مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— پارہ 29 (مکمل) —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— پارہ 29 (مکمل) —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	جولائی 2006ء
مطبع	....	وقار پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھراُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلوآمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراج انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو

آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست پارہ 29

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پیش لفظ 20

اظہارِ تشکر 27

پہلا باب: سورۃ الملک (آیات 1 تا 4)

دروسِ قرآن کی مختصر تاریخ 29

ارتکازِ مضامین 30

خارجی کائنات میں رونما ہونے والا انقلاب 31

دنیائے انسانیت میں عالم گیر انقلاب 31

فکرِ قرآنی کو سمجھنے کے لیے قرآنی الفاظ کے مجازی معنی کی اہمیت 31

لفظ برکت کا قرآنی مفہوم 33

قرآنِ حکیم نے احکامات کے بالمقابل اصولوں کی زیادہ بات کی ہے 34

اسلامی معاشرے میں صفاتِ خداوندی کا عکس 34

حمد کا مفہوم 35

حیاتِ انسانیت کا دارومدار نفسِ انسانی کی نشوونما کا رہینِ منت ہے 36

موت کا ذائقہ انسانی ذات کی کامرانی اور نشوونما کا پیمانہ ہے 37

موت کا مرحلہ انسانی زندگی کو حسین ترین منزل سے
متعارف کرانے کا ذریعہ ہے 39

ذاتِ انسانی کا مقام صرف حسن تک محدود نہیں
بلکہ احسن کے مقامِ بلند تک کا ہے 40

قرآنِ حکیم کے نزدیک عزت کا مفہوم 41

غلبہ اور حفاظت کے ملاپ کا نام ہی اسلامی نظام ہے 41

ہم نے قرآنِ حکیم کی طرز پر خارجی کائنات کو بطور
شہادت پیش کرنا چھوڑ رکھا ہے۔ 42

کائنات میں بکھرے ہوئے ان گنت کُرّوں
کے مابین باہمی ربط کی کیفیت 43

دوسرا باب: سورۃ الملک (آیات 5 تا 6)

قرآنِ کریم کا حقائق کو بیان کرنے کا محاکاتی انداز 44

انسان کے اختیار و ارادہ کو سلب کرنا خلافِ قرآن ہے 46

دنیائے انسانیت میں یہودیوں کا عقیدہ 47

ہندومت کی نظریاتی تعلیم میں انسانیت کی تذلیل 47

کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں 48

خدا کے احکامات کی بجائے انسانوں کے احکام 49

آج دو قسم کے قوانین رائج ہیں 50

طلاق طلاق طلاق اور قصہ ختم 51

ایمان کا چھٹا جز 52

خود ساختہ شریعت میں کسی کو آہ و فغاں کا حق نہیں 53

بزبانِ اقبال ابلیس کی مجلس شوریٰ 54
کرّوں کے چہروں پر عروسی کا نقاب 55
توہم پرستی کی مختلف شکلیں 55
اقبالؒ اور قرآن 56
صرف اور صرف خدا کے قانون کی حکمرانی 57
مختلف قسم کا عذاب 58
ملت اسلامیہ ہزار برس سے ایک مقام پر رُکی ہوئی ہے 58
تقدیر کا دوسرا نام: میں نہیں کر رہا، خدا کر رہا ہے 60
موجودہ اسلام کی حالت زار 60

تیسرا باب: سورة الملک (آیات 7 تا 14)

علمِ نجوم اور قسمت کا تعلق خلافِ قرآن ہے 62
صاحبِ اختیار اور مجبور میں فرق 63
قرآنِ حکیم کا حکم 64
قوموں کی جہنمی زندگی 64
تباہی سے پہلے دو شرطوں کا پورا کرنا 65
خاکِ زندہ سے خاکِ مردہ تک 66
وارثانِ امت کا فریضہ 66
عقل و فکر سے کام نہ لینے والا جہنمی ہوگا 67
عقل و فکر سے محروم لوگ 68
مکھی سے بھی گئے گزرے 68
قرآن کا بلا معنی سننا اور بلا سمجھے پڑھنا 69
ضابطہ انصاف کے دو بنیادی اصول 70
مدافعت کا حق اور قرآنِ حکیم سے قوانین سازی کا طریق 70
انصاف کی شرط: قانون کا بذات خود عدل پر مبنی ہونا ضروری ہے 71
بالغیب کیا چیز ہے؟ 72
صبر کا قرآنی مفہوم 72
کوئی عمل فوری طور پر نتیجہ خیز نہیں ہوتا 73
بچپن سے ہی خوف و ہراس 74
مہلت کا وقفہ خدا کی رحمت ہے 74
مغفرت کا مفہوم 75
پہلے ارادہ، پھر عمل، پھر اس کا نتیجہ 76
باہر کی بیٹریاں نتیجہ خیز نہیں ہوتیں 76
معاشرتی عدل کی کیفیت اور حیثیت 76
مومن کی فراست کی خصوصیات 77

چوتھا باب: سورة الملک (آیات 15 تا اختتام)

کائنات کی ہر شے انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے 80
مومن اور کافر میں سوچ کا فرق 81
قوانینِ خداوندی کے مطابق رزق کا پھیلانا 81
لفظ الیہ کا قرآنی مفہوم 82
روایات کے تحت عرش کی تعریف 83
رزق کی تقسیم ربوبیت عالمینی کی بنا پر کرنا ہوگی 83
غلط تقسیمِ کار کا نظام خوفناک تباہی ہوگا 84
آج پورا یورپ اور پورا امریکہ تباہی کے کنارے کھڑا ہے 85
چاروں طرف خوف و ہراس چھایا ہوا ہے 85
تاریخ کے بعد مظاہر فطرت کی شہادت 86
خدا کے قانون کے مقابلے میں کون سی قوت ہے؟ 87

انسانی صلاحیتیں ہوں یا نعمتیں، سب کی سب خدا کی ہی عطا کردہ ہیں	88
اصل سوال تو صلاحیتوں کا صحیح مصرف ہے	89
کرّہ ارض پر قدر مشترک صرف انسانیت ہے	89
انسانیت ایک، لہٰذا قانون بھی ایک	90
عملی نتائج کے سلسلہ میں ''کب'' کا جواب صرف خدا کو معلوم ہے	91
بات ہماری نہیں، تمہاری ہو رہی ہے	92
قرآن بحث میں نہیں الجھتا	92
خدا کو ماننا دراصل اس کے قانون کو ماننا ہے	92
کون کس حال میں ہے؟ جلد معلوم ہو جائے گا	93
زندگی کا مدار ہی پانی پر ہے	94
جنتی معاشرہ کی خصوصیات: خدا کی پیدا کردہ نعمتیں،	
انسان کی محنت اور قرآنی ضابطہ حیات	94
زندگی کا بہترین بزنس	96

پانچواں باب: سورۃ القلم (آیات 1 تا 6)

حروفِ ابجد کے سلسلہ میں حرف ''ن'' کی توجیہات	97
مرادفات کا مفہوم	98
قرآن فہمی کے لیے تصریف آیات کا طریق ضروری ہے	98
مفہوم کے لیے سند ضروری ہے	99
قلم کی اہمیت	99
پیغام پہنچانے کی پہلی شرط: دلائل و براہین	101
عمل کا نتیجہ خود بتا دے گا کہ سچ کیا ہے	102
تلوار کا استعمال صرف منفعتِ انسانی کے لیے ہے	103
قرآن اور شمشیر ایک دوسرے کے محافظ ہیں	105
منزل کے حصول کے لیے دیوانگی	108
حضور ﷺ کے متعلق عجم کی سازشیں	108
ہمیشہ سرسبز و شاداب رہنے والا درخت	109
ہم پیدائشی مسلمانوں کی قوم ہیں	110
سپر پاورز کی چیخ و پکار	110
غیر مسلموں کا اعتراض	111
سب سے زیادہ کامیاب ہتھیار کیریکٹر ہے	112
صوفیوں کا فرقہ ملامتیہ	112

چھٹا باب: سورۃ القلم (آیات 7 تا 14)

ایک دوسرے انداز کی مخالفت	115
حق حق ہے اور باطل باطل ہے۔ حق پر مفاہمت نہیں ہو سکتی	116
قسمیں کھانے والا شخص خود اعتمادی کے جوہر سے محروم ہوتا ہے	118
کچوکے مارنے والا شخص	118
نبی اکرم ﷺ کی ایک پر مغز دعا	119
کچوکوں کی خطرناک بیماری سے بچنے کا طریق	119
لگائی بجھائی کے بجائے بے نقاب ہو کر بات کریں	120
تخریب کاری کے مختلف خطرناک پہلو	121
یہ زندگی کی مستقل اقدار ہیں	123
باغ والوں کی ایک سبق آموز مثال	123
اپنی طرف سے قرآن میں کچھ اضافہ کرنا شرک ہے	126
قوانینِ خداوندی سے سرکشی کا نتیجہ: ہر طرف محرومی ہی محرومی ہے	127
قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کا نتیجہ: نعمتوں کی بارش	127
مسلمین کی پہچان	128

اپنی ہی لکھی ہوئی کتابوں کا درس دیتے ہو 128
اپنے فیصلے خدا کی طرف منسوب کرنا: یہی کفر ہے 129
سیکولرازم اور اسلامی حکومت میں فرق 129

ساتواں باب: سورۃ القلم (آیات 42: اختتام)

اس دنیا کی جہنم کا عذاب 132
ایک محاورے کی تشریح 132
خدا اپنی پنڈلی کو ننگا کرے گا: بخاری کی روایت 133
خدا کے صحیح تصور کی اہمیت 133
صحیحین کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی دائرۂ اسلام سے خارج کردے 133
جنگ بدر میں ابوجہل کا سر 134
عرب قوم کی ذہنیت 135
انہیں میرے حوالے کردیجیے 135
درجہ بدرجہ تباہی کی طرف 137
نبی کی دعوت بلا معاوضہ 137
یہ معصیت نہیں تھی 140
خدا کی طرف سے رسول خدا ﷺ کو بار بار صبر کی تاکید 141
آپ ﷺ کی ذات پر طعن و تشنیع کے خنجر 141
باطل کے ساتھ مفاہمت نہیں ہوسکتی 142
ضد میں اور اصول پرستی میں فرق 142
پرواز میں کوتاہی کا سبب کیا ہوتا ہے؟ 143
ایسا انسان خدا کا مہمان ہوگا 143
آپ ﷺ کی ذات کے متعلق کفار کا ناکام تجسس 143
سورتوں کے آخر میں فکرِ قرآنی کا نچوڑ ہے 144
انسانوں کے لیے دیا گیا نظام خداوندی کبھی فیل نہ ہوگا 144
ایمان اور عملِ صالح کے نتیجے میں استخلاف فی الارض 145
مسلمان حکومتوں کی حالت زار 145
ایک محسوس ٹیسٹ 146
گداگری کا پیالہ 146
لہو سے خریدی ہوئی جنت 146

آٹھواں باب: سورۃ الحاقۃ (آیات 1 تا 12)

نمائندگان بزم ہائے طلوع اسلام کا تعارف 148
تین نوعیتوں کے انقلابات: ایک انقلاب خارجی کائنات میں 149
تغیرات کی نشاندہی 149
اُخروی زندگی کے انقلابات کے متعلق کچھ اندازہ نہیں:
دوسرا انقلاب اُخروی زندگی سے متعلق 150
قوموں کے عروج و زوال کی داستان: تیسرا انقلاب اقوام کے اندر 151
اس دنیا کی جنت اور جہنم میں گروہ در گروہ داخل ہوں گے 152
معاشرے میں خوف اور بھوک کا عذاب 152
الحاقۃ ماالحاقۃ کا مفہوم 153
ہم نے مناظروں کا صرف نام بدلا ہے 154
حق کا قرآنی مفہوم 154
قوم عاد و ثمود کی داستانیں 156
اسپین پر 6 سو سال مسلمانوں کی حکومت کا انجام 156
حضرت صالح کی اذان 157
یہ داستانیں محض تاریخی واقعات نہیں 158
فرعون کی فرعونیت کا حشر 159

حضرتِ لوط کی قوم کا انجام	159
کام کرنے والا کمینہ اور ان کی کمائی پر پلنے والا سردار	161
ایک خوبصورت حدیث	161
قرآن کی یہ بیان کردہ داستانیں باعثِ عبرت ہیں	162
لفظ واعیۃ کا قرآنی مفہوم	162
1971ء میں انڈیا کے ہاتھوں ہونے والی شکست کی وجہ	
جواز اور ہماری اس شکست پر اندرا گاندھی کا تبصرہ	162
قرآن کی نظر میں تاریخ کی اہمیت	163
ان تغیرات سے ہمارا تعلق	164
نواں باب: سورۃ الحاقۃ (آیات 13 تا اختتام)	
قرآنِ حکیم کا پہلا انقلاب	165
قرآن کا دوسرا اور تیسرا انقلاب	166
واقعات ہنگامی ہوتے ہیں اور اصول ابدی	167
قیامت میں صور پھونکنے سے مراد کیا ہے	167
مردہ قوموں میں توانائی کا ظہور ہوگا	168
قرآنِ حکیم کا فلسفہ تاریخ	169
قرآنی الفاظ کا مفہوم متعین کرنے کا طریق	169
قرآنی لفظ سماء کا مفہوم	171
عرش کا مفہوم	171
ہر سانس میں قیامت موجود ہے	172
ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہو کر رہتا ہے	172
خوشی اور مسرت کا دار و مدار	173
آخرت کا قرآنی مفہوم	174
حضور ﷺ کی چمکتی ہوئی حدیث	174
صرف دو لفظوں میں قرآن کے معاشی نظام کا نقشہ	175
دسترس کے اس ایک لفظ نے قرآنی نظام کی وضاحت کر دی	157
جنتِ ارضی میں ایک ہاتھ بھی محروم نہیں ہوگا	176
حال ماضی کا ہی نتیجہ ہوتا ہے	176
موت پر یقین کا نتیجہ	177
قرآنِ حکیم کا محاکاتی انداز	178
قوموں کی تباہی کے لیے ایک ہی جرم کافی ہے	178
قسم کھانے سے کیا مراد ہے؟	179
شاعری میں فراق اور وصال کی حقیقت	180
وحی خداوندی میں کسی رسول کا اپنا ایک لفظ بھی شامل کرنا جرمِ عظیم ہے	180
تکذیب کا مفہوم	181
یقین کے تین مدارج: علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین	181
قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہماری حالت	182
دسواں باب: سورۃ المعارج (آیات 1 تا 28)	
نوعِ انسانی کی تباہی کے تین گوشے	185
کافر کے حقیقی معنی	186
مہلت کا وقفہ قانونِ مکافات کا ہی حصہ ہے	186
سیڑھیوں والا خدا	187
درکات اور درجات کا مفہوم	187
ملائکہ اور روح کی قوتیں	187
پچاس پچاس ہزار سال کے دن کا مفہوم	188
عالمِ امر اور عالمِ خلق کی حقیقت	189

قوموں کی زندگی صدیوں پر محیط ہوتی ہے 190
صبر کا قرآنی مفہوم 191
قرآن فہمی کے لیے بصیرت سے دیکھنا شرط ہے 192
بات طرے کی نہیں، بات تو قد کی ہے 193
جہنم میں کسی کو باہر سے دھکا دینے کی ضرورت نہیں پڑتی 193
خدائی کے دعویدار یہ پہاڑ اور یہ چٹانیں بالکل ختم ہو جائیں گی 193
لفظ ”کلا“ کا مفہوم 194
تباہی و بربادی کا دوسرا نام ہی تو جہنم ہے 195
آخر یہ تباہی و بربادی کیوں؟ 195
جمع فاوعی کا مفہوم 195
انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی 196
ھلوعاً کا مفہوم 197
ھلوعاً کی مہلک بیماری سے کون بچتے ہیں؟ 198
یہ مصلین نہیں، یہ نمازی ہیں 198
صلوٰۃ ایک نظام کا نام ہے 198
رزق کی تقسیم بہتے پانی کی طرح ہونی چاہیے 199
خیرات تو انسان کو نفسیاتی طور پر تباہ کر دیتی ہے 200
یوم الدین کی تصدیق کرنے والے 201
اہل یورپ کی حالت زار 202

گیارھواں باب: سورۃ المعارج (آیات 29 تا اختتام)

قرآن کے معاشی نظام میں ضرورت سے زیادہ ملکیت کی اجازت ہی نہیں 203
کمیونزم والوں نے خود کمیونزم کا مطالعہ نہیں کیا 204
مارکس کے پاس کوئی جذبہ محرکہ نہ تھا 204
مملکت کی تعریف 204
دنیا کا بدترین نظام 205
کمیونزم کے پاس کوئی ضابطہ قوانین نہیں 205
سوچیے کہ پھر دنیا کا حشر کیا ہوگا 206
یہ بنیاد صرف قرآن کے پاس ہے 206
قرآن ایک درجہ آگے جاتا ہے 207
نفسا نفسی کی بنیادی وجہ 207
آبادی تو بڑھ رہی ہے لیکن انسان کم ہوتے جا رہے ہیں 208
قرآن محض قانون نہیں بتاتا، انسان بھی بناتا ہے 208
معاشی نظام کے ساتھ جنسیات کا تعلق 209
قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر 209
دوسرا موضوع غلام اور لونڈیاں 210
غلام اور لونڈیوں کے متعلق قرآن کے احکام 210
پارلیمنٹ کے اجلاس میں ایک مولانا کا مطالبہ 211
قرآنِ کریم کی نظر میں امانت کا مفہوم 212
امانت کے نظام میں اور باطل کے نظام میں فرق 213
تصوف کی دنیا میں بے خوفی کا حصول 214
طواف کا مفہوم 214
یہ ہے ”قل العفو“ کا نتیجہ 214
خدا تعالیٰ کی ایک صفت: المومن 215
سوال صرف نظام کا نہیں ان ہاتھوں کا بھی ہے کہ
جنہوں نے یہ نظام قائم کرنا ہے 216
قانونِ شہادت اور ہم 216

انسان کا شدید ترین کنٹرول شکن جذبہ 218
جنت کی تعریف اور رزقِ کریم 219
عبادت کا مروّجہ مفہوم 219
تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئیں گے 212
تم تیر کی طرح اپنی حفاظت کے نشانے کی طرف بھاگو گے 221

بارھواں باب: سورۃ الحج (آیات 67 تا 71)

عذاب یا تباہی 223
قرآنِ کریم کا انداز 224
قوموں کی تباہی کی بنیادی وجوہات 224
قومِ عاد کا جرم 225
قومِ ثمود کا جرم 225
قومِ مدین کا جرم 226
فرعون کا جرم اور دیگر جرائم 226
قوموں کی تباہی کی وجوہات 226
قوموں کے جرائم اور تذکرہ حضرت نوح علیہ السلام کا 227
قرآن حکیم کا انداز 227
اربابِ تنذیر 227
عبادت سے مراد خدا کی محکومیت ہے 228
متقی کا مفہوم 229
خدا کے قوانین کی حکمرانی' خدا کی حکمرانی 229
رسول بحیثیت اتھارٹی 230
مہلت کا موقع رحمتِ خداوندی ہے 231
حضرت نوح علیہ السلام کی درخواست 231
لفظ ثیاب کا مفہوم 232
قرآنِ حکیم کا نظریہ ارتقا 233
لفظ وقار کا مفہوم اور آسمانی کرّوں کی مثال 234
چاند سورج سے روشنی کی بھیک مانگتا ہے 235
ارتقا کے سلسلہ میں درخت کی مثال 235
کرّۂ ارض کی مثال 236
بتوں کو ماننے کی وجہ جواز 237
پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرنے کی مثال 238
نشہ قوت انسانی صلاحیتوں کو سلب کر دیتا ہے 239
کسی کو چھوڑو تو وہ بھی حسن کارانہ انداز سے چھوڑو 240
ایک اعلان 241

تیرھواں باب: سورۃ الجن (آیات 1 تا 15)

عربی لغت کے تحت "جن" کا مفہوم 243
سائنس کے انکشافات 245
انسانی ذہن کا عہد طفولیت 245
نزولِ قرآن کے وقت آبادی کی حالت 247
خانہ بدوش نظروں سے دُور رہنے والی مخلوق 247
رسول اکرم ﷺ صرف انسانوں کی طرف ہی مبعوث ہوئے تھے 249
علم کی روشنی سے دُور مسلمان کی حالت 251
خدا تعالیٰ سے براہِ راست معلومات کا حصول 251
قرآنِ حکیم کے نور کی آگ 252
قسمت کا حال طوطے بتاتے ہیں 252
جنوں کے قصے 252

انسانی جن کو نکالنا بڑا مشکل کام ہے 253
روایات کے تحت سورۂ جن کے افسانے 254
''جنوں'' کی قرآن فہمی 255
یہ سب مذہبی پیشوائیت ہی کا پروپیگنڈا تھا 256
یہ سب توہم پرستیوں پر مبنی جہالت کی باتیں ہیں 257
خدا کے قانون کے ساتھ مقابلہ 258

چودھواں باب: سورۃ الجن (آیات 16 تا 22)

قوانینِ خداوندی سے اعراض کا نتیجہ روزی کی تنگی کی شکل میں ہوتا ہے 261
امارت کے سہارے جنت کا حصول 261
آیات کے غلط مفہوم کا نتیجہ 262
ایمان باللہ کا مفہوم 263
حقیقی نظریہ خدا کی محکومیت تھا 263
خدا کو پکارنے سے کیا مراد ہے 264
دعوت الی اللہ کا مفہوم 264
دین اور مذہب میں بنیادی فرق 266
پرستش خدا کی اور حاکمیت ملوکیت کی 266
ہمارے ہاں کی بحثیں اور مناظرے 267
نظامِ صلوٰۃ کے قیام کی بجائے صرف نماز پڑھنا 267
خدا حاکم مطلق کی بجائے صرف پرستش تک رہ گیا 268
غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق مولانا اسلم جیراج پوریؒ اور
مولانا مودودیؒ کی بحث 269
فرقوں کے نام پر مساجد کا وجود 270
یہ مراکز صرف حکومتِ خداوندی کے لیے مختص ہونے چاہئیں 270
ہر انسانی حکومت کے بالمقابل قرآنی حکومت 271
میرے پاس کسی کو نفع نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں 271

پندرھواں باب: سورۃ الجن (آیات 23 تا اختتام)

بلا شرکت غیرے حکومت 274
قرآن اور سربراہ مملکت کی اصطلاح 274
حضور ﷺ کا اپنے متعلق فرمان 274
مہلت کے وقفے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا نتیجہ 276
رسول کو کتنا غیب کا علم تھا 277
علم غیب کے حدود 277
قرآن کا معجزہ 278

سولھواں باب: سورۃ المزمل (ابتدائیہ)

سورۃ المزمل کی اہمیت 280
رفقاء کی ضرورت 280
مخالفت کی وجہ جواز 281
قد قامت صلوٰۃ کا قرآنی مفہوم 282
تفسیروں کی رو سے مزمل کی تفصیل 282
مقامِ نبوت، مقامِ وحی اور تصوف کی حقیقت 283
ہر جگہ پر تصوف کی ایک ہی شکل ہے 283
علم لدنی کے حصول کے لیے کوشش 284
چادر کے اوڑھنے پر پیش کردہ روایت 284
پہلی وحی کے نازل ہونے پر روایاتی بیان 284
مزمل کا قرآنی اور لغوی مفہوم 286
کمر توڑ دینے والا پروگرام 287

خدا کو بھی یہ کہنا پڑا 289

سترھواں باب: سورة المزمل (آیات 1 تا 9)

انقلاب کے مقابلے میں انقلاب 291
یہ ہوا کیسے؟ اس کی بنیادی وجہ کیا ہوئی؟ 291
قرآن کا مفہوم بدل دیا گیا 292
میری ذاتی معروضات 292
قرآنی نظام، ایرانی اور عجمی سازش کا شکار ہو گیا 293
روایات کے مجموعے کس طرح مرتب ہوئے 293
نبی اکرم ﷺ کی مصروفیات 294
روایات کی رو سے قرآن کی پہلی تفسیر اور پہلی تاریخ 295
مجھے کسی کی تحقیر مقصود نہیں 296
اصل معیار، اصل کسوٹی صرف اور صرف قرآن ہے 297
تسبیح کی حقیقت 297
صلوٰۃ کو قائم کرنا نظام کو قائم کرنا تھا 298
روشنی کا عدم ہی اندھیرے کا وجود ہوتا ہے 299
اہلحدیث اور اہل فقہ کے باہمی جھگڑے 299
حضور ﷺ سے استقامت کی تاکید 300
مسلمان ممالک میں ملوکیت کا راج 301
غلام اور لونڈیوں کا مسئلہ 301
تاریخ میں کہیں کہیں قرآن کی آواز سنائی دیتی ہے 302
کل بھی سیرتِ طیبہ کا مرکز قرآن ہو گا 302
رتل اور ترتیل کا قرآنی مفہوم 303
قرآن کا مفہوم تو موتیوں کی طرح پرویا ہوا ہے 304
قرآنی نظام کی ترتیب کے لیے مرحلہ وار پروگرام موجود ہے 304
قرآن کشمکش حیات کا عملی پروگرام دیتا ہے 304
پروگرام کی تکمیل بہت بڑا بوجھ تھا 305
قولاً ثقیلاً کی تشریح روایات کی رو سے 305
وحی قلب نبی پر نازل کی 306
لفظ ناشئة کا مفہوم 306
وَطًا کا مفہوم 307
سبح کا قرآنی مفہوم 308
بتول کا مفہوم 308
مشرق سے مغرب تک ربوبیت عالمینی کا پروگرام 308
لا اله الا هو کا قرآنی مفہوم 309
ملوکیت کے دور کی قرآنی تفسیر 309
حکومت بادشاہوں کی اور پرستش خدا کی 309

اٹھارھواں باب: سورة المزمل (آیات 10 تا اختتام)

سابقہ درس کا پس منظر 311
اعتراض نماز پر نہیں ہوتا، نظام پر ہوتا ہے۔ 313
نبی اکرم ﷺ کی غمگساری کی کیفیت 313
علیحدگی لیکن وہ بھی حسن کارانہ انداز سے 313
یہ ساری تگ و تاز اور یہ سارا ٹکراؤ کس چیز کے لیے تھا 314
فرمانِ خداوندی کہ میں ان سے خود نپٹ لوں گا 315
یہ سارا باطل کا نظام عین دین قرار پا گیا 315
لفظ جہنم کی بجائے جحیم کا استعمال 316
نظامِ سرمایہ داری کے تحت ملنے والا رزق 316

جبال کے مجازی معنی 317

جبال کے بعد کثیب کا لفظ 318

فتح مکہ کی مثال ایک زندہ شہادت ہے 319

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کشمکش 319

لفظ وبیل کا مفہوم 321

فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ کا اہل قریش سے حسن سلوک 324

اصل بات تصادمات کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا 324

قرآن کے لفظ ''تقوم'' کا مفہوم 325

قم الیل کی تفسیر 326

لفظ قرآن کے معنی اور اقراء کا مفہوم 327

ہمارے ہاں قرأت کا مفہوم 328

بھیروں راگ اور بھیرویں راگ کی وضاحت 329

سب کچھ بدل دیا گیا 329

قرآنی پروگرام کی تکمیل کے لیے ہدایات 330

نبی اکرم ﷺ کی تمنائے بے تاب کا اظہار 330

قرضِ حسنہ کسے کہتے ہیں؟ 331

انیسواں باب: سورة المدثر (آیات 1 تا 6)

مروجہ تراجم میں مدثر کے معنی 333

مزمل کا لغوی معنی 334

مغرب کے دانشور اور قرآن 335

ایک مغربی مورخ کے تاثرات 335

کارلائل کی عقیدت مندی 336

لفظ **قم** کا قرآنی مفہوم 337

دوعالم کے لیے رحمة للعالمین 338

یہ انذار سارے کے سارے اہل مذاہب کو پکارنا تھا 339

منفی پہلو کے بعد مثبت پہلو 339

انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ربوبیت عالمینی کو بلند کرے 340

اپنے قلب کی بات 340

لفظ تثویب کا مفہوم 342

نوع انسانی کے لیے پروگرام ربوبیت عالمینی 343

دماغ کے بت خانے کو صاف کرنا 343

ہر نوع کے بتوں سے نجات حاصل کرنا ہوگی 345

لا الٰہ سے پہلے الا اللہ نہایت ضروری ہے 346

عمل تزمیل اور ''رُجز'' کا قرآنی مفہوم 346

پروگرام کی تکمیل کے لیے ایک خصوصی شرط 347

مفہوم القرآن میں دیا جانے والا مفہوم 348

بیسواں باب: سورة المدثر (آیات 6 تا 26)

ربک فکبر کیا تھا؟ 349

قرآنِ حکیم کا پہلا ہی لفظ ربوبیت عالمینی ہے 350

اسلامی نظام کوئی مکینکل چیز نہیں 351

نفسیاتی تبدیلی کے بغیر قرآنی نظام متشکل نہیں ہوسکتا 351

لا تمنن تستکثر کا مفہوم 352

یہ پروگرام ایک دن کا پروگرام نہیں، زندگی بھر کا سلسلہ ہے 352

فاصبر کا قرآنی مفہوم 353

لفظ ربوا کی حقیقت 354

اصل زر کے اوپر جو کچھ بھی ہے وہ ربوٰ ہوگا 355

اسلام کے بنیادی نظام' ربوبیت عالمینی کے خلاف بغاوت 355
اگر کوئی اصل بھی دینے کے قابل نہ ہوتو پھر کیا کیا جائے؟ 356
غیر قرآنی حکومت ہمیشہ سرمایہ دار ہوتی ہے 356
انسانیت کے خلاف تین بڑی لعنتیں 357
زمین کی بٹائی اور مضاربت دونوں حلال 357
بنک کا سود حلال اور سور کا گوشت حرام 359
خدا کے ہاں زیادہ کیسے ہوگا؟ 359
لفظ العقبہ کا مفہوم 360
یتیم کس کو کہتے ہیں؟ 360
گاؤں کے امیر زادوں کی مصروفیات 362
سرمایہ داری کی ابتدا 363
دراصل یہ ٹکراؤ دو نظاموں کا تھا 364
محاکاتی انداز میں ایک واقعہ کا ذکر 364
ادب کی چاشنی ایمائیت کی شکل میں 365

اکیسواں باب: سورۃ المدثر (آیات 27 تا 32)

گزشتہ سے پیوستہ نفس مضمون 367
جہنم کے متعلق ہماری غلط نگہی 368
سال بھر کوئی مقدمہ نہیں آیا: ایک بے مثل نظیر 370
دوسری کیٹیگری (قسم) 370
مکافاتِ عمل کی اہمیت 372
نہ پولیس کی حاجت' نہ مجسٹریٹوں کی اور نہ ہی جیل خانوں کی ضرورت 372
مکہ کے میدان میں "ساصلیہ سقر" کا نقشہ 374
پابجولاں قیدیوں میں غیور کی کیفیت 374
آپ ﷺ کی شرافت کی عظمت 375
قرآن کی آخری سورتوں میں جامعیت کی انتہا ہے 375
حضور کا خطبہ حجۃ الوداع 376

بائیسواں باب: سورۃ المدثر (آیات 33 تا اختتام)

قرآن حکیم کا پیش کردہ ضابطۂ حیات ہر آنے والی نسل کے لیے مشعلِ راہ ہے 378
خارج سے ملنے والی سزا اور عمل کے فطری نتیجہ مرتب ہونے میں فرق 379
جہنمی زندگی میں عذاب کے مجازی معانی کا استعمال 380
موجودہ دَور میں دنیا بھر کی قوموں کی حالت زار 380
نبی اکرم ﷺ کی اہل قریش سے کشمکش اور اس کا نتیجہ 380
قرآنِ حکیم کی بلاغت وفصاحت 382
لفظِ احدٰی اور کبر کا قرآنی مفہوم 383
قرآنِ حکیم کی پوری نوعِ انسانی کو وارننگ (تنبیہ) ہے 382
چودہ سوسال پیشتر نظریہ ارتقاء کی نشاندہی 384
انسان کی ارتقائی منزل انسانیت کی شکل میں 385
آج کا مسلمان تو مقامِ آدمیت سے بھی پیچھے ہے 386
ہر روش زندگی اپنا نتیجہ مرتب کرتی ہے 386
ربوٰ کے غلط مفہوم نے قرآن کا معاشی نظام ہی بدل دیا ہے 387
جہنم میں آنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہم مصلین میں سے نہ تھے 388
قرآنِ حکیم کی اصطلاحات کا مفہوم قرآن ہی سے متعین کرنا ہوگا 388
مصلین کا لفظ قرآن حکیم میں 389
تکذیب دین کرنے والے کون لوگ ہیں 390
صلوٰۃ کا معیشت کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے 392

عمل کرنے کا جب وقت ہی ختم ہو جائے پھر تو ایمان کوئی فائدہ نہیں دیتا 392
شفاعت کا مفہوم سفارش کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا 393
انسان حقیقت سے اس طرح بھاگتا جیسے جنگلی گدھا شیر کو دیکھ کر 394
نظامِ ربوبیت کی روشنی میں نظامِ سرمایہ داری کی حقیقت 394
قرآنِ حکیم کا منشور پوری انسانیت کے لیے باعثِ موعظت ہے 395
انسان کو چاہیے کہ وہ کچھ چاہے جو خدا چاہتا ہے 396

تیئیسواں باب: سورۃ القیٰمۃ (آیات 1 تا 3)

کشمکشِ حق و باطل کے آخری مراحل 389
مردہ قوم کو لفظ قم یا القیمۃ کا ادراک ہی نہیں ہوتا 399
ہمارے ہاں کفر کے فتوے 400
کسی دَور یا فرد کا تدبر آنے والے دَور یا فرد کے لیے سند نہیں ہو سکتا 400
نفسِ انسانی پر تحقیق 401
انسان کے لیے اختیار و ارادہ کی صلاحیت اور توانائی 402
روح کا مفہوم 402
وہ ''میں'' کیا ہے 403
انسانی نفس کی مختلف اقسام اور خصوصیات 404
نفسِ امارہ کیا ہے؟ 404
نفسِ مطمئنہ کیا ہے؟ 405
جنت ہو یا جہنم اس میں اجتماعی طور پر ہی جانا ہوتا ہے 406
نفسِ لوامہ اور انسانی ضمیر کی تشریح 406
مطلق خیر اور مطلق شر کا علم وحی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے 407
ضمیر کی آواز کیا ہے؟ 408
ضمیر کی آواز حق اور باطل کا فیصلہ نہیں کر سکتی 409
نفسِ لوامہ کا عمل 409
ابلیس کی خدا سے چھٹی کی درخواست 409
نفس کے متعلق قرآن کی تعلیم 410
تعوذ کا مفہوم 410
حضرت صاحب کا تعویذ 411
خدا کے قانون کے پروں کے نیچے آنا 411
ضمیر کے اندر فی الواقعہ کچھ نہیں 412
خواہش کا پیدا ہونا بھی ایک نشان قائم کرتا ہے 413
عدم کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا 414

چوبیسواں باب: سورۃ القیٰمۃ (آیات 4 تا 15)

لفظ نفسِ لوامہ کے متعلق علامہ اقبال کی وضاحت 416
انسانی اعمال کے نتیجہ میں جزا اور سزا کے الفاظ مناسب نہیں 417
کراماً کاتبین کی حقیقت 419
انسان خود اپنے خلاف آپ گواہ ہوگا 420
انسان کا اعمال نامہ انسان کی گردن میں 421
کسی گواہی کی ضرورت نہ ہوگی 421
انسانوں کے نظامِ عدل کی خامیاں 422
قرآنِ حکیم کا مفہوم متعین کرنے کے سلسلہ میں ایک گزارش 422

پچیسواں باب: سورۃ القیٰمۃ (آیات 16 تا اختتام)

نزولِ وحی کے سلسلہ میں موجودہ تفاسیر 424
وحی کے سلسلے میں قابل غور نکات برائے تقاضائے ربط مضمون 425
اِن آیات میں سارا ذکر نامہ اعمال سے متعلق ہے 427
حیوانی زندگی کا نظریہ حیات 428

اُخروی زندگی کے لیے مفادِ عاجلہ کی قربانی 429
خدا تعالیٰ کے دیدار کا مفہوم 429
قرآن نے اُخروی زندگی کو مثالی طور پر بیان کیا ہے 429
صدق کے بالمقابل کذب اور صلیٰ کے بالمقابل تولّی کا مفہوم 432
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق 433
تکذیب کا قرآنی مفہوم اور اس کے مضمرات 434
اس پوری کائنات کا اور انسانی زندگی کا ایک مقصد ہے 435
اہل عرب کی زباندانی اور لفظ ''سدی'' کا مفہوم 436
خانقاہیت بھی تانا ہی تانا ہے 437
جولاہی تانا تندی پھر دی اے 437
جہانِ فردا کی حقیقت 438
بصارت کو بصیرت میں بدل دینے والی دلیل 439
کمہار کے عمل کی مثال 440
کوئی مادہ ختم نہیں ہوتا 441
سب سے بڑا جہنم 442

چھبیسواں باب: سورۃ الدھر (آیات 1 تا 9)

جنت ہو یا جہنم اس کی کیفیات کو قرآن نے تمثیلاً بیان کیا ہے؟ 443
پہلے تو انسان کوئی قابل ذکر شے تھا ہی نہیں 445
وقت کیا ہے اس پر بحث کر کے کچھ حاصل نہ ہوگا 445
قرآنی الفاظ دہر اور زماں کا مفہوم 446
تخلیق اور امر کا مفہوم 446
لفظ امشاج کی تشریح 448
ہمارے ہاں لفظ نَبْتَلِیْہِ کا ترجمہ غلط ہے 448
مضمر صلاحیتوں کی نمود کا ہونا 449
زندگی میں پہلو بدلنا 450
لفظ ''فجعلنا'' کا مفہوم 450
زندگی کے دو راستے ہیں 451
فواد اور قلب کا استعمال 451
حیوانات میں یہ خصوصیات نہیں 452
جہاں تک سائنس پہنچی اس سے آگے 453
ہتھکڑیوں اور طوقوں کی کیفیت 453
ابرار کا قرآنی مفہوم 455
کافوراً اور زنجبیلاً کی لازوال تشبیہ 456
حضرت عمرؓ کی اپنے گورنر کو ایک نصیحت 457
اپنے دل کی چٹانوں کو پھاڑ کر چشمے کا حصول 457
نذر کے لفظ کا معنی 458
شر کی وسعتیں اور ان سے حفاظت کا احساس 458
میری روٹی دوسرے تک نہ جائے 459
اس شر اور شرارے سے بچنے کا علاج 460
جنتی شراب پینے والے کی کیفیت 461

ستائیسواں باب: سورۃ الدھر (آیات 10 تا اختتام)

شر سے بچنے والے معاشرہ کی جنت ارضی 462
جنتِ ارضی کے بعد اخروی جنت 463
قرآنِ حکیم کی آیاتِ محکمات اور متشابہات کی وضاحت 464
عرب معاشرہ کی کیفیت 464
براؤن کی ہسٹری میں ایران کی تفصیل 465

مدائن کی فتح کے بعد صاحب سلطنت کی حالت زار 466
حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا خط ایران سے مالِ غنیمت کی تفصیل 467
کچھ ذکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اور کچھ عرب وعجم کا تقابلی جائزہ 468
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی 468
قوتوں کو اعتدال میں رکھنا 470
شراب ہر پینے والی شے کو کہا جاتا ہے 470
مزاجھا کا مفہوم 471
رزق کے چشموں پر بند لگا دینا 472
قرآن کی اصطلاحات کا مفہوم ہی بدل دیا گیا 472
قرآنی الفاظ "مسک" اور "تسنیم" کا مفہوم 473
مومن ہمیشہ بلندیوں پر پرواز کرتا ہے 437
جنت ارضی کا معاشرتی ماحول 474
جنت ارضی میں آسائش وزیبائش کے ساتھ جلال وجمال بھی ہوگا 475
تئیس لاکھ مربع میل پر مملکت 475
ملک کبیر کی تمام نعمتوں پر دسترس 476
یہ سب کچھ انسانی اعمال کی ہی جزا ہوگی 476
قرآن اسی قسم کے معاشرے کی طرف بتدریج ترغیب دیتا ہے 477
قبولِ اسلام کے سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان 478
تھکا دینے والا پروگرام 479
فرقہ اہل قرآن سے میری مخالفت کی وجہ 480
حضرت شعیب علیہ السلام کی صلوٰۃ 480
مخالفت کی اصل وجہ 481
اگر یہ نظام نہ بدلا تو پھر چھٹی ہوجائے گی 482

اٹھائیسواں باب: **سورۃ المرسلٰت** (آیات 1 تا 19)

کشمکش حق وباطل 484
تیسویں پارے کی اہمیت 484
حق کے غالب آنے کی دو صورتیں ہیں 485
کائناتی قوتوں کے تحت نتائج کا حصول صدیوں پر محیط ہوتا ہے 485
حق وباطل کے سلسلہ میں تاریخی شواہد 486
حق کا پہلا گوشہ اور مذہب کی ہمیشہ مخالفت 486
مذہب نے ہمیشہ حق کی مخالفت کی ہے 487
دوسرا گوشہ حق کو مکمل کرنا ہے 487
صدرِ اوّل کی کشمکش کا نتیجہ 487
کائناتی قوتوں کو قرآن نے ملائکہ بھی کہا ہے 488
لفظ عرفاً کا مفہوم 489
حق کو باطل سے الگ کرنے کا طریق 490
مذہب میں اصلاح کرنے سے دین نہیں آتا 491
روشنی ہوگی تو اندھیرا نہیں رہے گا 491
باطل کے بالمقابل قرآنی نظام کا روشن پہلو 493
تاریخ کے نوشتے بطور شہادت 493
سب سے پہلے مذہب اور دین کے فرق کو متعین کرنا ہوگا 495
قرآن کے بیان کردہ حقائق کو مجازی معنی میں بھی دیکھنا ہوگا 496
تاریخ کا مرقع باعثِ عبرت ہوتا ہے 497
جرم کا مفہوم 499

انتیسواں باب: **سورۃ المرسلٰت** (آیات 20 تا 37)

قرآن حکیم کے آخری پاروں کی خصوصیت 501

ظالم اور مظلوم کی غلط فہمی 501
استقرارِ حمل کے سلسلہ میں بچے کی پیدائش تک کی ایک ٹھوس مثال 502
قرآن نے مہلت کے اس وقفہ کو پیمانے سے تعبیر کیا ہے 503
حق و باطل کی پہچان 504
کائنات کو مسخر کرنا دین کا ایک گوشہ ہے 504
کائنات کی ہر شئے قانون کے سامنے سجدہ ریز ہے 505
یہ کائناتی دین اس کائنات کے اندر احسن طریق سے نافذ ہے 505
انسان فطرت کے ان قوانین میں دخل اندازی نہیں کر سکتا 505
طبعی قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ تباہی ہے 506
سپر پاور بننے کا طریق صرف ایک ہے 506
پوری کائنات کے اندر نہ کوئی سفارش ہے نہ رشوت اور نہ ہی کوئی کچہری 507
زندگی کا دوسرا گوشہ انسان کی انسانیت کی زندگی 508
صدیوں کی کاوشوں، ہلاکتوں اور خون ریزیوں کا شافی علاج: وحی کی رہنمائی 508
انسانی زندگی کا بٹوارا انسانوں کے ہاتھوں 509
تصوف کی دنیا اور دین خداوندی کی خلاف ورزی کا نتیجہ 509
دین اور دنیا کے امتزاج کا نام ہی الاسلام ہے 510
ایک حصے پر ایمان اور دوسرے سے انکار 501
کتاب اللہ اور کتاب فطرت 511
دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولیے 512
ایمان کے استحکام کا ثبوت 513
مدینہ منورہ کی یونیورسٹی کے چانسلر کا فتویٰ 531
زمین کے سلسلہ میں لفظ کفاتا کا مفہوم پرندوں کی مثال 514
فضائی کروں کے باہمی تعلقات 515
زمین پر پہاڑوں کے متعلق تحقیق 515
چٹانوں سے پانی کی مثال 515
کائناتی قرآن کو جھٹلانے والوں کے لیے تباہی ہے 516
انسان خود مصیبت کی طرف جاتا ہے 516
سائبان کی طرح محیط دھوئیں کے بادل کی کیفیت 517

تیسواں باب: **سورة المرسلٰت** (آیات 38 تا اختتام)

فیصلہ کن مرحلہ 519
انسان کی فریب خوری 520
یہ کیفیت ابدی نہیں ہوگی 521
متقین کا گروہ 522
جنت ارضی کی خصوصیات 522
معاشرتی جہنم 523
جنت کی خاص نشانی 524
جہنمی معاشرہ میں چوائس نہیں ہوتا 525
زندگی کی خواہشات اور اُخروی جنت میں فرق 527
رضوان کا قرآنی مفہوم 528
مومن کے لیے احکام اور آزادی کا مفہوم 528
من شاء کا مفہوم 529
اطاعت اور اتباع کا مفہوم 530
دورِ ملوکیت کی تفاسیر میں انسانی آزادی کہاں؟ 531
میری متاع حیات 534
میرا عشق دروں 535
نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں عقیدت 537
انتیسویں پارے کی آخری آیت اور میقات کا سنگ میل 539

پہلا باب: سورة الملک (تمہید اور آیات 1 تا 4)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دروسِ قرآن کی مختصر تاریخ

عزیزانِ من! آج ستمبر 1983 کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز 29 ویں پارہ کی سورۃ الملک سے ہو رہا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ قرآنِ کریم کے آخری دو پاروں میں ہماری اس راہ گزر کی ایک نئی منزل شروع ہوتی ہے۔ اس کے لیے میں پہلے تمہیدًا کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس درس کی مختصر سی تاریخ یہ ہے کہ میں نے اس درس کا آغاز کراچی میں 1950 میں شروع کیا جو بڑے حسین اور سادہ انداز میں تھا۔ کراچی سے واقف حضرات جانتے ہونگے کہ وہاں سعید منزل بڑی مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ اب تو کراچی بہت بڑھ گیا ہے' اس کی حیثیت شاید وہ نہ رہی ہو مگر اس زمانے میں' سارا شہر سعید منزل کو جانتا تھا۔ یہ منزل ڈاکٹر سعید مرحوم کے نام پہ تھی۔ آپ بزرگ تھے' سن رسیدہ تھے' بڑے انقلابی تھے اور ذہنی طور پہ بڑے قرآنی تھے۔ وہ اتوار کی صبح میرے ہاں آیا کرتے تھے اور قرآن کی باتیں کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بات کہی کہ پرویز صاحب! یہ جو ہم آپ باتیں کرتے ہیں' وہ صرف میں سنتا ہوں' یہ معاملہ دو تک رہتا ہے اگر اس سلسلے کو کچھ آگے بڑھا لیا جائے تو اور لوگ بھی مستفید ہونگے۔ ان کی اس تجویز کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا۔ تین سامعین تھے اور میں درس دینے والا تھا۔

میں اس زمانہ میں' 23/1 فاؤلرز لائن' نیپئر بارکس [1] کراچی میں رہتا تھا۔ یہ سرکاری مکان تھا۔ مکان کے صحن میں ایک چھوٹا سا درخت تھا' اس درخت کے سائے میں دو چار پائیاں بچھا لیتے تھے۔ میں دہلی سے تقسیم کے بعد بالکل بے سرو سامان آیا تھا تو ان چارپائیوں کے اوپر اس کی ابتداء ہوئی۔ آہستہ آہستہ اس کا سلسلہ وسیع ہوتا گیا اور ہمارا دامن تنگ اور سامعین کی تعداد بڑھتی گئی' ہم پھیلتے گئے۔ مکان کے باہر ایک بہت بڑا کشادہ میدان تھا' اس میں آہستہ آہستہ مانگی تانگی ہوئی کچھ کرسیاں بھی رکھتے چلے گئے۔ بہر حال

---

[1] پرویزؒ: معراجِ انسانیت' ناشر ادارہ طلوعِ اسلام' کراچی' 1949ء' ص۔ 42۔

1958ء تک میں وہاں رہا' یہ سلسلہ خاصا پھیل چکا تھا لیکن درس موضوعات پر ہوتا تھا' مسلسل قرآن کا درس نہیں تھا۔ موضوعات کے معنی یوں سمجھیے کہ میں قرآن کے بنیادی نظریات وتصورات یعنی Basic Concepts لیتا تھا کیونکہ جب تک یہ سمجھ میں نہ آئیں قرآن کا پیغام سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ وہ بنیادی تصورات دیتا ہے اور باقی قرآن تو صرف ان تصورات کی تشریح' وضاحت اور فروعات میں داخل ہے۔

میں 1958 میں یہاں لاہور آیا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے پھر اس سلسلے کو شروع کیا۔ ضمناً فروری 1983ء کے طلوعِ اسلام میں اس کی کچھ روائیداد لکھی ہے۔ اس میں 1953ء لکھا گیا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے کیونکہ 1953ء میں تو میں کراچی میں ہی تھا۔ میں 1958ء میں یہاں 25 / بی گلبرگ لاہور آیا ہوں۔ یہاں آ کر اس کی ابتداء کی۔ پہلے دو سال تک انہی تصورات کے موضوعات پر ہی یہ درس چلتا رہا پھر 1960ء میں ''الحمد'' سے یہ مسلسل شروع کیا گیا۔ یہ جو اس کا پہلا دَور تھا وہ آٹھ سال تک جاری رہا۔ دسمبر 1967ء میں وہ ختم ہوا تو اس تکمیل پر احباب نے بھی یہاں اس کا ایک جشن منایا تھا۔ میں نے سمجھا تھا کہ اب مجھے چھٹی مل جائے گی مگر ہوا وہ جو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ

مکتبِ عشق کا انداز نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

احباب کا تقاضا یہ تھا کہ نہیں صاحب! اب تو دوسرا دَور شروع ہوگا۔ چنانچہ مارچ 1968 سے یہ اس کا دوسرا دَور شروع ہوا جو اس وقت تک جاری ہے۔ یعنی کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پہلا دَور آٹھ سال میں ختم ہو گیا تھا' دوسرے دَور میں پندرہ سال ہو گئے ہیں اور ابھی آخری دو پارے باقی ہیں۔

ارتکازِ مضامین

عزیزانِ من! یہیں کھڑے ہو کر میں نے کہا تھا کہ اب اس سفر میں ایک نئی منزل آتی ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ جوں جوں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے' وہ تفصیلات کم کرتا چلا جاتا ہے' حقائق زیادہ دیتا چلا جاتا ہے۔ وہ نصاب کی کتاب کی طرح یہ سمجھتا ہے کہ جو باتیں تفصیلات کی ہیں ان کو زیادہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے' اور حقائق چونکہ مرتکز شکل یعنی Concentrated Form کے اندر ہوتے ہیں وہ انہیں بیان کرتا ہے۔ اور اس کے بعد جب وہ آخری دو پاروں میں پہنچتا ہے تو یہاں تو پوچھیے نہیں کہ اس ارتکاز کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے: دو دو لفظوں کی ایک ایک آیت ہے اور اگر اس کی تشریح میں جانا چاہیں تو آپ کو اس کے اندر کئی کئی ہفتے لگ جائیں' ایک تو عربی کی زبان ہی عجیب ہے اور اوپر سے خدا کا انتخاب ہے پھر اس کے بعد یہ آخری کتاب ہے اور یہ بھی نہیں کہ اس نے اسے اتنا بڑا پانچ سات دس پندرہ جلدوں (Volumes) کے اندر بنانا تھا' یہ بڑی مختصر کتاب ہے۔ میرے ہاں ایک ورق میں' شیشے کے نیچے' میں نے تعظیماً وہ رکھی ہوئی ہے، یہ مصر میں شائع ہوا ہے' سارا قرآن ایک ورق کے اندر لکھا ہوا ہے' یہ اتنی سی کتاب ہے۔ آخری دو پاروں میں پہنچ کر اس کے جو حقائق

ہیں، وہ بڑے ہی مرتکز شکل کے اندر آ گئے ہیں، اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ دو پارے کتنے وقت میں ختم ہونگے۔ آرزو اور دعا یہ ہے کہ میری زندگی ختم ہونے سے پہلے یہ ختم ہو جائیں۔

خارجی کائنات میں رونما ہونے والا انقلاب

عزیزانِ من! قرآن ایک پیغام آفریں کتاب ہے۔ اس نے آخری پاروں میں جو انقلابات پیش کیے ہیں وہ قریباً تین قسموں کے ہیں: ایک انقلاب تو وہ ہے جو خارجی کائنات میں واقع ہوگا۔ اس میں کُرّے آپس میں ٹکرائیں گے، سورج کی روشنی مدھم ہو جائے گی، چاند تاریک ہو جائے گا، ستارے جھڑ جائیں گے۔ یہ کچھ خارجی کائنات میں تبدیلیاں آئیں گی یا کوئی انقلاب آئے گا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیسا ہوگا، کس قسم کا ہوگا؟ مغرب کے جو Scientists (سائنسدان) ہیں وہ اس تحقیق میں لگے ہیں اور آہستہ آہستہ اس طرف آ رہے ہیں کہ یہ نظامِ کائنات ایک دن درہم برہم ہو جانے کو ہے۔ وہ تو ابھی سے کہہ رہے ہیں کہ سورج کی حرارت میں اتنا فرق آ رہا ہے۔ ہم تو ان کی زبان بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے ہاں کی، سائنس اور میتھیمیٹک (ریاضی) کی زبان ہی الگ ہے لیکن وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ کیفیت ہو رہی ہے۔ ان کا اندازہ یہ ہے کہ اگر حرارت میں کچھ زیادہ فرق آیا تو اس کی جو کششِ ثقل ہے جس سے یہ کُرّے اپنی اپنی جگہ معلق ہیں، وہ پاش پاش ہو جائیں گے۔ یہ کُرّے ایک دوسرے کی کشش کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ معلق ہیں۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ اگر کسی ایک کُرّے کی کشش میں کسی ایک بال کے کروڑویں حصے کا بھی فرق آ گیا تو یہ ٹکرا کے پاش پاش ہو جائیں گے۔ اس انقلاب کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، اور پھر خوامخواہ ہم کیوں سر کھپاتے پھریں، ہم تو اس وقت ہونگے بھی نہیں اور اگر ہونگے بھی تو ایک ٹکڑا آیا اور ہم ختم ہوئے۔ بس ٹھیک ہے قصہ ختم۔

دنیائے انسانیت میں عالمگیر انقلاب

قرآن دوسرا انقلاب کچھ عالمگیر قسم کا انقلاب بتا رہا ہے۔ یہ اس انسانی دنیا کے اندر، اقوام کے اندر، ایک قسم کا انقلاب ہے اور بڑا عالمگیر انقلاب ہے۔ وہ ایسا انقلاب ہے جس کے متعلق یہ مترشح ہوتا ہے کہ آخر میں انسانیت، جس نظام پہ آئے گی، وہ وہی نظام ہوگا، جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ یہ دوسرا انقلاب عالمگیر انسانیت کے لیے ہے اور تیسرا انقلاب وہ ہے جو مرنے کے بعد آئے گا، جسے ہمارے ہاں آپ قیامت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان آخری دو پاروں کے اندر، جو کچھ آئے گا، وہ ان میں سے ہی کسی نہ کسی انقلاب کی طرف اشارہ ملے گا۔ اب اس کے بعد بات اشارات میں ہوگی۔

فکرِ قرآنی کو سمجھنے کے لیے قرآنی الفاظ کے مجازی معنی کی اہمیت

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے اور میں بتایا کرتا ہوں کہ الفاظ کے ایک معنی تو لغوی ہوتے ہیں جو ہم روزمرہ کی زبان میں لیتے ہیں

اور ایک انہی الفاظ کے مجازی معنی ہوتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے مثلاً ارے! اس کا کیا پوچھتے ہو وہ تو شیر ہے۔ تو وہ یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ سچ مچ کا Animal (حیوان) ہے جو شیر ہے، وہ حیوان ہے۔ اس سے مراد ہوتا ہے کہ وہ بڑا بہادر ہے۔ پانی کو کون نہیں جانتا۔ یہ پانی میرے سامنے رکھا ہے لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ ''پانی پانی کرگئی مجھ کو قلندر کی یہ بات'' تو وہاں جو ''پانی پانی'' ہے اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ایک گلاس دو گلاس ایک ڈونگا دو ڈونگے پانی ہے، وہاں پانی کے مجازی معنی ہیں۔ قرآنِ کریم کے استعارات اور تشبیہات کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی لیے جائیں گے یا مجازی معنی لیے جائیں گے۔ لغوی معنی کے لیے بھی لغت موجود ہے۔ وہ تو آسان بات ہے۔ یہ عجیب چیز ہے کہ قرآن کی جو زبان ہم تک جس شکل میں منتقل ہوئی ہے، عربوں کے ہاں ان الفاظ کے جو مجازی معنی لیے جاتے تھے، وہ بھی ہمارے ہاں مل جاتے ہیں۔ میں نے جو لغت مرتب کیا اس میں مجھے بڑا لمبا عرصہ لگا تھا۔ میں نے اس میں ان کے لغتوں کی تائید سے قرآن کے ان الفاظ کے لغوی معنی بھی دیئے ہیں اور مجازی معنی بھی دیئے ہیں جو عرب اس کے لیتے تھے یا جو آج ہم لے سکتے ہیں۔ جو مجازی معنی ہیں وہ کسی خاص دَور تک محدود نہیں ہوتے، جوں جوں دنیا میں اور انکشافات ہوتے جائیں گے، انقلاب آتے جائیں، مجازی معنی کی فہرست اور زیادہ لمبی ہوتی چلی جائے گی۔ جو مجازی معنی لیے جاتے ہیں انہیں تو اپنے دَور کی علمی سطح پر سمجھانے سے مراد ہوتی ہے، تو وہاں ان میں مجازی معنی لیے جائیں گے اور چونکہ یہ ایسے الفاظ آئیں گے جس میں، میں نے عرض کیا ہے کہ حقائق Concentrated form میں، مرتکز شکل میں، دیئے گئے ہیں، بیشتر معنی مجازی لیے جائیں گے لیکن میں کبھی کسی کو ذہنی طور پر مجبور نہیں کرتا کہ جو مجازی معنی میں پیش کروں وہ انہی کو قبول کریں لہٰذا جی چاہے ان کو قبول کریں، نہ چاہے نہ کریں۔ لغوی معنی کے اعتبار سے آپ قرآن کا کوئی بھی ترجمہ اٹھا لیں گے اس میں ان کے معنی، لغوی طور پہ دیئے جاتے ہیں۔ وہاں سے بات تو سمجھ میں نہیں آتی لیکن بہرحال جو احباب یہ دیکھنا چاہیں کہ ان الفاظ کے لغوی معنی کیا ہیں تو وہ میرے ہی لغت کے اندر دیکھ لیں وہاں لغوی معنی بھی دیئے ہوئے ہیں یا کوئی ترجمہ قرآنِ کریم کا اٹھا کے دیکھ لیں، اس میں معنی اس اعتبار سے دیئے ہوئے ہیں۔ تو اس لیے جو میں عرض کرونگا وہ میں بیشتر مجازی معنی کے اعتبار سے ہی پیشِ خدمت کرونگا۔ اب اس آرزو اور اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اتنی مہلت دیدے، زندگی بھی دے اور پھر اتنی توفیق اور صحت بھی دے کہ یہ جو دو پارے ہیں میں انہیں اس طرح ختم کرسکوں کہ جس طرح سے میں مطمئن ہوں کہ میں نے بات سمجھا دی ہے یا میں سمجھ گیا ہوا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اب میری عمر اسی (80) سے اوپر جا رہی ہے، بہرحال اس کی توفیق شاملِ حال ہو تو یہ ماہ و سال تو کچھ شے ہی نہیں ہوتے، اس کے ہاں تو ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے تو اگر وہ دن کا کچھ حصہ بھی عمر میں عطا فرما دیں گے تو بہرحال پھر بات بن جائے گی۔

عزیزانِ من! یہ تو تھی مختصر سی تمہید۔ اب سورۃ الملک کی آیت نمبر 1 سے درس شروع ہوتا ہے: (67:1)

لفظ برکت کا قرآنی مفہوم

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ بِیَدِہِ الۡمُلۡکُ (67:1)۔لغوی اعتبار سے اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ملک ہے۔ برکت کا مادہ ''ب رک'' ہے۔اس کے معنی ہوتے ہیں ''کوئی شے جو اپنی جگہ محکم بھی کھڑی ہو اور نشوونما بھی پا رہی ہو' Develop (نشوونما) بھی ہو رہی ہو'' مثلاً درخت۔کونپل سے اس کو شروع کیجیے۔وہ اپنے مقام کے اوپر قائم ہوگا' دائم ہوگا' محکم کھڑا ہوگا۔اگر وہ وہاں سے اکھڑ جائے تو پھر اگلی یہ بات ہے کہ اس میں نشوونما نہیں ہوگی۔اسے محکم رہنا چاہیے کسی خاص وقت تک کے لیے نہیں بلکہ اس وقت تک جب تک اس کی زندگی ہے۔اس کے اندر دو شرطیں ہیں: وہ محکم بھی رہے' اور نشوونما بھی پاتا رہے' نشوونما دیتا بھی رہے' چنانچہ ان عربوں کے ہاں بھی برکت کے یہی معنی تھے۔قرآنِ کریم میں بھی زمین کے متعلق **بٰرَکَ فِیۡھَا** (41:10) کہا ہے۔اب دیکھیے کہ قرآنِ حکیم عربوں کو کس طرح سے بات سمجھا جاتا تھا۔زمین اپنے مقام پہ محکم ہے اور اس میں سے سامانِ نشوونما ملتا چلا جاتا ہے' اس کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔ایک بات اور سن لیجیے شاید وہ پہلے نہیں آئی۔عربی زبان بھی کیا زبان ہے! جو زبان خدا کے فرمان کی متحمل ہو سکے' سوچ لیجیے کہ وہ زبان کیا ہے۔ایک تو اس کا مادہ ہوتا ہے۔''ب رک'' مادہ ہی ہو گیا۔اس مادے کے اندر یہ بنیادی معنی ہوتے ہیں: اس کا قائم اور محکم رہنا' نشوونما پانا' نشوونما دینا۔ان کے ہاں اس مادے کے یہ معنی ہیں' اور آگے چلیے' آپ یہ بات سن کے حیرت میں رہ جائیں گے کہ دنیا کی کسی زبان میں یہ بات نہیں ہوگی۔میں اس زبان کی دوسری خصوصیت عرض کر رہا تھا۔مادے کر آگے چلیے۔آپ نے یہ ''ب رک'' دیکھا کہ یہ مادہ ہے اور عربی زبان کے کسی لفظ میں بھی اگر ''ب'' اور ''ر'' اکٹھا آ جائے تو اس میں نمود اور ظہور اور ظاہر ہونے کے معنی ضرور ہونگے۔کیا زبان ہے! گب H.A.R Gibb [1] نے کہا ہے کہ اس کا ترجمہ کسی بھی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ ساری دنیا کو چیلنج دیجیے کہ وہ برکت کا ترجمہ کر دیں' اس کے لیے کوئی دوسرا لفظ بتا دیں' اس کے لیے Blessing (نعمت) کہہ دینا تو کوئی بات نہیں ہے۔اور یہ بات بھی ہے کہ عربی زبان کے جس لفظ کے مادے کے اندر ''ب'' اور ''ر'' اکٹھی آ جائے گی اس میں ''ظہور اور نمود'' کے معنی ضرور ہونگے۔اور یہ کسی ایک کے لیے نہیں ہے' سب کے متعلق یہی چیز ہے کہ جس لفظ میں یہ دو حرف اکٹھے آ جائیں گے اس کے یہ معنی ضرور ہونگے۔یہ اس حرف کی خصوصیت ہوگی۔یہ ہے وہ زبان جس کی عظمت کی گواہی ایچ۔اے۔آر۔گب بھی دیتا ہے۔تو برکت کے معنوں کے لیے میں نے یہ عرض کیا ہے۔اس طرح وہ ذات اپنے مقام پہ قائم' محکم' غیر متبدل' ہے اور سامانِ نشوونما عطا کرتے جانے والی ہے۔اب یہ دیکھیے:

---

[1] ایچ۔اے۔آر۔گب (H.A.R. Gibb) نے اپنی مشہور کتاب ''اسلام میں جدید رجحانات'' (Modern Trends in Islam) میں یہ کہا تھا۔ (ملاحظہ ہو اس کتاب کا ص:4)

بِيَدِهِ الْمُلْكُ (67:1) ملک اقتدار کو کہتے ہیں' اتھارٹی کو کہتے ہیں' پاور کو کہتے ہیں' قوت کو کہتے ہیں' حکمرانی کو کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ کلی اقتدار اس کے ہاتھ میں ہے

قرآنِ حکیم نے احکامات کے بالمقابل اصولوں کی زیادہ بات کی ہے

عزیزانِ من! ایک اور بات سمجھ رکھیے۔ خدا آپ کو توفیق دے تو کہیں نوٹ کرتے چلے جایئے' پتہ نہیں پھر یہ موقعے آئیں گے یا نہیں آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت تھوڑے سے احکام قرآنِ کریم میں احکام کی شکل میں دیئے ہیں' باقی صرف اصول دیئے ہیں اور وہ اصول ایسے ہیں کہ آپ ان سے اپنے ہاں کا نظام' نظام کا آئین' اس آئین اور دستور کے احکام' ان اصولوں سے مرتب کر سکتے ہیں۔ قرآن نے خود کہا ہے کہ جو ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کریں انہیں کافر کہتے ہیں تو وہ یہی نہیں ہے کہ جو احکام کی شکل میں اس نے کہا ہے وہی چیزیں ہیں جو فیصلے کرنے کی ہیں' جو بات اس نے اصول کی شکل میں کہی ہے اگر اس کے بھی خلاف کوئی چلے جا رہے ہیں تو وہ اسلامی مملکت' اسلامی نظام یا اسلامی قانون نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اگر وہ قرآنِ کریم کے کسی اصول سے بھی ٹکرائے تو وہ اسلامی نہیں ہے۔ [1] آپ احباب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے کچھ یہ چیز بھی شروع کی ہے کہ قرآن کے اصولوں سے کس قسم کا آئین' کس قسم کا نظام' کس قسم کے قانون' مرتب ہوتے ہیں۔ یہاں اصول کیا ہے؟ کہ اس کے ہاتھ میں اقتدار ہے اور اقتدار اسی لیے ہے کہ سب کو سامانِ نشوونما مہیا ہوتا رہے' لہٰذا اسلامی نظام کا اصول ہوگیا کہ وہی اقتدار اسلامی ہے جو خیر و برکت کا موجب ہو یعنی سامانِ نشوونما باہم پہنچاتا ہو' Development (نشوونما) کرتا ہو' خیر ہو' برکت ہو۔ وہی نظام' وہی اقتدار' اسلامی کہلا سکتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں صفاتِ خداوندی کا عکس

عزیزانِ من! اس اصول سے یہ چیز مستنبط ہوگئی کہ اسلامی یا خداوندی نظام اس کو کہیں گے جس میں علیٰ حدِ بشریت صفاتِ خداوندی کی جھلک اور عکس ہو۔ بہرحال' خدا نے جو اپنے متعلق صفات بیان کی ہیں تو یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی اپنی تعریف کرا رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ ہم ایسے ہیں' ہمارے وہ بڑے ایسے ہیں (معاذ اللہ)۔ یہ جو صفاتِ خداوندی بتائی جا رہی ہیں ان کا ہماری زندگی پہ عملی اثر یہ ہے کہ جو ہمارے ہاں نظام قائم ہو' جو زندگی ہم بسر کریں' وہ زندگی اس قسم کی ہونی چاہیے۔ یہ جو اس نے صبغۃ اللہ کہا ہے وہ خدا کا رنگ ہے' اُس رنگ میں رنگے جانے کے تو معنی یہ ہوتے ہیں کہ آپ کے پہلے کپڑے کے اوپر جو بھی رنگ ہو' وہ باقی نہ رہے' وہی ایک رنگ باقی

---

[1] ان نکات کی مزید تشریح کے لیے انگریزی زبان میں یہ پمفلٹ ملاحظہ کیجیے:

Prof. Dr. Manzoor-ul-Haque (Compiled): Quranic Constitution in an Islamic State: The Basis of Legislation and Outlines of the Constitution, Idara Tolu-e-Islam (Regd), Lahore, October, 2002.

رہے، جس میں اسے رنگنا ہے۔ اسے توحید کہتے ہیں۔ یہ رنگ کیا ہے؟ یہ رنگ کہاں سے ملے گا؟ خدا نے جو کچھ قرآن میں اپنے متعلق کہا ہے ان سے یہ رنگ مستنبط ہوگا۔ اس نے یہ کہا ہے کہ اس کے ہاتھ میں اقتدار ہے، اور اقتدار محکم ہے، وہ اپنے مقام پہ قائم ہے۔ اس کے اقتدار کا مقصد یہ ہے کہ وہ سامانِ نشوونما اور Development (نشوونما) کی چیزیں مہیا کرتا چلا جائے۔ یہ اصول قائم ہوگیا، ہمیں اسلامی نظام، اسلامی قانون کا یہ رنگ مل گیا کہ وہ نظام محکم ہونا چاہیے، اپنے مقام کے اوپر قائم ہونا چاہیے لیکن اس کا مقصد سامانِ نشوونما مہیا کرنا ہوگا جبھی وہ جو پہلا ہی قرآن کے اندر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1) ہے، وہ قرآن کا ایک اصول ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہی نظام قابلِ حمد وستائش ہے جو ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ دار ہو۔

حمد کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ بات نہیں کہ خدا نے کہا ہے کہ سب تعریف خدا کے لیے ہے۔ جو رب عالمین ہے، سب تعریف خدا کے لیے ہے کے کیا معنی ہوئے؟ یہ عربی زبان سے پوچھیے کہ ''حمد'' کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ پھر پتہ چلتا ہے کہ قرآنِ حکیم کیا کہہ گیا ہے۔ یہ ایک اصول دیا ہے کہ جو حمدیت ہے وہ اسی نظام، اسی قانون، اسی اصول، اسی دستور کے لیے ہے جو رب العالمینی کی شرط پوری کرتا ہو۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن میں یہ چیزیں، جو بظاہر خدا کی صفات کے طور پہ دی ہوئی ہیں، کتنی عظیم حقیقتیں اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اس سے تو آپ کے ہاں کے نظام کی، دستور کی، حکومت کی، مملکت کی، زندگی کی، پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس لیے کہا کہ تَبٰـرَکَ الَّـذِیْ بِیَـدِهِ الْـمُـلْکُ (67:1) وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں تمام کائنات کا اقتدار ہے وہ از حد فراوانیوں اور خوشگواریوں کی مالک اور ثبات واستحکام اور نشوونما عطا کرنے کی ضامن ہے۔ اسی لیے وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (67:1) ہر شے کے لیے اپنے Measures یعنی پیمانے، قوانین، مقرر کردیئے ہوئے ہیں۔ یہ اس سورۃ کی پہلی ہی آیت ہے۔ یہ وہی ہے کہ ہر شے اب نشوونما پا رہی ہے۔ یہ Development (نشوونما) کے لیے ہے۔ نشوونما کے لیے کوئی دوسرا لفظ ہمارے ہاں ابھی ہے نہیں، اور یہ لفظ بھی اگر خالصتاً اس اصطلاح میں لیا جائے جس میں Development (نشوونما) کی اصطلاح آتی ہے تو وہ تو ٹھیک ہے ورنہ انگریزی زبان کے اندر بھی Development، آپ سمجھتے ہیں کہ کس کس معنے میں ہوجاتا ہے مثلاً اسے ابھی تک Develop (دھو) نہیں کیا، اسے Develop (دھویا) کردیجیے۔ یہ تصویریں Develop کرتے پھرتے ہیں۔ تو اس کے لیے یہ چیز ہے یعنی اس نے پیمانے اور قوانین مقرر کیے ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق یہ کچھ ہوتا چلا جائے گا۔ اب رہی یہ بات کہ اس بات کا ٹیسٹ کیا ہے کہ واقعی Development (نشوونما) ہو رہی ہے۔ یاد رکھیے، کائنات کی جو باقی اشیاء ہیں ان کی تو صرف Physical یا طبعی زندگی ہے، ان کی نشوونما تو دیکھی جاسکتی ہے، محسوس ہوتی ہے۔ پودا اگ رہا ہے یا نہیں اس میں پھل آ رہا ہے یا نہیں، بچہ تندرست وتوانا ہے یا نہیں، بڑھ رہا ہے یا نہیں، کسی مقام پہ بھی اگر کچھ

وقت کے لیے اسکا قد رک جاتا ہے' بڑھنا رک جاتا ہے' تشویش پیدا ہوجاتی ہے یعنی یہ Development (نشوونما) وہ ہے' یہ نشوونما یعنی Growth وہ ہے جو محسوس شکل میں سامنے آجاتی ہے' دیکھی جاسکتی ہے۔ انسان کا جسم بھی اسی سے متعلق ہے' طبعی جسم ہے' طبعی نشوونما ہوتی ہے' تندرست ہے' توانا ہے' صحت ہے' وہ قد کے اعتبار سے بھی بڑھ رہا ہے' توانائی بھی اس میں آ رہی ہے۔

حیاتِ انسانیت کا دارومدار نفس انسانی کی نشوونما کا رہین منت ہے

عزیزانِ من! یہ تو ہوئی ایک بات لیکن انسان صرف طبعی زندگی کا نام نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اندر ایک اور چیز بھی ہے جس کے لیے قرآن کا تو لفظ ''نفس'' ہی ہے جسے ذات' خودی' Personality' (شخصیت) Individuality (انفرادیت) کہتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی نام بھی وہ Concept (تصور) نہیں دے سکتا جو ''نفس'' کا ہے۔ انسان انسانیت کے درجے میں آتا ہی اس ''نفس'' کی رو سے ہے۔ Physical Body (طبعی جسم) کے اعتبار سے تو یہ حیوانات کے زمرے میں آتا ہے۔ انسان کے اندر وہ شے ہے جس کی Development (نشوونما) کے لیے یہ صفاتِ خداوندی ہیں۔ ان صفات کو آپ Permanent Values یا مستقل اقدار کہیں گے۔ یہ ان سے نشوونما پاتا ہے۔ قرآن کے ایک اصول کی رو سے انسان کا جسم ہر اس شے سے نشوونما پاتا ہے جو وہ لیتا ہے' کھاتا ہے مگر انسان کی ذات اس شے سے نشوونما پاتی ہے جو وہ دوسروں کی بہبود کے لیے دیتا ہے۔ اب وہ جو شے اندر ہے وہ دیکھی نہیں جاسکتی' محسوس نہیں کی جاسکتی' دوسرا انہیں محسوس کرسکتا' خود اگر انسان کی اپنی آنکھیں ہوں' بصارت ہی کی نہیں بلکہ بصیرت کی آنکھیں بھی ہوں' تو وہ اپنے متعلق تو محسوس کرسکتا ہے کہ کس حد تک وہ ذات نشوونما پاچکی ہے۔ قرآن نے جو مومنین کے خصائص بتائے ہیں' خصوصیات بتائی ہیں' وہ حقیقت میں اس کی ذات ہی کی نمود ہے' اس ہی کا ظہور ہے' اس کے شواہد ہیں جس کو اس نے بیان کیا ہے' مثلاً اگر اس نے مومن کے متعلق کہا ہے کہ وہ خود تنگی میں بھی گزارا کرلے گا دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پہ ترجیح دیدے گا۔ یہ انسان کے جسم کے بس کی بات نہیں ہے' یہ اس چیز کے بس کی بات ہے جسے اس نے نفس کہہ کر پکارا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ مومن وہ ہے کہ جو یہ کرے اور بطیبِ خاطر کرے اور اس میں اس کو خوشی محسوس ہو کہ خود تنگی میں رہا ہے' دوسرے کی ضرورت جو اس سے زیادہ تھی' اس کو اس نے پورا کردیا ہے۔ یہ کونسی چیز ہے جو یہ فیصلہ کرے گی۔ اس کے لیے' جسم تو اس کا فیصلہ کر نہیں سکتا۔ انسانی جسم کی نشوونما تو Instinct (جبلت) جسے حیوانات کی جبلت کہتے ہیں اس پہ پاتی ہے۔ کوئی حیوان بھی اپنی زندگی کے اوپر دوسرے کو ترجیح نہیں دے گا' انسان بھی' جب جسمانی سطح پہ ہوگا' حیوانی سطح پہ ہوگا' تو اس کی بھی یہی کیفیت ہوگی بلکہ یہ تو لوٹتا کھسوٹتا چلا جائے گا۔ اس کے برعکس بیل کا پیٹ بھر جاتا ہے تو باقی چارے کے متعلق اس کو پرواہ نہیں ہوتی کہ کوئی دوسرا بیل کھا جاتا ہے یا کون لے جاتا ہے' وہ بڑے مزے میں بیٹھا ہوا' آنکھیں بانگے کیے ہوئے' جگالی کرتا ہے۔ یہ یہی حیوان ہے کہ اس کی ضرورت تو دو روٹیوں کی ہے لیکن ساری عمر اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ حیوان میں یہ ہوس نہیں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ جب یہ گرتا ہے تو یہ حیوانات سے پست ترین درجے میں جاتا ہے۔ انسانیت کا درجہ وہ ہے جس کے

ماپنے کا پیمانہ وہ صفات ہیں جو قرآن نے مومن کی صفات گنائی ہیں: تکریم انسانیت یعنی کسی انسان کی بلالحاظ اس امر کے کہ وہ رنگ، نسل، زبان، عمر، مذہب، دولت، منصب کے اعتبار سے کیا ہے، محض انسان ہونے کی حیثیت سے ہر انسان کی عزت کرنا، تکریم کرنا، یہ نفسِ انسانی کا خاصہ ہے، جسمِ انسانی کا نہیں۔ جسمِ انسانی میں تو جو تگڑا ہوگا، وہ غریب کو دبا لے گا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کے پیغام کو سمجھنے کے لیے یہ چیزیں ہیں، یہ سمجھنی ضروری ہیں۔

اب اس نے یہ کہا ہے کہ کیسے معلوم ہو کہ یہ نشوونما پاتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی ہیں؟ اس کے لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اَلَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا (67:2) تم اپنے آپ کو ٹیسٹ کر سکو کہ تمہاری ذات کس حد تک نشوونما پا چکی ہے، اس کے لیے اس نے یہ کہا ہے کہ اس زندگی کے بعد کی زندگی میں کیفیت یہ نہیں ہوگی کہ جسمانی طور پر جو پہلوان ہوگا وہ وہاں بڑا تگڑا ہوگا، نہیں بلکہ جس کی ذات نشوونما پا کے اس معیار تک پہنچ چکی ہوگی کہ وہ اس منزل سے اگلی منزل میں پہنچنے کے قابل ہو گئی ہو یا وہ یہ صلاحیت رکھتی ہو تو وہ اگلی منزل میں چلی جائے گی، جسے قرآن جنت کی زندگی کہتا ہے اور اس کے برعکس یہاں جس ذات کی نشوونما رک گئی ہوگی، وہ اگلی زندگی میں وہیں کھڑی ہو جائے گی، آگے نہیں جا سکے گی، اسے جہنم کی زندگی کہا گیا ہے۔ جہنم کے معنی ہی روک دینے والی چیز ہیں جو کسی کو آگے نہ بڑھنے دے۔

موت کا ذائقہ انسانی ذات کی کامرانی اور نشوونما کا پیمانہ ہے

عزیزانِ من! موت وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان اپنا یہ ٹیسٹ کر سکتا ہے کہ میری ذات کی اتنی نشوونما ہو چکی ہے یا نہیں کہ میں اگلے درجے میں Promote (ترقی پانا) کیا جا سکوں۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر اسکولوں یا کالجوں کے اندر امتحان نہ ہوں تو دوسروں کو پتہ ہی نہ چل سکے، خود طالب علم کو بھی پتہ نہ چل سکے کہ وہ کتنا قابل ہو گیا ہے۔ امتحان کو ٹیسٹ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اس طالب علم کی قابلیت کا ٹیسٹ ہوتا ہے۔ انسان کی ذات کی Development (نشوونما) کا، جسے آپ ٹیسٹ کہیں گے، وہ ٹسٹ ایک چیز ہے جس کا نام موت ہے جس سے یہ چیز ہویدا ہوگی۔ یہاں کہا کہ خدا نے موت اور زندگی کو الگ الگ پیدا کیا۔ اس آیت میں اگلی چیز لِیَبۡلُوَکُمۡ (67:2) ہے۔ اس کا عام ترجمہ کرتے ہیں ''تا کہ اللہ آزمائے۔'' تو کیا اللہ کو بھی آزمانے کی ضرورت ہے؟ آزماتا تو وہ ہے جسے خود اس کے متعلق معلوم نہ ہو۔ کسی دوست سے کوئی بہت بڑی چیز کہنا کہ صاحب! مجھے ضرورت ہے، میری یہ مدد کرو۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد وہ آخر میں کہے گا کہ ''میں تے تینوں ایویں ازماندا ساں پیا۔ اوکی خیال اے پئی اللہ میاں وی ازماندے رہندے نیں بیٹھے ہوئے۔''[1] خدا آزماتا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ابتلا کا یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور ابتلا تو مصیبت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

---

[1] میں تو آپ کو ایسے ہی آزما رہا تھا۔ ارے کیا خیال ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ بھی بیٹھے ہوئے آزماتا رہتا ہے۔

عربی مبین میں ابتلا کے معنی ہوتے ہیں 'پہلو بدلنا' گردش کرنا تاکہ کوئی اپنے آپ کا ٹیسٹ کر سکے۔'' خدا اسے ٹیسٹ نہیں کرتا بلکہ انسان خود اپنا ٹیسٹ کر سکے۔ امتحان میں جو لڑکے کا ٹیسٹ لیا جاتا ہے' وہ یہ نہیں ہے کہ کوئی پروفیسر ٹیسٹ کرتا ہے۔ وہ لڑکا خود اپنا ٹیسٹ کر رہا ہوتا ہے کہ مجھ میں کتنی قابلیت آ گئی ہے۔ موت اور زندگی' بظاہر بڑی متضاد چیزیں نظر آتی ہیں لیکن یہ تو اصول ہے' یہ جو Scientific Progress (سائنسی ترقی) والے ہیں وہ بھی بتاتے ہیں کہ ٹکراؤ سے انسان کی توانائیاں بڑھتی ہیں' ٹکراؤ نہ ہو تو اُن کی نمود ہی نہیں ہوتی۔ ٹیسٹ کے لیے بھی وہ ٹکراؤ والی بات ہوتی ہے۔ وہ بڑی ضروری چیز ہوتی ہے۔ یہ مختلف قسم کے جن کو بظاہر ہم تضادات کہتے ہیں' وہ Conflicts (تصادمات) ہوتے ہیں' جن سے ٹکراتے ہوئے انسان یہ دیکھتا چلا جاتا ہے کہ میں کتنا بڑا ہوں۔ جسمانی طور پہ بھی جب تک آپ کسی چیز سے ٹکرائیں نہیں تو اس وقت تک معلوم ہی نہیں ہوسکتا۔ بوڑھے پہلوان کو کسی نے کہا تھا کہ بڑے میاں! اب وہ بات نہیں رہی جو جوانی میں تھی۔ کہنے لگے کہ نہیں صاحب! اب بھی ہماری وہی بات ہے' کچھ کمی نہیں ہوئی۔ کہنے لگے: کیسے؟ کہا کہ ابھی میں تجھ کو دکھائے دیتا ہوں۔ کہنے لگے: چلو۔ اکھاڑے کے کنارے پہ ایک بہت بڑا پتھر رکھا ہوا تھا۔ یہ گئے۔ بڑے میاں اکھاڑے میں اترے۔ اس پتھر کے اوپر یہ کیا' اور اُدھر سے زور لگایا۔ وہ ہلا ہی نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے: دیکھا بڑے میاں! نہیں ہلا۔ کہنے لگا: ٹھیک ہے جوانی میں بھی نہیں ہلا کرتا تھا' اب بھی نہیں ہلا۔ ایک ٹیسٹ یہ بھی ہوتا ہے' مگر یہاں قرآن کہتا ہے کہ **لِيَبۡلُوَكُمۡ** (67:2) خود انسان کی طبعی موت بھی اس کی ذات کی صلاحیتوں کے پرکھنے کی کسوٹی ہے۔

عزیزانِ من! موت تو عجیب چیز ہے۔ ایک تو موت کا انداز ہی ایسا ہے مگر وہ اپنے انداز کی بات ہے جو غالب [1] (1797-1869) کہہ گیا ہے کہ

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟

یہ غالب بھی عجیب شخص تھا: بھاگ دوڑ' جدوجہد' یہ لے' وہ کر' یہ بنا' اور ایک بزنس کا ٹھیکہ لے لے۔ وہ یہ سارا کچھ کہتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ یہ پتہ ہے کہ کل کو مر جانا ہے۔ اگر پتہ ہو کہ اللہ کی طرح مرنا ہی نہیں ہے تو پھر اس جلدی کا سوال ہی نہیں ہے۔ پھر تو ٹھیک ہے کہ او کرلواں گے' کیہڑی جلدی پئی ہوئی ہیگی۔ یہ جو جلدی پئی ہوئی ہوندی ہیگی اے' یہ موت کی وجہ سے ہے۔ [2] اور یہ ہے جسے ہوس کہا جاتا ہے: یہ بھی لو' اور وہ بھی لو۔ اب یہ شعر پھر دہرائیے اور پھر میری طرح اس سے لذت لیجیے کہ

---

[1] غالب: مرزا اسد اللہ خان: دیوانِ غالب' جہانگیر بک ڈپو' لاہور' 2002ء۔ ص 38

[2] کرلیں گے' کونسی جلدی پڑی ہے۔ یہ جو جلدی پڑی ہوتی ہے یہ موت کی وجہ سے ہے۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟ ❶

لیکن یہاں جو قرآن کہتا ہے، وہ ہوس کے لیے نہیں کہتا۔ وہ تو چیز ہی کچھ اور ہے۔ وہ تو جیسے محسوس ہو کہ مجھ میں اتنی قابلیت آ گئی ہے اور امتحان یا ٹیسٹ ہوا تو میں اگلی کلاس میں پروموٹ ہو جاؤں گا، اس کی تو کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اس کے برعکس دوسرے لڑکوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ امتحانات ہی Post pone (ملتوی) ہو جائیں۔ یہ سب نالائق ہوتے ہیں۔ جنہیں پتہ ہے کہ اگر ٹیسٹ ہوا تو ہم فیل ہو جائیں گے، اور جس طالبعلم کو یقین ہو کہ میں نے پروموٹ ہونا ہے، وہ تو تقاضا کر کے بھی کہے گا کہ خدا کے لیے کل کیوں لیتے ہو، آج لیجیے۔ اس کو اپنی قابلیت پر یقین ہے۔ جس کو یہاں یہ یقین ہوتا ہے وہ موت کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتا ہے:

موت کا مرحلہ انسانی زندگی کو حسین ترین منزل سے متعارف کرانے کا ذریعہ ہے

عزیزانِ من! وہ کامیاب طالبعلم بھاگا ہوا گھر آئے گا کہ میں پاس ہو گیا، مجھے پروموشن مل گئی۔ اس کے لیے موت تو یہ کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ کاہے کے لیے یہ موت ہے؟ **لِيَبْلُوَكُمْ** (67:2) ہم پہلو بدلتے ہیں، مواقع بہم پہنچاتے ہیں، گردش دیتے ہیں، آپ اس کے کچھ معنی کیجیے۔ یہ گردش اس لیے دیتے ہیں کہ دیکھیں کہ **اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا** (67:2) تم کس قدر عمدہ عمل کرتے ہو۔ کیا ایک لفظ کہہ گیا صاحب! اب لفظ یہ ہے کہ تم نے زندگی میں کس قدر احسن عمل کیا۔ یہ عملِ احسن کیا چیز ہے؟ جس مقصد کے لیے انسان کو پیدا کیا ہے یہ لفظ اس کے لیے آیا ہے۔ سورۃ التین میں کہا تھا کہ **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ٥ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ** ❷ (95:4-5)۔ عزیزانِ من! انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مگر اس کو احسن تقویم میں پیدا کیا گیا تھا۔ اب میں اس احسن کا کیا ترجمہ کروں۔ یہ حسن کی بلند ترین ڈگری ہے، جسے آپ انتہائی حسن کہہ سکتے ہیں لیکن یہ حسن جسم کا نہیں ہے، اگرچہ وہ بھی قابلِ نفرت شے نہیں لیکن یہ حسن تو انسانی ذات کا حسن ہے، اور حسن تو نام ہی صحیح Proportion (تناسب) اور توازن کا ہے۔

---

❶ غالب، مرزا اسداللہ: دیوانِ غالب، جہانگیر بک ڈپو، لاہور، 2002ء، ص۔ 38

❷ یہ (حق و باطل کی) کشمکش اس لیے ہوتی ہے کہ ہم نے انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی ہے کہ یہ اپنی ذات کی نشو ونما کر کے حسن کارانہ انداز سے بہترین توازن کی زندگی بسر کرے لیکن اس کی انفرادی مفاد پرستیاں اسے حیوانی زندگی کی پست ترین سطح پر لے جاتی ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ذاتِ انسانی کا مقام صرف حسن تک محدود نہیں بلکہ احسن کے مقامِ بلند تک کا ہے

جب آپ اس کو حسن کی بجائے احسن کہیں گے تو پھر تو پوچھیے نہیں کہ وہ کیا ہو جائے گا۔ تو مقصود یہ تھا کہ انسان ایسی زندگی بسر کرے کہ اس کی ذات ❶ احسن ہو جائے لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کم بخت اپنے آپ کو گراتا ہے تو پست سے پست تر درجے میں چلا جاتا ہے جو ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ حیوان سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ تو جو احسن ہونا ہے یہ Balanced Personality (متوازن شخصیت) کی سی ایک دوسری چیز ہے۔ اگر آپ اسے Balance یعنی متوازن کہیں گے تو پھر احسن کے لیے کیا لفظ لائیں گے۔ یہ انگریزی زبان کے لفظ Beauty (خوبصورتی) وغیرہ سے وہ بات نہیں بنتی۔ اس کے اندر دراصل مقامِ احسن میں یہ دیکھنا ہے کہ اس نے زندگی میں جو عمل احسن کیا ہے' کیا اس نے اس کو احسن بنایا ہے یا نہیں؟ چنانچہ انسان سے خدا کا مقصود و مطلوب یہ تھا کہ تیری زندگی احسن ہو جائے۔ یہ وہی ہے جو اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے۔ کیا بات یہ شخص کہہ جاتا ہے! اس نے قرآن کے متعلق کہا ہے کہ قرآن کرتا کیا ہے:

آں چہ حق می خواہد آں سازد ترا

جو خدا چاہتا ہے کہ تو اس قسم کا بن جائے تو قرآن تمہیں اس قسم کا بنا دیتا ہے۔ بات تشریح میں آنے کی نہیں تھی کیونکہ اگر آپ حسن کی تشریح کریں گے تو آپ پھول کی پتی کو مسل کر رکھ دیں گے۔ یہ تو صرف Appreciate (بنظر تحسین دیکھنا) کرنے کی چیز ہوتی ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کا بھی کمال یہ ہے کہ اس نے تجزیہ نہیں کیا' اس کا Analysis (تجزیہ) نہیں کیا' بلکہ صرف یہی کہا کہ قرآن کیا کرتا ہے' کرتا یہ ہے کہ

آں چہ حق می خواہد آں سازد ترا

اور حق کیا چاہتا ہے؟ حق چاہتا ہے: احسنِ تقویم۔ کہا ہے کہ یہ جو موت اور حیات ہے اس کا تضاد اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ تمہیں ایسے مواقع میسر آ جائیں کہ تم وہ کچھ بن جاؤ جو کچھ بنانا خدا کا مقصود تھا۔ خدا نے بنا بنایا ہوا انسان نہیں دیا' جس طرح سے اس نے طبعی زندگی میں یہ جو جنین ہوتا ہے وہ جب رحمِ مادر میں ہوتا ہے اس کو تو چھوڑ دیجیے جب بچہ بھی پیدا ہوتا ہے تو وہ بنا بنایا ہوا' نشو و نما یافتہ' بڑا انسان تو نہیں ہوتا' وہ تو ایک ہیولے کی شکل کے اندر ایک انسان سا ہوتا ہے لیکن اس میں انسان بننے کی صلاحیتیں اور استعداد رکھ دی جاتی ہیں کہ اس کی مناسب نشو و نما ہوتی چلی جائے تو وہ بڑھتا پھولتا پھلتا جوان ہوتا' بڑا ہوتا' انسان بن جاتا ہے۔ یہی چیز انسان کی ذات کی ہے۔ اس کو Undeveloped (غیر نشو و نما یافتہ) شکل کے اندر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن نے جو راہنمائی دی ہے' اگر اس

---

❶ اقبال کے الفاظ میں: ''پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی''

کے مطابق زندگی بسر کرو گے تو پھر جو تمہاری Undeveloped (غیر نشوونما یافتہ) صلاحیتیں ہیں وہ Develop (نشوونما یافتہ) ہو جائیں گی اور اس کے لیے جو معیار ہے وہ وہی احسن ہونا ہے۔ وہ حسین تک بھی نہیں محدود رکھتا وہ تو تمہیں احسن بنانا چاہتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک عزت کا مفہوم

اس احسن بننے کے لیے پھر دو چیزوں کی ضرورت آ گئی۔ میں نے کہا ہوا ہے کہ آیت کے آخر میں جو خدا کی دو صفتیں آتی ہیں وہ آیت کا جو مفہوم ہے وہ اس کی وضاحت نہایت بے تابی سے کر دیتی ہیں۔ اس کے لیے وہ دو چیزیں چاہئیں اور وہ ہیں: **وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ** (67:2)۔ اس کے لیے خدا کی ایک صفت تو عزیز ہے۔ آپ کو معلوم ہے اور میں نے کہا تھا کہ عزت کے معنی یہ نہیں جو ہمارے ہاں عزت ہوتی ہے۔ وہ ہمارے ہاں والے تو گاؤں کے لوگ یا عام بازاری سے لوگ بھی ہیں۔ غصہ چڑھا، اس کو گالی دے رہے ہیں۔ کہنے لگے: کیا ہوا؟ کہنے لگا: اپنے میری بے عزتی خراب کردتی ہے، بے عزتی خراب کردتی ہے، نہیں سمجھے[1] عزیزانِ من! عربی زبان میں عزت کے معنی یہ نہیں ہوتے۔ اس کے معنی غلبہ ہوتے ہیں، قوت ہوتی ہے، تسلط ہوتا ہے۔ اب اس قسم کی زندگی کے لیے جو حسن پیدا کر دے اسے دو چیزوں کی ضرورت ہے: قوت کی ضرورت ہے، غالب آنے کی ضرورت ہے، ہر جگہ مار کھانے کی ہی بات نہیں ہوتی مگر ہمارے ہاں تو کہتے ہیں کہ ہو جا ککھ میست دا۔[2] یہ بات نہیں ہے۔

غلبہ اور حفاظت کے ملاپ کا نام ہی اسلامی نظام ہے

عزیزانِ من! اس سوکھ کر لاغر و نزار ہونے میں تصوف ہے، ویدانت ہے۔ اس میں فلسفہ یہ ہے کہ ضعیف سے ضعیف تر کرتے چلے جاؤ۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم انسان کو قوی سے قوی تر کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ اس کو اعلون بناتا ہے۔ خدا عزیز ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا غلبہ ہے۔ وہ غفور ہے۔ یوں کہیے کہ غریبوں کی، کمزوروں کی، ضعیفوں کی، حفاظت کرتا ہے۔

عزیزانِ من! غلبہ اور حفاظت اکٹھے ہو جائیں تو اسلامی نظام بن جاتا ہے، ورنہ دوسرے کو کچلنے کے لیے غلبہ تو چنگیز اور ہلاکو بھی حاصل کر لیتے ہیں، ہر آمر حاصل کر سکتا ہے۔ عزیز کے ساتھ غفور ہونا اسلامی نظام کے لیے ضروری ہے۔ جس طرح ملک کے ساتھ برکت ہونا ہے، اسی طرح عزیز کے ساتھ غفور ہونا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ صفاتِ خداوندی کاہے کے لیے دی ہوئی ہیں؟ خدا اپنا تعارف نہیں کرا رہا کہ ہم ایسے ہیں، اور ہم ایسے ہیں۔ اس سے ہی انسانی ذات کی نشوونما ہوگی، اتنی قوت ہوگی کہ مظلوم کی حفاظت کے لیے ظالم کی کلائی مروڑ سکے اور اگر مظلوم کی کلائی مروڑے گا تو پھر وہ درندہ ہو جائے گا، مومن نہیں ہوگا اور اگر دوسرے کی کلائی مروڑنا تو ایک طرف رہا، اپنی

---

[1] اس نے میری بے عزتی خراب کر دی ہے۔ (ہاں) بے عزتی خراب کر دی!! کیا نہیں سمجھے آپ!

[2] سوکھ کر لاغر و نزار ہو جا۔

بھی حفاظت نہ کر سکے تو پھر وہ تو حیوان بھی نہیں ہوتا۔ یہاں "**اَلۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ**" (67:2) آیا ہے یعنی خدا اپنے تمام پروگرام پر غالب ہے اور اُسے ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہی صفات مومن میں ہوتی ہیں۔

ہم نے قرآنِ حکیم کی طرز پر خارجی کائنات کو بطور شہادت پیش کرنا چھوڑ رکھا ہے۔

عزیزانِ من! اب بات آگے آتی ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ جو حقائق بیان کرتا ہے' ان کی شہادت کے لیے خارجی کائنات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اب جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ جب سے ہم نے قرآن کے نظام کو چھوڑا ہے' اس کے آئین کو چھوڑا ہے' اس کے حقائق کو چھوڑا ہے' اس کی تعلیم کو چھوڑا ہے تو اس وقت سے وہ جو یہ شہادتیں پیش کرتا ہے' وہ بھی ہمارے لیے بے معنی ہو گئیں ہیں کیونکہ یہ شہادتیں تو انہیں کام دیتی ہیں جو ان چیزوں کی Scientifically (سائنسی) تحقیق کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ ہماری جو زندگیاں ہیں وہ ایک پرانے شعر پر فٹ بیٹھتی ہیں:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

لیکن مومن کی یہ کیفیت نہیں ہوتی اس کے برعکس اس میں یہ صفت ہوتی ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان

عزیزانِ من! زندگی کے حقائق کو سمجھنے کے لیے خارجی کائنات کو دیکھیے۔ اس کے لیے کہا کہ **اَلَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا** (67:3) ہم نے اس فضا کی پہنائیوں میں مختلف کرّے پیدا کیے ہیں۔ اب یہاں لفظ "طباق" آیا ہے۔ اس کے معنی عام ترجمے یوں کر جائیں گے: اوپر تلے' ایک کے اوپر دوسرا۔ یہ اس کے بنیادی معنی نہیں ہوتے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں: "وہ چیزیں جو کسی ایک قانون کے تابع سرگرمِ عمل ہوں' ان کا ایک اصول ہو' وہ ایک دوسرے کے ساتھ بنیادی طور پر مطابقت رکھتی ہوں' مثلاً بجلی یا Electricity کا ایک بنیادی اصول ہے: جتنی چیزیں بجلی سے چلیں گی اُن کی ایک دوسرے سے اس اصول کے اعتبار سے مطابقت ہو گی۔ یہاں قرآن سبع کہہ جاتا ہے۔ وہ ان کی تعداد نہیں بتاتا۔ اس کے معنی سات نہیں بلکہ "بکثرت" کے ہیں' یعنی کُرّے بکثرت ہیں لیکن جس بنیادی اصول کے مطابق وہ کارفرما ہیں' وہ مصروفِ حرکت ہیں' ان میں ایک دوسرے سے مطابق ہے' اور یہ اسی مطابقت کے اوپر یقین تھا جو زمین پہ تجربے کرنے کے بعد یہ لوگ چاند پہ بھی چلے گئے۔ تو جو اصول یہاں کارفرما ہے' وہی اصول وہاں کارفرما ہے' شکل بدلے گی' ہئیت بدلے گی' حرکتوں میں فرق آ جائے گا لیکن بنیادی اصول وہی ہے جو یہاں ہے' چنانچہ ہر کُرّے کے اندر بنیادی اصول وہی کارفرما ہے جو ایک کُرّے کے اندر ہے۔ اس لیے "طباقاً" کے معنی ہیں: باہمدگر ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ اور اس کے

بعد قرآن کی جو آیات آ رہی ہیں، خالص ادب کے اعتبار سے بھی، وہ قرآن کی حسین ترین آیات میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس وجد آفریں انداز سے Describe (بیان) کیا ہے کہ اگر انسان ان الفاظ پہ یا اس انداز پہ اور اس اسلوب پہ غور کرے Appreciate (بنظر تحسین دیکھنا) کرے تو وجد میں آ جاتا ہے۔ میں نے اپنے مفہوم القرآن میں اپنی استعداد کے مطابق ادبی انداز سے ہی ان آیات کا مفہوم لکھا ہے۔ پہلے میں یہ آیات پڑھنے کے بعد مفہوم القرآن آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں وہاں سے بات بھی سمجھ میں آ جائے گی۔

کائنات میں بکھرے ہوئے ان گنت کُرّوں کے مابین باہمی ربط کی کیفیت

یہ کہا کہ **مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ۵ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ہَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ۵ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّہُوَ حَسِیۡرٌ** (67:3-4) (اگر تم دیکھنا چاہو کہ اس کا پروگرام کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے اور اس کی صفاتِ ربوبیت اور حفاظت (رحمت وقدرت) کس حسن و خوبی سے بیک زمان کارفرما ہیں تو کائنات کی اس عظیم القدر مشینری پر غور کرو) اس نے فضا کی پہنائیوں میں مختلف کروں کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ (ان میں باہمی تصادم نہیں ہوتا) تم یہاں سے وہاں تک دیکھ جاؤ، تمہیں خدائے رحمٰن کی تخلیق کردہ کائنات میں کہیں بے ترتیبی یا عدمِ تناسب نظر نہیں آئے گا۔ تم ایک بار نہیں، بار بار نگاہ کو لوٹا کر دیکھو، خوب جانچ پڑتال کر کے غور کرو، تمہیں کہیں کوئی دراڑ یا درز دکھائی نہیں دے گی۔ کوئی شے بے جوڑ یا ان مل نہیں ہوگی۔ تم طائرِ نگاہ کو فضا کی پہنائیوں میں بار بار اذنِ بال کشائی دو اور اس سے کہو کہ وہ خوب اچھی طرح سے دیکھے کہ کائنات میں کہیں کوئی اختلال ہے۔ وہ ہر بار، واماندہ و درماندہ، کاشانۂ چشم میں لوٹ آئے گا اور اسے کہیں اختلال وفتور دکھائی نہیں دے گا۔ (یہ ہے اس کائنات کا نقشہ جس میں ہر شے ہمارے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ اب تم خود سوچ لو کہ اگر تم بھی اپنی دنیا میں ہمارا نظام قائم کر لو تو تمہارے معاشرے میں کس طرح فساد کی جگہ اصلاح اور اختلاف کی جگہ باہمی موافقت پیدا ہو جائے گی) یہ ہے عزیزانِ من! جو میں نے ان دو آیتوں کا مفہوم لکھا ہے۔ اگر الفاظ کے لیے ضرورت ہوئی تو میں پھر عرض کر دونگا۔ آج درس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ یوں کہیے کہ ہم سورۃ الملک کی ابتدائی آیات میں ہی ہیں اور اسی سے ہم آگے شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

دوسرا باب: سورة الملک (آیات 5 تا 6)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1983ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الملک کی آیت 5 سے ہو رہا ہے: (67:5)۔

قرآنِ کریم کا حقائق کو بیان کرنے کا محاکاتی انداز

آپ کو یاد ہوگا پچھلے درس میں' اس سورۃ کی ابتدائی چار آیتوں میں' عروسِ فطرت کی رعنائیوں اور زیبائیوں اور کارگہ کائنات کے حسنِ نظم و نسق کی ندرت کاریوں کا بیان بڑے ہی محاکاتی انداز میں ہوا تھا۔ پانچویں آیت کی ابتداء بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ کہا یہ ہے کہ وَلَقَدۡ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِمَصَابِيۡحَ وَجَعَلۡنٰهَا رُجُوۡمًا لِّلشَّيٰطِيۡنِ وَاَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابَ السَّعِيۡرِ (67:5) [1] یہاں بات تو وہی حسنِ کائنات کی ایک اگلی کڑی کی ہے لیکن وہ تو باتوں ہی باتوں میں' لفظوں ہی لفظوں میں' ایسے حقائق بیان کر جاتا ہے کہ عقل محوِ حیرت رہ جاتی ہے۔ یہاں کہا یہ ہے کہ ہم نے السَّمَآءَ الدُّنۡيَا میں جگمگاتے تارے تمہارے لیے رکھ دیئے ہیں۔ پہلے یہ دیکھیے کہ السَّمَآءَ الدُّنۡيَا تیرہ سو سال پیشتر کون کہہ سکتا تھا۔ یہ جو تم سے قریب ترین فضا ہے' اس میں جگمگاتے ہوئے چراغ تمہیں نظر آتے ہیں' تو گویا قریب ترین فضا کہنے سے بات واضح کر دی کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ یہ قریب تر فضا ہے' بعید تر فضائیں تو پتہ نہیں کتنی ہیں۔ قرآن ایک لفظ السَّمَآءَ الدُّنۡيَا سے افلاکیات کے اتنے حقائق بیان کر گیا کہ آج جیمز جینز (James Jeans) ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے' ورنہ اس دور میں تو سوال ہی نہیں تھا کہ کوئی السَّمَآءَ الدُّنۡيَا کہتا یا اس کے بعد اس کے بعید ترین سماء کا کوئی ذکر کرتا۔

---

[1] اور ہم نے اس فضا کو جو تمہیں قریب تر نظر آ رہی ہے' درخشاں ستاروں سے مزین کر رکھا ہے۔ (یہ بھی تمہاری زمین کی طرح مختلف اجرام ہیں لیکن) جو لوگ ہمارے قوانین کا علم نہیں رکھتے اور توہمات کی تاریکیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ ان ستاروں سے قیاس آرائیاں کر کے غیب کے حالات معلوم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اب نزولِ قرآن کے بعد علم و تحقیق کا دور آ گیا ہے تو یہ کاہن اور نجومی رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گے۔ ان کی اٹکلیں بے کار ہو کر رہ جائیں گی اور ان کا انجام بڑا ہلاکت انگیز ہوگا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تو پہلی چیز تو یہی ہے کہ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کے الفاظ سے یونہی آگے نہیں گزر جانا چاہیے۔ وہ تو حقائق کی ایک دنیا اپنے اندر لیے ہوئے ہوتا ہے۔ پھر مصابیح کہا یعنی یہ جو کرّے ہیں، یہ جو تارے ہمیں نظر آتے ہیں، یہ سارے کرّے ہیں۔

میں نے پہلے بھی یہ عرض کیا تھا کہ یہ بھی اس کی بڑی رحمت یعنی ربوبیت ہے کہ اس نے ان کرّوں کو اس انداز سے یہاں رکھا ہے کہ وہ ہمیں حسین تارے نظر آتے ہیں، جگمگاتے ہوئے کتنے خوبصورت ہوتے ہیں۔ اگر کہیں وہ ان کے اوپر پڑے ہوئے نقاب کو اٹھا دیتا اور وہ اپنی اصلی شکل میں ہمارے سامنے آتے تو رات کو کوئی سو نہ سکتا۔ آج ہمارے زمانے میں ایک چاند ہی کا نقاب اٹھا ہے تو دیکھیے کیا صورت نظر آئی ہے۔ عزیزانِ من! چاند کے حسن و زیبائش کی داستانیں زمانہ قبل از تاریخ سے انسان کے سامنے آتی رہیں۔ شاعروں کے ہاں، ادیبوں کے ہاں، وہ ایک حسین ترین مجسمہ تھا۔ بچوں کے لیے وہ بھی چندا ماموں تھا اور یہ اتنا حسین اپنی کشش اور رعنائی کی بناء پہ تھا۔ ہر چیز جسے آپ Lunatic کہتے ہیں، وہ لفظ Lunar سے ہی تو ہے یعنی دیوانگی پیدا کر دینے والا حسن۔ جنون پیدا کر دینے والا حسن، وہ ایسا مبہوت نظر آتا تھا اور جب خلانوردوں نے اس کے چہرے پہ پڑے ہوئے نقاب کو اٹھایا تو نیچے سے یہ اتنا بھیانک، ویرانہ نظر آتا ہے کہ اس سے ڈر آجاتا ہے۔ تو یہ تو اس کی کرامت اور ربوبیت تھی کہ اس نے ان ستاروں کو ہمارے سامنے بے نقاب نہیں کیا۔ اس لیے ہمارے ہاں وہ حسین سماء ہی نظر آتا ہے۔ کتنا کرم ہے اس کا کہ بعض حقائق کو چھپانا بھی ہمارے لیے رحمت بن جاتا ہے۔

عزیزانِ من! ''بمصابیح'' کے ایک لفظ نے بتا دیا کہ یہ ایسے نظر آتے ہیں جیسے کہ چمکتے ہوئے چراغ ہوں۔ درحقیقت یہ اس سے الگ ایک اور چیز ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر آج کے پورے درس میں ہی وہ چیز آ جائے تو غنیمت ہوگا۔ قرآن کریم نے کہا کہ **جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ** (67:5)۔ اس آیت کے مفہوم کے لیے تو بہت بڑی تمہید کی ضرورت ہے۔ بہرحال یہ جو کائنات ہمارے سامنے ہے اس کے اندر انسان کو اس نے ایک ایسی خصوصیت عطا کی ہے جو کائنات میں کسی اور شے کو حاصل نہیں ہے۔ اور وہ ہے اس کا اختیار و ارادہ۔ یہ خالصتاً خدا کی خصوصیت ہے۔ اسے اس نے روح یا توانائی کہا ہے۔ یہ اس کے لیے مخصوص تھی، کسی اور کا اس میں حصہ نہیں تھا۔ انسان کے متعلق اس نے یہ کہا ہے کہ **فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا** (21:91) اپنی توانائی کا ایک شمہ انسان کو بھی دیدیا۔ خدا تعالیٰ کا اختیار و ارادہ تو لامحدود ہے لیکن اس نے انسان کو ایک محدود حد تک ہی سہی، اختیار اور ارادے کی نعمت سے نوازا، جو ایک بہت بڑا شرف ہے۔ یہ چھوٹے سے پیمانے پر خدائی کرنے والی بات ہے اور مخلوق میں سے کسی اور کو یہ شرف حاصل نہیں ہے۔ اور پھر وہ تو خدا ہے جو بڑا وسیع الظرف ہے۔ اختیار و ارادہ عطا کیا ہے تو وہ اسے واپس نہیں لیتا، یہی بات نہیں کہ وہ اسے چھینتا نہیں ہے، وہ انسانوں کے معاملات میں دخل بھی نہیں دیتا۔ خدا Absolute Power، اقتدارِ مطلق کا مالک ہے۔ اس کا یہ اختیار و ارادہ جو انسان کو دیا ہے خود خدا کا عطا کردہ ہے لیکن جب ایک دفعہ دیا ہے تو پھر نہ چھینتا ہے اور نہ ہی اس میں دخل دیتا ہے۔

عزیزانِ من! قرآن کے مقامات کو دیکھیے۔ اس کی جو اپنی دنیا ہے اس میں تو یہ ہے کہ وہ **يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ** (3:40) ہے۔ وہ اپنی

مشیت کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ٹھیک ہے قادرِ مطلق ہے اس کی مشیت لامحدود اختیارات پر مبنی ہے۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ **مَا يَشَاءُ** (3:40) ہے لیکن جب انسانوں کی دنیا کی طرف آتا ہے تو وہاں وہی مادہ ہے وہی لفظ ہے۔غور کیجیے اس نے وہاں اسے ''یشاء'' ہی کہا ہے۔ان سے کہتا ہے کہ **اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ** (41:40)۔اپنی دنیا میں تمہاری مشیت چلے گی' ہماری دنیا میں ہماری مشیت چلے گی۔تم جو جی میں آئے کرو ہم دخل نہیں دیں گے۔ یہ **شِئْتُمْ** ہے۔اُدھر اپنے لیے **مَا يَشَاءُ** (3:40) ہے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے جو کہی ہے: **اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ** ❶ (41:40)۔ یہ الگ بات ہے کہ جو کچھ تم کرو گے اس کے نتائج بھی تمہیں بھگتنے پڑیں گے لیکن اپنی دنیا میں تم صاحبِ اختیار ہو۔یہی **اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ** ❶ ہے۔

عزیزانِ من! وحی کے ذریعے کچھ قوانین دیئے' کچھ ہدایات دیں۔ وہ درحقیقت ہدایات ہی ہیں جنہیں ہم قوانین کہتے ہیں۔ یہ Guidence ہے' راہنمائی ہے۔اس راہنمائی کے متعلق بھی یہ کہا کہ یہ تو تمہیں ہم نے بتا دیا ہے کہ سنکھیا ہلاکت پیدا کرتا ہے اور پانی زندگی بخش ہے' یہ صحیح راستہ ہے' یہ غلط راستہ ہے۔ یہ ہم نے بتا دیا ہے۔تمہیں مجبور نہیں پیدا کیا کہ ضرور یہ راستہ ہے اس پہ چلو۔صرف ہدایت دی اور ہدایت دینے کے بعد کہا کہ **فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ** ❷ (18:29)۔ہدایت ہم نے دیدی' جس کا جی چاہے صحیح راستہ اختیار کرے' جس کا جی چاہے غلط راستہ اختیار کرے۔ یہاں پھر وہی ''شآء'' آیا ہے۔اس کی مشیت کی دنیا اس کا جہان ہے' انسانی دنیا میں اس کی یہ کیفیت ہے۔تو یہ سب سے بڑی خصوصیت انسان کے لیے ہے جو اُدھر خدا کو حاصل ہے اور نیچے انسان کو حاصل ہے۔

انسان کے اختیار و ارادہ کو سلب کرنا خلافِ قرآن ہے

عزیزانِ من! اس چیز کے بعد قرآن کے اس اصول کو سامنے رکھیے کہ کوئی عقیدہ' کوئی مسلک' کوئی مذہب' کوئی نظام' جو انسان کے اس اختیار و ارادے کی حد میں حائل ہو یا کوئی اسے سلب کرے تو وہ خلافِ قرآن ہے۔قرآن نے آتے ہی پہلے مذاہب عالم کو لیا اور ان کے ہاں جو عقائد تھے جس سے انسان کا اختیار و ارادہ سلب ہوتا تھا' کہا کہ قرآن ان کے خلاف چیلنج ہے۔قرآنِ کریم نے اعلانیہ ان کی تردید کی۔

---

❶ جو کچھ تمہارے جی میں آئے کرو۔(جونسی روش جی میں آئے اختیار کرلو' تم پر کوئی زبردستی نہیں۔بس اتنا سمجھ لو کہ) اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (41:40) خدا کا قانونِ مکافات تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔تم جونسی روش اختیار کرو گے اس کے مطابق نتیجہ مرتب ہو جائے گا۔(مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے' اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ (ایضاً)

دنیائے انسانیت میں یہودیوں کا عقیدہ

یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ جو بچہ بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہوا اسی کو نجات ملے گی اور محض بنی اسرائیل کا بچہ ہونے کی جہت سے وہ جنت میں چلا جائے گا۔ غیر از بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والا کوئی بچہ، کوئی انسان، جنت میں نہیں جا سکتا۔ تو اب یہ بات کہ کوئی بچہ بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہوتا ہے اور کوئی دوسری نسلوں میں پیدا ہوتا ہے تو یہ تو اس بچے کے اپنے اختیار میں ہی نہیں ہے۔ اِس نے تو پیدائش سے ہی اختیار و ارادہ سلب کر دیا اور پھر جو بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہو گیا وہ غیر بنی اسرائیل نہیں بن سکتا اور جو غیر بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہو گیا وہ بنی اسرائیل کا نہیں بن سکتا۔ یہ تو **قاطبۃً** بن گیا یعنی اس کی قسمت میں پہلے سے ہی لکھا ہوا بن گیا۔ اس نے یہ بات سلب کر لی، لہٰذا قرآن نے اس کی کھٹ [1] سے تردید کر دی کہ یہ جو تم کہتے ہو بالکل غلط ہے۔ عزیزانِ من! میں یہ مختصر الفاظ میں بیان کرونگا کیونکہ اس میں تفصیلی باتیں تو پہلے آ چکی ہیں۔ عیسائیت کی دنیا کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، اپنی پیدائش کے ساتھ، اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کا بوجھ اپنی پشت پر لادے آتا ہے اور اس کا کوئی عمل اس بوجھ کو اتار نہیں سکتا بجز اس کے کہ وہ حضرتِ مسیحؑ کے کفارے پر ایمان لائے۔ تو گویا پہلی چیز تو یہ ہو گئی کہ بغیر اپنی کسی ذمہ داری کے، بغیر اپنے کسی اختیار و ارادے کے، چوائس کے، ہر انسانی بچہ گناہ کا بوجھ لاتا ہے۔ وہ تو پیدا ہونے کے ساتھ ہی جیسے ہاتھ منہ کان ناک اللہ کی طرف سے ملے، اسی طرح گناہ کا ایک پٹارہ بھی اس کی پیٹھ کے اوپر رکھ دیا اور پھر اگلی چیز یہ کہ وہ اسے اتار ہی نہیں سکتا، جو جی میں آئے کر دیکھے، اس کا کوئی عقیدہ، کوئی عمل، اس گناہ کے دھبے کو دھو نہیں سکتا۔

ہندومت کی نظریاتی تعلیم میں انسانیت کی تذلیل

عزیزانِ من! ہندومت کے ہاں بھی بعینہٖ یہی چیز ہے۔ انہوں نے تو انسانوں کو چار ورنوں میں تقسیم کر دیا۔ جس گھر میں، جس وَرن میں، کوئی بچہ پیدا ہوا، اسی وَرن کی خصوصیات اس کے ساتھ آ گئیں: برہمنوں کے ہاں پیدا ہوا تو پوچھو ہی نہیں: بے تاج بادشاہ، کھشتریوں کے ہاں پیدا ہوا: حکومت ان کے ہاتھ میں ہے، ویش کے ہاں پیدا ہوا: ساری کاروباری دنیا ان کی کیپٹلزم اور سوداگری اور اگر شودروں کے ہاں پیدا ہوا تو وہ ان سب کا خدمت گزار۔ جس گھر میں پیدا ہو گیا اپنے جنم کو بدل نہیں سکتا، اسے وہی کچھ رہنا ہے۔ آپ نے غور کیا۔ اس سے پیشتر، زمانہ نزولِ قرآن میں، اور آج تک بھی، یہ جتنے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب ہیں، یہ تمام مذاہب نزولِ قرآن سے پیشتر بھی موجود تھے اور یہ ان کے بنیادی عقائد تھے۔ قرآن نے آ کے ان کی تردید کی ہے۔ تو یہی نہیں کہ وہ ان کے ساتھ مذہبی مناظرہ کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آدم کی، انسان کی، یہ ایک ہی خصوصیت تھی، اس کو سلب کرنے والے مذاہب خدا کے نہیں ہو سکتے۔ دلیل یہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق سورۃ اعراف میں کہا گیا کہ یہ ان تمام زنجیروں کو توڑ دے گا، جو انسانیت کو پہنائی گئی ہیں۔ یہ ان تمام سلوں کو اتار

---

[1] فوراً ہی

پھینکے گا جو آدمیت کے سر پر برف کے تودوں کیطرح لادی گئی ہیں۔ یہ انسانیت کو آزاد کردے گا' زنجیروں کو توڑے گا کہ جو فزیکل (جسمانی) قسم کی بھی غلامی ہے وہ بھی نہیں رہے گی۔ یہ ان سلوں کو جو سر پہ ہیں اتار پھینکے گا کہ فکری طور پہ بھی کوئی غلامی باقی نہیں رہے گی۔ غور فرمایئے کہ جو بعثت نبی اکرم ﷺ کا مقصد بتایا ہے وہ یہ ہے۔اس کے متعلق جو پہلی چیز چلی آرہی تھی وہ یہ تھی کہ حکومت نسل کے اعتبار سے ہے تو اس نے اس پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا' ان تمام عقائد کے اوپر جو اس طرح ان مذاہب کے اندر چلے آرہے تھے۔قرآن کہتا ہے کہ **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ**(17:70) ہر انسانی بچہ' انسانی بچہ ہونے کی جہت سے' یکساں واجب التکریم ہے' اس لیے کہ اس نے ہر بچے کو پیدائش کے اعتبار سے اپنی اس توانائی کا' اپنے اس اختیار وارادے کا' حصہ دیا ہوا ہے۔

کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں

عزیزانِ من! آگے بات حکومت کی آتی تھی۔ سارا قرآن اس اصول کو لیے ہوئے ہے کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حقِ حکومت حاصل نہیں ہے۔غور فرمایئے کتنی بڑی آزادی دی ہے۔کسی کو حکومت کا حق ہی نہیں ہے۔نظم وضبط چلانے کے لیے خدا کی کتاب میں جو اصول اور قوانین دیئے گئے ہیں' صرف انہیں ہر ایک پہ یکساں طور پر نافذ کیا جائے گا۔اس میں کوئی بات نہ سربراہِ مملکت کی ہے' نہ خصوصیت حکمران کی ہے۔وہ سارے کے سارے اس کے تابع چلتے ہیں۔وہ صرف نافذ کرنے کی ایک مشینری ہیں اور اس کے بعد انہی قوانین کے تحت انہوں نے بھی زندگی بسر کرنی ہے۔ان کے متعلق یہ بھی کہہ دیا کہ یہ جو خدا کے احکام اور اصول ہیں جس کا جی چاہے ان کو تسلیم کرے جس کا جی چاہے اِن سے انکار کرے۔وہ کہتا ہے کہ ملحد و بے دین ہو جاؤ' خدا کا بھی انکار کردو' کیونکہ **لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ** (2:256) کسی قسم کا جبر نہیں ہے۔جبر آیا تو وہ جو انسانیت کے اختیار وارادے کی بنیادی خصوصیت تھی' وہ ختم ہو گی۔ جبر ہے ہی نہیں۔ اندازہ لگایئے کہ قرآن کیا لے کے آیا اور اِس کے ساتھ کیا کیا۔اور پھر وہ جو اولیں دَور ہے اس کی جو کچھ بھی تاریخ ہمارے ہاں ملتی ہے یا قرآن نے جو کچھ ان کے متعلق بیان کیا ہے اس میں آپ دیکھیئے: وہ یہی شرفِ انسانیت ہے جس کا بار بار تذکرہ ہے۔خود نبی اکرمؐ سے کہا کہ اپنی اس قوم سے کہدو کہ اس قرآن میں تمہارے ہی شرف کا تذکرہ ہے۔قرآن میں تو شرفِ انسانیت کا تذکرہ ہے۔ یہ آزادی دی یعنی اختیار وارادے کی وہ خصوصیت برقرار رکھی۔کون ہے آزادی دینے والا؟ آزادی تو خدا نے دے رکھی تھی۔اسی لیے حضرت عمرؓ نے حضرت عمر بن عاصؓ کو' جو مصر کے گورنر تھے' ایک ذرا سی کوتاہی پر لکھا تھا کہ ابن عاص ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا' تم انہیں غلام بنانے والے کون ہوتے ہو'' "آزاد جنا تھا'' کے قرآن کے وہی معنی ہیں کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے اعتبار سے واجب التکریم ہے۔ یہ سارا کچھ کیا۔

عزیزانِ من! اب اس نکتے پہ آجایئے گا کہ کوئی عقیدہ' کوئی عمل' کوئی نظام' جو انسان کے اختیار واردے کی خصوصیت سلب کرتا

ہے' اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا ہے' وہ منشائے خداوندی کے خلاف ہے' قرآن کے خلاف ہے۔ پہلی بات یہ تھی کہ یہ نظامِ حکومت ہو کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پہ حکومت نہ کر سکے۔ اس قوم نے پہلے ہی اسے توڑ دیا' عیسائیوں یہودیوں ہندوؤں مجوسیوں نے نہیں توڑا' اسی قوم نے توڑا جس کے ہاتھ میں یہ قرآن تھا اور جسے اس کتاب کا وارث کہہ کے پکارا گیا تھا۔ اسی نے سب سے پہلے اپنے ہاں ملوکیت رائج کی: انسانوں ہی کی حکومت دوسرے انسانوں پر۔ آپ لمبے چوڑے عقائد اور بحثوں میں نہ پڑیں۔

خدا کے احکامات کی بجائے انسانوں کے احکام

عزیزانِ من! ایک بنیاد کو لے لیجیے۔ قرآن نے انسان کو اختیار و ارادے کا جو شرف دیا ہے' اس نے اسے سلب کر لیا۔ اب خدا کے احکام نافذ نہیں ہو رہے۔ یہ انسانوں کے احکام تھے۔ یہ تو ملوکیت ہے جو ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ ملوکیت جبر کا اصل سرچشمہ ہے اور نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اسے نگاہوں سے اوجھل رکھا جاتا ہے۔ ایسا کرنے والی مذہبی پیشوائیت ہے جسے انگریزی میں تھیاکریسی کہتے ہیں۔ ذرا تاریخ کے اس نکتے پر غور کیجیے گا: نہ وہ اُمیہ (132-41ھ بمطابق 750-661ء) یا عباسیوں (656-132ھ بمطابق 1258-750ء) کی مملکتیں رہیں۔ چلی گئیں' نہ ان کی حکومتیں رہیں۔ وہ تو مدت ہوگئی ختم ہوگئیں' ناپید ہوگئیں۔ نہ وہ حکمران رہے' وہ چل بسے' نہ ان کی حکومتیں رہیں' نہ ان کے اختیارات رہے۔ یہ سب ختم ہوگئے لیکن انہوں نے مذہبی پیشوائیت سے جو قوانین بنوائے تھے وہ آج تک آپ کے سر پہ مسلط چلے آ رہے ہیں۔ مثلاً انہوں نے قانون بنوایا کہ عورت کو گواہی کا حق حاصل نہیں ہے:

ہوئی لاکھ دنیا اِدھر کی اُدھر ہے
وہی سنگِ در ہے' وہی اپنا سر ہے

آج بھی آپ کے ہاں وہی قانون ہے۔ وہ شہنشاہ چلے گئے' ان کی مملکتیں چلی گئیں' ان کی حکومتیں چلی گئیں' ان کے بنائے ہوئے اپنی دنیا کے جو قانون تھے' وہ بھی نہ رہے' مگر انہوں نے مذہب کے نام پر جو قوانین بنائے تھے آج بھی آپ انہیں ٹچ نہیں کر سکتے' ان کے خلاف ایک لفظ نہیں کہہ سکتے' ان کا بدلنا تو ایک طرف رہا ان کے خلاف بھی کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ ارتداد ہے' یہ کفر ہے' مرتد کی سزا قتل ہے۔ آپ غور فرمائیے' آپ کے ہاں کے قوانین جنہیں یہ سارے کے سارے Personal Laws (شخصی قوانین) کہتے ہیں' یہ سارے اس دَور کے انسانوں کے بنائے ہوئے Laws (قوانین) ہیں۔ یہ انہی شہنشاہوں کے زیرِ عاطفت بنے' جو کچھ ان کی منشاء تھی اس کے مطابق یہ سارا کچھ بنا۔ آپ کو معلوم ہے کہ سب سے بڑی فقہ حنفی ہے۔ اس کے ہاں یہ قانون ہے کہ بادشاہ یا سلطان یا جنہیں اس زمانے میں خلیفہ کہا کرتے تھے' وہ قتل کے سوا کوئی بھی جرم کرے وہ ماخوذ نہیں ہو سکتا' اس سے اس کی باز پرس نہیں ہو سکتی۔ آپ کے ہاں یہ فقہ کا قانون ہے' یہ لونڈیوں کے قوانین ہیں' عورتوں کو اس پست درجے پہ رکھنے کے قوانین ہیں' چار چار بیویاں رکھنے کے قوانین ہیں' انہیں طلاق طلاق

طلاق کہہ کر سب کچھ ختم کرنے کے قوانین ہیں۔ یہ جتنے بھی اس قسم کے سارے قوانین ہیں' یہ سارا قصہ آج کی جو آپ کے ہاں وفاقی شرعی عدالت ہے' یہ قوانین اس کے دائرہ اختیار سے بھی باہر رکھے ہوئے ہیں۔

آج دو قسم کے قوانین رائج ہیں

آج بھی آپ دو قسم کے قوانین دیکھ رہے ہیں۔ کچھ تو حکومت سے متعلق ہیں' ان کے نظم ونسق سے متعلق ہیں' وہ حکومت کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جن کا تعلق اُن معاملات سے ہے جسے آپ شرعی کہتے ہیں۔ وہ وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار میں ہیں۔ ان کے متعلق وہ فیصلہ کرتی ہے۔ وہ قوانین بنتے بھی اسی طرح سے ہیں۔ یہ ان کی توثیق سے بنتے ہیں۔ وہ جسے اسلام کہیں' وہ اسلام کی اس چیز سے نافذ ہوتا ہے۔ اس میں آپ کو کوئی اختیار وارادہ نہیں۔ جب وہ کہہ دیں کہ تم نے یہ تین دفعہ طلاق کہا اور میاں بیوی میں طلاق پڑ گئی' تمہارا نکاح ٹوٹ گیا۔ اب اس کے بعد' معاذ اللہ' میری بیٹیاں بیٹھی ہیں' وہ اس سے کہیں ہیں کہ اب تمہارا میاں بیوی کا تعلق زنا ہوگا' جو اولاد ہوگی وہ ولد الزنا ہوگی۔ آپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دیکھیے آپ کا وہ اختیار وارادہ کہاں گیا جو خدا نے دیا تھا۔ اس میں تو صرف کتاب اللہ کی پابندی تھی لیکن یہاں انہوں نے پابندی عائد کر دی ہے۔ آپ ان کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آج بھی اگر اربابِ حکومت سے کوئی آرڈیننس جاری ہوتا ہے تو اس کی اطاعت کرنا' اس کے مطابق عمل کرنا' ملک کا قانون ہے۔ اس کا اتباع لازم ہے۔ آپ اِسے Criticise کر سکتے ہیں' تنقید کر سکتے ہیں' اس کے متعلق لکھ سکتے ہیں مگر وہی چیز جب وفاقی شرعی عدالت کی رو سے نافذ ہو جائے تو آپ اس پہ تنقید بھی نہیں کر سکتے۔ آج بھی یہی آج کے فیصلے' جنہیں آپ شرعی عدالت کے فیصلے کہہ رہے ہیں' آنے والے دَور کے اندر یہی آپ کے ہاں شریعت بنے گی۔ کچھ پہلے سے بنی ہوئی چلی آ رہی ہے' کچھ اس کے اندر اضافہ ہو کے آگے بن جائے گی اور اسے کوئی بچ بھی نہیں کر سکے گا۔

عزیزانِ من! غور فرمایا یہ ہے آپ کے ہاں آج کا اسلام۔ میں یوں کہوں گا کہ آج کا نہیں ہے بلکہ ہزار برس کا' صدرِ اول کے بعد کے دَور کا ہے۔ وہ معاشرہ جو اس کی رو سے قائم ہوا تھا' وہ نظامِ سرمایہ داری کا تھا' نظامِ ملوکیت کا تھا' مذہبی پیشوائیت کا تھا۔ یہ تینوں نظام پہلے ہی دن سے لازم وملزوم چلے آ رہے ہیں: فرعون فرعونیت کر ہی نہیں سکتا جب تک کہ ہامان اور اس کے لشکر اس کے ساتھ نہ ہوں اور اس کی بنیاد وہ قانون ہوتا ہے' جو مذہبی پیشوائیت بناتی ہیں۔ دراصل یہ تینوں ایک ہی ہیں۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہ تینوں ایک ہی ہیں۔ اب بھوکے کے دل میں تو یہ خیال پیدا ہوگا کہ ساتھ ہی جو میری کوٹھی کے اندر مین بلڈنگ میں رہ رہا ہے جو کچھ اس کے کتوں کو نصیب ہے' میرے بچوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ کہا: خاموش' لب پہ لانا تو ایک طرف رہا' دل میں بھی اس کے خلاف کوئی بات نہ ہو کہ یہ تقدیر ہے' خدا کی بنائی ہوئی تمہاری قسمت ہے' تمہارے ہاں لکھا ہوا ہی یہ ہے' یہ اللہ کا لکھا ہوا ہے' اس کا متعین کردہ ہے۔ آپ کے ہاں تقدیر کا ایک مسئلہ

Introduce (داخل) کیا اور یہ تمام عقائد آ گئے۔ دراصل تقدیر کا یہ عقیدہ مجوسیوں کے ہاں تھا۔ وہ اس لیے کہ ایران کی شہنشاہیت تو آپ کو معلوم ہے کس انداز کی تھی۔ یہ ساری چیزیں' ملوکیت' شہنشاہیت بنواتی ہے اور یہ سارے معاملات باہمی طور پر کچھ اس طرح طے ہوتے ہیں کہ شہنشاہیت محتاج ہوتی ہے کہ انہوں نے خود اس قسم کا جو قانون بنانا ہے وہ ان سے بنوائیں تو یہ بنوا ہی لیتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا حصہ کیا ہے۔ وہ انہیں حصہ دیتے ہیں۔ وہ حصہ یہ ہے کہ تمہاری دنیا میں تمہاری بادشاہی ہوگی اور ہم اس میں دخل اندازی نہیں کریں گے اور اسی طرح ہمارا بنایا ہوا قانون' تمہارا حکمران بھی نہیں بدل سکتا۔ یہ عقیدہ تقدیر ہے کہ صاحب! اس قسم کے ظالم جابر مستبد جو انسانیت کا گلا گھونٹ رہے ہیں' خدا کی طرف سے ہیں۔ ان کے بارے میں خاموش رہو لب کشائی بھی نہ کرو کیونکہ خدا جسے چاہتا ہے حکومت دیتا ہے' جسے چاہتا ہے چھین لیتا ہے' جس سے چاہتا ہے وہ رزق دیتا ہے' جسے چاہتا ہے بھوکا مار دیتا ہے۔

ہر چیز پہلے سے لکھی ہوئی ہے صاحب! خدا کے ہاں سے یہ فیصلے پہلے ہی ہوئے ہوتے ہیں حتیٰ کہ یہ میاں بیوی کا معاملہ بھی۔ اب ہمارے ہاں ایجاب وقبول کی رسم چلی آ رہی ہے۔ یہ بھی ایک عجیب تماشہ ہے۔ سارا کچھ تو پہلے سے ہو چکا ہوتا ہے' طے ہو گیا ہوا ہے' برات آ گئی ہے' باجے بج رہے ہیں' ڈھولکیں بج رہی ہیں' کھانے پک رہے ہیں' وہ بچیاں گا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد آخر میں ہوتا ہے کہ ''اووی تے چار کلمے والی گل وی تے کرلوتے۔''[1] پھر وہ ماموں اور لڑکی کا چچا لڑکی کے پاس جاتے ہیں اور وہاں جا کے کہتے ہیں کہ فلاں ابنِ فلاں ابنِ فلاں تمہیں قبول ہے؟ اب اگر وہ نا قبول کے معاملے میں بھی خاموش رہے تو حکم یہ ہے کہ لڑکی کی جو خاموشی ہے اسے اس کی قبولیت ہی سمجھ لیجیے۔ چلو جی بات پوری ہوئی اور دوسرا یہ جو دولہا ہے یہ تو گھوڑی پہ چڑھ کے آیا ہوا ہوتا ہے۔ اس قبولیت کے لیے اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت۔ عزیزانِ من! اس ایجاب وقبول کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ ہماری آیات کا مذاق نہ اڑانا۔ یہ ہے رضامندی جو لی جا رہی ہے۔ رضامندی لینے والا کون ہے؟ قرآن نے تو کہا ہے کہ میاں بیوی باہمی رضامند ہوں تو نکاح ہوتا ہے۔ یہاں تو ہمارے ہاں ولی کی اجازت کے بغیر بالغ لڑکی بھی اپنا انتخاب نہیں کر سکتی۔ بعض حالات میں اگر لڑکی نے کہیں کوئی چن بھی لیا' پھر نکاح بھی کر لیا ہے تو انہیں یعنی وارث یا جسے وہ ولی کہتے ہیں' اس کا اختیار ہے کہ وہ اس نکاح کو فسق کر سکتے ہیں۔ لڑکے اور لڑکی کا اختیار وارادہ کہاں گیا؟ وہاں سے اختیار وارادے کی یہ صورت اِدھر وارث یا ولی کے پاس آ گئی۔

طلاق طلاق طلاق اور قصہ ختم

جس نکاح کو دونوں کی رضامندی سے' بہرحال' باندھا تھا' اب اس کے توڑنے کے وقت میں وہ ایک ہی فریق ہے' سارے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہیں۔ تین دفعہ اس نے طلاق طلاق طلاق کہی' معاملہ ختم ہو گیا۔ روتی رہو' اس کا اختیار وارادہ سلب ہوا۔ یہ

---

[1] وہ چار کلمے بھی تو پڑھا دو۔ وہ بات بھی تو پوری کر لو۔

نکاح کیا ہوا؟ کہا کہ اے جی! اے نکاح جیہڑے نیں' اے تے عرشاں تے بدھے رہندے نے ناں۔ اے دنیا اچ تے ایویں کھڈونا ای ہوندا ہیگا اے۔ او عرشاں دا بدھا ہویا نکاح وے۔ وہی تقدیر' وہی سنجوگ دا لکھیا ہویا۔ ❶ ہر روز ہماری بچیوں کے آنسوؤں میں یہ بات آتی ہے: سنجوگ دا لکھیا ہویا میری جھولی اچ پے گیا۔ ❷ ''قسمت کا یہ لکھا'' اِدھر آنے ہی نہیں دیتا کہ کس نے ہمارے اختیار وارادہ کو سلب کر دیا' کس نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم زبان تک بھی یہ بات نہ لائیں' کس نے اتنا جبر کیا کہ ہمارا گلا گھونٹ دیا' یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ اس میں ہمارا بھی کچھ حق ہے۔ جب عقد باندھتے وقت ہم سے پوچھا تھا تو توڑتے وقت بھی تو پوچھ لینا چاہیے لیکن ''ایتھے اے صورت ہے۔ معاف رکھیے' میری لگدی کسے نہ ویکھی' تے ٹٹدی نوں جگ جاندا۔ او توڑن والا جیہڑا' او ٹھاہ ٹھاہ کر کے' باہر کیندا: میں طلاق دیدتی ہوئی ہیگی۔'' ❸ یہ روتی رہے۔ کیا ہوا؟ عرشوں پہ بندھا ہوا ہے' سنجوگ ہے' قسمت کا لکھا ہے' جھولی آ پڑا' کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا' مظلوم کی داد کی کوئی سبیل نہیں۔ بس یہی ایک تھی کہ وہ باپ کے دروازے پہ آ جاتی مگر وہ دروازے پہ اندر قدم نہیں رکھنے دیتا۔ کہتا ہے کہ بیٹی! اس گھر سے جو ڈولا گیا ہے اب تو یہاں تمہارا جنازہ ہی آ سکے گا' یہ خدا کے حکم کے خلاف ہے۔ خاوند مجازی خدا بن گیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ملوکیت کا استبداد جو شریعت کی رو سے آتا ہے (معاذ اللہ) وہ کیا کیا گل کھلاتا ہے۔

ایمان کا چھٹا جز

عزیزانِ من! آپ کے ہاں' یہ کیا چیزیں ہیں؟ ایک ایک مسئلہ لینے کی ضرورت نہیں۔ اس کی بنیاد وہی اختیار وارادہ ہے جسے قرآن نے انسان کی بنیادی خصوصیت بتایا تھا' اسے ہی سلب کر دیا۔ حیوان کو بھی کچھ اپنا اختیار ہوتا ہی ہے' مگر اسے تو اتنا اختیار بھی نہ رہنے دیا۔ اس پہ تقدیر کا مسئلہ آ گیا۔ اس کو اتنی اہمیت دی کہ پانچ اجزائے ایمان تو خدا نے مقرر کیے: (۱) اللہ پر ایمان' (۲) اس کے رسولوں پر ایمان' (۳) کتابوں پر ایمان' (۴) ملائکہ پر ایمان اور (۵) آخرت پر ایمان۔ سارے قرآن میں یہی اجزائے ایمان ہیں۔ انہی کے ماننے سے ایمان آتا ہے۔ ان کے انکار سے کفر لازم ہوتا ہے لیکن اس کے بعد ہمارے ہاں دورِ ملوکیت کا جو ایمان ہے اس میں ایمان کا چھٹا جز و تقدیر ہے۔ اب بھی جہاں جہاں ''اٰمَنۡتُ بِاللّٰہِ'' پڑھایا جاتا ہے' اب تو بہر حال وہ رسمی سا ہے' اس میں یہ چھٹا بھی شامل ہوتا ہے۔ ایمان کے اجزاء میں یہ چھٹا ایمان لکھا ہوا ہے۔ بڑی بڑی اہم کتابیں ہیں جن میں اسے ایمان کا چھٹا جز کہا ہوا ہے۔ مجھے یاد آ گیا یہ کوئی

---

❶ جناب! یہ جو نکاح ہوتے ہیں یہ عرشوں پہ طے ہو چکے ہوتے ہیں۔ بس دنیا میں تو یہ محض ایک کھیل تماشا ہی ہے۔ اصل تو عرشوں پر طے ہو چکا نکاح ہوتا ہے۔ یہ تو وہی تقدیر کا مسئلہ ہے کہ بس قسمت میں ہی لکھا ہے۔

❷ قسمت کا لکھا میرے پلے پڑا۔

❸ جب اس سے تعلق استوار ہوا تو کسی کو پتہ بھی نہ چلا اور جب وہ ٹوٹا ہے تو اسے دنیا جانتی ہے۔ طلاق دینے والا ٹھاہ ٹھاہ کر کے باہر کہتا ہے میں نے طلاق دے دی ہے۔

گاؤں کے حجروں والے ملاّ کی بات نہیں ہے۔ سیرت النبی ﷺ کی وہ پانچ چھ [1] جلدیں' جو علامہ سید سلیمان ندوی (1953-1884) مرحوم نے لکھی ہیں' ان میں جہاں عقائد پہ بحث آتی ہے تو ان میں قرآن کے پانچ عقیدے تو یہ ہیں' اب کوئی سو صفحہ اس چھٹے عقیدے کے متعلق لکھا ہے۔

خود ساختہ شریعت میں کسی کو آہ و فغاں کا حق نہیں

عزیزانِ من! یہ جو عقیدہ تقدیر ہے وہ اس کو بھی جزوِ ایمان قرار دیتے ہیں۔ تقدیر کو یہاں تک لے آئے کہ کسی ظلم کے خلاف' کسی استبداد کے خلاف' کسی جبر کے خلاف' لب کشائی نہ ہو سکے' کوئی حق ہی نہ مانگ سکے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ معاملات کہاں تک جا پہنچے ہیں اور پھر یہ جو لطیف سی ہونے کی بات ہے کہ یہ سارا کچھ کیا بھی جائے اور محسوس بھی نہ ہونے پائے یعنی حکمرانوں کے جبر کے خلاف تو پھر بھی کوئی Agitation (مظاہرہ) ہوتا ہے' کوئی آہ و فغاں ہوتی ہے' کوئی بھی بات تو ہوتی ہے مگر شریعت کے راستے سے جو آپ کے ہاں جبر ہوتا ہے اس کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں تقدیر کا حصہ آ گیا۔ اسے سرمایہ داری بھی نہیں مٹا سکتی کہ رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے' ملوکیت کے استبداد کے خلاف لب کشائی نہیں کی جا سکتی کہ خدا جسے چاہتا ہے حکومت دیتا ہے۔ بات میں سے بات نکل آئے گی کہ پھر خدا بھی (معاذ اللہ' معاذ اللہ) عجیب ہے: فرعون کو وہ حکومت بھی دیتا ہے' موسیٰ علیہ السلام سے کہتا ہے کہ جاؤ' اس سے یہ حکومت چھین لو۔ اس کے متعلق کیا باتیں بتاؤں۔ آپ اس چیز کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہی چیزیں ہیں جو شریعت کے نام سے آپ کے ہاں آتی ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ ان حکمرانوں کی موجودگی میں' ان کی حکومت کے دور میں' نہیں کہہ سکتے تھے۔ آج بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ حکمران ختم ہوئے' ان کی حکومتیں ختم ہوئیں مگر جو' ان اہل شریعت کی حکومت ہے' وہ قیامت تک چلتی ہے اور پھر سلسلہ در سلسلہ آگے چلتی جا رہی ہے۔ آج بھی چل رہی ہے۔ یہی جو عقیدہ تقدیر تھا آپ اسی میں آگے بڑھے۔ اب اس میں آپ کے ہاں یہ عقیدہ آیا کہ انسان کی قسمت ستاروں کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ لو بھئی' اس سے پہلے تو پھر بھی کوئی انسان ہی تھے جن کے ہاتھوں میں یہ بات تھی' اب انسان کی قسمت ان ستاروں کے ساتھ بندھی ہوئی ہے یعنی جن ستاروں کے متعلق قرآن نے تیرہ سو سال پیشتر کہا کہ سَخَّرَ لَكُمْ (22:65) ان کو ہم نے تمہارے تابع تسخیر کر دیا۔ یہ کچھ قرآن ہی نے کہا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ ایک وقت آئے گا تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ وہ جن کے ساتھ ہماری تقدیر بندھی ہوئی ہے امریکہ کے خلانوردوں کی تقدیر بھی تو انہی سے بندھی ہوئی تھی۔ وہ اٹھے ہیں اور

---

[1] سید سلیمان ندوی مرحوم (1953-1884ء) نے سیرۃ النبیؐ کی یہ مختلف جلدیں 1918 میں' 1921 میں' 1923 میں اور نومبر 1940ء میں رقم کیں مگر ساتویں یعنی آخری جلد مکمل نہ کر پائے۔ آپ کی ایک کتاب ''خطبات مدراس'' بھی ہے جس میں ''سیرت النبیؐ'' کے مختلف پہلوؤں پر آپ کے آٹھ خطبے شائع ہوئے ہیں۔ (حوالہ: حفیظ گوہر: پاکستانی شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا' گوہر پبلی کیشنز' لاہور' (سالِ اشاعت درج نہیں ہے) ص ص۔ 162-161)

جوتے سمیت اس کے اوپر چڑھ گئے۔ کس کی تقدیر کس کے ساتھ بندھی ہوئی ہے' یہ سوچنے کا سوال ہے۔ اب وہ امریکی خلانوردان کرّوں کے ساتھ اس کے بعد جو جی میں آئے کریں گے۔ انہوں نے اتنی توانائیاں Scientific (سائنسی) طریقے سے حاصل کی ہیں اور کریں گے۔ قرآن نے کہا ہے کہ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ❶ (45:13)۔ اللہ اکبر! یہ ہے مقامِ انسانیت' یہ ہے مقامِ آدم کہ اس کے سامنے تمام ملائکہ سجدہ ریز ہیں' فطرت کی ساری قوتیں اس کے سامنے جھکی ہوئی ہیں اور یہ تھا قرآن۔ مگر مذہبی پیشوائیت نے یہ کہا کہ ہماری' آپ کی' انسانوں کی' ساری تقدیر ستاروں کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ آج اسے کہتے ہیں نجوم کا علم اور انہیں کہتے ہیں نجومی یا منجم۔ خیر سے آپ کے ہاں بھی وہ بڑے بڑے سے' کوئی پمفلٹ سے' آیا کرتے ہیں۔ ہم نے ان نجومیوں کو دیکھا تو نہیں' ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ یہ فٹ پاتھ پہ بیٹھنے والے نہیں ہیں' یہ بڑے مقام کے مالک ہیں۔ ان کے ہاں کے پمفلٹ دیکھیے۔ وہ کس شان سے نکل کے چلے آتے ہیں۔ اسلامی منجم اس کا نام ہوتا ہے۔ کیا بات ہے ''توحیدی بُت پرستی کی!'' اور چونکہ بڑی عجیب ہے' اقبالؒ (1938-1877) بھی کیا بات کہہ جاتا ہے! اس نے تقدیر کے متعلق ابلیس کی زبان سے مجلسِ شوریٰ میں یہ کہا ہے کہ

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا ❷

بزبانِ اقبال ابلیس کی مجلس شوریٰ

عزیزانِ من! جب کوئی نادار ہو جاتا ہے تو وہ بے کس اور بے بس ہو جاتا ہے۔ اس کا کوئی چارہ ساز نہیں ہوتا' کوئی اس کی پرسش نہیں کرتا۔ نہ قانون اس کا ساتھ دیتا ہے' نہ عدل ساتھ دیتا ہے' نہ معاشرہ ساتھ دیتا ہے۔ غریب اور بے کس کچھ نہیں ہوتا۔ اس مایوسی کے عالم میں وہ تنکوں کا سہارا لیتا ہے' کبھی وہ فٹ پاتھوں پہ بیٹھے ایک منجم کو ہاتھ دکھا رہا ہے' کبھی اپنے ستاروں کی بات پوچھ رہا ہے اس لیے کہ انسانیت کی دنیا کے اندر اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ وہ ستاروں کو پکار کے کہہ رہا ہے کہ تم ہی کچھ میری مدد کرو۔ انسان آدم کا بیٹا ہے جس کا مقصدِ حیات تسخیر کائنات کر کے اس سے حاصل کردہ توانائی کو قرآن کی روشنی میں نوعِ انسان کی بھلائی کے لیے صرف کرنا ہے۔ وہ ستاروں سے مدد کا متمنی ہے۔ میں نے بار بار کہا ہوا ہے' عزیزانِ من! خدا آپ کو فرصت دے تو اقبالؒ (1938-1877) کی یہ نظم ضرور پڑھتے چلے جایئے' ارمغانِ حجاز میں جو اردو کا حصہ ہے' یہ اس کے اندر ہے۔ اتنی بڑی بات ہے جو ایک فقرے میں وہ کہہ گیا:

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا

---

❶ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' اس نے سب کو تمہارے لیے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

کرّوں کے چہروں پر عروسی کا نقاب

عزیزانِ من! آیئے اب جس آیت سے بات چلی تھی اسے دیکھیں۔کہا: **وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ** (67:5) یہ تو بڑے بڑے کرّے تھے۔ہم نے ان کے چہرے کے اوپر عروسی کا نقاب ڈال دیا اور وہ نہایت خوبصورت جگمگاتے ہوئے چراغ بن کے تمہیں نظر آ رہے ہیں۔واقعی اگر گرمیوں میں خدا فلیٹ سے نجات دیدے اور کہیں ایسی جگہ سونا نصیب ہو جائے جہاں آسمان نظر آتا ہو‘ صاف آسمان کے اوپر یہ ستاروں کی دنیا بڑی کشش رکھتی ہے۔میں نے کہا ہے کہ یہ اس کی رحمت ہے جو یہ نقاب پوش ہیں۔اگر یہ سارے ستارے ویسے ہوتے جیسے نقاب اٹھنے کے بعد یہ چاند ایسا بھیانک نظر آ گیا ہے تو بچے ڈر کے مارے مر جاتے۔وہ اسے اپنی رحمت کی صورت بتاتا ہے۔یہ اس کا کتنا کرم ہے کہ کرّوں کو یہ بنا کے رکھ دیا۔کہا: یہ صورت تھی کہ کرّوں کو یہ کچھ بنایا اور اس انسان کو دیکھیے کہ یہ ان ستاروں کے متعلق بات کر کے نجوم کی اٹکلیں دوڑاتا ہے۔اٹکلیں دوڑاتا ہے!! یعنی **وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ** (67:5)۔قرآن نے اٹکلیں دوڑانے والوں کو شیاطین کہا ہے۔شیاطین اُس بنیادی چیز کی سرکشی کرنے والوں کو کہتے ہیں جو خدا نے کہی ہے۔اس نے انسان کو اختیار و ارادہ دیا تھا۔قرآن خدا کی اس نعمت اور رحمت اور بنیادی خصوصیت کے خلاف لفظ شیاطین لایا ہے جس کے معنی ''سرکشی کرنے والے'' ہیں۔یہ جو اسلامی نجوم کہہ رہے ہیں‘ قرآن انہیں شیاطین کہہ رہا ہے‘ سرکشی کرنے والے کہہ رہا ہے کہ ہم نے تو ان کو یہ **سَخَّرَ لَكُمْ** بنایا تھا اور یہ انہیں بتا رہے ہیں کہ تمہاری قسمت ان ستاروں کے ساتھ وابستہ ہے۔یہ **رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ** اس زمانے میں کہا جا رہا ہے‘ عزیزانِ من! جب ساری دنیا کے اندر یہ توہم پرستیاں اور ستارہ پرستیاں موجود تھیں۔ستارہ پرستی تو ایک مذہب بھی تھا جسے قرآن نے صابئین کہا ہے۔ان کا یہ زیادہ حصہ ایران میں تھا۔اگرچہ بعض اوقات انہیں مجوسی بھی کہا جاتا ہے لیکن نہیں‘ وہ **صابئین** (2:62) الگ تھے۔یہ ستارہ پرست تھے۔حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے تو قصے میں آتا ہے یہ غالباً وہی قوم تھی۔وہ اِن ستاروں کو خدا مانتی تھی‘ ان کی پرستش کرتی تھی۔یہ پرستش نہ بھی ہو تو بھی یہ چیز ہے کہ ستاروں کے ساتھ قسمتیں وابستہ ہیں۔یہ تو قریب قریب آج ساری دنیا میں یہ بات پھیلی ہوئی تھی اور عربوں کے ہاں جو ایسی قوم تھی جس کے ہاں نہ علم تھا نہ اس سے پیشتر دین تھا‘ ان کے ہاں تو ساری توہم پرستیاں تھیں۔یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ کبھی کاہن پیش گوئیاں کرنے والے زائچے بنا بنا کے اس قسم کی پیش گوئیاں کرتے ہیں‘ یہ وہی کچھ ہے جو ہندوؤں کے ہاں ہوتا ہے‘ وہ ہاتھوں کی لکیریں دیکھ کے پیش گوئیاں کرنے والے ہیں۔یہ کاہن بھی ایسے ہی ہیں۔قرآن نے شاعر بھی کہا۔شاعر یہ نہیں ہیں کہ نظم میں کوئی شعر کہنے والے ہوں۔

توہم پرستی کی مختلف شکلیں

عزیزانِ من! ان عربوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ انہیں بھی الہام ہوتا ہے۔انہیں ساحر بھی کہا‘ شاعر بھی کہا اور منجم بھی کہا۔یعنی مذہب کی دنیا میں جہاں جہاں بھی جبر اور استبداد تھا یعنی انسان کے اختیار و ارادے کو سلب کرنے والے جتنے عقائد تھے‘ قرآن نے ان کے

خلاف چیلنج دیا اور یہ جو اس دور میں عام طور پہ اور خاص طور پہ عرب میں تو ہم پرستی کی رسومات یا عقائد تھے ان میں کاہنوں کا تو پوچھیے نہیں قرآن نے ان کے ہاں کے سحر کے دعویداروں کے خلاف چیلنج دیا۔ اور یہاں آپ دیکھیے کہ یہ جو منجم تھے، جو نجوم کے ذریعے قسمتیں بتانے والے تھے، یہاں ایک تو یہ بات کہی کہ وہ جو تاریکی میں اٹکلیں دوڑانے والا ہوتا ہے، وہ اس کو رجوماً للشیٰطین کہتے ہیں۔ رجم کے معنی ویسے تو کچھ پھینکنا ہوتا ہے۔ وہیں سے یہ عقیدہ رجم ہے، پتھر مار کے سنگسار کر دیتے ہیں۔ یہ بنیادی طور پہ وہی لفظ ہے۔ ان کے ہاں عربی زبان کے اندر رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ قیاس آرائیاں کرنے کو کہتے تھے یعنی تاریکیوں میں تیر پھینکنا کہ پتہ نہیں نشانے پہ لگا یا نہیں۔ ہمارے ہاں بھی یہ ہے کہ لگ گیا تیر، نہیں تے تُکّا [1] ۔ یہ بعینہٖ اس معنی میں آتا ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ تو ستارے تھے، ان کی کیفیت دیکھو کہ اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔ ستاروں سے یہ عقیدہ بندھا ہوا ہے کہ تمہاری قسمت ان کے ساتھ وابستہ ہے۔ آپ کے ہاں تو اب پھر ان کے متعلق بڑے بڑے میگزین نکل رہے ہیں۔ ان میں دیکھیے۔ اب تو اس کا خاص ایڈیشن، اسلامی ایڈیشن، چھپتا ہے اس میں تو ان کے متعلق پورا ہی صفحہ ہوتا ہے۔ اب تو یہ علمِ نجوم، ستاروں کا علم، زہرہ میں داخل ہو گیا ہے، مریخ کے اِدھر آ گیا اور افراد کا ہی نہیں، قوموں کا، ملکوں کا، حکومتوں کا اور اب اس حکومت امریکہ کا بھی علم نجوم اس میں شامل ہے۔ جیسا میں نے کہا ہے کہ وہ تو اس زہرہ کے اوپر بھی چڑھ دوڑے۔ یہ زائچے میں بھی بتاتے ہیں۔ اب نہ افراد میں کوئی اختیار و ارادہ، نہ قوموں میں اختیار و ارادہ۔ وہ تو بہرحال اس پہ مذاق سمجھ کے ہنس دیتے ہیں۔ آپ نے اپنے ہاں تقدیر کا جو یہ عقیدہ بنا رکھا ہے اور تقدیر ان چیزوں کے اوپر ہے تو آپ کی تو قومیں بھی تقدیر پہ چلتی ہیں، افراد بھی تقدیر پہ چلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو مولا دی مرضی، [2] یہ ہے رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ.

اقبالؒ اور قرآن

عزیزانِ من! ہمارے دَور میں اقبالؒ (1877-1938) جو قرآن کی طرف دعوت دیتا تھا اور شرفِ انسانیت کا سب سے بڑا مبلغ تھا، نے برملا کہا تھا کہ

آدمیت احترامِ آدمی
برتر از گردوں مقامِ آدمی

اسی لیے اس نے پھر نجوم اور منجموں کے متعلق بھی یہ کہا کہ

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے، تُو تابعِ ستارہ نہیں

---

[1] وہ تیر جس میں بھال نہ ہو۔ [2] مرضی یار کے خلاف نہ ہو لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

خاکِ زندہ اور خاکِ مردہ میں کیا ہی خوب فرق کیا۔ دوسری جگہ ہے کہ

ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

کیا الفاظ ہیں: ''وہ کیا خبر دے گا'' اقبالؒ اس دَور میں بہت بڑا مبلغ تھا۔ یہ شرفِ آدمیت کی اس بنیادی حقیقتِ انسانیت کا بہت بڑا مبلغ تھا۔ اس نے کیا ہی خوب کہا تھا کہ

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تُو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے
تُو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں ❶

تجھے Plain (صاف) سلیٹ دی ہے اب تُو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ اور سارا قرآن اسی سے بھرا پڑا ہے۔ عزیزانِ من! بات یہاں سے چلی تھی کہ کوئی عقیدہ' کوئی تصور' کوئی نظریہ' کوئی مسلک' کوئی نظم و نسق' جو انسان کے شرفِ اختیار و ارادہ کو کم کرتا ہے یا اس کے راستے میں حائل ہوتا ہے' قرآن کے خلاف ہے تو قرآن اس کے خلاف چیلنج دیتا ہے۔

صرف اور صرف خدا کے قانون کی حکمرانی

عزیزانِ من! ایک ہی چیز ہے جسے میں نے کہا ہے کہ قرآنِ کریم نے خدا کے اصول دیئے ہوئے ہیں۔ یہ اس کی ہدایات ہیں جو اب قرآنِ کریم میں موجود ہیں۔ اور میں نے گزارش کیا ہے کہ اس میں بھی جو ہدایات دی ہیں وہ انہیں بالجبر نہیں منواتا' زبردستی نہیں منواتا' خود کہہ دیا کہ ہم دخل نہیں دیتے۔ انسانوں سے کہا کہ تمہارا جی چاہے مانو' جی چاہے نہ مانو۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق کہا کہ ہم جانتے ہیں تیرا دل بڑا کڑھتا ہے کہ کیوں یہ تباہی کی طرف جاتے ہیں' کیا تو ان کو مجبور کرے گا کہ صحیح راستے کی طرف آ جائیں۔ وہ تو رسول کو بھی اس کی اجازت نہیں دیتا مگر یہاں آپ کے ہاں One way traffic (یک طرفہ ٹریفک) کی چیز ہے کہ کسی نے کلمہ پڑھ لیا' اب مسلمان ہو گیا' اس کے بعد وہ ان مسلمانوں کی اصلی حالت کو دیکھ کر اگر ہزار چاہے کہ میں یہاں سے واپس چلا جاؤں تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! اس کے اندر Entry (داخلہ) ہے' واپس نہیں جا سکتے۔ واپس جانے والا مرتد اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ یہ کسی حکومت کے قانون میں نہیں کہ ہماری مملکت میں Citizenship (شہریت) قبول کر لینے کے بعد وہ انکار نہیں کر سکتا' یہ کسی حکومت کا قانون نہیں ہے۔ یہ آپ کے

---

❶ پرویزؒ: سلیم کے نام (ایڈیشن 1981) جلد اول' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1981' ص۔ 51

ہاں کی شریعت ہے کہ نکل کے بھی نہیں جا سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (2:167) یہ جہنم میں ہیں، جہنم سے نکل ہی نہیں سکتے۔ یہاں تک جبر کی یہ صورت ہے، اور اس کے لیے وَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ❶ (67:5) ہے۔ وہ ان منجموں کے لیے تو کیا کہے گا، یہ جو ان سے جا کے اپنی تقدیریں پوچھنے والے ہیں وہ سارے اس عَذَابَ السَّعِيْرِ کے اندر شامل ہیں، یعنی متاعِ حیات جھلس کر رہ جاتی ہے۔ یہ ہے اس کا ترجمہ۔ متاعِ حیات تو بنتی ہی سرگرمی عمل سے ہے، حرکت سے ہے، جو اُس سے ہے، اختیار و ارادے سے ہے، عزم سے ہے۔ جب یہی سلب ہو جائے تو باقی کیا بچے گا۔ آپ غور کیجیے کہ قرآن کی تشبیہات کے کیا الفاظ ہوتے ہیں: عَذَابَ السَّعِيْرِ (67:5)۔ وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ❷ (67:6)۔ وہاں عذاب سعیر (67:5) کہا ہے، پھر عذاب جہنم (67:6) کہا۔ جہنم کے متعلق قرآن کے مختلف مقامات میں ہے: خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا (5:33)۔

مختلف قسم کا عذاب

عزیزانِ من! کتنے ہی مختلف قسم کے عذاب ہیں: ذلت اور خواری کا عذاب، محتاجی اور مسکینی کا عذاب، ماتحتی کا عذاب۔ یہ جتنے عذاب ہیں، یہ سارے جہنم کے ہیں اور پھر جحیم بھی تو آیا ہے کہ جہاں کسی کی حرکت رک جائے، وہیں کھڑا ہو جائے، آگے نہ چل سکے، پروگریس نہ کر سکے، آگے نہ بڑھ سکے۔ آپ یہ مقام دیکھتے ہیں کہ پھر تقدیر کے عقیدوں سے کیا ہوتا ہے کہ جو قسمت میں لکھا ہے وہ ہو جائے گا۔ اس سے آپ سوچ سکتے ہیں کہ قوموں کی کیا حالت ہوتی ہے۔ یہ سوچنے کی تو بات ہی نہیں، ہم تو صورت ببیں حالش مپرس ❸ ہیں۔

ملت اسلامیہ ہزار برس سے ایک مقام پر رُکی ہوئی ہے

ہماری اپنی حالت یہ ہے کہ ہزار برس سے ایک مقام کے اوپر رُکے ہوئے ہیں۔ اس قوم کی یہ حالت کیوں ہوئی ہے؟ جی! خدا نے اس کی قسمت میں لکھا ہی ایسا ہے، تقدیر ہی اس کی ایسی ہے، بدل ہی نہیں سکتی۔ تم اس کے خلاف، خدا کے خلاف، اس کو چیلنج دے کر یہ کرنا چاہتے ہو مگر اس نے رکھا ہی تمہیں اس میں ہے تو جب یہ اس پہ مطمئن ہو جائیں اور وہ جو استبداد اور جبر کرنے والے ہیں ان کو تو یہ ایسا حربہ ہاتھ میں آئے کہ جو جی میں آئے وہ کرتے رہیں، وہ ابلیس ان کو تھپکیاں دیتا رہتا ہے کہ یہ سارا کچھ خدا کی طرف سے ہے، یہ کون ہو سکتے ہیں جو خدا کے اس لکھے کے خلاف کریں۔ اور آپ کو معلوم ہے جو میں نے پہلے بھی دہرایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی ہی سورۃ، پہلے ہی پارے میں،

---

❶ ان کا انجام بڑا ہلاکت آمیز ہوگا۔

❷ جو لوگ بھی زندگی کے کسی گوشے میں قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ان کا انجام تباہی اور بربادی ہوتا ہے، اور یہ بہت برا انجام ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ صورت دیکھ لو۔ حال پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

قریباً ابتدائی آیات میں، جو قصہ آدم بیان کیا، وہ آدمی کی سرگزشت ہے۔ اس کے اندر بنیادی چیز ہی یہ بیان کی ہے کہ آدم یعنی آدمی سے بھی خطا ہوئی، سہو ہوا، لغزش ہوئی، ابلیس نے اس سے بھی زیادہ سرکشی کی۔ یہاں آدم کے ہاں تو لغزش ہی ہوئی تھی، ابلیس نے چیلنج کیا ہے۔ خدا نے آدم سے پوچھا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ اس نے ذمہ داری کو قبول کیا اور کہا: ہاں میں نے کیا، غلطی کی، بھول گیا، خطا ہوگئی یعنی اپنے اختیار سے انکار نہیں کیا۔ یہ بات قبول کی کہ میں نے کیا ہے۔ اس سے یہ شرفِ انسانیت تو باقی رہا۔ لغزش ہو جانا اور بات ہے، غلط فیصلہ ہو جانا اور بات ہے۔ فیصلہ تو خود کیا۔ کہا: جب تو اپنے اختیار و ارادے سے انکار نہیں کر رہا اور ذمہ داری قبول کر رہا ہے تو تجھ میں اصلاح کی گنجائش ہے اس لیے ہم تجھ کو اجازت دیتے ہیں، موقعہ دیتے ہیں کہ اپنی اصلاح کر لو۔ تم میں اصلاح کی گنجائش ہے۔ ابلیس سے کہا کہ تو نے یہ کچھ کیوں کیا؟ اس نے کہا: آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں یہ ذرہ ناچیز، مجھ میں یہ کیا ہمت کہ آپ کے ہوتے ہوئے، آپ کے حکم کے بغیر، پتہ نہیں ہل سکتا، میں بھلا یہ کر سکتا تھا! کہا کہ تو اپنے اختیار و ارادے سے انکار کرتا ہے۔ تیری قیامت تک اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ شیطنت تو یہ تھی کہ سرکشی برتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہاں قرآن نے اس کے لیے کیا لفظ استعمال کیا ہے؟ یہاں قرآن کریم نے اس کے لیے ابلیس کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی ہیں: قیامت تک اصلاح سے مایوس رہو، محروم رہو۔ ابلیس کے تو معنی ''مایوس'' کے ہوتے ہیں۔ سرکشی اور لغزش ہو جائے ٹھیک ہے، اپنے گناہ کا اعتراف کرو، ذمہ داری قبول کرو، وہی جو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے اس سے انکار نہ کرو۔ فارسی کا شعر ہے لیکن کیا عرض کروں کہ اقبالؒ (1877-1938) کیا کہہ گیا:

شاخِ نہالِ سدرهٔ، خار و خس چمن مشو
منکر او اگر شوی منکر خویشتن مشو ❶

تُو تو وہ شجرِ سدرہ ہے، جو سات آسمانوں کے اوپر محصور ہے، تو خوشگوار ہے۔ اقبالؒ انسان سے کہہ رہا ہے کہ تیرا تو وہ مقام ہے مگر تو باغ کے یہ جھاڑ جھنکار بن رہا ہے تو پہچان کہ تیرا مقام کہاں آ رہا ہے؟ منکرِ او اگر شوی۔

---

❶ دین کی ساری عمارت انسانی ذات پر ایمان کی بنیادوں پر اٹھتی ہے۔ جو شخص محض جسمانی زندگی ہی کو منتہیٰ سمجھتا ہے، اس کا خدا پر ایمان لانا بے معنی ہے۔ خدا، وحی، رسالت، آخرت پر ایمان کی ضرورت ہی اس لیے پڑتی ہے کہ انسان اس حقیقت پر ایمان رکھے کہ زندگی اسی جسم کی زندگی نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے اور مقصدِ زندگی اس کی نشوونما ہے۔ جو اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے وہ ''مومن'' ہے۔ اس کا اظہار حضرت علامہ اقبالؒ نے کیا ہے اور کہا ہے کہ میری شمشیر اگرچہ اس وقت بڑی زنگ آلود ہے لیکن یہ ہے اصل فولاد کی ساختہ۔ اس لیے آپؐ اپنی توجیہات کی سان پر چڑھا دیجیے تاکہ یہ صیقل ہو جائے اور اس کی کاٹ تیز تیز ہو جائے۔ حضرت علامہ کا نظریہ یہ تھا کہ انسان اپنی ذات کا منکر نہ ہو اور خدا کے منکر سے کہیں زیادہ کافر وہ ہے جو اپنی ذات کا منکر ہے اس لیے کہا ہے کہ اگر تو اس کا انکار کرتا ہے تو کوئی بات نہیں، ابھی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی مگر تُو اپنا انکار نہ کر۔ یہ ہے تیرا مقام۔

تقدیر کا دوسرا نام: میں نہیں کر رہا، خدا کر رہا ہے

اگر ابھی تمہاری سمجھ میں بات نہیں آئی، خدا کا اقرار بھی تو نہیں کر رہا، کوئی بات نہیں، منکرِ خویشتن مشو۔ اپنا انکار نہ کر۔ اپنا انکار تو یہ ہے کہ میں کون ہوں یہ کرنے والا۔ مجھ میں تو یہ استعداد ہی نہیں، اختیار ہی نہیں، ارادہ ہی نہیں۔ یعنی یہ چیز کہ میں نہیں کر رہا، وہ کرا رہا ہے۔ یہ کہنا کہ میں نہیں کر رہا، خدا کرا رہا ہے۔ وہ اس کو ابلیس قرار دیتا ہے۔ اور یوں ہمارے ہاں وہ سارے عقائد چلے: مرضی مولا بر ہمہ اولیٰ۔ اس کی رضا کے اندر سب کچھ ہے شریعت کی طرف آ ؤ تو بھی اور اگر طریقت کی طرف آ ؤ تو بھی۔ شریعت تو پھر بھی ایک خشک ٹہنی ہوتی ہے اور یہ طریقت ہے یہ تو پانی میں گری ہوئی ٹہنی ہوتی ہے۔ یعنی ہر جگہ آپ کو یہ ملے گا کہ تو کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ سب کچھ اس سے ہوتا ہے، اس کی مرضی سے ہوتا ہے، اور رضائے حق کے مطابق چلنے کا نام ہی اسلام ہے۔ شاید آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ حسرت موہانی [1] جیسا اتنا بڑا انقلابی کہ جس زمانے میں آپ کے ہاں کے بڑے بڑے جو کانگریس میں تھے، اس زمانے میں یہ لوگ بھی ابھی ڈومینین سٹیٹس کے اوپر راضی ہوتے تھے، وہ بھی ان کے خلاف بغاوت کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ ہمارا مطالبہ کامل آزادی ہونا چاہیے۔ یہ اتنا بڑا انقلابی شخص، بڑا درویش آدمی تھا۔ وہ بھی جب عقیدے پہ آ گیا تو یہ کہہ رہا ہے:

مرضی یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

میں تو مرضی یار کے خلاف کروں گا ہی نہیں، آپ بھی نہ کیجیے۔

موجودہ اسلام کی حالت زار

عزیزانِ من! یہ چیزیں شاعری نہیں ہیں، یونہی عقائد نہیں ہیں، یہ گاؤں کے پکی روٹی والے ملاّ کی بات نہیں ہے۔ آپ کا اسلام یہ بن چکا ہوا ہے۔ یہ ہزار برس سے دَورِ استبداد کا اسلام ہے۔ اس لیے کہ یہ عقیدہ وضع کیا گیا تا کہ جو ملوکیت کر رہی تھی، جو سلاطین کر رہے تھے، جو بادشاہوں کے ظلم و ستم ہو رہے تھے، اُس کے خلاف آواز نہ اٹھے۔ جہاں کسی نے ایک آواز اٹھائی، اسے کہا کہ یہ تو سب خدا کا کیا ہوا ہے، ان کو تو بادشاہ بنایا ہی اس نے ہے، خاموش رہو۔ یہ وہی استبداد ہے جو آپ کے ہاں ہزار سال سے چلا آ رہا ہے۔ آپ کے ہاں یہ عقیدہ تقدیر نس نس میں رس چکا ہے۔ آپ اسے کہاں کہاں سے نکالیں گے۔ یہ عقائد تو آپ کے خون کے ذرات میں حلول کر چکے ہیں، جزوِ ایمان بن چکے ہیں۔ تقدیر کے ان عقائد سے ساری طریقت بھری پڑی ہے، ساری شریعت اس سے بھری پڑی ہے، تو پھر راوی عیش لکھتا ہے۔

---

[1] فضل الحسن حسرت موہانی (1875-1951)

عزیزانِ من! میں نے شروع میں ہی عرض کیا تھا کہ اگر آج کے درس میں یہ ایک ہی آیت ہو جائے تو غنیمت ہے۔ بہرحال غنیمت ہے کہ یہ ہوگئی ہے۔ آج پانچ اور چھ دو ہی آیتیں ہم لے سکے ہیں۔ سورۃ الملک کی ساتویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔ ان میں بھی وہ پچھلی آیت کی ہی مزید تفصیل چلی آ رہی ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

تیسرا باب: سورۃ الملک (آیات 7 تا 14)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1983ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ الملک کی آیت 6 سے ہو رہا ہے: (67:6)

علمِ نجوم اور قسمت کا تعلق خلافِ قرآن ہے

سابقہ درس میں ایک ہی بات سامنے آئی تھی اور وہ یہ تھی کہ یہ منجم جو علمِ نجوم کی بنا پر لوگوں کی قسمتیں بتاتے ہیں یا جس طریق سے بھی انسان کے مقدر کے متعلق بات کی جاتی ہے' یہ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ یہ صرف یہی ایک چیز علم نجوم نہیں ہے اس کے دیگر طریق بھی مروج ہیں مثلاً وہ جو یہاں فٹ پاتھ پہ طوطے لیے بیٹھے ہوئے ہیں وہ بھی قسمت کا حال بتاتے ہیں۔ یہ طریق کار انسانیت کی تذلیل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن نے اسے انتہائی شدید اور ذلیل ترین جرم قرار دیا ہے۔ میں ابھی یہ عرض کرونگا کہ اس میں تذلیلِ انسانیت ہے۔ میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا کہ انسان کو جو چیز اشرف بناتی ہے وہ اس کا اختیار وارادہ ہے۔ کوئی عقیدہ' کوئی مسلک' جو انسان کو مجبور بتائے' وہ قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ یہ مجبور ہوا تو پھر اس کے کسی عمل کی ذمہ داری اس پہ آتی ہی نہیں ہے۔ مجبور پہ تو ذمہ داری نہیں آتی اور قرآن کی ساری تعلیم کا نکتہ ماسکہ یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل یہاں تک کہ دل میں گزرنے والا خیال بھی نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے: اچھا عمل اچھا نتیجہ' خراب عمل خراب نتیجہ۔ یہ اسی صورت میں ہی اپنے اعمال کے نتائج کا ذمہ دار ہوتا ہے جب یہ صاحبِ اختیار ہو' بالارادہ ہو۔ جو اپنے ارادے سے کچھ کر ہی نہیں سکتا تو اس کام کی ذمہ داری اس پہ کیسے عائد ہو سکتی ہے! قرآنِ کریم کی طرف سے یہ سلسلہ یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام کا سلسلہ' وحی کا انبیاء کرام پر نازل ہونا' مکافاتِ عمل کا قانون' حیاتِ آخرت' وہاں

کی ساری جنت جہنم اسی ایک نکتے کے گرد گھومتی ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور ذمہ دار وہی ہوسکتا ہے جو صاحبِ اختیار اور صاحبِ ارادہ ہو۔ ایک چیز آپ کہیے کہ ''یہ مجبور ہے، صاحبِ اختیار نہیں ہے'' تو یہ سارا سلسلہ رشد و ہدایت معاذ اللہ بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے معنی کچھ نہیں رہتے۔ اس لیے قرآن نے بڑی شدت سے اس کی مخالفت کی ہے۔ یہ نجومی کی بات نہیں، اسی سے تو بات آگے چلے گی۔ جسے آپ پیشین گوئیاں کہا کرتے ہیں وہ تو مجبور کے متعلق ہوتی ہے۔ آپ صرف مجبور کے متعلق پیش گوئی کر سکتے ہیں۔

صاحبِ اختیار اور مجبور میں فرق

عزیزانِ من! آج سے سو برس بعد، چاند کو کس وقت گرہن لگے گا، کس وقت چھٹ جائے گا، آپ آج اس کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ زمین اور سورج کی گردش قوانینِ فطرت کے مطابق ہوتی ہے، جو غیر متبدل ہیں اور انہیں اختیار نہیں ہے کہ وہ اس کے خلاف کچھ کر سکیں۔ جب ان قوانین کا علم حاصل کر لیا جائے اور وہ مجبور ہوں کہ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تو وہ تو پھر آسانی سے سو برس کیا، ہزار برس سے پہلے بھی، کوئی یہ کچھ بتا سکتا ہے۔ یہ چاند اور سورج قوانین فطرت کے مطابق چلنے پر مجبور ہیں، اس لیے چاند گرہن کے متعلق بتایا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس، آپ کو ایک Scientist (سائنسدان) کی بات یاد ہوگی، جو میں نے پہلے بھی بتائی تھی۔ وہ بڑی اہم چیز ہے۔ وہ سائنسدان Limitations of Science کا مصنف[1] ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ ایک میز پہ بیٹھا ہوا ایک سائنسدان یہ بتا سکتا ہے کہ سو برس کے بعد چاند کو کس وقت گرہن لگے گا اور وہاں اسی میز پہ بیٹھے ہوئے دس سائنسدان یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ جو مکھی آ کر بیٹھی ہے وہ یہاں سے اڑ کر پھر کہاں بیٹھے گی۔ یہ دس سائنسدان کیوں نہیں بتا سکتے اور وہ ایک سائنسدان کیوں بتا سکتا ہے؟ یہ اس لیے کہ وہ ایک سائنسدان مجبور کے متعلق بات کر رہا ہے اور ان دس سائنسدانوں کے سامنے صاحبِ اختیار کے متعلق بات ہے۔ عزیزانِ من! اسے کہتے ہیں پہلے سے بتا دینا۔ وہ کہتا ہے مکھی کے متعلق نہیں بتا سکتے کہ یہ یہاں سے اڑی تو کہاں بیٹھے گی۔ اسی طرح کسی انسان کے متعلق بتانا کہ اس کے بعد وہ کیا کرے گا، انسان کو مجبور بنا دینے کے مرادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں ہونے والی چیز جو کسی قاعدے اور قانون کے تابع نہ ہو، وہ علم کے زمرے میں نہیں آتی۔

عزیزانِ من! جو بات قانون کے تابع کہی جائے گی وہ علم ہے۔ یہ جو صاحبِ اختیار کے متعلق اس طرح کہا جائے گا، وہ علم کے تابع نہیں آئے گا۔ اس لیے اس کے متعلق یہ کچھ کہنا کہ صاحب! تمہیں سال کے بعد نمونیا ہو جائے گا یا تمہیں بادشاہت مل جائے گی یا تم قید ہو جاؤ گے، یہ صاحبِ اختیار کے متعلق کہا جا رہا ہے۔ اسے علمِ غیب کہا جاتا ہے اور خدا نے کہا ہے کہ یہ خدا کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ خود نبیؐ کے متعلق کہا کہ رسول اللہ ﷺ، جو تمہیں آنے والے واقعات کے متعلق یہ کچھ باتیں بتاتے ہیں، تو یہ ہم نے انہیں وحی کے

---

[1] اس کتاب کا مصنف پروفیسر ڈبلیو۔ این سلیوان (Prof. W.N. Sullivan) ہے۔

ذریعے دی ہیں۔ اگر یہ وحی کے ذریعے نہ دیں تو خود رسول بھی نہیں بتا سکتا کہ یہ کیا ہے۔ اسے بھی علمِ غیب حاصل نہیں ہے۔ تو جب کیفیت یہ ہے کہ رسول کو بھی یہ حاصل نہیں ہے، وہ بھی کسی انسان کے متعلق پیش گوئی نہیں کر سکتا تو یہ جو آئے دن آپ کے ہاں پیشین گوئیاں ہوتی ہیں' یہ آپ کے ہاں کا سارا سلسلہ ولایت اور تصوف انہی پیشین گوئیوں کے اوپر چلا آ رہا ہے' حتیٰ کہ ہمارے ہاں تو وہ ❶ پیشین گوئیاں کر کے نبی بن گیا۔ ان سے اس بات پہ بحثیں ہوتی رہیں کہ نبی آ سکتا ہے یا نہیں۔ بات تو یہ تھی کہ کوئی انسان پیشین گوئی کر سکتا ہے یا نہیں۔ یا تو دعویٰ کرو کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ہوئی ہے اور اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم نبی ہو گئے ہو۔ بات اس پہ چلے گی۔ جب خدا یہ کہتا ہے کہ کسی انسان کو حتیٰ کہ کسی رسول کو بھی علمِ غیب حاصل نہیں بجز اس کے جو ہم وحی کے ذریعے اس کو دیں گے تو آپ سوچیے کہ پھر یہ پیشین گوئیاں کرنا' یہ نجوم کے ذریعے قسمت کا حال بتانا' یہ فٹ پاتھ پہ بیٹھے ہوئے طوطوں سے قسمتیں معلوم کرنا' ہاتھ کی لکیروں کے ذریعے سے یہ کہنا کہ یہ کچھ ہو گا' کیا یہ سب تماشا نہیں ہو رہا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ہم قرآن سے مہجور ہو گئے۔ اگر ہم اس سے راہنمائی لیں تو وہ بات بتا دیتا ہے کہ خاکِ زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں۔

قرآنِ حکیم کا حکم

جب بھی کوئی عقیدہ اس خاکِ زندہ کو خاکِ مردہ میں تبدیل کرے گا تو یاد رکھیے اور سنیے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ❷ (67:6) کفر ہے۔ جو کچھ یہ مانتا ہے وہ اپنی ذات سے کفر کرتا ہے' اپنے صاحبِ اختیار اور ارادہ ہونے سے انکار کرتا ہے۔ یہی کفر ہے۔ جو اسے یہ کچھ بتاتا ہے کہ اپنے صاحب اختیار و ارادہ ہونے سے انکار کرو وہ جھوٹ بھی بولتا ہے اور خدائی قوت بھی اختیار کرتا ہے کیونکہ یہ علمِ غیب صرف خدا کو حاصل ہے اور وہی اس کا مدعی ہوتا ہے' اس لیے وہ خدا سے انکار کرتا ہے۔ یہ دونوں کافر ہیں۔

قوموں کی جہنمی زندگی

قرآن کہتا ہے کہ یہ اپنے اختیار و ارادہ کے مالک ہونے سے انکار کرنے والا منکرِ خویش ہے اور وہ خدائی قوت کا انکار کرنے والا منکرِ خدا ہے۔ وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ❸ (67:6)۔ عزیزانِ من! عاقبت کا عذاب تو وہاں جا کے معلوم ہو گا۔ جو قومیں اپنے آپ کو صاحبِ اختیار ہی نہیں سمجھتیں اس دنیا میں ذلت و خواری کے جس جہنم کے اندر محصور رہتی ہیں وہ تو ہمیں معلوم ہے۔ ان کے گھروں کے قوانین اور پالیسیاں دوسری قوتیں مرتب کرتی ہیں۔ اس سے بڑا جہنم کیا ہو گا! جہنم کے داروغے کو

---

❶ یہ اشارہ مرزا غلام احمد آف قادیان (1835-1908) کی طرف ہے۔

❷ اور جو لوگ بھی' اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین کی' زندگی کے کسی بھی گوشے میں' خلاف ورزی کرتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ اور جو لوگ بھی' زندگی کے کسی گوشے میں' قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں' ان کا انجام تباہی اور بربادی ہوتا ہے اور یہ بہت برا انجام ہے۔ (ایضاً)

خدا نے مالک (43:77) کہا ہے۔ یہ قوتیں ان کی Masters (آقا و مالک) ہوتی ہیں، یہ اقوام صاحبِ اختیار نہیں ہوتیں اگرچہ اپنے آپ کو Sovereign Powers (اقتدارِ مطلق کی مالک) کہتی ہیں مگر یہ جھوٹ ہوتا ہے۔ یہ جہنم وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ہے۔ یہ عجیب بات آتی ہے۔ قرآنِ کریم نے جرائم کی پاداش میں جہنم کا ذکر بار بار کیا ہے۔ قرآن کہیں جحیم کہتا ہے، کہیں جہنم کہتا ہے، کہیں النار کہتا ہے، وہ بھی ٹھیک ہے۔ اس مقام پر جہنم کہا ہے۔ آگے جہنم کی جو کچھ تفصیل دی ہے، وہ اتنی شدید ہے کہ اس سے نظر آتا ہے کہ جتنا شدید، جتنا سنگین یہ جرم ہے، اسی کے مطابق اس جیل خانے یعنی جہنم کی تفصیل بتائی ہے۔ کہا ہے کہ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ (67:7) جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے تو ان کی کرب انگیز، دہشت انگیز، چیخ و پکار سنائی دے گی۔ وہ جہنم ایسے ہوگا جیسے کہ وہ اچھل رہا ہے، بھڑک رہا ہے: تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (67:8)۔ جیسے یہ کہتے ہیں کہ غصے کے مارے آپے سے باہر ہو رہا ہے یعنی اس سے جرم کی شدت یا سنگینی کی نوعیت پتہ چلتی ہے۔ یہ قرآن نے سزا کی شدت اور سنگینی بتائی ہے ورنہ اگر صرف جہنم ہی کہتا تو بھی یہ بات کافی تھی۔

میں نے عرض کیا ہے کہ اپنے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے سے انکار کرنے سے بڑا سنگین جرم اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ ایک ہی چیز ہے جو خدا نے انسان کو دی ہے۔ یہ خصوصیت جو خدا نے انسان کو عطا کی ہے اس نے اسے ''روحنا'' کہا ہے یعنی اپنی توانائی۔ وہ خدا کی توانائی ہے۔ انسان کے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کی اس حیثیت کا انکار کرنا، سب سے بڑا جرم ہے اور کسی کا اپنے آپ کے متعلق یہ سمجھنا تذلیلِ انسانیت ہے۔ اپنی ذلت کو قبول کرنا ہے۔ یہ اتنا بڑا شدید جرم ہے جس کی وجہ سے جہنم کے بعد یہ سب کچھ کہا۔ اور اس کے بعد ہے کہ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ (67:8) جب یہ پیشین گوئیاں کرنے والے اور قسمتیں بتانے والے اور انہیں ماننے والے اس میں فوج در فوج ڈالے جاتے ہیں تو جہنم کے داروغے ان سے پوچھتے ہیں۔ قرآن کا انداز تشبیہی ہوتا ہے۔ جہنم کے داروغے ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا تمہارے ہاں کوئی ایسا نہیں آیا تھا جس نے بتایا ہو کہ یہ جو تمہارے عقائد اور مسالک ہیں، ان کا نتیجہ کیا ہے؟ یہ کفر ہے، یہ شرک ہے، کیا کسی نے تمہیں نہیں بتایا تھا؟

تباہی سے پہلے دو شرطوں کا پورا کرنا

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے بار بار یہ کہا ہے کہ کسی قوم پر ہمارے قوانین کی رو سے تباہی نہیں آتی تاوقتیکہ پہلے دو شرطیں پوری نہ ہو جائیں۔ ایک یہ ہے کہ ان تک یہ بات پہنچ نہ جائے کہ تمہاری روش تباہی لانے والی ہے۔ اسے تنذیر کہتے ہیں۔ انہیں Warn (آگاہ) کر دیا جائے کہ جس روش پہ تم چل رہے ہو اس کا نتیجہ تباہی ہے۔ یہ ایک شرط ہے اور دوسری شرط یہ ہے کہ ان میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ اسے سمجھ جائیں کہ یہ کیا بات کہہ رہا ہے! کیا بات ہے اس قسم کے جج کی!! یہ کتنی عجیب شرطیں ہیں! کہ اس میں سمجھنے کی صحت ہو۔ پاگل تو جرم ہی نہیں کر سکتا، اسے کوئی بھی مجرم نہیں قرار دیتا: سمجھنے کی صلاحیت ہو اور وہ بات اس تک پہنچ چکی ہو۔

خاکِ زندہ سے خاکِ مردہ تک

عزیزانِ من! ان سے کہا جائے گا کہ تم جو اس قسم کے جرائم کے مرتکب ہوئے، تم نے جو اپنے آپ کو خاکِ زندہ سے خاکِ مردہ سمجھ لیا، کیا تمہیں کوئی بتانے والا نہیں آیا تھا کہ تمہارا مقام کیا ہے۔ یہ وہی بات ہے کہ بتانے والا آیا تھا یا نہیں۔ آگے کہا کہ **قَالُوۡا بَلٰی قَدۡ جَآءَنَا نَذِیۡرٌ** (67:9) وہ کہیں گے کہ ہاں، ہمارے پاس ایسا آگاہ کرنے والا آیا تو تھا۔ اب عزیزانِ من! یہ یاد رکھیے کہ نبی اکرم ﷺ تک یا حضورؐ سے پہلے جو یہ آنے والے تھے یہ انبیاء کرام تھے۔ ٹھیک ہے انبیاء کرام کے بعد ان کے جو متبعین تھے، جو صالحین تھے، وہ یہ فریضہ ادا کرتے تھے۔ وہ بھی نذیر تھے لیکن انبیاء کرام بہر حال آتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ تو آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد نبیوں کے سلسلے کا کوئی نذیر تو نہیں آئے گا لیکن رسول اللہ ﷺ سے بھی یہ کہا گیا تھا: **لتنذر به** (7:2) قرآن کے ذریعے تم نے یہ وارننگ دینی ہے۔

وارثانِ امت کا فریضہ

جب قرآن کو ابدی طور پہ محفوظ کر دیا اور اس امت کو وارثِ کتاب قرار دے دیا تو اب رسالتِ مآب حضور کے بعد پھر ضرورت ہی نہ رہی کہ کوئی اور نبی آ کے یہ وارننگ دے یا تنذیر کا یہ فریضہ ادا کرے۔ وہ تو قرآن کے ذریعے سے ادا کرنا تھا۔ قرآن محفوظ ہے، موجود ہے۔ امت کو اس کا وارث قرار دیدیا۔ اب یہ فریضہ اس پہ عائد ہو گیا کہ یہ وارن کرے اور جو امت خود ہی ان جرائم کی مرتکب ہو رہی ہو اس نے دوسروں کو کیا وارن کرنا ہے لیکن بہر حال یہ تھا کہ ان کے چوکیدار پوچھیں گے کہ کیا تمہاری طرف کوئی نذیر آیا تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی نبی آیا تھا یا نہیں۔ یہی چیز ہے کہ یہ جو ہم نے وارننگ دی تھی، یہ جس کتاب میں موجود تھی، کیا کوئی ایسا نہیں تھا کہ جس نے اس کتاب کی اس تعلیم کو تم تک پہنچایا ہو؟ یہ فریضہ کتنا بڑا ہے جو امت پر عائد ہوتا ہے۔ امت خود اس جرم کی بھی مجرم ہو رہی ہے۔

عزیزانِ من! ہم جو عذاب آئے ہوئے ہیں قرآن ان کی ایک ایک شق بتاتا ہے کہ تمہارے کیا کیا جرائم ہیں جس کی وجہ سے تم اس قدر ذلت آمیز عذاب کے اندر مبتلا چلے آ رہے ہو۔ سب سے بڑا عذاب، جو میں نے کہا ہے، وہ یہ ہے کہ جہنم کے داروغے کا نام مالک (43:77) ہے۔ انسان کی انسان پر محکومیت دنیا کے اندر سب سے بڑا جہنم ہے۔ ہاں تو بات یہ چلی آ رہی تھی کہ انہوں نے جہنم کے مالک سے کہا کہ ہاں آئے تو تھے۔ پوچھا کہ پھر تم نے کیا کیا؟ انہوں نے کہا کہ **فَکَذَّبۡنَا** (67:9)۔ ہم نے تکذیب کی۔ ہم نے کہا: نہیں، تم جھوٹ بولتے ہو، تم جو کچھ کہتے ہو کہ اس کے نتیجے میں ہمیں عذاب آ جائے گا، تباہی آ جائے گی، ہم ذلیل ہو جائیں گے، خوار ہو جائیں گے، یہ سب جھوٹ کا پلندا ہے۔ ہم نے ان سے بار بار کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو اور آگے بات ہے کہ **وَ قُلۡنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ** (67:9) ہم نے کہا کہ تیری طرف خدا کی کوئی وحی وغیرہ نہیں نازل ہوتی۔ ہم نے الٹا ان لوگوں کو مطعون کیا جو ان کا اتباع کرتے تھے اور برملا کہا کہ **اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ کَبِیۡرٍ** (67:9) تم بڑی گمراہی میں پڑے ہو۔ ہم بالکل ٹھیک راستے پر چل رہے ہیں۔ آگے بات

ہے کہ وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ❶ (67:10)

عقل وفکر سے کام نہ لینے والا جہنمی ہوگا

عزیزانِ من! اس آیت (67:10) میں عجیب چیز کہی ہے۔ یہ کیا چیز تھی جو قسمتیں بتا رہے تھے اور تم مان رہے تھے؟ نہ تو وہ کسی عقل وفکر کی رو سے کہتے تھے کہ یوں ہوگا اور اس میں یہ ہوگا۔ وہ تو بس جیسے علمِ غیب ہے کہ بس یوں ہوگا۔ نہ تم ہی عقل وفکر کی رو سے کسی نتیجے پہ پہنچتے تھے کہ بھئی! ایسا کیوں ہوگا؟ اس میں کیوں کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہوتا۔ سنیئے عزیزانِ من! وہ جہنم میں ڈالے جانے والے کیا کہہ رہے ہیں؟ کہا کہ اگر ہم ان کی بات غور سے سنتے (نسمع) اور پھر عقل وفکر سے کام لیتے (او نعقل) تو آج جہنم میں کیوں ہوتے۔ اب قرآن نے بتا دیا کہ جہنم میں کون لوگ جاتے ہیں۔ اور پھر اس کی تشریح اور تفسیر تو قرآن نے مختلف مقامات پر بتائی ہوئی ہے۔ قرآن عقل وفکر وتدبر وتفکر اور شعور پر بہت زیادہ زور دیتا ہے اور یہاں جہنم کی بات تو قرآن نے دو لفظوں میں ہی بتا دی کہ وہ خود اعتراف کریں کہ اگر ہم بات غور سے سن لیتے اور عقل وفکر سے کام لیتے تو ٹھیک تھا پھر ہم اٹکلوں، پیشین گوئیوں، قسمت کا حال بتانے والوں، نجومیوں اور پامسٹوں کی یہ باتیں کیوں مانتے، پھر ہم جہنم میں کیوں آتے۔ میں اس کی تفصیل میں ایک ہی اور آیت پیش کرونگا۔ سورۃ اعراف کی آیت ہے کہ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ❷ (7:179)۔ پہلے تو اس کا ترجمہ ہی دیکھیں۔ ہمارے ہاں جو ترجمے ہوئے ہیں وہ غلط راستے پہ ڈال دیتے ہیں۔ اس آیت کے ترجمے کیے جاتے ہیں کہ "خدا نے کہا کہ ہم نے جن وانس کی کثرت کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔" ذرا سوچیے کہ اگر انہیں خدا نے جہنم کے لیے ہی پیدا کر دیا تو اب یہ جنتی کیسے بن سکتا ہے؟ ان تراجم میں کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔ آپ سوچتے ہیں کہ یہ تراجم کہاں لے جاتے ہیں۔ پھر ان تراجم میں جنات کی بات ہے۔ وہ انہیں بھی جہنم میں بھیجتے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ عربی محاورے میں، اور عربی زبان کے استعمال میں قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ یہ جو وہاں صحرائی آبادیاں تھیں، شہروں سے دُور دُور رہنے والی وہ عرب انہیں صحرائی آبادی کہتے تھے اور وہاں کے رہنے والے خانہ بدوش کہلاتے تھے اور آج بھی وہاں عرب کے اندر وادئ حجاز کے اندر، تو شہر ہی دو تین ہیں، وہ بھی اب ذرا ماڈرن ہوئے ہیں تو ان کو شہر کہا جاسکتا ہے ورنہ وہ بھی قصبے ہی تھے اور وہ دو تین ہی تھے۔ باقی سارا ملک صحرائی آبادی تھی، خانہ بدوش تھا، آج یہاں، کل وہاں، آنکھوں سے دُور۔ تو جو چیز بھی آنکھوں سے نہاں ہوا اسے عربی زبان میں جن کہتے ہیں اور انس وہ ہوتے ہیں جو Socially، مل جل کر رہنے والے

---

❶ اور انہوں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ ہم نے عقل وفکر سے کام ہی نہ لیا۔ یونہی تعصب، ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید کی بنا پر ان کی مخالفت کرتے رہے۔ اگر ہم بگوشِ ہوش ان کی بات سنتے اور عقل وفکر سے کام لیتے تو آج جہنم میں کیوں ہوتے؟...... جہنم میں جاتا ہی وہ ہے جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتا۔ (7:179)

❷ اور انسانوں کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ...... مہذب اقوام ہوں یا جاہل بادیہ نشین...... وہ زندگی، جہنم میں گزارتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہوں۔اس طرح شہری آبادیوں کو وہ انس کہتے تھے اور ان دیہاتی اور صحرائی آبادیوں کو جن کہتے تھے۔

عقل وفکر سے محروم لوگ

قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی زبانِ حال سے پکار کر کہدیں گے کہ ہم جہنم کے رہنے والے لوگ ہیں۔کون ہیں یہ لوگ؟**لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا** (7:179) سمجھنے سوچنے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں مگر اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن اہلِ جہنم کی کیا بات بتا رہا ہے۔یہ ان کے اختیار کی بات ہے۔**لَهُمْ قُلُوْبٌ** (7:179) قرآن کے الفاظ دیکھیے:**لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا** ❶ (7:179)۔اگر یہ ہوتا کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے تو صرف **لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا** ہوتا۔تو پھر سارے مجبور ہو جاتے۔پہلے وہ کہتا ہے کہ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے اس کے باوجود اس سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔یہ جہنم کی پہلی چیز ہے اور آگے ہے کہ **وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا** (7:179) آنکھیں رکھتے ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔آنکھیں رکھتے ہیں! پھر ہے کہ **وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا** (7:179) کان رکھتے ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔اندھے، بہرے، گونگے، بنے رہتے ہیں، عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔اب پتہ چل گیا کہ وہ کون لوگ ہیں جو جہنم میں جانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ** ❷ (7:179) یہ وہ لوگ ہیں جو ہمارے "**لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ**" قانون کو توڑ رہے ہیں۔یہ لوگ ان سننے اور عقل وفکر کی صلاحیتوں کو رکھنے کے باوجود ان سے کام نہیں لیتے۔یہ لوگ ہیں جو جہنم میں جانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہے ہیں۔جہاں کہیں ایسے لوگ نظر آئیں، سمجھ لو کہ یہ اہلِ جہنم ہیں۔یہیں اسی دنیا کے اندر پہچان ہوگئی کہ اہلِ جہنم کون لوگ ہیں: وہ جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔اب آپ کے ہاں کا جو مروج اسلام یا شریعت چلی آ رہی ہے اس میں عقل سے کام لینا ہی ممنوع ہے۔قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کی تو صورت وکیفیت ہی بتا دیتی ہے کہ یہ جہنم کے رہنے والے لوگ ہیں۔آگے قرآن کریم نے کہا کہ **اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ** (7:179) یہ لوگ انسان نہیں، بالکل حیوان ہوتے ہیں۔

مکھی سے بھی گئے گزرے

عزیزانِ من! پہلے جو کہا کہ یہ انسانی سطح کے اوپر نہیں، حیوانی سطح پہ ہیں اور اس کے فوراً ہی بعد یہ کہا کہ **بَلْ هُمْ اَضَلُّ** (7:179) بلکہ ان حیوانوں سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔یہ تو مکھی سے بھی گئے گزرے ہیں۔وہ بھی اپنے اختیار سے اڑ کر، جہاں جی چاہے بیٹھے مگر یہ

---

❶ وہ قلوب سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔

❷ یہ لوگ ہیں جو جہنمی زندگی گزارتے ہیں۔

حیوانات عقل وفکر سے کام لیتے ہی نہیں۔ کسی گائے پہ بھی دھوپ آجاتی ہے تو وہ اٹھ کے سائے میں چلی جاتی ہے۔ یہ حضرت انسان نہیں اٹھتا۔ یہ کہتا ہے کہ خدا نے میری قسمت میں لکھا ہی ایسا ہے تو میں وہاں سے کیسے اٹھ سکوں۔ عقل وفکر سے کام نہیں لیتا۔ آگے کہا کہ **اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ** (7:179) بے خبر رہتے ہیں۔ کیا بات ہے غٰفلون کی! کہ سب کچھ رکھتے ہیں لیکن اس کی طرف سے بے خبر ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ یہ چیزیں نہیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں' ان کو کام میں نہیں لاتے۔ یہ ہے جو انہوں نے کہا کہ **لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ** (67:10) اگر ہم غور سے ان کی بات سنتے اور پھر عقل وفکر کی رو سے اسے جانچتے پہچانتے تو آج ہم جہنم میں کیوں ہوتے۔

قرآن کا بلا معنی سننا اور بلا سمجھے پڑھنا

عزیزانِ من! جہنم سے الگ ہونے یا جہنم سے بری ہونے کی بات ایک ہی ہے۔ اس کا معیار قرآن نے بتا دیا کہ جو بات کہی جائے کہ خدا نے یہ کہا ہے' اس کو غور سے سنا جائے اور پھر عقل وفکر سے کام لے کر اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ عقل وفکر سے کام لیا جائے۔ یہاں ہمارے ہاں جو سمع' یعنی سننا ہے' وہ سننا ایسا ہی ہے۔ قرآن جتنا سنا جاتا ہے کوئی کتاب ایسی نہیں جو اتنی سنی جائے۔ وہ ایسا سنا جاتا ہے کہ جس کے بعد عقل وفکر کا اس میں دخل نہیں ہوتا: بلا معنی الفاظ سنے جاتے ہیں جن کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا' جس کے معنی معلوم نہیں ہیں' ناظرہ پڑھ رہے ہیں' حافظ سے سن رہے ہیں' نہ حافظ صاحب کو علم ہے جو میں پڑھ رہا ہوں اس کے معنی کیا ہیں' نہ سننے والے کو علم ہے کہ جو میں سن رہا ہوں اس کے معنی کیا ہیں۔ تو کیا اس سننے کو سننا کہیں گے؟ ان جہنم میں جانے والوں نے جو کہا ہے کہ اگر ہم سنتے اور پھر عقل وفکر سے کام لیتے تو کبھی جہنم میں نہ جاتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جو الفاظ سنیں' ان کے معنی معلوم کریں۔ جن الفاظ کے معنی آپ کو معلوم نہ ہوں تو اس کے بعد ان الفاظ پہ عقل وفکر سے غور کرنے کے معنی ہی کچھ نہیں ہوتے۔ اسی لیے تو کہا کہ **اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ** (7:179) یہ لوگ انسان نہیں' بالکل حیوان ہوتے ہیں۔ وہ تو ایسے ہی ہے جیسے آپ نے ایک بھینس کو بھی سنا دیا اور ایک انسان کو بھی سنا دیا۔ اسی لیے سورۃ الملک میں کہا کہ **مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ o فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِہِمْ** [1] (67:10-11) یہ تھے وہ لوگ جنہوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ یہ بھی ایک عجیب اصول ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کے مقامات ایسے اصول بیان کر جاتے ہیں جہاں سے مملکتوں کے دستور بھی مرتب ہو سکتے ہیں اور قوانین کے ضابطے بھی۔

---

[1] آج ہم اس جہنم میں نہ ہوتے۔ وہ اس طرح عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اپنے جرائم کا اقرار واعتراف کرتے ہیں۔

ضابطہ انصاف کے دو بنیادی اصول

اب یہاں انہی دو آیتوں سے آپ دیکھیے کہ کیا ضابطہ قانون مقرر ہوتا ہے' کونسا قانون مقرر ہوتا ہے؟ اس سے یہ متعین ہوتا ہے کہ جس کو سزا دی جا رہی ہے یا سزا دی جانی ہے یا جس کو مجرم قرار دیا جانا ہے' پہلے اس سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ کیا تم تک یہ قانون پہنچ چکا تھا جس کی رو سے تمہیں اب یہ سزا دی جا رہی ہے۔ تو کسی کو مجرم قرار دینے کی پہلی چیز یہ ہوگئی کہ اس تک وہ قانون پہنچ چکا ہو۔ غور کیجیے گا کہ یہ کتنی بڑی اہم شق ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ "اَوْ نَعْقِلُ" اس میں اس قانون کے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ اگر نہ ہو تو سمجھانے والے موجود ہوں۔ وہ جہنم کے چوکیدار (67:8) نے جو کہا ہے کہ کیا وہ تمہارے پاس نہیں آئے تھے جنہوں نے تمہیں وارننگ دی تھی کہ ایسا کرو گے تو ایسا ہو جائے گا۔ تو معلوم ہوا کہ مملکت کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسا انتظام کرے کہ ہر فرد تک وہ قانون اس شکل میں پہنچے کہ وہ سمجھ جائے کہ قانون کا مطلب کیا ہے۔ پھر یہاں سے اس کی اگلی شق یہ مرتب ہوئی کہ ہر مجرم یا ملزم کو اس کا موقعہ بہم پہنچایا جائے کہ وہ Explain (واضح) کرے' وہ اپنی مدافعت میں جو کہنا چاہتا ہے' کہے۔ اسی لیے کہا ہے کہ ابھی جہنم کے اندر نہیں گئے ہیں' وہ باہر ہی ہیں۔ وہ چوکیدار جو اس سے باہر ہیں' پوچھتے ہیں کہ کیا تمہاری طرف یہ وارن کرنے والے آئے تھے یا نہیں آئے تھے۔ اب انہیں موقعہ دیا گیا۔ نہیں آئے ہوں تو وہ وہیں کہہ دیں کہ نہیں صاحب! ہم تک تو نہیں آئے تھے' پھر ان کے اوپر کوئی جرم ہی عائد نہیں ہوگا۔ انہیں جہنم میں نہیں بھیجا جائے گا۔ تو گویا ہر ملزم کو یہ موقعہ بہم پہنچانا چاہیے کہ وہ اپنی Defence 'اپنی مدافعت' میں جو کہنا چاہتا ہے' کہے۔

مدافعت کا حق اور قرآنِ حکیم سے قوانین سازی کا طریق

خدا نے تو ابلیس سے بھی یہ کہا تھا کہ تو نے کیوں سجدہ نہیں کیا۔ اپنی پوزیشن Explain (واضح) کرنے کا اس کو بھی موقع دیا تھا۔ اپنی مدافعت میں جو کچھ وہ کہنا چاہے اس کے لیے خود پوچھا۔ تو گویا یہ چیز بھی آئی کہ قانون وہی قانون کہلائے گا کہ جس میں ملزم کو یہ پورا موقعہ دیا جائے کہ اس نے مدافعت میں جو کہنا ہے وہ کہے۔ اس کے بعد اگر وہ چیز جرم ثابت ہوتی ہو تو پھر وہ مستوجبِ سزا قرار پائے گا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن میں یہ ضروری نہیں کہ یہ احکام یا قوانین' قوانین کی شکل میں ہی دیئے گئے ہوں' اس میں جو اصول دیئے گئے ہیں' وہاں سے قوانین مستنبط ہو جاتے ہیں۔ یہ طریقہ ہے قرآن سے قوانین سازی کا۔ ❶ ابلیس جیسے ملزم کو بھی جب بغیر مدافعت پیش کیے مستحقِ سزا نہیں قرار دیا جاتا تو اور پھر دوسرے کون ہیں جو مستوجب سزا قرار دیں۔ خدا بھی ان سے پوچھتا ہے۔ وہ تو اتنی بڑی مطلق قوتوں

---

❶ اس نکتے کی مکمل تفصیل کے لیے ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ یہ پمفلٹ ملاحظہ فرمائیے:

Prof. Dr. Manzoor-ul-Haque (Compiled): Quranic Constitution in an Islamic State: The Basis of Legislation and Outlines of the Constitution, Idara Tolu-e-Islam (Regd), Lahore, October, 2002.

کا مالک ہے اور پھر اسے علم بھی ہے اس کے باوجود وہ یہ چیزیں اس لیے قرآن میں بیان کرتا ہے کہ یہ ہمارے لیے ہدایت اور Guidance اور راہنمائی ہے کہ قوانینِ مملکت کے اندر یہ چیزیں ہونی چاہئیں۔ اس انداز سے یہ ساری بات آئی ہے کہ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ (67:11) انہوں نے اپنے جرم کا خود اعتراف کیا ہے۔ یہ سارے دلائل اس طرح سے بیان ہو جائیں اور ملزم کو معلوم ہو کہ بنائے ہوئے گواہ بھی جھوٹے نہیں ہیں اور یہ جج بھی کسی کے کہنے پہ نہیں چلے گا: وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ❶ (7:181)

انصاف کی شرط: قانون کا بذاتِ خود عدل پر مبنی ہونا ضروری ہے

قرآن نے عدل کہا ہے۔ اسے آپ قانونی عدل بھی کہتے ہیں۔ یہ وہی ہے جس کا نام ہمارے ہاں Justice (انصاف) رکھا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں Justice (انصاف) کی Definition یا تعریف یہ ہے کہ مروجہ قانون کے مطابق جو فیصلہ ہوٗا اسے عدل کہتے ہیں۔ ساری دنیا میں یہ مسلمہ ہے۔ اور قرآن، جس کی تعلیم بے مثال ہے، کہتا ہے کہ اگر وہ قانون ہی بے عدل ہو، عدل پہ مبنی نہ ہو تو اس کی رو سے دیا ہوا فیصلہ عدل کیسے کہلائے گا؟ پہلے اس قانون کا مبنی بر عدل ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے اس نے کہا کہ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (7:181) صحیح مملکت وہ ہے جو اس الحق یا اس Truth (صداقت) یا اس قرآن کے مطابق فیصلے دے، پھر وہ عدل کہلائے گا۔ جب یہ صورت ہو کہ وہاں یہ یقین ہو کہ یہ شاہد ایسے ہیں کہ جو بنائے ہوئے نہیں ہیں یا بنائے نہیں گئے، جج بھی میرے خلاف کوئی اس قسم کی چیز نہیں کرے گا، یہاں نہ کوئی سفارش قبول ہوگی، وہ جو قرآن نے کہا ہے نہ سفارش قبول ہوسکتی ہے نہ کفارہ دے کر چھوٹا جا سکتا ہے، نہ کوئی اس کی جگہ کھڑا ہوسکتا ہے، نہ کوئی اس کی مدد کر سکتا ہے۔ یہ اس قسم کا عدل کا نظام ہے۔ ان چیزوں کا یقین ہو کہ جو فردِ جرم عائد کی جائے اس میں مدافعت کا پورا موقعہ دیا جائے پھر اس کے بعد اس پہ جو فردِ جرم عائد کی جائے وہ اتنی معقول ہو کہ وہ سمجھیں بھی اور کہیں بھی کہ بات ٹھیک ہے۔ اس کے بعد کہا کہ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (67:11) یہ ہیں وہ اصحاب سعیر جن کے لیے واقعی بہت ہی محرومیاں ہیں۔ زندگی کی جتنی بھی محرومیاں ہوسکتی ہیں وہ ان کا حصہ ہیں۔ وہ زندگی کی خوشگواریوں سے بہت دُور ہٹ جاتے ہیں۔ عذاب یہ ہے کہ انہیں زندگی کی خوشگواریوں اور فراوانیوں سے محروم کر دیا جائے گا۔ یہ ہے حقیقت میں عذاب۔ ان کے برعکس ایک دوسرا گروہ بھی ہے جس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ❷ (67:12)۔ یہاں ایک لفظ ''غیب'' بھی کہا۔ جو خدا کے قوانین سے خطرے یا خوف یا اس بات کا بالغیب احساس رکھتے ہیں کہ اگر ان کی خلاف ورزی کی تو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا، عذاب ہوگا۔

---

❶ اور اس کے ذریعے اعتدال اور توازن کو ہمیشہ برقرار رکھتے ہیں...... اسی کو حق و عدل کے ساتھ فیصلے کرنا کہتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات کی روسے، اپنے اعمال کے اَن دیکھے نتائج کو اپنی نگاہوں میں رکھتے ہیں اور غلط اعمال کے عواقب سے خائف رہتے ہیں، ان کے لیے ہر قسم کی تباہیوں سے بچنے کا سامان ہے اور ان کی محنتوں کے نہایت شاندار نتائج ہیں۔ (ایضاً)

بالغیب کیا چیز ہے؟

یہاں یہ ''بالغیب'' کیا چیز ہے؟ ایک چیز تو ایسی ہوتی ہے جسے وہ ہاتھوں پہ سرسوں جمائی ہوئی کہتے ہیں۔ اسے یوں سمجھو کہ ماچس یوں کی' بس آگ نکل آئی' فوری سامنے آ گئی ہے۔ اس ماچس کو یوں کرنے کا نتیجہ فوری سامنے آ جاتا ہے۔ چیز یہ ہے کہ تم یقین رکھتے ہو یا نہیں کہ یوں کرنے سے اس میں سے آگ نکل آئے گی۔ اس نے ثبوت کے لیے کہا: ٹھیک یوں کیجیے آگ نکل آئی۔ اس کے برعکس ایک عمل وہ ہے جو کسان کی طرح ہے۔ بڑی محنت اور مشقت سے وہ زمین کو تیار کرتا ہے' پانی دیتا ہے' پھر وہ بیج کاشت کر دیتا ہے۔ نہایت عمدہ تندرست و توانا بیج' جسے کہا جاتا ہے کہ وہ اسے مٹی میں دبا دیتا ہے۔ روز صبح آتا ہے' سارا دن وہ اس کھیت کی دیکھ بھال اور حفاظت کرتا ہے' پانی دیتا ہے' اس میں سے جھاڑ جھنکاڑ الگ کرتا ہے' شام کو خالی ہاتھ اسی طرح واپس چلا جاتا ہے۔ ایک دن نہیں' دو دن نہیں' مہینوں یہ کچھ کرتا رہتا ہے' اس کی محنت کا کوئی ثمر اس کے سامنے نہیں آتا۔ وہ روز یہ کیوں کرتا ہے؟ کونسی یقین کی بات ہے جو اس کو ہر روز آمادہ کر دیتی ہے کہ شام کو خالی ہاتھ واپس آئے' صبح پھر اسی طرح سے وہاں چلا جائے؟ وہ کونسی بات ہے جو اس سے یہ کچھ کراتی ہے؟ اس بات پر ایمان کہ اس دانے سے فصل اُگے گی اور اس سے اتنی فصل میرے پاس آئے گی۔ اسے کہتے ہیں ایمان بالغیب۔ جو نتائج فوری طور پہ سامنے نہ آئے ہوں لیکن اس بات کا یقین ہو کہ ایسا ہو کر رہے گا' یہ ایمان بالغیب ہے۔ یہ غیب کس چیز پہ ہے' کس بات کا ہے؟ اس بات کا ہے کہ وہ بیج صاحبِ ارادہ نہیں کہ جی چاہے اُگ گیا' جی چاہے نہ اُگا' وہ مجبور ہے کہ اسے قانون کے تابع چلنا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے نہیں چل سکتا۔ وہ قانون کے ہاتھوں مجبور ہے: زمین صحیح ہے' بیج اچھا ہے' کھاد دی گئی ہے' وقت پر پانی دیا گیا ہے' بیج صالح ہے' اس کے بعد رکھوالی کی گئی ہے' دھوپ اس کو ملتی ہے' ہوا اس کو ملتی ہے' پانی ملتا ہے' رکھوالی ہوتی ہے۔ یہ زراعت سے متعلق سارے قانون ہیں۔ ان قوانین کے تابع وہ بیج رکھا ہوا ہے' جو چل رہا ہے۔ اب اس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ ان کے خلاف کچھ کرے۔ اس بیج سے قرآن کے الفاظ میں سو سو دانے پیدا ہو کر رہیں گے۔ یہ جو اپنی محنت کے اَن دیکھے نتیجے پر ایمان ہے' یقین ہے' اسے کہتے ہیں ایمان بالغیب۔

صبر کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! قرآن نے شروع ہی میں کہا ہے کہ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ [1] (2:3)۔ یہ ہر کوشش کے لیے ہے۔ پہلے ہی دن یہ کوشش برومند نہیں ہو جاتی' بڑا لمبا عرصہ لگتا ہے' روز محنت اور مشقت ہوتی ہے' نتیجہ سامنے نہیں آتا لیکن جن قوموں کو ان قوانین کا علم ہے' جن کی رو سے وہ کام کر رہی ہیں' انہیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ خیز ہو کر رہیں گی۔ وہ نہ تھکتی ہیں' نہ گھبراتی ہیں' نہ مایوس ہوتی ہیں' نہ اسے

---

[1] وہ اُن حقیقتوں پر یقین رکھتے ہیں جو نگاہوں سے اوجھل ہیں اور صحیح روش کے اُن نتائج پر بھروسہ رکھتے ہیں جو اگرچہ ابتداءً اُن کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن جن کا آخر الامر سامنے آ جانا یقینی ہوتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

درمیان میں چھوڑ دیتی ہیں۔ یہ ہے جسے قرآن نے صبر کہا ہے۔ صبر کے معنی یہ نہیں ہوتے جو ہمارے ہاں رائج ہیں کہ جب کچھ نہ ہو سکتا ہو' بے کسی' بے بسی اور لاچارگی ہو' کچھ نہیں ہو سکتا: ''نی بہن صبر کر' ہن ہو کی سکدا ہیگا۔ بہن ای نئیں' بھراواں نوں وی تے ایہوای کیا جاندا اے کہ میاں! صبر کرو۔''❶ قسمت کا لکھا جھولی میں آ گیا' اب کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے ہاں یہ صبر ہے۔ قرآنِ کریم میں صبر کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح وہ کسان مہینوں چلا جاتا ہے' مسلسل متواتر استقامت کے ساتھ' اسے کہتے ہیں صابر۔ کہا کہ یہ جو ایمان بالغیب ہے' یہ صبر کا متقاضی ہے۔ یاد رکھو! اس پہ یقین ہونا چاہیے۔ یہ چیز جو قرآن نے کہی ہے کہ **اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ** (6:21) ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ یہ اس نے ایک قانون دیا' اصول دیا ہے اور اس کے لیے **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (6:34) کہا ہے کہ اس میں تبدیلی نہیں ہو گی۔ مظلوم کو یقین ہونا چاہیے کہ ایسا ہو کر رہے گا لیکن ایسا ہو گا کیسے؟ یہ ان قوانین کے ماتحت ہو گا جو قرآن نے بتائے ہیں: یہ کرو گے تو پھر ظالم کی کھیتی اجڑے گی اور اگر تم بھی اس ظالم کے ساتھ شریک ہو جاؤ گے تو پھر ظالم کی کھیتی رات دوگنی اور دن چوگنی بھی پکے گی۔ یعنی یہ یقین کہ ظلم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی' یہ ہے وہ جو اس کسان کو دانے کی برومندی پر یقین ہے اور پھر اس کے آگے وہ عمل شروع ہوتا ہے۔

کوئی عمل فوری طور پر نتیجہ خیز نہیں ہوتا

عزیزانِ من! انسانوں کے متعلق قرآن نے جتنے بھی قوانین بتائے ہیں ان میں بھی یہ صورت ہے کہ وہ اسی دن نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ یہ جو روز آ کے شکایتیں ہوتی ہیں کہ صاحب! کہا جاتا ہے کہ خدا عادل ہے' انصاف کرتا ہے' ظالم پنپ نہیں سکتا' ہم روز دیکھتے ہیں کہ ظالم پنپتا ہے' بے ایمانی کرنے والے دن بدن دولت کے انبار اکٹھے کرتے جاتے ہیں' کوئی کاروبار دیانتداری سے چل ہی نہیں سکتا۔ یہ سارا کچھ کیا ہے؟ ہمیں خدا کے ان قوانین پر ایمان نہیں۔ اور پھر یہ قوانین نتیجہ خیز کیوں نہیں ہوتے؟ ہم اس کسان کی طرح نہیں ہیں جو چھ مہینے محنت کرتا ہے' قانون کے مطابق عمل کرتا ہے' پھر کہیں جا کر اس کا عمل نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ ہم تو گھر میں بیٹھے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صاحب! اگر خدا کا قانون ہے کہ ایک دانے سے سو سو دانے اُگیں گے تو جس دن اگیں گے ہم جا کے ان کو لے لیں گے۔ یوں نہیں ہے۔ تو یہ ہے جسے ایمان بالغیب کہا جاتا ہے۔ ہر وہ محنت کار' ہر وہ مزدور' ہر وہ صنعت کار جسے یہ یقین ہے کہ میں جو کر رہا ہوں' جو مشین میں بنا رہا ہوں' جو کلاک میں فٹ کر رہا ہوں' پتہ نہیں اس پہ چھ مہینے لگ جائیں' سال لگ جائے لیکن ایک دن یہ چلتا ہوا بن جائے گا اور اس کا اتنا کچھ مل جائے گا' وہ روز فاقے کاٹ کے بھی اس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ یہ یقینِ محکم اور عمل پیہم ہے اور یقینِ محکم خدا کے قوانین کی محکمیت پر ہے کہ وہ غیر متبدل ہیں یقیناً ایسا ہو گا جو قرآن کہتا ہے۔ ہم نے ان کی تکذیب کی ہے۔ تکذیب یہ ہے کہ ان میں وہ یقین باقی نہیں رہا۔ انہوں نے یہ کہا کہ نہیں صاحب! جھوٹ ہے' ہم نے دیکھا ہے بے ایمان سب سے زیادہ پنپتا ہے' جو بددیانت دوکاندار ہوتا

---

❶ اے بہن! صبر کرو' اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ بہنوں کو ہی نہیں' بھائیوں کو بھی یہی کہا جاتا ہے کہ میاں! صبر کرو۔

ہے وہ دیکھیے کیسے Flourish (پھلتا پھولتا) کرتا ہے۔ یہ ہے تکذیب خدا کے قوانین کی۔ جب یہ صورت ہوجائے گی تو پھر وہ کچھ دیانتداری کے لیے کام کرنے پہ آمادہ ہی کیسے ہوسکتا ہے۔ اَن دیکھے نتائج پر یقین: یہ ہے ایمان بالغیب۔ یہاں کہا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ (67:12)۔ اس کا ترجمہ ہوگا ''جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔'' یہ ڈرنا اور خوف کھانا کیا ہے؟ یہ بھی سوچنے کی چیز ہے۔

بچپن سے ہی خوف و ہراس

آج کی سائیکالوجی میں تو یہ ڈرنا اور خوف کھانا ایک طرف رہا' قرآن کہتا ہے کہ وہ جو ہمارے قوانین کے مطابق امت تیار ہوگی' معاشرہ تیار ہوگا' جو مومن ہوگا ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (2:38) ان پہ خوف و حزن ہی نہیں ہوگا اور یہاں ہمارے ہاں بچپن سے' پہلے ہی دن سے' جو اللہ میاں سے ڈرانا شروع کیا جاتا ہے کہ بس وہ اللہ میاں آپ کے لیے بالکل خوف کا مجسمہ بن جاتا ہے: ڈر' ڈر' ڈر۔ اور ڈر سے تو انسانیت کچلی جاتی ہے۔ یہ الفاظ ہیں: یخشون ۔ خشیٰ کے اس لفظ میں بات ڈر کی نہیں ہوتی۔ یہاں ہے: ھُمْ مِّنْ خَشْیَۃِ رَبِّھِمْ (23:57) جہاں بھی اللہ' رب کے لیے' قرآن یہ کہتا ہے' اس کے معنی ہیں ''ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں' ان سے مجتنب رہو' ان سے ڈرو' ان سے خوف کھاؤ کہ اس کے اس کلام کی خلاف ورزی کی تو ہم تباہ ہوجائیں گے۔ یہ ہے ڈرنا۔ یہ بالغیب ڈرنا ہے کہ فوری طور پہ تمہارے سامنے یہ تباہی نہیں آجائے گی۔

مہلت کا وقفہ خدا کی رحمت ہے

قرآن میں بیشمار مقامات پہ ہے کہ مخالفین نبی اکرم ﷺ سے بار بار کہتے ہیں' ہر نبی سے یہی کہتے تھے کہ جس تباہی کے لیے تم ڈراتے ہو وہ ہم پہ لاؤ' جلدی کرو' لاؤ' لاتے کیوں نہیں ہو؟ اللہ تعالیٰ نے اس پہ کہا ہے کہ یہ خدا کی اس رحمت کو Realise (محسوس) نہیں کرتے' محسوس نہیں کرتے کہ غلط کاری کے اعمال میں ہم فوری گرفت نہیں کرتے۔ غلط کاری کے اعمال اور ان کے نتائج کے درمیان ایک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے اس لیے کہ شاید یہ لوگ سمجھ جائیں۔ سمجھنے کے بعد اپنی غلط روش کو چھوڑ دیں' صحیح روش اختیار کرلیں تو پھر یہ تباہی سے بچ جائیں گے۔ قرآن نے کہا ہے کہ اگر تم یہ کرلو تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ مجھے کیا پڑی ہے کہ پھر میں تمہیں عذاب دوں' مجھے کوئی اس چیز میں مزا تو نہیں آتا۔ تو یہ جو مہلت کا وقفہ ہوتا ہے' یہ بھی قانونِ مکافاتِ عمل کا ایک لاینفک جزو ہے اور واقعی خدا کی رحمت ہے۔ جس دن ذرا سی بدپرہیزی کی جائے' اگر اسی دن سرطان ہوجائے تو پھر تو کوئی بچ ہی نہیں سکتا۔ اس وقفے میں' اس مہلت کے دوران' چھوٹی چھوٹی Symptoms (علامات) سامنے آتی ہیں: اس سے اندازہ لگ سکتا ہے۔ اگر تم توجہ سے غور کرو کہ میں نے یہ بدپرہیزی کی تھی' اس سے ایسا میرے اندر کچھ ہورہا ہے تو اس دوران میں جو مہلت کا وقفہ ہے' تم علاج کرسکتے ہو' اصلاح کرسکتے ہو۔ اور اگر فوری گرفت ہوجائے تو کوئی بچے ہی نہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ اگر ہم فوراً پکڑنے لگ جائیں تو دنیا میں کوئی انسان باقی ہی نہ رہے۔

مغفرت کا مفہوم

عزیزانِ من! کون ہے جس سے بد پرہیزی نہیں ہوتی؟ اس نے بد پرہیزی کے بعد اس کا علاج بھی رکھا ہے' اصلاح کا سامان بھی رکھا ہے' عقل و فکر بھی تمہیں دی ہے' صاحبِ اختیار بھی بنایا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کے لیے وہ انہیں بالغیب ڈرنے والے کہتا ہے۔ ان کے لیے **لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ** ❶ (67:12) کہا ہے۔ کیا بات ہے! ہمارے ہاں مغفرۃ کے ترجمے کے لیے بخشش کا لفظ آتا ہے۔ وہ فوراً بخشش کے اوپر آ گئے' ان فقیروں اور گداگروں کا بخشش کے بغیر کام ہی نہیں چلتا ہے۔ اِن کے ہاں تو بہشتِ فی سبیل اللہ است۔ یہاں کی ایک چیز گداگری تو الگ رہی' بخشش کی دعا کرتے رہو' اللہ میاں سے بہشت بھی ہمیں بخشش میں مل جائے گا: جا جھولیاں پھیلا دے' جا' بابا! تیرا بھلا ہو۔ ''او ہن کہے گا: پا بھئی! ٹوکری دے وچ لیکن اوتے باسی روٹی دیندے ہوندے نیں فقیرنوں۔'' ❷ نہیں' میرے عزیز! مغفرۃ Protection (حفاظت) ہے' حفاظت ہے۔ یہاں کہا ہے کہ انہیں اپنے غلط قدم کے نتائج برآمد ہونے سے حفاظت مل جاتی ہے۔ تباہی کے وہ نتائج جلدی نہیں برآمد ہوتے' اصلاح کے لیے وقفہ دیا جاتا ہے۔

مغفرۃ کیسا عجیب لفظ ہے! یہ وہ چیز ہے جسے Preventive (حفظ ماتقدم) کہتے ہیں۔ یہ Medicine (علم ادویات) کی اصطلاح میں ایسی چیزیں ہیں جو حفاظت کا سامان بہم پہنچاتی ہیں تا کہ کسی قسم کا کوئی نقصان ہی نہ ہو۔ اسے مغفرت کہتے ہیں۔ یہ Preventive (حفظ ماتقدم) بڑی چیز ہوتی ہے۔ یہ ہے **وَ اَجْرٌ كَبِيْرٌ** (67:12)۔ اگر انسان یہ کچھ کرے تو پھر وہ بہت بلند نتائج ہیں جو برآمد ہوتے ہیں' Protection (حفاظت) بھی ملتی چلی جاتی ہے اور اس کے نتائج بھی بہت بلند و بالا برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سب کچھ ہوگا کیسے؟ اس کے لیے قرآن کریم نے کہا کہ **وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ** (67:13) لیکن یہ چیزیں اس طرح نہیں حاصل ہو سکتیں کہ تم زبان سے ان قوانین کا احترام کرتے رہو اور دل میں ان کے خلاف پروگرام بناتے رہو۔ اس طرح تم خدا کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم اپنے ارادوں کو ظاہر کرو یا مخفی رکھو' خدا کے نزدیک یکساں ہے۔ اپنے اعمال کے لیے قرآن انسان کے بااختیار و ارادہ ہونے یا ذمہ دار ہونے کی بات کہتا ہے۔ وہ یہی نہیں کہتا کہ جو ظاہر میں تمہارے اعمال سامنے آ جائیں وہی جرم یا وہی نتیجہ خیز ہونگے۔ اس نے تو یہ بھی کہا ہے کہ دل کا ہر ارادہ اور نگاہ کی ہر خیانت کے بھی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ دل کے ارادے ہی سے تو جرائم کی ابتداء ہوتی ہے۔ یہ تخم ہوتا ہے اور بات ہی یہ ہے۔

---

❶ ان کے لیے ہر قسم کی تباہیوں سے بچنے کا سامان ہے' اور ان کی محنتوں کے نہایت شاندار نتائج ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ وہ اب کہے گا کہ بھئی! اب میری ٹوکری میں ڈال دو۔ لیکن وہاں تو فقیر کو باسی روٹی دیتے ہیں۔

پہلے ارادہ، پھر عمل، پھر اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! بات ہی ارادے سے چلتی ہے۔ انسان پہلے ارادہ کرتا ہے تو پھر اس کے بعد اس کے لیے قدم اٹھاتا ہے۔ قرآن کا قانونِ مکافاتِ عمل یہ ہے کہ وہ ارادے پہ بھی گرفت کرتا ہے اور اگر واقعی ارادے پہ گرفت ہو جائے اور انسان وہیں رک جائے تو جرم سرزد ہی نہ ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ ارادے پہ کنٹرول کس طرح سے ہوتا ہے؟ یہ کنٹرول صحیح تعلیم سے، صحیح تربیت سے ہوتا ہے۔ اس تعلیم سے اگر دلوں کے اندر یہ یقین پیدا ہو جائے کہ یہ جرائم ہیں، ان کا ارتکاب نہیں کرنا، مجھے اس کی سزا ملے گی۔ اگر انسان کے اندر کی یہ آواز ہو جائے تو جرائم رک جائیں گے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے یہ تعلیم دی تھی۔

باہر کی بیڑیاں نتیجہ خیز نہیں ہوتیں

عزیزانِ من! رسول اللہ ﷺ کا بھی یہ فریضہ بتایا کہ **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ** ❶ (62:2)۔ انہوں نے قانون کی تعلیم دی اور قانون کی علت و غایت بتائی کہ یہ قانون کیوں ایسا بنا ہے۔ اِس قسم کی تعلیم کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ نے وہ امت تیار کی تھی۔ سب سے پہلے اگر کسی کو کسی معاشرے میں اصلاح مطلوب ہے تو اس میں تعلیم و تربیت یہ ہونی چاہیے۔ قرآنِ کریم کے مطابق یہ چیزیں دل کی آواز بن کر اوپر آئیں کہ یہ جرم ہے، یہ نہیں کرنا۔ باہر سے بیڑیاں پہنانے سے تو کچھ نہیں ہوتا ہے۔ جتنا جی چاہے سخت بیڑیاں پہنا دیجئے، اصلاح نہیں ہوگی۔ یہ کہا کہ بات عمل سے سامنے آئے خواہ وہ ابھی تمہارے دل کا ارادہ ہی کیوں نہ ہو۔ یقین کرو یہ دونوں یعنی عمل اور دل کا ارادہ نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ **اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ** ❷ (67:13)

معاشرتی عدل کی کیفیت اور حیثیت

عزیزانِ من! قرآن یہ کہتا ہے کہ خدا وہ جج ہے جو تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے۔ جہاں تک ہمارے ہاں معاشرتی عدل کا تعلق ہے یہ بھی نظامِ عدل ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ اس میں تو جو جرم محسوس طور پر سرزد ہو جائے اور سامنے آ جائے اور اس کے لیے شہادات ہوں، وہی جرم جرم قرار پاتا ہے۔ دل کے ارادے کے اوپر گرفت نہیں ہوتی لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ یہ قانون تو ہمارے ہاں کا معاشرتی نظامِ عدل ہے۔ خدا کا نظامِ عدل تو اس کا محتاج نہیں ہے کہ اس قسم کی شہادات بھی لی جائیں، اس قسم کے Judges (منصف) مقرر کیے جائیں۔ وہ تو دل کے خیالات، جو ہنوز ارادے ہیں، ان پہ بھی نگاہ رکھتا ہے۔ وہ اصلاح کا کام ارادوں

---

❶ یہ رسولؐ ان کے سامنے قوانین خداوندی کو پیش کرتا ہے پھر انہیں سمجھاتا ہے کہ ان قوانین کی غرض و غایت کیا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ وہ تو دل کی گہرائیوں میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے۔ (ایضاً)

سے‘ خواہشات سے‘ اور آرزوؤں سے‘ شروع کرتا ہے اور اگر وہ بدل جائیں تو پھر اس کے بعد تو آپ سمجھیے ساری دنیا بدل جاتی ہے۔ اسی لیے کہا کہ خدا تو تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے اور دلیل سن لیجیے۔ کیا عجیب دلیل ہے! کہا کہ **اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ** (67:14) کیا جس نے پیدا کیا ہے وہ اس کو نہیں جانتا کہ اس کے اندر کیا ہے؟ کیا دلیل ہے! ہر وہ شخص جس نے اپنی کوئی مشین بنائی ہے اگر اس سے آ کر کہا جائے کہ صاحب! اس میں کچھ ذرا سی یوں رڑک سی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح کلاک بنانے والے سے کہا جائے کہ صاحب! وہ کوئی چار دن کے اندر ایک سیکنڈ کا فرق کرتا ہے وہ فوراً ذہن میں سمجھ جائے گا کہ فلاں مقام کا جو ایک پرزا ہے وہ صحیح کام نہیں کرتا۔ وہ کیوں فوراً سمجھ جائے گا کیونکہ اس نے اسے بنایا ہوا ہے۔ قرآنِ کریم کی کیا دلیلیں ہیں کہ جس نے انسان کو پیدا کیا ہے کیا وہی نہیں جان سکتا کہ اس کے دل میں کیا پیدا ہوا ہے۔ اس کے سوا تو کوئی اور جان نہیں سکتا کہ کسی نے انسان کو پیدا نہیں کیا اور وہ ہے **وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ** (67:14)۔ کوئی اس کا کیا ترجمے کرے گا! قرآن کے الفاظ کے ترجمے نہیں ہو سکتے۔ اب یہ جو لطیف لفظ ہے‘ ہمارے ہاں اس کے معنی ’’نرم و نازک‘‘ کے سوا اور کیا کیے جائیں‘ ہم اس کے لیے لطافت کہہ دیں گے۔ کہہ دیں گے کہ بہت لطیف ہے‘ ملائم سا ہو جائے گا۔ انگریزی زبان کے اندر وہ Subtle سی ایک چیز ہے کہ جو بظاہر محسوس نہ ہو لیکن اُسے محسوس کر لیا جائے۔ یہ جو اس طرح سے محسوس کرنے والی نگاہ ہے بس یہ وہی ہے۔ اس کے لیے میں ایک شعر پڑھا کرتا ہوں کہ

کیسے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے
انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے

خونِ آرزو کا کوئی رنگ و بو نہیں ہوتا لیکن خونِ آرزو کو تو وہ نگاہیں پہچان سکتی ہیں جو بصارت کے علاوہ بصیرت بھی رکھتی ہیں۔ کسی چیز کو جو یوں پہچاننا ہے یہ لطیف ہوتا ہے۔ رنگ و بو سے خونِ آرزو نہ پہچانیں‘ یہ پہچان لیں کہ ہاں‘ آرزو کا خون ہوا: **وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ** (67:14)۔ یوں باخبر تو دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔ کیا بات ہے قرآن کے ایک ایک لفظ کی!

عزیزانِ من! خبیر تو اور بھی ہو سکتے ہیں‘ باخبر اور بھی ہو سکتے ہیں مگر یہ جو لطیف ہونا ہے یہ ہے اصل چیز کہ نگاہ ایسی ہونی چاہیے اور یہیں سے یہ بھی چیز آ گئی ہے کہ جو قرآن کے مطابق عدل کرنے والے ہیں انہیں حدِ انسانیت کے اندر‘ امکانِ انسانیت کے اندر‘ لطیف بھی ہونا چاہیے‘ انہیں نگاہوں سے بھی پہچاننا چاہیے۔

مومن کی فراست کی خصوصیات

عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ ایسا انداز ہو کہ **یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰھُمْ** (55:41) مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں۔ یہ نگاہیں ہونگی۔ قرآن سے مومن کو یہ فراست پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جو ایک حدیث نبی اکرم ﷺ کی ہے‘ چمکتی ہوئی

ہے: مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اور اللہ کا نور تو قرآن ہے۔ اس نے قرآن کو نور کہا ہے۔ اس سے یہ فراست پیدا ہو جاتی ہے۔ اب ہمارے ہاں لطیف سے لطافت ہی تو بنتی ہے کہ اس میں لطیف ہونے کی' بشریت کی حد تک' ایک خصوصیت ہو یعنی یوں کہیں گے کہ خدا کی جو صفات ہیں وہ تو کلی اور مطلق ہوتی ہیں' لا انتہا ہوتی ہیں' انسان کو اس درجے تک تو حاصل نہیں ہوتیں لیکن اس کے رنگ میں رنگے جانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بحدِ بشریت وہ چیز انہیں حاصل ہو اور یاد رکھیے! جس فرد میں یہ حاصل ہوتی چلی جائیں گی وہ مومن بنتا چلا جائے گا اور جس معاشرے میں' نظام میں' مملکت میں' یہ چیزیں حاصل ہوتی چلی جائیں گی' صفاتِ خداوندی حاصل ہوتی چلی جائیں گی' اسی کو اسلامی نظام کہیں گے' وہی قرآنی مملکت ہوگی۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الملک کی آیت 14 تک آ گئے' 15 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

چوتھا باب: سورة الملک (آیات 15 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1983ء کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الملک کی آیت 15 سے ہو رہا ہے: (67:15)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ بات یہاں سے شروع کی تھی کہ یہ آسمانی کرّے یا ستارے کس مصرف کے لیے بنائے گئے ہیں۔ یہ لوگ انسانوں کی قسمت ان کی گردشوں سے ماپتے ہیں اور یہ کہ قرآن نے ان کی گردشوں سے انسانوں کی قسمت ماپنے کو کفر قرار دیا ہے۔ اس نے کہا کہ ستارے ہی نہیں بلکہ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ (45:13) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں، مختلف کرّوں میں، ساری کائنات میں، جو کچھ بھی ہے، وہ انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے، وہ اس کے تابعِ تسخیر ہے، انسان ان کے

تابع نہیں ہے۔ اسی سلسلے میں آگے بڑھتے ہوئے ہم اس آیت پہ آ رہے ہیں کہ هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا ❶ (67:15)۔ اس آیت میں ''ذلول'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ زمین دیکھیے' یہ تو تمہارے پاؤں تلے ہے اور دیکھو تو سہی کہ ''یہ تمہارے تابع تسخیر ہے۔''

کائنات کی ہر شے انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے

آسمانوں کی بات تو چھوڑ دیجیے۔ انہی کرّوں میں یہ زمین بھی تو ایک کرّہ تھا۔ اسے تو تم دیکھتے ہو اور پھر اس سے کام لیتے ہو: فَامْشُوْا فِىْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ (67:15) ایک تو یہ ہے کہ تم ان مختلف راستوں میں چلو پھرو' اور دوسرے معنوں میں یہ کہ اس سے رزق حاصل کرنے کے لیے تم مختلف طریقے اختیار کر سکتے ہو۔ جس طرح سے بھی چاہو تم اس سے کام لے سکتے ہو' یہ انکار ہی نہیں کر سکتی' سرکشی نہیں کر سکتی' تمہارے سامنے اٹھ کے کھڑی نہیں ہو سکتی حالانکہ یہ اتنی بڑی عظیم الجثہ ہے لیکن اس کے باوجود ایک انسان یا ایک فرد کے مقابلے میں اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی کیفیت تو یہ ہے کہ یہ حضرتِ انسان جس طریق سے چاہے اس کو استعمال کرتا چلا جائے' یہ اس سے نہ انکار کرے گی' نہ سرکشی اختیار کرے گی۔ اور اس کے رزق میں سے جو کچھ دیا گیا ہے' اسے تم کھاؤ' یہ من رزقه ہے۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن میں ایک لفظ رحمت ہے اور ایک ربوبیت ہے۔ رحمت اس طریق سے سامانِ نشوونما مہیا کرنے کو کہیں گے جس طرح رحمِ مادر میں بچے کو سامان ملتا ہے۔ اس میں اس بچے کی اپنی کسی کوشش یا Effort کا دخل ہوتا ہی نہیں' یعنی وہ ابھی اس پوزیشن میں ہوتا ہی نہیں کہ اپنے لیے کچھ کر سکے۔ اُسے یہ سامانِ نشوونما باہر سے ملتا ہے مگر باہر سے یہ مراد نہیں ہے کہ خارجی کائنات سے ملتا ہے۔ اسے یہ سامان ماں کے جسم سے ہی ملتا ہے لیکن وہ از خود ملتا چلا جاتا ہے۔ وہ بچہ ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ اس کے حاصل کرنے کے لیے کچھ خود Effort کرے' محنت کرے تو رزق حاصل ہو۔ اب جونہی وہ بچہ پیدا ہوتا ہے اُسی سامانِ نشوونما کا ملنا خدائے رحیم کی طرف سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب وہ ماں کی چھاتیوں کے دودھ سے ملتا ہے۔ اب یہ دودھ اُسے پینا پڑتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اب یہ جو باہر کی دنیا ہے' یہ Cause & Effect (علت و معلول) کی دنیا ہے' جس میں یہ نظامِ اسباب ہے۔ جب وہ اِس دنیا میں آتا ہی ہے تو وہ سامان تو اُسے اسی طرح رحمت کے ذریعے سے دیا جاتا ہے لیکن اب اسے خود پینا پڑتا ہے اور ماں کو وہ پلانا ہوتا ہے۔ اس سے آگے بڑھیے تو سامانِ نشوونما کھانے پینے کی چیزوں میں آتا ہے۔ اس میں جتنی چیزیں' بنیادی طور پر' رزق حاصل کرنے کے لیے تھیں وہ ساری خدا کی طرف سے مہیا ہیں۔ اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے تو ان کے لیے ذرائع رزق مہیا کر دیئے۔ اب ہم ان کو ذرائع رزق ہی کہیں گے۔ وہاں یہ چیز خود رحمِ مادر میں رزق تھی' اب ذرائع رزق ہیں۔ اس میں خود انسان کو محنت کر کے رزق حاصل کرنا

---

❶ اس (یعنی اللہ) نے تمہاری نشوونما کے لیے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ رزق کے سرچشموں (زمین) کو تمہارے تابع تسخیر بنا دیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہوگا۔ دیئے ہوئے یہ جو ذرائع ہیں' یہ بھی خدا ہی کے دیئے ہوئے ہیں لیکن اب اس میں انسان کی اپنی محنت کو بھی دخل ہوگا۔ اس محنت کے ذریعے ان چیزوں سے وہ رزق حاصل کیا جائے گا' تو اس اعتبار سے کہ یہ ذرائع خدا ہی کے پیدا کردہ ہیں' اسے آپ خدا کا رزق کہیے۔ اور اس اعتبار سے کہ اسے انسانوں نے اپنی محنت سے ان ذرائع سے حاصل کیا ہے یہ ان کا رزق کہیے۔ یہ سامانِ نشوونما ہے: وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ❶ (67:15)

مومن اور کافر میں سوچ کا فرق

اب یہاں تک کافر اور مومن سب یکساں ہیں۔ جس کا جی چاہے اس زمین سے رزق حاصل کرے' کوشش کرے' محنت کرے اور جو زیادہ کوشش اور محنت کرے گا اس کو زیادہ حاصل ہو جائے گا۔ اس حاصل ہونے میں ابھی کفر اور ایمان نہیں آتا' وہ آگے آتا ہے۔ جب یہ رزق حاصل ہو جائے تو پھر اس کی تقسیم کس طرح سے ہونی چاہیے؟ اصل چیز یہاں آتی ہے۔ یہ ہے مقامِ کفر اور مقامِ ایمان۔ جو خدا کے اقدار اور قوانین کے تابع نہیں ہیں وہ اپنی منشا' مقصد اور مفادات کے مطابق یہ انتظام کرتے ہیں جسے آپ معاشی انتظام کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے آج آدھی سے زیادہ دنیا رات کو بھوکی سوتی ہے' اور جنہیں کچھ ملتا بھی ہے وہ ایسا ہے کہ ان بڑے لوگوں کے کتوں کو جو کچھ ملتا ہے وہ ان کے بچوں کے نصیب میں بھی نہیں ہوتا۔ وہ ذرائع رزق خدا کے پیدا کردہ ہیں' اُنہی میں سے یہ سارا رزق حاصل ہوا ہے۔ اب آگے بڑھ کے یہ فرق پڑا ہے۔ یہ ہے کفر اور ایمان کا فرق۔ قرآن نے یہاں دو لفظ کہے ہیں: وَ اِلَيْهِ النُّشُوْرُ ❷ (67:15)۔ اب ہمارے ہاں اس کے جو عام تراجم ہوئے ہیں' اُن سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔

عزیزانِ من! پہلے یہ دیکھیے کہ اس نے زمین کو تمہارے تابع فرمان بنایا' پھر کہا کہ مختلف طریقے اختیار کرو' اس میں سے رزق حاصل کرو۔ اب رزق حاصل کرنے کے بعد اسی آیت کے اگلے حصے کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''پھر مرنے کے بعد تم نے اسی طرف جانا ہے۔'' یہ تو حقیقت ہے کہ جانا ہے لیکن یہاں اس ترجمے کا ربط نہیں بنتا۔ یہ مرنے کے بعد' اس کی طرف جانا کیا ہے؟ یہ ربط نہیں ملتا۔ رزق حاصل کرنے تک تو آ گئے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اس رزق کے حاصل کرنے میں کافر اور مومن سبھی آ گئے۔

قوانینِ خداوندی کے مطابق رزق کا پھیلانا

عزیزانِ من! قرآن اب آگے ایک فرق پیدا کر رہا ہے۔ ''نشور' نشر'' پھیلانے کو کہتے ہیں' یہ وسعت دینا ہے۔ ناشر کتابوں کا ہوتا

---

❶ اور اس طرح اس کے عطا کردہ رزق کو اپنے استعمال میں لاؤ۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ یہ رزق خدا کے قوانین اور اقدار کے مطابق پھیلایا جائے گا۔ (اس سے یہ نہ سمجھ لو کہ تم ان رزق کے سرچشموں کے واحد مالک ہو' اس لیے انہیں جس طرح جی چاہے اپنے تصرف میں رکھ سکتے ہو۔ یہ امانتاً تمہاری تحویل میں دیئے گئے ہیں۔ انہیں قوانین خداوندی کے مطابق پھیلایا جائے گا۔) (ایضاً)

ہے۔ ہمارے ہاں نشر و اشاعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ منشور پھیلائی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کے معنی ہی ''پھیلانا' وسعت دینا'' کے ہیں اور یہ اس انداز سے دینا ہے جیسے کسی درخت پہ خزاں آ جائے اور اس کے بعد نئے پتے نکل کر جو شاخیں پھیلیں ان کو بھی وہ عربی زبان میں نشور کہتے تھے۔ اب یہاں بات رزق کے پھیلانے کی آ گئی۔ کہا کہ **وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ** (67:15) اب یہ رزق خدا کے قوانین اور اقدار کے مطابق پھیلایا جائے گا۔ کیا ربط ہے! زمین اس کی پیدا کی ہوئی ہے' انسانوں کی نہیں۔ اسے انسان کے تابع فرمان بنا دیا ہے کہ وہ اس کے خلاف سرکشی نہیں کر سکتی۔ یہ بڑی چیز ہے۔ یہاں سے انسان نے سامانِ ربوبیت لینا ہے' محنت کر کے اس میں سے رزق حاصل کرنا ہے۔ زمین بھی کافر اور مومن سب کے لیے ہے' ذرائع رزق بھی سب کے لیے ہیں' محنت کر کے اس میں سے رزق بھی سب یکساں حاصل کر سکتے ہیں۔ اب آگے اس رزق کے پھیلانے اور تقسیم کرنے کی بات آ گئی۔ یہ شاخِ خزاں دیدہ کو بہار آلود بنانا ہے۔ ❶

لفظ الیہ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اس **رزقہ** کے بعد **الیہ** آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ خدا کی طرف رجوع کر کے' وہاں سے رہنمائی حاصل کرو' تو اس طریق سے اس رزق کو پھیلاؤ۔ یہ ہو جائے گا تو یہ سارا رزق آپ کا رزقِ حلال ہو گا' یہ اسلامی نظام ہو گا اور اگر وہ انسانوں کی اپنی مرضی اور اپنے مفاد کے مطابق ہو گا تو یہ کفر ہو جائے گا۔ یہ اگلی چیز **وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ** کی ہے۔ کہا کہ یہ جو تم پھر خود اپنے ہی نظام بناتے ہو' خدا کے قوانین و نظام کو نظر انداز کر دیتے ہو تو **ءَ اَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ** ❷ (67:16)۔ یہاں بھی اس آیت کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''کیا تم اس سے نڈر ہو گئے ہو کہ جو آسمان میں ہے۔'' اب اس کے معنی کیے جاتے ہیں ''خدا سے **مَنْ فِي السَّمَاءِ** جو آسمان میں ہے۔'' ہمارے ہاں عام طور پہ بھی خدا کو اوپر والا کہتے ہیں' وہ تو خیر مدارج کے اعتبار سے کہیے۔ جب خدا کے متعلق تصور آتا ہے تو اوپر کو نگاہ جاتی ہے: وہ دیکھ رہا ہے' لیکن جب ہم قرآن کا یہ **مَنْ فِي السَّمَاءِ** لیں گے' کہیں گے کہ جو سما میں ہے' اس نے کہا ہے کہ **هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ** (57:4) وہ تو ہر مقام پہ' ہر جگہ' ہے۔ تم جہاں بھی ہو' وہ وہاں تمہارے ساتھ ہے۔ اب اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ آسمانوں پر ہے حالانکہ وہ الہ السمآء بھی ہے' الہ الارض بھی ہے' زمین پہ بھی ہے' آسمان پہ بھی ہے۔ زمین اور آسمان کیا؟ اس کی طرف تو Space یا مکان کی نسبت ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ کہاں ہے اور کہاں نہیں ہے۔ کہاں کا سوال تو مادی چیز کے لیے ہوتا ہے جو ایک وقت میں ایک ہی جگہ ہو سکتی ہے۔

---

❶ جس سے انسانیت کا شجر خزاں دیدہ از سر نو بہار سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ کیا تم خدا کے قانونِ مکافات سے بالکل بے خوف ہو جاتے ہو؟ ذرا سوچو کہ اگر وہ ان معاشی سہولتوں کو ختم کر دے' زمین گرد و غبار (بنجر) بن کر رہ جائے گی۔ (ایضاً)

روایات کے تحت عرش کی تعریف

خدا تو ہمارے ان تمام تصورات سے بلند و بالا ہے اس لیے یہ بات نہیں ہے کہ وہ آسمانوں پہ ہے یا وہ عرش پر بیٹھا ہوا ہے اور عرش آسمانوں کے اوپر ہے۔ آپ کو پہاڑی بکروں کے سینگوں کے اوپر والی روایت یاد ہوگی۔ تو وہ یہ چیز نہیں کہ خدا سماء میں بیٹھا ہوا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے ڈرو بلکہ سماء' قرآنِ کریم کی رو سے' خدا کی طرف سے' جو قوانین نازل ہوتے ہیں' اس کے لیے نازل ہونے کا جو لفظ اس نے کہا ہے' وہ بلندیوں سے نیچے کی طرف آنے کی بات ہوتی ہے جسے آپ نزول کہتے ہیں' خواہ وہ قوانینِ خداوندی فطرت کے ہوں وہ بھی خدا ہی کے نازل کردہ ہیں' خواہ وہ انسانی دنیا کے لیے ہوں' جو وحی کی رو سے انبیا کرام علیہم السلام کو دیئے گئے اور اب آخری مرتبہ وہ قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ یہ جو قوانین ہیں یہ انسانوں کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ نازل ہونے کی جہت سے اس میں یہ ہے کہ یہ اوپر سے تمہیں دیئے جاتے ہیں۔ اس میں تصور صرف اوپر سے دینے کا اتنا ہی ہے کہ یہ تمہارے اپنے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ یہ انسانوں کی دنیا کے لیے خدا کی طرف سے دیئے جاتے ہیں۔ تو یہ جو (مَنْ فِي السَّمَآءِ) کے متعلق ہے کہ کیا تم اس سے خائف ہو گے؟ بات یہی ہے کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کرنے سے جو تباہیاں اور بربادیاں آتی ہیں کیا تم اس سے نڈر ہو گئے ہو؟

رزق کی تقسیم ربوبیت عالمینی کی بنا پر کرنا ہوگی

ذرائع رزق کے سلسلہ میں قرآن کا پہلا لفظ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہے' ربوبیتِ عالمینی ہے لہٰذا جس تقسیمِ رزق کے اندر طبقات کی تقسیم آجائے گی اور عالمینیت نہیں رہے گی وہ رزق رب کا نہیں رہے گا' انسانوں کا ہو جائے گا' وہ کفر ہو جائے گا' اسلام نہیں رہے گا۔ کہا کہ تم جو پھر ہماری بنائی ہوئی زمین سے' ہمارے پیدا کردہ ذرائع رزق سے' رزق حاصل کرنے کے بعد' ہمارے پیمانوں کے مطابق اس کی تقسیم نہیں کرتے' ان پیمانوں کے مطابق اسے نہیں پھیلاتے' اپنے پیمانوں' اپنے قوانین' اپنے نظام' کے مطابق پھیلاتے ہو اور تباہیاں لاتے ہو' تو کیا تم اتنے اس چیز سے نڈر ہو گئے ہو؟ اور سمجھتے ہو کہ یہ ذرائع رزق اس نے پیدا کر دیئے تو اب اس کا کوئی ان پہ تسلط اور غلبہ نہیں رہا ہے؟ کہا کہ سوچو تو سہی اگر وہ زمین کو ایسا کر دے کہ وہ ساری کی ساری بنجر ہو جائے' اس میں کسی چیز کے پیدا کرنے کی صلاحیت نہ رہے تو کونسا دوسرا خدا لے کر آؤ گے جو اس زمین کو پھر پیداوار کے قابل بنا دے؟ ہم نے اسے پیدا کیا ہے اور ایسا پیدا کیا ہے کہ اس میں کھیتی اگنے اور رزق پیدا کرنے کی صلاحیت رکھ دی ہے اور اگر اس صلاحیت کو سلب کر لیا جائے تو اسے کوئی انسان نہیں پیدا کر سکتا۔ ہاں البتہ اس صلاحیت سے فائدہ اٹھانا انسان کے علم کی بات ہے' اسے Improve (بہتر) کرنا بھی اس کے علم کی بات ہے لیکن وہ جو بنیادی طور پر اس میں یہ صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ رزق پیدا کرے گی یہ صلاحیت کوئی انسان نہیں پیدا کر سکتا' یہ چیز Mechanically (میکانکی لحاظ سے) نہیں ہو سکتی۔ کہا کہ اگر یہ صورت ہو کہ زمین کو ایسا کر دیا جائے کہ وہ گرد و غبار بن جائے' بنجر بن

جائے، ویرانہ ہو جائے، کہو کیا کیفیت ہو گی تمہاری؟ ہم اِسے تصور میں بھی نہیں لا سکتے، وہ تو اگر کہیں تھوڑا سا خطہ زمین بھی ایسا ہو جائے کہ جہاں سیم اور تھور ہو جائے اس ملک میں مصیبت آ جاتی ہے۔ اگر ساری کی ساری زمین ایسی ہو جائے تو کہو کیا حال ہو گا۔

عزیزانِ من! قرآن کا اسلوب عجیب وغریب ہے۔ وہ محسوس چیزوں کی تشبیہات کے ذریعے سے بات واضح کرتا ہے اور پھر اسے انسانوں کی دنیا کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ ہے خدا۔ پھر کہا کہ **اَمۡ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یُّرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ کَیۡفَ نَذِیۡرِ** (67:17) سوچو تو سہی کہ کس امن میں تم اس ارض کے اوپر ہو، کتنے کتنے بڑے عظیم کرّے اس کے اوپر گردش میں ہیں، تم آرام اطمینان سے بیٹھے ہو، اگر وہ کرے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں یا ان کرّوں سے زمین پر پتھر برسنے شروع ہو جائیں تو تم کہاں سر چھپاؤ گے۔ زمین کے بنجر بننے سے بھوک سے مرو گے، کچھ دن تو زندہ رہ سکو گے، اور اگر کہیں کسی وقت اس ساری زمین کے اوپر سے پتھروں کی بوچھاڑ شروع ہو جائے تو وہ تو انسان دو منٹ کے اندر ختم ہو سکتے ہیں۔ تمہیں یہ رزق بھی دیا اور یہ امن بھی دیا۔ اس سے تم اندازہ نہیں لگاتے کہ یہ ان چیزوں کی کنٹرول کرنے والی کوئی اور ہستی ہے اور وہ ایسی ہستی ہے کہ اس کا انسانوں کے ساتھ یہ تعلق ربوبیت اور رحمت کا ہے کہ اس نے یہ کچھ بنایا ہے۔ اس لیے تم امن میں بھی رہتے ہو، تمہیں رزق بھی میسر رہتا ہے اور تم اس وقت ان باتوں کو یونہی مذاق سمجھ رہے ہو۔ **فَسَتَعۡلَمُوۡنَ کَیۡفَ نَذِیۡرِ** ❶ (67:17)

غلط تقسیمِ کار کا نظام خوفناک تباہی ہو گا

یہاں اِس آیت میں وہی نذیر کی بات آئی ہے کہ یہ جو انہیں کہا گیا ہے کہ اب یہ جو کچھ تمہیں اس کائنات سے حاصل ہو اس کی تقسیم، اس کی نشر و اشاعت، اس کا وسعت دینا، اس کا پھیلانا، تم خدا ہی کے قانون اور اقدار کے مطابق کرو پھر تم اس کی طرف سے امن میں رہو گے۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری زمین بھی بنجر نہیں بنے گی، تم پر آسمان سے پتھر بھی نہیں برسیں گے لیکن یہ جو تمہارے ہاں غلط تقسیم کا نظام ہو گا وہ ایسی تباہی لائے گا جو ان دونوں تباہیوں سے زیادہ خوفناک اور خطرناک ہو گی تو **فَسَتَعۡلَمُوۡنَ کَیۡفَ نَذِیۡرِ** (67:17) اس سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ جو تمہیں وارننگ دی جاتی تھی، وہ جو کہا جاتا تھا کہ اس غلط نظام کے نتائج بڑے تباہ کن ہوں گے اور تم اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے، تم اس کا یقین نہیں کیا کرتے تھے، تمہیں عنقریب پتہ چل جائے گا۔ آہستہ آہستہ یہ چیز تمہارے سامنے آ جائے گی کہ غلط نظام کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تو اس وقت بھی ساری دنیا جہنم بنی ہوئی ہے، ہم تو اپنے بسم اللہ کے گنبد سے باہر ہی نہیں نکلتے۔

---

❶ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ ہماری ان تنبیہات کا مطلب کیا تھا؟ (قوموں کی تباہی طبعی حوادث سے ہی نہیں ہوا کرتی۔ یہ غلط نظامِ تمدن کا نتیجہ بھی ہوتی ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

آج پورا یورپ اور پورا امریکہ تباہی کے کنارے کھڑا ہے

ہمیں معلوم نہیں ہے کہ سارے یورپ اور امریکہ کی اقوام' جو ہم سے اتنی آگے ہیں' غلط نظامِ زندگی کے ہاتھوں کس طرح اس وقت واویلا کر رہی ہیں۔ ان کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ معاشی فراوانی کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ساری دنیا کو Aid (امداد) دے رہے ہیں' اپنی حالت یہ ہے کہ بڑے سے لے کر چھوٹے تک کوئی بھی ایک دن آرام کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ فطرت کی طبعی قوتوں پر تو انہوں نے کنٹرول حاصل کر لیا ہے' یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن یہ جو اگلی چیز وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ہے یہاں آ کر وہ مس (Miss) کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہی مفاد کی خاطر' اپنے ہی نظام کے تابع' رزق پہ کنٹرول کر رکھا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہم تو خیر کسی شمار میں ہی نہیں ہیں جن کو آپ سپر پاورز کہہ رہے ہیں وہ ایک دوسرے سے اس قدر ڈر اور کانپ رہی ہیں کہ وہ اپنی اپنی جگہ پہ لرزاں اور ترساں ہیں۔ ان کی ساری Energies (توانائیاں)' ان کی ساری قوت' ان کی ساری فکر' اس میں صرف ہوتی ہے کہ اگر اس قوت نے یا فلاں پاور نے اس قسم کی ٹیکنالوجی ایجاد کر لی یا ہتھیار حاصل کر لیے تو ہم کیا کریں گے۔ پھر وہ اس کی مدافعت کے لیے' اس کی Prevention (روک تھام) کے لیے' لگ جاتے ہیں۔ ادھر والا یہ کہہ رہا ہے کہ اگر اس نے وہ میزائل ایسا بنا دیا کہ ماسکو سے چھوڑا نیویارک پہنچ گیا تو اس سے بچنے کی صورت کیا ہوگی؟ وہ کہتے ہیں کہ آسمان کے اوپر ایک سیارہ بھیجتے ہیں' وہ پتہ چلا لے گا۔ یعنی ساری فکر ہی اس میں صرف ہو رہی ہے' تمام Energies (توانائیاں) اس میں صرف ہو رہی ہیں۔

چاروں طرف خوف و ہراس چھایا ہوا ہے

عزیزانِ من! اس طرح پورے کرۂ ارض پر انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کو امن نصیب نہیں ہے۔ اب سوچیے کہ قرآن نے کہا تھا کہ ءَ امنتم کیا تم اس سے امن میں آ جاتے ہو؟ آ سکتے ہو امن میں؟ کیا لفظ قرآن لایا ہے! لہٰذا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے نظام تو غلط ہو لیکن انسان امن و سکون کی نیند سو سکے۔ آج حالت یہ ہے کہ ایک Individual (فرد) بھی اس وقت دنیا کے اندر امن میں نہیں ہے' جب کہ اس کے برعکس نظامِ خداوندی کی بنیادی خصوصیت ہی یہ بتائی گئی ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ خوف کوئی نہیں ہوگا' اس سے امن ہوگا' کسی قسم کی دل گرفتگی نہیں ہوگی بلکہ اس نظام سے اطمینان ہوگا' اگر الیہ النشور ہوگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اس لیے کہا کہ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ [1] (67:18)۔

---

[1] تم سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح ہماری تنبیہات کو جھوٹا سمجھا تھا۔ سو تم تاریخ کے صفحات سے پوچھو کہ ان کی اس تکذیب کا نتیجہ کس طرح تباہی اور بربادی کی شکل میں سامنے آیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تاریخ کے بعد مظاہرِ فطرت کی شہادت

عزیزانِ من! قرآن مظاہر فطرت کے بعد تاریخ کو شہادت میں پیش کیا کرتا ہے۔ کہا کہ پہلے اقوامِ سابقہ کی تاریخ پہ غور کرو۔ جس نے قوم کا غلط نظام بنایا' پھر دیکھو کہ اس کا انجام کیا ہوا۔ کہا کہ اور دیکھنا چاہتے ہو کہ ہمارا کنٹرول کیا ہے' ہمارے قوانین میں کتنی بڑی قوت ہے تو اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ فَوۡقَھُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّ یَقۡبِضۡنَ (67:18) ان پرندوں کو ذرا دیکھو تو سہی' پرندوں میں ایک تو خیر چھوٹی چھوٹی سی چڑیا ہی کہہ لیجیے اگرچہ وزن ان کا بھی ہوا سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس چڑیا کے وزن کی کوئی چیز یوں اوپر کو اچھالیے تو وہ اسی وقت ہی زمین کے اوپر آ جائے گی' وہ وہاں ٹھہر ہی نہیں سکتی اور اگر گدھیں اور یہ چیلیں جو ہیں ان کا تو وزن آپ دیکھیے کتنا ہوتا ہے' ہر وہ چیز جو اپنے مساوی الحجم ہوا سے زیادہ بھاری ہوگی وہ نیچے گرے گی۔ کہا کہ یہ اتنے اتنے بڑے پرندے دیکھ رہے ہو کہ اس ہوا کے اندر' فضا کے اندر' کس طرح تیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں' پروں کو پھیلاتے ہیں' پروں کو سمٹاتے ہیں۔ یہ سمٹانے کی عجیب بات ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ان عربوں کی زبان بھی عجیب زبان ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب وہ ایک رفتار سے یوں چلتے ہیں کہ جب انہوں نے تیز اڑنا ہوتا ہے تو وہ پھڑ پھڑانا جسے کہتے ہیں وہ پروں کو سکیڑتے ہیں' پھیلاتے ہیں' سکیڑتے ہیں' پھیلاتے ہیں' اس سے تیزی آتی ہے۔ ہر وہ چیز جس میں تحرک پیدا کرنا ہوتا ہے اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے یوں کیجیے پھر یوں چھوڑ دیجیے تو وہ چیز اور تیزی سے آگے چلتی ہے۔ یہ جو تکان میں Muscles (عضلات) میں' گردشِ خون ذرا کم ہو جاتا ہے" تے اوٹھیاں بھراندے ہوندے نا ایوں کر کے۔"[1] وہ یہی ہوتا ہے۔ کوئی چیز جو دبا کے چھوڑی جائے اس کی رفتار میں تیزی آ جاتی ہے۔ عربوں کے ہاں "قبض" کا یہ لفظ سمیٹنا' گرفت میں لینا' یوں مٹھی میں پکڑنا' پرواز میں تیزی پیدا ہو جانا کے معنوں میں آتا تھا۔ وہ معنوں کے لحاظ سے یہاں تک پہنچے ہوئے تھے۔ عربی زبان میں اسی لفظ کے معنی ہیں "پر پھیلائے ہوئے چلتے ہیں۔" پھر اس کے بعد پرواز کی رفتار میں تیزی ہوتی ہے تو اس کے بعد پھر پر سمٹاتے اور پھیلاتے ہیں۔ اس پر کہا کہ مَا یُمۡسِکُھُنَّ اِلَّا الرَّحۡمٰنُ (67:19) اس طرح سے فضا کے اندر انہیں کون تھام سکتا تھا؟ ذرا اس پہ سوچو تو ہم نے یہ ایک قانون بھی بنایا تھا کہ پرندوں کا رزق زمین کے صرف ایک ہی مقام پہ نہیں ہے' مویشی تو تھوڑی تھوڑی دُور تک چل پھر کے بھی اپنا رزق لے سکتے ہیں' ان پرندوں کو پتہ ہی نہیں کہ کہاں کہاں جانا پڑتا ہے اور یہ جو مہاجر پرندے (Migratory Birds) ہوتے ہیں ان کو تو موسم کے بدلنے پر تین تین چار چار پانچ پانچ ہزار میل کے فاصلے پر دوسری جگہ جانا پڑتا ہے۔ پرندوں کے رزق کو اس طرح سے بنایا تو ان کی ساخت بھی ایسی رکھ دی کہ وہ اس فضا کے اندر معلق رہ سکتے ہیں' اڑ سکتے ہیں' تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتے ہیں۔ دیکھا تم نے خدا اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍۭ بَصِیۡرٌ (67:19) ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ اس نے اندھا

---

[1] تو وہ یوں کر کے ہاتھوں سے دبواتے ہیں۔

دھند کچھ بنا دیا' تخلیق کردی اور پھر اس کے بعد ان کو چھوڑ دیا۔ نہیں' وہ سب کچھ دیکھتا ہے کہ کس قسم کی مخلوق کے تقاضے کس قسم کے ہیں۔

خدا کے قانون کے مقابلے میں کون سی قوت ہے؟

خدا نے ہر شے کی نشوونما کے سارے ہی تقاضے اور ضروریات ساتھ رکھ دیئے' ان کے لیے قوانین پیدا کر دیئے کہ **اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ هُوَ جُنۡدٌ لَّكُمۡ یَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ** (67:20)۔ اگر خدا یہ کچھ کرے تو فرد تو ایک طرف رہا' کیا کوئی لشکر بھی ایسے ہو سکتے ہیں جو خدا کے مقابلے میں تمہاری مدد کریں؟ یا کیا تم کوئی ایسی فوجیں لا سکتے ہو جو اس کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکیں؟ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ اگر یہ زمین رزق پیدا کرنا بند کر دے تو دنیا میں تو فوج بھی باقی نہیں رہے گی جو کہ سب سے زیادہ طاقتور سمجھی جاتی ہے۔ کہا کہ ایک فرد نہیں' خدا کے مقابلے میں فوجیں بلاؤ' لشکر لے آؤ' یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ **اِنِ الۡكٰفِرُوۡنَ اِلَّا فِیۡ غُرُوۡرٍ** (67:20) قوانینِ خداوندی سے انکار کرنے والے بڑے فریبِ نفس میں مبتلا ہوتے ہیں' اپنے متعلق بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تمام اختیارات ہمارے ہی ہیں' ہم جس طرح جی چاہے کریں اور یہ نہیں ہے کہ غلط روش پہ چلیں تو اس کے نتائج تباہی ہونگے' وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ کیا بات ہے غرور کی! فریبِ نفس اس کو کہتے ہیں۔

غرور Self deception (فریبِ نفس) ہوتا ہے۔ اس میں انسان اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے حالانکہ یہ سارا قوانینِ خداوندی کی رو سے ہے اور اس نے سب سے بڑی چیز یہ کہی ہے کہ ہم نے قوانین بنائے ہیں **لَا تَبۡدِیۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (10:64) ہم ان قوانین میں تبدیلی نہیں کرتے حالانکہ وہ تو قادر ہے۔ جس نے یہ قوانین بنائے ہیں وہ تو ان سب کو بدل سکتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ بات غلط ہے ہم ان میں تبدیلی نہیں کریں گے۔ وہ بصیر بھی ہے' خالق ہے' اس نے پیدا کیا ہے۔ اس کی اس پر نگاہ ہے کہ کس کس مخلوق کے کون کونسے تقاضے ہیں۔ اس نے ان کے مطابق غیر متبدل قوانین بنا دیئے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ کسی وقت کوئی پرندہ اسی رفتار سے اسی فضا میں اڑ رہا تھا اور وہ قانون کسی وقت بدل جائے اور وہ دھڑام سے نیچے آ گرے۔ بالکل نہیں' اس کے قانون کو کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔ اس لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ان سے پوچھو کہ **اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ یَرۡزُقُكُمۡ اِنۡ اَمۡسَكَ رِزۡقَهٗ** [1] (67:21)۔ یہاں پھر وہی بات آئی کہ زندگی کا پورے کا پورا سامانِ نشوونما ہے۔ اسے زندگی کا سامان رزق کہتے ہیں اور عربوں کے ہاں کی عجیب چیز ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ان کے ہاں تو ایک ایک چیز کے لیے کتنے ہی الفاظ ہوتے ہیں لیکن وہ مرادف نہیں ہوتے۔ ان کے Meanings میں' معنوں میں' شیڈ کا فرق ہوتا ہے۔ یہ رزق کہتے ہیں اس سامانِ نشوونما کو جو بروقت مل جائے۔ ان کی زبان کی کیا بات تھی! اس رزق کے لیے بروقت ملنا بھی ضروری ہے۔ میں بھوک سے مر جاؤں تو میں تیرے رزق کو کیا کرونگا۔ کہا کہ اگر وہ اس رزق کو روک لے تمہارے

---

[1] اگر خدا' زمین کی اس صلاحیت کو سلب کر لے جس کی رو سے اس میں سے خوراک پیدا ہوتی ہے' تو وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے سکے؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہاں نہ آنے دے تو کیا کرلو گے؟ کہا کہ بَلۡ لَّجُّوۡا فِیۡ عُتُوٍّ وَّ نُفُوۡرٍ (67:21) ہم کتنی سمجھ بوجھ کی باتیں کررہے ہیں' Reason (عقل وفہم) کے مطابق کررہے ہیں' Arguments (دلائل وبراہین) دے رہے ہیں' دلائل دے رہے ہیں' مشاہداتِ فطرت ان کے سامنے ہیں' اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے سرکش اور نفرت کے جذبات کی رو میں' موج درموج' بہے چلے جارہے ہیں اور بہے ہی چلے جارہے ہیں' چنانچہ فرمایا: اَفَمَنۡ یَّمۡشِیۡ مُکِبًّا عَلٰی وَجۡہِہٖۤ اَہۡدٰۤی اَمَّنۡ یَّمۡشِیۡ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ [1] (67:22) یعنی یہاں انسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ ایک تو وہ جو آنکھوں سے کام لے رہا ہے' باہر روشنی موجود ہے' متعین راستہ پہلے معلوم کرلیا ہے کہ یہ سیدھا راستہ میری منزل تک جائے گا' اتنی چیزیں موجود ہیں' اتنے عناصر موجود ہیں۔ اور پھر اس کے مقابل میں دوسرا وہ ہے جس کے ہاں نہ راستہ متعین ہے' نہ منزل متعین ہے' روشنی نہیں ہے' آنکھیں بھی نہیں کھولتا' سر جھکائے ہوئے بلکہ اوندھے منہ چل رہا ہے تو کہا کہ کیا یہ دونوں مسافر یکساں ہوسکتے ہیں؟ اب یہ جو چیز تھی کہ آنکھیں کھول کر چلنے والا منزلِ مقصود تک پہنچے گا' اور اس کے بعد پھر آگے اک بات آئی اور یہ کہا کہ یہ جو آنکھیں کھول کر چلنے کی بات تھی صرف آنکھ ہی نہیں وہ تو دراصل عقل وفکر سے کام لینا ہے' حواس کے ذریعے کام لیتے ہوئے دل ودماغ سے فیصلہ کرنا ہے' لہٰذا ذرائع رزق تمام مخلوق کے لیے' تمام انسانوں کے لیے' یکساں پیدا کردیئے۔

انسانی صلاحیتیں ہوں یا نعمتیں' سب کی سب خدا کی ہی عطا کردہ ہیں

عزیزانِ من! قرآن نے کہا کہ اسی طرح یہ جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں تھیں یا ان کے ذرائع تھے' یہ بھی ہم نے ہر انسان کو دیدیئے: قُلۡ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَکُمۡ وَ جَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَۃَ [2] (67:23)۔ دیکھیے قرآن کدھر سے کدھر لے آیا ہے۔ زمین کے ذرائع رزق سے انسانوں کی دنیا کی طرف آیا اور یہ کہا کہ سوچ سمجھ کر' آنکھیں کھول کر' چلنے والا اور اندھا دھند چلنے والا' برابر نہیں ہوسکتے اور آنکھیں کھول کر چلنے والوں کے متعلق کہا کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا تو ہر انسان کو ہم نے دیکھنے سننے کی اُن تمام صلاحیتوں سے نوازا جن کو ہم حواس خمسہ کہتے ہیں۔

قرآنِ حکیم عام طور پر دو چیزیں نمایاں طور پر بیان کرتا ہے' ورنہ حواس خمسہ میں تو دیکھنا' سننا' سونگھنا' چکھنا' چھونا یہ سب شامل ہیں

---

[1] اِن سے پوچھو کہ جو شخص اوندھی ڈال کر' عقل وفکر سے کام لیے بغیر' جذبات کی رو میں بہے چلا جارہا ہو' وہ کبھی اس شخص کے برابر ہوسکتا ہے جو زندگی کے توازن بدوش راستے پر سیدھا چل رہا ہو؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] ان سے کہو کہ خدا نے تمہیں پیدا کیا تھا تو (جانوروں کی طرح نہیں بنادیا تھا۔ اس نے تمہیں) سننے' دیکھنے اور سمجھنے سوچنے کی استعداد دی تھی تا کہ تم اس سے کام لے کر انسانوں کی طرح زندگی بسر کرسکو۔ (ایضاً)

جس کے ذریعے سے یہ جو باہر کی کیفیت ہے یا جو باہر کی کوئی خبر ہے وہ ہمیں اندر پہنچتی ہے اور پھر وہ جو فیصلہ کرتی ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ المختصر یہ وہ ذرائع ہیں جن کو حواس Senses کہتے ہیں اور یہ ذرائع ہیں باہر کے احوال اور کیفیات کو اندر تک پہنچانے کے۔ اب یہ اندر کیا چیز ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے؟ ایک گولی کی آواز آتی ہے' کان کے ذریعے سے اندر ایک چیز فیصلہ کرتی ہے: کسی نے بندوق چلائی۔ ایک چیخ وہاں سے اٹھتی ہے تو اس سے یہ ہوتا ہے کہ یہ آواز تو کسی کی پہچانی ہوئی ہے۔ ایک قدم اور آگے بڑھے۔ اب اس کے بعد پھر یہ چیز کہ مجھے اٹھ کے جانا چاہیے' یہ پھر ایک اور چیز ہے۔ اندر ایک چیز فیصلہ کرتی ہے: جانا چاہیے۔ یہ بات دوسری طرف چلی جائے گی کہ یہ اندر سے فیصلہ کون کر رہا ہے۔ ابھی یہ چیز طے نہیں ہوئی۔ ہمارے ہاں تو یہ پرانے زمانے سے دل کی بات چلی آتی تھی کہ میرے دل نے یہ کہا' دل کا یہ فیصلہ ہوا۔ وہ دل تھا' اس کے لیے انہوں نے بھی اپنے ہاں مائنڈ (Mind) کا لفظ رکھا تھا لیکن ذرا آگے چل کر پھر انہوں نے کہا کہ یہ مائنڈ (Mind) بھی نہیں ہے کیونکہ مائنڈ (Mind) جب Adjective (صفت) بنایا تو وہ Mental ہو گیا۔ اب اُس سے Mental Hospital ہو گیا یعنی پاگل خانہ' تو اس کا تعلق دماغ سے ہوا۔ تو یہ دماغ ہے' دل ہے' کچھ ہے۔ قرآن اس کو قلب بھی کہتا ہے اور فواد بھی کہتا ہے۔ یہ اندر کی وہ صلاحیت ہے جو باہر کی خبروں سے کسی نتیجے پہ پہنچتی ہے۔ کہا کہ انسان کو ہم نے پیدا کیا تو ہر بچے کو پیدائش کے ساتھ ہی یہ چیزیں یعنی ذرائع رزق بھی دیدیئے۔ اب آگے ان ذرائع رزق سے حاصل کردہ رزق کے متعلق ہے کہ وہ کیسے استعمال کیا جاتا ہے؟

اصل سوال تو صلاحیتوں کا صحیح مصرف ہے

سوال یہی ہے کہ یہ جو علم حاصل کرنے کی تمہاری صلاحیتیں ہیں' انہیں تم کس طرح استعمال کرتے ہو' کس مصرف میں لاتے ہو' کس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہو؟ اس کے لیے کہا کہ قَلِيْلاً مَّا تَشْكُرُوْنَ (67:23) بہت تھوڑے انسان ہیں جو ان کا صحیح استعمال کرتے ہیں' نہ رزق کی صحیح تقسیم ہوتی ہے نہ علم یا ذرائع علم کا صحیح مصرف ہوتا ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے!

کرّہ ارض پر قدرِ مشترک صرف انسانیت ہے

قرآن نے کہا کہ قُلْ هُوَ الَّذِىْ ذَرَاَكُمْ فِى الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (67:24) ان سے کہو کہ خدا نے تمہیں زمین میں پیدا کیا۔ تم ساری زمین پہ ہر طرف پھیل گئے ہو۔ تمہاری آبادیاں اتنی وسیع ہو گئیں۔ ٹھیک ہے اب تم پھیلے ہوئے ہو۔ بظاہر ایسا ہے کہ مثلاً ہمارے پاکستان کے کسی گاؤں کا ایک فرد افریقہ کے کسی گاؤں کا ایک حبشی' دونوں میں کسی قسم کی کوئی نسبت یا تعلق نہیں' بظاہر کسی شے کا کوئی واسطہ نہیں۔ کہا کہ اس کے باوجود انسان اور انسان یا مختلف افراد میں ایک قدرِ مشترک ہے اور یہ جو بُعد ہے' یہ جو ایک دوسرے سے اتنے دُور پھیلے ہوئے ہو کہ ایک قطبِ شمالی میں ہے دوسرا قطبِ جنوبی میں ہے' اس کے باوجود انسان ہونے کی جہت سے دونوں میں ایک

قدرِ مشترک ہے۔فطرت کے یہ قوانین دونوں پہ یکساں طور پر لاگو ہوتے ہیں: زندگی کا ہوا پر دارومدار ہے اُس شخص کے لیے بھی اور اِس شخص کے لیے بھی' زندگی کا پانی پر دارومدار ہے اِس کے لیے بھی اور اُس کے لیے بھی۔ آپ دیکھتے ہیں دونوں کے اندر جیسے ایک لاسلکی ہوتی ہے' دونوں کی وائرلیس (Wireless) ہوتی ہے۔ اُسے پیاس لگتی ہے' وہ بھی پانی کی طرف جاتا ہے' اِسے پیاس لگتی ہے' یہ بھی پانی کی طرف جاتا ہے۔ کہا کہ انسان کے اندر یہ قدرِ مشترک کیا چیز ہے؟ اسی طرح سے یہ جو Physical Laws یا طبعی زندگی سے متعلق قوانین ہیں' انسان کی انسانی زندگی کے متعلق بھی قوانین ہیں اور وہ یہ ہیں کہ جیسے مثلاً ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی' جیسے پانی کے بغیر زندہ نہیں رہا جا سکتا۔ یہ قانون ہے۔ اسی طرح ''ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی'' بھی قانون ہے' اور دنیا کے تمام انسانوں کے اوپر اس قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ مشرق کے ظالم کو پکڑا جائے گا اور مغرب کے ظالم کو نہیں پکڑا جائے گا' فرعون کو پکڑا جائے گا اور اس دور کے فراعنہ کو نہیں پکڑا جائے گا۔ یہ قانون ہے اور اس قانون کا ہر انسان پر یکساں اطلاق ہوتا ہے۔ اس میں دیکھیں **هُوَ الَّذِیۡ ذَرَاَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ اِلَیۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ** ❶ (67:24)۔ وہاں یعنی (67:15) میں ''نشر'' کا لفظ آیا تھا۔ یہاں یعنی (67:24) میں ''حشر'' کا لفظ ہے۔ ہمارے ہاں تو حشر اور نشر دونوں' اکٹھے ہی' قیامت کے اوپر ہیں۔ میں پھر اس کو دہرادوں اور دہراتا جارہا ہوں کہ مرنے کے بعد کی زندگی پر ہمارا ایمان ہے لیکن یہ سارا کچھ مرنے کے بعد کی زندگی سے ہی متعلق نہیں ہے۔ ابھی اگلی آیت بتادے گی کہ یہ یہاں کی زندگی کے متعلق بات ہورہی ہے۔

انسانیت ایک' لہٰذا قانون بھی ایک

عزیزانِ من! قرآن نے کہا تھا کہ ہم نے انہیں اس دنیا میں ہر طرف پھیلا دیا: **وَ اِلَیۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ** ❷ (67:24)۔ اب بجائے اس کے کہ یہ معنی کرو کہ تم اس کی طرف سے اکٹھے کیے جاؤ گے' اس کا ایک قانون ہے جس کا انسانوں کے اوپر اطلاق ہوتا ہے۔ اس قانون میں تمام کے تمام انسان یکساں ہیں' سب اپنا قدم اس کی طرف ہی اٹھا رہے ہیں' اس قانون کے احاطے سے کوئی باہر نہیں جا سکتا' یہ تمام اسی کے قانون کی طرف ہی جارہے ہیں' اس وقت تمام انسانوں کا **تُحۡشَرُوۡنَ** ہورہا ہے۔ جس طرح طبعی قوانین کے احاطے سے کوئی باہر نہیں جا سکتا' سب اس کی طرف جاتے ہیں مثلاً پیاس لگتی ہے' سب پانی کی طرف جاتے ہیں۔ اسی طرح سے تمہیں محسوس تو نہیں ہوتا

---

❶ اس خدا نے تمہیں زمین میں ہر طرف پھیلا دیا (اور سامانِ معیشت فراوانی سے عطا کر دیا لیکن اس کے پھیلاؤ سے یہ مطلب نہیں کہ تم اس کے قانون کے دائرے سے باہر نکل گئے ہو۔ بالکل نہیں۔) تم ہر طرف سے ہنکا کر اس کے قانونِ مکافات کی طرف لائے جارہے ہو۔ (تمہارا ہر قدم اسی کی طرف اٹھ رہا ہے۔23:79)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اور تم ہر طرف سے ہنکا کر خدا ہی کے قانونِ مکافات کی طرف لائے جارہے ہو۔ (ایضاً)

لیکن تم جس قسم کی بھی روش یا عمل اختیار کرو گے تو تمہارا ہر قدم اس روش یا عمل کے نتیجے کی طرف اٹھ رہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کبھی جا کر اٹھے گا' بلکہ اٹھ رہا ہے۔ یہ دلیل اس کی ہے۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ یہ خدا نکردہ' کچھ میری اپنی ذاتی رائے کی چیزیں نہیں ہیں۔ قرآن میں اس طرح ذاتی رائے سے کچھ کہنا تو شرک ہے' یہ خدا بننا ہے۔ قرآن خود منہ سے بولتا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں۔ کیسے ہوا کہ یہ کچھ یہیں اِسی دنیا میں ہوگا' اگلی آیت میں ہے **وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ** (67:25) یہ پوچھتے ہیں کہ یہ کچھ کب ہوگا؟ یہ کہتے ہیں کہ **اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ** (67:25) اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی تو بتاؤ ظالم تو پنپ رہا ہے' تم پھر بھی کہے جا رہے ہو کہ نہیں' یہ صحیح بات ہے۔ کہا کہ بتاؤ تو سہی کہ یہ کب ہوگا۔ ہمارے ہاں روز یہ سوال ہوتے ہیں کہ یہ کب ہوگا۔ **قُلۡ اِنَّمَا الۡعِلۡمُ عِنۡدَ اللّٰہِ** (67:26) کہتا ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی کے عمل یا کسی قوم کی روشِ زندگی کے نتائج محسوس طور پر کب سامنے آئیں گے' یہ بات خدا کے قانون سے ہی متعلق ہے اور وہی جان سکتا ہے' میں نہیں کہہ سکتا' میں کب کی بات نہیں کہہ سکتا کیونکہ **وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ** (67:26) میرا کام تو یہ ہے کہ تمہیں یہ وارن کرتا جاؤں کہ غلط قدم اٹھا رہے ہو' تباہ ہو جاؤ گے' جس راستے پر چل رہے ہو' یہ تمہارے گاؤں کی طرف نہیں جا رہا۔ میرا کام یہ بتانا ہے۔

عملی نتائج کے سلسلہ میں ''کب'' کا جواب صرف خدا کو معلوم ہے

یہ کب ہوتا ہے؟ اس کے لیے یہی چیز ہے۔ کئی قومیں ہیں کہ جن کی غلط روش کے نتائج سے تباہیاں آنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں' کئی ایسے جرائم ہوتے ہیں جن کے نتائج فوری سامنے آ جاتے ہیں' کئی بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ مثلاً Heart (دل) فیل ہوتا ہے تو ایک سیکنڈ کے اندر موت واقع ہو جاتی ہے' کئی بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ سالوں پر محیط ہوتی ہے تو اس کے لیے ان بیماریوں پر کنٹرول کیے جاؤ' اس کے لیے انسان سالہا سال تک لگا رہتا ہے۔ اب اگر کوئی یہ پوچھے کہ صاحب! موت کب ہو جائے گی' اس کا تو کوئی نہیں بتا سکتا۔ کہا کہ اتنی سی بات میں تمہیں بتا دیتا ہوں بلکہ اس کے متعلق تمہیں وارن کر رہا ہوں کہ **فَلَمَّا رَاَوۡہُ زُلۡفَۃً سِیۡٓـَٔتۡ وُجُوۡہُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ قِیۡلَ ہٰذَا الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِہٖ تَدَّعُوۡنَ** (67:26) جب اُس تباہی و بربادی کا نتیجہ سامنے آتا ہے' جسے عذاب کہا گیا ہے' تو جو لوگ اس کے متعلق کہتے تھے کہ یہ یونہی باتیں ہی باتیں ہیں' عذاب کہاں ہے' ظالم تو پنپتا جاتا ہے' اس کو کون پکڑنے والا ہے' جب اس طرح سے ان کی گرفت ہوتی ہے تو وہ منہ کے بل اوندھے پڑے ہوتے ہیں۔ اس وقت ان سے یہ کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ جسے تم آوازیں دے دے کر پکارا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ آؤ! کون ہے ایسا کرنے والا' بتاؤ ہمیں؟ اب دیکھا کہ کیسی گرفت ہے! کیا انداز ہے قرآن کا! جسے تم آوازیں دے دے کر بلایا کرتے تھے' وہ یہ تھا۔ دوسرے مقامات پر ہے کہ وہ اس تباہی کے لیے جلدی مچاتے تھے کہ

جلدی لاؤ، ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ کہا کہ اس وقت انہیں کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ جسے تم آوازیں دے دے کر بلایا کرتے تھے۔ یہ ہے وہ تباہی۔ بات یہ تھی کہ جب ان سے یہ کچھ کہا جاتا تھا تو وہ ان سے کہتے تھے کہ آپ اپنے متعلق، اپنی قوم کے متعلق، اپنے متعبین کے متعلق، تو بتایئے کہ ان کا کیا حال ہوگا؟ کیا انداز ہے قرآن کا!

بات ہماری نہیں، تمہاری ہو رہی ہے

قرآن کہتا ہے کہ **قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَ مَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا** (67:28) کہو کہ اسے تو تم چھوڑو کہ ہمارا کیا حال ہوگا، ہم گرفت میں آئیں گے یا ہم پہ خدا کی رحمت ہو جائے گی، ہماری بات چھوڑو۔ یہاں آپ جس سے بھی کوئی بات کہیں، کوئی نصیحت کی بات یا یہ کہیے کہ تمہاری یہ غلطیاں ایسے نتائج پیدا کریں گی، وہ یہ نہیں کہتا کہ میں دیکھ لوں گا کہ واقعی یہ غلط ہے جو میں کر رہا ہوں، اس کا نتیجہ واقعی غلط نکلے گا وہ فوراً پلٹ کے آتا ہے، اس کا ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ ''توں ساڈی گل چھڈ، اپنی سنا۔''[1] یہ ردِعمل ہوتا ہے۔ یہاں کہا کہ اسے چھوڑو کہ ہمارے ساتھ کیا ہوگا، سوچو یہ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ ہم تو تمہاری بات کر رہے ہیں کہ جو تم سے کہا جا رہا ہے، بتاؤ ''وہ صحیح ہے یا نہیں۔'' اس بات کو سوچو جو ہم کہہ رہے ہیں۔ **فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ** (67:28) سوچو یہ کہ جو، ان قوانین کی صداقت سے انکار کرتے ہیں، جب ان کی غلط روش کے نتائج سامنے آئیں گے تو وہ کون ہے جو تمہیں اِن سے بچا لے گا۔

قرآن بحث میں نہیں الجھتا

ہم سے یہ کہہ کے مطمئن نہ ہو جاؤ کہ تم اپنی بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ وہ ہم سمجھ لیں گے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوگا۔ کتنا عجیب انداز ہے قرآن کا! وہ بحث میں نہیں الجھتا، مناظرے نہیں کرتا کہ اس کے بعد یوں ہو جائے۔ وہ کہتا ہے کہ ہماری تو چھوڑ دیجیے، تم سے جو کہا جا رہا ہے اس پر غور کرو کہ وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اور اگر وہ صحیح ہے تو تمہارا انجام کیا ہوگا؟ تم اپنے متعلق سوچو، ہماری بات چھوڑ دو۔

خدا کو ماننا دراصل اس کے قانون کو ماننا ہے

جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو سنو! **قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ** (67:29) ہم تو اس خدائے رحمٰن پر ایمان لاتے ہیں۔ اس پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے یہ مان لیا ہے کہ اس کے قوانین، اس کی راہنمائی، اس کی ہدایات، برحق ہیں، صداقت پر مبنی ہیں۔ وہ جیسا کہتا ہے ویسا ہو کے رہے گا۔ ہمیں ان چیزوں پر یقین ہے۔ ایمان کے یہ معنی ہوتے ہیں، ورنہ یہ نہیں ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں، دوسرا نہیں مانتا، فرق کیا پڑتا ہے۔ خدا نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے مجھے اس کی حقانیت اور صداقت پر یقین ہے کہ وہ ایسا ہوگا **وَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا** (67:29)

---

[1] تم ہماری بات چھوڑو، اپنی بات کرو۔

اور ہمارا اعتماد اور بھروسہ بھی اسی کے بتائے ہوئے قوانین پر ہے: غلط روش سے تباہی آتی ہے۔ اور اس کے بعد اس سے بچنے کا جو طریقہ اس نے بتایا ہے' ہمیں اس پہ بھی اعتماد ہے کہ ویسا کریں گے تو بچ جائیں گے۔ یہ ہے ہماری بات جو ہم سے پوچھتے ہو کہ تم بتاؤ تمہارا کیا ہوگا۔ کہنے لگے کہ ہم تو یہ کرنے والے ہیں۔ جن کی یہ کیفیت ہو ان کو کس قسم کا ڈر ہو سکتا ہے: صداقت پر ایمان اور اس کی نصرت پر اعتماد' اس لیے ہم تو امن میں رہیں گے۔

کون کس حال میں ہے؟ جلد معلوم ہو جائے گا

عزیزانِ من! باقی رہی یہ بات' جو میں نے عرض کیا تھا کہ اسی دنیا کے اندر بھی یہ نتائج آتے ہیں۔ قرآن ان کے بارے میں بھی کہتا ہے کہ **فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ** (67:29) تم یہ بات جلدی جان لو گے' تمہارے علم میں آ جائے گی' جلدی آ جائے گی۔ **فَسَتَعْلَمُوْنَ** (67:29) یہ وہ ہے جسے انگریزی میں By and by کہتے ہیں۔ یہ بھی چیز ہو جاتی ہے کہ اگر اس بات پہ بتدریج غور کرو گے تو سمجھ میں آ جائے گی کہ غلط قدم اٹھ رہا تھا اور اس سے غلط نتیجے پیدا ہو رہے تھے لیکن بہر حال **فَسَتَعْلَمُوْنَ** (67:29) یہیں نظر آ جائے گا کہ کون گمراہی میں تھا' کون صحیح حالت میں تھا۔ یہیں سامنے آئے گا تو اس کا کچھ فائدہ بھی ہوگا کہ پھر انسان اصلاح کر سکتا ہے' اس سے بچ بھی سکتا ہے لیکن اگر ایسا وقت ہو کہ اس میں پھر اس کی گنجائش ہی نہ ہو کہ اصلاح بھی کی جا سکتی ہے تو پھر اس کے بعد اس کی سمجھ میں آیا بھی تو کیا آیا۔ یہ ہے **فَسَتَعْلَمُوْنَ**! یہیں معلوم ہو جائے گا۔

عزیزانِ من! بات اس سے چلی تھی کہ ہم نے جو رزق کے سرچشمے تمام انسانوں کی نشوونما کے لیے عطا کیے تھے' انہیں ذاتی ملکیت سمجھ کر نہ بیٹھ جاؤ۔ اس سلسلہ میں' آخر میں' کہا تھا کہ انہیں ایک بات سمجھاؤ کہ **قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ** (67:30) ❶۔ پہلے زمین سے رزق کی بات کہی تھی۔ کہا کہ نیچے سے آتے ہوئے پانی کو دیکھو۔ قرآن نے کہا ہے **جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ** (21:30) زندگی کا مدار پانی پر ہے' ہر شے کو پانی سے زندہ کیا ہے اور اب بھی یہ جو اوپر کے کرّوں کے متعلق Scientific (سائنسی) تحقیق ہو رہی ہے کہ وہاں آبادیاں ہیں یا نہیں ہیں تو اس کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ' وہاں کی جو مٹی ہے' اسے دیکھیے کہ اس میں نم ہے کہ نہیں' اگر نم ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پانی ہے اور اگر پانی ہے تو پھر اس چیز کا امکان ہے کہ وہاں زندگی ہوگی۔ تیرہ سو سال پہلے قرآن کا بتانے والا کہہ رہا ہے کہ جہاں پانی ہوگا وہاں زندگی ہوگی' صحراؤں میں بھی جہاں دُور دُور تک پانی

---

❶ ان سے پوچھو کہ اس وقت خدا کے قانونِ کائنات کے مطابق' پانی زمین سے ابل کر' چشموں کے ذریعے اوپر کو آتا ہے۔ اگر اس کا قانون یہ ہو جائے کہ پانی اوپر کی طرف سے آنے کے بجائے زمین میں نیچے ہی نیچے چلا جائے تو بتاؤ کہ یہ آبِ رواں (جس پر تمہاری زندگی کا دارومدار ہے) تمہیں کون دے سکے گا؟ (56:63-64)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

نہیں ہوتا' کہیں کوا اڑتا ہوا نظر آ جائے تو وہ پہچانتے ہیں کہ ہاں یہاں کہیں پانی ہے کیونکہ اگر اس کو پانی نہ ملے تو وہاں کوئی جینے والی شئے کوئی Living Thing (جاندار شے) ہو ہی نہیں سکتی۔

زندگی کا مدار ہی پانی پر ہے

یہاں کہا ہے کہ پانی پہ تمہاری زندگی کا مدار ہے اور پھر وہ اولیں مخاطب تو وہ عرب تھے جن کے صحراؤں میں دُور دُور تک کنواں نہیں نکلتا تھا' ان کا تو مدار چشموں کے اوپر تھا۔ کہا کہ ہمارے چشمے کی کیفیت دیکھو کہ پانی کتنا نیچے ہوتا ہے' تمہیں پتہ نہیں ہے' لیکن تمہاری زندگی کا مدار اس پہ ہے تو ہم نے اس میں یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ چشمہ اوپر کو ابلتا ہوا باہر آ جاتا ہے' اس سے پانی باہر آ جاتا ہے۔ اگر ہمارا قانون یہ نہ ہو اور ہم یہ کریں کہ وہ اوپر آنے کے بجائے نیچے ہی دھنستا چلا جائے' پانی تو رہے گا' مگر پھر اس کے بعد کیا کرلو گے' وہ چشمے یا کنویں کا پانی کیا ہے؟ یہی کہ نیچے سے اوپر آتا ہے۔ گرمیوں میں ہمارے ہاں ایسے علاقے ہیں جہاں پانی بہت گہرائی میں جا کے ملتا ہے۔ گرمی میں ان کا پانی اتنا نیچے چلا جاتا ہے کہ ہماری دسترس سے باہر ہو جاتا ہے اور چشمہ تو خشک ہو جاتا ہے۔ چشمہ خشک ہو جائے تو کوئی قوت ایسی نہیں ہے جو اسی میں پانی جاری کر دے' اور پھر عربوں کے ہاں صحراؤں کے اندر تو وہ غنیمت تھا' جہاں کہیں پانی نکل آتا تھا' ان کے ہاں کی زندگی وہی تھی' جنت اسی کو کہتے تھے' اس لیے قرآن نے جہاں بھی جنت کا ذکر کیا ہے بہتا ہوا پانی اس کے ساتھ کہا ہے۔ ان کے ہاں یہ بڑی اہم چیز تھی' ہم اس کی قدر نہیں جان سکتے۔ ''اسی تے ٹوٹی مروڑی' تے پانی آ گیا۔''❶ کہا کہ بتاؤ کہ اس رزق کے حصول میں زندگی کو برقرار رکھنے میں قرآنِ کریم کی یہ بنیادی چیزیں کیا ہیں جن کے اوپر ان کا دارومدار ہے؟ اِن میں خدا کی پیدا کردہ کیا چیز ہے اور انسان اس میں جو کچھ کرتا ہے' اس کی کیا کیفیت ہے؟

جنتی معاشرہ کی خصوصیات: خدا کی پیدا کردہ نعمتیں' انسان کی محنت اور قرآنی ضابطہ حیات

سورۃ الواقعہ کی چند آیات ہیں' ان میں آیت 63 سے بات شروع ہوتی ہے اور وہ 74 تک جاتی ہے۔ عجیب انداز میں تقابل کیا گیا ہے۔ خدا کی پیدا کردہ چیز اور اس میں انسان کی محنت' جب یہ دونوں ملیں گی' تو پھر رزق بنے گا۔ ذرائع اس کے دیئے ہوئے ہیں' محنت انسان کی ہے۔ کہا ہے کہ اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ (56:63) کبھی تم نے غور کیا ہے جو کچھ تم بوتے ہو؟ تحرثون ہر اُس بونے یا Sowing کو کہتے ہیں جو تم بوتے ہو۔ تم کیا کرتے ہو؟ اچھا بھلا دانہ ہوتا ہے جسے تم مٹی میں ملا آتے ہو۔ یہ کرتے ہو۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ ءَ اَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ ❷ (56:64)۔

---

❶ ہم نے نل کھولا تو پانی آ گیا۔

❷ بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ کیا یہ تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رو سے ایسا ہوتا ہے؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

عزیزانِ من! یہ عربی زبان ہے۔ وہ حرث (56:63) تھا' یہ زرع (56:64) ہے۔ یہ وہی ہے جسے زراعت کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ اس دانے سے جو کونپل نکلتی ہے وہ تم کھینچ کے نکالتے ہو یا ہمارا قانون ہے جس کی رو سے یہ نکلتی ہے؟ وہ کیسی مثالیں دیتا ہے! بدیہی چیزیں ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہو' اس میں کتنا حصہ تمہارا ہوتا ہے؟ تم تو بوتے ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے زمین تیار کی' ہل چلایا' اسمیں کھاد ڈالی' اس مٹی کو نرم کیا' پھر دانہ بو دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں تک تمہاری محنت ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ اس دانے کو کونپل میں تبدیل کرنا' پلانٹ (Plant) میں یا پودے میں تبدیل کرنا' کس کا کام ہے؟ کیا یہ تم کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں؟ یاد رکھو! یہ ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ پھر کہا کہ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ o اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ o بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ (56:65-66) اگر ہمارا یہ قانون نہ ہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دانے سے کچھ بھی نہ اُگے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُگ کر اگر وہ پودا بھی بنتا ہے تو جل بھن کے تباہ ہو جائے۔ اس صورت میں ایک ایک دانے سے سات سات سو دانے تو ایک طرف رہے' تم کہو کہ ہم نے جو بیج ڈالا تھا ہمیں تو اس کی بھی چٹی پڑ گئی۔ بیج بھی گیا۔ کہا کہ تم یہ کہو اگر وہ ہمارا قانون تمہاری محنت کا ساتھ نہ دے' تو تنہا تمہاری محنت کیا کر لے گی؟ پھر کہا کہ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ (56:68) یہ پانی تم پیتے ہو' تمہاری زندگی کا دارومدار بھی اس پر ہے۔ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ (56:69) کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے؟ پانی کی بنیاد تو بارش کے اوپر ہے۔ بارش کا یہ کشید کیا ہوا پانی پینے کے قابل ہے۔ کہا کہ یہ پانی کا سارا انظام ٹھیک ہے۔ چشموں سے تم یہ پانی لے بھی جاتے ہو' کنواں بھی کھود لیتے ہو' نالیاں بنا لیتے ہو' نہریں بھی کھود لیتے ہو۔ یہ بات سب کچھ ٹھیک ہے لیکن وہ جو اصل پانی ہے وہ کس کا پیدا کیا ہوا ہے؟ یہ تو سارا تمہارا انتظام ہے' تمہاری کوششیں اس کے انتظام کے لیے ہیں اس پانی کو تم پیدا تو نہیں کرتے' ہم پیدا کرتے ہیں اور پھر تمہاری کھیتی کے لیے بھی یہی پانی ہے۔ اس کے بغیر تمہاری کھیتی اگ نہیں سکتی۔ پانی بھی ایسا ہے کہ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ (56:70) اگر وہ سارا پانی سمندر کے پانی کی طرح کھاری ہو' وہ نہ تم پی سکو' نہ کھیتی اگ سکے۔

کہا کہ کیا ہمارے اس Water works (واٹر ورکس) کے اوپر بھی کبھی تم نے غور کیا ہے؟ سمندر جیسا کھاری پانی کہ ایک گھونٹ بھی نہیں پی سکتے' اس میں کس طرح سے ہمارے سورج کی کرنیں یہ سارے نمکیات اس سمندر میں چھوڑ دیتی ہیں' سارا کھارا پن اس میں رہ جاتا ہے اور اس میں سے کشید کیا ہوا پانی اوپر اٹھا کے لے جاتی ہے' بادلوں کے مشکیزے بھرے جاتے ہیں' پھر یہ نہیں کہ وہ بادل وہیں سمندر میں ہی اپنا منہ کھول دیں' اسے سمندر میں ہی انڈیل دیں' پھر ہماری ہوائیں آتی ہیں' ان بادلوں کو یہاں سے وہاں تک لے جاتی ہیں۔ جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ان کا منہ کھول دیا جاتا ہے اور نہایت مقطر' کشید کیا ہوا پانی' وہاں ملتا ہے۔ زائد ہوتا ہے تو پہاڑوں کی چوٹیوں پہ برف کی طرح ہم اسے Store (اسٹور) کے اندر محفوظ کر دیتے ہیں تا کہ گرمیوں میں تمہارے کام آئے۔ برف پگھلتی ہے تو سارا پانی یہاں سے وہاں تک چلتا ہے۔ دریائے راوی میں بھی آتا ہے۔ کہا کہ بتاؤ یہ نظم و نسق کس کا ہے؟

اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ (56:71) جسے تم روشن کرتے ہو۔ پھر اس آگ سے تم کتنا کام لیتے ہو۔ کیا یہ درختوں کی لکڑی تمہاری بنائی ہوئی ہے؟ ٹھیک ہے کہ اس سے تم مختلف انداز سے آگ لیتے ہو لیکن اس میں آگ کی صلاحیت کس کی پیدا کی ہوئی ہے کہ لکڑی جلے تو اس میں سے آگ نکلے؛ بلکہ اس نے تو یہ کہا تھا کہ سبز ٹہنیوں کے اندر ہم نے جو آتشِ مضمر چھپائی ہوئی ہے کبھی اس پہ بھی تم نے غور کیا ہے۔ سبز ٹہنیوں کے اندر آتش مضمرا انداز عجیب ہے! پھر کہا کہ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ (56:72) رگِ خشک میں شعلے کو نہاں کر دینا تمہاری کاریگری ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟ آگے بات ساری یہ ہے کہ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً (56:73) یہ کاروبار اتنا ہوتا ہے تو پھر رزق پیدا ہوتا ہے۔ کہا کہ تمہارا اور ہمارا یہ معاملہ، یہ بزنس، یہ کاروبار، مشترکہ تھا۔ تم نے کوشش کی، ہم نے وہ سامان مہیا کیا۔ یہ کاروباری بات کا تو تقاضا ہے کہ پھر اس کو بانٹ لیا جائے: ہمارا حصہ ہمیں دے دیا جائے، تم اپنا حصہ لے لو۔

زندگی کا بہترین بزنس

تم تو کوشش کے مطابق اپنا حصہ لے سکو گے مگر وہ جو ساری بنیادی انوسٹمنٹ (Investment) ہے وہ تو ساری ہماری ہے۔ کیا بات ہے! پھر کہا کہ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً (56:73) ہم نے یہ سب کچھ بیان کیا ہے کہ تمہیں سمجھائیں کہ یہاں معاملہ کیا ہے۔ ہمارا حصہ ہمارے حوالے کرو، جبھی تم دیانتدار اور ایماندار کاروباری ہو سکو گے۔ اگر نہیں دو گے تو ہم آئندہ انوسٹ (روپیہ لگانا) نہیں کریں گے۔ خود ہی تیار کر لینا لیکن سنو! رزق کس طرح تیار کرو گے؟ آگے ایک ہی لفظ میں بات آ گئی کہ ہمارا حصہ ہمیں دو۔ انہوں نے کہا کہ مولا! آپ تو نہ ہمارے سامنے ہیں، نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، تو یہ آپ کا حصہ کس کو دیں؟ کہا کہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (56:74) بھوکوں کو جا کے دیدو، ہم تک پہنچ جائے گا۔ اور یہاں لفظ بھی آیا ہے: متاع۔ متاع ہوتا ہے "اتنا سامان جو مسافر اپنے ساتھ لے جائے، کمر پہ زائد نہ لادا ہو، جمع کرنے کے لیے نہیں بلکہ زندہ رہنے کے لیے ہو، جیسے مسافر لے جاتا ہے۔" یہ ہمارا حصہ ان کو دے دو۔ یہ کاروبار ہے، بزنس ہے، Honesty (ایمانداری) کے اوپر مبنی ہوگا، دیانتدار بنو! ایسا نہ کرو گے تو یاد رکھو! پھر ہم اپنا ہاتھ کھینچ لیں گے۔ اور وہ ہاتھ کھینچنا تو نبی اکرم ﷺ کی وہ چمکتی ہوئی حدیث ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: "جس بستی میں کوئی ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو گیا اس بستی سے خدا اپنی حفاظت کا ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔"

عزیزانِ من! سورۃ الملک آج ختم ہوگئی۔ آئندہ درس میں ہم سورۃ القلم یعنی 68 ویں سورۃ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

پانچواں باب: سورة القلم (آیات 1 تا 6)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1983ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القلم سے ہو رہا ہے: (68:1)۔

حروفِ ابجد کے سلسلہ میں حرف ''ن'' کی توجیہات

اِس سورۃ کی ابتداء ہوتی ہے: نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ❶ (68:1)۔ اِس آیت میں پہلا ہی حرف ''ن'' ہے۔ ایک تو جس طرح سے یہ ابجد کے حروف ''الف ب ت'' لکھے جاتے ہیں؛ اسی طرح سے یہ ''ن'' بھی ہے۔ اس کے متعلق دو تین توجیہات آئی ہیں۔ قدیم زمانے میں؛ یہ جو ہمارے ہاں Alphabet؛ یعنی ابجد کے حروف ''الف ب ت'' ہیں؛ یہ اس شکل میں نہیں ہوتے تھے؛ یہ حروف تصویروں کی شکل میں لکھے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ''ن'' جو لکھا جاتا تھا؛ وہ کچھ ایسی شکل تھی جیسے ایک پتلی سی لمبی مچھلی ہو۔ ایک تو اسے عربی زبان میں مچھلی کے معنوں میں بھی لیا جانے لگا؛ جیسے حضرتِ یونس علیہ السلام کو ذوالنون کہا گیا ہے یعنی مچھلی والا۔ تو گویا ایک تو اس ''ن'' کے معنی؛ اس اعتبار سے؛ مچھلی کے لیے جاتے تھے۔ پھر اس کے بعد آگے چل کر انہی نے؛ اس سے معلوم نہیں کس بناء پر؛ اس کے معنی ''اجمالی علوم'' کے لیے یعنی جن میں تفاسیر نہ ہوں۔ علامات یا اشارات کی رو سے؛ خود علم کے معنوں میں بھی اِسے لینے لگ گئے۔ جب اسے علم کے معنوں میں لیا تو پھر اسے قلم کے ساتھ ملایا تو روشنائی یا جسے انک (Ink) کہا جاتا ہے؛ اِس کے معنی ہو گئے۔ اِس کے معنی دوات کے بھی لیے جانے لگے۔ قلم کی نسبت سے اس کے معنی قلم اور دوات بھی لیے جانے لگے۔ اس کے بعد؛ غالباً وہی جو پہلی شکل تھی؛ ذرا سی باریک سی؛ لمبی سی؛ اس اعتبار سے عربوں کے ہاں ''ن'' ''تلوار کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگ گیا۔ اب یہاں میں آپ کو ایک اصول بتا دوں؛ جسے قرآن میں تدبر کہتے ہیں؛ جسے غور و فکر کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی بنیادی چیز ہے اور چونکہ میرا مسلک ہی اس انداز سے قرآن میں تدبر کا

---

❶ (اے رسولؐ! یہ مخالفین کہتے ہیں کہ تو دیوانہ ہے۔ اِن سے کہو کہ) ذرا دوات اور قلم اور جو کچھ اِس سے لکھا جاتا ہے (یعنی علم کی بارگاہ) سے پوچھو۔ وہ یہ شہادت دیں گے کہ کیا دیوانے اسی قسم کے ہوتے ہیں اور ایسی ہی تعلیم پیش کرتے ہیں جیسی تُو اس کتابِ عظیم میں پیش کر رہا ہے؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے اس لیے بھی اس کی ذرا تفصیل ضروری ہے۔

مرادفات کا مفہوم

عزیزانِ من! جیسا کہ آپ نے مختلف درسوں میں دیکھ لیا ہوگا کہ عربی زبان کے الفاظ میں سے' ہر لفظ کے متعدد معنی ہوتے ہیں لیکن وہ اس لفظ کے مرادفات نہیں ہوتے کہ ایک کی جگہ دوسرا لفظ لے آیا جائے تو معنی بالکل وہی ہوں۔ یہ تو اصل میں شاعری کے لیے فارس والوں نے فارسی میں یہ انداز اختیار کیا تھا کہ شہد بھی ہے اور انگبیں بھی ہے کیونکہ شعر کی نسبت سے مختلف الفاظ چاہئیں۔ عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لیے سینکڑوں الفاظ آتے ہیں لیکن ان کے معنی میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ کوئی لفظ بعینہٖ انہی معنوں میں دوسری جگہ استعمال نہیں ہوتا۔ یہ مرادفات کہلاتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ اب جو تدبر والا ہے اُسے دیکھنا یہ ہوگا کہ ان معنی میں سے کونسا معنی اس مقام پر Fit in (لاگو' موزوں) ہوتا ہے۔ اس مقام سے مطابقت کھاتا ہے جہاں قرآن نے اسے استعمال کیا ہے۔ یعنی اس مقام پر ان الفاظ کے معنی میں سے کونسا معنی لیا جائے گا۔ ایک تو یوں دیکھنا ہوتا ہے اور دوسرا طریقہ قرآن نے خود بتایا ہے۔ یہ تصریفِ آیات کا ہے۔

قرآن فہمی کے لیے تصریف آیات کا طریق ضروری ہے

قرآنِ کریم کے سمجھنے کا دوسرا طریقہ تصریفِ آیات ہے۔ ایک ہی چیز قرآن میں مختلف مقامات پر دہرائی جاتی ہے اور یہ اس کا خاص انداز ہے۔ اگر وہ مقامات سامنے ہوں جہاں وہ چیز بار بار آئی ہے تو ہر مقام پہ اس کے معنی خود متعین ہو جاتے ہیں۔ ایک تو تدبر کرنے والے کے لیے ضروری ہوگا کہ جو لفظ سامنے آیا ہے اس کے جو مختلف معنی ہیں' وہ معنی اس کے سامنے ہوں۔ پھر اسے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس میں سے کونسا معنی اس مقام پر جہاں آیت میں یہ لفظ آیا ہے' وہاں یہ مطابقت کھاتا ہے' Fit in (لاگو' موزوں) ہوتا ہے' اور اس کی سند اس کے پاس ہونی چاہیے۔ ایک تو لفظی معنی کی سند ہے وہ تو بہرحال زبان کے اعتبار سے ہوگی اور یہ جو معنی اس نے ان معنی میں سے منتخب کیے ہیں اس کی یہ سند ہو کہ قرآن کے دوسرے مقام پر یہ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اگر اس کے پاس دو سندیں ہیں یعنی زبان کے اعتبار سے سند ہو کہ اس لفظ کے یہ معنی بھی لغت میں آتے ہیں اور قرآنِ کریم کی دوسری آیات سے اس کے معنی جو مرتب یا متعین ہوتے ہیں' وہ سامنے ہوں' اس طرح اگر دونوں چیزیں اس کے سامنے ہوں تو یہ اس کا قرآن کا تدبر یا اجتہاد کہلائے گا۔ اب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ شخص کسی ایک وقت میں اپنے اسی تدبر سے ان معنی میں سے کسی ایک معنی کو لے۔ انسان ہے اس کی فکر بڑھتی رہتی ہے' تدبر کی نئی نئی راہیں کھلتی رہتی ہیں۔ کسی اور مقام پہ اس نے دیکھا کہ یہ دوسرے معنی زیادہ موزوں نظر آتے ہیں تو وہ اسے اختیار کر سکتا ہے۔ اسے اختلاف نہیں کہا جائے گا۔

مفہوم کے لیے سند ضروری ہے

عزیزانِ من! اس کے پاس سند وہ ہونی چاہیے کہ یہ جو معنی وہ لے رہا ہے' زبان کے اعتبار سے' عربوں کے ہاں مستعمل تھے' قرآنِ کریم کے دوسرے مقام سے اس کی تائید ہوتی ہے اور تیسری ایک اور چیز ہوتی ہے: قرآنِ کریم کی من حیث الکل بھی ایک تعلیم ہے' وہ ایک تصور دیتا ہے' اُس کے اندر بھی اس معنی کو fit in (لاگو' موزوں) ہونا چاہیے۔ مثلاً وہ علم کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ یہ کلی قرآن کا اصول ہے۔ کسی جگہ جہالت کی تعریف نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ بات اس کے خلاف چلی جائے گی۔ یہ تینوں چیزیں سامنے ہوں تو پھر اسے تدبر فی القرآن کہتے ہیں۔ اب یہاں پر جہاں تک ''قلم'' کا تعلق ہے قرآن نے جہاں یہ بتایا ہے' اس کے لیے ہمارے پاس قرآن کی واضح دلیل موجود ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ** (94:4)۔ اس کے لفظی معنی یہ آئیں گے کہ خدا وہ ذات ہے کہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعے سکھایا۔ ایک جگہ آیا ہے کہ **عَلَّمَهُ الْبَيَان** (55:4) اس کو باتیں کرنا سکھایا۔ ''سکھایا'' کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اس میں سیکھنے کی صلاحیت رکھ دی۔ انسان میں قوتِ گویائی سے اپنا مفہوم بیان کرنے کی صلاحیت ہے۔ اور جہاں کہا کہ ''قلم'' کے ذریعے سکھایا تو اس کے یہ معنی ہوگئے کہ انسان میں تحریر کے ذریعے سے اپنا مفہوم بیان کرنے کی صلاحیت ہے۔ قرآن نے یہ دونوں چیزیں کہی ہیں: ''قلم'' کے ذریعے یعنی تحریری طور پر بھی مفہوم بیان کرنا اور قوتِ گویائی سے یعنی بول کر بھی مفہوم بیان کرنا۔ ہمیں قرآن سے سند مل گئی کہ یہاں جو قلم ہے' تو یہ تحریر کے ذریعے سے بات کی جائے گی' یہ اس کے لیے آیا ہے۔ علم کے لیے بھی یہ **وَمَا يَسْطُرُوْنَ** آیا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ تحریر کے معنوں میں یہ بات آئی ہے۔ اب اگر یہاں ''ن'' کے معنی کوئی روشنائی لیتا ہے' اس کے معنی انک (Ink) لیتا ہے' تو یہ اس اعتبار سے ٹھیک ہونگے۔ ''قلم'' کے ساتھ یہ چیز کہی گئی ہے لیکن وہ جو ان کے ہاں ''ن'' کے دوسرے معنی تلوار کے لیے تھے' یہ معنی ان کے لغت میں موجود ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر کوئی یہ معنی لیتا ہے تو قرآنِ کریم سے اس کی تائید کیسے ملے گی۔

قلم کی اہمیت

عزیزانِ من! قرآن نے ''قلم'' کی جو اہمیت بتائی ہے پہلے میں اس میں ذرا دو الفاظ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو عام تحریر بھی ہے۔ خصوصیت سے وحی کے ساتھ قرآن نے یہ کہا کہ انسان کو قلم کے ذریعے' تحریر کے ذریعے' بھی علم کی دنیا میں سندات و تائیدات حاصل کرنے کی صلاحیت دی۔ جو وحی تھی اسے نہ تو قوتِ گویائی کہا جاسکتا ہے' نہ تحریر کہا جاسکتا ہے۔ وہ تو ایک خصوصی چیز تھی جو انبیائے کرام کے ساتھ ہی تھی کیونکہ قرآن نے کہا ہے کہ جبریل نے اسے قلبِ نبوی پر نازل کیا۔ تو جو چیز قلب پر نازل کی جاتی ہے' وہ تو اُن محسوسات کی چیزوں میں سے نہ تو گویائی میں آتی ہے' نہ ہی تحریر میں آتی ہے لیکن یہ وحی صرف خیالات یا Ideas نہیں تھے' یہ وحی بالفظ

تھی۔قرآن کے یہ الفاظ بھی وحی کے ذریعے نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئے جسے قرآن کی عبارت کہتے ہیں۔اب حضور ﷺ نے اسے دسروں تک پہنچایا۔تو پہلی چیز تو وحی پہنچانے کی بیان کی تھی۔گویائی کے ذریعے سے ان چیزوں کو دہرایا' صحابہ رضی اللہ عنہم نے دہرایا' ان کو زبانی یاد کیا۔وہ حصہ صرف گویائی کا آتا ہے لیکن قلم کی اہمیت قرآن نے بتائی کہ اس کو تحریر میں بھی لایا گیا۔اب قرآن کے دیگر مقامات میں یہ موجود ہے۔قرآن کو تحریر میں لانے والے جو وحی کے کاتب تھے ان کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ بڑے معزز' بڑے قابلِ اعتماد' بڑے دیانتدار تھے۔تو گویا نظر آ گیا کہ قرآنِ کریم اس زمانے میں صرف زبانی کلامی نہیں رہتا تھا بلکہ یہ لکھا جاتا تھا اور قرآن نے تو یہ کہا ہے۔ اس زمانے میں ہرن کی کھال زیادہ مضبوط قسم کے کاغذ کی نوعیت میں تھی۔قرآن کہتا ہے کہ یہ اس پر لکھا جایا کرتا تھا۔تو اگر آپ قلم کے معنی تحریر کے لیتے ہیں تو قرآن سے تائید ملتی ہے اور نظر آتا ہے کہ یہ وحی خداوندی حضور ﷺ کے قلب پر القا ہوتا تھا' حضور ﷺ پھر ان الفاظ کو جو القا ہوتے تھے صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کو دہراتے تھے' زبانی بھی یہ دہرایا جاتا تھا اور صحیح لکھا بھی جاتا تھا۔تو یہ جو تینوں چیزیں ہیں یہ تو پہلے سے آ گئیں۔ ''ن'' کو اگر آپ روشنائی لیتے ہیں اور ''قلم'' کو یہی تحریر کا جو بیان کرنے کا' انداز ہے' وہ لیتے ہیں تو اس مَــــــا یَسۡطُرُوۡنَ کے ساتھ یہ تینوں چیزیں مل جاتی ہیں۔

عزیزانِ من! اب یہاں دوسری چیز یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کے زمانے میں قرآن کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں لکھی جاتی تھی۔اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس زمانے میں کوئی اور کتاب تھی۔اسلام سے پہلے تو عربوں کے ہاں کتاب ہی کوئی نہیں تھی۔یہ قرآن ان کے ہاں پہلی کتاب ہے اور اس کتاب کے دوران پہلے دَور میں اس کے ساتھ دوسری کتاب ہی کوئی نہیں تھی' حتیٰ کہ مجموعہ احادیث جو مسلم کا ہے' صحاح ستہ میں بھی جن کو صحیحین کہتے ہیں' اس میں پہلے دیباچہ میں' یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ مجھ سے قرآن کے سوا کوئی چیز نہ لکھو جس کسی نے جو کچھ لکھا ہو' وہ اسے مٹا دے۔تو گویا قرآن لکھا جاتا تھا اور قرآن کے سوا کوئی دوسری چیز لکھی ہوئی نہیں تھی۔تو یہ چیز تو قرآن کی بابت آ گئی۔

یہ ''ن'' جو تلوار کے متعلق ہے' تو تلوار کی عظمت اور اہمیت قرآن کے ایک ایک صفحہ سے واضح ہے۔یہ جسے آپ جہاد کہتے ہیں' جس کے لیے قتال کا لفظ ہے' (جہاد تو ہر قسم کی کوشش کو کہا جاتا ہے' ساری زندگی جدوجہد میں گزرتی ہے' اسے جہاد کہتے ہیں۔) یہ اس کی آخری منزل ہے جو میدانِ جنگ میں جا کے کوشش کرنی پڑتی ہے۔اس کے لیے قتال کا لفظ آیا ہے جو عام معنی میں جنگ یا جسے War کہا جاتا ہے تو اس سلسلہ میں تو قرآن حکیم بھرا پڑا ہے اور نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا سن 7 ہجری تک کا یہ دَور تو مسلسل ان جنگوں کی ہی تفسیر ہے' جو ایسی جدوجہد میں گزرا' لہٰذا تلوار کی اہمیت تو موجود ہے لیکن قرآن نے اپنے انداز میں ایک بات بھی کہی ہے کہ جس کے تحت تلوار کی عظمت کو ہی نہیں بیان کیا بلکہ اس سارے Process (عمل) یا اسلوب اور طریقِ کار کے تحت تبلیغِ دین کے قیام کی بھی وضاحت کی گئی ہے اور جسے ایک سورۃ کے چند الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے' ویسے تو قرآن کا کونسا مقام ہے کہ جس میں دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است' وہاں

سے نگاہ یا دامن کو وہ کرشمے اپنی طرف کھینچتے ہوئے یہ نہ کہہ رہے ہوں کہ یہیں کھڑا ہو جا' لیکن بعض مقام یا یوں کہیے کہ ہمارے ذوق کے مطابق زندگی کے بعض پہلو اور حقائق کچھ اس طرح ابھرے ہوئے ہوتے ہیں کہ جن کی وضاحت اس سے پیشتر سورۃ الحدید 57 میں بھی آ چکی ہے لیکن میں اُسے یہاں بھی دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ قرآن نے کہا کہ **لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ** ❶ (57:25)۔ انبیائے کرام علیہم السلام پر ہم نے وحی نازل کی۔ یہ تدریجی یا By stages والی جو چیزیں ہیں بڑی غور طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انبیاء کرام کے وحی کو دوسروں تک پہنچانے اور دین کے نظام کو قائم کرنے کے انداز میں تدریجی منازل کیا تھیں؟ اِن میں پہلی چیز ہے: **رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ** (57:25) انہیں دلائل اور براہین کے ساتھ بھیجنا۔ یہ کیا بات ہے!

پیغام پہنچانے کی پہلی شرط: دلائل و براہین

عزیزانِ من! پہلی چیز انبیائے کرام کا دلائل کی رو سے اپنے پیغام کو عام کیے چلے جانا ہے۔ اس میں اعتراضات کا جواب دینا' شکوک کو مٹانا' شبہات کا ازالہ کرنا' ہر چیز دلیل کے ساتھ پیش کرنا' آ جاتا ہے۔ قرآن میں بار بار اپنے مخالفین سے یہ چیز کہی گئی ہے کہ **هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** (2:111) اگر تم سچے ہو تو اپنے دعوے میں دلیل لاؤ۔ تو گویا پہلی چیز اپنے دعویٰ کو دلائل کی رو سے صحیح ثابت کرنا ہے اور یہ انداز اختیار کرنا ہے تاکہ قلب اور دماغ دونوں مطمئن ہو جائیں۔ اسی کو ایمان کہتے ہیں تاکہ قلب اور دماغ دونوں کے اطمینان اور سکون کیساتھ کسی چیز کی صداقت کو تسلیم کیا جائے۔ اگر یہ چیز نہیں ہے تو وہ ایمان نہیں ہے' محض رسم ہے' رسم میں نہ دماغ ہوتا ہے' نہ دل ہوتا ہے اور قرآن نے اس سے اس کی شدید تردید کی ہے۔ رسم وہ چیز ہوتی ہے جو پہلے سے' سلف سے' چلی آ رہی ہو' ''ساڈے ایویں ہونداہونداے۔'' ❷ یعنی اس کے لیے دلیل نہیں' برہان نہیں' The why of it نہیں' کوئی Reason نہیں۔ بھئی! کیوں کرتے ہو؟ جی! ''ساڈے ایویں ہونداے۔'' ❸ ہمارے ہاں یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے اور جو اُس طرح ہوتا چلا آ رہا ہے' کے اعتبار سے مسلمان ہو یا

---

❶ اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کے قیام کے لیے ایسا انتظام کیا ہے کہ اس نے مختلف اقوام کی طرف' اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے اور ہر رسول اپنے ساتھ ضابطہ قوانین بھی لاتا ہے۔ وہ اس ضابطہ قوانین کی رو سے ایسا معاشرہ قائم کرتے ہیں جس میں ہر شخص کا عمل ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرے اور یوں لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ اس معاشرے کے استحکام کے لیے اس نے' ضابطہ قوانین کے ساتھ' شمشیر خارہ شگاف (فولاد) بھی نازل کی ہے جس میں بڑی سختی ہوتی ہے اور چونکہ یہ سختی عدل و انصاف کے نظام کے قیام اور مظلوموں کی حفاظت کے کام آتی ہے اس لیے یہ نوعِ انسان کے لیے مضرت رساں ہونے کے بجائے بڑی منفعت بخش ہوتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ ہمارے ہاں ایسے ایسے ہوتا ہے۔

❸ ہمارے ہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔

ایمان ہوتو قرآن ان سے کہتا ہے کہ تم ایمان لاؤ' ورنہ ہم اسے نہیں مانیں گے۔ کیسے لاؤ؟ فرمایا: دلیل و برہان کی رو سے مانو' یوں مانو تو ایمان کہلائے گا۔ خدا کے ہر نبی نے یہی فارمولا پیش کیا تھا۔ لہٰذا اتباعِ نبوت میں اسی عمل کو ہی پیش نظر رکھنا ہوگا' ورنہ اس طریق کے بغیر کوئی بات قابل ستائش نہ ہوگی اور اگر کوئی اس حقیقت سے انکاری ہوتو پھر اس کے لیے کوئی زبردستی نہیں' کوئی اکراہ نہیں' کوئی بزورِ شمشیر نہیں۔ سوال یہ نہیں کہ اکراہ کی رو سے کسی کو منوایا جائے۔ قرآن خود اس کو ایمان نہیں مانتا بلکہ اس کا تو فرمان ہے کہ آپ خود کوئی بات اکراہ سے مانیں یا آپ منوائیں تو وہ ایمان نہیں ہے۔ اب وہ آ گئے جو دل و دماغ سے' اطمینان کے ساتھ' دلائل و براہین کی رو سے' اسے مانیں تو اُن کے لیے ہے **وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ** (57:25) اور انہیں ضابطہ قوانین دیا گیا۔ اب یہ دیکھیے کہ کیا عجیب لنک (Link۔ ربط) ہے! وہ قانون کا اتباع ان لوگوں سے کراتا ہے جو قانون کی علت اور منافعت کو دل و دماغ کے اطمینان کے ساتھ سمجھ چکے ہیں کہ یہ واقعی حق ہے' یہ ہونا چاہیے اور اس کا اتباع ہمارے لیے' نوعِ انسانی کے لیے' منفعت کی بات ہے۔ کتاب ان کے لیے ہے جو پہلے دلیل و برہان سے' بات کی صداقت کو مان لیں۔ قرآن کی اہمیت کو تسلیم کر لیں تو ان کے لیے کتاب ہے۔ یہ کتاب یا قانون کاہے کے لیے دیا گیا ہے؟ **وَالۡمِيۡزَانَ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ** (57:25) تاکہ تم لوگوں کے معاملات انصاف اور عدل کے ساتھ طے کر سکو۔

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہوگا یہ دو تین مقامات میں آیا تھا کہ عدل کسے کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو چیز بھی مروجہ قانون کے مطابق طے ہو جائے' اسے کہیں گے کہ عدل ہوا ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ جس قانون کی رو سے تم نے طے کیا ہے اگر وہی قانون عدل پہ مبنی نہ ہوتو یہ عدل کیسے ہوگیا؟ بیِّنٰت یعنی دلائل و برہان کی رو سے قانون کی صداقت کو بھی منوانا لازمی ہے۔ جنھوں نے اِس قانون کو مانا' انہیں کہا کہ اس قانون کی رو سے تم معاملات کا تصفیہ کیا کرو۔ اب یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ لوگ آئے جو یہی نہیں کہ اس عدل کے نظام کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں' اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہ رائج نہیں ہونے دینگے' ہمارے ہاں جو ہوتا چلا آ رہا ہے' وہی ہوتا رہے گا۔ جو مروجہ غلط قانون ہے ہم اس پہ چلیں گے۔ یہ قانون نہیں چلنے دیں گے۔ عزیزانِ من! قرآن کسی سے بجبر نہیں منواتا لیکن جنھوں نے برضائے خود اس کو مانا ہوا ہوتا ہے' وہ اگر اس کے مطابق ایک نظامِ عدل قائم کرنا چاہتے ہیں' اور اس کے راستے میں کوئی مزاحم ہوتا ہے' تو اس مزاحمت کا ہٹانا بڑا ضروری ہے۔ کوئی اور طریقہ تو ہے نہیں' دلیل و برہان سے تو انہوں نے مانا نہیں' دھاندلی کر رہے ہیں۔

عمل کا نتیجہ خود بتا دے گا کہ سچ کیا ہے

قرآنِ کریم میں بیشتر مقامات پر ان مخالفین سے کہا گیا ہے کہ **اِعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ اِنِّىۡ عَامِلٌ** (6:135) ارے بھائی! تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے چلے جاؤ' میں اس میں دخل نہیں دونگا لیکن مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو' تم اس میں

دخل نہ دو' دونوں کے نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سچ پر تھا' کون جھوٹ پر تھا۔ یعنی یہ بجائے خود ایک دلیل ہے: کام کے نتیجے سے اس کام کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا۔ جو ڈاکٹر کہتا ہے کہ مجھے یہ دوائی دے لینے دو' نتیجہ خود بتا دے گا کہ اس نے واقعی بخار کا علاج کیا ہے یا نہیں کیا۔ ٹمپریچر بتا دے گا' تھرمامیٹر بتا دے گا۔ یہ Pragmatic Test (عملیتی آزمائش) کہلاتا ہے جو کسی کام کے نتیجے سے اس کام کی صداقت یا کذب کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ وہ ان چیزوں پہ بھی نہیں آ رہے' ان کو یہ کام نہیں کرنے دیتے' ان پروگراموں پہ نہیں چلنے دیتے۔ وہ جو چیز قائم کرنا چاہتے ہیں یہ اس کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں' مزاحمت کرتے ہیں' مخالفت کرتے ہیں۔ اب یہ جو کام ہو رہا تھا اس کے لیے تو قرآن نے کہا ہے کہ یہ **وَمَنَا فِعُ لِلنَّاسِ** ❶ (57:25) ہے۔ ہم اپنے لیے یہ کچھ نہیں کرنا چاہتے' یہ تمہارے ہی بھلے اور فائدے کے لیے کر رہے ہیں۔ آپ سوچیے۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر کسی گاؤں میں کوئی شخص اپنے طور پہ' اپنے چندے سے' اپنے خرچ سے' ہسپتال قائم کرنا چاہے اور وہ گاؤں والے' وہ وہاں کے مستبد سردار' اس کی مخالفت کریں' وہ ڈنڈے لے کر آ جائیں کہ ہم ہسپتال نہیں بننے دیں گے تو انہیں تو پہلے سمجھایا جائے گا کہ میں یہ کچھ اپنے فائدے کے لیے نہیں کر رہا' یہ تمہارے فائدے کے لیے ہے' تمہارے ہاں اتنے امراض پھیلے ہوئے ہیں' اتنی بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں' کہیں سے علاج نہیں ہو رہا' میں یہاں ہسپتال بنانا چاہتا ہوں اور اگر وہ مستبد سردار اس طرح سے روک رہا ہے تو پھر تو ان کو قوت کے زور سے روکنا چاہیے تا کہ وہ ہسپتال بن جائے۔ یاد رکھیے! جسے آپ دین یا اسلام کہتے ہیں' اُس کی ابتداء تو اپنے معاشرے سے ہوتی ہے۔ وہ رب العالمین پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ یوں کہیے کہ وہ ان کی بیماریوں کے لیے ہسپتال قائم کرتا ہے۔ اب مزاحمت کرنے والوں کو تو روکنا خود ان مریضوں کے حق میں خدا کی رحمت ہے۔

تلوار کا استعمال صرف منفعتِ انسانی کے لیے ہے

عزیزانِ من! قرآن نے یہ کہا کہ عدل کا نظام قائم کرو اور اس کے بعد کہا کہ **اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِيۡدَ فِيۡهِ بَاۡسٌ شَدِيۡدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ** (57:25) اس کے ساتھ پھر ہم نے فولاد کی شمشیرِ جگر دار بھی نازل کی۔ **فِيۡهِ بَاۡسٌ شَدِيۡدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ** (57:25) اس میں بڑی سختی ہے لیکن یہ تلوار انسانیت کی منفعت کے لیے استعمال ہوتی ہے' اور اس کا مقصد ہے کہ **وَلِيَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ يَّنۡصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالۡغَيۡبِ** (57:25) تا کہ اس سے نکھر کے یہ بات سامنے آ جائے کہ وہ جو خدا کا پروگرام ہے' اس پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے کون کھڑا ہوتا ہے۔ علاوہ دیگر مقامات کے آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم کے نزدیک خود تلوار' آپ اسے تلوار کہہ لیجیے' تو قوت کی ایک Symbol یا ایک علامت ہے دین کے نظام کے قیام کے لیے بڑی اہم قرار دی جاتی ہے۔ اب اس نظام کو قائم کرنے کے راستے میں جو روڑے اٹکائے' اور عقل و خرد سے' تدبر' تفکر' شعور' برہان اور دلیل کی رو سے نہ مانے' دھاندلی کرے تو انسانیت کی منفعت کا تقاضا ہے کہ

---

❶ نوعِ انسانی کے لیے نفع بخش ہے۔

پھر اسے قوت کے زور سے روکا جائے۔ جتنی جنگیں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے کی ہیں وہ ساری مدافعانہ ہیں' دھاندلی کرنے والوں کو روکنے کے لیے ہیں' کہیں جا کے ان کے اوپر حملے کرنے کے لیے نہیں ہیں۔ اور اسی کو کہتے ہیں: منافع للناس۔ اور پھر یہ خالی تلوار نہیں تھی۔ یہ جو وہ سب کچھ پہلے کہتے چلے آ رہے ہیں' ان سب کے ساتھ یہ تلوار ہے' اسی لیے تو قرآن میں ہے کہ یہ بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور اُدھر تمہیں بھی بڑی کامیابی حاصل ہو رہی ہے' نظر آ رہا ہے فتح ہماری ہے۔ میدانِ جنگ میں دشمن کو شکست ہو رہی ہے' اس وقت اگر وہ دشمن صلح کی جھنڈی دکھاتا ہے تو کہا کہ یہ نہ کہو کہ تم بے ایمان ہو' اس لیے شکست سے بچنے کے لیے' صلح کی جھنڈی دکھاتے ہو' اُسے تسلیم کر لو کہ ہم مانتے ہیں۔ اگر وہ تمہیں دغا دے گا تو کوئی بات نہیں' ہم تمہیں مدد دیں گے۔ مان لو کہ وہ ٹھیک کہتا ہے' آگے نہ بڑھو۔ یہ ہے تلوار اور پھر یہ تلوار قرآن کے ساتھ ہے۔ بے ساختہ یہاں پھر اقبالؒ (1877-1938) ہی آ جاتے ہیں۔ انہوں نے قرآن کے مقامات بڑے ہی بلیغ انداز میں واضح کیے ہیں۔ کہا:

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تُو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار ❶

اور اس کا استعمال بتا دیا کہ

لا دِیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دِیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق ❷

اور دو ایک مقامات میں تو بڑی خوبصورتی سے بات کی ہے:

مومناں را تیغ با قرآن بس است

سوال یہ ہے کہ قرآن اور قوت ہی کیوں؟ کہا کہ

ایں دو قوت حافظِ یک دیگرند

یہ قرآن اور شمشیر دو قوتیں ہیں۔

---

❶ اقبالؒ: ضربِ کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔ 49
❷ اقبالؒ: ضربِ کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔ 51

قرآن اور شمشیر ایک دوسرے کے محافظ ہیں

عزیزانِ من! یہ قرآن اور شمشیر دو قوتیں ہیں۔ قرآن کی ایک قوت ہے۔ صحیح زندگی کے جو اصول ہیں' ان میں اپنی ایک قوت ہوتی ہے۔ حق کی ایک قوت ہے۔ شمشیر کے اندر بھی ایک قوت ہے۔ کہا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے محافظ ہیں۔ قرآن شمشیر کا محافظ ہے کہ یہ بے راہ نہ ہونے پائے اور شمشیر قرآن کی محافظ ہے کہ کہیں یہ وعظ ہی بن کر نہ رہ جائے۔ قرآن کے راستے میں مزاحمت کے معنی قرآن کا راستہ روکنا ہے تاکہ قوانین خداوندی ایک نظام کے تحت متشکل نہ ہوسکیں۔ اس کی حفاظت شمشیر کرے گی اور اگلی چیز یہ ہے کہ قرآن شمشیر کی حفاظت کرے گا۔ دیکھا کس خوبصورتی سے ❶ یہ بات کرتے ہیں اور ساری باتیں قرآن کے ان محکمات کے مطابق ہیں:

این دو قوت حافظِ یک دیگرند

کائناتِ زندگی را محور اند

عزیزانِ من! زندگی کی ساری کائنات ان دو قوتوں کے گرد گھوم رہی ہے۔ صداقتِ ابدی کی حفاظت کے لیے تلوار ایک قوت ہے۔ قوت نہایت ضروری ہے بشرطیکہ وہ قرآن کے حصار کے اندر رہے۔ جب یہ چیز ساتھ لی جائے اور قرآن نے جو شمشیر کی قوت کی خود تعریف کر کے اس کی اتنی اہمیت بتائی ہے' وہ لیا جائے تو پھر''ن'' کے معنی شمشیر لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ جو دوسرے معنی ہیں' میں نے انہیں کیوں ترجیح دی ہے۔ لغاتِ عربی زبان اس کی تائید کرتی ہے' قرآن اس کی تائید کرتا ہے۔ ❷

عزیزانِ من! اب یہ چیز Priorities (ترجیحات) کی ہوجاتی ہے کہ تدبر کرنے والے کے نزدیک ترجیحات کون سی ہیں۔ اسے کہتے ہیں کہ ان دونوں معنی میں سے وہ کس کو ترجیح دیتا ہے یا ترجیح دی ہے۔ اگر کوئی دوسرا وہ معنی لیتا ہے تو یہ بات اس کے ساتھ جھگڑنے کی نہیں ہے کہ یہ غلط ہیں۔ شرط یہ ہے کہ اس کے پاس بھی یہ تینوں سندات ہونی چاہئیں: لغت کی سند اور قرآن کے دوسرے مقامات کی سند اور ان دونوں کے ساتھ تیسری سند قرانِ کریم کی کلی تعلیم کی تائید کی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ فلاں مفسر نے یہ لکھا ہے' فلاں محدث نے یہ لکھا ہے' فلاں عالم نے یہ کہا ہے۔ یہ سند نہیں ہے۔ سند یہی ہے جو قرآن نے خود بتائی ہے۔ اس اعتبار سے آپ دیکھیے گا کہ کسی ایک تدبر کرنے والے کا بھی ضروری نہیں ہے کہ عمر بھر کے لیے وہ وہی بات ہو۔ ہوسکتا ہے کہ مزید شواہد اس کے سامنے آئیں جب وہ مزید غور و فکر

---

❶ یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) مفکرِ اسلام کی طرف ہے۔

❷ اس ساری علمی بحث کو یوں سمیٹا جا سکتا ہے کہ''ن'' کے معنی تلوار بھی ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے''ن والقلم'' سے مراد''شمشیر اور قرآن'' بھی ہوسکتے ہیں یعنی قانونِ خداوندی اور قوتِ نافذہ۔ یہی دو چیزیں ہیں جن سے اسلامی نظامِ مملکت قائم ہوتا ہے۔ قانونِ خداوندی' مملکت کی قوت کی نگرانی کرنے والا کہ وہ بے جا صرف نہ کی جائے۔ اور قوت' قانونِ خداوندی کی نگرانی کرنے والی کہ وہ محض''وعظ'' بن کر نہ رہ جائے۔

کرے' قرآن کے اور مقامات سے کچھ اور انکشافات ہوں' تو وہ جو پہلے اس نے ترجیح کے طور پہ اس کے معنی لیے تھے' ان شرطوں کے ساتھ وہ خود ہی اس میں تبدیلی کر دے۔ علمِ انسانی تو بڑھتا چلا جاتا ہے' یہ رکتا نہیں ہے۔ اس لیے کسی ایک دَور کے ایک فرد کا تدبر بھی حرفِ آخر نہیں۔ ہر ایک کو حق حاصل ہے کہ وہ اس سند کے ساتھ خود تدبر کرے۔ اسی طرح کسی ایک دَور کا تدبر بالقرآن قیامت تک کے انسانوں کے لیے سند نہیں ہے۔ علمِ انسانی بڑھ رہا ہے' قرآن کے محکمات اپنی جگہ پر چٹان کی طرح موجود ہیں۔ قرآن نے اسے محور کہا ہے۔ محور وہ شے ہے جو اپنے مقام پہ کھڑی ہو اور ہر چیز جو گھوم رہی ہے وہ اس کے گرد گھومے تو قرآنِ کریم کے یہ حقائق محور ہوں' چٹان ہوں' جو اپنے مقام پہ کھڑے ہوں اور تدبر و تفکر ان کے گرد گھومتا رہے۔ پھر اس کی رو سے جو تدبر ہے وہ یوں ہوگا کہ جوں جوں علمِ انسانی بڑھتا چلا جائے گا' تدبر کی راہیں بھی کشادہ ہوتی جائیں گی۔ قرآن نے تو اپنے ہاں خود بتایا ہے کہ انفس و آفاق میں جو ہماری علامات ہیں' ہم ان سے پردے اٹھاتے چلے جائیں گے اور ہر پردہ اٹھنے کے بعد جو بات سامنے آئے گی وہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ قرآن نے جو کچھ کہا تھا' وہ حق ہے۔ تو یہ پردے ہر دَور میں اٹھتے ہیں۔

عزیزانِ من! کسی ایک دَور میں سارے پردے نہیں اٹھتے۔ دنیا جتنی علم میں آگے بڑھے گی' اتنے ہی پردے اٹھتے جائیں گے۔ خود ہمارا یہ دَور اس پر شاہد ہے۔ اس دور میں تو اس تیزی سے یہ پردے اٹھنے شروع ہو گئے ہیں کہ خود ہی ایک شخص اپنی زندگی میں مثلاً میں ہی اگر اپنے بچپن کے دَور میں دیکھوں اور آج کا زمانہ دیکھوں تو معلوم ہوگا کہ پہلے زمانے میں ہزار سال میں اتنی تبدیلیاں' انقلابات اور انکشافات نہیں آتے تھے' جتنے اتنے عرصے میں آ جاتے ہیں۔ اب تو ہر سال کار کا ماڈل بدل جاتا ہے۔ جسے کہتے ہیں' یہ دَور بڑا تیز ہو گیا ہے' انسان کے علم کی ترقی کی رفتار بڑی ہی تیز ہو گئی ہے۔ تو اسی اعتبار سے قرآن کے معنی' مفاہیم' انکشافات' میں ترقی ہوتی چلی جائے گی۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ یہ میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ اگر اس طرح لیے گئے معنی کے ساتھ یہ سند موجود ہے تو پھر اس میں کوئی تعرض نہیں ہے' اس کی مخالفت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے یہ ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ کوئی سند نہیں دیتا بلکہ بالکل بلا سند اپنی رائے سے کچھ کہتا ہے یا کسی دوسرے کو کوٹ (Quote۔ حوالہ) کرتا ہے کہ اس نے یہ کہا تھا' یہ قرآن سمجھنے کی سند نہیں۔ کسی دوسرے کا سمجھا ہوا قرآن' کسی دوسرے کے لیے سند نہیں ہو سکتا۔

نٓ وَالۡقَلَمِ وَمَا یَسۡطُرُوۡنَ [1] (68:1)۔ عزیزانِ من! میں نے آپ کو بتایا ہوا ہے کہ جہاں جہاں بھی یہ چیزیں آتی ہیں جسے مثلاً کہتے ہیں کہ خدا ان چیزوں کی قسم کھاتا ہے' وہاں قسم کھانے کے معنی نہیں ہوتے بلکہ یہ معنی ہوتے ہیں کہ "یہ چیزیں اس بات کی شہادت

---

[1] (اے رسولؐ! یہ مخالفین کہتے ہیں کہ تُو دیوانہ ہے۔ ان سے کہو کہ) ذرا دوات اور قلم اور جو کچھ اس سے لکھا جاتا ہے (یعنی علم کی بارگاہ) سے پوچھو۔ وہ یہ شہادت دیں گے کہ کیا دیوانے اسی قسم کے ہوتے ہیں اور ایسی ہی تعلیم پیش کرتے ہیں جیسی تُو اس کتابِ عظیم میں پیش کر رہا ہے؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دیتی ہیں، جو آگے کہی جاتی ہے اور وہ بات عظیم ہے جو کہی جارہی ہے۔ ''کس بات کی شہادت دیتی ہیں؟'' علم کی بارگاہ سے تمہیں شہادت ملے گی، قوت کی بارگاہ سے بھی تمہیں شہادت ملے گی۔ شہادت کس بات کی؟ کہا کہ مَآ اَنۡتَ بِنِعۡمَةِ رَبِّکَ بِمَجۡنُوۡنٍ (68:2) خدا کے فضل و کرم سے تو پاگل نہیں ہے، تُو دیوانہ نہیں ہے۔ قرآن کے دیگر مقامات میں ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہا کرتے تھے کہ یہ تو پاگل ہے، (نعوذ باللہ)۔ جہاں تک میں نے اس بات پر غور کیا ہے، طبعی طور پہ تو کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے وہ یہ کہیں کہ یہ پاگل ہے۔ ایک پاگل پن، دیوانگی اور جنون دوسرا بھی ہوتا ہے اور یہ جنون وہ ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی بلند مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ وہاں پہنچنے پر عقل کے سب تقاضے پیچھے رہ جاتے ہیں، وہ عشق کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے۔ بلند مقصد، اس کی صداقت پر یقین، اس کے حصول کے لیے مسلسل جدوجہد، اور پھر وہ مقام کہ جہاں پھر یہ جو عام نچلی سطح کے وہ نفع اور نقصان کے جو معیار ہیں، پست سطح پہ رہ جاتے ہیں۔ وہاں نفع نقصان کا معیار بدل جاتا ہے، یہ جو نیچے اس معیار والے ہوتے ہیں وہ اسے پاگل کہتے ہیں۔

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو محاورہ ہے کہ اب! پاگل ہوگیا ہے، اسے اپنے نفع نقصان کا بھی پتہ نہیں۔ یہ نفع نقصان کا پتہ نہیں کیا ہے؟ میں اُن پاگلوں کا ذکر نہیں کررہا ہے جنہیں آپ طبعی طور پر اور Mental Hospital (دماغی امراض کا اسپتال) والے بھی پاگل کہتے ہیں۔ میں اُن ''پاگلوں'' کا ذکر کرتا ہوں جو عشق کی دیوانگی میں اس مقام پہ پہنچتے ہیں جہاں ان کے ہاں نفع اور نقصان کا معیار بدل جاتا ہے۔ یہ جو پست سطح کے لوگ ہوتے ہیں وہ اُسے کہتے ہیں کہ پاگل ہوگیا ہے، اسے تو اپنے نفع نقصان کا بھی پتہ نہیں ہے، لیکن دیوانہ بکارِ خویش ہشیار، یہ دیوانہ اپنے کام میں بڑا ہوشیار ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑا خوبصورت ہے وہ مصرع: خلق پسِ دیوانہ و دیوانہ بکارے۔ دنیا پتھر لیے ہوئے، ڈنڈے لیے ہوئے، گالیاں دیتے ہوئے، پاگل کے پیچھے جارہی ہے اور پاگل اپنی دھن میں، اپنے کام کی طرف، چلا جارہا ہے۔ یہ وہ دیوانگی ہے جس پہ ہزار فرزانگی نثار ہوسکتی ہے اور اس دیوانگی کے بغیر دنیا میں کوئی بلند مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جواب بھی تاریخ میں آتا ہے کہ وہ لوگ آئے تھے اور حضور ﷺ کے چچا کی موجودگی میں انہوں نے کہا تھا کہ آپ یہ چیزیں چھوڑ دیں جو ہمارے خلاف کہہ رہے ہیں۔ آپ ﷺ سے پوچھا تھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ دنیا بھر کی دولت چاہتے ہیں، ہمارے پاس موجود ہے وہ ہم آپ کو دیدیں گے، آپ چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے بڑے بن جائیں وہ پنچائتی نظام ہوتا تھا کہ اس میں جو بڑا آدمی ہوتا تھا وہ سربراہ ہوجاتا تھا، آمر ڈکٹیٹر ہوتا تھا۔ آپ وہ قوت و اقتدار چاہتے ہیں، ہم خود آپ کے ہاں دینے کو تیار ہیں اور پھر وہ بڑا دکھتا ہوا پہلو آتا ہے: اگر آپ چاہتے ہیں کہ کسی حسین ترین لڑکی سے آپ کی شادی ہو، ہم آپ کی شادی بھی اس سے کرسکتے ہیں، اور اس عقلِ کل کی دیوانگی کا جواب یہ تھا کہ یہ تو باتیں ہی کچھ نہیں ہیں۔ اگر میرے ایک ہاتھ پہ چاند رکھ دیں اور دوسرے پہ سورج رکھ دیں، میں اس سے پھر بھی باز نہیں آسکتا۔

منزل کے حصول کے لیے دیوانگی

عزیزانِ من! جن کے سامنے وہ بلند مقصد ہوتا ہے' دوسرے واقعی انہیں پاگل کہتے ہیں۔ یہ دیوانگی ہے' دیوانگیٔ عشق ان کے ہاں ہوتی ہے۔ یہ غالب (1797-1869) بھی کس انداز میں بات کر گیا ہے:

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

یہ مشہور ہے کہ بلبل پھولوں سے عشق کرتی ہے اور یہ تو پھر آپ نے بہار کے موسم میں دیکھا ہی ہوگا۔ پتہ نہیں' وہ عشق کرتی ہے یا کیا ہے' وہ ٹک ٹک کرتی ہوئی' پاگلوں کی طرح' گلاب کے پھولوں کے پودوں کے اندر پھر رہی ہوتی ہے۔ بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل۔ غالب (1797-1869) کا انداز اپنا ہے: خندہ ہائے گل' پھول ہنستے ہیں' کیوں؟

کہتے ہیں جس کو عشق' خلل ہے دماغ کا [1]

ان کے نزدیک یہ دماغ کا خلل ہے لیکن اس سے پوچھو کہ یہ دردِ سر نہیں' دردِ جگر ہے۔ وہ اس دیوانگی کا علاج نہیں چاہتا' من لذتِ دردِ تو بدرماں نہ فروشم' نہ فروشم' تیرے درد کی لذت کو میں علاج کے ہاتھوں نہیں بیچنا چاہتا۔ اسی لیے اس کہنے والے نے یہ کہا ہے کہ زندگی میں' باہر کمال خندہ آشفتگی خوش است' کتنا ہی کمال حاصل ہو جائے جو اس کے اندر تھوڑی سی آشفتگی ہے جیسے دوسری دنیا اور دوسرے لوگ جو پست سطح والے ہیں وہ اسے دیوانگی کہیں گے' عقلِ کل بھی اگر تم ہو جاؤ تو پھر بھی جنون ضرور ہونا چاہیے کہ اس جنون کے بغیر عقل تو کسی مقصد کے حاصل کرنے کا آزاد حربہ یا Instrument ہوتی ہے' اس کے حصول کے لیے جو اندر سے جوش اٹھتا ہے وہ تو اس جنون کا ہی پیدا کردہ ہوتا ہے۔

حضور ﷺ کے متعلق عجم کی سازشیں

بہر حال حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے مطالعہ کی وادیوں میں ہی' عزیزانِ من! عمر گزر گئی ہے۔ جو میں نے دیکھا ہے اس میں یہ سوال نہیں تھا کہ معاذ اللہ معاذ اللہ Physically' طبعی طور پر' حضور ﷺ پہ کوئی ایسی کیفیت تھی' پھر بھی جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کی سیرت کو داغدار کر کے پیش کرنے کی کوششیں کی ہیں وہاں یہ بھی چیختے ہیں کہ حضور ﷺ کے اوپر معاذ اللہ معاذ اللہ صدر بار ہزار معاذ اللہ مرگی کے دَورے پڑا کرتے تھے۔ یہ سب عجم کی سازشیں ہیں اور پھر مغرب والوں کو تو خدا دے۔ انکی کوئی سیرت کی کتاب اٹھا کے دیکھیے وہ اس چیز کو اہمیت دے رہے ہیں کہ یہ کیفیت تھی اور جب یہ صورت تھی تو پھر وہ کہتے ہیں کہ جی! اس جنون کے عالم کے اندر وہ' معاذ اللہ

---

[1] مرزا اسداللہ خاں غالب: دیوانِ غالب' جہانگیر بک ڈپو لاہور' 2002' ص۔ 48

کچھ پڑھوایا کرتے تھے اور اس کا نام وحی پڑ گیا تھا۔ وحی کی یہ کیفیت تھی' یا للعجب! جس وحی پہ کم از کم ڈیڑھ ہزار سال تو اب بھی ہو گیا ہے' اس پر بلند ترین علم کی دنیا وجد کرتی ہے' اس وحی کے بیان کردہ حقائق کے اوپر' تو کیا وہ دیوانے کی بڑ ہو سکتی ہے! لیکن جب ہم اپنے ہاں خود ہی اس قسم کی چیزیں ان کو دیدیں تو ان کا کیا قصور ہے' وہ کیوں نہ Exploit (استحصال) کریں' انہیں کیا پڑی کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کی مدافعت کرتے جب کہ ہم ان کو خود ہی یہ میٹریل پہنچا رہے ہیں۔ کس چیز کے خلاف ہم نے انہیں میٹریل نہیں پہنچایا؟ قرآن کہتا ہے کہ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ o مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (68:1-2) کیا خوبصورت بات کہی ہے! دنیا بھر کا علم' دنیا بھر کی مزاحمتیں اور کشمکشیں' یہ سب اس چیز کی شہادت دیں گے کہ اے رسول! تو جو کچھ کر رہا ہے' یہ کسی دیوانے کا کام نہیں ہے' کسی پاگل کا کام نہیں ہے۔ وہ تو اگر کبھی ایسا ہو کہ کہیں کوئی چیز عام معیار کے مطابق ہی ہو تو اس قسم کا دیوانہ اس قسم کی پست چیز کی مزاحمت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اس لیے کہ کہیں غلط راستہ آ گیا ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! وہ ایک بہت اچھا شعر یاد آ گیا:

بھٹک بھٹک کے کہاں آ گیا ہے دیوانے
مقامِ سود و زیاں آ گیا ہے دیوانے

دیوانے کے لیے تو یہ مقامِ سود و زیاں ہے۔ اسے تو اس کے لیے بھٹک جانا ہے' بہک جانا ہے۔ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (68:2) یہ خدا کی نعمت ہے کہ ان کے معیار کے مطابق وہ جنون و دیوانے پن والی بات نہیں ہے اور اس کے لیے دلیل یہ دی ہے کہ جو سچ مچ کا پاگل ہوتا ہے اس کے کسی کام میں' کسی پروگرام میں' کسی کاروبار میں' کسی اسکیم میں' قرار و استحکام ہوتا ہی نہیں ہے' اس کے نتائج ہی کچھ نہیں نکلتے۔ ایک تو یہ کہ اس کی ہر چیز بے ربط و بے مقصد ہوتی ہے' کسی ایک خاص پروگرام کے تابع نہیں ہوتی' اس میں تسلسل نہیں ہوتا' ربط نہیں ہوتا۔ یہ چیز نہیں ہوتی کہ اس سے یوں کیا جائے گا تو یقیناً اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ یہ اس میں ہوتا ہے جسے ہم پاگل کہتے ہیں۔ اب میں اُن کا ذکر کر رہا ہوں جن کے ہاں یہ بات نہیں ہوتی۔ وہ جو مخالفین تھے' اور پھر اس زمانے کے یہ مخالفین تو مشرکین تھے' ان کا تو علم بھی اتنا نہیں تھا۔ وہ اس قسم کے کاروبار کو جنون ہی کہتے تھے۔ کہا کہ اس کی دلیل جو ہم کہتے ہیں کہ تجھے ان کے معیار کے مطابق تو کچھ جنون ہے مگر تو پاگل نہیں ہو گیا' اور دلیل اس کی یہ بات ہے' ثبوت اس کا یہ دیا کہ اِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ [1] (68:3)

ہمیشہ سرسبز و شاداب رہنے والا درخت

اس دیوانگی میں جو کچھ تم کر رہے ہو اس کا نتیجہ صرف ہنگامی طور پہ ہی باعثِ منفعت نہیں بلکہ یہ تو غیر منقطع طور پر ہمیشہ پر مفاد ہونگے اور پھر جتنے بھی مفادات ہونگے وہ قیامت تک برابر برآمد ہوتے رہیں گے۔ لہٰذا جسے یہ تمہاری دیوانگی کہہ رہے ہیں' اس دیوانگی کے نتائج

---

[1] تیری سعی و کاوش کا صلہ ایسا ملے گا جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تو یہ ہوں گے کہ اِنَّ لَکَ لَاَجۡرًا غَیۡرَ مَمۡنُوۡنٍ (68:3) وہ کہیں Intercept (منقطع) ہی نہیں ہونگے، منقطع ہی نہ ہونگے، کٹیں گے ہی نہیں، اور ہمیشہ ثمر بار رہوں گے۔ عزیزانِ من! یہ عجیب چیز ہے جو قرآن نے کہی ہے، اس کو ہمیشہ خیال میں رکھیے کہ صدرِ اول کے بعد سے قرآن یا اسلام کی صداقتیں مسلمانوں کی قوم میں موجود ہی نہیں۔ یہ دو بالکل مختلف چیزیں ہیں، ان کو آپس میں نہ ملائیے۔

ہم پیدائشی مسلمانوں کی قوم ہیں

عزیزانِ من! ہمارے ہاں اکثر یہ ہوجاتا ہے کہ ہم اسی کو اسلام سمجھ لیتے ہیں جس کے مطابق مسلمان آج تک زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں یا بسر کررہے ہیں۔ یہ مسلمان ایک قوم ہے جو پیدائش کے اعتبار سے بن جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے اور اب تو معلوم ہونا چاہیئے، اب تو پورا قرآن دو دفعہ [1] آپ کے سامنے آگیا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (4:136) اے وہ لوگو! جو کہتے ہو کہ ہم مسلمان ہیں، ایمان لاؤ۔ قرآن تو ہم سے ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ تو مسلمان کی اور زندگی ہوتی ہے۔ اب میں یہ کہونگا کہ مسلمان کی زندگی تو کچھ اور ہوتی ہے لیکن ہم مسلمانوں کی جو زندگی ہے وہ اسلام کی زندگی نہیں ہے۔ اس لیے یہ چیز کہی جائے گی کہ مسلمانوں پہ تو یہ بڑی افتاد آن پڑی، ان پہ زوال آیا، تباہی آئی۔ اگر آج کے مسلمان کو دیکھیے تو دنیا کی جتنی غیر مسلم قومیں ہیں، وہ ان کے ہاتھوں ذلتیں اٹھا رہا ہے تو کہا جائے گا کہ یہ تو کہا گیا تھا کہ اس کا نتیجہ جو آپ کررہے ہیں، منقطع نہیں ہوگا، مسلسل متواتر چلے گا، آگے قیامت تک کے لیے چلے گا۔ اگر مسلمانوں کی تاریخ پیش کی جائے گی تو اس کے اندر تو آپ کو ذلت اور خواری کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آئے گا۔ کیا یہ اجر ہے؟ رسول اللہ پیدائش کے اعتبار سے اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والوں ہی کے رسول نہیں تھے، وہ پیغام بر تھے، انہوں نے ایک پیغام دیا ہے اور وہ پیغام ہے ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (12:104) تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک پیغام دیا ہے، کچھ صداقتیں دی ہیں، کچھ زندگی کے اصول دیئے ہیں۔ قرآن نے جتنے اصول دیئے ہیں اور صداقتیں بیان کی ہیں، عزیزانِ من! دنیا مسلسل ان کو تسلیم کیے چلی آرہی ہے، ان میں کسی جگہ انقطاع واقع نہیں ہوا ہے۔

سپر پاورز کی چیخ و پکار

عزیزانِ من! اس دور میں تو پوچھیے نہیں کہ دنیا میں کیا چیخ و پکار مچی ہے۔ اگر آپ نے قرآن کی عظمت کی صداقت دیکھنی ہو تو اس وقت جس کرب میں دنیا کی قومیں مبتلا ہیں، یورپ کی اور امریکہ جیسی سپر پاورز کی، ادھر سے رشیا [2] کی بھی۔ انہیں دیکھیں۔ وہ جس عذاب میں مبتلا ہیں، اس عذاب میں بے ساختہ ان کی زبان سے نکل رہا ہے کہ اے کاش! کہیں ہماری زندگی ایسی ہوتی اور وہ جو ایسی کہتے ہیں تو

---

[1] قرآنِ پاک کا یہ دوسرا دورِ درس تھا۔

[2] یہ اکتوبر 1983ء کی بات ہے۔

وہ قرآن کے مطابق ہوتی ہے۔ وہ تڑپ رہے ہیں' انہیں تو کوئی قرآن دینے والا نہیں ہے' کوئی سمجھانے والا نہیں ہے۔ ان میں تڑپ ہے' کرب ہے' اضطراب ہے' یہ بے ساختہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے ہاں جتنے زندگی کے مختلف اصول' قواعد' قوانین' دساتیر بنائے تھے ان میں سے ایک ایک فیل ہوتا چلا گیا ہے اور ہر اصول فیل ہونے کے بعد جب کہیں ان کی نگاہ گئی تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کے ہاں کوئی بات ایسی تھی جو قرآن کے خلاف تھی۔ عزیزانِ من! وہ بہت باشعور لوگ ہیں۔ اپنے حالات پہ غور کرتے ہیں' پھر یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کیوں ہوا ہے۔ تو جب اس کیوں کے اوپر پہنچ کے اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ کوئی بات ایسی تھی جو قرآن کے خلاف ہے۔ معلوم نہیں میرا ایک پمفلٹ آپ کی نظروں سے گزرا ہے یا نہیں۔ میں نے لکھا ہے کہ ''کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟''[1] یہ ہمارے ہاں کا ایک زباں زدِ خلائق فقرہ تھا۔ عام طور پہ ہمارے ہاں مغرب والے تو پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور یہاں چونکہ عقل وفکر سے کام لینا مذہب کے معاملے میں حرام قرار دیا ہوا ہے تو ہماری نئی جنریشن (Generation۔ نسل) اس پروپیگنڈے کا شکار ہو جاتی ہے۔ انہوں نے یہ چیز کہی تھی کہ یہ اسلام چلا ہوا کارتوس ہے' وہ اب چل نہیں سکتا۔ تو میں نے اس پر یہ چیز پہلے لکھی تھی۔ پھر اس کے بعد میں نے ''سلیم کے نام خطوط'' میں بھی ایک بڑا جامع سا مقالہ بھی لکھا تھا۔ مغرب کے یہ جتنے بڑے بڑے دانشور ہیں ان کے اقوال سے میں نے یہ چیز ثابت کی تھی کہ یہ اُس زندگی کی تلاش کر رہے ہیں جو قرآن نے دی ہے۔ تو چلے ہوئے کارتوس کی تو یہ صورت نہیں ہوتی۔

غیر مسلموں کا اعتراض

میرے ہاں ان میں سے لوگ آتے ہیں' بات کرتے ہیں۔ وہ اسی زعم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی بات کرتے ہیں تو اسے اسلام کے اوپر منطبق کرتے ہیں کہ یہ کہاں چل رہا ہے' کہاں ہے یہ نظام آپ کے ہاں؟ جب میں ان کو اِن دونوں میں فرق کر کے بتاتا ہوں اور پھر قرآنِ خالص کو پیش کرتا ہوں تو وہ شعوری طور پہ تو تسلیم کرتے ہیں لیکن پھر وہ اگلا اعتراض کرتے ہیں۔ جس طرح سے پھر وہ مور' ناچنے کے بعد' اپنے پاؤں پہ نگاہ ڈالتا ہے تو پر سمٹ جاتے ہیں' میرے پر سمٹ جاتے ہیں۔ وہ اٹھتے ہیں اور جاتے وقت کہتے ہیں کہ پھر جب یہ کچھ تمہارے پاس ہے تو دنیا میں ذلیل کیوں ہو؟ اس کا جواب کیا دیں؟ قرآنِ کریم نے تو کہا تھا کہ **اِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ** (68:3) یہ ہے وہ اجرِ رسالت وہ تو ساری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ انسانیت اس سے انکار اور تکذیب نہیں کر رہی۔ وہ اس کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ صداقت ہے ہی یہی۔ کوئی دوسری صداقت ہی نہیں ہے۔ یہ اجرِ غیر ممنون ہے۔

عزیزانِ من! دو چیزیں تو پہلے آ گئیں: یہ علم آ گیا' قوت آ گئی اور تیسری چیز یہ بتائی ہے۔ یہ بڑی اہم ہے کہ **اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ** (68:4) اے رسول! اس قوت اور علم کے ساتھ تمہاری سیرت بڑی بلند ہے۔ تو اب نتائج اس صورت میں نکلیں گے کہ علم ہو'

---

[1] اس کا انگریزی ترجمہ ?Is Islam Failure کے نام سے ادارہ طلوعِ اسلام لاہور میں موجود ہے۔

براہین ہو' اس کی رو سے بات کو سمجھایا اور عام کیا جائے۔ استعمال کرنے کے لیے مدافعت کی قوت موجود ہو' اور ان پیش کرنے والوں یا مدافعت کرنے والوں کی اپنی سیرت بلندیوں کے اوپر ہو۔ یہ ہے اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ (68:4)

سب سے زیادہ کامیاب ہتھیار کیریکٹر ہے

اے رسول! اگلی بات ہی کردار و سیرت کی بلندی کی ہے جس کی وجہ سے اس قدر کامیابیاں ہو رہی ہیں' ورنہ کتنے ہی صداقت پر مبنی اصول کیوں نہ ہوں' کتنے ہی مدافعت کے سامان کیوں نہ ہوں' پیش کرنے والوں کا اگر اپنا کیریکٹر پست ہے تو کبھی بھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتے۔ اور یہ بڑی چیز ہے' عزیزانِ من! یہاں ہمیں پھر کھڑے ہو جانا پڑتا ہے۔ قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ کی بلند ترین سیرت کو عظیم کہا ہے' خلق کہا ہے' کیریکٹر کہا ہے' سیرت کہا ہے' کہیں اخلاق کہا ہے لیکن روحانیت کا نام سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ یہ جو روحانی پیشوا ہے یہ بہت بعد کی اختراع ہے۔ روحانیت ہے ہی پاکیزگی سیرت کا نام' بلندیٔ اخلاق کا نام۔ رسول اللہ ﷺ کی جو سب سے بڑی صفت خود خدا بیان کر رہا ہے وہ ''خلقِ عظیم'' ہے' ورنہ خدا یہ کہتا کہ یہ اس لیے ہے کہ تو روحانیت کے بہت بلند مقام پر ہے۔ خدا نے یہ نہیں کہا۔ یہ تو ساری توجہ علم کی طرف سے' تلوار کی طرف سے' اخلاق و سیرت کی طرف سے' ساری توجہ ہٹانے کے لیے ایک چیز دی گئی جس کو یہ روحانیت کہتے ہیں۔ بس جس کے متعلق کہہ دیا جائے کہ صاحب! ان میں بڑی روحانیت ہے' پھر بات آگے نہیں ہوتی کہ علم بھی ہے یا نہیں' پھر یہ نہیں ہوتا کہ وہ تھپڑ مار دیں تو تھپڑ کا جواب دینے کی طاقت بھی ہے یا نہیں: ہو جا لکھ مسیت دا' اکو الف تینوں در کار' سیدھی گل۔''[1] یہ ڈگڈگی بجاتے ہوئے چلا جا رہا ہے' عزیزانِ من! میں نے قوت کی بات کی مگر یہ ہیں جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ''ہو جا لکھ مسیت دا' او سارے آون۔ پاؤں کے نیچے روندتے ہوئے تمہیں چلے جائیں۔ رڑکیں وی نئیں اوناں نوں۔ لکھ جو ہویا' کنڈا نہیں۔''[2] کانٹا نہیں صرف خشک تنکا ہو جا۔ یہ ہے روحانیت۔ اور جب وہ اس سے آگے بڑھے تو خلق کا لفظ آیا۔ سوال یہ تھا کہ خلق میں سیرت کیا ہے۔ کہا کہ صاحب! آپ کرامات کو دیکھیے' کیا آپ یہ باتیں نہیں دیکھتے؟ وہ جتنے اخلاقیات کی دنیا میں پست ہوتے چلے جائیں' اتنے ہی بزرگ تر ہو جاتے ہیں۔

صوفیوں کا فرقہ ملامتیہ

آخر میں صوفیوں کا ایک فرقہ ہوتا ہے۔ وہ ملامتی کہلاتا ہے۔ ان کی ہر روش' ہر بات پر' انہیں ملامت کرنے کو جی چاہتا ہے اور وہ

---

[1] کھانا پینا چھوڑ دو اور صرف مسجد کا ہو کر رہ جاؤ۔ بس سیدھی سی بات یہ ہے کہ تجھے صرف ایک الف (اللہ) ہی درکار ہے۔

[2] کھانا پینا چھوڑ دو اور صرف مسجد کے ہو رہو۔ بے شک وہ سب آئیں اور تجھے پاؤں کے نیچے روندتے ہوئے چلے جائیں مگر تمہاری کسک تک بھی انہیں محسوس نہ ہو۔ تنکا جو ہوا' کانٹا نہیں۔

مقربِ بارگاہِ خداوندی ہیں۔ "ساری عمر نہاندے نئیں ہیگے۔" ❶ آپ نے یہ دیکھے ہونگے۔ یہ جو مجذوب ہوتے تھے یا ہوتے ہیں' ان کا کیا معیار ہے؟ یہ معیار ہے ان کا۔ مگر قرآنِ کریم نے آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے بارے میں برملا کہا ہے کہ **اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ** ❷ (68:4)۔ عزیزانِ من! یہ ہے معیار پرکھنے کا: علم کتنا ہے' مدافعت کی قوت کتنی ہے' قوت کو استعمال کس طرح کرتا ہے اور ذاتی سیرت کیسی ہے۔ جب یہ کچھ ہوگا تو پھر کہا کہ **فَسَتُبۡصِرُ وَ یُبۡصِرُوۡنَ** ❸ (68:5)

عزیزانِ من! میں ہر درس میں یہ عرض کرتا ہوں کہ مرنے کے بعد کی جنت اور دوزخ برحق ہے' ہمارا قیامت پر ایمان ہے لیکن قرآن جو یہ تبدیلیاں اور انقلابات بیان کرتا ہے' اس کے نتائج وہیں پر اٹھا نہیں رکھتا۔ اگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ صاحب! ہمارا راستہ غلط تھا تو کیا فائدہ؟ وہاں سے واپس تو آنا نہیں ہے۔ وہ تو یہاں بتایا جائے گا کہ وہ غلط راستہ تھا۔ اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ جب قرآن یہ انقلابات کہتا ہے تو تمہیں اس کے نتائج کا کہتا ہے کہ وہ تمہیں نظر آ جائیں گے: **فَسَتُبۡصِرُ وَ یُبۡصِرُوۡنَ** (68:5)۔ اس آیت میں حرف "س" بھی ہے' جس کا مطلب ہوتا ہے: ابھی۔ تو یہ کہا کہ اس کے نتائج' اے جماعتِ مومنین! تم بھی "ابھی" دیکھ لو گے' یہ بھی "عنقریب" دیکھ لیں گے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ واقعی ہر چیز کی صداقت پر مبنی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس کے نتائج سے صداقت معلوم ہوتی ہے۔ نتائج قیامت پہ اٹھا رکھیے تو یہاں صداقت کا پتہ کیسے چل سکتا ہے۔ پھر تو یہ ہوگا کہ وہاں چل کے بتا دیں گے جب کہ قرآن کا فرمان تو یہ ہے کہ **فَسَتُبۡصِرُ وَ یُبۡصِرُوۡنَ** (68:5) کیا پتہ چلے گا؟ کہا کہ عنقریب دیکھ لیں گے' عنقریب یہ بات سامنے آئے گی۔ اور پھر یہاں لفظ "بصر" آیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یہ عقیدے کی بات نہیں ہے کہ ذہنی طور پہ یہ مان لیں گے۔ یہاں تو کہا ہے کہ آنکھوں سے دیکھ لیں گے' نتیجہ ان کے سامنے آ جائے گا۔ کیا نتیجہ سامنے آئے گا؟ **بِاَیِّکُمُ الۡمَفۡتُوۡنُ** (68:6) یہ نتیجہ سامنے آئے گا کہ ان دونوں میں سے پاگل کون تھا؟ جس نے اپنا فائدہ اپنے ہاتھ سے گم کر دیا پاگل وہ ہے۔ اس کا ابھی پتہ چل جائے گا۔ یہ قرآن ہے۔ یہ ہر بات واضح کر دیتا ہے۔

عزیزانِ من! وقت ختم ہو گیا۔ سورۃ القلم کی آیت 6 تک ہم آ گئے' ساتویں آیت سے ہم دوبارہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀❀❀......❀

---

❶ وہ عمر بھر نہاتے نہیں ہیں۔

❷ آپؐ کی سیرت بلند ہے اور آپؐ حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ یہ تو رہی نظری (Theoretical) شہادت۔ اس کی عملی شہادت کے لیے تھوڑا سا انتظار کرو' تمہارے قائم کردہ نظام کے درخشندہ نتائج خود بتا دیں گے کہ پاگل کون ہے؟ (ایضاً)

چھٹا باب: سورۃ القلم (آیات 7 تا 41)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج نومبر 1983ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القلم کی آیت 7 سے ہو رہا ہے: (68:7)۔ سابقہ درسوں میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہر رسول حق کا پیغام لے کر آتا تھا۔ اس کے پروگرام کی کڑیاں یوں ہوتی تھیں کہ سب سے پہلے وہ دلائل و براہان کی رو سے اپنے پیغام کو پیش کرتا تھا' دوسروں سے بھی دلائل مانگتا تھا' جو ان دلائل سے قائل ہو جاتے تھے' تو جو ضابطہ قوانین تھا' اس کا اطلاق ان پہ ہو جاتا تھا' مگر جو لوگ اسے نہیں مانتے تھے' اس کی مخالفت میں کھڑے ہو جاتے تھے' ان کے لیے مدافعانہ طور پر قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا تھا' لہٰذا ان کو روکنے کے لیے وہاں قوت استعمال کرنا پڑتی تھی۔ اس سلسلے میں ہوتا یہ تھا کہ مخالفین آپؐ کو دیوانہ کہتے تھے۔ آپ ﷺ انہیں دلائل و براہین سے سمجھاتے۔ اب ظاہر ہے کہ اس پروگرام میں سب سے پہلے وہ لوگ آئیں گے جو

دلائل و براہین کی رو سے اگر چاہیں تو اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں' اگر نہ چاہیں تو ان سے کہا جاتا تھا کہ تم ہمارے پروگرام میں مداخلت نہ کرو' ہم تمہارے پروگرام میں دخل نہیں دیتے' نتائج خود بتادیں گے کہ دونوں میں کون دیوانہ اور فریب خوردہ ہے اور علی الاعلان کہتے تھے کہ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ص وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (68:7) تیرے خدا پر اچھی طرح روشن ہے کہ کون صحیح راستے پر چل رہا ہے اور کون اس راستے سے بھٹک چکا ہے۔ دونوں کو دن بھر چلنے دو' شام کے وقت جب سفر ختم ہو جائے گا تو واضح ہو جائے گا کہ کون منزل پر پہنچ گیا اور کون راستے میں کھو گیا۔ اس کے باوجود جو مقابلے میں آ کر انہیں روکتا تھا' اس رکاوٹ کو دُور کرنا ضروری ہو جاتا تھا۔

ایک دوسرے انداز کی مخالفت

عزیزانِ من! اب اگلی آیتوں میں مقابلہ کرنے اور مخالفت کرنے کا ایک اور Type (اسلوب، قسم) آتا ہے۔ شمشیر تک کی بھی صورت یہ تھی کہ وہ کھلے بندوں میدان میں سامنے آتے تھے' کھلے بندوں مقابلہ ہوتا تھا۔ یہ ایک اور Type (قسم) چاہتا ہے کہ کسی طرح سے Compromise (مصالحت) کر لی جائے' مفاہمت کر لی جائے اس لیے آپ ﷺ سے کہا کہ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ o وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ [1] (68:8-9) یہ حق اور صداقت کی تکذیب کرنے والا ایک ایسا گروہ بھی ہے جو چاہتا یہ ہے کہ کچھ تم جھکو' کچھ وہ جھکیں' کچھ تم پیچھے ہٹو' کچھ وہ آگے بڑھیں۔ یہ وہی ہے جسے مفاہمت یا Compromise کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اسے بھی وارن (Warn۔ متنبہ) کیا ہے۔ امتِ مسلمہ کو بتایا ہے کہ یہ بڑے خطرناک قسم کا گروہ ہوتا ہے۔ اب عام طور پہ آپ دیکھیں گے کہ کشمکش میں کوئی بھی ہو' اس میں یہ مقام آتے ہیں' Compromise (مفاہمت) ہوتا ہے لیکن یہاں یہ ہے کہ ان کی اِس بات کو قطعاً نہ ماننا' وہ اس لیے کہ:

باطل دُوئی پسند ہے' حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

حق پہلے ہی وقت میں اپنے مقام پہ اٹل ہوتا ہے۔ سوال ہی نہیں ہوتا کہ وہ کچھ Give and Take (مک مکا) کر سکے' Compromise (مفاہمت) کر سکے' مفاہمت پیدا کر سکے۔ میں اکثر یہ مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک شخص دو اور دو چار کہتا ہے' دوسرا دو اور

---

[1] یہ لوگ ان حربوں پر اس لیے اتر آئے ہیں کہ یہ چاہتے ہیں کہ تو اس قسم کے طعن و تشنیع سے تنگ آ کر مفاہمت پر آمادہ ہو جائے یعنی کچھ تو اپنے مقام سے ہٹے' کچھ یہ نرم پڑیں اور اس طرح تم دونوں میں مفاہمت کی شکل پیدا ہو جائے لیکن تم ان کی بات بالکل نہ ماننا (اس لیے کہ جو شخص حق پر ہو اس کے لیے اپنے مقام سے ہٹنا اس کی شکست ہے' حق اپنے مقام سے ہٹا تو باطل ہو گیا۔ اس کے برعکس باطل کوئی بھی مقام اختیار کر لے اس کا کچھ نہیں بگڑتا' وہ پہلے ہی باطل تھا پھر بھی باطل رہے گا' صحیح جواب ایک اور صرف ایک ہوتا ہے غلط سینکڑوں ہو سکتے ہیں۔ (17:74:11:113)

دو چھ کہتا ہے۔ اب چار کہنے والا حق پر ہے' چھ کہنے والا باطل پہ ہے۔ درمیان میں کوئی دوسرے بھی آ جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ صاحب! باہمی ضد سے کیا حاصل ہے' آیئے کچھ Compromise (مفاہمت) کر لیں اور Compromise (مفاہمت) یہ ہو کہ تم بھی مان لو' میں بھی مان لیتا ہوں کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں۔ اب وہ جو چھ کہنے والا تھا' اس کا تو کچھ نہیں بگڑا۔ وہ پہلے بھی باطل پہ تھا' اب بھی باطل پہ ہے۔ یہ جو پہلے چار کہنے والا تھا وہ حق پہ تھا' اس کا تو رہا ہی کچھ نہیں۔ یہ تو اگر سوا چار بھی کہہ لے گا تو اپنے مقام سے گر گیا۔ حق کہتے ہی اسے ہیں جو اپنے مقام پر اٹل ہو۔ اس میں Compromise (مفاہمت) نہیں ہوسکتا' اس میں کوئی دوسری چیز شامل نہیں ہوسکتی' اور پھر قرآن ہی کے الفاظ میں اس کے حصے بخرے بھی نہیں ہوسکتے کہ اس کے کچھ حصے کو آپ مانیں اور کچھ حصے سے انکار کر دیں۔ وہ تو کہتا ہے کہ یا تو پورے کا پورا حق لینا ہوگا یا اسے چھوڑنا ہوگا کیونکہ یہ بھی غلط ہے کہ اس کا کوئی حصہ لے لیا جائے اور دوسرے حصے سے انکار کر دیا جائے' جبکہ یہ چیز تو مفاہمت کی یا Compromise کی ہے لہٰذا جو حق پر ہے' اگر وہ یہاں ذرا بھی ایک قدم اس سے اِدھر اُدھر ہوا وہ باطل پہ آ گیا۔

حق حق ہے اور باطل باطل ہے۔ حق پر مفاہمت نہیں ہوسکتی

عام طور پر لوگ کہیں گے کہ صاحب! یہ بڑا ضدی ہے' اپنی بات پہ اڑا ہوا ہے۔ دیکھیے مفاہمت کرانے والے ثالث بیچ میں آ جاتے ہیں۔ وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ اسے دیکھیے صاحب! وہ اپنا مقام چھوڑتا ہے۔ وہ کہتا ہے ٹھیک ہے میں مانے لیتا ہوں' میں پیچھے آ جاتا ہوں' میں کہہ دیتا ہوں کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں اور یہ ضدی ہیں' صاحب! اپنے مقام سے ہل ہی نہیں رہا۔ عزیزانِ من! ضدی اور حق پرست میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ضدی وہ ہوتا ہے جو اپنی بات پہ ناحق اڑا رہے حالانکہ اس نے جو بات خود اختیار کی ہے' یہ اس کے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ اس کو چھوڑ کے دوسری بات اختیار کر لے۔ اب اگر وہ اپنی بات پہ ناحق اڑا ہوا ہے تو وہ ضدی کہلائے گا لیکن جو حق کو لے کر آگے بڑھا ہے وہ حق کو چھوڑ کیسے دے' اسے ضدی نہیں کہا جاتا' اسے اصول پرست کہا جاتا ہے۔ جو لوگ حق کے ماننے والے ہیں وہ اصول پرست ہوتے ہیں' ان کی یہ ضد نہیں ہوتی۔ حق کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہ ہٹیں۔ دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو پھر وہ ہر مقام پہ مفاہمتیں کرتا ہے' حق مفاہمت نہیں کرتا۔

اب قرآن کی اگلی آیات آئی ہیں۔ ان میں ان مفاہمت کرنے والوں کا ذکر ہے اور عجیب چیز ہے جو قرآن نے بتائی ہے۔ یہ Characterless (بے کردار) لوگ ہوتے ہیں' ان کا کوئی کیریکٹر نہیں ہوتا یعنی پہلے ہی جو بات وہ پیش کر رہے ہیں وہ ایسی نہیں جس کے متعلق ان کو یقین ہو کہ یہ حق ہے۔ صرف حق میں Compromise (مفاہمت) نہیں ہوسکتا' یہ اٹل ہے۔ باطل یہ کچھ نہیں ہوتا' یہ سودے بازی ہوتی ہے کہ یہ کہہ وجیسے دوکاندار نفع لینے والا کرتا ہے۔ بیچنا تو اس نے سو روپے میں ہوتا ہے' ڈیڑھ سو روپے قیمت بتاتا ہے

اور پھر کہتا ہے: ''جی تسی دسو: کی دیو گے؟''[1] جس دوکاندار کے ہاں یہ اصول ہوگا کہ میں وہی کھونگا جو مجھے لینا ہے اس پہ اگر آپ یہ کہیں گے کہ صاحب! کچھ کم کرو تو وہ کہتا ہے کہ صاحب! آگے چلے جایئے' یہاں یہ اصول نہیں ہے۔ یہ جو اس طرح سو روپے کے ڈیڑھ سو روپے کرنے والا ہے قرآن نے اب آگے یہ کیٹگری (Category) بتائی ہے۔ عجیب و غریب چیزیں اس میں آتی ہیں۔ اس نے بتایا ہی یہ ہے کہ جو Compromise (مفاہمت) کرنے والا ہے' یاد رکھیے! وہ حق پر نہیں ہے' ضدی ہے اور یہ بات بتا تا نہیں ہے کہ میں حق پر نہیں ہوں لہٰذا اس قسم کی پست ذہنیت کے انسان کے لیے قرآن نے پانچ چھ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ کسی خاص شخصیت کے متعلق بات نہیں کر رہا' وہ ان لوگوں کی ذہنیت بتا رہا ہے جو حق کی دعوت دینے والوں کے ساتھ یہ Attitude (رویہ) اختیار کرتے ہیں' یہ روش اختیار کرتے ہیں۔ وہ حق کے ساتھ Compromise (مفاہمت) کرنے کی دعوت لے کر آتے ہیں۔ یہ پست ذہنیت' Characterless (بے کردار) لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی کردار نہیں ہوتا بلکہ کردار تو اس کا ہے جو حق پر ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ پانچ چھ الفاظ قرآن لے کر آیا ہے۔

عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ نہیں ہے کہ کوئی خاص شخص تھا جس کے متعلق یہ کچھ کہا گیا ہے اور نہ ہی یہ سمجھ لیجیے کہ قرآن معاذ اللہ کسی کو گالی دیتا ہے۔ قرآن تو بتوں کو گالی دینے سے بھی منع کرتا ہے چہ جائیکہ اپنے کسی مخالف کو' اپنے کسی حریف کو وہ گالیاں دینا شروع کرے (معاذ اللہ)۔ وہ ذہنیت بتاتا ہے کہ اس ذہنیت کے لوگ بھی آئیں گے اور یہ متعدد مقامات پہ کہا گیا ہے کہ اے رسول! یہ ٹھیک ہے' ہم جانتے ہیں کہ جو لوگ دلائل و براہین سے بات کریں گے' ان سے بھی تو تنگ نہیں پڑے گا' اور نہ ہی جو میدانِ جنگ میں کھلے بندوں شمشیر لے کر آئیں گے' ان سے تنگ پڑے گا' ہاں البتہ یہ جو اس قسم کی ذہنیت یا Character (کردار) والے لوگ آئیں گے' ہم جانتے ہیں کہ تو ان سے تنگ پڑ جاتا ہے۔ اس لیے کہا کہ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (73:10)[2] یعنی یہ نہیں کہا کہ شمشیر لے کر ان کے مقابلے میں آ جاؤ' بلکہ کہا کہ یہ ''جو باتیں کرتے ہیں اس کو ہمت سے' حوصلے سے' برداشت کرو۔'' تو گویا وہ اس ذہنیت کے لوگ ہیں کہ اس کا جواب رسول یا حق پرست اس ذہنیت سے دے نہیں سکتا' وہ اس مقام پہ اتر ہی نہیں سکتا' یہ بڑا پست مقام ہوتا ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ پھر مقابلہ کس طرح کرے؟ سو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ برداشت کی کیفیت یہ ہے کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ تُو تو اپنی جان گھلا دے گا' ہمت سے کام لو' دلبر داشتہ نہ ہو۔ تو گویا ان لوگوں کا یہ وہ ٹائپ (قسم) آتا ہے جن کی مخالفت میں مخالفت کم ہوتی ہے' پست ذہنیت اور کمینہ پن زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے لیے کہا کہ وَلَا تُطِعْ (68:10) یہ جو Compromise یا مفاہمت کرنے والے آتے ہیں

---

[1] آپ بتائیں: کیا دو گے؟

[2] اور اپنے مخالفین کی کسی بات سے اثر پذیر مت ہو' بلکہ ان کی طرف سے صرف نظر کر کے' اپنے پروگرام پر ثبات اور استقامت سے جمے رہو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

پہلے ان کی یہ بات مت مانو۔ اب دیکھیے کہ ان کی کیا کیا خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ کہا کہ **كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ** [1] (68:10)

قسمیں کھانے والا شخص خود اعتمادی کے جوہر سے محروم ہوتا ہے

عزیزانِ من! اس آیت میں لفظ ہے مھین: پست ذہنیت کا' ذلیل کردار کا انسان۔ اور بتایا یہ ہے کہ جو حلاف ہوتا ہے' وہ بات بات پہ قسم کھائے گا۔ یہ جھوٹے کی پہچان ہوتی ہے۔ سچے میں خود اعتمادی ہوتی ہے۔ وہ اپنی بات کہتا ہے تو اس اعتماد کے ساتھ کہتا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے یہ سچ ہے' مجھے ضرورت نہیں ہے کہ میں قسمیں کھا کے اپنے جھوٹ کو سچ کر کے بتاؤں۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ بار بار قسمیں کھا کے' اپنی غلط بات کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرنے والا' حلاف ہے۔ عزیزانِ من! ہمارے لیے ان چیزوں کے اندر سبق یہ ہے کہ ایسی سیرت ایک مومن کی نہیں ہونی چاہیے' نہ ہو سکتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ کسی خاص شخص کے متعلق کہا ہے کہ وہ ایسا تھا۔ یہ ان لوگوں کی ذہنیت بتائی ہے۔ قرآن تو قیامت تک آنے والوں کے لیے' ہم سب کے لیے' ایک ضابطہ ہدایت ہے۔ جن چیزوں کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ مذموم ہیں' یہ معیوب ہیں' اس قسم کی سیرت اور کردار پسندیدہ نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم بھی یہ خیال کرو کہ یہ بات کہیں تم میں نہ پیدا ہو جائے۔ حلاف جھوٹا ہوتا ہے۔ قرآن نے پہلے یہ بات کہی ہے کہ جھوٹا ہوتا ہے جو حلاف ہوتا ہے۔ جو بار بار قسمیں کھاتا ہے' وہ جھوٹا ہوتا ہے' اس لیے **وَلَا تُطِعْ** [2] (68:10) اب اس کے بعد یہ کہا کہ وہ مھین ہوتا ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ جس میں خود اعتمادی ہوتی ہے وہ وزن دار بات کرتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ میری بات سچی ہے جو ماننا ہے تو مانیے' نہیں تو نہ مانیے بلکہ اسے تو رنج پیدا ہوتا ہے اگر اسے کہا جائے کہ تم نے جھوٹ بولا ہے۔ مھین وہ ہوتا ہے جو حلاف ہوتا ہے۔ قرآن نے حلاف ہونا بڑا معیوب بتایا ہے۔ اب آگے چلیے۔

کچوکے مارنے والا شخص

عزیزانِ من! پہلے میں آپ کو الفاظ بتاتا ہوں کہ قرآن کس انداز میں لیے چلا آ رہا ہے۔ کہا کہ **هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيمٍ ۝ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيمٍ** (68:11-13)۔ اف! ان الفاظ کے معنی آپ کے سامنے ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن کس قسم کا ایک کیریکٹر پیش کر گیا ہے۔ اس آیت میں ایک لفظ ہے ھماز: ''پنجابی اچ کیندے نیں چوباں لان والا۔'' [3] اسے

---

1. (یہ جو مفاہمت کی پیشکش لے کر آیا ہے اس کی حالت یہ ہے کہ) یہ بڑا دنی الطبع' پست ذہنیت کا مالک اور سخت جھوٹا ہے۔ اسی لیے اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیے قسموں پر قسمیں کھائے چلا جا رہا ہے۔
2. اس کی بات بالکل نہ ماننا
3. پنجابی زبان میں اسے کچوکے لگانے والا کہتے ہیں۔

کچوکے مارنے والا کہتے ہیں۔ یہ کچوکے مارنے والا عجیب چیز ہے۔اس کے معنی ہوتے ہیں کمینی حرکتوں سے جماعت میں تفریق پیدا کرنے والا اور یہ یاد رکھیے کہ اس میں ہر وہ چیز ہے جو کمین کی ہے۔اس کے اندر کمینگی ہے' کچوکے مارنے والا' جماعت میں تفریق پیدا کرنے والا ہے۔اس کے معنی ہوتے ہیں وہ جسے ہر جگہ نقص ہی نقص نظر آئے' کوئی اچھی بات نظر ہی نہ آئے' مکھی کی طرح جب بیٹھے گندگی اور غلاظت پہ بیٹھے،کوئی چیز اسے خوبصورت اور حسین نہ نظر آئے' یہ ہر ایک کے عیب کی تلاش کرتا رہتا ہے' یہی ڈھونڈتا رہے کہ اس کے اندر برائی کہاں ہے' کتنی ہے'نقص ہی نقص دکھائی دے' اچھائی کہیں دکھائی ہی نہ دے۔یہ عجیب قسم کی ایک ذہنیت ہے اور ذہنیت کے بدلنے سے تو سب کچھ بدلتا ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ تم تو ایک طرف خدا بھی اس قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جو خود اپنی ذہنیت کو نہ بدل لے۔سارا دارومدار ذہنیت کے بدلنے پہ ہوتا ہے۔ایک یہ ذہنیت بتائی کہ جسے ہر جگہ خرابی ہی خرابی نظر آئے' نقص ہی نقص نظر آئے' برائی ہی برائی نظر آئے۔اف! کس قدر جہنم کی زندگی ہے ایسے شخص کی۔

نبی اکرم ﷺ کی ایک پر مغز دعا

قرآن اس قسم کا تغیرِ نفس ذہنیت میں تبدیلی پیدا کرنے سے کرتا ہے کہ وہ خوبی کو خوبی دیکھتا ہے' خرابی کو خرابی دیکھتا ہے۔وہ نبی اکرم ﷺ کی چمکتی ہوئی ایک حدیث ہے' جو یوں نظر آتی ہے کہ یہ واقعی نبی اکرم کی ہے۔یہ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ''یا اللہ! مجھے وہ نگاہ دے جو ہر شے کی حقیقت کو دیکھ لے: برائی کو برائی دیکھے' بھلائی کو بھلائی دیکھے۔'' اور جب پھر قرآن کی بصیرت جسے نور اللہ' خدا کی روشنی' کہا گیا ہے' یہ تبدیلی وہ پیدا کرتا ہے کہ جس میں پھر انسان کو جہاں جہاں اچھائی ہوتی ہے وہ ابھر کر اپنی نگاہ میں نظر آتی ہے' یعنی وہ اس قسم کا چشمہ لگا لیتا ہے۔قرآن ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔وہ شعر یاد آ گیا جس میں کہا گیا ہے کہ:

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں میں حسیں معلوم ہوتی ہے

قرآن نگاہوں میں یہ تبدیلی پیدا کرتا ہے اور عزیزانِ من! تبدیلی نگاہ یہ ہونی چاہیے کہ جہاں کسی میں کوئی چیز اچھی ہے' اُسے پہلے وہ نظر آئے' پھر یہ کچوکے نہیں مارے گا' یہ تفریق نہیں پیدا کرے گا' پھر یہ جہنم کی آگ میں نہیں جلے گا۔

کچوکوں کی خطرناک بیماری سے بچنے کا طریق

عزیزانِ من! کچوکے مارنے والی ذہنیت تو کسی میں اچھائی بھی دیکھتی ہے تو جل بھن اٹھتی ہے۔اس کا ایک لفظ ہے: ھـمـاز۔ آپ عربی زبان کی جامعیت دیکھیے کہ ایک لفظ میں کتنے معنی سمو کے رکھ دیتی ہے۔یہ وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ۝ الَّذِىۡ جَمَعَ

مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ [1] (104:1-2)۔اور وہاں وہ لفظ آیا ہے۔ھماز یعنی ھَمَّازٍ مَّشَّآءٍ (68:11)۔مشاءٍ کے معنی ہوتا ہے: لگائی بجھائی کرنے والا' ہر وقت چلتا پھرتا رہنے والا کہ کبھی اس کے پاس' کبھی اُس کے پاس۔اِدھر چلا گیا۔کہا کہ سنا تم نے کچھ ایسے؟ یعنی اُس کا کام ہی یہ ہے کہ اِس کے پاس چلا جا رہا ہے' اُس کے پاس چلا جا رہا ہے' پھر رہا ہے' چل رہا ہے گویا لگائی بجھائی کے علاوہ اسے کوئی اور کام ہی نہیں ہے۔ ہمارے دَور میں اِسے پروپیگنڈا کہتے ہیں اور یہ پروپیگنڈے کی The most effective یا مؤثر ترین یا بدترین شکل ہوتی ہے۔صبح اٹھے اور اِدھر کہدیا: ''میاں! سنا کچھ تم نے؟'' اجی میں نے تو نہیں سنا۔کہا کہ ''ویسے تو ہمیں کوئی بات نہیں لیکن چونکہ بات آئی تو میں نے کہا کہ میں آپ کو بتا دوں' تم ان صاحب کو دیکھو' محلے میں کتنے نمازی پرہیزگار نظر آتے ہیں' دیکھا ان کے کرتوت کیا ہیں؟ لیکن ہمیں کیا صاحب! اپنی اپنی گور [2] میں سب لوگوں نے جانا ہے۔ہمیں کیا واسطہ! ویسے ذہن میں ایک بات آئی تھی تو میں نے کہا آپ کو بتا دوں' دیکھنا! یہ کسی اور سے نہیں کرنا' ہمیں کیا واسطہ! اور یہ کیا اور آگے چلے گئے۔ پھر اس کے پاس چلے گئے۔شام تک سارے شہر میں ریڈیو اور ٹی وی وہ پروپیگنڈہ نہیں کر سکتے جو یہ ایک اکیلا کر دے گا اور پھر پتہ ہی کہیں نہیں چلے گا کہ بات شروع کہاں سے ہوئی تھی۔جس سے پوچھو وہ یہ بات دہرائے گا اور اگر اس سے پوچھو' تو وہ کہدے گا کہ ساری دنیا یہ کہتی ہے۔عزیزانِ من! یہ بدترین کریکٹر ہے۔

لگائی بجھائی کے بجائے بےنقاب ہو کر بات کریں

کسی کے خلاف کچھ کہنا ہے تو اس سے کہو' کھل کے کہو' دھڑلے سے کہو' سامنے آ کے کہو' بےنقاب کہو۔عزیزانِ من! پھر عرض کر دوں کہ حلاف' مہین' ہماز' نمیم' زنیم اور مَنَّاعٍ وہ چیزیں ہیں جن سے مجتنب رہنے کے لیے قرآن نے انہیں بار بار دہرایا ہے۔یہ نہیں ہے کہ وہ کسی خاص شخص کی یہ عادتیں بتا رہا ہے۔کہا صرف یہ ہے کہ یہ کیریکٹر (کردار) نہیں ہونا چاہیے۔یہ وہی ہے جسے ہمارے ہاں لگائی بجھائی کرنے والے کہتے ہیں' اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر۔یہ مشاءٍ کیا لفظ ہے! پھر قرآنِ کریم نے اس لفظ کے ساتھ ایک لفظ اور لگایا ہے۔وہ ہے: بِنَمِيْمٍ (68:11) بھڑکانے والا' برانگیختہ کرنے والا' مشتعل کرنے والا' ''بڑے بےحیا ہو تم' وہ اس طرح سے تمہارے خلاف کہتا ہے اور تم آرام سے بیٹھے ہوئے ہو' یہ بےحمیتی کہلاتی ہے' بےغیرتی کہلاتی ہے۔'' اس ذہنیت میں تحمل نہیں ہے' برداشت نہیں ہے۔یہ کچھ کرنے والا بھڑکا رہا ہے' ہرانگیخت کر رہا ہے۔یہ اپنی باتوں میں جھوٹ ملا کر' ہر جگہ فساد پیدا کرنے کی کوشش کر رہا

---

[1] (اے رسول! تم اس شخص سے برملا کہہ دو کہ) وہ شخص تباہ و برباد ہو کر رہے گا جس کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہو کہ دولت اکٹھی کرتا رہے اور پھر گنتا رہے کہ اب کتنا روپیہ جمع ہو گیا اور اب کتنا۔ایسے شخص کی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ اگر قوم میں کوئی مصلح پیدا ہو جو سرمایہ داری کے نظام کے خلاف کچھ کہے تو یہ اس میں ہزار عیب نکالے گا' نکتہ چینی کرے گا' طعن و تشنیع تک اتر آئے گا' کوشش کرے گا کہ اس کے ساتھیوں میں پھوٹ پیدا کر دے۔

[2] قبر (مفہوم القرآن۔پرویز)

ہے۔ یہ ہے بِنَمِيمٍ (68:11)۔اس کے بعد قرآن اس ذہنیت کی مزید وضاحت یوں کرتا ہے کہ مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ (68:12) کوئی بات بھلائی کی ہو، اس میں روڑے اٹکانے والا ہے، ایسی بات کرنے والا ہے کہ اس میں تخریب نکل آئے، مثلاً ''نی بہن! مبارک ہو، اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے۔ میں نے کہا ہے کہ کوٹھے کے اوپر سے ہی جا کر مبارک دے آؤں، رشتہ لڑکے کی منگنی کے لیے آیا ہے بڑی خوشی کی بات ہے۔ اللہ ہر ایک کے ہاں یہ کچھ کرے، خوشی ہے بہن! اچھا! میں جاتی ہوں۔ میں تو دعا کرتی ہوں جیسے اللہ نے اس بچے کا رشتہ کیا ہے، اسی طرح اس کی مرگی بھی ہٹا دے تو اچھا ہے۔'' وہ نیچے لڑکے والے بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ اس طرح مبارک دینے آئی ہے۔ مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ ❶ (68:12)۔ کیا بات ہے! ایسی ذہنیت والے بڑے سجن بن کے آوندے نیں، ❷ مثلاً بہت ہمدردی کے ساتھ اللہ کے ہاں دعا کرتی ہوں بہن! کہ جیسے تو نے یہ کیا ہے، اس کی مرگی بھی ہٹا دے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ کیریکٹر آپ کو ہر جگہ ملیں گے۔ اب آپ ذہن میں لاتے چلے جایئے، میں سمجھتا ہوں پردۂ سیمیں کی طرح آپ کے ہاں معاشرے کے اندر وہ لوگ آپ کے سامنے آتے جائیں گے اور اب تو خدا کے فضل سے ان کی بہتات ہے، کوئی زیادہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

تخریب کاری کے مختلف خطرناک پہلو

اب مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ کے بعد قرآن کہتا ہے کہ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ❸ (68:12)۔ یہ تخریبی مقاصد میں سب سے آگے بڑھنے والا ہے۔ یہ عجیب چیز ہے کہ قرآن یہاں دو متضاد الفاظ لایا ہے: مُعْتَدٍ اور اَثِيْمٍ۔ اثمہ کہتے ہیں ''وہ اونٹنی جو تھک کر، ڈار ❹ سے پیچھے رہ جائے اور ''مُعْتَدٍ'' وہ ہوتا ہے جو آگے بڑھنے والا ہو، ہر برائی اور تخریب کے کام میں سب سے آگے آگے اور اچھائی کے کام میں سب سے پیچھے پیچھے۔ قرآن کیا کیریکٹر بتا رہا ہے، عزیزانِ من! آگے کہا: عُتُلٍّ ❺ (68:13)۔ یہ وہ ہے جو بیدردی سے جیسے کسی بکرے کو یا بکرے کی لاش کو گھسیٹ کے لے جانے والا اور سب کچھ ہڑپ کر جانے والا ہو، یہ دوسروں کا سب کچھ ہڑپ کرنے والا ہے، جو گھسیٹ کر لے جائے۔ اس کے بعد کہا کہ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ❻ (68:13)۔ زنیم یونہی کسی کے ساتھ چپکا ہوا۔ اس کے دو معنی ہوتے ہیں کہ خود تو وہ شاخِ خزاں دیدہ ہو، اپنا ایک پتہ بھی نہ ہو اور دوسروں کے ساتھ چپک کر ان کو چوستا چلا جائے۔ ایک ہی لفظ کے اندر یہ دو چیزیں ہیں: ہر قسم کی

---

❶ خود بھی کوئی بھلے کام نہیں کرتا اور لوگوں کو بھی بھلائی کے کاموں سے روکتا رہتا ہے۔

❷ اس ذہنیت کے مالک بڑے ہمدرد دوست بن کر آتے ہیں۔

❸ انسانیت کے صحیح قانونِ حیات سے سرکشی برتنے میں سب سے آگے اور منفعت بخش تعمیری کاموں میں سب سے پیچھے رہتا ہے۔

❹ قطار

❺ بیدرد، شقی القلب، سخت گیر، جھگڑالو، ہر وقت نیت یہ کہ لوگوں کا سب کچھ سمیٹ کر ہڑپ کر جائے۔

❻ یہ زندگی کی سرسبزی اور شادابی سے یکسر محروم ہے اس لیے بڑا ہی ذلیل اور کمینہ ہے، پیراسائیٹ طفیلی، پیر تسمہ پا: (Parasite) ہے۔

شادابی وخوشحالی سے محروم' دوسروں کا خون پینے والا۔اب آپ دیکھ رہے ہیں قرآن کیا کچھ کہہ گیا ہے' کیا کیریکٹر پیش کر گیا ہے' کس قسم کی تصویریں پیش کرتا چلا جاتا ہے۔اوراس کے بعد کہا کہ جھگڑنے کے لیے کیریکٹر تو یہ ہے اور بڑا کس طرح سے بن گیا ہے؟ اس کے جواب میں کہا کہ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ (68:14) سرمایہ دار ہے' روپیہ بہت ہے اوراس کے پاس ووٹس (Votes) بہت ہیں۔اس زمانے میں قبائلی زندگی کے اندر اولاد ہوتی تھی' قبیلے کے افراد ہوتے تھے۔ان پہ بڑائی کا دارومدار ہوتا تھا:

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں

اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات ومنات ❶

یہ جو آج مغرب کی جمہوریت ہے وہی زندگی ہے' اکثریت ہاتھ اٹھانے والوں کی ہے۔وہاں اُس دَور میں قبائلی زندگی تھی وہاں اکثریت کے لیے اپنی اولاد' اپنے رشتہ دار' گنے جاتے تھے۔ان کی بنا پہ قبیلے کا بوجھ اور وزن ہوتا تھا۔آج اسی طرح سے ذرا سی اس کی شکل بدلی ہوئی ہے۔دیکھیے قرآن دو چیزیں کیسے اکٹھی کر گیا۔کہا: ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ (68:14) اس کے لیے سرمایہ داری بڑی ضروری چیز ہے۔پیسے ہوں تو پھر جتنے جی چاہے آپ ووٹ اکٹھے کر لیجیے۔یہ سب آپ کے بنین ہوتے ہیں' جتنے بیٹے جی چاہے خرید لیجیے۔قرآن کہتا ہے کہ ان کا کیریکٹر یہ ہے اوراس میں ساری خوبی یہ ہے کہ ان کے پاس پیسے ہیں اور جتھہ مضبوط ہے۔آج کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ پارٹی بڑی تگڑی ہے۔

عزیزانِ من! حق کو تو اس کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ اس کی تائید میں کتنے ہاتھ اٹھتے ہیں۔حق کی دعوت دینے والا تو اکیلا ہی ہوتا ہے: اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163) میں سب سے پہلا اکیلا سرِ تسلیم خم کرنے والا ہوں' میرا کوئی سیکنڈ (تائید) کرنے والا بھی نہیں لیکن میں ایک اکیلا ہی حق کے اوپر ہوں۔حق کے ثبوت کے لیے اکثریت کے سارے معیار ہی غلط ہیں' اکثریت کس کی ہے؟ حق کس کی طرف ہے؟ آج کی جمہوریت میں تو اکثریت کی طرف ہے۔اور حق تو' بہرحال' امتِ مسلمہ ہو یا کوئی دوسری قوم ہو' وہ تو خدا کی کتاب ہی ہے۔سوال ہی یہ ہے' Deciding Factor (فیصلہ کن حقیقت) ہی یہ ہے کہ خدا کی کتاب کس کی تائید کرتی ہے۔اس کے ساتھ اگر ایک ووٹ بھی نہ ہو تو بھی وہ حق پہ ہے' اور سو فیصد ووٹ لے جانیوالا بھی اگر اس کے خلاف ہے تو وہ حق پر نہیں ہے۔یہاں قرآن نے کہا کہ وہ اس قسم کی سیرت وکردار کے باوجود لوگوں کا لیڈر اس لیے بنا ہوا ہے کہ وہ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ (68:14) ہے یعنی اس کے پاس روپیہ ہے' ووٹ زیادہ ہیں لیکن اس سے اس کے پاس' حق نہیں ہو جاتا۔قرآن کیا کیا چیزیں کہتا جاتا ہے۔پھر آگے کہا کہ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (68:15) جب اس کے سامنے قرآن کے حقائق پیش کیے جاتے ہیں' بتایا جاتا ہے کہ جس قوم نے بھی

---

❶ اقبالؒ: ضربِ کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔60۔

یہ روش اختیار کی تھی اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی تھا تو وہ کہتا ہے کہ یہ اگلے لوگوں کی بنائی ہوئی کہانیاں ہیں' افسانے ہیں' ہمارے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے' یہ محض افسانے ہیں۔

یہ زندگی کی مستقل اقدار ہیں

کہا کہ اے رسول! یہ ہیں وہ لوگ جو اب مقابلے میں آ رہے ہیں: **سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ** (68:16)۔ یہ محاورہ ہے جیسے ناک کاٹ دینا۔ جسے کہتے ہیں کہ اس کی ناک چورا ہے میں کٹے گی۔ کہا کہ یہ جو اتنا بڑا عزت والا بنا پھرتا ہے اس کی ''ناک'' بیچ چورا ہے کے کٹے گی' اس کا انجام یہ ہوگا۔ تو واقعی یہ جتنی مخالفتیں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کے خلاف جس جس انداز سے ابھری تھیں' ان سب کا انجام ایک ہی ہوا تھا۔ انہیں بری طرح شکستیں ہوئی تھیں۔ قرآن آگے ایک مثال کے ذریعے بات سمجھاتا ہے کہ یہ کردار کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس قسم کا معاشرہ کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ قرآن نے کیا مثال دی ہے اور غلط اور صحیح معاشرے کے اندر کیا بنیادی بات کہہ گیا ہے: **اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ** ❶ (68:17)۔ قرآن کا سمجھانے کا انداز یہ ہے کہ آیئے' تمہیں ایک محسوس مثال سے بات سمجھائیں۔ یہ کوئی واقعہ نہیں ہوتا بلکہ قرآن ایک مثال دیتا ہے۔ قرآن نے دو مقامات پر یہ مثال پیش کی ہے ایک سورۃ کہف میں باغ والوں کی مثال ہے ❷ :(18:32-40)

باغ والوں کی ایک سبق آموز مثال

عزیزانِ من! اس کے علاوہ یہاں (68:17) میں بھی قرآن نے باغ والوں کی ہی مثال دی ہے۔ کہا کہ **اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ** (68:17) انہوں نے کہا کہ بھئی! پھل پک گیا ہوا ہے' کل صبح ہی صبح چلیں گے اور وہ پھل کاٹ لیں گے۔ باغ بڑا شاداب تھا' ثمر بار تھا' پھلوں سے پودے جھکے ہوئے تھے' پھل Ripe ہو گئے تھے' پک گئے ہوئے تھے اور یہ اپنا پھل توڑ کر صبح منڈی لے کر جائیں گے۔ اب یہ دیکھیے کہ فرق کیا ہے؟ قرآن بتاتا ہے کہ **وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ** (68:18) انہوں نے یہ کہا کہ اس میں کسی محتاج' غریب اور مسکین کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ باغ بہت بڑا ہے' پھل پکے ہوئے ہیں' یہ اسے توڑنے جا رہے ہیں۔ اب ایک ہی بات کہہ دی کہ اس میں محتاج و مسکین کا حصہ نہیں ہوگا۔ یہ ایک ذہنیت ہے۔ سرمایہ داری کی ذہنیت ہی یہ ہوتی ہے۔ قرآن نے قارون ❸ کے متعلق کہا ہے

---

❶ ہم اسے ایسا پلٹا دیں گے جیسا (مشہور مثال میں) باغ والوں کو پلٹا دیا تھا۔ (اسی قسم کی مثال (18:32-44) میں بھی آئی ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اس مثال کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ الکہف و سورۃ مریم' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص ص: 83-79

❸ قارون فسادِ سرمایہ داری کا مظہر تھا۔ اس کی مزید تفصیل و تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرِ نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص۔ 124 (فٹ نوٹ نمبر 1)

کہ اسے کہا گیا تھا کہ تو نے اتنا مال' اتنی دولت جمع کر لی ہے تو دیکھو اس میں غریبوں' مسکینوں اور محتاجوں کا حصہ ہے۔ اس پر اس نے کہا تھا کہ یہ میری کاریگری ہے جس کی وجہ سے میں نے یہ جمع کر لیا ہے' اس میں غریبوں اور مسکینوں کا کیا ہاتھ ہے۔ انہوں نے اس کے جمع کرنے میں کیا کیا ہے۔ یعنی اس نے یہ دلیل دی تھی کہ مجھے یہ میری کاریگری سے ملا ہے۔ اس لیے اس میں کسی کا حق نہیں ہوسکتا۔ اب بات دوسری طرف چلی جائے گی ورنہ ہر سرمایہ دار خود سے محنت نہیں کرتا۔ یہ جتنا کچھ تمہارے پاس آ رہا ہے' یہ انہی غریبوں کی محنت کا نتیجہ ہے لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ میرا سرمایہ' میری تکنیک' میری ہنرمندی' میری کاریگری' چالاکی' فریب کاری' یہ سب کچھ میں نے کیا ہے اور یہ مال ومتاع میرے پاس آ گیا' اس میں ان کا کیا ہے؟ وہ یہ کہتا ہے۔

عزیزانِ من! اب یہ دیکھیے کہ مثال کہاں آ رہی ہے: بھرے ہوئے باغات ہیں' ذہنیت یہ ہے کہ ان میں کسی محتاج اور مسکین کا کوئی حصہ نہیں ہے تو اس کا انجام کیا ہوا؟ قرآن نے بتایا کہ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ (68:19) یہ فیصلہ کر کے' کہ صبح جا کے پھل کاٹ لیں گے' وہ سو گئے اور سوتے ہی سوتے باہر سے ٹڈی دَل آیا اور وہ ایسا آیا کہ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ (68:20) اس نے اس سارے باغ کو ایسے کر دیا جیسے کسی کھیت سے فصل کو کاٹ لیا جائے اور باقی بنجر رہ جائے۔ یوں ٹڈی دَل کا ایک طوفان آیا' جس نے سب ختم کر دیا۔ آپ کو یاد ہے کہ وہ جو سورہ الواقعہ (56) کی آیات 63 سے 74 تک جاتی ہیں' ان میں قرآن نے کھیتی اُگانے والوں کو یہ کہا تھا کہ ذرا دیکھو تو سہی کہ اس میں تمہارا حصہ کتنا ہے' ہمارا کتنا ہے۔ یہ بھی دیکھو کہ یہ زمین کس کی ہے: ہماری ہے یا تمہاری؟ تم تو صرف ہل ہی چلاتے ہو' پانی کی ضرورت ہے کیا تم پانی بنا سکتے ہو؟ نہیں' یہ ہم بھیجتے ہیں۔ حرارت کی ضرورت ہے۔ کیا سورج تمہارا ہے؟ نہیں' یہ ہمارا ہے' تم تو صرف اس کی نگہداشت کرتے ہو' تھوڑی سی محنت کرتے ہو۔ کھیتی پک گئی' کھلیان تیار ہو گئے۔ اب اس کے بعد کہا کہ یہ تمہارا اور ہمارا مشترکہ کاروبار تھا۔ یہ خدا کہہ رہا ہے' کہ دیانتدار کاروبار کی طرح آؤ' حصہ کر لیں' اس کو بانٹو' تمہاری تو صرف محنت ہے باقی ساری انوسٹمنٹ ہماری ہے۔ ہمارا حصہ ہمیں دے دو' اپنا حصہ آپ لے لو کیونکہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) انسان تو صرف محنت کا حقدار ہوتا ہے۔ جس کمائی میں محنت شامل نہیں ہے' صرف انوسٹمنٹ ہے' وہ حرام ہے' ربوٰ ہے۔ کہا: تمہاری محنت ہے' تم اپنا حصہ لے لو' ہمارا حصہ ہمیں دے دو۔ کہا کہ جی! آپ تو کہیں نظر ہی نہیں آتے' کہیں ملاقات ہی نہیں ہوتی' تو آپ کو حصہ کس طرح سے دیں۔ کہا کہ بھوکوں کو دیدو' یہ ہم تک پہنچ جائے گا۔

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ بات ان باغ والوں کی ہو رہی تھی۔ کہا کہ یہ کہہ کے وہ صبح گئے۔ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ (68:21) صبح اٹھ کر ایک دوسرے کو پکارا کہ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ (68:22) اٹھو چلو جلدی صبح ہی صبح جا کے فارغ ہو جائیں' پھل کاٹ لائیں۔ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۝ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ (68:23-24) چنانچہ وہ اس مقصد کے لیے اپنے گھروں سے روانہ ہوئے۔ وہ چلتے جا رہے تھے اور چپکے ہی چپکے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ دیکھنا!

ایسا انتظام کرنا' ایسی احتیاط کرنا کہ کوئی بھوکے' محتاج یہاں نہ جھپٹ کے آ جائیں' ان کی عادت ہے انہیں پتہ لگتا ہے کہ کھیتی کاٹنے گئے ہیں تو یہ ہجوم کر کے آ جاتے ہیں۔اس طرح وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے جا رہے تھے کہ کوئی بھوکا اِدھر نہ آنے پائے' اس کا انتظام کر لینا **وَغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ** (68:25) چنانچہ وہ اس طرح باغ کے قریب گئے اور انہوں نے ایسا انتظام کر لیا کہ وہ کسی غریب کو قریب نہ آنے دیں۔ وہ چار آدمی باہر کھڑے کیے ہوئے ہوں تو غریب بیچارہ کہاں جا سکتا ہے؟ وہ تو مانگنے والا ہوتا ہے۔**فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ** [1] (68:26)۔قرآن کا کیا انداز ہے جو اسٹوری بیان کرتا ہے! کہتا ہے کہ وہ اپنے ہی باغ پر پہنچے تو ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ او میاں! کوئی راستہ تو نہیں بھول گئے۔ یہ ہم آپ کہاں آ گئے؟ کہا کہ راستہ تو تم آج نہیں بھولے' دیر کے بھولے ہوئے ہو۔ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں: یہ ہم کہاں آ گئے؟ پھر اس کے بعد آنکھیں ملیں' ذرا دیکھا تو کہا کہ نہیں' باغ تو وہ ہمارا ہی ہے مگر ہوا کیا؟**بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ** (68:27) اس پر وہ سر پیٹ کر بیٹھ گئے اور چلا اٹھے کہ ہمارا تو بیڑہ غرق ہو گیا' کچھ رہا ہی نہیں' چٹی پڑ گئی' ساری محنت گئی' سب کچھ تباہ ہو گیا' ہم برباد ہو گئے' دہائی مچادی۔ایک جھٹکا آیا تھا خدا کا۔**قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ** (68:28) ان میں سے ایک شخص ذرا اعتدال رکھتا تھا' اُس کا ذہن مدہوشی کے عالم میں نہیں تھا' اس کے ہوش کچھ برقرار تھے۔ اس نے کہا کہ میں تم سے نہیں کہا کرتا تھا کہ تم اپنی تمام جدوجہد کو خدا کے قانون کے تابع رکھو' تم نے میری بات نہ مانی۔ یہ اُسی کا نتیجہ ہے۔

عزیزانِ من! اب یہاں میں پھر عرض کروں کہ یہاں **لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ** آیا ہے۔اس کے عام ترجمے آپ دیکھیں گے کہ ''وہ کہتا تھا کہ میں نہیں کہا کرتا تھا کہ تسبیح بھی پھیرا کرو' دیکھ لیا تسبیح نہیں سی پھیر دے۔'' [2] کہا کہ کیا میں یہ نہیں کہا کرتا تھا؟**فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ** (56:74) خدا کی ربوبیتِ عظمیٰ کے لیے ساتھ تگ و تاز کیا کرو' اس کے لیے محنت کیا کرو' کوشش کیا کرو۔**قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ** (68:29) یوں اس پہ انہوں نے اعتراف کیا کہ ہاں ٹھیک ہے' ہم ہی زیادتی کر رہے تھے' جو اس میں غریبوں اور مسکینوں کا حصہ نہیں شامل کرتے تھے۔**فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ** (68:30) پھر وہ آپس میں جھگڑنے لگے جیسے ایسے وقت میں ہوتا ہے۔ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ تیرا بیڑہ غرق' تو نے یہ کرایا۔ دوسرا اس کو کہتا ہے کہ میں نے وہ کہاں کہا تھا؟ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگ گئے۔وہ اس نتیجے پہ نہ پہنچے کہ اِس میں یہ سارے ہی مجرم ہیں **قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ** (68:31) اور اس کے بعد پھر افسوس کرتے ہوئے آ گئے کہ واقعی ہم نے ہی قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تھی' اس لیے یہ کیفیت پیدا ہو گئی۔کہا کہ **عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ** (68:32) اب ہم آئندہ احتیاط برتیں گے اور اس میں

---

[1] جب وہ وہاں پہنچے تو (باغ اور کھیتوں کو دیکھ کر) کہنے لگے کہ آج ہم کہیں راستہ تو نہیں بھول گئے؟ یہ تو ہمارے باغات اور کھیت معلوم نہیں ہوتے۔

[2] تم نے دیکھ لیا کہ تم تسبیح نہیں پھیرتے تھے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

غریبوں کا حصہ رکھیں گے۔ اس کے مطابق عمل کریں گے تو ہمیں یقین ہے کہ خدا ہماری محنتوں کا ہمیں بھرپور نتیجہ دے گا۔

عزیزانِ من! بات یہ ہوئی تھی کہ ہم تمہیں باغ والوں کی بات سمجھاتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کا' جو اس طرح ہر چیز پر سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں' اپنے مال اور بنین کے زور پر حق کی مخالفت کرتے ہیں' ان کا نقشہ الٹ کے رکھ دیں گے' بالکل ایسا جیسے اُن باغ والوں کا نقشہ الٹا تھا۔ دیکھا' مثال کیا دی ہے؟ قرآن محسوس مثال دیتا ہے' وہ صرف ذہنی نہیں ہوتی' صرف اعتقادی نہیں ہوتی' یونہی نہیں ہوتا کہ ان کا بیڑا غرق ہو جائے گا' وہ سچ مچ دکھاتا ہے کہ بیڑا غرق ہو رہا ہوتا ہے۔ اس طرح سے جن کی یہ ذہنیت ہوتی ہے ان کا نقشہ ہی الٹ جائے گا کیونکہ وہ صرف مال اور جتھے کی مضبوطی کی بنا پر سمجھتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں' اور پھر حق کی مخالفت کرتے رہتے ہیں لیکن آخر کار اُن کی یہ صورت ہو جائے گی کہ نہ مال رہے گا' نہ بنین رہیں گے' نہ جتھہ رہے گا' نہ دولت رہے گی اور پھر قوت بھی نہیں رہے گی۔ یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد کہا کہ **كَذٰلِكَ الْعَذَابُ** (68:33) پھر اے رسول! ان سے کہدو کہ اسے کہتے ہیں خدا کا عذاب۔ قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے والوں پر اس دنیا میں تباہی آتی ہے اور دیکھا کس مثال سے قرآن کیا سمجھاتا ہے اور پھر عذاب کے معنی کیا بیان کرتا ہے۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں' ہر بار کہتا ہوں کہ ٹھیک ہے آخرت کی زندگی' اس کا عذاب وثواب برحق ہے لیکن یہ عذاب وہیں نہیں آتا' یہ عذاب یہاں سے شروع ہوتا ہے اور یہی تو وہ چیز ہے جس سے انسان کو درسِ عبرت مل سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہا کہ **كَذٰلِكَ الْعَذَابُ** (68:33) ان سے کہو کہ یہ ہے وہ عذاب جس سے میں تمہیں وارن (آگاہ) کر رہا ہوں کہ یہ کچھ ہو جائے گا۔

اپنی طرف سے قرآن میں کچھ اضافہ کرنا شرک ہے

عزیزانِ من! اب وہ بات جو میں بار بار کہتا ہوں کہ یہ یہاں کا عذاب ہے اور وہاں کا بھی عذاب ہے۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا' قرآن ہاتھ میں لے کر' اپنی طرف سے کچھ کہنا تو شرک ہے' اس سے اللہ محفوظ رکھے۔ **كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ** (68:33) یہ ہے عذاب جو اس دنیا میں آتا ہے' آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ بڑا ہوگا۔ وہ خود کہہ رہا ہے کہ یہ دنیا کا عذاب ہے' جب وہ ذلت' محکومی' محتاجی' مسکینی اور غیروں کا محتاج ہونا عذاب بتاتا ہے تو پھر اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں محو رہنا کہ نہیں' ہم خدا کے محبوب کی محبوب امت ہیں' اس لیے ہم تو خدا کے پسندیدہ ہیں' ہم پہ عذاب نہیں آ سکتا' عذاب دوسروں پہ آتا ہے' مبنی بر صداقت نہیں ہے۔ کہا کہ تمہاری یہ کیفیتیں ہیں۔ تم کہنے لگے ہو کہ دنیا چار دن کی بات ہے' اس میں کونسا ہمیشہ رہنا ہے اصل میں تو عذاب وثواب آخرت کا ہے۔ عزیزانِ من! آپ دیکھیے گا کہ جنت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ایتھے سانوں جتیاں پیندیاں تے پین دیو۔ [1]

---

[1] یہاں ہمیں جوتے پڑتے ہیں تو پڑنے دو۔

قوانینِ خداوندی سے سرکشی کا نتیجہ: ہر طرف محرومی ہی محرومی ہے

قرآن کہتا ہے کہ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ (68:33) اے رسول! تم اِن مخالفت کرنے والوں کو بتا دو کہ قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے والوں پر اس طرح، اس دنیا میں، تباہی آیا کرتی ہے۔ یوں عذاب آتا ہے: اناج سے بھرے ہوئے کھلیان ہیں مگر قوم بھوکی مر رہی ہے، پھلوں سے لدے ہوئے درخت خالی ہو جاتے ہیں، غریب ایک ایک چیز کو ترستا ہے، وہاں تو غریب کا بچہ ایک چھوٹے سے بیر کے لیے بھی ترس رہا ہے۔ یہ ہے كَذٰلِكَ الْعَذَابُ (68:33)۔ وہ جو انہوں نے کہا تھا کہ ہم محروم ہو گئے، وہ صرف ٹڈی دَل ہی محروم نہیں کرتی، انسانوں کے جو ٹڈی دَل ہیں وہ تو بیڑہ غرق کر کے رکھ دیتے ہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کسی کے نصیب میں کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جو غلط نظام ہے وہ خدا کا عذاب ہے۔ مثال یہ بتائی ہے کہ سب کچھ ہوتے سوتے بھی یہ کیفیت ہو کہ اس قوم کے اندر محتاجی اور مسکینی گھر کر گئی ہو، ہر سُو محرومیت ہو۔ قرآن نے اسے محروم کہا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (68:33) اے کاش! غلط نظام والے اس بات کو سمجھ سکتے جو ہم نے کہا ہے کہ بھرے ہوئے کھلیان خالی ہو جاتے ہیں اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت ٹنڈ منڈ رہ جاتے ہیں۔ اگر نظام غلط ہو تو لینے والے لے جاتے ہیں اور جو سال بھر، دن رات محنت کر کے، گاڑھے پسینے کی کمائی سے، یہ پیدا کرتے ہیں، وہ محروم رہتے ہیں: كَذٰلِكَ الْعَذَابُ (68:33) یہ ہے وہ عذاب۔ کیا بات ہے!

قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کا نتیجہ: نعمتوں کی بارش

اس کے برعکس قرآنِ کریم نے ایک دوسرے گروہ کی بات کی ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (68:34) جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے والے ہیں، جو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے والے ہیں، ان کے لیے نعمتوں اور خوشحالیوں کے باغات ہیں۔ وہ تو ایک باغ ہے، یہاں جنّت کہا ہے یعنی ان کے لیے بہت سے باغات ہوتے ہیں۔ پہلے باغ کی مثال دی تھی، اب قرآن یہاں بھی باغ ہی کا لفظ لایا ہے۔ کہا ہے کہ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (68:34) ان سے کہو کہ انہیں ایسی جنتی زندگی نصیب ہو گی جس میں ہر قسم کی آسائشیں ہوں گی۔ ذرا سوچو کہ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ (68:35) کیا ایسا ہو سکے گا کہ ہم مسلمین کو مجرموں جیسا بنا دیں؟ اللہ اکبر! قرآن نے امتیازی خط کھینچ دیا: مسلمان اور مجرم برابر نہیں ہو سکتے۔ جو مجرم ہے، وہ مسلمان نہیں ہوتا، اور جو قوم المجرمین ہے وہ قوم المسلمین نہیں ہو سکتی۔ یہ بات قرآن کہہ رہا ہے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم مسلموں کو اور مجرموں کو برابر، یکساں، ایک جیسا، کر دیں؟ یعنی یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن نے تو ایسی واضح مثال دی ہے کہ جس میں کسی ذہنی عقیدے کے لانے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس نے دوسرے مقام پہ یہ کہا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار مومنین پر غالب آ جائیں۔ اب جسے ہم "مومنین یا مسلمان" کہتے ہیں، ان کے پیچھے تو اب ساری دنیا کی کفار قومیں لگی ہوئی ہیں، وہ اقوام ان پر غالب ہیں اور یہ مغلوب ہیں۔

مسلمین کی پہچان

قرآن کہتا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا' خدا کہتا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ہم مسلمین کو مجرموں جیسا بنا دیں۔ تو سوال یہ ہے کہ پھر یہ کیا چیز ہوگی؟ یہی بات ہوگی کہ جن پر یہ غالب ہیں وہ مومنین ہیں ہی نہیں۔ پہچان یہ ہوگی کہ جماعتِ مومنین پر کفار غالب نہیں آ سکیں گے' پہچان یہ ہوگی کہ مسلمین مجرمین جیسے نہیں ہو سکیں گے۔ قرآن کیا بات کہہ رہا ہے؟ یہ کہ **مَا لَكُمْ** (68:36) اوتمہیں کیا ہو گیا ہے؟ **كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ** (68:36) جو تم اس قسم کے فیصلے کرتے ہو؟ تم کس طرح اپنے فیصلے الٹے سلٹے کرتے رہتے ہو؟ یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ معاشرے کے اندر جرائم بھی عام ہو رہے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ یہ کچھ وقتی سی بات ہے' یہ کچھ بات نہیں ہے' مسلمان ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے' اسلامی ہونے میں کوئی کسی قسم کا فرق نہیں ہے مگر قرآن کہتا ہے کہ **مَا لَكُمْ** (68:36) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ **كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ** جو تم اس قسم کے فیصلے کرتے ہو؟ او کیا فیصلے تم خود اپنے ذہن سے کرتے ہو؟ فیصلہ تو یہ ہے جو ہم نے کیا ہے۔ **اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ** (68:37) کیا قرآن کے سوا کوئی اور کتاب تمہارے پاس ہے جس میں یہ فیصلے لکھے ہوئے ہیں؟

عزیزانِ من! یہ کہتے ہیں کہ صاحب! وہ ایک کتاب نہیں' ان کتابوں کا انبار لگا ہوا ہے جن میں یہی فیصلے لکھے ہوئے ہیں کہ یہ دنیا کفار کی ہے' مجرموں کی ہے۔ مومن' اس دنیا کے اندر' ایسے رہے گا کہ جس طرح قیدی جیل خانے میں رہتا ہے۔ ایسی کتابیں ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ یہ غربت اور مسکینی فخر ہے' ذلت اور محتاجی خدا کے بندوں کی نشانیاں ہیں۔ یہ کتابیں ہیں جن میں یہ لکھا ہوا ہے کہ **اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ** (68:38) کتابیں تمہارے پاس ہیں کہ جو وہ کچھ بتاتی ہیں جو تم چاہتے ہو۔ تم تو اپنی ہی لکھی ہوئی کتابوں کا درس دیتے ہو۔

اپنی ہی لکھی ہوئی کتابوں کا درس دیتے ہو

عزیزانِ من! جس کے سامنے قرآن ہو' وہ اور کہیں جا ہی نہیں سکتا۔ مگر تمہارے ہاں وہ کتابیں ہیں تم **تَدْرُسُوْنَ** (68:37) انہی کی تدریس کرتے ہو' انہی کو اپنے دارالعلوموں میں پڑھاتے ہو' انہی کے مطابق وعظیں کہتے ہو' انہی کے مطابق قوانین بناتے ہیں۔ یہ کتابیں تمہارے پاس ہیں اس لیے تم انہیں سینے سے لگائے ہوئے ہو کہ **اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ** (68:38) جو تم چاہتے ہو' وہ کتاب وہی کچھ تمہیں دیدیتی ہے کہ ٹھیک ہے جی! آپ کی مرضی کے مطابق شرعی قانون ہو جائے گا۔ وہ کتابیں یہ دیتی ہیں۔ **اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ** (68:39) یا تم نے ہم سے کوئی اس قسم کا وعدہ لے رکھا ہے کہ قیامت تک کے لیے تم ہی ہماری محبوب امت رہو گے۔ ہے کوئی اس قسم کا پیمان جو تم نے ہم سے لے رکھا ہے کہ تم جو جی میں آئے کرتے رہو' کیا کوئی اس قسم کا وعدہ لے رکھا ہے؟ وہ وعدہ کہ **اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ** (68:39) جو کچھ تمہارا جی چاہے تم فیصلے کرو' جس طرح سے جی چاہے قانون بناؤ'

فتوے دو، وہ سب کے سب خداوندی قرار پا جائیں گے۔ کیا یہ ہے کہیں؟ کہ فیصلے تو تم اپنی طرف سے کرو اور کہو یہ کہ نہیں، ہم نے خدا سے وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ خدائی فیصلے قرار پا جائیں گے، وہ اسلامی قوانین قرار پا جائیں گے۔ یہ لَمَا تَحْكُمُوْنَ (68:39) بڑی غور طلب چیزیں ہوتی ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن کا لفظ جو اس نے کہا ہے وہ یہ ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (6:57) حکم صرف خدا کا ہے۔

اپنے فیصلے خدا کی طرف منسوب کرنا: یہی کفر ہے

قرآن نے کہا ہے کہ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) جو خدا کی کتاب کے مطابق حکم نہیں کرتا وہ کافر ہے۔ کہا کہ پھر تم نے ہم سے کوئی ایسا عہد لے رکھا ہے، تمہارا، ہمارے ساتھ آپس میں کوئی Agreement (معاہدہ) ہے کہ تم جو فیصلے کرو، وہ ہمارے فیصلے سمجھے جائیں۔ یہاں وہی تَحْكُمُوْنَ (68:39) حکم کا لفظ ہے، یہ فیصلوں کا ہے، حکومت کا ہے، قانون سازی کا ہے۔ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ (68:40) اے رسول! ان سے پوچھو، ان سے کہو کہ وہ اپنا بڑا لاؤ جو چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر یہ کہے کہ میں نے خدا سے اس قسم کا عہد لے رکھا ہے اور اس کے پورا کرنے کا میں ذمہ دار ہوں۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ (68:41) یا اس معاملہ میں ان کے کوئی اور شریک ہیں۔ یہ خود نہیں ہیں، ان کے ساتھ کچھ شریک ہیں، جو آ کے کہیں کہ ہاں صاحب! شریعت کا یہی فیصلہ ہے۔ قرآن نے یہاں شرکا کہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (68:41) ان سے کہو کہ پھر اپنے ان شرکا کو لاؤ، اگر تم سچے ہو، تا کہ وہ بتائیں کہ کون سی وہ کتاب ہے جس کے اندر ہم نے یہ لکھ کر دیا ہوا ہے، کونسا وہ عہد و پیمان ہے جو انہوں نے ہم سے کیا ہوا ہے۔ اگر تمہیں خود معلوم نہیں ہے تو اپنے ساتھی، شرکا، کو لے آؤ، Advisors (مشیر) بھی اپنے ساتھ لے آؤ، ان سے کہو کہ وہ آ کر بتا دیں۔

سیکولرازم اور اسلامی حکومت میں فرق

عزیزانِ من! اسلامی نظام اور غیر اسلامی نظام کا، ایک ہی چیز، ایک ہی لفظ فیصلہ کر دیتا ہے: جہاں بھی یحکم یا تحکم، فیصلہ کرنا، حکم دینا، حکومت کرنا، کتاب اللہ کے مطابق ہے وہ اسلامی ہے، خداوندی ہے اور جہاں تحکمون ہے کہ تم جو خود فیصلے کرو، وہ غیر اسلامی ہے، اسے سیکولرازم کہتے ہیں۔ تم سے مراد مخاطب افراد ہی نہیں ہوتے، انسان ہوتے ہیں۔ جہاں یحکم یا تحکم ہے۔ جو خدا کے فیصلے ہیں وہ اسلامی نظام ہے اور انسانوں کے فیصلے، آج کے انسانوں کے فیصلے، یا ہزار سال پہلے کے انسانوں کے فیصلے، وہ سارے تحکمون میں آئیں گے جو تم فیصلے کرتے ہو۔ اسلامی نظام یا اسلامی شریعت یا اسلامی حکومت کہتے ہی اس کو ہیں کہ جس میں فیصلے انسان نہیں کرتے، جس میں فیصلے خدا کی کتاب کرتی ہے۔ تحکمون شرک ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (6:57) حکم صرف خدا کا ہے اور لَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) وہ اپنے اس حقِ حکومت میں، فیصلہ کرنے کے حق میں، کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہاں کس

قدرواضح الفاظ میں کہا کہ کیا کچھ کتابیں ایسی ہیں: فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ o اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ (68:37-38) جن کو تم پڑھتے پڑھاتے رہے ہو۔ جن میں یہ لکھا ہے کہ تم جو روش چاہو اختیار کرلو' نتائج تمہارے حسب پسند نکل آئیں گے؟ اس کے برعکس ان میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں۔ سارے قوانینِ فقہ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں' وہ آج کے انسانوں کے ہوں یا ہزار سال پہلے کے انسانوں کے ہوں' وہ کہتا ہے کہ کیا یہ عہد لے رکھا ہے کہ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ (68:39) یہ ہے کہ تم فیصلے کرو اور وہ خدائی فیصلے قرار پا جائیں۔ ہاں یہ کہا کہ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ❶ (68:40) اے رسول! ان سے پوچھو کہ لاؤ اس بڑے کو جو یہ زعم کرتا ہے کہ ہمارے فیصلے خدا کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ (68:41) یا اس معاملے میں اُن کے کوئی اور شریک ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان سے کہو کہ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (68:41) اگر وہ سچے ہیں تو اپنے شرکاء کو بھی سامنے لاؤ اور اس طرح اپنے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت دو اور پھر آگے ہے کہ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ❷ (68:42)

عزیزانِ من! آگے بات چلے گی کہ جب غلط نظام کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آئیں گے اس وقت یہ بات ان کے بس میں نہیں رہے گی کہ کسی طرح سے اس تباہی سے بچ جائیں۔ جیسا کہ یہ بات بار بار آ چکی ہے کہ غلط روش کے تباہ کن نتائج فوری نہیں سامنے آیا کرتے۔ قرآن اس کو مہلت کا وقفہ کہا کرتا ہے۔ اس مہلت کے وقفے کے بعد جب وہ غلط روش کے تباہ کن نتائج کا پھل پک جاتا ہے تو اس وقت عذاب اس شکل میں سامنے آتا ہے کہ کھیتیاں اجڑ جاتی ہیں' باغ ویران ہو جاتے ہیں' مال تباہ ہو جاتے ہیں' جتھے ختم ہو جاتے ہیں' اور خدا کا قانون غالب آتا ہے۔ اُس وقت مسلم اور مجرم ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔

عزیزانِ من! سورۃ القلم کی آیت 41 تک ہم آ گئے' 42 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

---

❶ ان سے پوچھو کہ تم میں وہ کون ہے جو چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہے کہ میں نے خدا سے اس قسم کا عہد لے رکھا ہے اور اس کے پورا کرنے کا میں ذمہ دار ہوں۔

❷ (یہ سب ان کی من گھڑت باتیں ہیں۔ خدا کا قانونِ مکافات اٹل ہے۔ لہٰذا) اب وہ وقت بہت قریب آ رہا ہے جب ان کی اس غلط روش کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آ جائیں گے۔ بڑے گھمسان کا رن پڑے گا۔ چاروں طرف سے شدت کی سختیاں امنڈ کر آ جائیں گی۔ اس وقت ان میں سے بعض انہیں مشورہ دیں گے کہ وہ قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جائیں لیکن اس کا وقت گزر چکا ہوگا۔ اُس وقت یہ بات اُن کے بس کی نہیں رہے گی کہ کسی طرح اِس تباہی سے بچ جائیں۔ (ظہورِ نتائج کے وقت مہلت کا عرصہ ختم ہو جاتا ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ساتواں باب: سورة القلم (آیات 42 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج نومبر 1983ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القلم کی آیت 42 سے ہو رہا ہے:(68:42)۔
سابقہ آیات میں حق و باطل کی کشمکش کا سلسلہ چلا آ رہا تھا اور ایسا نظر آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں مخالفین کے ساتھ حضور ﷺ کی کشمکش اپنی آخری منازل میں ہے' نتائج کھل کر سامنے آ رہے ہیں اور وہ لوگ جو اتنے عرصے تک اپنی سرکشی' تمرد اور استبداد کے عالم میں مخالفت کر رہے تھے' اب انہیں سخت شکست ہوئی ہے۔ یہ ان کے لیے بڑی ناکامیاں ہیں اور جماعتِ مومنین جس نے اتنا عرصہ اس قدر مشقتوں' مصیبتوں اور صعوبتوں میں گزارا ہے' وہ اپنے حسنِ عمل کے خوشگوار نتائج سے مستفید ہو رہی ہے۔ پچھلی آیتوں میں یہ کچھ چلا آ رہا تھا اور جیسا میں نے عرض کیا تھا' یہ جو آخری دو پارے ہیں' ان میں بیشتر اسی کشمکش اور اس کے نتائج کا ذکر زیادہ نمایاں حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وہ ظہورِ نتائج کا وقت ہے۔ میں پھر دو لفظوں کو دہرا دوں کہ قرآنِ کریم نے یہ سارا ذکر کرنے کے بعد' جسے کہا جاتا ہے' کہ جہنم کا ذکر کیا ہے۔ کہا کہ **كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ** (68:33) یہ عذاب' یہ تباہی' اس دنیا کی ہے۔ آخرت کا عذاب اس سے کہیں زیادہ بڑا ہوگا۔

اس دنیا کی جہنم کا عذاب

عزیزانِ من! وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ ہر بات کے متعلق یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ قیامت میں ہی جا کے سامنے آئے گی۔ قرآن جو ان کے اوپر مسلط اس قسم کی تباہیوں کا ذکر کر رہا ہے یہ اس دنیا کا عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ وہ آخرت میں جا کے ہوگا۔ یہ عذاب' اسی دنیا میں' قوموں کی شکست کا' تباہی کا' ذلت کا' خواری کا محتاجی کا' محرومی کا' عذاب ہے۔ یہ اس دنیا میں غلط نظام کے نتیجے میں آتا ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر آرہا ہے۔

ایک محاورے کی تشریح

عزیزانِ من! اسی تسلسل میں اب اگلی آیت ہے: **يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ** (68:42) یہاں دو لفظ آئے ہیں: **يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ** (68:42) ''کشف ساق'' کا لفظی ترجمہ یہ ہے: پنڈلی کو ننگا کر دینا' ظاہر کر دینا۔ عربوں کے ہاں یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا تھا جب کہیں مقابلہ بڑی کشمکش کی شکل میں بہت زیادہ شدت اختیار کر جائے تو اس طرح یہ گھمسان کا رن پڑنا ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں ایک محاورہ بولا جاتا ہے وہ بھی دراصل ایسی سختی کے عالم میں ہی بولا جاتا ہے۔ اصل میں نظریوں آتا ہے کہ یہ محاورہ ان کے ہاں اس طرح ہوا تھا کہ عربوں کا لباس تو ہمیں پتہ ہے کہ ٹخنوں تک ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے۔ یہ تہمد سے بھی زیادہ اوپر سے نیچے تک ہوتا ہے اور اس قسم کے معرکے میں جب شدت سے مقابلہ ہو اور بھاگنا پڑے تو وہ ظاہر ہے کہ انسان اس کو اٹھا کے ہی بھاگ سکتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی جو تہمد باندھنے والے لوگ ہوتے ہیں جب ایسے وقت میں انہیں بھی بھاگنا پڑے تو وہ تہمد کو اٹھاتے ہیں حتیٰ کہ شلواروں کو بھی اٹھاتے ہیں۔ ''او ساڈے پنجابی وچ اونوں ٹنگ لینا کیندے سن کہ ذرا ٹنگ لو اونوں۔''[1] اس طرح کرنے سے یہ پنڈلی کا ننگا ہونا ہے۔ اُن کے ہاں کا تو لباس ہی ایسا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ ہی نہیں سکتے تھے جب تک کہ اسے اٹھا نہ لیں۔ اس کے اٹھانے سے بہر حال پنڈلی ننگی ہو جاتی تھی تو اس سے نظر یہ آتا ہے کہ یہ ان کے ہاں ایک محاورہ تھا کہ جب کہیں شدت کی سختی ہو' معرکہ ہو' پریشانی ہو' کشمکش ہو' تو وہ اس میں یہ کہا کرتے تھے کہ ''وہاں تو پنڈلیاں بھی ننگی ہو گئیں۔'' تو قرآن نے اس محاورے کی رو سے بتایا ہے کہ یہ جو معرکہ آرائی کی شدت سی تھی' اس کا نقشہ ان دو لفظوں میں کھینچا ہے لیکن ہمارے ہاں تو آپ ترجمے میں بھی یہ دیکھیں گے اور پھر تفسیروں میں بھی یہ ہوگا کہ جب قیامت ہوگی تو خدا اپنی پنڈلی کو ننگا کرے گا۔

---

[1] ہمارے ہاں پنجابی میں اسے اوپر کر لینا کہتے ہیں کہ ''اسے ذرا اوپر کر لو۔''

خدا اپنی پنڈلی کو ننگا کرے گا: بخاری کی روایت

یہ لوگ جو یہاں کے متکبر اور سرکش تھے' وہاں قیامت میں بھی اسی طرح سرکش' اسی طرح سر اٹھائے ہوئے' تکبر اور فخر کے ساتھ خدا کے سامنے جائیں گے' کسی طرح سے بھی نہیں جھکیں گے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں ہے۔ یہ روایت موجود ہے کہ پھر خدا اپنی پنڈلی کو ننگا کرے گا اور اس کا اثر یہ ہوگا کہ یہ سب سجدے میں گر جائیں گے۔ اب' عزیزانِ من! اس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ خدا اپنی پنڈلی کو ننگا کرے گا۔ دین کی ساری عمارت خدا کے صحیح تصور پر استوار ہوتی ہے' تو اس میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کے ہاں خدا کا تصور کس قسم کا ہے' یہی نہیں بلکہ اس سے آگے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہاں کس قسم کا مذہب ہے۔

خدا کے صحیح تصور کی اہمیت

ایک مغربی مفکر ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کا نام کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ آپ مجھے صرف یہ بتا دیجیے کہ اس قوم نے اپنی پرستش کے لیے کس قسم کا معبود تجویز کر رکھا تھا تو میں اس قوم کی تہذیب و تمدن و ثقافت کے متعلق سب کچھ بتا دونگا۔ گویا خدا کا تصور اتنی اہم چیز ہے۔ ہمیں تو ان چیزوں کا پتہ ہی نہیں ہے۔ ہم نے نہ اس تصور کے متعلق کبھی تحقیق کی' نہ کبھی یہ معلوم کیا کہ یہ بات کیا ہے۔ ہم تو خدا پر ایمان بھی نہیں لائے ہوئے' مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے' مسلمان چلے جا رہے ہیں' وہی جو مسلمانوں کی چند رسومات ہیں بجا لاتے ہوئے آخر تجہیز و تکفین کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ پیدا ہوئے تو کان میں اذان دی' مر گئے تو جنازہ پڑھ لیا۔ عزیزانِ من! خدا کا تصور دین' مذہب' تہذیب' تمدن' ثقافت' اور پھر سیاست کی بنیاد ہے۔ یہ جو خدا کا تصور ہے کہ قیامت میں یہ لوگ کسی اور طریق سے نہیں جھکیں گے تو خدا اپنی پنڈلی ننگی کر دے گا تو اس سے ہمارے ہاں کس قسم کا خدا سامنے آتا ہے: یہی کہ خدا ہے' اس کی پنڈلی ہے اور پھر وہ کپڑا اس سے اٹھا کے ننگی کر دے گا۔

صحیحین کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی دائرۂ اسلام سے خارج کر دے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن کو ان احادیث کی رو سے سمجھنا چاہیے تو اس میں یہ لکھا ہے اور صحاح ستہ' چھ صحیح کتابیں ہیں' ان میں سے صحیحین بخاری اور مسلم ہیں' ان کا عقیدہ یہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ اگر آپ اسے نہ مانیں کہ صاحب! خدا اپنی پنڈلی ننگی کر دے گا' تو اس عقیدے کی رو سے آپ مسلمان ہی نہیں رہتے۔ انہی احادیث و روایات پہ آپکی تفاسیر مبنی ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہیں آپ مستند تفاسیر کہتے ہیں۔ انہیں اٹھا کے دیکھیے اِن میں آپ کو یہی لکھا ملے گا کہ خدا اپنی پنڈلی ننگی کرے گا۔

عزیزانِ من! یہاں کہا یہ ہے کہ اسی زبان کے محاورے کے مطابق اس روز ان کی پریشانی' ان کی مصیبتوں کی حالت شدت اختیار

کر جائے گی، انتہا تک پہنچ جائے گی۔ اس وقت مشورہ دینے والے مشورہ دیں گے کہ اب بھی جھک جاؤ لیکن وہ اپنی ضد میں ایسے اڑے ہوئے ہونگے کہ وہاں بھی جھکنا نہیں چاہیں گے۔ یہ عجیب قسم کی قوم تھی۔ ہمیں تو اس تاریخ کا بھی علم نہیں ہے کہ یہ جو حضور ﷺ کو کشمکش تھی، جو تصادمات تھے، جو مزاحمت ہو رہی تھی وہ کونسے لوگ تھے، وہ کس قسم کے لوگ تھے جن کے ساتھ ان کا واسطہ پڑا ہوا تھا۔

جنگ بدر میں ابوجہل کا سر

نہ جھکنے والے لوگوں کی کیفیت یہ تھی کہ بدر کے میدان میں دو لڑکے ❶ چھاتی پہ بیٹھ کر ابوجہل کا سر کاٹنے لگے تو اس نے کہا کہ یہ گردن ذرا نیچے سے، یہاں سے، کاٹنا۔ انہوں نے کہا کہ یہاں تو یہ ہڈیاں ہیں، اِن میں تو بڑی تکلیف ہوگی، تم یہ کیوں کہتے ہو؟ عزیزانِ من! ان کے ہاں یہ رواج تھا کہ میدانِ جنگ میں جو مرنے والے ہوتے تھے، ان کے سروں کو نیزے پہ ٹانگ کر، ان کا جلوس نکالا کرتے تھے۔ اس نے کہا کہ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جب وہ جلوس نکلے گا تو میرا سر باقیوں سے اتنا اونچا نظر آئے گا۔ یہ تھی وہ قوم جس کے ساتھ انہیں پالا پڑا تھا کہ اُس وقت، خواہ میری ہڈیاں ہی کیوں نہ کٹ جائیں اور اتنی تکلیف ہی کیوں نہ ہو جائے، مرنے کے بعد اس جلوس میں میرا سر ذرا اونچا رہے۔ یہ سر اونچا رکھنے کی ذہنیت تو ان کے ہاں یہاں تک جاتی تھی۔ یہاں یہ کہا ہے کہ یہ کیفیت ہوگی جیسی وہ کشفِ ساق کی ہوتی ہے: میدانِ جنگ سے بھاگنے کی۔ مصیبتوں کا یہ عالم تھا اور اس پہ بھی اگر کوئی ان سے یہ کہتا تھا کہ اب بھی جھک جاؤ تو وہ کہتے تھے کہ نہیں بھئی! وہ بات ٹھیک ہے کہ آخری وقت میں ''کیا خاک مسلماں ہونگے۔'' ❷ لیکن یہ ضد تھی، تکبر تھا، استکبار تھا۔ بالکل وہی جیسا کہ فرعون ❸ کے معاملے میں قرآن نے کہا ہے کہ وہ لوگ دل سے مانتے تھے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن وہ جو فرعونیت تھی، نخوت اور تکبر تھا، وہ سر نہیں جھکنے دیتا تھا۔ اور دوسری جگہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہوں نے پہلی دفعہ ہی، First Impression میں، یہ بات کہی کہ ہم نہیں مانتے تو پھر اس کے بعد ساری عمر یہی کہتے رہیں گے ''ہم نہیں مانتے۔'' اس لیے نہیں کہ اس کے بعد وہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی، مان تو جائیں گے کہ ٹھیک ہے لیکن وہ جو ایک دفعہ بات کہہ دی تھی اب اس بات سے ہٹنے میں اپنی بڑی ہزیمت محسوس کریں گے، ندامت محسوس کریں گے۔ یہ جو False Prestige کا، جھوٹی عزت کا، جسے قرآن عزت الاثم کہتا ہے اور یہ لوگ اسی بیماری کا شکار ہوتے ہیں، اگر یہ ذہنیت نہ بدلی جائے تو اگر وہ حق وصداقت کو ذہنی طور پہ سمجھ بھی لیں کہ یہ صحیح ہے کہ یہ جو تکبر برتری کا احساس ہوتا ہے یہ احساس جھکنے نہیں دیتا، تو کہا کہ وہاں کیفیت یہ ہے۔ وہاں معرکہ آرائی میں کیفیت کشفِ ساق تک کی آجائے گی۔

---

❶ یہ انصار کے دو نوجوان بھائی، معوذ اور معاذ تھے۔ (حوالہ پرویزؒ: معراجِ انسانیت، ناشر ادارہ طلوعِ اسلام کراچی، ۱۹۴۹ء، ص۔ 524

❷ عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن ... آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

❸ فرعون کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں۔ یہ قدیم شاہانِ مصر کا لقب تھا۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرِ نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن: سورۃ بنی اسرائیل، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004، ص۔ 109 (فٹ نوٹ نمبر 1)

کوئی مشورہ بھی دے گا کہ اب بھی یہ بات تسلیم کر لی جائے لیکن اس پر بھی وہ نہیں مانیں گے' جھکیں گے نہیں' وہ اس وقت بھی تباہی سے بچنے کا سامان نہیں کریں گے۔ یہ ہے **فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ o خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ** (68:42-43) کیفیت یہ ہے کہ شکست وندامت سے' آنکھیں جھکی ہوئی ہیں۔ جیسے یہ بھی محاورہ ہے جسے روسیاہی کہتے ہیں' جسے ندامت کی' شرم کی' چہرے پہ کالک ملی ہوئی کہتے ہیں: اس قدر ذلیل وخوار ہیں۔ **وَ قَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ** (68:43) اُس زمانے میں جب ابھی انہوں نے یہ شکست نہیں کھائی تھی' یہ اس زمانے میں اچھے بھلے تھے۔ مہلت کے عرصے کے دوران ان کو دعوت دی جاتی تھی کہ صداقت کی طرف آ جاؤ' اسلام کی طرف آ جاؤ' اس وقت یہ نہیں مانتے تھے۔ اب بھی اسی نخوت کے جذبے کے ماتحت یہ کہتے ہیں کہ اب کیا ماننا ہے صاحب!

عرب قوم کی ذہنیت

عزیزانِ من! قومِ عرب میں جذبہ اصل میں تفاخر نسب کا جذبہ تھا۔ ان کے ہاں یہ جذبہ اس قدر ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا کہ ہماری تاریخ کے اندر درج ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے چچا ابو طالب تھے۔ مجھے فرقہ دارانہ بحث کرنے کی عادت نہیں ہے۔ میں کہہ یہ رہا ہوں' سنیوں کے ہاں کی تاریخ میں تو یہی ہے کہ وہ آپ کے چچا تھے۔ تعلقات ایسے تھے تو آخری وقت میں آپ ﷺ نے ان چچا سے کہا کہ ''میری زندگی تو آپ کے سامنے گزری ہے' آپ کے ہاتھوں میری پرورش ہوئی ہے' آپ جانتے بھی ہیں' میری جو دعوت ہے' اُسے بھی آپ جانتے ہیں۔ آخری وقت ہے اب تو اسے تسلیم کر لیجیے۔'' انہوں نے کہا کہ ''بیٹا! یہ ٹھیک ہے کہ میں جانتا ہوں کہ یہ بات سچی ہے لیکن اگر اس وقت میں نے تسلیم کیا' قوم یہ کہے گی کہ موت سے ڈر کر ایمان قبول کر لیا' اس لیے جانے دو۔'' یہ چیز عین اس قوم کی ذہنیت کی ترجمانی کرتی ہے' اور آج بھی جو آپ کے ہاں بڑے بڑے پھنے خاں ہوتے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ دل سے وہ مانتے ہیں کہ ٹھیک ہے لیکن جھکنا نہیں چاہتے۔ اصل ذہنیت یہی ہے کہ جب یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ وہاں صداقت موجود ہے تو پھر یہ جھوٹا فخر اور تکبر اس طرف نہیں آنے دیتا حالانکہ اس جھوٹے فخر وتکبر سے الگ ہٹ کر' اس حق وصداقت کے سامنے جھک جانا' ہی عین بزرگی اور عظمت ہے۔ یہ جو ان کے ہاں نسلی اور نسبی تفاخر کی ابتداء ہوتی تھی' یہ ان کے ہاں زندگی کے ہر شعبے میں سچ کے ماننے کے راستے میں آڑے آتی تھی۔ آج بھی لوگوں کی وہی کیفیت ہوتی ہے۔

انہیں میرے حوالے کر دیجیے

رسول اللہ ﷺ سے یہ کہا گیا کہ آپ ﷺ ان سے نہ گھبرائیے' آپ ﷺ اپنے پروگرام پر اسی طرح استقامت سے کارفرما رہیے' باقی رہے یہ تو ان کے لیے یہ ہے کہ: **فَذَرْنِیْ وَ مَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ** (68:44) جو لوگ اس حق وصداقت کی تکذیب کرتے ہیں' انہیں میرے حوالے کر دو۔ اف میرے اللہ! عزیزانِ من! آپ سوچ لیجیے کہ جنہیں خدا کے حوالے کر دیا جائے تو پھر ان کا

کیا انجام ہوتا ہے۔ ''جنوں کیندے نیں: میں آپے سج لاں گا ایناں نال۔'' ❶ وہ میں خود ہی انہیں سمجھ لوں گا۔ یہ محاورہ ہے ''وہ سج لین گے جیہڑی گل ہے۔'' ❷ ''سمجھ لینے میں'' وہ بات نہیں بنتی۔ کیوں بیٹیو! ٹھیک ہے!! اور بات کہنے کا کیا انداز ہے کہ آپؐ اپنے پروگرام پہ چلے جایئے۔ ان کے متعلق Worry (فکر و تشویش) نہ کیجیے۔ انہیں میرے حوالے کر دیجیے۔ آپ سوچ لیجیے کہ جس مجرم کو خدا کے حوالے کر دیا جائے کہ آپ اس سے نمٹ لیجیے تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا۔ کیا انداز ہے قرآن کے بات کرنے کا: انہیں میرے حوالے کر دیجیے صاحب! کیا کرونگا میں ان کے ساتھ؟ جھپٹ کر ٹینٹوا نہیں دبا دونگا۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ قانونِ مکافات ہے جو بار بار ہمارے سامنے آتا ہے کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ہوتا ہے' قوموں کی روش کا نتیجہ اور غلط نظام کا نتیجہ سامنے آ کر رہتا ہے۔ لیکن یہ پہلے دن ہی سامنے نہیں آ جاتا' یہ آہستہ آہستہ' شروع میں' اس کے نتائج کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں' غلط نظام کے چھوٹے چھوٹے جھٹکے بھی آتے ہیں' وہ شیک (Shake) کرتا ہے۔ ممکن ہے یہ اب بھی سمجھ جائیں' اب بھی اصلاح کر لیں مگر وہ بتدریج بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ چیز فوری طور پر نہیں ہوتی۔ اسے مہلت کا وقفہ کہا جاتا ہے۔ اس دوران میں اِدھر سے نبی اکرم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ تاکید ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ معاملات کا قطع تعلق بھی کر لو مگر قرآن کا پیغام پہنچاتے چلے جاؤ تاکہ یہ بات نہ ہو کہ کوئی اس لیے ہلاک ہو جائے کہ اس تک قرآن کا پیغام نہیں پہنچا تھا۔

عزیزانِ من! یہ جو مہلت کا وقفہ ہوتا ہے اس میں آہستہ آہستہ یہ قوم تباہی کی طرف جا رہی ہوتی ہے۔ قرآن کا پیغام پہنچانے والوں کی ذمہ داری ہے کہ اس زمانے میں بھی ان تک پیغام پہنچاتے رہیں۔ ممکن ہے سعید روحیں ایسی ہوں جو اس پہ آ جائیں اور تباہی سے بچ جائیں۔ اس میں خدا کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہے' نہ ہی اس حق و صداقت والی جماعت کا فائدہ ہے کہ اس سے انہیں ووٹس زیادہ آ جائیں گے۔ جذبہ صرف یہ ہے کہ یہ تباہی سے بچ جائیں۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس پر بھی اِن سے معاشرتی قطع تعلق تو کر لو کیونکہ یہ ہیں ہی ایسے' لیکن اس کے باوجود قرآن کا پیغام پہنچاتے جاؤ تاکہ کوئی شخص اس لیے ہلاک نہ ہو جائے کہ اس کے کان تک حق کی آواز نہیں پہنچی تھی۔ گویا مہلت کے وقفہ میں یہی مقصد ہوتا ہے: ممکن ہے یہ لوگ اب بھی سمجھ جائیں لیکن وہ نہیں سنتے' نہیں مانتے' ان کی ضد' ان کی نخوت' انکا تکبر اس پہ آنے نہیں دیتا۔ وہ اپنی غلط روش میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور پھر اس فریبِ نفس میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ''ہم اتنا کچھ کرتے ہیں' یہ کہتے ہیں تباہ ہو جائے گا' ہمارا تو کچھ بگڑ ہی نہیں رہا۔'' اس میں بھی انکو مغالطہ لگ جاتا ہے۔

---

❶ یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ پھر میں ان سے خود ہی نپٹ لوں گا۔

❷ وہ خود ہی نپٹ لیں گے۔ بات یہی ہے بس!

درجہ بدرجہ تباہی کی طرف

یہ جو آہستہ آہستہ آگے بڑھتے چلے جانا ہے اس کے لیے قرآن کی لفظی ندرت کاریوں کو بھی یہاں دیکھیے۔ اس کے لیے ایک لفظ ہے۔ یہاں کہا تو یہ ہے کہ ان کو میرے حوالے کردو' میں ان سے نمٹ لوں گا لیکن میں نے کہا ہے کہ اس کی طرف بتدریج آنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ ایک لفظ ہے۔ اسے بھی آپ جلدی سے نہیں بول سکتے۔ اس میں بھی درجہ بدرجہ قدم بقدم آگے آنا پڑتا ہے۔ یہ لفظ ہے: **سَنَسْتَدْرِجُهُمْ** (68:44)۔ یہ ہے قرآن کا اسلوبِ بیان۔ یعنی یہ لفظ ایسا نہیں ہے کہ آپ یوں جھٹکے سے آگے بڑھ جائیں۔ آگے بڑھ ہی نہیں سکتے' اس کا ایک ایک حرف آپ کو بولنا پڑتا ہے۔ یہ لفظ درجہ بدرجہ بولنا پڑتا ہے تو پھر اس کے معنی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لفظ کو بولتے ہوئے بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ درجہ بدرجہ کی بات ہے۔

عزیزانِ من! اسے پھر سن لیجیے۔ کہا کہ **فَذَرْنِيْ وَ مَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ** (68:44) میرے حوالے کردو۔ **سَنَسْتَدْرِجُهُمْ** (68:44) میں انہیں بتدریج لیتا چلا آونگا۔ کہاں سے لیتا چلا آؤں گا؟ کہا کہ **مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ** (68:44) وہاں سے پھر تباہی آئے گی جس کو یہ جانتے بھی نہیں ہیں کہ کدھر سے آیا کرتی ہے لیکن اسی طرح درجہ بدرجہ آئے گی' بتدریج آئے گی' یکلخت نہیں آئے گی۔ یہی ہوتا ہے کہ غلط نظام کی تباہی آخر الامر بتدریج آتی ہے۔ یہ ان چیزوں کا Cumulative Effect (مجموعی اثر) ہوتا ہے' یہ کچھ اسی دن' اسی وقت' اسی جھٹکے میں نہیں ہو جاتا۔ یہ عمل **سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ** (68:44) ہوتا ہے۔ کیا بات ہے! پھر کہا کہ **وَ اُمْلِيْ لَهُمْ** (68:45) مہلت اور رسی دراز کردو' مہلت کا وقفہ اور لمبا کردو۔ یہ نہ سمجھو کہ ہماری ناکامی ہے بلکہ یہ سمجھو کہ **اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ** (68:45) میری تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ وقفے کے وقت سے یا لمبے عرصے سے کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ کوئی بات نہیں ہے

نبی کی دعوت بلا معاوضہ

اسے قرآنِ کریم نے **اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ** (68:45)۔ کہا ہے۔ یعنی ہماری تدبیر بڑی محکم اور مضبوط ہوتی ہے۔ تم اس کی گرفت سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہ اس طرح سے جو تم سے بھاگ رہے ہیں تو **اَمْ تَسْــَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ** (68:46) کیا تو اپنی تبلیغ کا ان سے کچھ معاوضہ مانگتا ہے کہ یہ اس کو بیگار سمجھتے ہیں' جرمانہ سمجھتے ہیں' اور تم سے بھاگتے ہیں؟ عزیزانِ من! آپ کو یاد ہے کہ خاص طور پہ سورۃ ھود میں انبیاء کرام کی جو اتنی داستانیں آئی ہیں' ان میں ہر نبی کی پہلی پکار یا پہلی دعوت یا پہلے الفاظ یہ ہوتے تھے: **اُعْبُدُ اللّٰهَ** (11:50,61,84) محکومیت صرف خدا کی اختیار کرو۔ اگلے لفظ ہوتے تھے کہ میں اس کے لیے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ ہر نبی اپنی قوم سے پہلا فقرہ یہ کہتا تھا۔ تو اس سے نظر آیا کہ یہ کتنی اہم بات ہے جو کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ تمہارے لیے اتنی مشقت اٹھاتا ہے۔ انسان ذرا سا بھی ضد اور تعصب سے ہٹ کر سوچے۔ اس کے اخلاق پر تو نگاہ رکھو۔ اس کا اپنا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمارے لیے اتنی مصیبت

اٹھا رہا ہے۔ اوسوچ تو لیجیے کہ یہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اسی لیے تو پچھلی آیات میں آیا تھا کہ وہ کہتے تھے: پاگل ہو گیا ہے۔ وہ ٹھیک ہے کہ اِس سے اِسے کچھ نہیں ملتا مگر پھر بھی کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں لونگا۔ مشقتیں اٹھا رہا ہے' گھر سے کھا رہا ہے' مار پڑ رہی ہے' گالیاں پڑ رہی ہیں' اور اس میں کوئی نظر ہی نہیں آتا کہ اسے کوئی منفعت بھی ہو' اس کا کوئی فائدہ بھی ہوتا ہو۔ تو انہیں یہ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ دیوانہ بکارِ خویش ہشیار' اس قسم کے دیوانوں پہ ہزار فرزانگیاں نچھاور ہو جاتی ہیں۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا کہ اِنَّ كَيۡدِىۡ مَتِيۡنٌ o اَمۡ تَسۡـَٔـلُهُمۡ اَجۡرًا فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ o اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَيۡبُ فَهُمۡ يَكۡتُبُوۡنَ (68:45-47) نظر آ رہا ہے کہ یہ تباہی کی طرف جا رہے ہیں' تو کیا ان کے ہاں کوئی ایسی کتاب رکھی ہے جس میں غیب کا علم ہے کہ وہاں سے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ کامیابیاں' سرفرازیاں اور خوشگواریاں ہمارے ہی لیے لکھی ہوئی ہیں؟ اب دیکھیے کہ یہ جو بات بتائی کہ اگر ذرا بھی آنکھیں کھول کر دیکھیں تو نظر آ رہا ہے کہ یہ تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ غیب نہیں ہے۔ غیب تو آنکھوں سے پنہاں کا نام ہے۔ یہ شہود میں ہے' یہ چیز سامنے نظر آئے گی۔ وہ نظر آ رہی ہے کہ غلط نظام تباہی کی طرف جاتا ہے۔ غلط نظام کی کونسی بات ہے جو سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ ''غلط نظام ہے' تباہی کی طرف جا رہا ہے۔'' تو بس یہی ہے کہ غیب سے کوئی ایسی بات ان کے پاس ہو جو انہیں بتائے کہ نہیں' یہ جو کچھ کہہ رہا ہے غلط ہے' آخر الامر کامیابیاں ہمارے حصے میں آئیں گی۔ کیا ان کے پاس کوئی غیب کی کتاب ہے جو یہ بتا رہی ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن جو کچھ ان لوگوں کے متعلق کہتا تھا' اُس سب کا اطلاق آج ہمارے اوپر ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے بیماری آتی ہے' تدبیر کرنی ہے' علاج کرائیے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی پھر یہ حضرت صاحب کے پاس بھی جاتے ہیں' پوچھتے ہیں کہ حضرت صاحب! کیا یہ اچھا ہو جائے گا۔ غیب کی پوچھتے ہیں۔

عزیزانِ من! ہم نے بھی اس قسم کی کتابیں رکھی ہوئی ہیں' ہم حضرت صاحب سے ہر بات کے متعلق پوچھتے ہیں' اور خدا یہ کہتا ہے کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں' حتیٰ کہ اس کے رسول کو بھی نہیں۔ اسے بھی اتنا ہی معلوم ہوتا ہے جتنا وحی کے ذریعے اسے بتایا جاتا ہے' اس سے زائد بالکل نہیں۔ ان کے متعلق ہم رات کو جا کے پوچھتے ہیں۔ کیا انہوں نے چھپا کر کوئی کتاب رکھی ہوئی ہے؟ اُسے دیکھتے ہیں' اس میں سے فال نکالتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ فال نکالتے ہیں' استخارے کرتے ہیں' حضرت صاحب سے پوچھتے ہیں' غیب کی بات کو شہود میں لاتے ہیں' جو سامنے ہے اسے تو وہ نظر نہیں آتا' اس سے تو آنکھیں بند کرتے ہیں اور غیب کے متعلق اِدھر اُدھر سے مختلف غلط قسم کی بیان بازی کرتے رہتے ہیں۔ کہا کہ یہ سارا کچھ کر رہے ہیں' ہمیں اس کا پتہ ہے۔ تو ان کی کسی بات کی پرواہ نہ کر۔ فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ (68:48) ان تمام چیزوں کو برداشت کر' استقامت سے اپنے پروگرام کے لیے جمے رہو اور خدا کے فیصلے کا انتظار کرو' وَلَا تَكُنۡ كَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ [1] (68:48)

---

[1] اور مچھلی والے پیغمبر (یونسؑ) کی طرح جلد بازی نہ کر۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ استقامت سے جمے رہو۔ جتنے انبیاء کرام علیہم السلام ہیں ان کی داستانوں میں حضرتِ یونس علیہ السلام ایسے ہیں جہاں ان سے ایک تھوڑی سی اجتہادی غلطی ہوگئی تھی۔ معاف رکھیے، یہ معصیت نہیں تھی، خدا کے حکم کی نافرمانبرداری نہیں تھی، ایک فیصلے کی غلطی تھی۔ ہر رسول کے ضمن میں یہ نظر آتا ہے کہ وہ جس قوم میں پیدا ہوتا ہے، وہیں اپنے تعلیم کے سلسلے کے مشن کی ابتداء کرتا ہے، اسے جاری رکھتا ہے، پھر ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ اس معاشرے میں جتنی سعید روحیں ہوتی ہیں وہ ان کے ساتھ ہوجاتی ہیں، حق وصداقت قبول کرلیتی ہیں اور باقی صرف اندھی مخالفت میں ہی مصروفِ کار رہتی ہیں، چنانچہ یہ نظر آتا ہے کہ جہاں اب اس انقلاب کے بارآور ہونے کی کوئی امید نہیں ہے تو پھر اس وقت وہ نبی خدا کے حکم سے اپنی جماعت کو لے کر اُس مقام سے کسی دوسرے مقام کی طرف چلا جاتا ہے جہاں اس کے اس پروگرام کی کامیابی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اسے ہجرت کہتے ہیں۔ یہ مکان ہی چھوڑنا نہیں ہوتا، سب کچھ چھوڑنا ہوتا ہے۔ پھر یہ وہاں چلا جاتا ہے لیکن یہ جو وقت متعین کرنا ہے وہ خدا کے حکم سے ایسا ہوتا ہے کہ وہ ادھر چلا جائے۔ حضرتِ یونس علیہ السلام کے قصے میں ایک بات ہے کہ ان کی قوم جب مخالفت میں انتہا تک پہنچ گئی تو انہوں نے از خود فیصلہ کرلیا اور اس قوم کو چھوڑ کر وہ وہاں سے نکل گئے اور پھر آگے وہ قصہ ہے کہ وہ دریا میں مصیبت میں پھنس گئے، کشتی میں سے دریا میں گر گئے تھے، مچھلی نے ان کو اپنے منہ میں لے لیا تھا، نگل نہیں لیا تھا، وہ بات نہیں ہے۔ جب وہ سورۃ سامنے آئے گی تو میں عرض کرونگا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ جو کہتے تھے کہ پھر وہاں انہوں نے تسبیح پڑھی کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ [1] (21:87)۔ وہ جو سورۃ الصفت میں (37:143) میں مسبحین کا لفظ آیا ہے تو اس میں قرآن نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں: ''تیراک ہونا۔'' مُسَبِّحُوْنَ کے معنی ہوتا ہے: ''بہت تیزی سے تیراکی۔''

پورا ہاتھ پھیلا کر جو تیراکی ہوتی ہے اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ مگر آپ کے ہاں یہ تسبیح بن گئی ہے، جو دانوں پہ کرتے ہیں۔ تو وہاں یہ بات ہوئی ہے کہ اس حضرت یونس علیہ السلام نے ہمت کی، وہ مچھلی کے منہ سے نکل آئے۔ اس نے انہیں نگلا نہیں تھا۔ وہ مچھلی کے صرف منہ میں ہی تھے۔ اگر وہ اتنے تیراک نہ ہوتے تو وہ قیامت تک وہیں رہتے، مچھلی ان کو کھا جاتی۔ جب وہ مچھلی کے منہ سے نکل آئے تو پھر دریا کی ایک موج نے ان کو لبِ ساحل الٹ دیا۔ وہ خشکی کے اوپر آگئے لیکن جو حالت ہوسکتی تھی، وہ ظاہر ہے: دریا میں غرقابی کی کیفیت، مچھلی کے منہ میں، پتہ نہیں وہ کتنی بڑی وہیل جیسی مچھلی ہوگی، اس سے چھٹکارا، پھر اس کے بعد تیر کے باہر آنا، تو وہ نیم مردہ سے ہو رہے تھے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ وہاں ایک بیل تھی، وہ اس کے سائے میں آگئے۔ وہاں یہ بات کی گئی کہ انہوں نے کہا کہ میں نے وہاں سے آنے کا

---

[1] بارِ الٰہا! تیرے سوا اور کسی کو اس کا اقتدار واختیار نہیں (کہ وہ مجھے ان مشکلات سے نجات دلا سکے) میں نے جو اس فیصلے میں عجلت کی اور تیرے حکم کا انتظار نہ کیا تو میری زیادتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا فیصلہ ہی ایسا ہوتا ہے جو ہر قسم کے عیب سے پاک ہوتا ہے۔

غلط اندازہ لگایا۔ وہاں یہ کہا گیا کہ اگر تم تھوڑا سا بھی انتظار کر لیتے تو وہ پوری کی پوری قوم ایمان لے آتی۔ اس کی تو یہ کیفیت ہو گئی ہوئی تھی۔ ''اوتے جس طراں دم دِتے ہوئے چاول ہوندے نیں نا بس وہ ایک کنی باقی ہوتی ہے۔''[1] تو کہا کہ وہاں تو ان کی یہ کیفیت ہو گئی تھی اور تم جی چھوڑ بیٹھے' دلبرداشتہ ہو گئے' اور خود ہی وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ فیصلہ غلط تھا' چلو جاؤ' وہاں جا کے ان سے پروگرام بناؤ۔ یعنی یہ ایک واقعہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے یہ کہا گیا ہے کہ انبیائے سابقہ نے جو کچھ کیا' اسی طرح سے تمہیں بھی ثابت قدم رہنا ہوگا' استقامت پہ رہنا ہوگا' یہ کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے' گھبراؤ نہیں' انجامِ کار کامیابی تمہاری ہوگی لیکن اس میں حضرت یونس علیہ السلام کی ایک استثنیٰ ہے۔ حضرتِ یونس علیہ السلام سے جو قبل از وقت گھبرا کر یا دلبرداشتہ ہو کر' یا مایوس ہو کر' جو بھی جی میں آئے کہیے' وہ قبل از وقت وہاں سے چلے آئے تھے۔ کہا کہ **فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ** (68:48) استقامت سے جمے رہو۔ ہم جانتے ہیں کہ بڑی شدید مخالف اور مخاصمت ہے' خدا کے حکم کا انتظار کرو' صاحبِ حوت (حضرتِ یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جانا۔

یہ معصیت نہیں تھی

عزیزانِ من! حوت مچھلی کو کہتے ہیں۔ اسی لیے حضرتِ یونس علیہ السلام کو مچھلی والا پیغمبر بھی کہتے ہیں۔ کہا کہ اس کی طرح نہ کر دینا' جلد بازی سے کام نہ لینا' دلبرداشتہ نہ ہو جانا۔ اس (حضرتِ یونس علیہ السلام) کی کیفیت تھی کہ **اِذۡ نَادٰی وَهُوَ مَكۡظُوۡمٌ ۝ لَوۡلَاۤ اَنۡ تَدٰرَكَهٗ نِعۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالۡعَرَآءِ وَ هُوَ مَذۡمُوۡمٌ** (68:48-49) اگر پھر خدا کی یہ عنایتیں اس کے ساتھ نہ ہوتیں تو وہ اپنے ایک غلط فیصلے کی رو سے ختم ہو گیا ہوا تھا۔ وہ تو یہ تھا کہ چونکہ وہ معصیت نہیں تھی کہ جس کی سزا دینی مقصود تھی' صرف ایک اجتہادی غلطی تھی تو پھر اس کے بعد یہ ساری چیزیں ایسی آتی رہیں جس سے اس کی حفاظت ہو گئی' پرورش ہو گئی۔ **فَاجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ** (68:50) سرکشی اور معصیت نہیں تھی اس لیے اس کے خدا نے اس کا انتخاب کیا' وہ نبی تھے' نبی رہے' خدا نے ان کو صالحین میں سے بھی کہا' لیکن وہ جو ایک چیز تھی کہ قبل از وقت فیصلہ کیا' دلبرداشتہ ہو گئے' استقامت چھوڑ دی' اس لیے آپ ﷺ سے یہ کہا ہے کہ **فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنۡ كَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ** (68:48)[2]۔ عزیزانِ من! اس پروگرام میں آپ اندازہ لگائیے کیا مقامات آتے ہیں کہ خدا کا یونس علیہ السلام جیسا' ایک نبی بھی' گھبرا کر وہاں سے' وہ جگہ چھوڑ کے' ہجرت کر بیٹھتا ہے۔

---

[1] جس طرح دم دیئے چاول ہوتے ہیں' ان میں تو صرف معمولی سی سختی رہ گئی تھی۔

[2] تو ان کی کسی بات کی پرواہ نہ کر' اور اپنے نشوونما دینے والے کے تجویز کردہ پروگرام کی تکمیل میں ثابت قدم رہ۔ اور مچھلی والے پیغمبر (یونسؑ) کی طرح جلد بازی نہ کر۔ وہ اپنی قوم کی مخالفت سے گھبرا کر وقت سے پہلے ان سے ہجرت کر کے چلا گیا (37:139; 21:87)۔ اس سے وہ خود مشکل میں پھنس گیا اور غم والم کی اس حالت میں اس نے ہمیں مضطربانہ پکارا۔ (مفہوم القرآن - پرویز)

خدا کی طرف سے رسول خدا ﷺ کو بار بار صبر کی تاکید

رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ ایسا نہ کرنا' انہیں برداشت کیے جاؤ۔ ان کی برداشت کی بھی بڑی انتہا تھی اگر ہم حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی مکہ کی زندگی دیکھتے ہیں تو آج بھی اس کے پڑھنے سے آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں' رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ کیا تھی برداشت کی قوت! حضور ﷺ کے تو بہر حال یہ انداز تھے ہی' آپ کے جو ساتھی تھے' ان کی بھی کیفیت یہ ہے۔ تو یہ کہا گیا کہ برداشت کیے جاؤ' ہمت سے کام لو' استقامت سے کام لو۔ آپ اس سے سمجھ لیجیے کہ ہم جو پیدائشی مسلمان ہو کر سمجھ رہے ہیں کہ ہم اس حبیب کی امت میں سے ہیں' اس کی شفاعت سے بخشے جائیں گے' تو کیا یہ درست ہے جب کہ اس طرح کے سنگین مراحل نبیوں اور ان کے صحابہ کے ساتھ پیش آئے۔ ہمیں تو اس میں کوئی بھی ایسی منزل پیش نہیں آتی' کہیں بھی کوئی آزمائش نہیں ہوتی' کوئی کسی قسم کی بھی مصیبت نہیں آتی مگر ان منازل سے گزرنا پڑتا ہے:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

مسلمان ہونا آسان نہیں ہے۔ مسلمان کہلانا تو بڑا ہی آسان ہے' اس میں تو کچھ بھی نہیں لگتا: نہ ہینگ نہ پھٹکڑی۔ **وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ** [1] (68:51)۔

آپ ﷺ کی ذات پر طعن و تشنیع کے خنجر

عزیزانِ من! یہ جو تیغ وسناں کے کچوکے یا زخم ہوتے ہیں' ان میں اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی طعن و تشنیع کے خنجر سے ہوتی ہے۔ مرنے والا تو فقط بات سے مر جاتا ہے۔ یہ ان حربوں پر بھی اتر آتے تھے اور قرآن نے بات بھی یہی کہی ہے کہ ان کی جو باتیں ہیں ان سے یہ صورت ہوگی۔ کہا: جس انداز سے یہ تمہیں دیکھتے ہیں' ہمیں معلوم ہے کہ تم پہ اس سے بھی کیا گزرتی ہے۔ اس قوم کی عجیب چیز نظر آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک طرف تو ان کی یہ اس قسم کی جرأتیں اور بصالتیں ہیں کہ دشمن بھی نکھرے ہوئے کھلے طور پر ہیں اور دوسری طرف اِن میں اس قسم کے بھی لوگ تھے جو طعن و تشنیع بھی دیں اور کمینی حرکتیں بھی کریں۔ وہاں مختلف قبائل کا ذکر ہے' اس کے اندر یہودیوں کا بھی ہے' جنہیں منافقین کہا گیا ہے کہ وہ ان حربوں پر بھی اتر آئیں کہ طعن و تشنیع بھی دیں اور کمینی حرکتیں بھی کریں اور پھر' جیسے یہاں کہا گیا ہے کہ اس قسم کی نگاہوں سے دیکھیں کہ اس سے جگر شق ہو جائے۔ کہا کہ یہ بھی کوشش کریں گے اور یہ ساری بات اس

---

[1] اِن کفار کی کوشش یہ رہتی ہے کہ جب وہ تم سے قرآن سنیں تو تمہیں (کبھی) دیوانہ کہہ دیں' (اور کبھی ساحر اور شاعر) اور تمہاری طرف گھور گھور کر دیکھیں تاکہ تم ان سے زچ پڑ جاؤ اور اس طرح اپنے مقام سے پھسل جاؤ۔

لیے کریں گے کہ تم اپنے مقام سے ذرا پھسل جاؤ۔

آپ کو معلوم ہے کہ قرآن میں ان کے متعلق یہ ہے کہ یہ کوشش کرتے تھے کہ کچھ Compromise (مفاہمت) کی شکل نکل آئے یعنی پہلے پورا زور لگا لیا کہ شکست دیدیں۔ وہ نہیں ہو سکا تو پھر ان منافقین کا اگلا حربہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مفاہمت پہ آ جائیں۔ جو حق پر ہوتا ہے وہ کسی سے مفاہمت کے لیے کچھ کہنا تو ایک طرف، وہ تو مفاہمت پہ آتا بھی نہیں، وہ آ سکتا ہی نہیں ہے چہ جائیکہ وہ دوسرے سے کہے کہ آیئے کچھ Compromise (مفاہمت) کرلیں۔ یعنی کچھ تم جھکو کچھ میں جھکتا ہوں، کچھ تم پیچھے ہٹو کچھ میں آگے بڑھتا ہوں۔ یہ وہی کرے گا جو حق پر نہیں ہوگا۔ یہ جو مصالحتی اسلام ہے، یہ وہی ہے، جسے نظریہ ضرورت کا اسلام کہا جاتا ہے۔ وہ Compromise (مصالحت) ہے۔ جو حق پر ہے وہ مصالحت نہیں کر سکتا۔ وہ تو جان دیدیگا لیکن دو اور دو پانچ نہیں کہے گا۔ غور فرمایئے قرآن ان مقامات کو اتنی اہمیت دیتا ہی اس لیے ہے۔ یہ تو ہمارے لیے ہے۔ یہ اس زمانے کی صرف کوئی داستان نہیں بیان کر رہا۔ یہ صرف تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ آپ یہ کہیں کہ اس نے یہ کہا، اس نے وہ کیا اور پھر آگے بڑھ گئے کہ ہمارا تو اس میں کچھ واسطہ نہیں ہے، طالبعلم ہے تو اتنا ہی واسطہ ہے کہ امتحان میں سوال آئے گا تو مجھے جواب دینا ہوگا، ہمارا ان چیزوں سے تعلق نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔

باطل کے ساتھ مفاہمت نہیں ہو سکتی

یہ قرآن ہمارے لیے ہے اور وہ یہی ہے کہ جو حق پر ہے وہ Compromise (مفاہمت) پہ نہیں اتر سکتا، وہ مفاہمت نہیں کر سکتا، اس کے دل میں مفاہمت کا تصور بھی نہیں آ سکتا۔ سوال ہی نہیں کہ پھر وہ گفت و شنید پر اتر آئے۔ اگر وہ حق پہ ہے تو اس کا اس چیز پر آنا ہی نہیں۔ وہ تو اس کے لیے آپ کو دعوت دیتے تھے کہ آیئے آپ اور ہم مفاہمت کرلیں۔ یہی بات قرآن کہتا ہے کہ ان کے باطل پر ہونے کے لیے یہی ایک ہی دلیل کافی ہے کہ وہ خود کہہ رہے ہیں کہ ہم اپنے مقام سے ہٹتے ہیں۔ اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں پڑ سکتی کہ ہم اپنے مقام سے ہٹتے ہیں۔ ویسے تو یہ ان کی شکست ہوتی ہے مگر یہ نہیں کہتے کہ ہم غلطی پر تھے۔ کہا کہ جب تو مفاہمت کی اس بات پہ بھی نہیں آتا تو پھر یہ کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہو گیا ہے، یہ کسی کی مانتا ہی نہیں ہے۔

ضد میں اور اصول پرستی میں فرق

اب جیسا میں نے پچھلی دفعہ، اس سے پہلے درس میں، بھی عرض کیا تھا کہ ضد میں اور اصول پرستی میں ایک فرق ہوتا ہے۔ ضدی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ حق پر ہی ہو تو اس پہ اڑا ہوا ہو، وہ تو اپنی ہر بات پر اڑا رہتا ہے۔ اپنی قوت کے زعم پہ اڑا ہوا ہوتا ہے۔ تکبر اور استبداد کی ذہنیت کی بناء پہ، اپنی ہی بات پہ اڑا ہوتا ہے۔ یہ بات ضروری نہیں ہے کہ وہ حق پر ہو۔ اصول پرست وہ ہوتا ہے جو سمجھنے سوچنے کے بعد حق کو قبول کرے اور پھر اس پر جم کر کھڑا ہو جائے۔

پرواز میں کوتاہی کا سبب کیا ہوتا ہے؟

یہ جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ❶ (41:30)۔عزیزانِ من! وہ سب کچھ سمجھنے سوچنے کے بعد اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ روٹی کسی انسان کے ہاتھ سے نہیں لی جائے گی، وہ ذلت ہے، اس سے پرواز میں کوتاہی آتی ہے، وہ اس نتیجے پہ پہنچ کر اس کو اپنا ایمان بنا لیتے ہیں۔اس کے بعد کہا ہے کہ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30) پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ آگے آتا ہے کہ ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔انہوں نے صرف ایمان لانے کے اوپر ہی اکتفا نہیں کیا، ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30) بھی ساتھ کہا ہے۔

ایسا انسان خدا کا مہمان ہوگا

عزیزانِ من! استقاموا کے بعد بڑی بڑی رکاوٹیں، تصادمات اور تزاحمات آئیں گے، کشمکش ہوگی، مصیبتیں آئیں گی، مشکلات آئیں گی پھر اس وقت اس پر جم کر کھڑے ہو جانا۔ یہ ہے وہ مقام جہاں قرآن کہتا ہے کہ ان پر ملائکہ کا نزول ہوگا جو اس بات کی بشارت دیں گے جو تمہارے لیے خدا نے پہلے سے ہی تیار کر رکھا ہے۔تم تو خدا کے مہمان ہو گئے ہو، اس نے مہمانوں کی تواضع کے لیے بڑے حسین وشاداب سامان تیار کر رکھے ہیں وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (41:30) اِس استقامت سے تمہارے لیے اس جنتی معاشرے کی خوشخبری ہے، جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ یہ مقام تو اس وقت آتا ہے جب آپ پہلے حق وصداقت کو اس طرح قبول کریں کہ اس سے دل اور دماغ کا اطمینان ہو جائے پھر اگلا مرحلہ اس حق وصداقت پر چلنے کا آتا ہے، ورنہ صبح کو آپ نے بات کی، شام کو پھر گئے۔ یہ شیوہ ان لوگوں کا ہے جن کو پتہ نہیں کہ ایمان اور یقین کسے کہتے ہیں۔

آپ ﷺ کی ذات کے متعلق کفار کا ناکام تجسس

عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ❷ پٹتا ہے، ماریں کھاتا ہے، گالیاں سہتا ہے، سب کچھ برداشت کرتا ہے مگر اس کا کچھ معاوضہ نہیں مانگتا۔وہ تجسس کے بعد، سراغ رسانی سے بھی، دیکھتے ہونگے کہ کوئی کسی قسم کا، غائبانہ ہی، کوئی تو اس کا مفاد ہوگا۔جب کچھ نظر نہیں آتا، تو ایک تو اِس مقام پہ وہ کہتے تھے کہ ''پاگل ہے جسے اپنے نفع نقصان کی بھی پرواہ نہیں۔'' یہاں دوسری بات یہ ہے کہ ہم اسے

---

❶ جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشو ونما دینے والا، اللہ ہے۔اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں پیدا کرتی۔

❷ اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

Compromise (مفاہمت) کے لیے کہتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم یہ لڑائی بند کر دیں گے' یہ کشمکش ختم ہو جائے گی' یہ مصیبتیں اور ان مصیبتوں کے یہ مرحلے تمہارے سامنے سے ختم ہو جائیں گے' مگر اس پہ بھی یہ کہتا ہے کہ "نہیں صاحب! میں تو یہ نہیں چھوڑ سکتا' میں اس پہ ذرا بھی Compromise (مفاہمت) نہیں کر سکتا' تو جیسے ہم کہتے ہیں کہ وہ یہی کہہ کے اٹھ گئے ہونگے کہ یہ بڑا ہی ضدی ہے۔ اس کے لیے تو پھر ان کے ہاں وہی لفظ ہے کہ بالکل مجنون ہے' پاگل ہے۔ یہ کچھ کہنے کے بعد اگلی وہ بات آئی جس پر اِس سورۃ کا خاتمہ ہوتا ہے۔

سورتوں کے آخر میں فکرِ قرآنی کا نچوڑ ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ سورتوں کی جو آخری آیات ہوتی ہیں' ان میں اس پیغام کا جو اس سورۃ کے اندر دیا جاتا ہے ایک نچوڑ دیا ہوتا ہے۔ یہ ساری کشمکش وہاں ہوئی' یہ سب کچھ آیا' یہ قوم نہیں مان رہی' آخر تک زور لگا دیا' پھر یہاں آگے مایوسی کی بات ہوتی ہے کہ میں ناکام رہ گیا۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں یہ نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! دیکھیے کہ یہاں کس بات کا اطمینان دلایا جاتا ہے۔ کہا کہ تمہارا یہ پیغام' تمہارا یہ مشن اسی رقبے' اسی وطن' اسی ملک' اور اسی قوم کیساتھ محدود نہیں ہے وَ مَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (68:52) یہ تو پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ اگر یہ لوگ یہاں نہیں مانتے تو اپنا نقصان کر رہے ہیں' اس مشن کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ وہ تو وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ "پوری روئے زمین میری مسجد ہے۔" تم نہیں تو ملکِ خدا تنگ نیست' اور مقام ہونگے اور قوم آ جائے گی' وہ اِسے تسلیم کر لے گی۔ تو غم تو اس کو ہونا چاہیے جس کے لیے یہ ہو کہ "یہی چار گاہک تھے یہ دوکان سے مڑ گئے تو اس کے بعد یہ سودا کیسے بکے گا۔" سودا بیچنے کی تو بات ہی نہیں ہے' تم تو ان کے بھلے کی بات کہہ رہے تھے' اگر یہ نہیں مانتے تو کوئی بات نہیں۔ یہ "ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ" (68:52) بڑی عظیم چیز ہے۔

انسانوں کے لیے دیا گیا نظامِ خداوندی کبھی فیل نہ ہوگا

قرآن کے خدا کا تصور رب العلمین کا ہے' یہ کسی ایک قوم کا' کسی گروہ کا' کسی جماعت کا' کسی نظام کا' کسی فرقے کا' کسی پارٹی کا رب نہیں' یہ تمام نوعِ انسانی کا رب ہے۔ اس کا رسول "رحمت للعلمین" ہے' یہ کسی ایک جماعت کے لیے رحمت نہیں' وہ تمام اقوامِ عالم کے لیے رحمت ہوگا۔ اس کا قرآن "ذکر للعلمین" ہے۔ اب "ذکر" کے معنی اگر Guidance یا راہنمائی یا یاددہانی کے ہیں تو وہ بھی لیجیے اور عربی زبان میں اگر ذکر کے معنی شرف اور عزت یا رفعت (68:50 ;16:43) کے ہیں تو یہ معنی لیجیے تو یہ پوری انسانیت کے لیے باعث عزت افزائی ہوگا' باعثِ شرف ہوگا۔ یہ بات نہیں ہے کہ اگر یہ مخاطب قوم اس کی مخالفت کرتی ہے' اسے تسلیم نہیں کرتی تو اس سے یہ نظام فیل ہو جائے گا' یہ پیغام ناکام رہ جائے گا' قطعاً نہیں۔ یہ یہیں قومِ مخاطب کے لیے نہیں ہے' یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے اور پھر نوعِ انسانی تو قیامت تک کے لیے ہے۔

عزیزانِ من! ختمِ نبوت کے بھی معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد اور کوئی نبی بھی نہیں آئے گا۔ اگر نبوت کا اجراء رہے تو کچھ عرصے کے بعد پھر دوسرے نبی کی نبوت کا دَور شروع ہو جاتا ہے' ہو سکتا ہے اس کی قوم بھی دوسری ہو' ملک بھی دوسرا ہو' اپنی جماعت بھی دوسری ہو' لیکن جب نبوت کا خاتمہ ہو گیا تو پھر ختمِ نبوت کے بعد پیغامِ رسالت ہی باقی رہتا ہے۔ وہ پیغام غیر متبدل ہے' تمت ہے' مکمل ہے' محفوظ ہے۔ اب کوئی نبی بھی نہیں آئے گا جو دوسرا پیغام دے۔ اگر یہ تمہاری قوم مخاطب اس کو اپنا کے اِسے عملاً متشکل نہیں کرتی تو اس نظام کا کچھ نہیں بگڑتا۔ قرآن نے کئی مقامات پہ کہا ہے کہ اگر یہ نہ کرو گے تو یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ (9:39; 47:38) تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی اور وہ کہا ہے کہ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ (47:38) پھر وہ تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ یعنی یہ Substitution (استبدال) ایسا نہیں ہے کہ اسی قسم کی ایک دوسری قوم آ جائے۔

ایمان اور عملِ صالح کے نتیجے میں استخلاف فی الارض

یہ جو بزورِ شمشیر یا قوت کے زور پہ مملکتیں حاصل ہوتی ہیں وہ تو جس قسم کی مستبد ایک قوم ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ مستبد دوسری قوم آتی ہے۔ وہ اس سے بہتر نہیں ہوتی لیکن وہ جو پیغامِ خداوندی کی رو سے بنتی ہے' جسے استخلاف فی الارض کہا گیا ہے' جسے ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجے میں استخلاف فی الارض نصیب ہوتا ہے' وہ قوم اس سے بہتر ہوتی ہے جو اپنی سرکشیوں کی وجہ سے تباہ ہوئی ہے۔ یہ قوم جو اس کی جگہ لیتی ہے اسے کہا جائے گا کہ یہ اس سے بہتر قوم آئی ہے۔ اور یہاں کہا یہ ہے کہ پھر یہ سلسلہ اس طرح سے قیامت تک کے لیے جاری ہے۔

مسلمان حکومتوں کی حالت زار

یہ بات حقیقت ہے جو عام طور پر ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ دنیا میں مسلمانوں کی آبادی بھی اتنی زیادہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی اپنی چالیس سے بھی زیادہ آزاد مملکتیں ہیں لیکن ان تمام مملکتوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ دوسروں کی دستِ نگر ہیں' ذلیل ہیں' محتاج ہیں۔ یعنی اِن کے ہاں ایسی دوہری غلامی ہے کہ جہاں اپنی حکومت ہے وہاں کی رعایا اپنے ہاں کے صاحبِ اقتدار حاکم کی غلام ہے اور یہ جو اپنے ہاں کے اتنے بڑے حاکم ہیں' وہ سپر پاورز کے غلام ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں ہے' کوئی ایک مملکت بھی ایسی نہیں ہے کہ عام معیار کے مطابق ہی سہی' اس کا شمار سپر پاور میں ہی ہو جائے۔ جو مصیبت پڑتی ہے ان پہ آ کر پڑتی ہے' یہ اس کے لیے کچھ نہیں کر پاتے۔ زیادہ سے زیادہ یو این او (UNO) میں جا کے ایک ریزولیشن (Resulution' قرار داد) پاس کرا لیتے ہیں اور بس۔ ویٹو پاور دو ممالک [1]

---

[1] یاد رہے یہ 11 نومبر 1983ء کو کہا گیا تھا جب یہ ویٹو پاور صرف دو ہی ممالک کو حاصل تھی۔

کودی ہوئی ہے، وہ ویٹو پاور اسی وقت اس ریزولیشن کو مسترد کر دیتی ہے اور اسی طرح سے یہ اپنی جھولی خالی لے کر گھر واپس آ جاتے ہیں۔ یہ چیز کہ ان میں سے آج اسلام کسی کے ہاں بھی نہیں ہے صرف میرے کہنے کی بات نہیں ہے کہ میں فتوے لگاتا ہوں۔ یہ اظہر من الشمس ہے۔

ایک محسوس ٹیسٹ

قرآن نے یہ کہا ہوا ہے کہ ''یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی غیر مسلم، مسلم جماعت پر غالب آ ہی نہیں سکتا۔'' یہ اتنا محسوس ٹیسٹ ہے کہ اس میں کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یعنی یہ کوئی Abstract Talk نہیں، فلسفے کا مسئلہ نہیں کہ بحثیں کر کے پتہ چلے کہ وہ غالب آئے ہوئے ہیں یا نہیں، یہ مسلمان ہیں یا نہیں۔ تو پھر جب ہمیں خود اقرار ہے کہ یہ تمام غیر مسلم اقوام ہمارے اوپر غالب ہیں تو پھر دو ہی باتیں ہونگی: یا تو معاذ اللہ یہ کہا جائے گا کہ خدا نے یہ ٹھیک نہیں کہا کہ غیر مسلم غالب نہیں آئیں گے، دیکھ لیجیے وہ آئے ہوئے ہیں۔ تو کیا آپ یہ مانیں گے؟ خدا نے یہ کہا ہے کہ ہم سے زیادہ وعدے کا سچا ہی کوئی نہیں ہے۔ تو اس کا یہ وعدہ تو صحیح ہے اور سچا ہے۔ تو اگلی بات یہی ہے کہ اس نے کہا تھا کہ کوئی غیر مسلم مومنین کے اوپر غالب نہیں آ سکے گا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم مومن نہیں ہیں جو یہ ہم پہ غالب آئے ہوئے ہیں، کوئی تیسرا نتیجہ اس سے نہیں نکلتا۔ لیکن، عزیزانِ من! اسے کوئی تسلیم نہیں کرتا، اس لیے کہ اس طرح سے یہ پیدائشی مسلمان رہنا، مسلمان مرجانا تو بڑا آسان ہے، کرنا ہی کچھ نہیں پڑتا۔ اس جنت سے کس کا جی چاہتا ہے کہ وہ نکل جائے جو اتنی آسانی سے مل جائے۔

گداگری کا پیالہ

''بہشت فی سبیل اللہ ہم است''، جو اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے، خوش باش، موج کر، بہشت فی سبیل اللہ ہم است، اللہ واسطے بھی بہشت مل جاتی ہے۔ یہاں بھی جو کچھ لیتے ہیں بخشش کے طور پہ لیتے ہیں۔ گداگری کا وہ پیالہ ہاتھ میں لیے ہوئے پھر رہے ہیں۔ وہاں جا کر بھی جنت بخشیش میں ہی مانگتے ہیں: اللہ بخش دے گا۔ یعنی یہ بات ہماری زبان پہ ہے کہ ہم جنت بھی بخشیش میں ہی مانگتے ہیں۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ جنہیں جنت دی جائے گی ان سے کہا جائے گا کہ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (46:14) یہ تمہارے حسنِ عمل کا نتیجہ ہے جو تمہیں دیا جائے گا، اور اس کے بعد کہا ہے کہ پھر اس جنت سے تم اس طرح نہیں نکالے جاؤ گے جس طرح تمہارا باپ باوا آدم نکالا گیا، تھا جیسے یہ کہتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ اُسے وہ جنت بخشیش میں ملی ہوئی تھی، اس کے عمل کا نتیجہ نہیں تھی، پھر اس سے ایک لغزش ہوئی اور وہ باہر آ گیا۔

لہو سے خریدی ہوئی جنت

عزیزانِ من! یہاں جو ان کے لیے جنت ہے، اسی جگہ کہہ دیا کہ تمہیں اس سے نہیں نکالا جائے گا، اس لیے کہ تم نے اسے اپنے لہو سے خریدا ہے، ہم نے یہ تمہارے ہاتھ بیچ دی ہے اور ہم بڑے دیانتدار کاروباری ہیں۔ جو اس طرح سے ہم نے چیز بیچ دی ہے ہم اس کو واپس نہیں لیتے۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (4:122) اس میں ہیشگی ہے جو اس طرح سے جنت خریدی جائے گی۔ یہ ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ

(68:52) ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ''نہیں ہے کہ جو مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے والی قوم ہے' یہ انہی تک محدود ہے' اس سے آگے نہیں ہے۔'' یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن میں ایک جگہ نہیں بلکہ دو ایک مقامات پر آیا ہے: یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136) اے وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو: ایمان لاؤ خدا پر۔ وہ تو ہم سے ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے اور صحیح ہے یہ مطالبہ۔ کیا کبھی ہم نے سوچا ہے کہ ہم ان چیزوں پر غور وفکر کے بعد ایمان لائے ہیں؟ قرآنِ کریم اس کا مطالبہ کرتا ہے۔ پہلے یہ کہہ کر پکارتا ہے کہ یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (4:136) اور اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ جو اپنے آپ کو بزعمِ خویش مسلمان سمجھتے ہو' مسلمان تو ہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں' مسلمان کا لفظ تو قرآن میں نہیں ہے۔ وہاں تو یا مسلم ہے یا مومن ہے۔ کہا کہ جو بھی اپنے آپ کو یہ سمجھتے ہو۔ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136) او اللہ پر ایمان لاؤ۔ تم اللہ پر ایمان لا کے مسلمان نہیں ہوئے ہو۔ وہ تمہارے مسلمان ہونے کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ قومی حیثیت سے ایک مسلمان قوم ہے مگر قرآن کی حیثیت سے یہ مومن تو نہیں ہے۔ تو وہ جو کہا گیا تھا کہ غیر مسلم تم پہ غالب نہیں آسکیں گے' وہ مومنین کے لیے کہا گیا تھا۔ آج بھی یہ مسلمان جو پیدائشی ہے' قومی ہے' اگر قرآن کے مطابق ایمان لے آئے تو پھر دیکھیے واقعی کوئی غیر مسلم ان پر غالب نہیں آسکتا کیونکہ یہ اور خدا پھر دونوں ایک طرف ہونگے اور بقیہ تمام دوسری طرف مدمقابل۔

عزیزانِ من! سورۃ القلم ختم ہوگئی۔ اگلے درس میں سورۃ الحآقۃ' 69 ویں سورۃ سے شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

آٹھواں باب: **سورۃ الحاقة** (آیات 1 تا 12)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج نومبر 1983ء کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحاقۃ سے ہو رہا ہے: یہ 69 ویں سورۃ ہے اور یہ درس اس کے آغاز سے ہی ہو رہا ہے۔

نمائندگان بزم ہائے طلوعِ اسلام کا تعارف

ایک ضروری تمہید سے یہ درس شروع کر رہا ہوں۔ آج کے درس میں آپ احباب کو کچھ ایسے چہرے نظر آئیں گے جو آپ کے لیے نامانوس اور اجنبی سے ہیں۔ یہ طلوعِ اسلام کی مختلف بزموں کے نمائندگان ہیں' جو اپنے اجتماع کے لیے یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اب ان کا تعارف میں اس سے زیادہ کیا کراؤں کہ یہ جو ہماری قرآنی فکر ہے' اس کے ذرائع ابلاغ اور ناشرین یہی احباب ہیں اور ان کی وفاداری بشرطِ استواری کی یہ کیفیت ہے کہ کم از کم گزشتہ پچیس تیس سال سے جب سے طلوعِ اسلام وجود میں آیا ہے ان کی بزمیں مختلف شہروں میں قائم ہیں: پاکستان میں بھی اور بیرونِ پاکستان بھی۔ یہ وقتاً فوقتاً اس طرح سے جمع ہوتے رہتے ہیں۔ پہلے تو طلوعِ اسلام کا سالانہ کنونشن ہوا کرتا تھا لیکن اب حالات کی وجہ سے یہ کنونشن ملتوی ہو گیا ہے۔ یہ احباب باہمی مشاورت کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ اس دفعہ اجتماع کے دوران جمعہ کا ہفتہ وار درس بھی ہے اور اس میں یہ احباب بھی شریک ہیں۔ ان کا واقعی اس قرآنی فکر کی تحریک پہ بڑا ہی احسان ہے کہ یہ بلا مزد و معاوضہ اس قرآن کے ساتھ تمسک کی بناء پر مسلسل اس فکر کو آگے پہنچانے میں مصروفِ سعی و عمل رہتے ہیں۔ اللہ انہیں اس کی جزا دے۔

عزیزانِ من! درسِ قرآن کے سلسلہ میں عرض ہے کہ آپ کو یاد ہوگا جب میں نے 28 ویں پارے کے درس کی ابتداء کی تھی تو میں نے عرض کیا تھا کہ یوں تو قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں ہی یہ چیزیں آتی ہیں کہ وہ حقائق کو مجازی انداز میں، استعارات یا تشبیہات کے رنگ میں، بیان کرتا ہے لیکن آخری دو پاروں میں یہ انداز بڑا ہی ارتکاز اختیار کر گیا ہے۔ اس کے اندر بہت سے حقائق آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک حقیقت ایسی ہے کہ وہ اپنے اندر مطالب اور معانی کا ایک دریا رکھتی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ان آیات میں اور خصوصاً آخری دو پاروں میں کچھ تغیرات اور انقلابات کا ذکر ہے۔

تین نوعیتوں کے انقلابات: ایک انقلاب خارجی کائنات میں

قرآن تو آیا ہی اس لیے تھا کہ وہ انقلاب برپا کرے لیکن ان آیات میں جو انقلابات ہیں وہ تین نوعیت کے نظر آتے ہیں۔ ایک تو ایسا نظر آتا ہے کہ خارجی کائنات میں کچھ انقلابات برپا ہونگے جن کی نشاندہی وحی الٰہی نے کی ہے اور وہ قرآن کی ان آیات میں ہے۔ مثلاً طبعی کائنات میں تغیرات، جن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ سورج ماند پڑ جائے گا، چاند کے ٹکڑے ہو جائیں گے، ستارے گر پڑیں گے، آسمان پہ یہ کچھ ہوگا۔ یہ تمام چیزیں اس طرح سے پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کا تعلق اِس طبعی کائنات سے ہے۔ طبعی کائنات میں کس قسم کے تغیرات رونما ہونگے؟ ایک تو یہ موضوع ایسا ہے کہ ان میں جو ریسرچ کرنے والے سائنسدان ہیں وہ مغرب میں ہی ہیں، وہ اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور آئے دن اس پر ایسا لٹریچر شائع ہوتا چلا جا رہا ہے جن سے نشاندہی ہوتی ہے کہ اس خارجی کائنات میں کس قسم کے محیر العقول تغیرات واقع ہونگے لیکن ابھی یہ چیز قیاسات کی حد تک ہے، وہ متعین طور پہ کسی نتیجے پہ نہیں پہنچے۔ وہ قیاسات بھی ایسے ہیں جو قرآن کے بیان کردہ تغیرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ابھی کل ہی میرے ایک عزیز رفیق محترم آئے ہیں اور میرے لیے تو یہ احباب جہاں کہیں بھی کوئی ایسی کتاب ملے لے آتے ہیں۔ ھدیۃً وہ ایک کتاب لائے ہیں۔ یہ عجیب کتاب ہے۔ کاف مین ایک بہت بڑا افزکس کا سائنسدان ہے۔ اس کی کتاب ہے Black Holes and Walked Space Time۔ یہ عنوان ہی بڑا ٹکنیکی ہے، سائنس کے بغیر بات سمجھ میں نہیں آتی۔ پہلے ہی صفحہ پر جو لکھا ہے، وہ ان تغیرات کی عجیب انداز سے راہنمائی بھی کرتا ہے اور نشاندہی کرتا ہے۔

تغیرات کی نشاندہی

میں نے مناسب سمجھا ہے کہ وہ الفاظ ہی آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ میں تو ان کو پڑھنے کے بعد ٹھٹھرا گیا۔ وہ الفاظ ہیں:

The most fantastic things ever predicted, holes in the fabric of space, where gravity is so strong that any thing pulled in, even light, is lost for ever, where the four dimensions of the Universe are infinitely walked, where space and time

become meaningless, almost beyond comprehension. Black holes seem to defy the traditional laws of physics. Are they tunnels to a parallel Universe or path - ways to another time or supermassive black hole swelling whole galaxies? Is it even conceiveable that our entire Universe is vanishing into the ultimate black holes?

اللہ اکبر۔ یہ چند تعارفی الفاظ کتاب کے متعلق ہیں اور آگے جو کچھ لکھا ہے' پوچھیے نہیں کیا چیز ہے! اتنے سے ہی' جتنا میں ابھی ان دو دنوں میں دیکھ سکا ہوں' قرآنِ کریم کے کئی معارف ہیں جو میری محدود سمجھ اور بصیرت کے مطابق' جو کچھ یہ کہہ رہا ہے' اس سے روشن ہو جاتے ہیں۔

عزیزانِ من! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ایک تو یہ تغیرات ہیں جو خارجی کائنات میں رونما ہونے والے ہیں۔ ان پہ تو ہمارا کوئی کنٹرول نہیں ہے اور ان لوگوں کی Prediction (پیشین گوئی) کے مطابق یہ غنیمت ہے کہ وہ کم از کم ہماری زندگی میں نہیں آئیں گے لیکن ہیں بڑے محیر العقول۔ قرآنِ کریم میں ان انقلابات کے متعلق جو الفاظ آئے ہیں' ظاہر ہے وہ تو تشبیہات اور استعارات ہی کے رنگ میں آئیں گے۔ یہ زبان خود سائنس کے استعارے کے رنگ کی ہے۔ Holes کے معنی یوں سوراخ ہی نہیں ہے جو سوراخ عموماً بن سکتا ہے' یہ تو پوری کائنات کو ہڑپ کر سکتا ہے۔ یہ استعارہ ہے' قرآن نے استعارہ کے انداز میں یہ چیزیں بیان کی ہیں۔ اس نے یہ کہا تھا کہ ہم تمہیں انفس اور آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے۔ جوں ہی کسی حقیقت پر پڑا ہوا پردہ اٹھے گا' تو اس کے نیچے سے جو چیز نظر آئے گی' وہ قرآن کے کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت ہوگی۔ یہ چیز تو کائنات کے ریسرچ اسکالر' Scientists (سائنسدان) کی بات ہے کہ وہ ان چیزوں کو پہلے سے دیکھ لیتے ہیں۔

اُخروی زندگی کے انقلابات کے متعلق کچھ اندازہ نہیں: دوسرا انقلاب اُخروی زندگی سے متعلق

دوسری قسم کے جو انقلابات و تغیرات ہیں' وہ اُخروی زندگی کے متعلق بھی ہیں۔ یہاں کے ان تغیرات کا بھی تو بہرحال انسانی تحقیقات اور تجسس سے کچھ پتہ چل سکتا ہے لیکن اخروی زندگی کے متعلق تو ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں ہو سکتا۔ ان تغیرات کو بھی قرآن نے استعارات اور تمثیلات کے انداز میں ہی بیان کیا ہے جیسے مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ (13:35)...... جنت کی مثال یوں سمجھو جیسے...... تو جب بھی ان تغیرات کا ذکر آتا ہے قرآن میں تو بہرحال ہمیں جو کچھ کہا گیا ہے' اس کو استعارہ یا تشبیہ قرار دے کر' اپنے انداز سے دیکھنا ہوتا ہے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔

قوموں کے عروج وزوال کی داستان: تیسرا انقلاب اقوام کے اندر

تیسرے قسم کے انقلابات وہ ہیں جو اس دنیا میں قوموں کے اندر پیدا ہوتے ہیں، جسے میں استبدادو استخلافِ قومی Succession of Nation کہا کرتا ہوں۔ ایک قوم آتی ہے، عروج پہ پہنچتی ہے، زوال آمادہ ہوتی ہے، فنا ہوجاتی ہے، اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ دوسرا نظام وجود میں آتا ہے، وہ نظام چند دنوں کے لیے چلتا ہے، پھر اس کے بعد وہ خود ہی زوال آمادہ ہوجاتا ہے۔ یہ انسانیت کی ایک مسلسل تاریخ ہے جو چلی جارہی ہے۔ ان انقلابات کا ذکر بھی قرآن میں آتا ہے اور قرآن کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ وہ تاریخی اسلوب سے یہ چیزیں بیان کرتا چلا جائے۔ وہ ہمارے لیے ہدایت ہے۔ یہ ان کے لیے راہنمائی ہے جو قرآن کو اپنے دَور میں خود پڑھتے ہیں۔ یہ ان کے لیے ہے جو اس سے راہنمائی لینا چاہتے ہیں۔ یہ ہر دَور کے انسان کے لیے ہے۔ اس لیے وہ باتیں بھی اس نے استعارات کے رنگ میں بیان کی ہیں، جیسے تاریخ کے انداز کے واقعات۔ ان سے جو نتائج مستنبط ہوتے ہیں، وہ اس نے اپنے انداز میں بیان کیے ہیں۔

عربی زبان میں، جس میں یہ قرآنِ عظیم ہے، ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان استعارات وتشبیہات کے متعلق عربوں کی زبان میں یہ تھا کہ ان کے مجازی معنی یوں لیے جاتے ہیں۔ ایک تو لفظ کا Literal Meaning (لغوی معنی) ہوتا ہے۔ اس میں لفظ کے معنی ہی لفظ ہوتا ہے جیسے Water کے معنی پانی ہوتا ہے اور ان الفاظ کے دوسرے معنی کو مجازی معنی کہتے ہیں۔ قرآن کے اندر جو واقعات آئے ہیں، قوموں کے عروج وزوال سے متعلق جو حقائق آئے ہیں، وہ ہمیں راہنمائی بخشتے ہیں اور ان کے لیے قرآن میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کے مجازی معنی لیے جاتے ہیں اور وہ مجازی معنی عربوں کی زبان کے اندر موجود ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے طور پہ، جو جی میں آئے ان کے معنی لے لیں۔ وہ معانی ان کی زبان کے اندر موجود ہیں۔ ان کی روشنی میں جب وہ معنی متعین کیے جائیں تو قوموں کے عروج و زوال کے متعلق عجیب عجیب حقائق سامنے آتے ہیں اور یہ قرآن کا وہ حصہ ہے جس کا بنیادی طور پر اولین تعلق ہم سے ہے۔ اب وہ جو قوموں کے متعلق ذکر کرتا ہے ایک تو یہ کہ اقوامِ سابقہ کی وہ داستانیں بیان کرتا ہے۔ اس کے ہاں ایک اصول ہے کہ وہ نظام جس کی بنیادیں ان حقائق کے اوپر ہوں جو قرآن نے دی ہیں، وہ نظام انسانیت کے لیے درخشندہ، تابناک، سرسبز وشاداب نتائج پیدا کرتے ہیں، انسانیت اس میں جنت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اب یہ اس دنیا کے اندر معاشرے کا ایک اندازِ زیست ہے جسے وہ جنت سے تعبیر کرتا ہے۔ ایک جنت وہ بھی ہے جو آخرت میں جاکے آنے والی ہے۔ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ وہ قرآن کا تمثیلی انداز ہے لیکن جس جنت کا قرآنِ کریم ذکر کرتا ہے کہ فلاں معاشرے میں تم دیکھو وہ حقائق پر مبنی تھا، صداقتوں پر مبنی تھا، تو اس نے یہ نتائج پیدا کیے۔ یہ جنت ہے، اور جو قومیں اس رہنمائی کو چھوڑ دیتی ہیں، اپنے لیے انسانیت کے وضع کردہ نظام اختیار کرتی ہیں، اس کا نتیجہ جس قسم کی تباہی آتا ہے، اسے وہ

جہنم سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ اس دنیا کی جہنم ہے' آخرت کی جہنم اپنے مقام پر آئے گی۔ قرآنِ کریم پر غور وفکر کرنے والے طالب علم کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان مقامات میں یہ دیکھے کہ ان الفاظ کے مجازی معنی کیا ہیں۔ اور ان سے کیا اصول مستنبط ہوتے ہیں۔

اس دنیا کی جنت اور جہنم میں گروہ در گروہ داخل ہوں گے

عزیزانِ من! یاد رکھیے یہ قرآن جنت میں بھی گروہوں کو' جماعتوں کو' قوم کو' داخل کرتا ہے اور جہنم میں بھی اقوام کو گروہ در گروہ داخل کرتا ہے۔ یہ اقوام کی تباہیاں ہیں جو اسی دنیا میں آتی ہیں۔ یہ جو ہمارے ذہن میں تصور ہے کہ جہاں قرآن میں عذاب کا لفظ آیا اور ہم نے سمجھ لیا کہ اس کا تعلق تو قیامت سے ہے تو جب قیامت سے ہے تو یہاں ہمارے ساتھ اس کا واسطہ ہی نہیں ہے۔ ابھی آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس ہی جو سورۃ القلم' 68 ویں سورۃ تھی' کی 33 ویں آیت میں قرآن پیچھے سے بیان کرتا چلا آ رہا ہے کہ قومیں کس طرح تباہ ہوئیں' کس طرح برباد ہوئیں' کس طرح جہنم رسید ہوئیں اور آگے ہے کہ **كَذٰلِكَ الْعَذَابُ** (68:33) یہ ہے عذاب جس میں قومیں مبتلا ہوتی ہیں۔ یہ **كَذٰلِكَ الْعَذَابُ** ہے اور آگے ہے کہ **وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ** (68:33) وہ آگے آنے والا اخروی زندگی کا عذاب' اس سے زیادہ شدید ہے' تو دونوں عذاب اس نے بیان کر دیئے۔ قوموں کے تنزل' تباہی' اور بربادی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ **كَذٰلِكَ الْعَذَابُ** (68:33) یہ ہے عذاب جس میں قومیں مبتلا ہوتی ہیں۔ اور اس خیال سے کہ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بس زندگی اسی دنیا کی ہے اور یہاں عذاب آ گیا تو معاملہ ختم ہو گیا' اس لیے کہا کہ **وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ** (68:33) اور وہ جو اخروی زندگی کا عذاب ہے' وہ اس سے بہت بڑا ہے' وہ بعد میں آئے گا مگر **كَذٰلِكَ الْعَذَابُ** (68:33) قوموں کی تباہیوں کا یہ عذاب آیا کرتا ہے۔ قرآن سمجھنے کا یہ انداز نہایت ضروری ہے۔ عزیزانِ من! اس سے یہ معلوم ہوگا کہ جسے عذاب کہا گیا ہے' جسے قوموں کا اس دنیا میں جہنم کہا گیا ہے' اس کی نشانیاں کیا ہیں؟ اس کی علامات کیا ہیں؟

معاشرے میں خوف اور بھوک کا عذاب

قرآن نے بتایا ہے کہ قوموں کے زوال' قوموں کی تباہی کی علامت یہ ہے کہ ان کے ہاں اس قوم پر لباس الخوف والجوع طاری ہو جاتا ہے۔ خوف ہوتا ہے معاشرے کے تمام افراد کے دل میں' اور اس میں بھوک عام ہو جاتی ہے۔ جب تمہیں یہ علامات نظر آئیں تو سمجھ لو کہ وہ قوم جہنم کے عذاب میں مبتلا ہے۔ وہ بتاتا یہ ہے کہ جس قوم میں انسان کی عزت اور تکریم بحیثیت انسان نہ ہوتی ہو اور اس کی تذلیل ہوتی ہو' سمجھ لیجیے کہ وہ معاشرہ جہنم میں ہے۔ اور اسی انداز سے قرآن اور چیزیں بتا رہا ہے۔ تو جب یہ چیزیں آئیں اور اس کے بعد جب یہ ہو کہ اس قوم پر عذاب ہے یا وہ قوم جس کا معاشرہ اس انداز کا ہو' عذاب میں مبتلا ہو جائے گی' تو ہمارے ہاں اِس کو Escapism (فرار) کہتے ہیں۔ ہم نے ان تمام قرآنی آیات کے حقائق کا تعلق اُخروی زندگی سے باندھ دیا۔ ہم نے یہ کہہ کر فرار کی راہ

اختیار کی کہ ہماری قوم سے' ہمارے تنزل سے' ہمارے عروج سے' اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ وہاں آخرت کی بات ہے صاحب! جب یہ صورت ہو جائے تو پھر اصلاح کی کوئی شکل ہی باقی نہیں رہتی' پھر اِن خوش فہمیوں میں قوم کو مبتلا رکھا جاتا ہے کہ "یہ دنیا ہے ہی ترک کر دینے کے قابل' مومن کے لیے تو یہ دنیا قید خانہ ہے' یہ اصل میں جو اُخروی زندگی ہے' یہ وہاں کی زندگی ہے' یہ سارے جو یہاں آپ کو نظر آتے ہیں' بڑے خوشحال ہیں' بڑے متمدن ہیں' بڑے مہذب ہیں' آخرت میں یہ سب جہنم میں ہونگے اور ہم جو ہیں اس دنیا کی چند روزہ زندگی میں یہ جو کیفیت ہم پہ ہے' آپ اس کو زوال کہتے ہیں' آپ اس کو تباہی کہتے ہیں' یہ آپ کے کہنے کی باتیں ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہمیں تو آزمائش میں ڈالا گیا ہے اس کے بعد آپ دیکھیے گا ہم جنت کے اندر ہونگے۔" قوم کو ان خوش فہمیوں میں مبتلا رکھا جاتا ہے اور قوم جہنم میں جا رہی ہوتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ اور جہنم کے اندر ہوتی ہے:

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی

ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

جبکہ اس کے برعکس واعظ اپنے وعظ میں قیامت کے اعمالنامے کا' ترازوؤں کا' تکڑی [1] کا' ذکر اتنی طول داستان کی طرح بیان کرتا چلا جاتا ہے لیکن کیا تیری آنکھوں نے اس قیامت کو نہیں دیکھا جس میں ہم مبتلا ہیں۔ تو قرآن کے ان مقامات میں' میں نے عرض کیا ہے کہ خاص طور پر یہ جو آخری دو پارے آتے ہیں' ان میں تو قدم قدم پہ یہ چیز ہمارے سامنے آتی ہے: قوموں کا زوال' ان کی تباہی' ان کی بربادی' جس عذاب میں وہ مبتلا ہوتی ہے۔ پہلے اس دنیا کے اندر کے عذاب میں اس کو لینا چاہیے اور اس کے لیے اصلاح کی شکلیں قرآن نے خود متعین کر کے بتا دیں کہ اس جہنم سے تو یوں نکلا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ قوم اس جہنم سے نکلنے کی خواہش اپنے اندر رکھے اور جو اسی جہنم کی زندگی کو جنت سمجھ لے تو اس میں سے اس کے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ذہن میں رکھ کے بالخصوص قرآن میں آخری دو پاروں پر غور و تدبر یوں کرنا چاہیے' پھر آپ دیکھیں گے کہ ایک ایک بات کس طرح ایک حقیقت بن کر سامنے آتی ہے اور حقیقت کا لفظ میں نے اس لیے کہا کہ یہی بات شروع ہوتی ہے جو الحاقۃ کی سورۃ ہے۔ 69 سورۃ شروع ہی اس طرح سے ہوتی ہے۔

الحاقۃ ما الحاقۃ کا مفہوم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَآقَّۃُ ۙ﴿﴾ مَا الۡحَآقَّۃُ [2] (69:1-2)۔ کیا اسلوب ہے قرآن کا! میں بار بار کہا کرتا ہوں کہ آپ کچھ تھوڑی سی عربی ضرور جان

---

[1] ترازو

[2] ایک حقیقت ثانیہ بن کر سامنے آ جانے والی تباہی۔ یہ تباہی کیا ہے؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لیجیے پھر آپ دیکھیں گے کہ اس میں کیا عجیب لطائف پنہاں ہیں اور اس میں کتنا لطف آتا ہے۔ کہا کہ اَلْحَآقَّةُ o مَا الْحَآقَّةُ o وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْحَآقَّةُ ❶ (69:1-3)۔ تین دفعہ الحاقہ کی بات کو کہا گیا ہے کہ یہ حاقہ کیا چیز ہے؟ حق اور حقیقت ہے۔ ہمارے ہاں تو حق اور حقیقت کے یہ الفاظ بھی نظری بن کے رہ گئے ہیں۔ یہ حق و باطل کی کشمکش' نظریات کی کشمکش ہے' اس پہ مذاکرے ہوتے ہیں۔

ہم نے مناظروں کا صرف نام بدلا ہے

عزیزانِ من! وہ جو پہلے مناظرے ہوتے تھے' مباحثے ہوتے تھے' آج بھی ہوتا وہی کچھ ہے مگر اب اس کا نام مذاکرات رکھ لیا گیا ہے' سیمینار رکھ لیا گیا ہے' ڈائیلاگ (Dialogue) رکھا ہے' بات وہی ہے: بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں' اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات۔ یہ سارے وہ لات و منات ہیں جو انسان کو حقیقت تک نہیں آنے دیتے۔ حق اور حقیقت کے معنی یہ ہو گئے ہیں۔ کشمکش حق و باطل آپ روز سنتے ہیں۔ حق کے معنی ترجمے میں بھی Truth کے ہو گئے اور وہ Truth بھی Abstract' یعنی اب یہ کچھ ایک ذہنی سی چیز ہے' اس کا عملی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔

حق کا قرآنی مفہوم

لسان عربی مبین میں' جس میں قرآن آیا ہے' حق کے معنی ہوتے ہیں: ''وہ نتیجہ جو محسوس شکل میں سامنے آ جائے۔'' یہ محض نظری بحث نہیں ہے۔ جب نبی اکرم ﷺ نے اپنی یہ دعوت دی تو قبیلہ بن عامر کا ایک بوڑھا سردار عصا ٹیکتا ہوا آیا۔ تاریخ میں وہ واقعہ اس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس نے آ کے آپ ﷺ سے یہ پوچھا کہ آپ ﷺ جو دعوت دے رہے ہیں' یہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ایک حقیقت ہے' یہ ایک حق ہے جس کی طرف میں دعوت دیتا ہے' یہ ایک کلمہ ہے جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں۔ اس نے کہا کہ ہر کلمہ کی ایک حقیقت ہوتی ہے' یہ جو آپ کا کلمہ ہے' اس کی بنیاد کس نظریہ زندگی پر ہے؟ کیونکہ جس نظریہ زندگی کے اوپر کسی چیز کی بنیاد ہوتی ہے وہ کلمہ ہوتا ہے۔ قرآن نے کہا تھا: تَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّکَ ❷ (6:116)۔ دیکھیے کلمہ کے معنی یہ ہیں۔ تو اس نے کہا تھا کہ آپ کے کلمہ کی حقیقت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جو اتنے شہر اور اتنے قلعے فتح کیے ہوئے ہیں' یہ میرے کلمہ کی حقیقت ہے۔ آپ نے غور فرمایا: حقیقت کیا ہے؟ عزیزانِ من! حقیقت کے معنی کیا ہو گئے؟ وہ چیز جو اس طرح سے واقعہ ہو کر' محسوس طور پر' سب کے سامنے آ جائے تو پھر اس میں کسی اعتراض کی' بحث کی' مناظرے کی' تردید کی' گنجائش ہی نہیں رہتی۔ جو حقیقت ہے وہ محسوس طور پہ سامنے آ جائے'

---

❶ ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ جانے والی تباہی۔ یہ تباہی کیا ہے؟ اس کے متعلق خدا سے بہتر سمجھانے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ (اس لیے ہم بتاتے ہیں کہ یہ واقع ہو کر رہنے والی تباہی کیا ہے اور وہ کیوں آئے گی۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اس قرآن میں' خدا کا ضابطہ قوانین' تمام صداقتوں کو اپنے اندر لیے ہوئے' مکمل ہو چکا ہے۔ (ایضاً)

اس کی یہ شرط ہے۔حق وہ ہے جو محسوس طور پر سامنے آنے والی چیز ہو۔اگر آپ انگریزی میں سمجھتے ہیں تو اس کے لیے Reality کا لفظ ہے۔یعنی اس میں Reality ہو۔اس Reality کے برعکس Illusion کا لفظ آتا ہے یعنی Reality وہ ہے جس میں Illusion نہ ہو۔ اسے کہا جائے گا حقیقت۔اور وہاں سے ہی یہ الحاقۃ ہے۔یہ حقیقت سے ہے۔الحاقۃ محسوس شکل میں سامنے آنے والی بات یعنی Reality کو کہتے ہیں۔اور پھر آپ جانتے ہیں کہ عربی زبان میں ''ال'' داخل ہو گیا ہو تو بس کہیے کہ یہ ایسے ہے جیسے The Reality ہے۔اس The کے ساتھ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ یہ وہی Reality ہے کوئی دوسری Reality نہیں ہے۔جب یہ The کا لفظ آجاتا ہے تو وہ Definite Article ہو جاتا ہے۔الحاقۃ تو کتنی ہی اہم بات ہے جو آگے بیان ہو رہی ہے۔

عزیزانِ من! اس کی اہمیت کے لیے قرآن کا یہ انداز ہے کہ کہا: **اَلۡحَآقَّةُ ۝ مَا الۡحَآقَّةُ** (69:1-2) الحاقۃ کی بات اب ہو گی کہ الحاقۃ کیا ہے؟ خود ہی سوال کیا جا رہا ہے کہ **وَمَا اَدۡرٰکَ مَا الۡحَآقَّةُ** (69:3) خدا کے سوا تمہیں کون بتائے گا کہ الحاقۃ کیا ہے' جس کا ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں۔یہ یاد رکھیے کہ قرآن میں جہاں ''**مَآ اَدۡرٰکَ**'' آیا ہے۔اس کے بعد آگے' اگلی ہی آیتوں میں' اس کا بیان ہوتا ہے کہ یہ ہے وہ چیز جس کا جواب تمہیں خدا کے سوا کون بتائے گا کہ الحاقۃ کیا ہے اور پھر بات ختم کر دی جائے۔اس کے متعلق آگے بتایا ہوتا ہے' آپ دیکھیے کہ اس کی اہمیت اندازِ بیان میں بھی کیسی ہے۔کہا کہ **اَلۡحَآقَّةُ ۝ مَا الۡحَآقَّةُ ۝ وَمَآ اَدۡرٰکَ مَا الۡحَآقَّةُ** (69:1-3) وہ حقیقتِ ثابتہ کیا ہے' وہ Concrete Reality (محسوس حقیقت) جس کا یہاں ذکر کیا جائے گا' وہ کیا ہے؟ اب یہ دیکھیے کہ اس کے بعد قیامت کے' اُخروی زندگی کے تغیرات کا' ذکر نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ کہا یہ جا رہا ہے کہ **كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ وَ عَادٌۢ بِالۡقَارِعَةِ** [1] (69:4) عاد اور ثمود کی قوموں نے اِس تنبیہ کو جھٹلایا۔ان سے کہا جاتا تھا کہ ایک کھٹکھٹا دینے والی چیز ہے جو تمہارا پیچھا کر رہی ہے' تمہارے پیچھے آ رہی ہے۔یہ قارعۃ ہے۔دو چیزوں کے باہمی ٹکرانے سے جو آواز نکلتی ہے اس ٹکراؤ کی آواز کو قارعۃ کہتے ہیں۔اور پھر کیا بات ہے ان عربوں کی! اس قسم کی وہ آواز' وہ تباہی' جو کسی کھیتی کو ویران کر دے' بے برگ و گیاہ کر دے' جس سے قوم کی کھیتیاں اجڑ جائیں' ویران ہو جائیں' اس قسم کے تزاحم' اس قسم کے تصادم' اس قسم کے ٹکراؤ کو وہ قارعۃ کہتے تھے۔قومِ ثمود اور عاد میں' ان کے انبیاء' ان سے کہتے رہے کہ تمہارے باطل کے نظام کا یہ نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا' مگر انہوں نے **كَذَّبَتۡ** (69:4) انہیں جھٹلایا۔انہوں نے کہا کہ کیا کہہ رہے ہو' ہم نے سب انتظام کر رکھے ہیں' ہماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔انہوں نے اس چیز کی تکذیب کی' اس بات کو جھٹلایا اور برملا کہا کہ تم غلط کہتے ہو' اس کا انجام یہ نہیں ہوتا۔

---

[1] یہ اسی قسم کی تباہی ہے جو ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے' اقوامِ سابقہ پر بھی آتی رہی (مثلاً) عاد اور ثمود کو تنبیہ کی گئی تھی کہ اگر وہ اپنی غلط روش سے باز نہیں آئیں گے تو ان پر کھڑ کھڑا دینے والی تباہی آجائے گی۔ انہوں نے اس تنذیر (Warning) کو جھٹلایا تو اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ (مفہوم القرآن۔پرویز)

عزیزانِ من! غلط نظام قائم کرنے والے اور اس خوش فہمی میں رہنے والے یہی کہتے ہیں اور اس پر عمل کرتے رہے ہیں کہ یہ اسی طرح سے رہے گا، یہ زوال پذیر نہیں ہوسکتا، فنا ہونا تو ایک طرف زوال پذیر بھی نہیں ہوسکتا، ہم نے سب انتظام کر رکھے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب وہ انجام آتا ہے تو **من حيث لا يشعرون** (16:26) ان راہوں سے آتا ہے جو تمہارا علم تو ایک طرف، وہ تمہارے شعور میں بھی نہیں ہوتیں۔ کیا بات ہے: شعور میں بھی نہیں ہوتیں! انہوں نے اپنے شعور کو غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہوتا ہے۔ ان کا شعور خالص ہوتا ہی نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ تباہی ان راہوں سے آتی ہے جو تمہارے شعور میں نہیں آسکتیں، اگر تمہارا وہ شعور خالص ہوتا، نگاہوں پہ پٹی نہ بندھی ہوئی ہوتی، تو تمہیں وہ راستے نظر آجاتے۔ آنے والا وہ جو قارعۃ تھا، وہ جو عذاب تھا، وہ تمہیں دکھائی دیدیتا، جیسے کسی قوم کی طرف لاوا آتا ہے۔ کیا ذکر کیا الحاقہ کا! حق کیا ہے؟ حقیقت کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے قرآن قومِ عاد و ثمود کی داستانیں بیان کرتا ہے۔

قومِ عاد و ثمود کی داستانیں

عزیزانِ من! قرآنِ حکیم نے کہا کہ قومِ عاد و ثمود کی داستانیں تم سے بیان کر چکے ہیں۔ اب یہاں وہ پوری داستانیں نہیں دہرائی جائیں گی۔ کہا جائے گا کہ وارن (Warn) کرنے والوں نے، آگاہ کرنے والوں نے، ان کو آگاہ کیا کہ تمہارے اس باطل نظام کا نتیجہ تباہی ہوگا مگر انہوں نے کہا کہ یہ غلط ہے، تم جھوٹ بولتے ہو ایسا نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے کہا کہ تم جانتے ہو **فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ** [1] (69:5)۔ یہاں کہا کہ ثمود کی داستان ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس کے بعد پھر کس طرح سے وہ تباہ ہوئی ہے، اس قسم کے عذاب سے وہ قوم ہلاک ہوئی ہے، یہ عذاب (طاغیۃ) تھا یعنی حدود فراموش تھا، آگے بڑھ کے، لپک کے، جھپٹ لینے والا جسے کہتے ہیں۔ یوں نظر آتا تھا کہ ابھی وہ بھیڑیا یا وہ شیر مجھ سے دُور ہے لیکن انہیں پتہ نہیں "طاغیۃ" دراصل لپک کے، جھپٹ کے، پکڑ لینے والا عذاب تھا۔ جب تباہی کا انجام قریب آتا ہے تو پھر وہ اسی طرح سے آتا ہے، لپک کر جھپٹ لیتا ہے۔ وہ اس عذاب سے پکڑیں گے **وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ** (69:6) اور وہاں اس قسم کا وہ جھکڑ چلا کہ اس نے قومِ عاد کی زندگی کا نام ونشان تک مٹا دیا۔ دیکھیے قوموں کا ذکر ہو رہا ہے۔ بتایا تھا کہ تمہیں خدا بتائے گا کہ الحاقۃ کیا ہوتا ہے۔ کہا: یہ ہے الحاقۃ۔ یہ ہے حق، یہ ہے حقیقتِ ثابتہ، جو محسوس طور پہ سامنے آگئی۔ اس طرح **سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ** (69:7) وہ آندھی ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلتی رہی۔ اس کے بعد صرف انہی کو نہیں بلکہ ان کے نام ونشان تک کو مٹا دیا۔

اسپین پر 6 سو سال مسلمانوں کی حکومت کا انجام

عزیزانِ من! پانچ چھ سو سال تک اسپین میں مسلمانوں نے اس انداز کی حکومت کی کہ تاریخ اس کی مثال نہیں بیان کرسکتی۔ آج بھی

---

[1] شدید کڑک کے ساتھ ایک ہیبت ناک زلزلہ آیا جس نے انہیں تباہ کر کے رکھ دیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اسپین کی عمارات ساری دنیا کے لیے وجہ جاذبیت بنی ہوئی ہیں۔ اس اسپین میں یہ جو الحمرا اور دوسری مسجدیں ہیں' انہیں دیکھنے کے لیے دنیا وہاں جاتی ہے۔ اس اسپین میں پانچ چھ سو سال تک حکومت کرنے والی قوم کی ایک بھی قبر وہاں موجود نہیں ہے۔ قرآن اس کے لیے لفظ **حُسُوۡمًا** (69:7) لایا ہے۔ تم تو ایک طرف رہے' تمہارا نام و نشان تک مٹا دیا۔ حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔ کہا کہ وہ کیا چیز تھی؟ کہا کہ **حُسُوۡمًا فَتَرَی الۡقَوۡمَ فِیۡہَا صَرۡعٰی** ❶ (69:7)

عزیزانِ من! اس سے اگلی بات بھی ہے کہ یوں نظر آ رہے تھے **کَاَنَّہُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِیَۃٍ** (69:7) جیسے کھجور کے تناور درخت جڑوں سے اکھیڑ کر رکھ دیئے گئے ہوں۔ عربوں کے ہاں تو کھجور ہی کی مثال ہے جس کی جڑیں سب سے زیادہ گہرائی میں ہوتی ہیں۔ یہ وہ درخت ہوتا ہے کہ عام آندھیاں تو اس کا کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتیں۔ عربوں کے ہاتھوں سے سندھ میں کھجور کے لگائے ہوئے یہ درخت ہزار ہزار سال سے قائم ہیں جب کہ اس وقت ہمارے ہاں کھجور ہوتی ہی نہیں تھی۔ کہا کہ اس قسم کے درخت کی طرح یہ قوم تھی اور اس قوم کے افراد یوں کھڑے ہوئے تھے' جو سمجھ رہے تھے کہ ہماری جڑیں مضبوط ہیں۔ نظر میں تو وہ ایسے ہی درخت تھے لیکن وہ اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے: **نَخۡلٍ خَاوِیَۃٍ** (69:7) اور اس کے بعد وہ ایسا جھکڑ آیا کہ وہ اس طرح گر گئے جس طرح کسی کو مرگی پڑی ہو۔ دراصل وہ اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے لیکن ان کو نظر نہیں آتا تھا کہ یہ کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ وہ ایک ہی لغزش سے' اس قسم کی ایک ہی آندھی کی تباہی سے' گر پڑے اور ایسے گرے جیسے جڑوں سے کھجور کے تنے اکھڑ گئے ہوں۔ اور اس کے بعد قرآن ہم سے پوچھتا ہے کہ **فَہَلۡ تَرٰی لَہُمۡ مِّنۡۢ بَاقِیَۃٍ** (69:8) کیا تمہیں ان میں سے ان کا کوئی نام و نشان بھی نظر آتا ہے؟ کہا: یہ ہے الحاقۃ۔ اب اس میں ہمارے لیے کیا راہنمائی ہے۔ قرآن نے عاد اور ثمود کا نظام مختلف مقامات پر تفصیلاً بیان کیا ہوا ہے۔ ثمود کے نظام کی سب سے بڑی چیز تو یہ تھی کہ ان کے ہاں چراہ گاہوں پر مویشی پالنے کا نظام تھا' اور چشموں پر قوم کے بڑے بڑے سرداروں نے قوت کے بل بوتے پر قبضہ کر رکھا تھا کہ صرف انہی کے جانور چریں' انہی کے جانور پانی پئیں۔ جب وہ نکل کر چلے جائیں تو جو کچھ باقی بچ جائے وہ غریبوں کے حصے میں آئے۔ یہ تھا وہاں کا اقتصادی اور معاشی نظام' یہ تھے وہاں کے طبقات۔ یہ کسی کے جانور کو قریب نہیں آنے دیتے تھے۔

حضرت صالح کی اذان

حضرتِ صالح علیہ السلام نے ان سے کہا تھا کہ تمہاری یہ روش غلط ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ پھر بتاؤ صحیح روش کیا ہے؟ کہا کہ صحیح روش یہ ہے کہ تم ان جانوروں اور مویشیوں کی نسبت اپنی طرف کر دیتے ہو کہ یہ فلاں سردار صاحب کا ہے' یہ فلاں جاگیردار صاحب کا ہے' یہ فلاں زمیندار کا ہے اور یہ فلاں' معاف رکھیے گا' فلاں جولاہے کا ہے' فلاں کمینے کا ہے' فلاں کا ہے۔ کہا کہ تم نے ان جانوروں کی نسبت ان کی

---

❶ اُس نے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ تو اگر وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ وہ کس طرح اوندھے منہ گرے پڑے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

طرف کس طرح سے کر دی اور اس کے بعد یہ زمین کہ یہ فلاں زمیندار کی ہے، یہ فلاں جاگیر دار کی ہے، اس پہ غریب کی کوئی بھیڑ بکری بھی نہیں آ سکتی۔ کہنے لگے کہ زمین کے اوپر یہ تقسیم کس بنا پہ کی؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ حضرت صالح نے اپنے ہاں زمین کا جو انتظام کر رکھا تھا وہ کیا تھا اور ان کی پیشکش کیا تھی؟ ان کا کہنا یہ تھا کہ آ ؤ اس معاملے میں ہمارا ساتھ دو۔ انہوں نے قرآن کے دو لفظوں میں کہا تھا کہ **هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ** (11:64) یہ زمین خدا کی زمین ہے اور یہ سارے مویشی خدا کے مویشی ہیں، خدا کے مویشیوں کو خدا کی زمین کے اندر چرنے دو۔ کیا تم اس کے چچا لگتے ہو؟

عزیزانِ من! قرآن نے زمین اور اس کے ذرائع کی ذاتی ملکیت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ ہر متنفس، ہر سانس لینے والا، جسے خدا نے پیدا کیا ہے، وہ خدا کا بندہ ہے، خدا کی مخلوق ہے۔ کہا کہ ارض بھی اللہ کی پیدا کردہ ہے، اس کی ملکیت ہے۔ وہاں حضرت صالح علیہ السلام کے ہاں تو معاملہ صرف مویشیوں کا تھا، اس لیے ناقۃ کا ہی لفظ آیا ہے۔ پھر نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں جو انقلاب متشکل ہوا ہے تو حضور ﷺ نے اس کی اور وسعت کی اور وہ یہ تھی کہ بندے خدا کے، زمین خدا کی ملکیت لہٰذا خدا کی زمین میں خدا کے بندے بے روک ٹوک چلیں گے۔ جب یہ کہا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ عاد کا یہ حشر کیوں ہوا، ثمود کا یہ حشر کیوں ہوا؟ قرآن نے یہ پہلے بتایا ہوا ہے۔

یہ داستانیں محض تاریخی واقعات نہیں

اب ہمارے لیے یہ داستان محض تاریخی واقعات نہ رہے بلکہ ان واقعات سے جو قرآن نے نتائج مستنبط کیے وہ ہمارے لیے زندگی کے اصول بن گئے کہ خدا کی پیدا کردہ چیز کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی، وہ تمام نوعِ انسانی کے لیے کھلی ہونی چاہیے۔ یہ اصول آ گیا۔ اس کے خلاف جو کچھ کوئی کرے گا تو اس کا یہ حشر ہو گا۔ یہ چیز نظری طور پر بیان نہیں کی بلکہ کہا کہ **اَلْحَآقَّةُ** (69:1) یہ ایسی حقیقت ہے جسے محسوس شکل میں تم دیکھ چکے ہو، تمہیں پتہ ہے کہ عاد کا کیا حشر ہوا تھا، اور ثمود کا کیا حشر ہوا تھا۔ اس زمانے کی عرب قومیں تو روز ان بستیوں سے گزر رہی تھیں۔ قرآن کہتا ہے کہ تم صبح شام ان کی بستیوں سے گزر رہے ہو۔ ان بستیوں کے کھنڈرات کی اینٹوں پر لکھی ہوئی داستان کو پڑھو کہ ان کا انجام کیا ہوا تھا۔ کہا کہ یہ ہے الحاقۃ۔ اب معلوم ہوا کہ حق کس کو کہتے ہیں، حقیقت کسے کہتے ہیں۔ کہا کہ **فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ** (69:8) کیا تو ان میں سے کسی کو بھی باقی دیکھتا ہے؟ نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔ اسی طرح **وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ** [1] (69:9)۔

---

[1] فرعون کا بھی یہی حشر ہوا۔ اور اُن دیگر اقوام کا بھی جو اس سے پہلے ہو گزری تھیں اور (قومِ لوط کے) خطا کاروں کا، جن کی بستیاں الٹ گئی تھیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

فرعون کی فرعونیت کا حشر

عزیزانِ من! کہا کہ اس سے پہلے تم فرعون [1] کا تکبر بھی دیکھ چکے ہو۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) تمام ذرائع رزق پر جو خدا نے اپنے بندوں کے لیے قائم کیے تھے' استکبار کی بناء پر' قوت کی بناء پر' شمشیر کے زور سے' ان کو اپنے قبضے میں لیا اور پھر اس کے بعد کہا کہ "کون ہے تمہارا رب' جس کو تم اپنا خدا بنائے بیٹھے ہو' ہم تمہارے رب ہیں۔ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُوْنَ (63:5) اور وہ قوت کے زور پر یہ چیزیں حاصل کرتے ہیں۔ جو بھی قوت کے زور پہ چیزیں حاصل کرتا ہے اس کا انداز یہی ہوتا ہے: وہ رب بنتا ہے۔ کہا کہ پھر دیکھ لیا کہ اس رب بننے والے کا انجام کیا ہوا۔ اس انجام کو دیکھو اور سمجھو کہ "اسے کہتے ہیں الحاقۃ۔"

حضرتِ لوط کی قوم کا انجام

قرآنِ حکیم نے کہا کہ قومِ لوط بے حیائی میں از حد آگے چلی گئی تھی۔ اب وہ جنسی معایب وذمائم کی طرف آیا۔ قومِ لوط نے ان حدوں کو تجاوز کیا تھا۔ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً (69:10) انہوں نے اپنے نشوونما دینے والے خدا کے رسولوں کی نافرمانی کی تو اس کے قانونِ مکافات نے انہیں سختی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ جس قوم نے بھی جب حدود سے تجاوز کیا پھر اس کا انجام بھی تم نے دیکھ لیا: مُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ (69:9) الٹی ہوئی بستیاں تھیں۔ قرآنِ کریم نے ہر واقعہ کے ساتھ یہ بتایا کہ مَا ظَلَمْنٰهُمْ (16:118) یہ نہ کہو کہ خدا نے ان پر یہ ظلم کر دیا تھا۔ یہاں تو عذاب کا تصور ہی یہ ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے کسی پر یہ آ جاتا ہے' خدا جس کو چاہے تباہ کر دے' جس کو چاہے زندگی دے' جس کو چاہے موت دے۔ قرآن کریم نے ہر تباہی کے بعد خود بتا دیا کہ اس کی وجہ ان کا یہ جرم تھا۔ کہا کہ "ہم کسی پہ ظلم نہیں کیا کرتے": وَلٰـكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (16:118) وہ اپنے آپ پر خود ظلم کیا کرتے تھے۔ اور پھر قرآن کا انداز یہ ہے کہ جو جابر اور مستکبر ظلم وزیادتی کرتا ہے' وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں یہ ظلم وزیادتی دوسرے پہ کر رہا ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہی تو غلط نگہی ہے' وہ دوسرے پہ نہیں' اپنی ذات پہ ظلم کر رہا ہوتا ہے۔ اور پھر اس ظلم کے ایک لفظ میں یہاں بات بتا دی کہ ان کے وہ کیا جرائم تھے' اس غلط نظام کی اہم خصوصیات کیا تھیں؟ اور کہا کہ ان جرائم اور غلط نظام کی وجہ سے یہ تباہی آئی ہے' یونہی نہیں آئی کہ بیٹھے بٹھائے خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ الٹ دو اور انہوں نے الٹ دیا۔ یہ چیز تو خود اس عمل کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے' جیسے سنکھیا کھانے سے' سنکھیے کے اندر یہ چیز ہوتی ہے کہ وہ ہلاک کر دیتا ہے۔ غلط نظام کے اندر یہ چیز ہوتی ہے کہ اس سے قوموں کی تباہی آتی ہے' مملکتیں تباہ ہوتی ہیں' حکومتیں الٹ جاتی ہیں اور یہ جس انداز سے الٹتی ہیں تو پھر تم خود دیکھ سکتے ہو کہ اس کا انجام کیا ہوا تھا۔ یہ ہے الحاقۃ!

---

[1] اس کی وضاحت وتفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرِ نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص۔ 109 (فٹ نوٹ نمبر 1)

اس کے برعکس جو لوگ خدا کے صحیح نظام پر ایمان رکھنے والے ہوتے ہیں' قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ان لوگوں کو ہم نے بچا لیا۔ **اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ** ❶ (69:11)۔قرآن نے کہا کہ حضرتِ نوح علیہ السلام کا قصہ یاد رکھو کہ جب سیلاب کی طغیانیاں آئیں تھیں تو کس طرح وہ غرقاب ہوئے لیکن وہ جو خدا کے صحیح نظام کی صداقتوں پر ایمان لائے ہوئے تھے وہ اس سے بچ گئے۔اب یہاں ایک لفظ بڑا غور طلب ہے۔

بات حضرتِ نوحؑ اور ان کی قوم کی ہو رہی ہے۔کہا یہ ہے کہ **اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ** (69:11) جب پانی حد سے بڑھ گیا' طوفان کی طغیانیاں لامحدود ہو گئیں' پانی اتنا زیادہ بڑھ گیا تو **حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ** (69:11)۔یہاں قرآن کہتا ہے کہ پھر ''ہم نے تمہیں'' کشتی میں سوار کرا لیا۔یہ ''تمہیں'' کون ہے؟ یہ وہی قرآن کا اصول ہے کہ ہم نے تمہیں کشتی میں سوار کرا دیا۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تو پتہ نہیں کتنے ہزار سال پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم تھی۔دنیا میں پہلے دن سے لے کر آخری دن تک جو قوم' جو فرد بھی خدا کی صداقتوں پر ایمان لاتا ہے' وہ ایک قوم بن جاتا ہے' وہ ایک گروہ بن جاتا ہے۔اس لیے کہا کہ بات نوح علیہ السلام کی ہے مگر کہا یہ کہ تم کو ہم نے کشتی میں سوار کرا لیا تھا۔قرآن کس قسم کی برادری بناتا ہے! ہم عصر اقوام ہی کی نہیں' مخاطب اقوام ہی کی نہیں کہ وہ انہیں تم کہے' وہ انسانیت کو کہتا ہے کہ **كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213) پوری نوعِ انسانی ایک برادری ہے' ایک امتِ واحدہ ہے' تو انسانیت میں یہی نہیں ہے کہ یہاں سے شروع کر کے امت بنائے' وہ تو آگے' پیچھے سے بھی جو انسانیت چلی آ رہی ہے اس میں بھی وہ دو فریق پیدا کر دیتا ہے: حزب اللہ اور حزب الشیطٰن۔خدا کے نظام کی صداقتوں پر ایمان رکھنے والی قوم' وہ حضرتِ نوحؑ کے زمانے کی ہو یا نبی اکرمؐ کے زمانے کی' یا ان کے بعد قیامت تک کے زمانے کی' جو بھی ان صداقتوں پر ایمان رکھے گی اسے وہ ہر دور میں ''تم'' کہہ کر پکارتا ہے اور اس نے صرف ہندوستان اور پاکستان میں ہی دو قومی نظریہ کی حقیقت کو واضح نہیں کر دیا' ایک عالمگیر صداقت بیان کر دی کہ وہ نوحؑ کے زمانے کے لوگ ہوں جو ان حقیقتوں پہ ایمان لائے تھے یا تم ہو' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یا قیامت تک آنے والے' یہ سارے ایک قوم کے افراد ہیں' اسی لیے تو ''تم'' کہہ کے پکارا گیا ہے۔تو یہاں برادری یا قوم بننے کی جو وجہ ہے' وہ ایمان کا اشتراک ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ پھر یہ غور طلب چیز ہے کہ اپنے ہم عصر انسانوں کے متعلق ہی نہیں' دنیا میں جب' جہاں' جس قوم نے' جس زمانے میں بھی' جو قوم بھی' ان حقائق پر ایمان لائی' وہ ایک برادری کے فرد بنے۔وہاں ابتداء حضرتِ نوحؑ سے ہوئی۔وہ اُن کے دور میں جو ''ملاء'' تھے' وہ بڑے بڑے متکبر تھے۔انہوں نے یہ کہا تھا کہ یہ لوگ جو ہمارے ہاں شودر ہیں' نیچ ہیں' کمینے ہیں' انہیں یا تو نکال دو یا نیچے بٹھاؤ پھر ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

---

❶ (جب طوفانِ نوح کے وقت) پانی کی طغیانیاں حد سے بڑھ گئیں تو ہم نے (اے جماعت مومنین! ان لوگوں کو جو تمہارے جیسا مسلک رکھتے تھے) کشتی میں سوار کرا لیا۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

کام کرنے والا کمینہ اوران کی کمائی پر پلنے والا سردار

عزیزانِ من! کام کرنے والے کو ہی ہمارے ہاں کمین کہا گیا ہے' اور پھر آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو بڑے بڑے تھے' وہ یہ اصطلاح کہاں سے لائے؟ نہیں معلوم تو سنو! ہمارے ہاں جو کمی ہے' اس کو کمینہ کہتے ہیں۔ کمی کے معنی ہیں کام کرنے والا۔ ان سرداروں اور زمینداروں کے نزدیک تو کام کرنا ہی بڑا کمینہ پن ہو گیا۔ ان کے ہاں بڑا تو وہ ہے جو خود کام نہ کرے' دوسرے کریں اور وہ بیٹھا ہوا کھائے۔ وہاں سے یہ کمی بنا' کمی سے یہ کمین بنا' کامی سے کمی کمین بنا اور پھر یہ شودر بن گیا۔ بیاہ شادیوں میں ایک ''لاگ'' ہوتا تھا۔ وہ ''لاگ'' نکالتے تھے جو پیسے کی صورت میں ہوتا تھا اوران کمی کمین کو دیا جاتا تھا۔ یہ جتنے بھی صنعت وحرفت والے کاریگر وہاں ہوتے تھے یعنی لوہار' ترکھان' کمہار' چوکیدار وغیرہ' یہ سارے کام کرنے والے کمینوں کی صف میں کھڑے ہوتے تھے اورانہیں بیاہ شادیوں کے موقعہ پر خیرات کے طور پر یہ کچھ رقم دیتے تھے اوران کو کمی کہا جاتا تھا یعنی کام کرنے والے۔ یہ حضرتِ نوحؑ کی داستان ہے جو پہلے شروع ہوئی ہے' اس میں یہ کمی کمین والی چیز تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ جو کمی تمہارے ساتھ ہیں' تمہارا ساتھ دینے کو ہم تیار ہیں لیکن کیا تم چاہتے ہو کہ یہ اور ہم ایک ہی پلنگ پہ بیٹھ جائیں' یہ ہمارے برابر بیٹھ جائیں۔ اب یا تو ان کو نیچے بٹھاؤ یا ان کو نکال دو' پھر ہم آئیں گے۔ جواب یہ تھا کہ **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ** (17:70) ہر انسان انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ اور کام کرنے والے کو تو حضور ﷺ نے حبیب اللہ فرمایا ہے' جسے تم کمی اور کمینہ کہتے ہو وہ تو خدا کا دوست ہوتا ہے۔

ایک خوبصورت حدیث

ایک حدیث میں ہے کہ کام کرنے والے کے کدال سے جو ہاتھوں میں گٹھے پڑ جاتے ہیں' فرشتے اسے چومتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ حضور ﷺ اس کمی اور کمینے کو اٹھا کے کہاں لے گئے۔ قرآن نے پہلا واقعہ طبقاتی تقسیم کا بتایا ہے اور پھر اس کے خلاف یہ انقلاب برپا کیا۔ کہا کہ یہ جو طبقاتی تقسیم تھی اس کا انجام غرقابی تھا۔ جو قوم بھی یہ کرے گی' غرق ہو جائے گی۔ غرق ہونے کا ذریعہ کچھ بھی ہو: خواہ وہ پانی کا طوفان ہو یا کہیں کا ایٹم بم آ جائے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ عاد اور ثمود کی ان اقوام کے جرائم گنائے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمہیں تو ہم نے کشتی میں سوار کرا کے اس غرقابی سے محفوظ رکھا لیکن وہ تباہ ہو گئے۔ کہا کہ **لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّ تَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ** [1] (69:12)۔

---

[1] (ہم نے اقوامِ سابقہ کے واقعات اس لیے بیان کیے ہیں کہ) یہ تمہارے لیے قانونِ مکافات کی تاریخی شہادتوں کا کام دیں اور گوشِ نصیحت نیوش (معقول بات سننے والے) انہیں اچھی طرح یاد رکھیں (12:111)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

قرآن کی یہ بیان کردہ داستانیں باعثِ عبرت ہیں

عزیزانِ من! یہاں قرآنِ کریم نے کہا کہ ہم نے یہ ساری داستانیں بیان کیں اور بتایا ہے کہ الحاقہ (69:3) کیا ہوتا ہے۔ اب یہ بات آئی کہ ہم نے تمہارے لیے یہ داستانیں کیوں بیان کیں ہیں؟ آپ جب بھی ہسٹری کی کوئی کتاب پڑھیں گے تو اس میں یہ کہیں نہیں لکھا ہوگا کہ تمہارے لیے یہ واقعہ اپنے اندر عبرت اور موعظت کی داستانیں رکھتا ہے۔ وہاں تو مورخین واقعات بیان کرتے چلے جاتے ہیں' وہاں تو مکافات کے قانون کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ قرآن تو تاریخ بھی اپنے ہی انداز کی بیان کرتا ہے۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد کہا کہ ان اقوام کی روشِ زندگی' ان کا انجام' ان کی تباہی' تمہارے لیے ''واعیۃ'' ہے' اپنے اندر عبرت رکھتی ہے اور اس لیے رکھتی ہے کہ تمہیں معلوم ہو کہ تمہارے جرائم کیا تھے۔ قرآن کا کیا انداز ہے! کہا کہ تَعِيَهَآ أُذُنٌ وَّاعِيَةٌ (69:12) یہ (تاریخی شہادتیں تمہارے لیے) گوشِ نصیحت نیوش ہوں۔ عزیزانِ من! ایک تو کہتے ہیں کہ اس کان سے سنی' اس کان سے نکال دی۔ یہ وہ بات نہیں ہے۔

لفظ واعیۃ کا قرآنی مفہوم

یہ لفظ آیا ہے ''واعیۃ''۔ یہ کسی چیز کو لے کر' وہاں اس طرح سے اکٹھا کرنا کہ جیسے کسی برتن میں کسی چیز کو ڈال کے' اس کے اوپر ڈھکنا دے دیا جائے۔ لہٰذا انسان کرتا یہ ہے کہ مال کو جمع کرتا ہے' تو یہ تو کوئی جرم نہیں تھا' مال اکٹھا کیا' پھر وہ اس طرح سے اس کو برتن میں ڈال کے رکھتا ہے کہ اس کی ہوا بھی کسی غریب تک نہ پہنچنے پائے۔ یہ ہے وہ لفظ جو یہاں آیا ہے۔ کہا کہ یہ ان کے لیے تذکرہ ہے جو گوشِ نصیحت نیوش ہیں' جسے غالب [1] نے گوشِ نصیحت کہا ہے کہ وہ جو کان میں بات کو ڈالیں اور پھر اس کے اندر محفوظ رکھ دیں۔ ان کے لیے ان واقعات کے اندر زندگی اور موت کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ یہ ہے وہ انقلاب جو آنے والا ہے اور یہ ہے وہ ٹکراؤ جسے القارعۃ (69:4) کہا گیا ہے' جس کے بعد الحاقہ کے انداز میں پھر وہ محسوس نتائج سامنے آنے والے ہیں۔ پھر وہ واقعات آئے: بدر کے میدان میں' احد کے میدان میں' حنین کے میدان میں' چھ سات سال تک مسلسل ٹکراؤ ہی ٹکراؤ ہوتا چلا گیا' اس ٹکراؤ کے نتیجے میں حق پر مبنی نظام کی باطل پر مبنی نظام پہ فتح تھی۔

1971ء میں انڈیا کے ہاتھوں ہونے والی شکست کی وجہ جواز اور ہماری اس شکست پر اندرا گاندھی کا تبصرہ

عزیزانِ من! بعض اوقات عجیب چیزیں سامنے آتی ہیں مثلاً انڈیا کے ساتھ ہماری 1971ء کی جنگ ہوئی۔ اس کے بعد آج تک ریسرچ ہو رہی ہے' تحقیق ہو رہی ہے کہ اس شکست کی کیا وجوہات تھیں؟ اس کا ذمہ دار کون تھا؟

---

[1] دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو' جو گوشِ نصیحت نیوش ہو۔

ہمارے ہاں یہ تحقیق ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی جب میں نے اندرا گاندھی [1] کا پہلا اعلان جو اس نے اپنی پارلیمان میں دیا تھا' سنا کہ یہ جو مشرقی پاکستان میں ہماری کامیابی ہوئی ہے' عام طور پہ آپ سمجھیں گے کہ یہ ہماری فوجوں کی کامیابی' ہمارے جرنیلوں کی کامیابی ہے' ہمارے لشکروں کی جو یہ ہماری فوج اور اس کے ہتھیار اور جرنیل ہیں اور یہ ذرائع ہیں' یہ ان کی کامیابی ہے۔ اس نے کہا کہ بالکل نہیں بلکہ یہ کامیابی ہے ایک حق کے نظام کی باطل کے نظام پر: ہم پاکستان سے کہہ رہے تھے کہ تمہارے ہاں غلط نظام قائم ہو رہا ہے' بچ جاؤ' انہوں نے ہماری نہ سنی' آج دنیا نے دیکھ لیا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ وہ تو بات سمجھ گئی کہ یہ ٹکراؤ دو نظاموں کا تھا' یہ دو نظام تھے جن کا ٹکراؤ ہوا تھا۔ اگلی بات یہ ہے کہ حق پہ کیا اور باطل پہ کیا؟ ہمارے ہاں تو کوئی نظام ہی نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ تو یہ بات سمجھ گئی۔ ہمارے ہاں اس وقت سے آج تک کئی کمیٹیاں بٹھائی گئیں' کمیشن بٹھائے جا رہے ہیں' تحقیقات ہو رہی ہیں' کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ کسی ایک نے یہ نہیں کہا کہ ہمارا نظام غلط تھا جسے شکست ہوئی ہے۔

عزیزانِ من! اور یہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (16:26) تمہارا دھیان ہی اس طرف نہیں جاتا کہ یہ تباہی' یہ ناکامی کیوں ہوئی ہے' تم اس میں خارجی اسباب اور خارجی ذرائع کی طرف توجہ دیتے ہو' وہ بھی ضروری ہوتے ہیں لیکن اصل چیز وہ ہے جو اس اندرا گاندھی (1917-1984) نے اپنے ہاں سمجھ لی تھی کہ یہ فتح ہے صحیح نظام کی باطل نظام پر۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ پاکستان کی بنیاد جب انہوں نے رکھی ہے' ان کے نزدیک وہ دعویٰ ہی باطل تھا کہ قومیت کا مدار ایمان پر ہوتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم بہتیرا ان کو سمجھاتے رہے کہ یہ نظام غلط ہے' یہ نہیں مانے۔ انہوں نے ہماری بات کی تکذیب کی' آج نتائج نے خود بتا دیا کہ وہ ہمارا حق تھا اور یہ حق کے نظام کی فتح ہے باطل کے نظام پر۔ وہاں تو یہ بات سمجھ میں آ گئی' ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی۔ اور قرآن یہ بتاتا ہے کہ یہ سارے واقعات تمہارے سامنے آئے ہیں' محسوس طور پر ان قوموں کا انجام تمہارے سامنے آ گیا۔ ان واقعات کو تاریخ کے واقعات کی طرح نہ پڑھ چھوڑو۔ یہ تو اپنے اندر سامانِ عبرت رکھتے ہیں لیکن اُس کان کے لیے جو اِدھر سے بات کو لے کر اُدھر سے نہ نکال دے' اس کو اپنے اندر محفوظ رکھے۔ کان میں محفوظ رکھی ہوئی چیز پھر دماغ تک پہنچتی ہے پھر دماغ اس کے سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور جو بات ہی اِدھر سے اُدھر نکل جائے تو پھر اس میں سوچ کا ہے کی ہو سکتی ہے۔ سوچنے کے بعد پھر انسان اس نتیجہ پہ پہنچے گا کہ تاریخ کی اہمیت ہے۔

قرآن کی نظر میں تاریخ کی اہمیت

عزیزانِ من! آپ دیکھیے کہ قرآن نے اس نکتہ نگاہ سے کتنی اہمیت بتائی کہ انسانیت کی ساری تاریخ باطل اور حق' غلط اور صحیح نظاموں کے درمیان ٹکراؤ کی تاریخ ہے۔ یہ ٹکراؤ ہوا کرتا ہے اور اس کے نتائج سے پھر آنے والی نسلیں یہ نتیجہ اخذ کر سکتی ہیں کہ کس قسم کا

---

[1] اندرا گاندھی (1917-1984)

نظام کامیاب ہوتا ہے اور کہاں شکست ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے ان سارے واقعات کے بعد یہ بتایا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ کافر کبھی مومنوں پر غالب رہیں۔ خدا یہ کبھی نہیں کرے گا۔ خدا نے یہ کہا ہے کہ غلط نظام کے حامل صحیح نظام والوں پر غالب نہیں آسکیں گے۔ یہ ہے تاریخ جو بیان کر رہی ہے' اور یہ ہے الحاقۃ جہاں سے اس سورۃ کی ابتداء ہوئی۔ اب آپ سمجھ جائیں گے کہ الحاقۃ کیا ہوگا؟ کہا ہے کہ اس چیز پر غور کرو' اس حقیقت پر غور کرو جو محسوس شکل میں تمہارے سامنے آئی تھی۔ کیا ہوتی ہے حاقۃ؟ **مَآ اَدْرٰکَ مَا الْحَآقَّةُ** (69:3) تمہیں خدا کے سوا کون بتائے؟ اور پھر خدا خود ہی کہتا ہے کہ آؤ ہم بتاتے ہیں کہ یہ کیا ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہوتی ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ **كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌ بِالْقَارِعَةِ** (69:4) ان قوم ثمود اور عاد سے لاکھ کہا گیا' بتیرا سمجھایا گیا کہ غلط نظام کا انجام بربادی اور تباہی ہوتا ہے' انہوں نے ایک نہ مانی۔ عزیزانِ من! یہ نہیں کہا کہ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ یہاں لفظ کذبت آیا ہے' جو یہ ہے کہ بات سمجھ میں تو آئی تھی لیکن وہ اپنے اِس غلط نظام اور اپنے نظام کے استحکام کے ذرائع اور اسباب پر اتنے مگن تھے کہ انہوں نے کہا: یہ غلط کہہ رہا ہے' یہ بات غلط ہے' ہم ان ذرائع کے بھروسے ابدی طور پر زندہ رہیں گے' مستحکم رہیں گے' آگے بڑھیں۔ قرآن نے کہا کہ وہ بستیاں دیکھ رہے ہو' وہ بتا رہی ہیں کہ ان کے کھجوروں کے محکم تنے کس طرح جڑوں سے اکھڑے اور ڈھیر ہو کے رہ گئے' اور ان کا نام ونشان تک مٹ گیا۔

عزیزانِ من! باطل پر مبنی نظام کا' ان قوموں کا' اس طرح نام ونشان تک مٹ جاتا ہے۔ قرآن تو اقوامِ انسانیہ کے استبداد و استخلاف کی داستان ہے' اور داستان صرف تاریخی واقعات کی نہیں ہے بلکہ یہ بتانے کے لیے ہے کہ کس قسم کا غلط نظام تباہ ہوتا ہے' کس قسم کا صحیح نظام کامیاب ہوتا ہے۔ سارے قرآنِ کریم کی داستان کا ملخص ہی یہ ہے۔ یہ ہیں وہ تغیرات جو اس دنیا میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ان تغیرات سے ہمارا تعلق

لہٰذا قرآن میں جو اس قسم کے تغیرات ہیں' جو خارجی کائنات میں آنے والے ہیں' وہ تو انسانوں کی' Scientists (سائنسدانوں) کی تحقیق' نتیجے پہ پہنچ کے بتائے گی وہ تغیرات بھی آئیں گے۔ قیامت کے تغیرات ہم نہیں جان سکتے کہ کیا ہوں گے۔ وہ جا کے دیکھیں گے۔ ہمارا تعلق قومی حیثیت سے ان تغیرات سے ہے جو غلط اور صحیح نظام کی بناء پہ واقع ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں صرف Theoretical یا Academic یا نظری طور پہ وہ بات نہیں بتائی گئی بلکہ اس نے حقیقت کے طور پر' محسوس انجام کی شکل کے طور پر' بیان کی ہے تاکہ کوئی غلط فہمی میں نہ رہے۔ اس میں کسی قسم کے مناظرے' مباحثے' اور مذاکرے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

عزیزانِ من! سورۃ الحاقۃ کی آیت 12 تک ہم آ گئے' آیت 13 سے آئندہ لیں گے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

نواں باب: سورۃ الحاقۃ (آیات 13 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج نومبر 1983ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحاقۃ کی آیت 13 سے ہو رہا ہے: (69:13)

قرآنِ حکیم کا پہلا انقلاب

اس سورۃ کی ابتداء ہوئی تھی: اَلْحَآقَّةُ o مَا الْحَآقَّةُ o وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْحَآقَّةُ (69:1-3) ایک واقعہ جو حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آنے والا ہے اور کہا ہے کہ وہ کیا ہے؟ خدا تمہیں بتاتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ اِسے پھر دہرا دوں کہ ان آخری دو پاروں میں قرآنِ کریم نے کچھ انقلابات کا تذکرہ کیا ہے۔ کچھ انقلابات تو وہ ہیں جو طبعی طور پر، اس باہر کی دنیا میں، نظر آنے والے ہیں مثلاً یہی کہ چاند پھٹ جائے گا، سورج تاریک ہو جائے گا، ستارے ٹوٹ جائیں گے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جہاں تک سائنس کے انکشافات ہیں، وہی

ان انقلابات کے صحیح معنی ہمیں بتا سکتے ہیں۔ آپ کو یاد ہے کہ میں نے موریس بکائے کی کتاب

The Bible , The Quran & and Science

کا ذکر کیا تھا۔ وہ بہت بڑا Scientist (سائنسدان) ہے۔ قرآنِ کریم کی یہ آیات جن کا تعلق خارجی کائنات کے طبعی امور سے ہے' اس شخص نے ان کا مطالعہ کیا اور ایک ایک آیت کا صحیح ترجمہ' صحیح مفہوم' بیان کرنے کے بعد اس نے یہ کہا کہ میں دنیا بھر کے Scientists (سائنسدانوں) کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ بتائیں کہ کیا یہ بات تیرہ سو سال پہلے' عرب کی سرزمین کا ایک اَن پڑھ شخص' اپنی طرف سے کہہ سکتا تھا جبکہ دنیا میں بڑے سے بڑا Scientist (سائنسدان) بھی اس نکتے تک نہیں پہنچ سکتا تھا جو اس نے کہا ہے' اور آج اس ڈیڑھ ہزار سال کے بعد جو ہم لوگوں نے سائنس کے انکشافات کیے ہیں وہ اس کی صداقت کی شہادت دیتے ہیں۔ تو یہ وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق علومِ سائنس سے ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ قرآن تو ذکر للعٰلمین ہے' تمام نوعِ انسان کے لیے ایک تذکرہ ہے۔ دنیا کی کوئی قوم ہو' کوئی فرد ہو' جو بھی اس طرح سے ان طبعی حقائق پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھائے گا' وہ بتا سکے گا کہ قرآن کی ان آیات کے مفاہیم کیا ہیں۔

عزیزانِ من! یہ یاد رکھیے کہ کوئی چیز ایجاد نہیں ہوتی بلکہ Discovery (بے نقاب) ہوتی ہے' اس کا اکتشاف و انکشاف ہوتا ہے' ان پر سے صرف پردہ اٹھانا ہوتا ہے۔

قرآن کا دوسرا اور تیسرا انقلاب

دوسرا انقلاب وہ ہے جس کا تعلق مرنے کے بعد کی زندگی سے ہے۔ اس انقلاب کے متعلق آج کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایک یقین کی بات ہے' ایک ایمان کی بات ہے۔ انقلابات کا تیسرا درجہ وہ ہے' جو قوموں کی زندگی میں آتا ہے' عروج و زوال کی شکل میں' تباہیوں کی شکل میں آتا ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر کہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ کیا حقیقت ہے جو' اب سامنے آنے والی ہے' بتایا ہے کہ یہ انقلاب حق اور باطل کی کشمکش تھی۔ نبی اکرم ﷺ کی دعوت اور اس کی مخالفت کی کشمکش تھی' جس میں شدید ترین مخالفت قریش کی طرف سے ہو رہی تھی۔ یہ بڑے بڑے ٹکراؤ تھے جو قریباً چھ سات سال تک مسلسل ان کے ساتھ جنگوں کی صورت میں جاری رہے۔ ان سے قدم قدم پہ کہا جاتا تھا کہ تمہارا نظام باطل ہے۔ یہ حقیقت میں دو نظاموں کا ٹکراؤ ہے' تم دیکھو گے کہ آخر الامر تمہارا نظام شکست کھا جائے گا کیوں کہ یہ باطل کی بنیادوں پر اٹھا ہوا ہے اور اپنی قوتِ استبداد و استحصال کی بنا پر وہ فریب یا مغالطے یا غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ وہ اس بات کا مذاق اڑاتے تھے کہ یہ ایک خانماں خراب ہے۔ نہ گھر نہ بار نہ کوئی فوج' نہ کوئی مملکت اور ہم سے کہہ رہا ہے کہ ہم تباہ ہونگے اور یہ کامیاب ہوگا۔ ان حالات میں یہ باتیں کہی جا رہی تھیں۔

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ پہلے تاریخی شہادات پیش کرتا ہے۔ پہلے ہی الحاقۃ کہنے کے بعد وہ فوراً' عاد اور ثمود اور قومِ لوط اور

فرعون کا ذکر کر رہا ہے۔ اس سے نظر آ گیا کہ یہ جو آگے انقلاب بیان ہو رہا ہے یہ قوموں کی تباہیوں کا اور عروج و زوال کا ہے۔ اس کا تعلق خارجی دنیا کے انقلابات سے بھی نہیں اور آنے والی آخرت کے انقلاب سے بھی نہیں کیونکہ درمیان میں وہ جو مثالیں دے رہا ہے' وہ یہاں کی' اقوامِ سابقہ کی' تباہیوں کی مثالیں ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کا انداز کیا ہے۔ تینوں قسم کے انقلابات کا ذکر قرآن میں ہے مگر وہ یہاں جو کہہ رہا ہے' وہ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آئے گی۔ اس کے بعد وہ اس کی تائید میں' اُن قوموں کے زوال اور عروج کی شہادات پیش کر رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس انقلاب کا تعلق قوموں کے عروج و زوال کے جو اصول قرآن نے بیان کیے ہیں' اُن سے ہے۔ اب ان سے پچھلی قوموں کی داستانیں دہرا کر کہا جا رہا ہے کہ وہ تم سے زیادہ شوکت و حشمت و اقتدار میں بالا تھیں' یہ تم خود دیکھ رہے ہو۔ تم ان کی تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات پر سے دن رات گزرتے ہو' تم اپنی محفلوں میں ان کی داستانیں بیان کرتے ہو' فرق اتنا ہی ہے کہ تم صرف ان داستانوں کو بیان کرتے ہو اور ہم یہ بتاتے ہیں کہ ان کا یہ حشر کیوں ہوا تھا۔ اور یہ بتاتے اس لیے ہیں کہ اگر تم نے بھی انہی جیسا نظام قائم کیا اور قائم کیا ہوا ہے' تو اس کا انجام بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ان لوگوں کا انجام ہوا۔ یہ بات قریش تک ہی نہیں ہے۔

واقعات ہنگامی ہوتے ہیں اور اصول ابدی

عزیزانِ من! قرآن قیامت تک تمام اقوامِ عالم کے انسانوں کے لیے ایک ضابطہ موعظت اور نصیحت ہے۔ وہ آج بھی یہ بتا رہا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کے اصول کیا ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اصول ابدی ہوتے ہیں' مگر واقعات ہنگامی ہوتے ہیں۔ تاریخ میں مورخین ہمیشہ واقعات بیان کرتے ہیں' ان کے اسباب و علل بیان نہیں کرتے۔ وہ یہ تو بتائیں گے کہ فلاں قوم کو شکست ہوگئی' وہ بتائیں گے کہ اتنی فوج تھی' اتنا اسلحہ تھا' اتنی کمزوری تھی' ان کے ہاں یہ Strategic Weakness (حکمتِ عملی کی خامی) تھی وغیرہ وغیرہ۔ قرآن یہ بتائے گا کہ ان کے نظام میں کیا خرابی تھی جس کی وجہ سے وہ قوم تباہ ہوئی ہے۔ اور یہ ہے وہ چیز جس کا تعلق قیامت تک آنے والے انسانوں سے ہے کہ ہر قوم یہ دیکھ لے کہ ہمارا نظام اس قسم کا تو نہیں ہے۔ اس اعتبار سے اس کا تعلق ہمارے ساتھ بھی ہے' آنے والی قوموں کے ساتھ بھی ہے۔

قیامت میں صور پھونکنے سے مراد کیا ہے

عزیزانِ من! یہ کچھ کہنے کے بعد ان قریش سے کہا گیا کہ **فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ o وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً** (69:13-14) [1]۔ ان دو آیات کے عام تراجم میں یہی بات کہی گئی ہے کہ جب صور

---

[1] جب اعلانِ جنگ کا بگل پہلی بار بجایا جائے گا' اور بڑے بڑے لیڈر اور ان کا لاؤ لشکر' سب تباہ کر دیئے جائیں گے اور ایک ہی حملہ میں (سردارانِ قوم) کی سرکشی اور تکبر کا بھرکس نکال کر رکھ دیا جائے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

پھونکا جائے گا۔ یہ چیز ہمارے ہاں ہمیشہ قیامت کے لیے اٹھا رکھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ وہاں ایک فرشتہ ہے۔ وہ پہلے صور پھونکے گا۔ وہ صور' بگل بجانے کے لیے' سینگ جیسی ایک چیز ہوتی ہے۔ اس زمانے میں یہ بگل تو نہیں ہوتے تھے' قرنا ہوتا تھا' وہ ایک لمبا سا سینگ تھا۔ اس میں پھونکتے تھے تو اس سے آواز نکلتی تھی۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ قیامت میں جب مردے اٹھائے جائیں گے تو وہ فرشتہ' جس کا نام اسرافیل ہے' پہلے وہ قرنا میں صور پھونکے گا۔ آواز آئے گی۔ ایک دفعہ آواز آئے گی تو وہ ایک دفعہ کی آواز پہ نہیں اٹھیں گے پھر جب وہ دوسری دفعہ زور سے پھونکے گا تو پھر سب اٹھ کھڑے ہونگے۔ صور سے مراد وہ قرنا لی جاتی ہے۔

عزیزانِ من! دراصل صور سے مراد جنگ کے زمانے میں فوجوں کے اعلان کے لیے بگل کا بجایا جانا ہے۔ عرب اس کو بھی صور کہتے ہیں۔ یہ دوسری چیز ہوگئی۔ اس طرح اس دنیا کی جو آپس میں جنگیں ہوتی تھیں' ان میں جسے جنگ کا بگل بجانا کہتے ہیں' یہ بھی اس کے معنی ہوسکیں گے۔ اس کے ایک تیسرے معنی ہیں' ان میں وہ مفہوم مجازی لیا جاتا ہے یا حقیقی لیا جاتا ہے۔ صور کا یہ لفظ صورت کی جمع بھی ہے اور صورت کے معنی ہوتا ہے پیکر' جسے ایک ڈھانچہ کہا جاتا ہے' جسے پیکرِ بے جان کہا جاتا ہے۔ نفخ کا یہ لفظ قرآن میں آتا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں توانائی پیدا کرنا۔ انسانی بچے کے لیے قرآنِ کریم نے یہی لفظ استعمال کیے ہیں۔

مردہ قوموں میں توانائی کا ظہور ہوگا

آدم کے لیے بھی اس کے معنی ایک ایسا انقلاب ہیں جس میں مردہ قوموں میں ازسرِ نو توانائی کی روح پھونکی جائے گی۔ اب اگر تاریخ کے شواہد کے ضمن میں یہ بات آئے گی تو اس کا یہ مفہوم ہوگا۔ اور قرآن نے مختلف مقامات پہ یہ کہا ہے۔ قوموں کو مردہ قومیں کہا ہے۔ اور یہ تو ہمارے ہاں بھی محاورہ ہے: یہ مردہ اقوام یعنی وہ مردہ یہ نہیں کہ قبروں کے اندر وہ لوگ ہوتے ہیں۔ وہ قوم زندگی کی توانائیوں سے محروم ہوتی ہے' چلتی پھرتی تو ہے لیکن وہ زندگی کی توانائیوں سے محروم ہوتی ہے۔ ان کو ازسرِ نو زندگی عطا کرنا' یہ ہے جس کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ تو یہاں جو صور ہے وہ ہے جسے ہم اردو میں صور کہتے ہیں۔ یہ صورت کی جمع ہے یعنی اسے یوں کہیے کہ بے جان پیکروں میں ازسرِ نو توانائی پھونکی جائے گی۔ اب وہ ٹکراؤ ہے۔ اس کے ذریعے ایک نہایت قلیل سی تعداد والی' کمزور سی' بے بس سی' بے کس سی' مہاجر سی' ایک جماعت میں' اتنی توانائیاں عطا کی گئیں کہ انہوں نے قیصر ❶ و کسریٰ ❷ جیسی سلطنتوں کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ یہ سلطنتوں کی تباہی نہیں ہے' یہ ان کے غلط نظام کی شکست و ریخت ہے۔

---

❶ قیصر: شاہ روم کا لقب۔ واضح رہے زبان رومی میں قیصر اس بچے کو کہتے ہیں جس کی ماں اُس بچے کے جننے کے دنوں میں مر جائے اور پھر اس عورت کا پیٹ چاک کر کے وہ بچہ نکالا جائے۔ چونکہ پہلا بادشاہ روم کا اغسطوس نامی اسی طرح سے پیدا ہوا تھا اس لیے اس کا خطاب قیصر ہوا۔ اُس روز سے اب ہر بادشاہ روم کا لقب ہوگیا۔ (حوالہ: لغات کشوری' ص ص۔ 374 - 373)

❷ کسریٰ: شاہانِ عجم کے ہر بادشاہ کا لقب۔ فارس اور مدائن کے بادشاہوں کا لقب۔

قرآنِ حکیم کا فلسفہ تاریخ

میں پھر عرض کردوں کہ قرآن کا فلسفہ تاریخ یہ ہے کہ اقوام کی تباہی کا باعث ان کا غلط نظام تھا اور وہ غلط نظام ملوکیت کا تھا: انسانوں کا انسانوں پر حکومت کرنا۔ قرآن کی رو سے سب سے بڑا جرم یہ ہے جس کا نتیجہ سب سے بڑی تباہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان پہ حکومت کرے۔ تو کہا کہ اس کے بعد کیا ہوگا: وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (69:14)❶۔ یہاں اگر مراد طبعی دنیا سے ہو تو اس کا عام ترجمہ یہ کیا جائے گا جیسا کیا جاتا ہے کہ جب زمین کو اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا اور ایک ہی مرتبہ وہ توڑ دیئے جائیں گے۔ یہاں میں ایک چیز عرض کروں کہ یہ واقعات جو خارجی دنیا میں ہونے کے ہیں' صحیح ہیں۔ سائنسدان تو اب آہستہ آہستہ اس نتیجے پہ پہنچ رہے ہیں کہ ایک دن یہ کرّے ٹکرائیں گے' پاش پاش ہو جائیں گے' تاریکیاں چھا جائیں گی۔ یہ ٹھیک ہے لیکن یہ ایک Scientific (سائنسی) معلومات کی بات ہے کہ ایسا ہوگا۔ ہمارے اعمال کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے کہ آج سے کروڑ سال کے بعد یہ زمین پھٹ جائے گی اور ستارے ٹوٹ جائیں گے' مجھ پہ اس کا کیا اثر ہے؟ اور اس زمانے میں جو لوگ ہونگے بھی اگر یہ ساری زمین تہس نہس ہو جائے گی' وہ بھی ساتھ تہس نہس ہو جائیں گے۔ اصل چیز جو قرآن کا پیغام ہے وہ اس کی تعلیم ہے اور تعلیم کا تعلق زندگی سے ہے' خواہ فرد کی زندگی ہو یا اقوام کی زندگی ہو۔ اس لیے میں ان انقلابات کو' جہاں تک قرآن اس کی تائید کرتا ہے' قوموں کی زندگی سے ہی متعلق سمجھتا ہوں۔ اس کی تائید عربی زبان کے الفاظ کے مجازی معنی کرتے ہیں' جو ان کے ہاں کے لغت میں' ان کی زبان میں' موجود ہیں۔ میں نے اپنے لغات القرآن میں ان کی تائید اور سند سے معنی دیئے ہیں۔ یاد رکھیے قرآن عربی مبین میں نازل ہوا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کے کسی لفظ کے جو معنی ہمارے جی میں آئیں' ہم وہ معنی کر دیں۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ ان معنی میں عربی زبان کی سند حاصل ہونی چاہیے۔ قرآن کی جو کلی تعلیم ہے اس کے اندر ان معنی کو fit in (موزوں) ہونا چاہیے۔

قرآنی الفاظ کا مفہوم متعین کرنے کا طریق

عزیزانِ من! میں یہ عرض کردوں کہ میں نے ساری عمر' اور ساری عمر سے مراد اب قریب پچاس سال کا عرصہ ہو چلا ہے' قرآنِ کریم پڑھا' وہ اتنی سی تو کتاب ہے' پچاس سال کے عرصے میں اس پہ غور کیا ہے۔ اس کا طریقہ یہی تھا کہ اس کے الفاظ کے وہ معنی لیے جائیں جو عربوں کے ہاں زمانہ نزولِ قرآن میں مستعمل تھے۔ اس کی سند وہاں سے حاصل ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ جس طرح سے میرا جی چاہے

---

❶ ایک ہی حملہ میں' سردارانِ قوم اور ان کے لاؤ لشکر (الجبال) کی سرکشی اور تکبر کا بھرکس نکال کر رکھ دیا جائے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

میں نے معنی پہنا دیئے اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں جہاں ان الفاظ کا استعمال کیا ہے' اس کی تائید حاصل ہونی چاہیے۔ اب یہاں جو ارض اور جبال آیا ہے' اس کے جو لفظی معنی لیے جائیں گے' تو ان میں ارض زمین کو کہیں گے اور جبال پہاڑوں کو کہیں گے لیکن اس آیت میں یہ معنی fit in (موزوں) نہیں ہوتے۔ یہاں قومِ ثمود' عاد اور نوح کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے اکابرین کو پہلے **حملت** کہا۔ بڑے بڑے سردارانِ قوم کہا گیا ہے۔ ان کے ہاں بڑے بڑے صاحبِ قوت و اقتدار تھے۔ اُن کا ذکر چلا آ رہا ہے کہ وہ کس طرح تباہ ہوئے۔ اس کے فوری بعد یہ بات کہنا کہ یہ زمین پھٹ جائے گی' یہ پہاڑ ٹوٹ جائیں' تو اِن میں ربط نہیں مل رہا۔ اسی زبان میں ارض اور جبال کے یہ معنی موجود ہیں۔ ''**حملت**'' کے معنی ہوتا ہے کسی کو اپنی جگہ سے دھکا دے کر ہٹا دینا۔ ''ارض'' پست لوگ ہوتے ہیں اور ''جبال'' جن کے کھونٹے پہاڑوں کی طرح گڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی جگہ سے کوئی نہیں ہلا سکتا۔ یہ ان الفاظ کے مجازی معنی ہیں۔ یعنی وہ اس قدر محکم ہیں کہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمیں اپنی جگہ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا ہے۔ ''ارض'' اتنے پست کہ وہ بیچارے روندے ہی جائیں' ان کو کبھی یہ توقع ہی نہ ہو کہ ہم بھی سر اٹھا سکیں گے۔

عزیزانِ من! اب دیکھیے قرآن تین لفظوں میں یہ کیا بات کہہ گیا ہے کہ اس کے بعد وہ ٹکراؤ جو ہونے والے ہیں' ان سے ان کمزور قوم کے بے جان پیکروں میں توانائیاں پھونکی جائیں گی۔ آگے یہ ہے کہ ان پست لوگوں یعنی ارض کو جنہیں یہ روندتے ہوئے چلے جا رہے ہیں' اپنی جگہ سے ''ہلا دیا'' جائے گا۔ ان کے ہلانے کے معنی ہیں ''اونچا کر دینا''۔ کہا کہ پہاڑوں کی طرح جو اپنے آپ کو مستحکم سمجھتے تھے' ان کو اپنی جگہ سے ہلا دینا' انکا اقتدار چھین لینا ہے' ان کی قوت چھین لینا ہے۔ کہا یہ ہے کہ اب جو انقلاب یعنی ''الحاقۃ'' آنے والا ہے' اس میں ان کو جو بڑے بڑے پہاڑوں کی طرح اپنے آپ کو محکم اور مستحکم سمجھتے تھے' بنیادوں تک ہلا دیا جائے گا اور یہ جو پستیوں کے گڑھوں میں گرے ہوئے ہیں ان کو اٹھا کے سربلند کر دیا جائے گا اور یہ ایک دم ایسا ہلا بولے گا کہ یہ جو پہاڑوں جیسے مستحکم بنے پھرتے ہیں' وہ ٹکڑے ٹکڑے' پاش پاش کر کے رکھ دیئے جائیں گے۔ اس کے فوراً بعد کہا کہ **فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ** (69:15) یہ ہے وہ دن جس دن وہ واقعہ ہوگا' جس کا ذکر ہم شروع میں کر آئے ہیں کہ وہ چیزیں جو آج محض نظری طور Theoratically' تمہارے سامنے آ رہی ہیں' وہ ایک حقیقت بن کر تمہارے سامنے آ جائیں گی۔ کیا انداز ہے قرآن کا!

عزیزانِ من! کلمۃ اللہ کے متعلق وہ ان سے کہتا جا رہا ہے کہ یہ خدا کا قانون یعنی کلمۃ اللہ ہی غالب رہے گا۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ قرآن نے سنۃ اللہ بھی کہا ہے: **وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا** (48:23)❶۔ کلمات لفظی معنوں میں' نظری طور' پہ In Theory قانون ہوتے ہیں۔ جب تک یہ In Theory (نظری طور پر) رہتے ہیں' وہ کلمہ کہلاتے ہیں اور جب وہ عمل میں آ جاتے

---

❶ اور خدا کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں' ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہیں تو وہ سنت کہلاتے ہیں۔ یعنی جب محسوس شکل میں اس کے نتائج سامنے آئے اسی کلمہ کو تو سنت اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جو خدا کے قانون کا عملاً سامنے آجانا کہلاتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس قانون نے اپنا نتیجہ مرتب کر دیا ہے۔ اسے Pragmatic Test (عملی آزمائش) کہتے ہیں۔

قرآنی لفظ سماء کا مفہوم

یہ ہے وہ واقعہ جو الحاقہ کی شکل میں سامنے آئے گا۔ اسی لیے کہا کہ وَ انۡشَقَّتِ السَّمَآءُ فَہِیَ یَوۡمَئِذٍ وَّاہِیَۃٌ ❶ (69:16)۔ عزیزانِ من! کیا لفظ ہے سما! اگر سما کے معنی آسمان لیے جائیں گے تو آسمان کوئی شے ہے ہی نہیں' یہ تو حدِ نگاہ ہے۔ یہ جو فضا کے کرّے ہیں' آپ انہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ سما ہیں لیکن پھر وہی بات ہے کہ اس ربط کے اندر یہ معنی فٹ ان (Fit- In) نہیں ہوتے۔ سماء کے معنی ہی بلندیوں پر اٹھے ہوئے لوگ ہیں۔ وہ اپنے آپ کو طرہ باز خان سمجھتے ہیں یعنی ایسے جو کسی کو اپنی خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کی یہ کیفیت لفظ واھیۃ نے واضح کر دی۔ واھیۃ کے معنی ہوتے ہیں ''وہ بندشیں' جن کے ساتھ بندھے ہوئے کوئی مضبوط اور محکم ہوتا ہے' ان بندشوں کو ڈھیلا کر دینا۔'' یہ جو بڑے بڑے بنے پھرتے ہیں' یہ تنہا نہیں ہوتے' ان کے بہت سے ذرائع اور اسباب ہوتے ہیں جو انہوں نے اپنے ساتھ بڑی محکمیت سے' بڑی مضبوطی سے' باندھ رکھے ہوتے ہیں۔ وہ ان کی قوت اور اقتدار کے اصلی سبب ہوتے ہیں۔ آپ قرآن کا ایک ایک لفظ دیکھیے۔ یہاں لفظ آیا ہے واھیۃ کہ ان کی بندشیں ڈھیلی کر دی جائیں گی' وہ جن ذرائع اور اسباب کی بناء پر اتنے محکم بنے پھرتے تھے' وہ بندشیں ڈھیلی ہو کر کمزور ہو جائیں گی۔

عرش کا مفہوم

عزیزانِ من! آگے ایک بات ہے جس کا مفہوم ابھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہے۔ کہا کہ وَالۡمَلَکُ عَلٰۤی اَرۡجَآئِہَا وَ یَحۡمِلُ عَرۡشَ رَبِّکَ فَوۡقَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ ثَمٰنِیَۃٌ ❷ (69:17)۔ خدا کے عرش کے معنی یہ نہیں کہ کوئی کسی قسم کا تخت ہے خواہ وہ لکڑی کا بنا ہوا ہو یا تختِ طاؤس ہو۔ خدا کے لیے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اس قسم کے تخت پر بیٹھا ہوگا۔ روایات کی رو سے جو عرش کا مفہوم ہے وہ کئی دفعہ سامنے آچکا ہے۔ وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پہاڑی بکروں کے سینگوں کے اوپر خدا کا وہ تخت ہے اور پھر جب خدا اس پہ بیٹھتا ہے تو اس میں سے ایسے چرچر کی آواز نکلتی ہے جیسے اونٹ کے بیٹھتے وقت آواز نکلتی ہے۔ یہ ہے جو احادیث کے اندر عرش کے معنی دیئے ہوئے ہیں۔ یہ معنی اس خدا کے متعلق ہیں جو کہتا ہے کہ ہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ (57:4) تم جہاں بھی ہو ہم تمہارے

---

❶ اس وقت ہر سر بلند' متکبر کی قوت پاش پاش ہو جائے گی اور ہر مستبد کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔

❷ اور کائناتی قوتیں اسے ہر طرف سے گھیرے ہوں گی اور خدا کے نظامِ ربوبیت کا مرکزی کنٹرول آٹھ شعبوں میں بٹا ہوگا۔

ساتھ ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! عرش کے معنی اقتدار کا Centre (مرکز) ہوتا ہے' پورا کنٹرول ہوتا ہے۔ خدا نے یہی کہا ہے کہ اس نے کائنات کو پیدا کیا اور اس کا رگہ کائنات کا مرکزی کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا۔ **ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ** ❶ (7:54)۔ یہاں استویٰ کا لفظ آیا ہے۔ استویٰ کے معنی ہوتا ہے "لغزش کھانے سے محفوظ رہنا" اپنی جگہ سے نہ ہلنا یعنی اس میں لغزش کھانے یا اپنی جگہ سے ہلنے کی یہ بات نہیں ہوگی' اس میں خدا کا کنٹرول ❷ ہے' کسی قسم کی جھول یا بندش کا ڈھیلا پن نہیں ہوگا۔" **یَوۡمَئِذٍ تُعۡرَضُوۡنَ لَا تَخۡفٰی مِنۡکُمۡ خَافِیَۃٌ** (69:18) اس دن تم سب نکھر کر سامنے آجاؤ گے' تمام راز فاش ہو جائیں گے اور پھر تمہاری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں رہے گی۔

ہر سانس میں قیامت موجود ہے

آپ اسے' خواہ اس دنیا میں جو قوموں میں انقلاب آتا ہے' وہ یوم حساب لے لیجیے یا مرنے کے بعد کی زندگی کا یومِ حساب لیجیے' مگر یومِ حساب یہاں بھی ہوتا ہے' ہر آن ہوتا رہتا ہے' ہر سانس میں انسان میں قیامت موجود ہے۔ ویسے یہ موت بھی یکا یک نہیں آتی۔ اگر ایکسیڈنٹ ہو جائے تو یہ اور چیز ہے ورنہ طبعی موت بھی یکا یک نہیں آتی۔ ہر سانس میں انسان یا تو زندگی پیدا کرتا ہے یا موت کی طرف جا رہا ہوتا ہے۔ طبعی موت بڑی Gradually آتی ہے' بتدریج آتی ہے' فوراً نہیں آتی۔ یہ حساب ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح سے قوموں کا حساب ہوتا ہے۔ وہ قوم ایک ہی دن میں نہیں گر جاتی' وہ بڑی آہستہ آہستہ' بتدریج زوال کی طرف جاتی ہے۔ مغلیہ سلطنت اتنی جاہ وحشمت کی سلطنت تھی۔ اس جیسی دنیا میں کسی نے کم دیکھی ہوگی۔ ایک براعظم کے اوپر یہ حکومت سینکڑیوں سال' صدیوں تک' رہی۔ اس کے بعد تاریخ لکھنے والے یعنی مورخ کہتے ہیں کہ جی! اورنگ زیب (1618-1707) کے بعد جو زوال ہوا تو اس کے بعد بھی اس نے آخری دیا گل ہونے کے وقت تک قریباً ڈیڑھ سو سال لے لیا' تو یہ انقلاب Gradually (بتدریج) آہستہ آہستہ' ایک Accumulative Effect ہوتا ہے' اجتماعی اثر ہوتا ہے' جس سے پھر وہ قوم موت کی طرف چلی جا رہی ہوتی ہے اور پھر ایک دن وہ گر جاتی ہے۔

ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہو کر رہتا ہے

قرآن' قوموں کو اس دوران میں جب وہ بتدریج اپنی تباہی کی طرف جا رہی ہوتی ہیں' وارننگ دیتا ہے کہ سنبھل جاؤ تو بچ جاؤ گے' ورنہ گڑھے میں گر جاؤ گے۔ یہ ہے وہ حساب جو ہوتا رہتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس مجموعی اثر کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے انسان اپنے

---

❶ پھر اس (کائنات کی پستیوں اور بلندیوں) کا مرکزی کنٹرول خود اپنے دستِ قدرت میں رکھا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) نے اپنی مشہور تصنیف "المفردات فی غریب القرآن" میں لکھا ہے کہ اِسۡتَوٰی عَلٰی میں کسی غلبہ وتسلط کا مفہوم ہوتا ہے۔

آپ کو بھی دھوکا دے سکتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں چھیڑ نہیں سکتا' کوئی نہیں ہلا سکتا۔ وہ دوسروں کو بھی دھوکا دے سکتا ہے کہ وہ جو کچھ اپنے آپ' فریب سے' غصب سے' استحصال سے' کر رہا ہے' اس کے بارے میں کوئی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ اس کے متعلق خواہ کچھ معنی ہی پہنا دے کہ یہ ہم سب کچھ تمہارے فائدے کے لیے' قوم کے فائدے کے لیے' ملک کے فائدے کے لیے کر رہے ہیں۔ قرآن نے کہا کہ جب وہ انقلاب کی گھڑی آتی ہے تو پھر کوئی بات چھپی ہوئی نہیں رہتی۔ مشکل یہ ہے کہ اربابِ اقتدار کا استبداد ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی کو اصلی بات کہنے ہی نہیں دیتے۔ آپ دیکھیے ان کے مرنے کے بعد جو تاریخیں لکھی جاتی ہیں' دیکھیے کس طرح ان کے حساب سامنے آتے ہیں۔ پھر تو ایک ایک شخص اپنے ہاتھ میں کاغذ لیے بولتا چلا جاتا ہے کہ اس نے یہ بھی کیا تھا' اس نے وہ بھی کیا تھا۔ یہ تو عام حالات میں ہے اور قرآن کہتا ہے کہ کوئی بھی بات چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔ اب یہ دیکھیے کہ آگے دو قسم کے گروہ آتے ہیں۔ میں پھر عرض کروں کہ آپ اس دنیا میں قوموں کے زوال کو لیجیے یا آخرت کی زندگی کو لیجیے۔ بات یہی ہے۔ ان دو گروہوں میں سے پہلے ایک گروہ کے بارے میں کہا کہ فَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَہٗ بِیَمِیۡنِہٖ فَیَقُوۡلُ ہَآؤُمُ اقۡرَءُوۡا کِتٰبِیَہۡ [1] (69:19)

بڑے خوبصورت الفاظ اس آیت میں آئے ہیں۔ دایاں ہاتھ عربی زبان میں یمین ہے۔ یا اس کے لیے یمن وسعادت کا لفظ ہے۔ یہ ہمارے ہاں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بابرکت یا سعادت مند کے لیے یمن کہتے ہیں۔ یہاں سے دایاں ہاتھ یمین ہوتا ہے جو برکت و سعادت کے لیے ہے اور ''شمال'' بایاں ہاتھ ہوتا ہے۔ اسے محاورے کے اعتبار سے منحوس کہتے ہیں تو ان کے عربی زبان کے محاورے کے اعتبار سے یہ کہا گیا ہے کہ جس کا حساب کا کاغذ' جو اس کی Account Book ہوگی' اس کے یمن وسعادت کے ہاتھ میں ہوگا' وہ سب کو دکھاتا پھرے گا کہ لو! میرا نامۂ اعمال پڑھو۔ آپ دیکھیے کہ اس کے بعد کیا کہا ہے؟ کہ یہ کہے گا جب یہ رزلٹ آؤٹ ہوتا ہے تو لڑکوں کو وہ رزلٹ کی چٹ ملتی ہے۔ ان میں یہ دیکھیے کہ جو فسٹ ڈویژن میں ہو یا جو فسٹ آیا ہو' اس بچے کی کیفیت ذہن میں رکھیے کہ وہ ہال کے کمرے سے ناچتا کودتا ہوا نکلتا ہے اور ہر ایک کو دکھاتا ہے کہ یہ دیکھو تو سہی' میں نے اتنے نمبر حاصل کیے۔

خوشی اور مسرت کا دارومدار

قرآن کا کہنا یہ ہے کہ جس کے یمن وسعادت کے ہاتھ میں اس کا اکاونٹ ہوگا وہ سب کو دکھاتا پھرے گا: ارے دیکھو! میرا حساب دیکھو! میرا حساب دیکھو!!! یہ کیا الفاظ ہیں: او دیکھو تو سہی میرا حساب! یہ کیوں ہوا؟ اس نے ایسے عمدہ نمبر کیوں حاصل کیے' یہ آج کیوں اتنا خوش ہے کہ ہر ایک کو دکھاتا ہے کہ میرا حساب دیکھیے؟ اس لیے کہ اِنِّیۡ ظَنَنۡتُ اَنِّیۡ مُلٰقٍ حِسَابِیَہۡ (69:20) راز کی بات یہ ہے کہ یہ کہے گا کہ یہ اس لیے ہوا کہ مجھے یقین تھا کہ میں نے ایک دن کسی کو حساب دینا ہے۔ بس یہ ہے' عزیزانِ من! غلط اور صحیح نظام

---

[1] جس کے اعمال کا رجسٹر' یمن وسعادت کے ہاتھوں میں ہوگا' وہ ہر ایک سے خوشی خوشی کہے گا کہ لو! میرا نامۂ اعمال پڑھو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کی بات۔ جس نظام میں اربابِ اقتدار کو یہ یقین ہو کہ ہم نے اپنے سے اعلیٰ ایک ہستی کے سامنے حساب دینا ہے یا یہ کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' یہ یونہی رائیگاں نہیں جائے گا بلکہ یہ نتیجہ برآمد کرے گا۔ تو وہ شادکام رہتے ہیں۔ اب یہ معنی ہو گئے۔ کیا انداز قرآن کا ہے کہ وہ کودتا' ناچتا' رقصاں' فرحاں وشاداں' ہر ایک کو اپنا حساب دکھائے گا اور آگے بات بتادی کہ وہ کہے گا کہ میں نے اس لیے اتنے اعلیٰ نمبر حاصل کیے کہ مجھے پتہ تھا کہ ایک دن امتحان ہونا ہے اور پرچے ملنے ہیں اور اس کا نتیجہ نکلنا ہے۔ یہ ہے ایمان بالآخرۃ۔

آخرت کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! یہ مرنے کے بعد کی زندگی ہی آخرت نہیں ہے' ہر Future (مستقبل کا لمحہ) آخرت ہے' ہر کل آنے والا دن' آخرت ہے اور وہ نبی اکرم ﷺ کی چمکتی دمکتی ہوئی حدیث ہے کہ جس شخص کا آج کا دن اس کے کل کے دن سے زیادہ ترقی یافتہ نہ ہوا' سمجھ لو کہ وہ تباہ ہو گیا۔ الفاظ تو یہ ہیں کہ جس کے یہ دو دن ایک جیسے ہوئے وہ برباد ہو گیا۔ **فھو مغبون** یعنی حرکت اور ترقی کی پیمائش کی کیفیت حضورؐ نے یہ فرمائی کہ تمہارا ہر قدم' ہر نیا دن' پچھلے دن سے آگے ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہا کہ جس کا وہ دن پہلے دن سے پیچھے ہوا۔ اگر وہ دن پہلے دن جیسا بھی رہا تو تباہ ہو گیا۔ زندگی تو حرکت اور ترقی چاہتی ہے' ہر سانس میں آگے بڑھنے کی بات ہونی چاہیے۔ اگر کسی کے دو دن بھی ایک جیسے ہو گئے اور اس نے آنے والے دن میں پچھلے دن کے مقابلے میں ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھایا' وہ تباہ ہو جائے گا۔ اور جہاں صورت یہ ہو کہ یہ بات کہی جائے کہ ہزار سال پہلے جہاں قوم تھی وہاں جاؤ تو پھر تمہاری ترقی ہوگی۔ تو بتاؤ تو سہی کہ یہ کیا ہے؟ عزیزانِ من! اسے Fundamentalism (بنیاد پرستی) کی تاریخ کہتے ہیں اور آپ کے ہاں کا سارا مذہب یہی کہتا ہے' تمہارے بڑوں نے بھی یہی کیا تھا' تمہارے اسلاف نے بھی یہ کیا تھا ہمیں تو ہزار برس پہلے' پیچھے جا کر ان کا اتباع کرنا چاہیے' اور یہ سنتِ رسول اللہؐ کے مدعی ہیں۔

حضور ﷺ کی چمکتی ہوئی حدیث

عزیزانِ من! اس طرح کی حدیثیں یہ کبھی پیش نہیں کریں گے کہ ہزار سال تو ایک طرف' حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس قوم کا گزرا ہوا کل' اس کے آج کے برابر ہے' اس سے آگے نہیں بڑھا ہے' وہ قوم تباہ ہو جائے گی۔ اللہ اکبر! یہ تھی تعلیم اور کس قدر صحیح کہا تھا شاعرِ مشرق' مفکرِ اسلام' مفکرِ قرآن' ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877ء) نے کہ

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامہ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

قرآن کہتا ہے کہ بس ایک ہی بات کہی گئی ہے کہ **اِنِّیۡ ظَنَنۡتُ اَنِّیۡ مُلٰقٍ حِسَابِیَہۡ** (69:20) مجھے یہ یقین تھا کہ جو کچھ میں کر رہا

ہوں، ایک دن اس کا نتیجہ نکلنا ہے۔ جس نے یہ ذہن میں رکھ کر کام کیا فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ (69:21) اس کی زندگی خوشگواریوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوگی، اس کی آرزوؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہوگی۔ اِس سے اگلی ہی آیت میں کہا ہے کہ فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ (69:22)۔ عزیزانِ من! جنت قرآن کی تشبیہ ہوتی ہے: یہ وہ زندگی ہے جس میں ہر قسم کی آسائشیں، سہولتیں، اطمینان، سکون، حاصل ہو۔ وہ اس قسم کا باغ جنتی زندگی ہے۔ عالیہ کہہ کے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ باغ بلندیوں کی طرف جانے والا ہے، وہ Hanging Garden ہوتے ہیں۔ اس کے تختے اوپر کی طرف جانے والے ہیں۔ ہم نے وہ کشمیر میں دیکھے: جَنَّةٍ عَالِیَةٍ (69:22) اوپر کی طرف جو جنت کے تختوں کے بھی اوپر ترین جو تختہ ہے، یعنی سب سے بلند تختہ۔ اس کے اندر آگے دو لفظ ہیں۔ جن کا سمجھنا از بس ضروری ہے۔

صرف دو لفظوں میں قرآن کے معاشی نظام کا نقشہ

عزیزانِ من! کہا کرتے ہیں کہ قرآن کا معاشی نظام کیا ہے۔ قرآن کے الفاظ پہ اگر بات سمجھ میں آجائے تو انسان وجد میں آجاتا ہے کہ اس ایجاز کے ساتھ، اس اختصار کے ساتھ، دو لفظوں میں قرآن نے آپ کا پورا معاشی نظام بتا دیا۔ آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے۔ دو لفظوں میں بتایا کہ ان کی زندگی آسائشوں کے جھولے جھولے گی، وہ باغات کے بلند ترین تختوں پر ہونگے، اور وہ باغات، وہ زندگی، وہ نظام ہے جس میں کہا ہے کہ قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ ❶ (69:23)۔ معاشی زندگی کے لیے دو ہی چیزیں چاہئیں۔ پیداوار بہت زیادہ ہو۔ یہ پہلی بات ہے مگر یہ تو سیکولر نظام بھی کرلے گا، سرمایہ داری کا نظام بھی کرلے گا، کیوں کہ اس میں ساری تگ و تاز اسی کے لیے ہے کہ پیداوار زیادہ سے زیادہ ہو، اس زیادہ سے زیادہ پیداوار نے ''اوناں سبزیاں دا بیڑہ غرق کر کے رکھ دتا، جیہڑیاں روز کھانے آں اسیں''۔ ❷ زیادہ سے زیادہ پیداوار، یہ ہے نظامِ سرمایہ داری۔ قرآن نے یہ ضرور کہا ہے کہ ایسے درخت ہوں جن کے پھلوں کے گچھے بھرپور پھل دیں گے۔ یہ بھی ضروری ہے اور اگلی بات وہ ہے جہاں قرآن کا نظام آتا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ (69:23) اس قدر بھرپور پھلوں کے گچھے ہوں گے جو ہر شخص کی دسترس میں ہوں گے۔

دسترس کے اس ایک لفظ نے قرآنی نظام کی وضاحت کر دی

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ یہاں نظر آتا ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے تشبیہاً جنت کا ذکر آرہا ہے۔ ایسا معاشی نظام دیا ہے، جس پہ اب کوئی اضافہ ہی نہیں کرسکتے۔ کہا ہے کہ قُطُوْفُهَا (69:23) زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو اور اس کے بعد یہ ہے کہ وہ دَانِیَةٌ (69:23) پیداوار ہر شخص کی دسترس میں ہو۔ وہ پھلوں کے گچھے خود جھکے ہوئے ہوں کہ ہر شخص جالے۔

---

❶ جس کے پھل ہر وقت اُن کی دسترس میں ہوں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ ان سبزیوں کا بیڑا ہی غرق کر کے رکھ دیا جو ہم روز کھاتے ہیں۔

جنتِ ارضی میں ایک ہاتھ بھی محروم نہیں ہوگا

جس پیداوار میں، خواہ وہ کتنی ہی کیوں نہ ہو، اگر کوئی ایک ہاتھ بھی اس سے محروم رہ گیا، تو وہ جنت نہیں، جہنم ہے۔ قرآنِ کریم نے جنتی نظام کی بات کی ہے۔ عزیزانِ من! اب تو میرا خیال ہے، آپ کے قلوب کو بھی وجد آ جانا چاہیے۔ یہاں دو لفظ آئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پیداوار، پھلوں کے لٹکے ہوئے گچھے، اور ان کی شرط یہ ہے کہ وہ ہر ایک کی دسترس میں ہوں، اس میں ہر ایک کا حصہ ہو۔ وہاں ایسا لفظ استعمال ہوا ہے کہ وہ خود جھک کر اس کی طرف آ جائیں، اسے ایڑیاں اٹھا کر اس تک ہاتھ بھی نہ لے جانا پڑے، وہ خود جھک کر اس کی طرف آ جائیں۔ میرے اللہ! عزیزانِ من! دنیا کے کسی لٹریچر میں یہ دو لفظ لایئے: پیداوار تو اتنی زیادہ ہو اور اس کی کیفیت یہ ہو کہ وہ محروم تک، محتاج تک، خود جھک کے آ جائے، ہر ایک کی دسترس میں ہو جائے۔ یہ ہے وہ جنتی نظام جس کے متعلق قرآن نے کہا کہ **كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ** (69:24) کھاؤ پیو، استعمال کرو، آسائشیں اٹھاؤ، یہ سب ان اعمال کا نتیجہ ہے جو تم نے سابقہ ایام میں کیے تھے۔

حال ماضی کا ہی نتیجہ ہوتا ہے

یہ سب کچھ کیسے مل گیا؟ ہر پیداوار جو آج کھیتی ہوتی ہے، ماضی میں، Past میں، وہ کسان کی محنت کا ثمر ہوتی ہے، اس کے لیے کسان محنت کرتا ہوا چلا آتا ہے۔ پھر آ کر اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ ہر باغ کی مثال لیں گے تو اس کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ماضی میں جو کچھ کیا ہوا ہوتا ہے، حال میں اس کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ آپ اندازہ لگایئے کہ یہ جنت بخششیں کی جنت نہیں ہے، یونہی کسی قوم کو انعام کے طور پہ نہیں ملتی۔ کہا کہ کیسے یہ اتنے اتنے بڑے پھلدار درخت آ گئے، اتنی بہتات آ گئی کہ ان سے کہا جائے گا کھاؤ پیو۔ یہاں لفظ آیا ہے: هنیئًا۔ لفظ هنیئًا بڑا خوشگوار ہوتا ہے، کھاؤ پیو۔ **بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ** (69:24) ارے یہ تو تمہاری اسی محنت کا نتیجہ ہے جو تم نے پہلے کی تھی۔ اپنی محنت کے نتیجے میں، جو ماضی میں کی تھی، اس کے نتائج حال میں سامنے آتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن قوموں کے کیا انقلابات بتا رہا ہے۔ یہ چیز نہیں ہے کہ بیٹھے بٹھائے یہ باغ اگ کھڑا ہوا اور اس میں وہ پھل بھی آ گئے اور تم آرام سے بیٹھے ہوئے ہو، لیٹے ہوئے ہو، اور پھر یہ جھک کے تمہارے منہ میں آ جائے گا۔ اور پھر تم اس کا ایک ایک دانہ بڑے مزے سے کھا رہے ہو، نہیں، بات یہ نہیں ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ **الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ** (69:24) تمہارے وہ دن جو پہلے گزرے ہیں، ان میں تم نے جو کچھ کیا تھا، یہ اس کا نتیجہ ہے جو ایسے تمہارے ہاں آ رہا ہے۔ یہ ماضی ہے، جو حال بنتا ہے۔

عزیزانِ من! یہ بات کسی اور طرف نکل جائے گی، مگر میں کہوں گا کہ Present (زمانہ حال) جسے آپ حال کہتے ہیں، اس کا تو وجود ہی کچھ نہیں ہوتا۔ اگر دیکھا جائے تو یہ جو حال ہوتا ہے، وہ ماضی کا ہی مستقبل ہوتا ہے، بعد میں آنے والا ہوتا ہے اور دوسری طرف

مستقبل کا ماضی ہوتا ہے' پیچھے رہ جانے والا۔ زندگی تو صرف ماضی اور مستقبل ہے۔ کہا کہ جو تم نے ماضی میں اپنے لیے کیا تھا' یہ آج اس کا نتیجہ ہے۔ یہ ہے وہ جو یمن وسعادت والے ہیں۔ وَ اَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَہٗ بِشِمَالِہٖ فَیَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِیۡ لَمۡ اُوۡتَ کِتٰبِیَہۡ (69:25) وہ بچہ تو رزلٹ دکھانے کو رقصاں وشاداں وفرحاں آیا تھا اور جس کا رزلٹ بائیں ہاتھ میں ہوگا' وہ کہے گا کہ اے کاش! مجھے یہ رجسٹر نہ دیا جاتا۔ یہ عربوں کا محاورہ ہے کہ جس کا رزلٹ بائیں ہاتھ میں ہوگا اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ کہے گا کہ یا اللہ! یہ رزلٹ ہی نہ نکلتا تھا تو اچھا تھا اور بیڑہ غرق ہو جاتا تو اچھا تھا۔

عزیزانِ من! مجھے بچپن کی بات یاد آ گئی ہے۔ جنگ عظیم (اوّل: 18-1914) کے دوران جب ہم وہاں پڑھا کرتے تھے تو مجھے اب تک یاد ہے کہ کچھ لڑکے جو بڑے نالائق ہوتے تھے' وہ روز یہ کہتے تھے کہ یا اللہ! جرمنی کو بھیج کہ وہ اس اسکول پہ بھی بم مارے۔ اب یہاں اس آیت میں یہی انداز ہے کہ اے کاش! یہ نتیجہ نہ مرتب ہوتا اور آگے ہے کہ وَلَمۡ اَدۡرِ مَا حِسَابِیَہۡ (59:20) اور مجھے پتہ ہی نہ چلتا کہ میرے پیپر میں مجھے کتنے نمبر ملے ہیں۔ اگلی بات ہے کہ یٰلَیۡتَہَا کَانَتِ الۡقَاضِیَۃَ (69:27) اے کاش! موت میرا کام تمام کر دیتی اور مجھے زندگی نہ ملتی۔ اس زندگی سے' جو حاصل ہوئی ہے' موت بہتر ہے'۔اس رزق سے موت اچھی ہے۔ یٰلَیۡتَہَا کَانَتِ الۡقَاضِیَۃَ (69:27) اے کاش! کسی طرح موت میرا قصہ تمام کر دیتی۔ ہمارے ہاں یہ جتنے لوگ ہیں' انہیں اپنے حساب کی کوئی فکر نہیں۔ ان سب کا یہی یقین ہے کہ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے' اس کے بعد تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔

موت پر یقین کا نتیجہ

عزیزانِ من! کسی ایک دن بھی یہ یقین ہو جائے کہ موت کے بعد بھی مجھے ان چیزوں کا حساب دینا پڑے گا جو میں آج کر رہا ہوں تو پھر آدمی انہیں کبھی بھی نہیں دہراتا۔ وہ تو غم سے مر جاتا ہے جس کو یہ پتہ چل جائے کہ میں نے فیل ہونا ہے اور فیل ہونے کے بعد جو ناکامی میرے حصے میں آنی ہے۔ یہ ہے وہ جو قرآن کہتا ہے۔ یہ قومیں جو تباہ ہو جاتی ہیں' اس لیے ہوتی ہیں کہ ان کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں' اور جو کہے کہ صاحب! اس زندگی میں اگر تم بچ بھی جاؤ گے تو زندگی تو آگے بھی چلے گی' وہاں پکڑے جاؤ گے' تو ان کو یہ یقین نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں' موت انسان کو ختم کر دیتی ہے۔ اور یہاں الفاظ ہیں جن کے معنی ہیں کہ اے کاش! موت میرا خاتمہ کر دیتی۔ مَاۤ اَغۡنٰی عَنِّیۡ مَالِیَہۡ ۚ o ہَلَکَ عَنِّیۡ سُلۡطٰنِیَہۡ [1] (69:28-29)۔ دو ہی چیزیں ہوتی ہیں: مال ودولت کے زور پر اقتدار اور پھر اقتدار کے زور پر قوت۔ یہاں کہا ہے کہ وہ اس دن کہے گا کہ نہ وہ مال ودولت میرے کسی کام آئی اور نہ وہ اقتدار ہی کسی کام آیا۔

---

[1] افسوس کہ وہ مال (جس پر میں اس قدر اتراتا تھا) میرے کسی کام نہ آیا اور میرا وہ غلبہ واقتدار (جس کے بل بوتے پر میں نے اس قدر سرکشی اختیار کر رکھی تھی) غت ربود ہو گیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

قرآنِ حکیم کا محاکاتی انداز

میں کہہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم میں قوموں کے ہی عروج وزوال کی داستانیں بیان ہوئی ہیں۔ یہ غلط اور صحیح نظام کے انجام کی باتیں بیان ہورہی ہیں۔اس کے بعد اگلی آیات میں ایسا انداز آرہا ہے جیسا کہ وہ مجرم کو ہتھکڑیاں پہناتے ہیں' جیل کی طرف لے جاتے ہیں۔ قرآن کا اندازِ بیان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ان چیزوں کو محاکات کے انداز میں بیان کرتا ہے یعنی ایسی محسوس شکل میں جو سامنے آجائیں۔ کہا کہ **خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ** (69:30) وہاں عدالت سے ایسا حکم ملا ہے کہ اس کو ہتھکڑیاں لگاؤ۔ بیڑیاں اور زنجیریں پہنا دو۔ **ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ** ❶ (69:31) اور لے جاؤ کھینچ کے اس کو۔ قرآن یہاں لفظ جحیم لایا ہے جب کہ قرآن میں جہنم کا لفظ بھی تھا۔ جہنم تو وہ ہے جہاں انسانیت جلائی جاتی ہے' وہ انسانیت سوز مقام ہے اور جحیم وہ ہے جہاں حرکت رک جائے' وہیں کا وہیں کھڑا رہ جائے' آگے قدم نہ بڑھ پائے۔ وہ وہی ہے جو حضورؐ نے فرمایا تھا کہ جس کے دو دن برابر ہو جائیں' وہ جحیم ہے' آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پھر کہا کہ **ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ** ❷ (69:32) یوں زنجیر پہنا دو' بیڑیاں ہتھکڑیاں پہنا دو۔ سوال یہ ہے کہ کیوں پہنا دو؟ غور سے سنیے' عزیزانِ من! آگے دو لفظ آتے ہیں' اس ''کیوں'' کا جواب مل رہا ہے' یہ نظر آرہا ہے کہ یہ کس قدر شدید عذاب ہے' کس قدر سنگین عذاب ہے' تباہ کن ہے۔ کیوں ایسا ہوا؟ اس کے جواب میں دو لفظوں میں بات آئی کہ **اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ** (69:33) یہ اپنے ہی بنائے ہوئے قواعد و قوانین پر یقین رکھتا تھا' خدا کے قوانین پر اس کو یقین نہیں تھا' یہ سب کچھ سمیٹے ہوئے تھا۔ اب سن لیجیے کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ یہ تو آپ نے دیکھا کہ یہ کتنا دردناک تباہ کن منظر ہے جس کو بتایا گیا ہے: ہتھکڑیاں ہیں' بیڑیاں ہیں' جہنم ہے' آگ ہے۔ یہ کیوں ہوا؟

قوموں کی تباہی کے لیے ایک ہی جرم کافی ہے

عزیزانِ من! یہ اس لیے ہوا کہ **وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ** (69:34) یہ بھوکوں کو روٹی کھلانے کا انتظام نہیں کرتا تھا' ہر اس شخص کو روٹی کھلانے کا انتظام نہیں کرتا تھا جس میں کمانے کی سکت نہ رہی ہو' جس کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو' جس کی کمائی اُس کی ضروریات پوری نہ کر سکے۔ یہاں **یحض** کا لفظ ہے: یہی نہیں ہے کہ یہ خود نہیں کرتا تھا' یہ دوسروں سے بھی نہیں کہتا تھا کہ اس کا ہمیں انتظام کرنا چاہیے۔ جرم دیکھ لیا۔ قرآن نے قوموں کی تباہی کا ایک ہی جرم گنایا ہے۔ مگر یہاں کہہ دیا جاتا ہے کہ جی! یہ قرآن کے معاشی نظام کو ہی لیے پھرتے ہیں' ان کے نزدیک روٹی کا ہی مسئلہ ہے' یہ جتنا بھی مسئلہ ہے' یہ Materialistic Concept (مادی تصور) ہے'

---

❶ پھر اسے دوزخ میں دھکیل دو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اور وہاں اسے ایک لمبی زنجیر پہنا دو۔ (ایضاً)

یہ مادہ پرستانہ نظریہ ہے۔ ٹھیک ہے کیونکہ میاں صاحب کو بیٹھے بٹھائے جو مل جاتی ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ قرآن ایک ہی جرم گنا رہا ہے' وہ بھی بڑی شدید قسم کی سزاؤں کا صرف ایک جرم گنا رہا ہے کہ **وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ٥ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ** (69:34-35) آج ان لوگوں کا جنہوں نے روٹی کا انتظام نہیں کیا تھا' کوئی ولی' کوئی دوست نہیں ہے۔ بظاہر تو نہیں دوست' ساتھی' ووٹرز' بہت سے ملیں گے۔ جو محبت کے ساتھ' گرمجوشی کے ساتھ کسی کا دوست ہو' اس کے لیے یہ لفظ حمیم آتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی مخلص دوست نہیں رہتا۔ جس کی دولت ختم ہو جائے' جس کا اقتدار ختم ہو جائے' جو جہنم رسید ہو جائے' تو اس کا اس وقت ولی' دوست کون ہو سکتا ہے؟ کون اس کا ساتھ دے سکتا ہے؟ **وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ** (69:36)۔ اس آیت کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ان کو کھانے کو غسلین ملے گا۔ غسلین کے معنی عام طور پہ لیتے ہیں: دھوون [1] کسی چیز کا' یا غسالہ' یا وہ پانی جس سے زخم دھویا گیا ہو' یا انتہائی گرم۔ اصل میں غسلین کے معنی ہوتے ہیں: آنسو' جو گرم گرم نکلتے ہیں۔ یہ وہ آنسو ہیں۔ اس لیے کہ کہا کہ ''اور کھولتے ہوئے پانی کے سوا (جس سے پیاس اور بھڑک اٹھے) کچھ پینے کو نہیں ملے گا۔ یہ اس کے اپنے ہی آنسوؤں کے گھونٹ ہوں گے۔ **لَا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ** (69:37) اس قسم کے جو مجرم ہیں یہ ان کی غذا ہو گی' انکا کھانا ہو گا۔ اس کے بعد وہ ہے جسے میں خدا کا تختِ جلال کہا کرتا ہوں۔ وہ عدالتیں آج ہمارے ہاں بھی ہیں خواہ وہ کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو۔ ہم ہی کہتے ہیں: ہماری عدالت سے' ہم ہمارے ہاں' بھی بولتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہوتی ہے کہ قرآنِ کریم ایسے مقام پر آ کر بھی ایک شہادت دیتا ہے کہ یہ جو کہا جا رہا ہے' اسے محض شاعری نہ سمجھو' یہ شاعری نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس شہادت کے لیے جو ''اقسم'' کا لفظ آتا ہے' جس کا ترجمہ ''قسم کھانا'' کیا جاتا ہے' اس ''قسم کھانے'' سے کیا مراد ہے؟

قسم کھانے سے کیا مراد ہے؟

عزیزانِ من! اس تک پہنچنے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ قرآن کا اپنا انداز ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ٥ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ** [2] (69:38-39)۔ عموی طور پر ہمارے ہاں ''اقسم'' کے معنی قسم کھانا کیے جاتے ہیں۔ مثلاً میں قسم کھاتا ہوں اس چیز کی: **وَالتِّيْنِ ٥ وَالزَّيْتُوْنِ ٥ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ** (95:1-2) جب کہ عربی لغت کے لحاظ سے ''اقسم'' کا ترجمہ کسی چیز کو شہادت کے طور پر پیش کرنے کا ہے۔'' یعنی وہ چیزیں جو محسوس طور پر اور مشہود طور پر تمہارے سامنے آ چکی ہیں اور وہ جو ابھی آنے والی ہیں' میں ان تمام

---

[1] دھوون۔ وہ پانی جس میں کوئی چیز دھوئی گئی ہو اور اس میں کثافت آ گئی ہو۔

[2] (اے رسول! تم ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے' قیاسات نہیں' یہ اٹل حقائق ہیں جن پر) وہ واقعات جو محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ چکے ہیں اور وہ جو ابھی تک پردہ اخفا میں ہیں' شاہد ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

چیزوں کو اس اعلانِ عظیم کی شہادت میں پیش کرتا ہوں کہ اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ (69:40) یہ جو تمہیں باتیں کہہ رہا ہے' جس کی زبان سے تم یہ سن رہے ہو' یہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا' یہ ہمارا پیغامبر ہے۔ کیا بات کہی ہے! یہ ہمارے پیغامات تم تک پہنچا رہا ہے' تم ان پیغامات کو بڑا Lightly (معمولی سا) لے رہے ہو' Serious (سنجیدگی سے) نہیں لے رہے' غور نہیں کر رہے' تو کیا تم سمجھ رہے ہو کہ یہ شاعر ہے؟ ان کے ہاں شاعروں کو بھی کہا کرتے تھے کہ ان کو بھی الہام ہوتا ہے۔ یہ دیوی دیوتاؤں کیطرف سے آتے ہیں' لہٰذا ان کی بڑی قدر ومنزلت ہوتی تھی لیکن وہ شاعر ساری عمر شعر تو کہتا تھا' اپنی روٹی کما سکنے کے بھی قابل نہیں ہوتا تھا۔

شاعری میں فراق اور وصال کی حقیقت

عزیزانِ من! قرآن نے اسی لیے شاعری کی مذمت کی کہ ان کی زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا' کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ قرآن نے کہا ہے۔ فِیۡ کُلِّ وَادٍ یَّہِیۡمُوۡنَ (26:225) وہ اپنے خیالات کی دنیا کے اندر' کبھی وصال کی لذتیں گنا رہا ہے' کبھی فراق کے رونے رو رہا ہے' نہ فراق اصلی ہوتا ہے' نہ وصال اصلی ہوتا ہے' دونوں چیزیں شاعری ہوتی ہیں۔ یہاں کہا کہ وَمَا ہُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ (69:41) اُو اس کو شاعری نہ سمجھ۔ اقبالؒ (1877-1938ء) نے بھی تو اپنے لیے یہی کہا ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ قَلِیۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ (69:41) یہ شاعری سمجھ کے گزر جاتے ہیں۔ اس حقیقت پہ غور کر کے' اس پہ یقین نہیں رکھتے کہ یہ جو بات کہہ رہا ہے' وہ واقعی ہونے والی ہے۔ وَلَا بِقَوۡلِ کَاہِنٍ (69:42) یہ پیشین گوئیاں کرنے والا' قسمت کے حال بتانے والا' تقدیریں بیچنے والا نہیں ہے۔ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ (69:42) تم اسی لیے اس کی بات پہ غور نہیں کرتے۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ کچھ کہہ رہا ہے اس کی بات غور سے سنو۔ یہ ہمارا پیغامبر ہے۔ اور تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (69:43) یہ قرآن نازل کیا ہوا ہے اس خدا کا جو تمام اقوامِ عالم کا رب ہے۔ ربوبیتِ عالمینی کے لیے یہاں قرآن کا انداز دیکھیے۔ وہاں کہا تھا کہ یہ بھوکے اور مسکین کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے' یہاں اپنی صفت ہی یہ بتائی ہے کہ یہ اس خدا کیطرف سے ہے جو تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔ یہ ہمارا پیغام پہنچا رہا ہے۔

وحی خداوندی میں کسی رسول کا اپنا ایک لفظ ہی شامل کرنا جرمِ عظیم ہے

عزیزانِ من! یاد رکھیے' رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ اس کی تو کیفیت یہ ہے کہ وَلَوۡ تَقَوَّلَ عَلَیۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِیۡلِ ٥ لَاَخَذۡنَا مِنۡہُ بِالۡیَمِیۡنِ (69:44-45) پورے کا پورا اپنی طرف سے بنا کر کہنا تو ایکطرف اگر اس وحی میں یہ رسول' یہ پیغامبر' کوئی ایک بات بھی اپنی طرف سے ملا کے بتائے تو ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡہُ الۡوَتِیۡنَ (69:46) تو ہم اس کی اتنی سخت گرفت کریں۔ ''وتین'' کے معنی عام طور پر رگِ جان لیتے ہیں۔ اس کے معنی وہ ذرائع ہوتے ہیں جس سے کوئی شے مستحکم ہو' طاقتور ہو۔ کہا کہ ہم کاٹ کے رکھ دیں ان تمام

ذرائع کو جن کی بناء پہ یہ ایسی جرأت کریں کہ یہ اپنی طرف سے کچھ کریں اور پھر اسے ہماری طرف منسوب کردیں۔ **فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ** (69:49) اور دوسرا کوئی ایسا نہ ہو جس میں یہ جرأت ہو سکے کہ ہمارا ہاتھ پکڑ لے کہ ہم ایسے نہ کریں۔ کہا: یہ ہمارا پیغام ہے جو تمہیں پہنچا رہا ہے۔ **وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ** (69:47) وہ لوگ جو احساس رکھتے ہیں، جو غلط اعمال اور غلط نظام کے انجام سے ڈرنے والے ہیں، ان کے لیے اس میں بڑی وارننگ ہے، بڑی نصیحت کی باتیں ہیں۔ **وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ** (69:49) ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ کہنے کے باوجود تم میں وہ لوگ ہیں جو اپنا نام تو مسلمان رکھیں گے لیکن اپنے اندازِ نظام اور مطالب سے ثابت کریں گے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کو جانتے ہیں۔

تکذیب کا مفہوم

عزیزانِ من! یہاں ایسے لوگوں کو مکذب کہا ہے۔ کفر تو ہوتا ہے کسی بات سے کھلے بندوں انکار کر دینا۔ تکذیب ہوتی ہے کسی چیز کو زبان سے تو مانتے رہنا لیکن عملی زندگی میں اسے جھٹلانا، یہ کہنا کہ یہ جھوٹ بولتا ہے۔ آج زبان سے تو ہم قرآن کی یہ آیت پڑھتے ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کبھی کافروں کو مومنوں پر غالب نہیں کرے گا۔ ہم یہ آیت پڑھتے ہیں، ہزاروں لاکھوں مرتبہ اسے دہراتے ہیں، شبینوں میں دہراتے ہیں۔ مگر ہماری زندگی اس دعوے کی تکذیب کر رہی ہوتی ہے کیونکہ ہم اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں جب کہ قرآن کہتا ہے تم جھوٹ بولتے ہو۔ اسے کہتے ہیں تکذیب۔ ہم یہ جانتے ہیں مگر عملاً اسے جھٹلاتے ہیں۔ آگے آنے والی بات یہ ہے کہ **وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ** (69:50) وہ آنے والا الحاقۃ، جو محسوس کنکریٹ (Concrete)، شکل میں سامنے آئے گا، وہ ان جھٹلانے والوں اور ان نہ ماننے والوں کے لیے، بڑا ہی حسرت کا مقام ہوگا۔ کیا بات ہے "حسرۃ" کی۔ حسرت "واماندگی" کو کہتے ہیں، یہ تھک کے کہیں بیٹھ جانا ہے، یہ زندگی کی حرارت کا باقی نہ رہنا ہے۔ ان کی یہ کیفیت ہوگئی ہے۔ اور آگے پھر آخری آیت آ گئی۔ مگر آخری سے پہلی کہا کہ **وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ** (69:51)۔ اس آیت کا ترجمہ کرنے سے پہلے آپ یہ دیکھیے کہ پہلے کہا تھا: **الحاقۃ**. بات یہاں سے شروع کی تھی اور کہا تھا کہ یہ سارا کچھ جو ہم نے Describe (بیان) کیا ہے، یہ جتنا کچھ جو ہم نے بتایا ہے، یہ حق الیقین ہے، یہ ایک ایسی یقینی بات ہے جو محسوس شکل میں سامنے آ جائے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں حق "اس صداقت کو کہتے ہیں جو محسوس شکل میں سامنے آ جائے۔"

یقین کے تین مدارج: علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین

قرآن نے یقین کے تین درجے بتائے ہیں: پہلا درجہ ہے: علم الیقین کہ کسی چیز کے متعلق ذہنی طور پر سمجھ لینا۔ یہ محض فلسفیانہ انداز

ہے۔جس کو آپ Intellectual (ذہنی' عقلی) کہتے ہیں۔یعنی ذہنی طور پہ سمجھ لینا کہ ہاں یہ ٹھیک ہے بھئی! اور یہ سارا فلسفہ' یہ ساری شاعری' اسی میں چلی جاتی ہے۔یقین کا یہ پہلا درجہ علم الیقین ہے۔دوسرا درجہ عین الیقین ہے۔یہ کسی چیز کو دیکھ لینا کہ یہ بھی یقین کے لیے ایک اچھی چیز ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ بھی آخری درجہ نہیں۔اس سے اگلا درجہ ہے: حق الیقین۔یہ وہ بات ہے کہ جیسے آگ ہے' دھواں اٹھتا ہے' تو ہم علم کے طور پر اندازہ لگاتے ہیں کہ آگ ہے' جو سامنے بھڑکتی ہوئی نظر آتی ہے اور جب آگ میں انگلی ڈال دی جائے اور وہ جلا دے تو یہ جو یقین ہوتا ہے یہ ہے حق الیقین۔کہا کہ یہ جو کہا گیا ہے' یہ کوئی یونہی Intellectual (ذہنی) اسی بات نہیں ہے۔یہ بھی نہیں ہے کہ دُور سے تم نے کچھ دیکھ لیا ہے اور اب کہتے ہو کہ شاید ہو یا نہ ہو۔یہ تو وہ چیز ہے جو آگ میں کودنے کے بعد کسی کی کیفیت ہوتی ہے۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہماری حالت

یہ جو ہم باتیں بتا رہے ہیں' یہ **اِنَّـهٗ لَحَقُّ الْيَـقِيْنِ** (69:51) ہیں۔کتنی یقینی چیز ہے۔اب اس الحاقۃ سے بچنے کے لیے کیا کیا جائے؟ بچنے کے لیے یہی کہا تھا کہ تم بھوکوں کی روٹی کا بھی انتظام کرو۔یہی کہا تھا کہ یہ قرآن اس خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہے جو رب العلمین ہے یعنی تمام اقوام کا نشوونما دینے والا ہے: عزیزانِ من! اس سورۃ کی آخری آیت میں کہا کہ **فَسَبِّـحْ بِـاسْـمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ** (69:52)۔اب اس آیت کا ہمارے ہاں ترجمہ ہو گیا کہ خدائے عظیم کی تسبیح کیا کرو اور وہ تسبیح ہے: **سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ' سُبْـحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ**۔اس گئے گزرے زمانے میں بھی مسلمان جو نمازیں پڑھتے ہیں' وہ کتنی ہی بار اس تسبیح کو دہراتے ہیں۔پھر یہی نہیں ہے کہ یہ رکوع اور سجود میں ہوتی ہے وہ تسبیحیں تو پھر ہزار ہزار دانے کی تسبیحیں ہوتی ہیں:

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

چلے ہوئے ہیں' تسبیحیں ہو رہی ہیں۔سوال یہ ہے کہ کیا کرنا ہے؟ عزیزانِ من! اس سورۃ کی آخری آیت میں عجیب چیز آئی ہے۔یہاں خدا کی جو صفت بتائی گئی ہے' وہ ہے: رب العلمین۔ایک ربوبیت تو ''دوسروں کی پرورش کرنا'' ہے یہ تو محدود پیمانے پر ہر شخص اپنے گھر میں کرتا ہے۔یہ چیزیں تو کافر ہوں یا مومن دونوں ہی کرتے ہیں بلکہ ہم تو اس لحاظ سے مومن کم ہیں اور کافر زیادہ۔ یہاں کہا ہے کہ خدا کی اس صفتِ ربوبیت کو عظیم پیمانے پہ عملی شکل دو۔صرف محدود پیمانے پہ نہیں' بلکہ عظیم پیمانے پر ربوبیتِ عالمینی کا نظام قائم کرو' اس

عذاب سے بچ جاؤ گے۔ سبح کے معنی ہوتا ہے: ''گرمجوش رہنا' سرگرداں رہنا' مسلسل کوشش کرنا' بھرپور کوشش کرنا' متواتر اور مسلسل کوشش کرنا۔'' یہ اس لیے کہا کہ خدا کی صفتِ ربوبیت کے عام کرنے کے لیے مسلسل ومتواتر کوشش کرو' تو بچ جاؤ گے۔ دیکھا آیات میں کس قدر ربط ہے۔ وہ جو کہا کہ یہ عذاب اس لیے آیا ہے کہ تم ان کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے۔ اب کہا کہ یہ اس خدا کا پیغام ہے جو رب العلمین ہے۔ پھر کہا کہ اس عذاب سے' اس الحاقۃ سے' بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی صفتِ ربوبیت کو عام کرنے کے لیے مسلسل سرگرداں رہو' تو بچ جاؤ گے' ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔

عزیزانِ من! سورۃ الحاقۃ کا آج اختتام ہوا۔ آئندہ درس میں ہم سورۃ المعارج لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

دسواں باب: سورة المعارج (آیات 1 تا 28)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1983ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المعارج سے ہو رہا ہے۔ یہ 70 ویں سورۃ ہے۔اس کی پہلی تین آیات یوں ہیں: **سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ o لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ o مِّنَ اللّٰهِ ذِى الْمَعَارِجِ** (70:1-3) اے رسول! یہ پوچھنے والے تجھ سے اس تباہی کے متعلق پوچھتے ہیں جس کی بابت تو انہیں Warn (آگاہ) کرتا چلا آ رہا ہے کہ وہ واقعہ ہو کر رہے گی اس لیے اپنے نظام کی اصلاح کر لو۔ جب وہ تباہی آئے گی تو کوئی بھی اُسے روک نہیں سکے گا۔

آپ کو یاد ہو گا آخری پاروں کی ابتدا میں جو میں نے کہا تھا کہ ہر پارے کے وقت اس کی تکرار ضروری ہے کہ ان پاروں میں کچھ انقلابات ہیں جن کا ذکر آ رہا ہے۔ان انقلابات کی تین نوعیتیں ہیں۔ایک تو خارجی کائنات میں کوئی انقلابات آئیں گے۔ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں، نہ وہ ہمارے لائے ہوئے ہونگے، نہ ہم انہیں روک سکیں گے۔ دوسرے انقلابات وہ ہیں جو اخروی زندگی میں آئیں گے۔ وہاں کی زندگی کے متعلق بھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جو قرآن کہہ رہا ہے ہمارا اس پر ایمان ہے اور انقلابات کی تیسری قسم وہ تباہیاں ہیں جو قوموں کے غلط نظام کی وجہ سے آتی ہیں لہٰذا قومی اور معاشرتی لحاظ سے ہمارا تعلق اِن انقلابات سے یقینی طور پر ہے۔ یہ ہماری ہی لائی ہوئی تباہیاں ہوتی ہیں اور ہم چاہیں تو اس نظام کو بدل کر، جن کی وجہ سے یہ تباہیاں آتی ہیں، انہیں روک سکتے

ہیں۔ اسی لیے قرآنِ کریم یہ بتانے کے لیے ان تباہیوں کے سلسلے میں اقوامِ سابقہ کی داستانیں بطور شہادت پیش کرتا ہے کہ فلاں قوم نے اس قسم کا غلط نظام رائج کیا تو اس کا نتیجہ یہ تباہی ہوئی' فلاں قوم نے صحیح نظام رائج کیا تو اس کا نتیجہ خوشگواری ہوا۔ وہ ان اقوام کی تباہیاں بتاتا چلا جاتا ہے۔

نوعِ انسانی کی تباہی کے تین گوشے

جن اسباب سے وہ تباہیاں آتی ہیں اگرچہ ان کی نوعتیں تو بڑی مختلف ہوتی ہیں لیکن عام طور پہ وہ تین شقوں میں تقسیم کرتا ہے۔ فرعون [1] کی ملوکیت یعنی شخصی حکومت' ایک انسان کی دوسرے انسان پر حکومت' خواہ اس کی شکل وصورت' اس کا نام' اس کا طریق' کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ پہلی چیز تو وہی ہے جس کو وہ استکبار اور استحصال کہتا ہے یعنی کسی شخص کا کسی دوسرے انسان پر حکومت کرنا۔ اسے عام طور پر ملوکیت کہا جاتا ہے لیکن نام کچھ بھی رکھیے۔ ایک تو یہ ہے کہ یہ غلط نظام ہے۔ دوسرا غلط نظام نظامِ سرمایہ داری ہے کہ محنت کسی کی ہو اور اس کو استحصال اور Exploit (لوٹ کھسوٹ) کر کے کوئی اور لے جائے۔ یہ وہی ہے جسے قرآن قارونیت [2] کہتا ہے' ہمارے دَور میں یا بعد کے دَور میں اسے نظامِ سرمایہ داری یا کیپٹل ازم کہا جاتا ہے اور تیسرا باطل کا نظام ہے' جسے وہ ہامان [2] کا نظام کہتا ہے' جسے مذہبی پیشوائیت کہتا ہے جو قوم کو ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اس کے راستے میں کھڑی ہو جاتی ہے کہ یہ آگے نہ بڑھنے پائیں' تو اس نے یہ تین موٹی موٹی شقیں بتائی ہیں اور کہا ہے کہ اس کے نتیجے میں یہ تباہی آتی ہے۔ تباہی کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں لیکن وہ نظام الٹ جاتا ہے' مملکتیں الٹ جاتی ہیں۔ اس طرح قومیں تباہ ہو جاتی ہیں یہ ہیں وہ تباہیاں جن کا تعلق ہم سے ہے۔ اس لیے جب میں ان آیات پہ آتا ہوں تو وہ جو دوسری دو تباہیاں ہیں انہیں چھوڑ کر اسی معاشرتی تباہی کی طرف آتا ہوں کہ ہمارا تعلق ہی اس تباہی سے ہے۔

آپ کو یاد ہے کہ 68ویں سورۃ (**الـقـلـم**) میں اقوامِ عالم کی تباہیوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا تھا: **کَـذٰلِکَ الۡـعَـذَابُ** [3] (68:33)۔ کسی قسم کی تباہی تم پر آئے گی تو جو حضور ﷺ کی قومِ مخاطب تھی یہ اسے بتایا کہ ان کے غلط نظام سے جو تباہیاں آئی ہیں اور جن کا ذکر ہم نے کیا ہے تمہارا نظام بھی انہی جیسا غلط نظام ہے' اس قسم کا عذاب تم پہ بھی آئے گا۔ **وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَکۡبَرُ** (68:33)

---

1. اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرنگرانی)' مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء ص 109' (فٹ نوٹ نمبر 1)
2. قارون' قارونیت اور ہامان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظوالحق (زیرنگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص 124' (فٹ نوٹ نمبر 1 اور 2)
3. اے رسولؐ! تم ان مخالفت کرنے والوں کو بتا دو کہ قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے والوں پر اس طرح' اس دنیا میں' تباہی آیا کرتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اوراخروی زندگی کا عذاب اس سے بھی کہیں زیادہ ہوگا۔قرآنِ کریم نے اس دنیا میں آنے والے عذاب یا تباہی کی تشریح اور توضیح کی تھی۔ اس طرح یہ جو **کَذٰلِکَ الْعَذَابُ** (68:33) تھا کہ اسی قسم کی تباہی تم پر بھی آنے والی ہے تو اسی ضمن میں کہا کہ اب یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ تباہی کب آئے گی: تم روز ہمیں اس سے ڈراتے رہتے ہو' وارن کرتے رہتے ہو' تنبیہ کرتے رہتے ہو۔ اب بتاؤ کہ وہ عذاب کب آئے گا' جس کے متعلق تم کہتے ہو کہ وہ فی الحقیقت واقعہ ہو کر رہے گا۔تم اس یقین کے ساتھ ان کے لیے کہہ رہے ہو جو صحیح نظام کی مخالفت کرتے ہیں۔

کافر کے حقیقی معنی

یاد رکھیے کہ جب قرآن میں کافرین یا کافر کا لفظ آتا ہے تو ہمارے ذہن میں تو بس ایک ہندو آجاتا ہے' اور تو ہم کسی کو کافر سمجھتے نہیں اور وہ بھی اب وہاں انڈیا میں رہ گیا تو گویا اب تو یہاں کافر کوئی ہے ہی نہیں۔ ہم تو سب مومن ہیں۔ کافر کے معنی ہیں ''نظامِ خداوندی کی تردید کرنے والا' اس کے خلاف سرکشی کرنے والا' اس کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنے والا۔'' یہ صرف عقیدے کی بات نہیں ہے' یہ نظام کی بات ہے۔ یہ جو غلط نظام عائد کیے ہوئے ہیں اور اس پہ مصر ہیں کہ ہم اسے نہیں بدلیں گے' ان کے لیے ہے کہ وہ نظام آئے گا۔ تمہاری غلط نظام سے تباہی آئے گی۔ اس کے لیے کہا کہ **لَیْسَ لَهٗ دَافِعٌ o مِّنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِ** (70:2-3) ان سے کہو کہ جلدی نہ مچاؤ' کوئی عید کا چاند نہیں ہے' وہ جو آنے والا ہے' وہ تو تباہی ہے جب وہ آئے گی تو کوئی اس کی مدافعت نہیں کرسکے گا' کوئی اسے روک نہیں سکے گا' اس کے لیے پہلے ہی **مِنَ اللّٰهِ** (70:3) کہا کہ یہ خدا کی طرف سے' خدا کے قانون کی رو سے' آئے گا۔ وہ من اللہ کہہ کر یہ بتا رہا ہے۔ اب آگے ایک اور بات کہی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ویسے تو قرآن پہلے لفظ الحمد سے آخری لفظ **والناس** تک' پورے کا پورا' اعجاز ہے لیکن اس میں بعض ایسے مقامات آتے ہیں کہ چشمِ بصیرت غور کرتی ہے تو وجد میں آجاتی ہے۔

مہلت کا وقفہ قانونِ مکافات کا ہی حصہ ہے

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہے کہ قانونِ مکافات یہ ہے کہ جس قسم کے اعمال ہوں گے' جس قسم کا نظام ہوگا' اسی قسم کے اس کے نتائج سامنے آئیں گے۔ یہ قانونِ مکافات ہے۔ یہ اٹل ہے' غیر متبدل ہے' شروع سے چلا آرہا ہے' آخر تک چلا جائے گا لیکن ایک عمل یا نظام کے قائم ہونے اور اس کا نتیجہ برآمد ہونے کے درمیان مہلت کا ایک وقفہ ہے۔ یہ بھی اس قانونِ مکافات کا ایک حصہ ہے' ایک جزو ہے' فوری گرفت نہیں ہوتی۔ یہ وہ ہے جسے Accumulative Effect (مجموعی اثر) کہتے ہیں۔ وہ چیز بتدریج آہستہ آہستہ جمع ہوتی رہتی ہے' ہوتی رہتی ہے' تآنکہ وہ وقت آجاتا ہے کہ پھر وہ کشتی ڈوب جاتی ہے۔ یہ قانونِ مکافات کا ایک طریق ہے' ایک جزو ہے' ایک پروگرام ہے۔

اب دیکھیے جو میں نے کہا تھا کہ بعض مقامات ایسے آتے ہیں کہ انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ یہاں کہا: **مِنَ اللّٰہِ** (70:3) یہ خدا کی طرف سے آئے گا۔ من اللہ کے بعد کہا ہے: **ذِی الْمَعَارِجِ** (70:3)۔ معارج سیڑھیوں کو کہتے ہیں یعنی یہ اس خدا کی طرف سے ہے جو سیڑھیوں والا ہے۔ یہ کتنی عجیب چیز ہے۔ اگر آپ نے چھت پہ جانا ہو تو آپ جمپ کر کے نہیں جا سکتے' آپ Step by Step جاتے ہیں' قدم بہ قدم جاتے ہیں' بتدریج جاتے ہیں۔ وہ جو کہا تھا کہ **سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ** [1] (68:44)۔ یہ قوم تدریجی طور پر' قدم بہ قدم' اس انجام کی طرف جاتی ہے جو اس نظام کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے لیکن چڑھتی ہے قدم بہ قدم۔ اب غور فرمائیے یہی مہلت کا وقفہ ہے کہ فوری گرفت نہیں ہوتی' وہ قوم آہستہ آہستہ اس کی طرف جا رہی ہوتی ہے۔

سیڑھیوں والا خدا

اب اس عمل (Process) کے لیے کہا کہ خدا کی طرف سے' خدا کے قانونِ مکافات کی طرف سے' وہ تباہی آئے گی۔ وہ خدا سیڑھیوں والا ہے۔ قرآن کریم نے سیڑھی کا ایک لفظ کہہ کر اپنا وہ سارا' فلسفہ بتا دیا جس کے ذریعے نظام بتدریج اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ قرآن اس ایک تشبیہہ میں وہ ساری بات بتا گیا ہے اور پھر عربوں کی اس زبان کا کیا پوچھتے ہو! وہ بھی کیا قوم تھی!

درکات اور درجات کا مفہوم

یہ جو معراج یا معارج ہیں یہ تو سیڑھیاں ہو گئیں۔ انہی سیڑھیوں سے جب کوئی اوپر چڑھتا تھا تو عرب انہی ڈنڈوں کو اوپر چڑھتے وقت درجات یا مدارج کہتے تھے اور انہی ڈنڈوں کو جب کوئی نیچے اترتا تھا تو درکات کہتے تھے۔ سیڑھی ایک ہی ہوتی ہے' آپ قدم بہ قدم بلندیوں کی طرف جائیے تو وہ درجات ہوتے ہیں جو بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی سیڑھی سے' غلط نظام کی رو سے' نیچے اتریئے تو وہ درکات ہوتے ہیں' لیکن وہ بھی سیڑھی ہوتی ہے جس پہ قدم بہ قدم آگے جایا جاتا ہے۔

ملائکہ اور روح کی قوتیں

عزیزانِ من! آگے ہے کہ **تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ** [2] (70:4)۔

---

[1] ہم انہیں بتدریج' آہستہ آہستہ' تباہی کی طرف لا رہے ہیں حتیٰ کہ انہیں اس مقام تک پہنچا دیں گے جہاں انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ وہ تباہی آ کہاں سے گئی!

[2] خدا کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنی اسکیم کا آغاز اس کے پست ترین نقطہ سے کرتا ہے۔ پھر کائناتی قوتیں (جو عالم خلق میں کارفرما ہیں) اور الوہیاتی توانائی (جو عالم امر میں روبعمل ہے) اُس اسکیم کو تکمیل تک لے جانے کے لیے اوپر اٹھتی ہیں اور اس طرح اسے ارتقائی مدارج طے کرتی ہوئی' آگے بڑھاتی ہیں۔ یہ مراحل بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں جن کی مدت ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال ہوتی ہے۔ (22:47; 32:5; 35:10; 78:38; 97:4) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ملائکہ اور روح کے متعلق پہلے آ چکا ہے کہ ملائکہ کائناتی قوتیں ہیں اور روح خدا کی اسکیم کو بروئے کار لانے والی عالم امر کی قوتیں ہیں۔ یہ جو چیز ہے کہ غلط نظام کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے یہ یونہی نہیں آ جاتا۔ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل روبعمل ہوتا ہے۔ اس کے لیے خدا کی یہ قوتیں مقرر کی ہوئی ہیں جو یہ چیزیں لاتی ہیں یا اس نظام کے اندر جو تباہیاں پوشیدہ ہوتی ہیں انہیں وہ بروئے کار لاتی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ اس کے لیے قوموں کی تباہی کا بڑا لمبا عرصہ ہوتا ہے۔

پچاس پچاس ہزار سال کے دن کا مفہوم

اب یہ دیکھیے یہاں کہا ہے کہ خدا کا ایک ایک دن پچاس پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے۔ کائنات کی زندگی سائنسدانوں سے پوچھیے وہ اسے جس عدد یا جس نمبر یا جس شمارے میں بیان کرتے ہیں وہ تو ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ وہ ہوتا کیا ہے۔ وہ ایک ایسا Higher Mathematics ہے کہ وہ حساب شمار میں آتا ہی نہیں ہے۔ وہ اتنا لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ یہاں تو یہ کہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ بات آ گئی ہے، دو مقام اور بھی ہیں جنہیں تصریفِ آیات کی رو سے ساتھ ملانے سے، بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن کہہ کیا رہا ہے، وہ میں یہاں بیان کر دوں۔ السجدۃ کی پانچویں آیت میں ایک مقام ہے، جہاں کہا ہے کہ **يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ** [1] (32:5)۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کی اسکیم کا ایسا نظام ہے کہ ایک Plan (اسکیم) ہوتا ہے۔ وہ اسکیم عالمِ امر میں طے پاتی ہے۔ یہ جو عالمِ امر میں خدا کی اسکیم طے پاتی ہے وہ بتدریج نہیں طے پاتی، اس میں وقت نہیں لگتا، اس عالمِ امر کے اندر وقت کا تو شمار ہی نہیں ہوتا، وقت کا یہ شمار تو ہماری دنیا کے اندر ہے، وہاں کے عالمِ امر کے متعلق تو قرآن نے مختلف مقامات میں کہا ہے۔ ایک مقام پہ کہا ہے کہ **اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ** [2] (36:82)

---

[1] (کائنات کو مختلف ادوار و منازل سے گزار کر پیدا کرنے سے مراد کیا ہے، اسے غور سے سنو۔ اس کا طریقِ تخلیق یہ ہے کہ) اس کے عالم مشیت میں ایک اسکیم سامنے آتی ہے۔ وہ اس اسکیم کا آغاز، اُس کے پست ترین نقطہ سے کرتا ہے اور وہ (کائناتی عناصر کے باہمی تعاون سے نشوونما پاتی ہوئی، ارتقائی منازل طے کرتی جاتی ہے اور) اس طرح، آہستہ آہستہ، اس نقطۂ تکمیل کی طرف اٹھتی اور بڑھتی جاتی ہے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کیا تھا (35:10)۔ ان ارتقائی منازل کی مدت، تمہارے حساب شمار کے مطابق، ہزار ہزار سال (22:47) بلکہ (بعض اسکیموں کے سلسلہ میں پچاس پچاس ہزار (70:4) کی ہوتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] خدا کو تخلیق کے لیے، کہیں سے کوئی مسالہ (Material) مانگ کر لانا نہیں پڑتا۔ اس کا قانون تخلیق یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس ارادے کے ساتھ ہی اس شے کی تخلیق کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ (ایضاً)

عالمِ امر اور عالمِ خلق کی حقیقت

عالمِ امر میں کیفیت یہ ہے کہ وہاں خدا کا کسی شے کے متعلق ارادہ ہوتا ہے' اس نے ہمارے سمجھانے کو کہا کہ وہ کہتا ہے ''ہوجا'' اور اس شے کی تخلیق کا آغاز ہوجاتا ہے' ورنہ یہ کوئی بھی کہنے والی بات نہیں ہے کہ خدا کو یہ کہنا پڑے: ''کن'' اور پھر وہ شے ہوجائے' اس کے بغیر یہ عمل سمجھا یا نہیں جاسکتا' چونکہ یہ گفتگو ہماری زبان میں ہوتی ہے اس لیے اتنی سی بات کہی کہ اس کا ارادہ ہوتا ہے' وہ کہتا ہے ''ہوجا'' اور اس کا آغاز ہوجاتا ہے۔ اس طرح عالمِ امر میں یہ تدریجی بات نہیں ہوتی کہ وہاں آہستہ آہستہ' نقشہ بن رہا ہوتا ہے یا یہ کہ وہاں قانون بن رہا ہوتا ہے' مثلاً یہ کہ وہ قانون کہ جس کے تابع شہد کو شیرینی اور نمک کو نمکینی ملتی ہے' اس عالم میں ضروری نہیں کہ خدا جو قانون بنا رہا ہو وہ تدریجاً بنائے' وہاں عالمِ امر میں تو یہ چیز ہے: ''کن اور فیکون'' جب وہ عالمِ امر کی اسکیم اس عالمِ خلق میں آجاتی ہے تو یہاں پھر وہ اسکیم بتدریج اپنی انتہا تک پہنچتی ہے۔ اس کا انتہائی درجہ تو اس کے لیے مقرر کیا ہوتا ہے۔ یہ کہا ہے کہ اس کا وہ امر سماء میں تیار ہوتا ہے' اس بلندی کے اوپر جو ہمارے تصور میں بھی نہیں آسکتی وہاں وہ تیار ہوتا ہے۔ یہ الفاظ محض ہمارے سمجھانے کے لیے ہیں۔ اب اس اسکیم کو عالمِ خلق میں' ہماری زندگی میں' ہماری دنیا میں لانا ہے تو وہاں سے وہ اسکیم ارض کے اوپر آجاتی ہے' جہاں وہ آہستہ آہستہ بتدریج اپنے انتہائی مقام تک پہنچتی ہے۔ وہ **تعرج** کا لفظ آگیا جس کی تشریح میں کر رہا ہوں کہ پھر وہ یہاں آہستہ آہستہ اوپر چڑھتی ہے' وہ اس طرف جاتی ہے جس عالم کے اندر وہ طے پائی تھی۔ عالمِ امر اس کا منتہیٰ ہے' وہ اسکیم اس کی طرف آہستہ آہستہ جاتی ہے۔ اوپر کی طرف جانے کے لیے ایک بات تو یہاں خدا کی سکیم کی ہو رہی تھی لیکن اوپر جانے کے لیے ایک نقشہ بڑا خوبصورت ہے یونہی ذہن میں وہ شعر آگیا:

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تیری انگڑائی کا

یہ تغزل کے اندر شعر ہے۔ اس کے اندر کتنی بلندیاں ہیں: اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہے۔ تو یہ جو خدا کی اسکیم ہوتی ہے' جس کی ابتدا سماء سے ہوتی ہے' وہ اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز ہوتی ہے مگر ہوتی ہے یہ بتدریج۔ یہ خدا کے ایک ایک دن میں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی' مقامِ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کا یہ ایک ایک دن تمہارے حساب وشمار سے ہزار ہزار (32:5 ;22:47) سال کا ہوتا ہے اور پچاس پچاس ہزار سال (70:4) کا ہوتا ہے۔ یہاں سورۃ السجدۃ کی پانچویں آیت (32:5) میں تو عام الفاظ میں بات کہی ہے اور دوسرے مقام یعنی (22:47) میں آپ دیکھیے وہاں اس تباہی کے متعلق بالخصوص کہا ہے کہ **وَ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالۡعَذَابِ** (22:47) یہ جلدی مچا رہے ہیں' تقاضا پر تقاضا کر رہے ہیں کہ وہ عذاب جس کی انہیں دھمکی دی جارہی ہے' آتا کیوں نہیں' کب آئے گا؟ اس کے آنے کے لیے وہ جلدی مچا رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ **وَلَنۡ یُّخۡلِفَ اللّٰهُ وَعۡدَهٗ** (22:47) خدا کے قانون میں کبھی

بھی وعدہ خلافی نہیں ہوتی' وہ ہو کر رہتا ہے' جو کہا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ یہ اٹل قانون ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جب یہ نتائج خدا کے کائناتی قانون کے مطابق مرتب ہوں تو ان کے ظہور میں دیر لگتی ہے اس لیے کہ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (22:47) ❶

قوموں کی زندگی صدیوں پر محیط ہوتی ہے

اگر خدا کے ایک دن میں بھی وہ واقعہ ہو جائے تو تمہارے حساب وشمار سے اس میں ہزار سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔قوموں کی زندگی بھی دنوں اور مہینوں سے نہیں ماپی جاتی' اس کے اندر صدیاں ہوتی ہیں' وہ تو اگر زوال پذیر بھی ہوتی ہیں تو صدیاں لگ جاتی ہیں مثلاً اورنگزیب (1707-1618ء) کی موت کے بعد تباہی تک پہنچنے کے لیے اس میں بھی اس کو ڈیڑھ سو سال لگ جاتا ہے۔تو یہاں کہا ہے کہ اس میں جلدی کی بات نہیں ہے۔اس کی رفتار خدا کے حساب وشمار سے یوں سمجھیے کہ اگر وہ اس کے حساب سے ایک دن میں بھی واقعہ ہو تو وہ ایک دن تمہارے حساب وشمار میں ہزار سال کا بھی ہو سکتا ہے' تو گویا اس نے بتایا یہ ہے کہ یہ جو قوموں کی تباہیاں آتی ہیں وہ ایک دن میں نہیں آجاتیں۔تو یہ جو جلدی مچا رہے ہیں' ان سے کہیے کہ وہ واقعہ ہو کر رہے گا' یہ اٹل بات ہے۔''کب واقعہ ہوگا؟'' یہ خدا کے قانونِ مکافات کے حساب میں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر آپ سنکھیا کھائیں تو اسی وقت موت ہو جائے اور یہ جو آج کل ہیروئین وغیرہ پی جاتی ہے' خودکشی تو اس میں بھی ہوتی ہے مگر وہ ذرا زیادہ وقت لے لیتی ہے' وہ درجہ بدرجہ ہوتی ہے۔تو خودکشی کے مختلف طریقے ہوتے ہیں جبکہ غلط نظام کی کارکردگی بھی اسی شکل میں نکلتی ہے نیز یہ کہ قوموں کی موت وحیات کا پیمانہ خدا کے حساب وشمار کے مطابق صدیوں پر محیط ہوتا ہے اور اُس کی نتیجہ خیزی میں کسی قسم کی کوتاہی کا امکان نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ چیز جسے ہم ایمان کہتے ہیں کہ خدا نے غلط نظام کا جو انجام کہا ہے' وہ یقینی چیز ہے' وہ یقیناً واقعہ ہو کر رہتا ہے۔''کب واقعہ ہوتا ہے؟'' اس کے لیے تو نبی اکرم ﷺ نے بھی دریافت فرمایا تھا تو جواب یہ تھا کہ یہ متعین کرنا کہ وہ کب ہوگا تمہارا کام نہیں ہے' تمہارے ذمہ عَلَيْكَ الْبَلٰغُ (13:40) اس پیغام کو پہنچاتے چلے جانا ہے۔ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40) یہ حساب ہمارے ذمہ ہے کہ اس کا نتیجہ کب مرتب ہوتا ہے۔تمہاری بے صبری کا عالم یہ ہوتا ہے کہ ''ہم جنوں کیندے ناں کالے پے جانے آں۔'' ❷ یہ ٹھیک ہے کہ وہ جو مظلوم بیچارہ ہے' جس کے بچے تین دن سے بھوکے ہیں' سردی میں کپڑا نہیں ہے' چھت گر گئی ہے' کوئی متبادل انتظام نہیں ہے' وہ تو اس انتظار میں کہاں رہے گا کہ ہزار سال کا عرصہ ہو گزرے تو اس ظالم کی کلائی مروڑی جائے لیکن کیا کیا جائے' وہ تو اپنے حساب سے ان تباہیوں کو لاتا ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ جو مظلوم ہے اس کے اوپر تو تباہی کا ایسا

---

❶ خدا کے کائناتی نظام میں ایک ایک دن کی مقدار ایسی ہے جیسے' تم لوگوں کی گنتی شمار کے مطابق' ایک ہزار سال ہو (32:5-5-70:4) (کائناتی تبدیلیاں' اور قوموں کے احوال وظروف میں تغیرات بڑے بڑے لمبے عرصے کے بعد رونما ہوتے ہیں)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ جلدی مچانے لگ جاتے ہیں۔

اثر نظر آتا ہے لیکن یہ بھی اس کی رحمت ہے کہ اس نے نظام یا عمل کے اس نتیجے میں وقفہ رکھا ہے تا کہ اس درمیان میں کوئی چاہتا ہے تو اپنی اصلاح کر لے لیکن بہرحال جن پہ یہ بیتتی ہے ان کے لیے یہ بڑا مشکل ہوتا ہے: کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک[1] وہ بیچارے تو یہ کہتے ہیں۔

صبر کا قرآنی مفہوم

لہٰذا ان تقاضوں سے مضطرب نہیں ہونا چاہیے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نبی اکرم ﷺ سے اگلی ہی آیت میں کہا گیا ہے کہ **فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا**[2] (70:5)۔ عزیزانِ من! ہم آپ تو ایک طرف رہے نبی اکرم ﷺ کے ذہن میں بھی یہ آتا تھا کہ ''یہ کب ہوگا؟'' انہیں کہا تھا کہ ضبط کرو، برداشت کرو، استقلال سے کام لو، ان چیزوں کو جو ہو رہی ہیں، Stead-fastly (مستقل مزاجی سے) سے کرو Bear (برداشت) کرو۔ یہاں **فَاصْبِرْ** ہے۔ یہ صبر بھی **صَبْرًا جَمِيْلًا** ہے۔ حسن کارانہ انداز سے ضبط کرو۔ ایک تو واویلا کرنے سے ضبط ہوتا ہے کہ کچھ بن نہیں پڑتا تو واویلا مچانے لگے۔ صبر کے یہ معنی ہمارے ہاں ہیں: جب بے کسی اور بے بسی انتہا کو پہنچ جائے، کوئی ذریعہ باقی نہ رہے تو اس بے بسی کے عالم میں کہا جاتا ہے کہ ''اچھا بہن! کی کرنا ہویا، ہن صبر کر، پاویں کنا وی نقصان ہووے، صبر کر۔[3]

عزیزانِ من! یہ صبراً جمیلاً نہیں ہے۔ یہ تو اپنی بے کسی اور بے بسی کی مجبوری کا نام ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے صبر مجبوری کا نام نہیں ہے۔ قرآن میں صبر کے بنیادی معنی کچھ اور ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ عرب اس زمانے میں جو کشتیاں لے جاتے تھے وہ بادبانوں کی ہوا والی کشتیاں تھیں۔ ان میں مسافر بھی ہوتے تھے اور سامان بھی ہوتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر اس میں وزن کا توازن نہ ہو تو یہی کشتی اس طرح ڈولتی ہے کہ ڈوب بھی جاتی ہے۔ اس زمانے میں دیدہ ور ملاح کرتا یہ تھا کہ جدھر سے وہ دیکھتا تھا کہ وزن کم ہے وہاں ایک بہت بڑا پتھر رکھ دیتا تھا۔ وہ یہ پتھر اس لیے رکھتا تھا کہ وہ کشتی ڈولے نہیں۔ اس پتھر کو وہ صابورہ کہتے تھے۔ اس طرح صبر کے معنی ہیں: ''وہ برداشت کہ جس سے قدم میں لغزش نہ آنے پائے، انسان نہ ڈولے'' کیا بات ہے **فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا** (70:5) کی! خدا کہہ رہا ہے کہ **اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝ وَّ نَرٰىهُ قَرِيْبًا** (70:6-7) یہ تو اس تباہی کو بہت دور دیکھتے ہیں کہ پتہ نہیں وہ کب آنے والی ہے۔ ان کی نگاہوں کے سامنے وہ بے نقاب ہو کر نہیں آ رہی اس لیے یہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ آتی واتی تو کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ کہا کہ یہ اس تباہی کو بہت دُور دیکھتے ہیں مگر ہم تو اس کو بہت ہی قریب دیکھ رہے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ فرق ہے ایک مردِ دیدہ ور کی نگاہوں میں اور ایک اس مدہوش

---

[1] آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک [غالب]

[2] تم اپنے پروگرام پر حسن کارانہ انداز سے ثابت قدم رہو۔ یہ اپنے وقت پر تکمیل تک پہنچے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[3] اے بہن! اب کیا کرنا ہے۔ اب صبر کر خواہ تیرا کتنا ہی نقصان ہو جائے۔ بس صبر کر۔

کی نگاہوں میں۔ جو استبداد اور ظلم کی مے سے مدہوش ہوگا اس کو یہ نہیں نظر آتی' بالکل یہی صورت ہوتی ہے، اور یہ جو شراب کا نشہ ہے وہ تو پوچھو نہیں کہ کیا کر دیتا ہے۔''اوئے جاندا نئیں سانوں۔ کیا بڑکاں ماردا پیا ہونداا اے۔ ❶'' یہ ہوتا ہے انداز اس کا خواہ وہ تھوڑی سی ہی کیوں نہ پی ہوئی ہو۔ یہ کیفیت ہوتی ہے اس کی: ''سانوں کون پھڑ سکدا اے اوئے۔''❷ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّھُمۡ یَرَوۡنَہٗ بَعِیۡدًا (70:6) یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تباہی کہیں بہت دُور ہے۔

قرآن فہمی کے لیے بصیرت سے دیکھنا شرط ہے

یہ نشے میں بدمست ہے' اسے یہ چیزیں نظر نہیں آتیں' آنکھوں پر سے پردے ہٹا کے' بصیرت کے ساتھ' دیکھے تو نظر آئے مگر بصارت کے ساتھ وہ نظر نہیں آئیں اگر وہ بصیرت سے دیکھتا تو وَ نَرٰىہُ قَرِیۡبًا (70:7) وہ تباہی اسے سامنے نظر آ جائے گی اور یہی چیز ہے جو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ مومن کی نگاہوں سے خائف رہا کرو' وہ چیزوں کو اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ جس نے قرآن کی رو سے فراست حاصل کی ہو' وہ بہت پہلے کہہ سکتا ہے۔ وہ مثلاً 1907ء میں کہہ سکتا ہے کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہو گا

(اقبالؒ: بانگِ درا)

وہ قرآن سے یہ بصیرت حاصل کرتا تھا'❸ قرآن کہتا ہے کہ وَ نَرٰىہُ قَرِیۡبًا ❹ (70:7)۔ خدا ہی نہیں دیکھتا جو خدا کی روشنی میں دیکھتا ہے اور خدا کی روشنی قرآن ہے' جو قرآن سے فراست حاصل کرتا ہے' اسے یہ بات قریب نظر آ جاتی ہے کہ اس غلط نظام کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہا کہ اس نظام سے وہ جو تباہی آئے گی اس میں ہوگا کیا؟ پھر بتایا کہ یَوۡمَ تَکُوۡنُ السَّمَآءُ کَالۡمُھۡلِ o وَتَکُوۡنُ الۡجِبَالُ کَالۡعِھۡنِ ❺ (70:8-9) کیا بات ہے! اس دن کے لیے اب یہاں سماء اور جبال کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ وہی ہے جو میں نے کہا ہے کہ یہاں اس

---

❶ ''اوئے! کیا تو ہمیں جانتا نہیں۔'' کیسی بڑی بڑی ڈھینگیں مارتا ہے!

❷ اوئے! کس کی ہمت ہے کہ ہمیں پکڑ لے۔ پکڑ کر تو دیکھے۔

❸ یہ اشارہ ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938) مفکر قرآن کی طرف ہے۔

❹ ہم اسے بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔

❺ اس وقت اِن بڑے بڑے فلک نشیں سرداروں کی قوتیں پگھل کر پانی ہو جائیں گی۔ تمام سرفرازیاں اور سربلندیاں پست ہو جائیں گی (55:37)۔ اور یہ جو اس وقت پہاڑ کی طرح جمے ہوئے نظر آتے ہیں' (دھنی ہوئی) اُون کی طرح فضا میں اڑتے دکھائی دیں گے (101:5) اور شاخِ شکستہ کی طرح خمیدہ ہو جائیں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کے مجازی معنی لیے جائیں گے۔ ان کے ہاں ''یہ جو سرکڈ جنوں اسی کیندے آں نا پنجابی اچ'' [1] یوں طرے باز خان اکڑ کے چلنے والا جیسے وہ اوپر والا خدا ہے' اسے وہ جبال کہتے تھے۔

بات طرے کی نہیں' بات تو قد کی ہے

قرآن نے کہا ہے کہ تو اتنا اکڑ کے چلتا ہے' کیا تو آسمان کو پھاڑ دے گا' زمین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا؟ جتنا تیرا قد ہے اس سے تو تو ایک انچ بھی اوپر نہیں ہوسکتا۔ تیری یہ جوتے کی ایڑیاں یا طُرّے کی بلندیاں تو یونہی ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ اصل ہے تو قد ہے تمہارا۔ کیا بات ہے! کہا کہ یہ جو سماء بنے پھرتے ہیں' کس طرح سے وہ پگھل کر پانی ہو جائیں گے! اس پگھل جانے کے لیے اس آیت میں قرآن کریم نے **مھل** (70:8) کا ایک لفظ استعمال کیا ہے' جو بڑا ہی غور طلب ہے۔

جہنم میں کسی کو باہر سے دھکا دینے کی ضرورت نہیں پڑتی

دوسری جگہ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ یہ بت برف کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب تک سورج نہیں نکلتا ان کا وقار قائم ہوتا ہے' دھوپ پڑتی ہے تو خود پگھل کے رہ جاتے ہیں۔ یعنی کسی شے کا ایسا ہونا کہ وہ خود پگھل کے رہ جائے' یہ اس لفظ ''**مھل**'' کے معنی ہیں۔ کہا کہ اس کے اندر یہ تباہی موجود ہوتی ہے' اس کے لیے کسی کو باہر سے دھکا دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اقبالؒ (1877-1938) نے تو انداز ہی اور اختیار کیا ہے۔ کہا:

ایں خدا تا سجدہ اش کردی خداست

یہ جو خدائی کے دعویدار ہیں' جب تک ان کے سامنے جھکے رہو' اس وقت تک ان کی خدائی قائم رہتی ہے۔

چوں یکے اندر قیام آئی فناست

جونہی تو کھڑا ہو گیا' یہ ختم ہو جائیں گے۔ یہ ہے **تَكُونُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ** (70:8)۔ کیا خوبصورت تشبیہات ہیں قرآن کی!

خدائی کے دعویدار یہ پہاڑ اور یہ چٹانیں بالکل ختم ہو جائیں گی

عزیزانِ من! اندازہ لگایئے۔ میں تو جب ان الفاظ پہ آتا ہوں تو آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لیے تو پچاس سال ہو گئے اتنی سی کتاب کو لیے ہوئے بیٹھا ہوں۔ کہا کہ **وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ** (70:8) اور یہ چٹانیں جو تمہیں پہاڑوں کی طرح نظر آتی ہیں' یہ اڑتی ہوئی' اون کی طرح' دھنکی ہوئی روئی کی طرح' ہو جائیں گی۔ نگاہ ڈالیے جو بڑے بڑے طرہ بازوں اور بڑے بڑے چٹانوں کے

---

[1] جسے ہم پنجابی زبان میں ''سرکڈ'' یعنی فلک نشیں سردار کہتے ہیں۔

پہاڑوں کی طرح تھے وہ کس طرح برف کی مانند پگھلتے ہیں' اون اور دھنکی ہوئی روئی کی طرح فضا میں اڑتے ہیں۔ پھر کہا کہ **وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا** (70:10) وہ جوان کے عہدِ اقتدار میں ان کے بڑے ہی گہرے دوست نظر آتے ہیں' (گرمجوش حمیم کے معنی ہیں' گرمجوش دوست جو نظر آتے ہیں) اس دن وہ ان کو پکارے گا' وہ جواب تک نہیں دیں گے۔ وہ اُن کے دوست نہیں تھے وہ تو ان کے اقتدار کے دوست تھے' وہ تو اکٹھے مل کر شراب پیا کرتے تھے' جب وہ ختم ہوگئی تو دوستی کا ہے کی؟ انہیں کوئی نہیں پوچھے گا' وہ آوازیں دے گا وہ جواب نہیں دیں گے: **يُبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ بِبَنِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـــْٔوِيْهِ** ❶ (70:11)

عزیزانِ من! شیکسپئر (Willam Shakespeare: 1564-16161) نے بھی ڈرامے لکھے۔ جب اُس کے قریب ترین دوست' جو اس کا وفادار بنا پھرتا تھا' نے ایک چوٹ لگائی تو وہ چیخ اٹھا! You too Bruce' اے بروس! تم بھی!!! یہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وہ جو اسے اپنے زعم میں نہایت قریبی دوست نظر آتے تھے وہ اس سے کہے گا مگر وہ اس کی بات کا جواب نہیں دے گا۔ اس دن وہ مجرم چاہے گا کہ وہ اس عذاب سے چھوٹ جائے اور اس کے کفارے میں' فدیہ میں' اپنی جگہ' (دیکھیے قرآن نے عذاب کی شدت کن الفاظ میں بیان کی ہے) چاہے گا کہ میرا بیٹا میری جگہ آ کے پھانسی پہ چڑھ جائے' میری بیوی آ جائے' میرا بھائی آ جائے' میرا کنبہ' میرا خاندان آ جائے۔ عزیزانِ من! فرمانِ خداوندی ہے کہ اس وقت نہایت قریبی دوست بھی پکارنے پر کوئی جواب نہیں دے گا اور مجرم اس دن چاہے گا کہ وہ اس عذاب سے چھوٹ جائے۔ وہ یہاں تک چاہے گا کہ **وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ** (70:14) جتنا کچھ زمین میں میرے پاس ہے' جتنا کچھ ملک میں میرے پاس ہے' میں وہ سارا کچھ دینے کو تیار ہوں' بس کسی طرح اس عذاب سے چھوٹ جاؤں۔

لفظ ''کلا'' کا مفہوم

عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ میں اس کا ایک ہی جواب ہوگا: **كَلَّا** (70:15) یہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ عربی زبان میں بڑے زور کا لفظ ہوتا ہے یعنی یہ نہیں ہو سکے گا۔ **اِنَّهَا لَظٰى** (70:15) ایسی تباہی کی آگ' تو شعلے مار کے دُور دُور تک جایا کرتی ہے۔ اِس سے کون بچ سکتا ہے۔ اس لیے وہ اس کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے بچ نہیں سکے گا کیونکہ **نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى** ❷ (70:16)۔ عزیزانِ من! یہ

---

❶ حالانکہ وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ وہ کس مصیبت میں بتلا ہیں۔ اور مجرمین اپنے ان دوستوں کو دیکھ رہے ہوں گے کہ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کرتے۔ ان میں سے ہر مجرم چاہے گا کہ وہ کسی اور کو اپنی جگہ فدیہ کے طور پر دے کر' خود اس عذاب سے چھوٹ جائے۔ اپنے بیٹے' بیوی' بھائی یا دیگر خویش قبیلے کے لوگوں کو جن کی خاطر اس نے دیانت و امانت کے سب اصول بالائے طاق رکھ دیئے تھے اور وہ اس کی پشت پناہ بننے کے مدعی تھے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ وہ انسان کی تمام قوتوں کو کھینچ کر نکال باہر کرے گا اور اس طرح اُسے عضوِ معطل بنا کر رکھ دے گا۔ (ایضاً)

بڑے عجیب لفظ ہیں، ان کے معنی ہوتے ہیں: ''انسان کی توانائیاں کسی طرح سے کھینچ کے باہر نکال لی جائیں اور یوں اس کو کمزور کر دیا جائے۔'' اس عمل (Process) کے لیے یہ الفاظ آتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے سرنج سے کوئی خون نکال لیتا ہے۔ اس سے اس کا پیکر تو وہی رہتا ہے اور شاید وزن بھی وہی رہتا ہے مگر اندر سے کمزور ہو جاتا ہے۔ اس طرح اندر کی توانائیوں کو اس طرح سے کھینچ کے نکال لینا اور اس طرح اس کو کمزور کر دینا نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی ہے۔

تباہی و بربادی کا دوسرا نام ہی تو جہنم ہے

عزیزانِ من! کس کس شکل میں قرآن تباہیوں کے منظر پیش کرتا ہے۔ اب اس منظر کو سامنے رکھیے۔ اس کا نام جہنم رکھ لیجیے، اس کا نام تباہی رکھ لیجیے، اس کا نام عذاب رکھ لیجیے۔ پھر کہا کہ وہ تباہی، جہنم یا عذاب کچھ دُور نہیں: تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰی ❶ (70:17) وہ تو آوازیں دے دے کر بلا رہی ہے: کہا جا رہا ہے اوہ، چلو، چلو ان چیزوں کو بیان کرنے کے لیے۔ قرآن کا انداز محاکاتی ہوتا ہے۔ یہاں کہا کہ وہ تباہی آوازیں دے دے کر بلا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کن کو؟ کہا: ان کو جنہیں صحیح نظام کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو وہ اس سے اعراض برتتے تھے، پیٹھ موڑ کے چل دیتے تھے، یہ انہیں آوازیں دے رہی ہے کہ جاؤ، دیکھو، ادھر آؤ۔

آخر یہ تباہی و بربادی کیوں؟

عزیزانِ من! یہاں رک کر ذرا سوچیے گا، غور کیجیے گا کہ یہ تباہیاں کس قسم کی ہوتی ہیں اور قرآن انہیں کن الفاظ میں بیان کرتا ہے، اس کی نوعیت کیا ہوتی ہے، تشبیہات اور استعارات میں اس سے مقصد کیا ہوتا ہے۔ آپ کچھ بھی مفہوم لے لیجیے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے اس کی شدت کا ہم پہ اثر ہوتا ہے۔ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ تباہی کیوں آتی ہے اور کس نظام پہ آتی ہے۔ ہمیں یہاں پہنچ کر رکنا چاہیے کیونکہ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے ہی یہ سب کچھ کہا گیا ہے۔ یہ یوں ایک پرانی داستان نہیں ہے جسے قرآن بیان کر رہا ہے۔ قرآن نے جہاں یہ تباہیاں بیان کی ہیں، اس کے آگے اس نے بتا دیا ہے کہ یہ کس قسم کے نظام کا نتیجہ ہے، کون لوگ ہیں جن کی وجہ سے یہ تباہیاں آتی ہیں۔

جمع فاوعی کا مفہوم

عزیزانِ من! اس آیت کے فوراً بعد، اگلی ہی آیت میں، پھر وہی بات ہے جو مجھ سے بار بار کہا جاتا ہے کہ تم تو جب بھی بات کرتے ہو، روٹی کے مسئلے پہ آ جاتے ہو۔ میں نہیں آ جاتا۔ کیا کروں؟ کیا میں قرآن کی ان آیتوں کو چھوڑ دیا کروں؟ سنیے! کس کس کے لیے یہ

---

❶ وہ تو آوازیں دے دے کر بلا رہی ہے ہر اس شخص کو جو اس نظام کی طرف سے منہ موڑ کر بھاگتا ہے اور گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تباہی آتی ہے؟ کہا ہے کہ یہ اُس نظام کے لیے ہے یا اُس شخص کے لیے ہے جو وَ جَمَعَ فَاَوْعٰی (70:18) مال و دولت کو سمیٹتا چلا جاتا ہے' اکٹھا کرتا چلا جاتا ہے' اور اکٹھا کرنے کے بعد تھیلی میں ڈال کر اس کا منہ اوپر سے کس کر باندھ دیتا ہے' تجوریاں بھرتا چلا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! پھر اس کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کے لیے دوسرا لفظ عجیب ہے: کسی چیز کو برتن میں رکھ کر اس کے اوپر ایسا ڈھکنا دیدینا کہ وہ وہاں سے نکل نہ سکے۔ یہ دو لفظ ہیں' عزیزانِ من! ''جمع'' پہلی چیز تو یہ ہے کہ سمیٹتے چلے جانا اور اگلی چیز یہ ہے کہ وہ کسی اور تک پہنچنے ہی نہ پائے' اس طرح سے ڈھک کے رکھ دینا' باندھ کے رکھ دینا۔ یہ نظام سرمایہ داری کے لیے کس قدر برجستہ تشبیہہ ہے: جَمَعَ فَاَوْعٰی (70:18)۔کہا: یہ اس لیے ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا [1] (70:19)۔عزیزانِ من! یہ بات نہیں ہے کہ اس کو اس کی بڑی ضرورت تھی۔ ایک چیز اصولاً یادرکھیے! اگر قرآن کے درس کے آپ کہیں نوٹس رکھتے ہیں تو یہ نوٹس بھی رکھ لیجیے کہ قرآن میں جہاں جہاں انسان کی الگ بات کہی ہے کہ انسان ایسا ہے' انسان ایسا ہے' اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر اس کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے' وہ وحی خداوندی کی راہنمائی میں نہ چلے' اپنی مرضی کے مطابق چلے' تو وہ ایسا ہوتا ہے اور پھر وہ حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتا ہے' ظالم ہوتا ہے' جاہل ہوتا ہے' تباہ ہوتا ہے' اسے ہوس ہوتی ہے' تکبر ہوتا ہے۔ انسان کے ساتھ یہ ساری چیزیں اس کے اندر رکھیں۔

انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی

یہیں سے ہمارے ہاں یہ چیز نکل آئی ہے کہ صاحب! یہ جمع کرنا اور گرہ مار کے رکھنا تو انسان کی فطرت میں ہے۔ ایک فطرت کا لفظ کہیں سے لیا اور اس پر یہ ساری عمارت تعمیر کر دی۔ یاد رکھیے! انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی۔ فطرت وہ شے ہوتی ہے جو بدل نہ سکے' جس کے بدلنے کا اسے اختیار نہ ہو جسکی وہ فطرت ہے۔ مثلاً پانی کی فطرت ہے: بہاؤ کی طرف جانا۔ یہ پانی کے بس میں ہی نہیں ہے کہ وہ چڑھائی کی طرف جائے۔ آگ کی فطرت ہے: حرارت بہم پہنچانا۔ وہ اس کو بدل نہیں سکتی۔ بکری کی فطرت ہے: گھاس کھانا۔ وہ گوشت نہیں کھا سکتی۔ شیر کی فطرت ہے: گوشت کھانا۔ وہ گھاس نہیں کھا سکتا۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے۔ یہ شیر بھی بن سکتا ہے' یہ بکری بھی بن سکتا ہے' یہ آگ بھی بن سکتا ہے' یہ پانی بھی بن سکتا ہے۔ اس کے اندر یہ تمام صلاحیتیں ہیں۔ اگر ان صلاحیتوں کو کنٹرول میں نہ رکھا جائے' اگر اس سیلاب کے پانی کو ساحلوں کے اندر محدود نہ کیا جائے تو پھر یہ طوفان اور سیلاب بن جاتا ہے۔ تو جہاں بھی قرآن میں انسان آئے گا' صرف الانسان یا انسان تو سمجھ لیجیے کہ وہ انسان ہے جو وحی کی راہنمائی میں اپنا Discipline (نظم و نسق) قائم نہیں رکھتا' جو سیلاب بن جاتا ہے اور اسی انسان کے متعلق جب یہ کہا جائے گا کہ یہ وحی کی روشنی میں چلتا ہے تو پھر وہ مردِ مومن ہو جاتا ہے۔ یہاں کہا کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (70:19) اگر انسان کو ایسے ہی چھوڑ دیا جائے تو یہ حیوانات سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ یعنی اس کی ہوس

---

[1] (ذرا غور کرو کہ انسان جب وحی کی راہ نمائی چھوڑ کر' حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے تو) وہ کس قدر تنگ دل' بھوکا اور بے صبرا ہو جاتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کی تسکین ہی نہیں ہوتی۔ یہ بالکل صحیح بات ہے۔ کہا کہ یہ جو جمع کیے جا رہا ہے اور تجوریوں میں بند کیے چلا جا رہا ہے تو یہ نہیں ہے کہ اسے اس کی ضرورت ہے۔ اس کے یہ جتنے بھی جمع کرنے والے اور بند رکھنے والے ہوتے ہیں وہ Capitalists (سرمایہ دار) ہیں۔ ان کی ضرورت کا تو پوچھیے نہیں! ان کی تو آخر میں جا کر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ دو روٹیاں جو ایک غریب مزدور کھاتا ہے' یہ وہ بھی نہیں کھا سکتا۔ میں نے ایسے دیکھے ہیں لیکن اس پہ بھی اس کی کیفیت یہ ہے کہ جمع کیے چلا جا رہا ہے اور پھر **هَلُوْعًا** (70:19) بہت زیادہ تنگ دل' بھوکا اور بے صبرا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ **اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا o وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا** [1] (70:20-21)۔ اسے محاکاتی انداز میں یوں کہیے کہ کہیں کاروبار میں ذرا سا نقصان ہوا: کہا کہ بیڑہ غرق ہو گیا۔ اب ماتم ہو رہا ہے' افسردہ ہو کے بیٹھے ہیں کہ کیا ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ صاحب! توقع یہ تھی کہ اس سے دس لاکھ بچے گا' اب ایک ایسا جھٹکا لگا ہے: وہاں امریکہ میں ڈالر کی قدر و قیمت کم ہوئی ہے' وہ دس کی بجائے پانچ رہ گیا۔ صاحب! بیڑہ ہی غرق ہو گیا۔ اور جب یہ چیز آتی ہے تو دیکھیے قرآن نے کیا لفظ استعمال کیا ہے: **مَنُوْعًا** (70:21) پھر وہ کوشش کرتا ہے کہ کوئی اس کے پاس نہ پھٹکنے پائے' کوئی لینے والا' مانگنے والا' کوئی ضرورت والا' کوئی احتیاج والا اس کے راستے میں نہ آ جائے' رکاوٹیں ڈال کر اس کو بند رکھتا ہے' وہ اس کے اوپر ڈھکنا دیدیتا ہے۔

ھلوعاً کا مفہوم

عزیزانِ من! وحی خداوندی کے تابع نہ چلنے سے انسان کی حالت حیوان سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ حیوان "**هَلُوْعًا**" (70:19) تنگ دل' بھوکا اور بے صبرا نہیں ہوتا۔ ایک بیل کے آگے کُھرلی میں کتنا ہی چارہ آپ ڈال دیجیے' وہ کھاتا ہے' جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو کتنا ہی چارہ باقی ہو وہ چھوڑ دیتا ہے' آرام سے بیٹھ جاتا ہے آنکھیں بند کر کے سر ہلاتا ہے' پھر جگالی کرتا ہے۔ کس مزے میں جگالی کرتا ہے! اسے اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ باقی چارہ کون لے جاتا ہے۔ وہ اپنی بھوک کے مطابق کھاتا ہے۔ اس کے برعکس انسان ھلوعاً ہے: بھوک کے لیے نہیں کھاتا' ہوس کے لیے جمع کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے کہا تھا کہ **اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ** (7:179) یہ انسان نہیں' حیوان ہے۔ اور آگے کہا ہے: یہ تو ان سے بھی زیادہ گیا گزرا ہے' ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ ہے۔ یہ تو اس بیل سے بھی گیا گزرا ہے جو باقی چارے کے متعلق نہیں سوچتا کہ کون لے جاتا ہے۔ کوئی دوسرا بھوکا بیل آ جائے تو وہ کھائے گا' وہ اس کو سینگ تک نہیں مارتا مگر

---

[1] اس کی بے صبری کا یہ عالم ہے کہ ذرا سی تکلیف پہنچے تو واویلا مچانا شروع کر دیتا ہے۔ تنگ دل ایسا کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی "ہے نہیں' ہے نہیں" کی رٹ لگاتا رہتا ہے۔ اور نیت کا بھوکا ایسا کہ جب مال و دولت ہاتھ آ جائے تو وہ اس کی ضرورت سے کتنا ہی وافر کیوں نہ ہو' اس میں سے ایک پائی بھی کسی ضرورت مند کو نہیں دیتا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

حضرتِ انسان هَلُوْعًا (70:19) واقع ہوا ہے۔

ھلوعاً کی مہلک بیماری سے کون بچتے ہیں؟

اس انسان کی کیفیت جَـزُوْعًـا (70:20) ہے۔ اس میں بے صبرا پن ہے۔ ''ہے نہیں ہے نہیں'' کی رٹ لگا تا ہے۔ آ گے سنئے عزیزانِ من! کہ کون لوگ ہیں جو ایسا نہیں کرتے' کون ہیں جو اس سے بچتے ہیں۔ کہا کہ اِلَّا الْـمُـصَلِّيْنَ (70:22) البتہ وہ لوگ ایسا نہیں کرتے جو مصلی ہیں۔ اب مصلی کا ترجمہ ہو جائے گا کہ نمازی ایسے نہیں ہوتے۔ کیا یہ بات ٹھیک ہے جو میں کہہ رہا ہوں؟ عزیزانِ من! ذرا سمجھیے پھر اس کے اوپر ہنسیے گا۔ بات بڑی دُور چلی جائے گی۔ قرآن کہتا ہے کہ مصلین ایسے نہیں ہوتے۔ آپ کے ذہنوں کے اندر قطار در قطار وہ نمازی آ جاتے ہیں جو اس سے بھی زیادہ بدتر ہوتے ہیں۔ اس کے پھر کیا معنی ہوئے۔ کیا آپ اس نتیجے پہ پہنچو گے کہ خدا نے (معاذ اللہ) غلط کہہ دیا ہے کہ مصلین ایسے نہیں ہوتے' ہم نے تو دیکھے ہیں کہ مصلین ایسے ہی ہوتے ہیں۔

یہ مصلین نہیں' یہ نمازی ہیں

عزیزانِ من! ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ خدا تو غلط نہیں کہے گا۔ اُس نے کہا ہے کہ ہم غلط نہیں بیان کرتے۔ تو یہ کیا بات ہوئی۔ یہ مصلین نہیں ہیں جنہیں آپ سمجھ رہے ہیں۔ یہ نمازی ہیں۔ صلٰوۃ کے متعلق تو اس نے خود قرآنِ کریم میں کہہ دیا تھا کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ❶ (29:45)۔ عزیزانِ من! یہاں لفظ فحشا ہے فحش نہیں ہے۔ فحشا بخل کو کہتے ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ صلٰوۃ معاشرے سے بخل کو اور بُری چیز کو روک دیتی ہے۔ جو صلٰوۃ یہ کرتی ہے وہ خدا کی قائم کردہ صلٰوۃ ہے' جو یہ نہیں کرتی ہے وہ صلٰوۃ نہیں ہے' وہ نماز ہے۔ اب اگر آپ کا جی ہنسنے کو چاہتا ہے تو اس میں یہ امتیاز کر لیجیے کہ آپ یہ بات موجودہ نمازیوں کے متعلق کہتے ہیں' اور خدا مصلین کے متعلق یہ بات کہتا ہے۔ یہ چیز ہنگامی نہیں ہے کیونکہ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ❷ (70:23)

صلٰوۃ ایک نظام کا نام ہے

عزیزانِ من! صلٰوۃ ایک نظام کا نام ہے۔ صلٰوۃ کے بنیادی معنی ہیں ''کسی کے پیچھے پیچھے' مسلسل اور متواتر' ایسے چلے جانا کہ اس

---

❶ یقیناً نظامِ صلٰوۃ لوگوں کو ان کی اس روش سے روک دے گا جس کی رو سے' ہر فرد سب کچھ اپنے لیے سمیٹنے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور دوسروں کی پرورش کا خیال کسی کو نہیں آتا اور اس مقصد کے حصول کے لیے' عقل خود بیں کی فریب کاریاں' انہیں عجیب عجیب طریقے سمجھاتی رہتی ہیں (70:21-27)۔

❷ وہ لوگ (مصلین) جو اپنے انفرادی مفاد کے پیچھے چلنے کے بجائے' خدا کے نظامِ ربوبیت کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور اس روش پر نہایت ہمت اور استقلال اور التزام اور مداومت سے قائم رہتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

میں اور تم میں فرق نہ ہو لیکن رہو پیچھے۔'' اس نظام میں آگے آگے خدا جا رہا ہے اور اس کے پیچھے مسلسل ومتواتر مصلین چلے جا رہے ہیں اور کہا کہ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (1) (11:56) جب تم دعا مانگتے ہو کہ ہمیں صراطِ مستقیم پہ چلا تو یاد رکھو! تمہارا خدا صراطِ مستقیم پہ جا رہا ہے' اس کے پیچھے پیچھے چلتے چلے جاؤ۔ یہ صلوٰۃ ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وہ مصلین اس پر دَآئِمُوۡنَ (70:23) ہیں۔ ہنگامی طور پہ نہیں ہے کہ کسی وقت یہ ہو گیا' کسی وقت نہیں ہو گیا' یہ تو ایک نظام ہے جسے مسلسل قائم رکھنا ہے' مسلسل اس کے اوپر چلتے چلے جانا ہے۔

عزیزانِ من! یہ جو مصلین کی چیز ہے اس کی تشریح قرآنِ کریم نے سورۃ الماعون میں کی ہے۔ یہ سورۃ 107 نمبر ہے اور کئی دفعہ درس میں آ چکی ہے۔ پھر سن لیجیے کہ وہ صلوٰۃ کیا ہے اور وہ مصلی کیا ہے؟ کہا کہ اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ (107:1) تم نے اس کی حالت پہ بھی غور کیا جو زبان سے تو اس کا اقرار کرتا ہے کہ وہ دین اسلام پر ہے اور عملاً اس کی تکذیب کرتا ہے؟ اس کا عمل کہہ رہا ہوتا ہے کہ یہ دین اسلام کی تکذیب کر رہا ہے' اس کا عمل دین کو جھٹلا رہا ہے۔ یہ کون ہے؟ کہا کہ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ (107:2-3) یہ وہ ہے جو ان لوگوں کو جو معاشرے میں تنہا رہ جاتے ہیں' بے یار و مددگار رہ جاتے ہیں' دھکے دیتا ہے' جو بھوکے رہ جاتے ہیں ان کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا۔ یہ ہے جو دین اسلام کی تکذیب کرتا ہے' دین کی تکذیب کرتا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ نہیں صاحب! میں پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں' بڑے اہتمام سے پڑھتا ہوں' بلکہ تہجد بھی پڑھتا ہوں' اشراق بھی پڑھتا ہوں' مجھے کیا کہہ رہے ہیں آپ کہ میں دین کی تکذیب کرتا ہوں۔ قرآنِ کریم ان کے لیے کہتا ہے کہ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ (107:4) تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے۔ ان نمازیوں کی تباہی ہے۔ اور آگے بتا دیا کہ خود ہی تاویلات نہ کرنے لگ جانا کہ کونسی تباہی ہے۔ انہیں اس کا پتہ ہی نہیں کہ صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟ ان لوگوں کے لیے کہا کہ اَلَّذِیۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ هُمۡ یُرَآءُوۡنَ (107:5-6) یہ وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو سجدہ رکوع سجود ہے جو لوگ دیکھ سکتے ہیں یہ نماز ہے' وہ اس نماز کے ان حرکات و سکنات کو تو نماز سمجھتے ہیں مگر نماز کا جو مقصد ہے یہ اُسے پسِ پشت ڈالے ہوئے ہیں۔ یہ نماز تو پڑھ رہے ہیں' مولوی صاحب کہہ رہے ہیں کہ تمہاری نماز ہو گئی' بالکل ٹھیک ہے کہ تمہارا پاجامہ ٹخنوں سے اوپر تھا' نماز قبول ہو گئی۔ تو یہ کیا بات ہے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ صلوٰۃ نہیں ہے' ان کی تباہی ہے۔

رزق کی تقسیم بہتے پانی کی طرح ہونی چاہیے

عزیزانِ من! یہ کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے صلوٰۃ کے مقصد کو نظر انداز کر دیا۔ اس سے اعراض برت لیا تو تباہی آ گئی۔ کہا کہ ان

---

(1) میرا خدا' (حق و عدل کی) سیدھی اور توازن بدوش راہ پر ہے۔ [لہٰذا تم بھی' اس کے پیچھے پیچھے' اسی راہ پر چلو (1:5)۔] (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کی اس خودفریبی کا نتیجہ یہ ہے کہ وَ یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) خدا کا وہ رزق جسے بہتے پانی کی طرح جانا چاہیے تھا اس کو بند لگا کے روک لیتے ہیں۔ وہ یہ نماز پڑھتے ہیں' فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ❶ (107:4-5)۔ وہ یہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ میں تو قرآن ہی پیش کرتا ہوں۔ یہاں کہا ہے کہ مصلین ایسے نہیں ہوتے۔ جیسا پہلے کہا گیا تھا کہ وہ ایسے نہیں ہوتے ایسے تو یہ نمازی ہوتے ہیں۔ ان کی **هلوعًا** والی بات ہوتی ہے: تنگ دل' بھوکے اور بے صبرے۔ ان میں تو جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ❷ (104:2) والی بات ہوتی ہے۔ یہ بات مصلین میں نہیں ہوئی وہ تو عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (70:23) اپنی صلوٰۃ پر نہایت ہمت' استقلال' التزام اور مداومت سے قائم رہتے ہیں۔ دیکھیے! **دائمون** کوئی ایسی چیز ہے جس پہ مستقل طور پر رہنا ہے۔ ان مصلین کے بارے میں اگلی بات یہ کہی کہ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ o لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (70:24-25) یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے مال میں ہر اس شخص کا حق ہے جس کا اپنی کمائی سے گزارا نہیں ہوتا' وہ محتاج ہو گیا ہے جس کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہے' اس کے مال میں ان کا حق ہے۔

خیرات تو انسان کو نفسیاتی طور پر تباہ کر دیتی ہے

قرآن کے نظام کی کیا بات ہے! اسے خیرات نہیں کہا۔ خیرات سے تو نفسیاتی طور پہ دینے والے اور لینے والے دونوں کی تذلیل ہوتی ہے۔ یہ نفسیاتی تبدیلی ہوتی ہے۔ اس سے لینے والے کے اندر Inferiority Complex (احساسِ کمتری) پیدا ہو جاتا ہے' وہ اپنے آپ کو نیچ Feel (محسوس) کرتا ہے۔ دینے والے کے دل کے اندر ایک تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''صدقے اور خیرات سے دل مر جاتا ہے۔'' یہ خیرات نہیں ہے یہ حق ہے۔ یہ As of right (بطور حق) ہے۔ یہ اس میں سے لیتے ہیں جس کے اندر اس کا حق ہے۔ جو حق لیتا ہے وہ اس کے اوپر یہ نہیں کہتا کہ مجھ پہ کوئی بہت بڑا احسان ہو گیا وہ تو اپنا حق لے رہا ہے۔ جو کسی کو اُس کا حق دیتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ میں نے اس پر کوئی احسان کیا ہے کہ میں نے اس کو دیا ہے۔ وہ تو اس کا حق دے رہا ہے۔ حق کے ساتھ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ (70:24) کہا ہے۔ یہ بات چپکے سے نہیں کہی ہے۔ یہ تو اُس قسم کے نظام میں اس قسم کے قانون ہونگے جو نافذ کیے ہوئے ہونگے۔ اس بات کا ہر ایک کو علم ہو گا کہ جس کی ذرا ضرورت رکے گی' جس کا چلتا ہوا کام رکے گا' اس کا حق ہو گا'

---

❶ کام تو ایسے کرتا ہے لیکن اپنے آپ کو ''دیندار'' ظاہر کرنے کے لیے نمازیں بہت پڑھتا ہے۔ اسی قسم کے نمازی ہیں جن کی نمازیں ان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں اس لیے کہ یہ نمازیں پڑھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں (یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں) کہ یہ بڑے متقی پرہیزگار ہیں۔ انہیں اس کا پتہ نہیں کہ صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے۔ اس کا مقصد تھا ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد قوانین خداوندی کا اتباع کریں اور عالمگیر انسانیت کو سامانِ نشوونما پہنچا رہے مگر اَلَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ (107:6) یہ اس کی غرض وغایت سے تو غافل رہتے ہیں اور اس کے محسوس ارکان (قیام' رکوع' سجود وغیرہ) کی ادائیگی کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ ہم فریضہ خداوندی سے سبکدوش ہو گئے (9:54)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ مقصد حیات یہ ہو کہ دولت اکٹھی کرتا رہے اور پھر گنتا رہے کہ اب کتنا روپیہ جمع ہو گیا اور اب کتنا۔ یعنی وہ ننانویں کے پھیر میں پڑ جائے۔ (ایضاً)

کہ نظام اس کا انتظام کرے گا' مملکت اسلامی اس قسم کا بندوبست کرے گی کہ کوئی ایسا رہے ہی نہیں کہ جس کی ضرورت رکی ہوئی ہو۔ وہاں کیفیت یہ نہیں ہے:

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست ❶

(اقبالؒ)

بات روٹی کی ہی نہیں ہے عزتِ نفس کی بھی ہے۔ کوئی شخص ذلیل ہوتا ہے جب کوئی شخص حاکم ہو اور یہ اس کا محکوم ہو تو ذلت تو آ گئی۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے ہر بنی آدم کو صاحبِ تکریم پیدا کیا ہے تو وہاں کوئی حاکم و محکوم بھی نہیں ہوتا' سائل و محروم بھی نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہاں جو کہا ہے کہ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ o لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (70:24-25) ابھی ابھی ہم نے سورۃ الماعون میں دیکھا ہے کہ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ❷ (107:1)

یوم الدین کی تصدیق کرنے والے

ان مصلین کو تم نے دیکھا ہے جو دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہاں یہ کہنے کے بعد کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے مال میں سائل و محروم کا معلوم حق ہے' کہا کہ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (70:26) یہ ہیں جو یوم الدین کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ تکذیب کرتے تھے دیکھا آپ نے تصریفِ آیات سے' قرآن کی آیات کو ملانے سے' مطلب کتنا اجاگر ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ وہ تکذیبِ دین کرتا ہے جو بے کس اور تنہا رہ جانے والے کو دھکا دیتا ہے' مسکین کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا' رزق کے چشموں کو بہتے ہوئے پانی کی طرح نہیں رہنے دیتا' بند لگا کے روک لیتا ہے۔ اور دین کی تصدیق وہ کرتا ہے جن کے مال میں مسکین اور محروم کا حقِ معلوم ہوتا ہے اور وہ انہیں دیتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ (70:27) جانتے ہیں کہ اگر غلط نظام پیدا ہوا' جس میں مال کو جمع کیا' روک کے رکھا' بند کر کے رکھا' وہاں سائل بھی محروم ہوئے' یتیم بھی ہوئے' ان کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے جو تباہی

---

❶ ہمارے ہاں (یعنی اسلامی مملکت میں) کوئی شخص اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا اس لیے کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا اور جب کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا تو پھر نہ کوئی کسی کا غلام ہوتا ہے نہ کوئی غلاموں کا آقا۔ حتیٰ کہ نہ یہاں کوئی حاکم ہے اور نہ محکوم۔ خدا نے جو غیر متبدل قوانین عطا فرمائے ہیں سب انہی کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں اور کوئی انسان کسی انسان پر حکومت نہیں کرتا۔ یہی قرآنی تعلیم کا مقصود و منتہی اور یہی اسلامی دستور و آئین کا ماحصل و لب لباب ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتا ہے لیکن عملاً دین کی تکذیب کرتا ہے۔ یعنی اس کا طرزِ عمل اس امر کی دلیل ہے کہ اگر دینداری یہی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا ہے تو پھر دین کا ہر دعویٰ جھوٹا ہے۔ (75:32-33; 95:7; 53:33) (ایضاً)

آتی ہے یہ اس سے ڈرتے ہیں کہ کسی طرح وہ تباہی نہ آجائے' وہ ڈرتے ہیں' وہ جانتے ہیں کہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُوْنٍ (70:28) جب وہ تباہی آتی ہے تو کوئی بھی اس میں مامون نہیں رہتا' اس تباہی سے کسی کو کہیں بھی پناہ نہیں ملتی۔ اس قسم کا معاشرہ تباہ ہو کر رہتا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقام پہ یہ کہا ہے کہ اس فتنے سے خوف کھاؤ محتاط رہو' اس کو روکو' آنے نہ دو' کیونکہ جب وہ آیا کرتا ہے تو وہ صرف ظالموں تک [1] ہی نہیں ہوتا' انہی کو نہیں پکڑا کرتا جنہوں نے ظلم کیا تھا۔ اس سیلاب کے اندر تو سارے بہہ جایا کرتے ہیں۔ روکو' اس فتنے کو نہ آنے دو' اس تباہی کو نہ آنے دو جس کی یہ کیفیت ہے۔ کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں مصلین کہا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! ذہن میں یہ نہ رکھیے کہ یہ جو ہمارے ہاں کی صلوٰۃ کے اجتماعات ہیں اور اس کی یہ شکلیں ہیں' میں اس کی تنقیص کر رہا ہوں۔ وہ اس نظام میں ضروری چیزیں ہیں لیکن وہ اسی صورت میں ہیں کہ جب ان اجتماعات کا' اس صلوٰۃ کا' اور اس نماز کا' نتیجہ یہ ہو کہ وہ معاشرے سے اُن چیزوں کو دُور کرے' اور یہ چیزیں پیدا کرے۔ ان کے اندر صلوٰۃ کا ایک نظام ہے' یہ کوئی ہنگامی Prayer (دعا یا نماز) نہیں ہے۔ اس صلوٰۃ کا نتیجہ قرآن نے خود بتا دیا کہ اس کے اندر کوئی بھوکا نہیں رہے گا' کوئی محتاج نہیں رہے گا' یہ لوگ اس تباہی سے ڈریں گے جو اس قسم کے نظام کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اہل یورپ کی حالت زار

عزیزانِ من! یورپ نے اپنے ہاں جو نظام قائم کیا تھا' اس نظام کے نتیجے میں' اس وقت' جس قدر آہ و فغاں' وہاں ہو رہی ہے اس کے مقابلے میں ہمارے دکھ تو دبے ہوئے دکھ ہیں' وہ تو ہم اندر ہی اندر آہ و فغاں کر رہے ہیں لیکن اگر آپ نے ترقی یافتہ قوموں کا لٹریچر پڑھا ہو تو آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ وہ کس قدر چیخ رہے ہیں اُس قیامت سے جو غلط نظام کی وجہ سے ان پہ آئی ہوئی ہے۔ یہ Physically (طبعی طور پہ) چاند پہ پہنچ رہے ہیں لیکن معاشرتی طور پر ان کے ہاں گھر کے اندر بھی کوئی اپنے آپ کو مامون نہیں تصور کر سکتا۔ غلط نظام یہ ہوا کرتا ہے۔ یہ مصلین وہ لوگ ہیں جو اُس نظام کو قائم کریں گے۔ آگے چند آیات میں بتایا ہے کہ اُن کی خوبیاں کیا ہیں۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ المعارج کی آیت 28 تک آ گئے ہیں' 29 سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

---

[1] وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (8:25) (اور اسے بھی یاد رکھو کہ اگر جماعت میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو اس قسم کے تذبذب میں گرفتار ہوں) تو اس سے جو مصیبت آتی ہے وہ صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہتی وہ سارے کے سارے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

گیارھواں باب: سورۃ المعارج (آیات 29 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1983ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المعارج کی آیت 29 سے ہو رہا ہے:(70:29)۔

قرآن کے معاشی نظام میں ضرورت سے زیادہ ملکیت کی اجازت ہی نہیں

سابقہ آیات میں قرآنِ کریم کے معاشی نظام کا ایک گوشہ سامنے آیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ جن لوگوں کے پاس اپنی ضروریات سے زائد ہو وہ ان کی ذاتی ملکیت نہیں ہو جاتا۔ اس میں ان لوگوں کا بھی حق ہوتا ہے' وہ لوگ اس سے بطور اپنا حق لے سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ضروریات اپنی محنت سے پوری نہ ہوتی ہوں یا وہ محنت کرنے کی استعداد سے ہی محروم ہو چکے ہوں۔ انہیں مسکین اور محتاج کہا جاتا ہے۔ آگے بڑھنے سے پیشتر میں یہ عرض کر دوں کہ جب کبھی بھی اسلام کے معاشی نظام کا ذکر آتا ہے تو عام طور پر ہی نہیں بلکہ خاص طور پر نوجوان طبقہ کے افراد آتے ہیں۔ وہ یہ بات سن کر کہتے ہیں کہ یہی تو کمیونسٹ کہتے ہیں۔ آپ کمیونزم کے اتنے خلاف ہیں اور قرآن کا وہی نظام پیش کرتے ہیں۔

کمیونزم والوں نے خود کمیونزم کا مطالعہ نہیں کیا

اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ جو کمیونزم یا کمیونسٹ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں خود انہیں بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کمیونزم ہے کیا۔ ہمارے ہاں تو علم کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ چند الفاظ ہوتے ہیں جو لوگوں نے یاد کر رکھے ہوتے ہیں۔ بڑے ہوں یا چھوٹے' اہلِ دانش وبینش ہوں یا عوام' کیفیت سب کی یہی ہے۔ میں نے تو دیکھا ہے کہ جو کمیونزم کے بڑے بڑے مدعی ہیں انہوں نے بھی بہت کم کمیونزم کا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ اس کے لیے اتنی گنجائش تو نہیں کہ میں تفصیل سے بتا سکوں کہ یہ کیا ہے' پھر بھی مختصراً کہتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کہ مارکس (Karl Marx: 1818-1883) نظامِ سرمایہ داری کے خلاف تھا۔ یہ نظامِ سرمایہ داری (Capitalism) ایک تخریبی چیز ہے اور انسانیت کے خلاف ہے۔ خدا کے نظام میں تعمیری بات آگے چلنی چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ پھر وہ معاشی نظام ہے کیا جو تعمیرِ انسانیت کا ضامن بنتا ہے۔ کارل مارکس نے جو اصول دیا تھا وہ یہ تھا کہ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق کام کرے اور اسے اس کی ضروریات پورا کرنے کے لیے دیا جائے۔ یہ بڑا زرّیں اصول ہے۔ یہ اصول اس کا اپنا اختراع کیا ہوا نہیں تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ اصول نافذ فرمایا تھا اور اس پہ عمل کر کے بھی دکھایا ہے۔ یہ تو وہاں کا اصول ہے۔

مارکس کے پاس کوئی جذبہ محرکہ نہ تھا

عزیزانِ من! کارل مارکس (Karl Marx: 1818-1883) نے اس اصول کو نظری طور پہ پیش کیا تھا۔ وہ شخص حقائق کو سامنے رکھتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس پر عمل کرانے کے لیے کوئی بنیاد نہیں مل سکتی کہ ایک شخص جان مار کر مسلسل محنت کرے اور اس میں سے صرف اتنا سا لے جتنا سا دو روٹیاں اس کو ضرورت ہے اور باقی سب دوسروں کو دیدے۔ سوال یہ تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا چلا جائے۔ اسے اس ''کیوں'' کا جواب نہیں مل سکتا تھا تو انہوں نے یہ طے کیا کہ چونکہ کمیونزم تو ممکن العمل نہیں ہے اس لیے اس سے نچلے درجے پر جو سوشلزم ہے' اسے ہی سر دست اختیار کر لیا جائے۔ اگرچہ انہوں نے یہ بات کہی تھی کہ اس گردشِ دوراں کے بعد ایک دور آئے گا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ دَور کب آئے۔ لیکن آخر الامر انسانوں نے آنا اسی پہ ہے۔ اس لیے سرِ دست ہم اسے تو نافذ نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس سے نیچے درجے پر سوشلزم ہے لہٰذا سرِ دست اسے ہی اختیار کیا جائے جب کہ سوشلزم دنیا کا بدترین نظام ہے۔ کیپٹلزم (نظامِ سرمایہ داری) میں ذرائع پیداوار اور دولت جو زائد ہو وہ مختلف افراد کے ہاتھوں میں رہتی ہے مگر سوشلزم میں یہ اسٹیٹ یا مملکت کے پاس چلی جاتی ہے۔

مملکت کی تعریف

عزیزانِ من! ریاست یا مملکت تو Abstract (غیر محسوس' نظری سے) الفاظ ہیں۔ جب ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو کہ یہ

کس کے پاس چلی جاتی ہے۔ اسٹیٹ کوئی مائی (عورت) تو نہیں بیٹھی ہوئی کہ جسے جا کر یہ کچھ دیدیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جن کے ہاتھوں میں اقتدار ہوتا ہے انہی کا نام اسٹیٹ ہوتا ہے۔ یہ ان کے ہاتھوں میں دیدیا جائے۔ آپ سوچیے کہ سیرت و کردار کے اعتبار سے انسان تو وہی ہوں جیسے ہم لوگ ہیں یا جیسے دنیا میں ہیں۔ ان کے پاس پہلے ہی فوج بھی ہو، پولیس بھی ہو، قانون سازی کے اختیارات بھی ہوں، جیل خانے بھی ہوں، ہنٹر بھی ہوں، موت کے لیے پھانسی گھر بھی ہوں، یہ سارا کچھ پہلے سے موجود ہو اور سارے ذرائع پیداوار اور دولت بھی انہی کو دیدی جائے تو آپ سوچیے کہ اس کے بعد وہ کس قسم کی فرعونیت کا نظام بن جائے گا۔ اسے سوشلزم کہتے ہیں۔ یہ نظام چل ہی نہیں سکتا تھا۔

دنیا کا بدترین نظام

روس میں بھی یہ نظام ناکام رہا، چین میں بھی ناکام ہوگیا۔ سوال یہ ہے کہ اس میں بنیادی کمزوری کیا تھی۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ نظام کے یہ الفاظ، قانون کے یہ الفاظ، دہرا دینے سے یا کاغذوں پہ لکھ دینے سے، وہ نظام قائم ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا۔ بات کچھ اور ہے۔

کمیونزم کے پاس کوئی ضابطہ قوانین نہیں

قرآن نے کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ انسانوں نے یہ سارا کچھ کرنا ہے۔ قرآن نے کہا کہ بات یہ دیکھنی ہے کہ وہ انسان کیسے ہوتے ہیں جو اس نظام کو چلاتے ہیں۔ اس کے لیے وہ پہلے انسانیت سازی کرتا ہے، پہلے وہ انسان بناتا ہے اور پھر ان کے ہاتھ میں یہ چیزیں دیتا ہے لیکن ان کے ہاں کمیونزم میں تو کوئی ضابطہ قوانین ایسا ہے ہی نہیں جو انسانوں سے بالا ہو۔ وہ نہ خدا کو مانتے ہیں، نہ وحی کو مانتے ہیں، نہ ضابطہ اخلاق کو مانتے ہیں، نہ Permanent Values (مستقل اقدار) کو مانتے ہیں۔ وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں مانتے ہیں۔ اس وقت اور زیادہ تفصیل میں تو نہیں جا سکتا۔ لیکن لینن (Vladimir Illich Lenin:1870-1924, also Lenin as Nikolai Lenin) نے 1920ء میں یوتھ کمیونسٹ لیگ کی کانگرس میں نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے جو کچھ کہا تھا وہ اس لینن (1870-1924ء) کے ہاں نہیں ہے۔ ان کے ہاں کمیونزم میں ہر جگہ یہ ملے گی کہ ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی فوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں۔ پہلی چیز ہی یہ ہوگئی کہ تمام ضوابطِ اخلاق جو کسی سپر ہیومن سرچشمہ سے، کسی فوق البشر سرچشمہ یعنی وحی سے ہو، ہم اس کو مسترد کرتے ہیں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے، دھوکا ہے۔ یہ تصور زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطہ اخلاق محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے مفاد کے تابع ہے۔ یہی ہمارے ضابطہ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ جب کہ اس کے برعکس سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطہ اخلاق احکامِ خداوندی پر مبنی ہے۔ اس پر سوشلزم کے مبلغین یہ کہتے

ہیں کہ ہم اس تصور کو ٹھکراتے ہیں' ہم خدا وغیرہ کو کچھ نہیں جانتے' ہم خدا کو مانتے ہی نہیں' ہمارا تصور یہ ہے کہ اخلاق انسانی معاشرے کا ہی نام ہے' اس سے ماوراء جو کچھ ہے فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے مطابق جس قدر افسانے وضع کیے گئے ہیں ہم ان کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔ اب یہ ہے انسان کے متعلق ان کا نظریہ: کوئی مستقل اقدار نہیں' کوئی اس قسم کا غیر متبدل ضابطہ اخلاق نہیں' انسانوں سے اونچا کوئی سرچشمہ ایسا نہیں' جہاں سے ہدایت یا قانون یا راہنمائی ملتی ہو' خود ہی ہم جس قسم کے قوانین بنائیں وہی قوانین ہیں کہ جن کے تابع نظام چلے گا۔ انسانوں کے اندر تبدیلی پیدا کرنے والی بات ضابطہ اخلاق کی رو سے ہوتی ہے اور وہ کسی غیر متبدل ضابطہ اخلاق کے ماننے والے ہی نہیں ہیں۔

سوچیے کہ پھر دنیا کا حشر کیا ہوگا

عزیزانِ من! اس کمیونزم کے نظام کی بنیادی یہ کمزوری تھی کہ انسانوں کے اندر کوئی تبدیلی نہ پیدا کی جائے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ محض قانون کے الفاظ کی بنیاد پر اس قسم کا نظام قائم کر دیا جائے تو یہ کچھ ہو جائے گا۔ اب وہ نظام جس میں پہلے سے ہی' جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' اتنی قوتیں اور اقتدارات انسانوں کے ہاتھوں میں ہوں' انہیں تمام دولت اور ذرائع پیداوار کا مالک بھی بنا دیا جائے' اس ایک ٹولے' گروہ' جماعت' جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے یا جس نے کسی طرح سے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور یہ سب کچھ بھی اس کے ہاتھ میں آ جائے' تو پھر آپ سوچیے کہ دنیا کا حشر کیا ہوگا۔ آپ جتنے زیادہ اختیارات انسان کو دیتے جائیں گے اور ان پر کسی قسم کی کوئی Controlling Authority (مرکزی اتھاریٹی برائے کنٹرول) نہیں ہوگی۔ وہ اتنا ہی زیادہ فرعون [1] بنتا چلا جائے گا۔ یہ ہے وہ وجہ جس سے یہ نظام کامیاب ہو ہی نہیں سکتا ہو۔

یہ بنیاد صرف قرآن کے پاس ہے

عزیزانِ من! اقبالؒ (1877-1938) نے' بہت پہلے جب کمیونزم کا چرچا ہوا' یا انقلاب آیا ہے' اس زمانے میں کہا تھا کہ

اے کہ مے جوئی نظامِ عالمے

اے کہ تو ایک عالمگیر معاشی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ انہوں نے روس سے کہا تھا کہ......

جستہ ای اورا اساسِ محکمے

کیا اس کے لیے تم نے وہ بنیاد تلاش کر لی ہے جس پر اس کی اتنی بڑی عظیم عمارت کھڑی ہو سکے؟ اور پھر انہوں نے بتایا تھا کہ یہ

---

[1] اس کی تشریح کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر منظور الحق (زیر نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء (فٹ نوٹ نمبر 1)۔

اساس، یہ بنیاد، قرآن کے سوا کوئی تیسری چیز نہیں ہوسکتی۔ میں نے یہاں تو ضمناً ایک اقتباس دیا ہے اور چند باتیں عرض کی ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ''نظامِ ربوبیت'' میں نظامِ سرمایہ داری اور رشیا (روس) کے اس نظام کی اصل حقیقت بتائی ہے اور قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد یہ دی ہے کہ قرآن انسانوں کے اندر پہلے تبدیلی پیدا کرتا ہے اور جب وہ تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے تو ان کے ہاتھوں میں اقتدار دیتا ہے۔ اس تبدیلی کی ایک جھلک ان الفاظ میں دی گئی ہے کہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ [1] (59:9) وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پہ ترجیح دیتے ہیں۔ یہ مومن کی ایک خصوصیت بتائی ہے۔ یہی جماعتِ مومنین کی خصوصیت ہے۔ آپ ذرا اس کو ذہن میں رکھیے تو نظر آئے گا کہ یہ کتنا عجیب انقلاب ہے، ورنہ ہر انسان، ہر شخص، ہر ذی حیات، اپنی ضرورت کو مقدم سمجھتا ہے۔

ایک تو یہ نقشہ ہے کہ کسی دوسرے کی ضرورت کو کوئی سمجھے ہی نہیں، اسے اس کا احساس ہی نہ ہو۔ یہ حیوانات کا درجہ ہے۔ اگر وہ سمجھے گا بھی تو زیادہ سے زیادہ یہ صورت ہوگی کہ اپنے آپ کو پہلے مقدم سمجھے گا اور اس کے بعد دوسرے کا خیال آئے گا۔

قرآن ایک درجہ آگے جاتا ہے

عزیزانِ من! قرآن تو ایک درجہ آگے جاتا ہے۔ وہ ایسے انسان تیار کرتا ہے کہ جب وہ اپنی اور کسی دوسرے کی ضروریات میں تقابل کریں اور محسوس کریں کہ اس کی ضرورت میری ضرورت سے زیادہ ہے تو اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیں، آپ محروم رہیں اور اسے دیدیں۔ یہ باتیں ہمیں تو آج محض وعظ اور افسانے سے نظر آتے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ ہم نے نہ ایسے مومن دیکھے، نہ ہم ایسے مومن بنے۔

نفسا نفسی کی بنیادی وجہ

قرآن جو بنیاد قائم کرتا ہے وہ انسانوں کے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کرتا ہے اور جب یہ اس قسم کے انسان وجود میں آجائیں تو یہ زمین، یہ دولت اور اسی قبیل کی یہ دوسری چیزیں تو ایک طرف رہیں، اگر ان کے ہاتھ میں پوری کائنات بھی دیدی جائے گی تو بھی اس سے بدنظمی کا کوئی واقعہ نہیں ہوگا۔ وہ فرعون نہیں بنیں گے بلکہ قوانین خداوندی کے سامنے اور زیادہ جھکتے چلے جائیں گے، اس وقت جو دنیا میں نفسا نفسی کی ایک قیامت برپا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ آج ایسے انسان نہیں ہیں۔

---

[1] یہ ہمیشہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انہیں خود تنگی ہی سے گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ (یہی سچے مومنین کا شعار ہے۔)(مفہوم القرآن۔ پرویز)

آبادی تو بڑھ رہی ہے لیکن انسان کم ہوتے جا رہے ہیں

عزیزانِ من! اس نفسا نفسی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ساری نگاہیں قوانین کے اوپر رہتی ہیں' الفاظ اور اصطلاحات پر رہتی ہیں' فارملزم (رسمی چیزوں Formalism:) پہ رہتی ہیں' رسومات پہ رہتی ہیں۔ جو مقصدِ حیات ہے' جو انسانیت کے اندر تبدیلی پیدا ہونی ہے' اس کا خیال کہیں بھی نہیں آ رہا۔ انسانوں کی آبادی تو بڑھتی چلی جا رہی ہے مگر ''انسان'' کم ہوتے چلے جا رہے ہیں اور اب تو شاید نایاب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ قرآن پہلے انسانوں کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرتا ہے اور جب وہ تبدیلی پیدا ہو چکتی ہے تو ان انسانوں کے ہاتھ میں اقتدار دیتا ہے۔ اس کے بعد تو کسی قسم کے خطرے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہے۔ کیا ان انسانوں سے کسی کو خطرہ ہوگا؟ نہیں قطعاً نہیں۔ سابقہ آیات میں یہی چیز آئی تھی کہ مصلین وہ ہیں جن کی کمائی میں' جن کی دولت میں' جن کی آمدنی میں' جن کے ذرائع میں' حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ o لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ❶ (70:24-25) ہے۔ وہ خیرات (Charity) کے طور پر نہیں اور نہ ہی دیان گیان کے طور پر دوسروں کو کچھ دیتے ہیں وہ تو اپنی کمائی کے اندر ان کا حق سمجھتے ہیں جن کی ضروریات رُکی ہوئی ہوں۔ اس نے یہ کہا تھا کہ یہ ہوتے ہیں جنہیں آپ مصلین کہتے ہیں۔ صلوٰۃ ان انسانوں کے اندر یہ تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ تو قرآن نے یہ اصول بتایا کہ ان کی کمائی میں حق ہوتا ہے اور اسے حقِ معلوم کہا ہے۔ یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے' ہر ایک کو اس کا علم ہوتا ہے۔ تو یہ ذہن میں رکھتے ہوئے یا ہمیں سمجھانے کے لیے کہا گیا ہے کہ اس قسم کا نظام ہوتا ہے جس میں ہر ضرورت مند کی ضرورت کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔

قرآن محض قانون نہیں بتاتا' انسان بھی بناتا ہے

عزیزانِ من! آگے یہی بات تھی کہ پھر وہ انسان کس قسم کے ہوتے ہیں۔ اگلی ہی آیت میں یہ بات بتادی کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ انسان کیسے ہوتے ہیں۔ یہ ہے قرآن! اس نے محض قانون نہیں بتایا' نظام کے خطوط نہیں سامنے لایا' صرف لائنز ہی نہیں کھینچیں' اس نے بتایا ہے کہ وہ انسان کیسے ہوتے ہیں۔ میں یہاں ان انسانوں کی موٹی موٹی دو چار خصوصیات بیان کروں گا' یاد رکھیے! قرآنِ کریم میں مومنین کی جس قدر خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ وہی ہیں جن کے اندر پہلے انسان یہ تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ جن انسانوں کے اندر یہ تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں' قرآن انہیں اس پروگرام کو بروئے کار لانے کا اہل قرار دیتا ہے۔ وہ اقتدار ان کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ کسی

---

❶ ایسا حق ہے جس کا سب کو علم ہے۔ یہ حق ان لوگوں کا ہے جن کی ضروریات ان کی کمائی سے پوری نہ ہوتی ہوں' یا جو کمانے کے قابل نہ رہیں اور اس طرح اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائیں۔ اس لیے وہ ان کا حق انہیں لوٹا دیتے ہیں اور اپنی ضروریات سے زائد اپنے پاس کچھ رکھتے ہی نہیں۔ (2:219) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

انسان کا کسی دوسرے انسان پہ حکومت کرنا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ یہ تو قرآن کی رو سے ہوتا ہی نہیں لیکن کسی کے حکم منوانے کا بھی یہ اختیار دینا' خواہ وہ خدا کا حکم ہو' کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ دونوں انسان ایک جیسے ہوتے ہیں۔ قرآن تو کرتا یہ ہے کہ پہلے انسانوں کے اندر یہ تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ یہاں بتایا کہ ہم نے یہ کہا ہے کہ وہ مصلین اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اب ان کی دو چار خصوصیات بھی سن لیجیے۔

معاشی نظام کے ساتھ جنسیات کا تعلق

عزیزانِ من! سب سے پہلی خصوصیت وہ ہے جس کے متعلق عام طور پہ سمجھا ہی نہیں جاتا کہ اس کا بھی کوئی تعلق معیشت سے یا نظامِ سیاست سے ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ **وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ o اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ o فَمَنِ ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡعٰدُوۡنَ** [1](23:5-7)۔ اس نے پہلی چیز جنسیات (Sex) کے متعلق بتائی ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' عام طور پر ذہنوں میں نہیں آتا کہ معاشی نظام کے ساتھ جنسیات کا کیا تعلق ہے۔ ہماری سمجھ میں تو یہ آ ہی نہیں سکتا' اس لیے کہ ہمارے ہاں تو تحقیق کا سوال ہی نہیں ہے۔ کچھ رسوم ہیں جو بلا تنقید چلی آ رہی ہیں۔ صدیوں سے یہ امت انہی پر کار فرما ہے۔ جنسیات کا جو ایک حدود فراموش نظام مغرب کی اقوام کے اندر کچھ عرصے سے رائج ہوا ہے' انہی نے تحقیق شروع کی کہ جنسیات کو ضوابط کے تابع رکھنے اور اس کو بے محابہ آزاد کر دینے میں قوموں کی زندگی پر کیا فرق پڑتا ہے۔

قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے کئی ایک درسوں کا مستقل موضوع ہی "قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر" قرار دیا تھا اور انہی کے ہاں کے محقق جنہوں نے خاص طور پہ اس مسئلے پہ تحقیق کی ہے' کا تذکرہ کیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے انون (Unwin) [2] کی کتاب کا حوالہ دیا تھا۔ وہ خود اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر جنسیات کو حدود کے اندر نہ رکھا جائے تو ایسی قوم زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک زندہ رہ سکتی

---

[1] اور انہوں نے اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھا اور انہیں صرف اپنی بیویوں پر صرف کیا یا ان لونڈیوں پر جو انسدادِ غلامی کے متعلق قرآنی احکام نازل ہونے سے پہلے (47:4) ان کی مِلک میں آ چکی تھیں (لیکن جنہیں' نکاح کے بعد بیویوں کا ہم پلہ قرار دیا جا چکا ہے)۔ ان سے زناشوئی کے تعلقات رکھنے پر کوئی ملامت نہیں۔ جو کوئی اس کے علاوہ جنسی تعلق کی کوئی صورت اختیار کرے' تو وہ قانون شکنی ہوگی اور حدودِ خداوندی سے تجاوز (جو سنگین جرم ہے۔ 24:2) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن سے 1934ء میں پہلی مرتبہ چھپ کر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کا نام ہے Sex and Culture اور اس کے مصنف کا نام ہے J.D. Unwin۔ ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیر نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء ص ص۔ 168-166۔

ہے اس سے زیادہ نہیں۔ یعنی وہاں یہ انفرادی سوال نہیں رہ گیا۔ انہوں نے تحقیق کی ہے کہ وہ قوم ہی تین نسلیں ہیں۔ آپ اسے زیادہ سے زیادہ سو سال کہہ لیجیے۔ اس کے بعد اس سے زیادہ عرصہ تک وہ قوم زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ زندہ نہ رہنے کے معنی ہیں کہ وہ قوم زوال پذیر ہو جاتی ہے' اس کا شمار مردہ اقوام کی صف میں ہونے لگ جاتا ہے۔ یہ صرف جنس کو غیر محدود طریق پر عام کرنے سے ہوتا ہے کہ ایسی قوم زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک زندہ قوم رہ سکتی ہے۔ یہ ان کی تحقیق ہے۔ قرآن نے پہلی چیز یہ قرار دی کہ جن کے ہاتھوں سے یہ نظام بروئے کار آئے گا' ان کے اندر پہلی چیز یہ ہے کہ وہ جنسیات کو ان حدود کے اندر رکھیں گے جو قرآنی یا وحی کے ضابطہ اخلاق نے متعین کی ہیں۔ وہ حدود غیر متبدل ہیں اور بتا دیا کہ اس کا طریقہ' نکاح کا طریقہ ہے۔ اب اس کے اندر **ما ملکت ایمانھم** کا بھی ایک لفظ آیا ہوا ہے۔

دوسرا موضوع غلام اور لونڈیاں

عزیزانِ من! **مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ** ایک دوسرا موضوع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان سے مراد غلام اور لونڈیاں ہیں۔ قرآن کے اندر یہ **مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ** بار بار آیا۔ میں چند الفاظ میں دہرا دوں۔ یہ بات تو درس کے اندر کئی دفعہ آ چکی ہے۔ نزولِ قرآنِ کریم کے زمانے میں' ویسے تو ساری دنیا کے اندر ہی غلامی عام تھی' عربوں میں خاص طور پر بڑی کثرت سے مرد غلام اور عورتیں لونڈیاں ہوتی تھیں' وہ جنگ کے قیدیوں کو بھی اس طرح سے غلام اور لونڈیاں بناتے تھے اور پھر یہ مارکیٹ میں بکتی بھی تھیں' ان کا تبادلہ بھی ہوتا تھا' پھر جو دوسرے ممالک اس سے بھی زیادہ کمزور تھے' یہ وہاں سے اغوا کر کے بھی لے آتے تھے' تو گویا یہ بڑی عام چیز تھی اور معیوب بھی نہیں تھی۔ یہ معاشرے کا ایک جزو بن چکی ہوئی تھی۔

غلام اور لونڈیوں کے متعلق قرآن کے احکام

قرآنِ کریم کے نزول کے زمانے میں ان کی آبادیوں میں ان غلاموں اور لونڈیوں کی اکثریت تھی۔ قرآن نے آ کر پہلی چیز تو یہ کی کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کے اس سرچشمے یعنی اس سوچ کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جائے گا' ان کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا۔ اور یہ قرآن ہے عزیزانِ من! کہا کہ اگر انہیں فدیہ دینے کی طاقت نہ ہو' ایسا نہ ہو سکتا ہو' تو انہیں بطورِ احسان چھوڑنا ہوگا۔ بہرحال ان کو چھوڑنا ہوگا۔ یہ تو آئندہ کے لیے ہوا اور جو اس زمانے میں موجود تھے' سارے قرآن میں ان کے متعلق احکام ہیں۔ **مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ** کے یہ معنی ہیں کہ وہ غلام اور لونڈیاں جو اس زمانے میں ابھی تک موجود ہیں۔ اگر ان کو شباشب ہی یہ کہہ دیا جاتا کہ ان سب کو آزاد کر دیجیے' یہ چلے جائیں' تو سوچیے کہ وہ جاتے کہاں۔ ان کا کوئی انتظام ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بڑی کثرت سے تھے اور ان کی معاشرت کی زندگی کا جزو بن چکے ہوئے تھے۔ یہ کہیں جا ہی نہیں سکتے تھے۔ انہیں تو کہیں ایک وقت کا

ٹھکانہ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ ان کے متعلق احکام دیئے کہ یہ جو مثلاً عمرؓ انہوں نے بطور لونڈیوں کے رکھا ہوا تھا' وہ انہیں بیویوں کی حیثیت سے رکھنا ہے۔

پہلے ایک ہی حکم میں ان کا درجہ لونڈیوں سے بیویوں کا بنا دیا' ان کی اولاد اپنی اولاد قرار دیدی گئی اور پھر قدم قدم پر کہا کہ انہیں آزاد کرو' غلام آزاد کرو' ذرا سی یوں لغزش ہوئی تو کہا کہ غلام آزاد کرو۔ ان کے لیے آزاد آزاد آزاد کا نعرہ تھا۔ آہستہ آہستہ ان کو یا تو اپنے معاشرے کا جزو بنالو یا آزاد کرواور یہ کہ آزاد کرتے وقت یہ دیکھو کہ اگر کسی غلام میں کما کر کھانے کی صلاحیت ہے لیکن اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے تو اس کو خود سرمایہ دے کر اس قابل بناؤ کہ وہ خود کما کر کھا سکے۔ قرآن کے احکام یہ ہیں۔ قرآن میں جہاں یہ **مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ** آیا ہے' اس سے اس زمانے میں موجود یہ غلام اور لونڈیاں مراد ہیں۔ اب وہاں گھر میں ان عورتوں کی یہ دو کیٹگریز (Categories) ہو گئی تھیں۔ ایک تو وہ ہے کہ بیوی کی حیثیت سے' نکاح کی حیثیت سے' آئی ہو اور دوسری وہ جو پہلے لونڈیوں کی حیثیت سے تھی اور پھر قرآن نے ان کو بیویوں کی حیثیت دے دی۔ وہاں یہ دو الگ شقیں تھیں۔ ایک شق کو قرآن ازواج کہتا ہے اور دوسری کو **مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ** تا ہے۔ پھر ان کے ہاں ان کی پوزیشن اور درجے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ قرآن نے تو یہ کیا۔ یہ اس کے بعد کی بات ہے کہ جب پھر وہ ہمارا دورِ ملوکیت آیا ہے۔ تو انہوں نے زمانہ قبل از اسلام کی ہر قسم کی جتنی بھی غیر اسلامی ہندوجاتی رسومات تھیں' ان سب کو اپنے معاشرے کے اندر رائج کیا۔ جب انہوں نے مملکت ہی مشاورت کی بجائے ملوکیت بنا دی تو پہلی ہی مملکت غیر اسلامی ہوئی تو پھر اس کے اندر اسلام کہاں رہنا تھا۔ ہر چیز غیر اسلامی آئی' غلام اور لونڈیاں بھی آئیں' سیلاب کی طرح آئیں۔ آپ کو یاد ہے کہ عباسیوں کے خلفاء (132-656AH بمطابق 750-1258AD) میں سے ایک ایک خلیفہ کے حرم میں تین تین ہزار لونڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ پتہ نہیں یہ کیا انسان تھے اور کیا ان کا معاشرہ تھا۔ وہ کچھ اب تک چلا آ رہا ہے اور اب تک یہ جو ہمارے ہاں کے بڑے بڑے اسلام کے ''سربراہان'' ہیں وہ سارے زور دیتے ہیں کہ لونڈیاں ضرور ہونی چاہئیں۔

پارلیمنٹ کے اجلاس میں ایک مولانا کا مطالبہ

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی حکومت کے دوران ❶ جب عائلی قوانین ❷ آئے تھے کہ چار بیویوں کی بھی پابندی عائد کی

---

❶ یہ بات 9 دسمبر 1983ء کو کہی گئی ہے۔

❷ مغربی پاکستان میں 1964ء میں عائلی عدالتوں کا قانون منظور کیا گیا جس کے تحت عائلی عدالتوں کو (۱) تنسیخ نکاح (۲) مہر (۳) نفقہ (۴) اعادہ حقوقِ زوجیت (۵) ولایت نابالغاں، (۶) جھوٹا دعویٰ نکاح کے مقدمات کی سماعت کا کلی اور بلاشرکت غیرے اختیار عطا کیا گیا۔ (جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن: قانونی لغت (نواں ایڈیشن۔ انگریزی اردو) پی ایل ڈی پبلشرز 2002ء ص۔226۔

جائے تو پارلیمان میں ایک مولانا صاحب نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ اگر یہ پابندیاں عائد کرتے ہو تو کم ازکم ایک لونڈی کی تو اجازت دیدو۔ یہ آپ کے ہاں کل کی بات ہے۔ بہرحال اس سے غرض نہیں ہے کہ اس اسلام میں کیا ہوتا رہا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ میں تو قرآن کا طالبعلم ہوں۔ قرآن نے جہاں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ کہا ہے' وہاں اس سے مراد وہ غلام اور لونڈیاں ہیں جو اس دور میں' زمانہ نزولِ قرآن کے وقت' عرب معاشرے کے اندر موجود تھیں' اور انہیں جذب کرنے اور آزاد کرنے کے سارے احکام قرآن میں موجود ہیں۔ بہرحال قرآن کریم نے جنسی تعلق کو محدود کر دیا۔ کہا کہ اگر اس سے الگ کوئی اور طریق اختیار کرو گے تو وہ خدائی احکام سے سرکشی ہوگی' ان حدود سے تجاوز ہوگا' اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآن نے جنسیات پر پابندی عائد کی۔ کہا کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں یہ نظام ہوگا' ان میں پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اپنے جنسی جذبات پر اتنا کنٹرول رکھیں گے۔ یہ ایک چیز ہے اور بڑی ہی اہم۔

قرآنِ کریم کی نظر میں امانت کا مفہوم

عزیزانِ من! اب آگے ایک بڑی ہی اہم بات آتی ہے۔ دو الفاظ آ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دو چیزیں معاشرت اور سیاست کے نظام کی بنیادوں میں سے ہیں۔ پہلی چیز کے متعلق کہا گیا کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (23:8)۔ اس آیت کا عام ترجمہ تو یہ ہوگا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہدوں' وعدوں کو پورا کرتے ہیں۔ امانت کے متعلق تو آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں اس سے کیا مفہوم لیا جاتا ہے: کوئی شخص کہیں جاتے وقت اپنی کوئی چیز' عام طور پہ روپیہ پیسہ ہی ہوتا ہے' کسی کے پاس بطور امانت رکھ جاتا ہے اور پھر جب وہ واپس آتا ہے تو اگر وہ امین ہے' دیانتدار ہے تو وہ اسے واپس دیتا ہے۔ ہمارے ہاں امانت کے یہی معنی ہیں۔ قرآن کا جو مملکت' حکومت' سوسائٹی' معاشرے' کا تصور ہے' اس میں اس امانت کو بڑی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ''امانت'' کی پہلی چیز جس پر کبھی کسی نے غور نہیں کیا' یہ ہے کہ امانت کا مادہ بھی امن یعنی ''ا م ن'' ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ''ایمان'' کا مادہ امن ''ا م ن'' ہے۔ مومن کا مادہ بھی امن ''ا م ن'' ہے۔ اسلامی معاشرے کی جو بنیادی خوشگوار خصوصیت بتائی ہے' وہ یہ ہے کہ وہ پہلے یہ دیکھے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) انہیں کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا' حزن نہیں ہوگا' امن ہوگا۔ قرآن نے جو کہا ہے' وہ بات تو ذرا بعد میں آئے گی۔ پہلے یہ دیکھیے کہ نظامِ حکومت میں ہوتا کیا ہے؟ جنہیں آپ صاحبِ اقتدار کہتے ہیں' ان کے پاس پیدائش سے' یا کسی جگہ سے آ کے' اختیارات واقتدارات کی قوتیں اور مال و دولت جیسی چیزیں تو نہیں ہوتیں' وہ عام انسانوں جیسے انسان ہوتے ہیں' ان کے پاس یہ کچھ نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ یہ کچھ کہاں سے آتا ہے؟ یہ قوم ہوتی ہے جو اپنی ان چیزوں کو ان کے سپرد کرتی جاتی ہے' اپنے اختیارات ان کو دیدیتی ہے' اپنی قوت ان کو دیدیتی ہے' اپنی دولت ان کو دیدیتی ہے۔ یہ کیوں دیدیتی ہے؟ کہا کہ یہ اس لیے دیدیتی ہے کہ تم یہ لو تا کہ ہم امن میں رہ سکیں' تم ہمارا امن قائم رکھ سکو۔ ذرا دومنٹ کے لیے عزیزانِ من! غور کیجیے گا کہ بات کیا ہوئی

ہے؟ زندگی کو آساں بنا دیا۔ جو غم ملا' اسے غمِ جاناں بنا دیا۔ یہ در دِسر میں کیوں اپنے پاس رکھوں' تم اپنے پاس رکھو تا کہ میں رات کو آرام سے سوؤں' تم اسے اس کی حفاظت کرو تا کہ میں امن میں رہوں۔ اس لیے یہ اقتدار' یہ دولت' یہ قوت' یہ ساری چیزیں' اسٹیٹ کو' حکومت کو' اقتدار کے صاحبان کو' قوم دیتی ہے کہ قوم امن میں رہے۔

امانت کے نظام میں اور باطل کے نظام میں فرق

باطل کا نظام یہ ہے کہ قوم جتنا کچھ انہیں دیتی ہے' اتنا ہی قوم میں خوف بڑھتا جاتا ہے۔ ہر زائد چیز جو صاحبِ اقتدار کے پاس جاتی ہے' غلط نظام میں وہ قوم میں خوف کے بڑھانے کا موجب بنتی ہے۔ اس اختیار و اقتدار ملنے سے پیشتر کوئی شخص بھی ہو' خواہ صاحبِ اقتدار یا بادشاہ بھی کیوں نہ ہو' ڈکٹیٹر بھی کیوں نہ ہو' دورِ حاضرہ کے اندر بھی اقتدار کے خواہ وہ جمہوری طریق ہوں' خواہ وہ دوسرے طریق ہوں اس سے پہلے تو وہ دوسرے انسانوں جیسے انسان ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ان سے بھی کم درجہ کے ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ چیزیں کہاں سے آتی ہیں؟ سیدھی سی بات ہے کہ

تمہیں تو ''تم'' کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا
''جناب''،ہم نے بنایا''حضور''،ہم نے کیا

یہ کچھ انہیں کیوں بنایا' کیوں اپنی یہ چیزیں قوم نے ان کو کیوں دیں؟ یہ اس لیے دیں تا کہ قوم کو امن نصیب ہو۔ اسے کہتے ہیں امانت' عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ❶ (23:8)۔ یہ وہ صاحبِ اقتدار ہیں کہ جنہیں قوم اپنا یہ سب کچھ دیدیتی ہے تا کہ یہ آرام سے سوئے' یہ امن سے رہے؟ اسلامی نظام کی یہ ایک خصوصیت ہے۔ اندازہ لگایئے' عزیزانِ من! لمبی چوڑی بحثیں تو رہیں ایک طرف' اگر صرف اسی ایک خصوصیت کو پھیلا دیا جائے' تو پوچھو نہیں کہ بات کہاں تک چلی جائے۔ ان لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہوتا' قوم اپنی ان چیزوں کو ان کے سپرد کر دیتی ہے تا کہ قوم امن میں رہے اور یہ لوگ' جن کو اس نے کہا ہے کہ صاحبِ اقتدار ہیں یا اس نظام والے ہوتے ہیں' وہ قوم کے اس معیار پر پورا اترتے ہیں۔ اسے ٹرسٹ (اعتماد: Trust) کہا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں بھی ٹرسٹ (Trust) کے معنی یہی ہوتے ہیں یعنی کسی پہ بھروسہ کرنا لیکن قرآن کا لفظ تو بھروسہ سے بھی آگے جاتا ہے۔ قرآن کے نزدیک جب یہ چیز اس مرکز کے حوالے کر دی جائے تو انسان کا خوف ختم ہو جاتا ہے' اس کو امن نصیب ہو جاتا ہے اور کسی قسم کا ڈر نہیں رہتا۔

---

❶ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی امانتوں اور معاہدوں کا پاس رکھا (4:58)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تصوف کی دنیا میں بےخوفی کا حصول

عزیزانِ من! جو رہبانیت یا تصوف کے اندر بےخوفی کا تصور ہوتا ہے' اس کا انداز کچھ اور ہوتا ہے: وہ جنگل میں چلا جارہا تھا' آگے آگے گرو تھا' پیچھے پیچھے چیلا تھا' رات کا وقت تھا' اندھیری رات میں ہر دس قدم پہ وہ کہے: بابا جی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ وہ کہے: اوئے! تجھے ڈر کس بات کا لگ رہا ہے' پاگل چلتا رہ' یہاں تمہیں مار دینے والا کون ہے۔ پھر وہ دس قدم کے بعد کہے: بابا جی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ بابا جی کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے: ٹھہر جا۔ وہ ننگ دھڑنگ تھا۔ ایک لنگوٹی باندھے ہوئے تھا۔ اس سے کہا اوے! لنگوٹی دی لانگڑ کھول ❶۔ کھولی تو اس میں ایک پیسہ تھا۔ اس نے کہا: پھینک اس کو۔ اس نے اسے پھینک دیا۔ کہنے لگا: آ' اب تمہیں ڈر نہیں لگے گا۔ ڈر تھا اپنے پاس 'اس پیسے کا۔ رہبانیت نے تو کہا: کھول کے اس کو پھینک دے۔ اسلام نے کہا: پھینک نہ دے' اسے ان ہاتھوں میں دیدے کہ جو پھر تمہیں امن کے اندر رکھیں۔

طواف کا مفہوم

پیسہ پھینک دینے سے امن نہیں آتا۔ پیسہ ایسے ہاتھوں میں دیدینے سے امن نصیب ہوگا جو اسے تمہارے امن کے لیے ہی صرف کریں گے۔ تم سوؤ گے' وہ راتوں کو پہرہ دیں گے۔ تمہیں پتہ ہے' عزیزانِ من! یہ جو کعبے کا طواف ہوتا ہے' اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ طائفین کس کو کہتے ہیں؟ یہ بات مومن کی صفات میں سے ہے۔ یہ جو رات کو پہرہ دیتے ہیں' جنہیں گشت کرنے والے کہتے ہیں' انہی کو عربی زبان میں طائف کہتے ہیں۔ مومن کی صفت یہ ہے کہ وہ کعبے کو شہادت میں رکھ کر اس دنیا میں انسانیت سے کہتے ہیں کہ تم آرام سے سوؤ' ہم پہرہ دیں گے۔ انسان' ان افراد سے یہ کہتا ہے کہ یہ لو' یہ ایک پیسہ میرے پاس ہے' اسے بھی تم امن وامان قائم کرنے کے لیے لگا دو۔ قرآنِ کریم نے بڑے عجیب انداز سے ''قل العفو'' ❷ (2:219) کے ایک لفظ میں سمجھا دیا کہ یہ سب کچھ لے لو تا کہ مجھے امن نصیب ہو' یہ میرے لیے ہر وقت دردِ سر بنا ہوا ہے۔

یہ ہے ''قل العفو'' کا نتیجہ

سوچیے' عزیزانِ من! کہ پیسہ دے کر اگر امن نصیب ہو جائے تو یہ کتنا سستا سودا ہے۔ سنیے حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا نے خریدا تھا'

---

❶ لنگوٹ کا بند کھول دے۔

❷ بقدر اپنی ضروریات کے اپنے لیے رکھ لو اور جس قدر ان سے زائد ہے سب کا سب' نوع انسان کی پرورش کے لیے کھلا رکھو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

جامی نے ''یوسف زلیخا'' لکھی ہے۔ وہاں مصر کے بازار میں جائے خرید پر پہنچنے کے بعد جب وہ انہیں خرید چکیں تو وہ ایک عجیب شعر ہے' سہیلیوں نے پوچھا کہ تم نے کیا سودا کیا' کہنے لگی: سودا پوچھ رہے ہو:

دراہم چند دادم' جاں خریدم

میں نے سونے کے چند سکے دیئے اور جان خرید لی۔

تعالیٰ اللہ عجب ارزاں خریدم

اللہ کی قسم' سستا سودا کیا ہے؟ دراہم چند دادم جاں خریدم۔ ❶

عزیزانِ من! اسلامی نظام یہ ہے کہ ہر شخص اپنے چند دراہم ان کے سپرد کر دیتا ہے اور امن خرید لیتا ہے اور اس کے بعد دنیا سے کہتا ہے: تعالیٰ اللہ عجب ارزاں خریدم۔ ❷ غور فرمایا' عزیزانِ من! کہ قرآن نے ان لوگوں کی خصوصیات بتائی ہیں اور پہلی ہی خصوصیت یہ ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (23:8) یہ وہ لوگ ہیں کہ قوم جو کچھ امن کے لیے ان کے سپرد کرتی ہے' یہ اسے لیتے ہیں اور قوم کے امن کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں۔ مومن کے معنی ہیں: دوسرے کے امن کا ذمہ دار۔ ایمان لانے والا تو اس کے ثانوی معنی ہیں' بنیادی معنی دوسروں کے امن کے ذمہ دار ہونے کے ہیں۔ ایمان لانے والی بات دوسری ہے۔

خدا تعالیٰ کی ایک صفت: المومن

قرآن میں تو خود اللہ تعالیٰ کی ایک صفت المومن ہے۔ اگر مومن کے معنی ایمان لانے والا ہو' تو خدا کی یہ صفت کیا ہوئی کہ اللہ مومن ہے۔ ہم تو اللہ پہ ایمان لاتے ہیں' تو اللہ کس پہ ایمان لاتا ہے؟ مومن کے معنی ہیں: امن کی ضمانت دینے والا۔ یہ خدا کی صفت ہے اور جب خدا کے بندوں میں یہی صفت نمودار ہو جاتی ہے تو انہی کو مومن کہتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قوم یعنی امت اپنا یہ سارا کچھ ان کو دے جاتی ہے تاکہ تم ہمارے امن کی ذمہ داری لو۔ وہ بھی مومن ہوتے ہیں' یہ بھی مومن ہوتے ہیں۔ یہ ہے جسے قرآن هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ❸ (23:8) کہتا ہے۔ سوچیے' حضرات! ایک وہ کمیونزم یا سوشلزم کا دعویٰ ہے اور ایک یہ اسلام کے نظام کی بات ہے۔ یہ بات نظام یا قانون سے شروع نہیں کرتا۔ یہ انسانوں سے شروع کرتا ہے۔

---

❶ میں نے سونے کے چند سکے (Coins) دے کر جان خرید لی۔

❷ اللہ کی قسم! کتنا سستا سودا کیا ہے!

❸ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی امانتوں اور معاہدوں کا پاس رکھا (4:58)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سوال صرف نظام کا نہیں ان ہاتھوں کا بھی ہے کہ جنہوں نے یہ نظام قائم کرنا ہے

عزیزانِ من! اگرچہ وہ بات تو میرے سامنے ہے، میں اس کا اعلان بعد میں کرونگا۔ آئندہ درس پر ربیع الاول کے مقدس مہینہ میں عید میلاد النبی کی تقریب ہے۔ آئندہ جمعہ یا آئندہ درس اسی تقریب کے ضمن میں ہمارے سامنے آجائے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرا ایسی تقاریب پہ ایک درسِ خصوصی ہوا کرتا ہے اور پھر یہ تقریب تو وہ ہے جسے میں نزولِ قرآن اور حضور ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری سمجھتا ہوں۔ ہمارے لیے یہ دو ہی تو جشن کے میدان ہیں۔ تو اس پہ میں نے اس دفعہ ذہن میں رکھا ہی یہ ہے کہ یہ نظامِ اسلام قائم کرنے والے کس قسم کے ہوتے ہیں، اصل چیز ہی یہ ہے۔ نظام کے متعلق گفتگو تو ایک نظری بحث ہے، وہ تو کی جاسکتی ہے مگر یہ نظام قائم کرنے والے کس طرح کے ہوتے ہیں، اصل چیز ہی یہ ہے۔ اگر ہم ساری گفتگو کرتے بھی ہیں تو وہ نظام کے متعلق ہی کرتے ہیں کہ یہ ایسا ہوتا ہے، یہ ایسا ہوتا ہے۔ وہ تو بعد کی بات ہے کہ جن کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوتا ہے، وہ کیسے ہوتے ہیں۔ اس دفعہ کے عید میلاد النبیؐ کی تقریب کا جو درس ہے وہ آئندہ جمعہ کو ہی ہے۔ اس میں میرا عنوان ہی یہ ہے اور اتفاق سے ہی یہاں بھی یہ بات آگئی کہ اس نظام کے قائم کرنے والوں کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ **هُم لِاَمٰنٰتِهِم**۔ وہ امن کے قیام کے لیے ہیں اور اس کے بعد **وَ عَهْدِهِمْ**۔ وہ معاہدوں کا پاس رکھتے ہیں۔ عہد کا ترجمہ تو ہمارے ہاں وعدہ ہی کیا جاتا ہے۔ جس کو ہم Promise کہتے ہیں۔ یہ وعدہ اور عہد دو الگ چیزیں ہیں۔ عہد کے معنی ہوتا ہے: کسی چیز کی مسلسل حفاظت کی ذمہ داری لے لینا۔ یہ ان کو دیتے ہیں اور وہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعت مژگانِ یار تھا

(غالب)

یہ ایک ایک قطرے کا حساب دینا ہے۔ اب دیکھیں کہ یہ دو چیزیں امانات اور عہد کتنی اہم ہوگئیں، اس معاشی نظام کی کتنی بنیادی ہوگئیں۔ اور پھر ان کی مسلسل حفاظت کی ذمہ داری لے لینا اور بھی کس قدر اہم ہوگیا۔ جو دیں تو پھر ان کو دینا، جو اس کی حفاظت کرنا، اور ان کو امن کی ضمانت دیدینا نبھا سکتے ہوں۔ یہ ہے بنیادی چیز، یہ ہے ان انسانوں کی بنیادی خصوصیات جو ان افراد میں بدرجہ اتم ہوگی، اس نظام کو قائم کرنے کے اہل ہوں گے۔ **وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ** (70:33) ان کی کیفیت یہ ہے کہ جس بات کے متعلق انہوں نے کہنا ہے کہ ''ہاں ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ سچی چیز ہے'' وہ اس پر قائم رہتے ہیں۔

قانونِ شہادت اور ہم

عزیزانِ من! دنیا میں نظامِ عدل کی بنیاد ہی شہادت کے قانون پہ ہے۔ یہ قانونِ شہادت (Law of Evidence) عدل کے

نظام کی بنیاد ہے' اگر وہ شہادت یہ ہے جو آپ کے ہاں قانونِ ❶ شہادت کی صورت میں آج کل مرتب ہو رہا ہے اور ابھی باہر نہیں آیا تو اس میں عورت کی شہادت قابل قبول ہی نہیں ہے۔ اس سے پہلے جو حدود کے کچھ آرڈیننسز (Ordinances) آگئے ہیں' ان میں شہادت کے متعلق جو بات آئی ہے' وہ یہ ہے کہ اس میں ان کی تو شہادت ہی قبول نہیں۔ ہماری ان بیٹیوں اور بہنوں کی شہادت ہی قبول نہیں۔ ''بھلا ہویا' میں نیڑیوں چھٹیا' میری ساری لنگ گئی'' ❷ بعض نے کہا ہے کہ یہ بہت ظلم ہے۔ کچھ کہنے لگے: اچھا تو پھر عورت کی شہادت کے متعلق کیا حکم ہے۔ کہنے لگے کہ آدھی شہادت ہے۔ یہ آدھی شہادت بھی عجیب چیز ہے۔ بہرحال یہ دوسرا قصہ ہے۔ یہاں کہا ہے کہ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ (70:33) جب کبھی کسی معاملہ میں شہادت دیتے ہیں تو ہمیشہ حق وانصاف پر قائم رکھتے ہیں۔ نظامِ عدل ہی اس شہادت کے اوپر ہے۔ قَآئِمُوْنَ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس مجسٹریٹ نے ملزم سے کہا کہ تمہاری عمر کتنی ہے؟ کہنے لگا: جی' چوبیس سال۔ کہنے لگا: چوبیس سال؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ پانچ چار سال ہوئے' کسی جرم میں تم میری عدالت میں آئے تھے' تو میں نے تم سے پوچھا تھا تو تم نے کہا تھا: جی' عمر چوبیس سال ہے۔ آج بھی کہتے ہو چوبیس سال۔ کہنے لگا: جی' ہم ان میں نہیں ہیں کہ آج کچھ کہہ دیا کل کچھ کہہ دیا۔ ایک تو شہادت پہ قائم رہنے والے ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! صحیح نظام میں عدل کی بنیاد قانونِ شہادت پر ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ قرآن ایک جگہ تو ایک لفظ کہتا ہے' پھر دوسری جگہ اس کی تفصیل دیتا ہے۔ شہادت کے متعلق کہا ہے: یاد رکھو! مومن جو شاہد یا گواہ ہو' اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر شہادت اس کی اپنی ذات کے بھی خلاف جائے تو وہ سچی شہادت دیتا ہے۔ اپنی ذات کے بھی خلاف جائے! یہ بات قابلِ توجہ ہے۔ اور آگے ہے کہ اگر شہادت والدین کے خلاف جائے' رشتہ داروں کے خلاف جائے' دوستوں کے خلاف جائے اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر خود اپنی ذات کے بھی خلاف جائے تو پھر بھی وہ سچی شہادت دیتا ہے۔ پورا نظامِ عدل اس شہادت پر قائم ہے۔

---

❶ قیامِ پاکستان کے بعد حکومتِ پاکستان نے متحدہ ہندوستان کے بہت سے دوسرے قوانین کی طرح قانون شہادت مجریہ 1872ء کو بھی اپنا لیا تھا۔ یہ قانون پاکستان میں 28 اکتوبر 1984ء تک رائج رہا۔ اسی قانون کا مسودہ سر جیمس فٹز جیمس اسٹیفن (Sir Jamesfitz James Stephen) نے تیار کیا تھا۔ جناب جسٹس ایم منیر (ص 1895) نے اپنی کتاب (Principles and Digest of Law of Evidence) میں اس قانون کو اپنی نوعیت کا ایسا واحد قانون قرار دیا ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ 28 اکتوبر 1984ء کو صدر پاکستان نے اپنے ان اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جو انہیں اس ضمن میں حاصل ہیں' حکم نمبر 10 بابت 1984ء کے ذریعہ قانون شہادت مجریہ 1972ء کو منسوخ کرتے ہوئے اس کی جگہ قانونِ شہادت 1984ء کا نفاذ کیا اور 28 اکتوبر 1984ء سے اب یہ نیا قانونِ شہادت پاکستان میں نافذ ہے۔ (تراب احمد: قانونِ شہادت' مکتبہ فریدی' کراچی' 1985ء' ص۔11۔

❷ خوب اچھا ہوا کہ میں تو جلدی ہی چھوٹ گیا میری تو ساری عمر یونہی گزر گئی۔ (مجھ پہ اس کا اطلاق نہیں ہوگا)۔

انسان کا شدید ترین کنٹرول شکن جذبہ

عزیزانِ من! قرآن نے یہاں یہ تین چار خصوصیات ہی بتائی ہیں' دوسرے مقامات پر بھی مومنین کی خصوصیات بتائی ہیں لیکن یہی کچھ کم نہیں ہیں۔انسان کے اندر سب سے شدید ترین جذبہ جو کنٹرول کو توڑتا ہے' وہ جنس کا جذبہ ہوتا ہے۔مومن اس جذبۂ جنس پہ کنٹرول کرنے والا ہے۔امانات کی اس طرح سے حفاظت کرنے والا ہے کہ ہر ایک کو امن نصیب ہو جائے۔نظامِ عدل کی بنیاد جس شہادت پہ ہے یہ اسے قائم رکھنے والا ہے۔

بات آئی تھی'مصلین کی' جنہیں ہم نے نماز پڑھنے والے کہا ہے'ان کے لیے قرآن کریم نے کہا ہے: **اَلَّذِیۡنَ ھُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ** [1] (70:34) یہ صلوٰۃ ہے جس پر وہ ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور یہ آج کل مصلی ہیں' جنہیں ہم نمازی کہتے ہیں۔انہیں دیکھ کر مجھے وہ واقعہ یاد آ جاتا ہے۔باپ نے آ کر کہا کہ میں وہ سودا کر آیا ہوں۔بیٹے نے کہا کہ ابا جان! یہ تو آپ بڑا گھاٹے کا سودا کر آئے ہیں' یہ تو بڑی بری بات ہوگئی' اس کو تو فسق کیجیے۔کہنے لگا: ''کوئی گل نہیں ڈرنے کی۔کرلاں گے اسیں کجھ۔کہنے لگے: کرلوگے تاں ہنے کجھ کرلو۔کہنے لگے: اوئے کوئی گل نئیں۔اسیں رپھڑ پادیاں گے۔کہنے لگا: جی' جاؤ تے اے کرآ و۔کہنے لگے: ہن نماز عصر دا تا ویلا تنگ ہوندا جاندا پیاا ے۔میں اے نماز پڑھ لاں' تے فیر مگروں' اے کرلاں گا۔کوئی گل نئیں۔ [2] مگر قرآن کہتا ہے کہ **ھُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ** (70:34) وہ لوگ خدا کے متعین کردہ نظامِ صلوٰۃ کے محافظ ہوتے ہیں۔**اُولٰٓئِکَ فِیۡ جَنّٰتٍ مُّکۡرَمُوۡنَ** (70:35) یہی لوگ ہیں جو باعزت جنتی معاشرہ کے مستحق ہیں۔اور پوچھتے ہو کہ جنت میں کون جائے گا؟ سنو یہ ہے جن کو جنتی کہتے ہیں۔اور پھر جنت کی تعریف بتائی۔

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم نے جو اس نظام میں ضمانت دی ہے' وہ صرف رزق کی ضمانت نہیں دی' **رزق کریم** کی ضمانت دی ہے' یعنی باعزت روٹی کی ضمانت دی ہے۔اور روٹی کی محتاجی انسان کو ذلیل کرتی ہے۔نظر آتا ہے کہ قرآن نے ہر جگہ رزق کریم کہا ہے۔یہاں جنّت کہا ہے۔ جسے جنت کہا جاتا ہے' یہ بڑی جامع اصطلاح (Term) ہے۔وہ قیامت والی جنت تو وہاں آئے گی' ہم وہیں دیکھیں گے۔یہ جن کی خصوصیات بتائی چلی جارہی ہیں' ان کا سارا نظام یہاں قائم ہو رہا ہے۔اس کے بعد کہا ہے کہ یہ وہ جنتی معاشرہ ہے جس میں دینے والے اور لینے والے دونوں کی عزت و تکریم باقی رہتی ہے۔

---

[1] یہ لوگ خدا کے متعین کردہ نظامِ صلوٰۃ کے محافظ ہوتے ہیں۔(خود اس پر التزاماً قائم رہتے ہیں اور اسے قائم و مستحکم رکھنے کے لیے کوشاں و سرگرداں)

[2] ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔واپس آ کر کچھ کرلوں گا۔کہنے لگے: جی! کیا کرلو گے؟ ابھی کرلو۔کہنے لگے: ارے کوئی بات نہیں۔ہم جھگڑا کھڑا کردیں گے۔کہنے لگا: جی! جاؤ اور یہ کر آو۔کہنے لگے: اب نمازِ عصر کا وقت تنگ ہوتا جارہا ہے۔میں نماز ادا کرلوں تو آ کر یہ کرلوں گا۔اس کی کوئی بات نہیں۔

جنت کی تعریف اور ایک لفظ رزقِ کریم

عزیزانِ من! یہ جنت وہ ہے جو کہ مومن کی جنت ہے۔ اس سے اگلی ہی آیات میں کہا کہ **فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ o عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ o اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ** (70:36-38) یہ جو اس کی تکذیب کرتے چلے آ رہے ہیں' جو ان خصوصیات کو بالائے طاق رکھے ہوئے ہیں' ان میں سے کوئی چیز ان کے پاس نہیں ہے۔ جب یہ جنتی معاشرہ ان مومنین کے ہاتھوں سے قائم ہوگا تو اس کی خوشگواریوں کو دیکھ کر یہ تمہاری طرف دوڑے ہوئے آئینگے کہ صاحب! ہمیں بھی Admit (داخل) کر لیجیے۔ ہمیں بھی ٹکٹ دیدیجئے' ہمیں بھی پاس دیدیجیے۔ کہنے لگے: یہ کیا چیز کہتے ہیں؟ ان ٹکٹوں اور پاسوں سے اس جنت میں نہیں آیا جا سکتا' مگر دوسروں کو دیکھ کر یہ بھاگے ہوئے آئیں گے۔ یہ ہے' عزیزانِ من! اسلام کی تبلیغ کا طریق کہ ایسا نظام قائم کیجیے جس کے انسانیت ساز نتائج کو دیکھ کر دنیا' **يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا** (110:2) ' دنیا گروہ در گروہ اس طرف بھاگی ہوئی آئے۔ کہا کہ انہوں نے یہ خصوصیات تو پیدا نہیں کیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ انہیں بھی اس جنت نعیم کے اندر حصہ مل جائے۔ قرآن کریم نے کہا ہے: **كَلَّا** (70:39) نہیں' وہ جنتی زندگی اس طرح نہیں مل سکتی۔ بڑا عجیب اعلان ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا؟ اس کے ہونے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ **اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ** [1] (70:39)۔ انہیں معلوم ہے کہ ہم نے ان کی پیدائش کا کیا مقصد بتایا ہے؟ وہ مقصد قرآن نے بتایا ہوا ہے۔ **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ** [2] (51:56)۔ ہمارے ہاں اس کا بھی عجیب ترجمہ ہوتا ہے۔

عبادت کا مروّجہ مفہوم

عزیزانِ من! ہمارے ہاں عبادت کا ترجمہ پرستش کیا جاتا ہے۔ قرآن کی اس آیت (51:56) کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے جن اور انس کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ یہ ہماری عبادت کرتے رہیں۔ عبادت کا ترجمہ ہوا کہ یہ ہماری پرستش کرتے رہیں' پرستش کے معنی ہوئے: نماز پڑھتے رہیں۔ تو پھر اس کے لیے ہمارے ہاں عجیب عجیب تفسیریں آتی ہیں کہ صاحب! قرآن نے تو کہا ہے کہ ان کی

---

[1] انہیں اس کا اچھی طرح سے علم ہے کہ ان کی خلقت سے مقصود یہ تھا کہ یہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں (51:56) سو جب یہ' اس کے برعکس' ان قوانین سے سرکشی اختیار کریں تو پھر' زندگی کی خوشگواریوں کے امیدوار کیسے ہو سکتے ہیں؟ (یعنی یہ لوگ جنتی معاشرہ متشکل کرنے والے نظام کے قیام کی راہ میں تو سنگِ گراں بن کر حائل ہوں اور توقع یہ رکھیں کہ اس کی آسائش بخش برگ و باران کی جھولی میں آ پڑیں۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] اور اس حقیقت کو یاد رکھو کہ انسان' خواہ وہ مہذب شہری ہوں' یا صحرا کے خانہ بدوش غیر مہذب قبائل' ان کی تخلیق کی غرض و غایت اسی صورت میں پوری ہو سکے گی کہ یہ قوانین خداوندی کی اطاعت سے اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کریں (اور انہیں نوعِ انسان کی پرورشِ عامہ کے لیے وقف کر کے عالمگیر نظامِ ربوبیت متشکل کر دیں)۔ (ایضاً)

زندگی کا مقصد یہی ہے کہ یہ پرستش کرتے رہیں' ان کو تو ہر وقت پرستش کرتے رہنا چاہیے' عبادت کرتے رہنا چاہیے' اب جو وقت عبادت میں نہیں گزرتا وہ بات تو پھر اسکے خلاف چلی گئی۔ وہ کیسے ہوگا؟ اس پر انہوں نے کہا کہ ہمیں تفسیر بھی آتی ہے' کوئی بات نہیں ہے۔ تو پھر اس کی یہ تفسیر ہوئی کہ جو مومن صبح کی نماز پڑھ لیتا ہے اور اس کے بعد پھر ظہر کی پڑھتا ہے' تو درمیان کا سارا وقفہ اس کا عبادت میں گزر جاتا ہے۔

چل بھئی' شام تیکر ❶ عبادت ہی عبادت ہے حتیٰ کہ رات کو نماز پڑھ کر سوجاتا ہے' صبح اٹھ کر نماز پڑھتا ہے' تو ساری رات کی نیند بھی عبادت میں گزرتی ہے۔ یوں وہ قرآن کی تفسیر پوری ہوتی ہے کہ ہم نے تمہیں اس لیے پیدا کیا کہ ہماری عبادت کرتے رہو۔ بس وہ ذرا سے تراجم اور تفاسیر کو یوں کیا تو بات کچھ سے کچھ ہوگئی۔ طبری ❷ نے پہلے وہ سارا نقشہ ہی الٹ دیا۔ اس نے صرف ایک لفظ کے ترجمہ سے نقشہ ہی اُلٹ دیا۔

عزیزانِ من! اس زمانے کے ان عربوں سے پوچھو کہ وہ عبد' عبادت' عابد اور معبود کے کیا معنی لیتے تھے۔ یہاں (70:36-37) یہ بات ہو رہی تھی کہ جب ان کفار نے اسے سنا تو یوں سمجھ بیٹھے گویا جنت مفت بٹ رہی ہے' چلو ہم بھی اس لوٹ کے مال سے کچھ حصہ لے لیں' چنانچہ وہ اس خیال کے تحت گروہ در گروہ دائیں بائیں سے لپک کر تیری طرف بھاگے ہوئے چلے جا رہے ہیں کہ ہمیں بھی اس جنت کے اندر حصہ دو۔ کہا کہ ان سے پوچھو کہ ہم نے انہیں بتایا نہیں تھا کہ تمہاری پیدائش کا مقصود ہی یہ ہے کہ صرف خدا کے قوانین کی تابع داری کرو' فرماں برداری کرو' محکومیت اختیار کرو' کسی اور کی نہیں۔ عبادت کے معنی محکومیت کے ہیں۔ صرف خدا کے قانون کی محکومیت اختیار کرو' کسی اور انسان کی نہیں اور تم نے تو انسانوں کی محکومیت اختیار کی ہوئی تھی تو تم اس جنت میں کیسے آ سکتے ہو۔ صاحب! یہ تو شرک ہے۔ تم یہاں نہیں آ سکتے۔ کہا کہ فَلَآ اُقۡسِمُ بِرَبِّ الۡمَشٰرِقِ وَالۡمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوۡنَ o عَلٰٓی اَنۡ نُّبَدِّلَ خَیۡرًا مِّنۡهُمۡ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ (70:40-41) ❸۔ ان سے کہو جو اپنے آپ میں اس قدر تکبر اور تمرد کے نشے میں بدمست ہیں کہ ہمیں ناتواں نہ سمجھو ہم اس پوری کائنات کو اور اس کے نظام کو جو ہمارے قوانین کے تابع چلتا ہے' گواہی میں لاتے ہیں۔

---

❶ تک

❷ ابوجعفر محمد بن جریر طبری (310-224ھ)۔ ان کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرنگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور' 2004ء' ص۔ 31۔

❸ خدا کی ربوبیت عامہ جو اس کائنات کے مشارق و مغارب میں اس نظم و ضبط کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے' اس حقیقت پر شاید ہے کہ جو لوگ انسانی معاشرہ میں اس نظامِ ربوبیت کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جائیں' ہم اس پر قادر ہیں کہ ہم ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئیں جو ان سے بہتر ہوں۔ یہ مخالفین' نہ تو ہمارے حیطۂ اقتدار سے باہر جا سکتے ہیں اور نہ ہی ہماری اسکیموں کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئیں گے

ہم میں یہ قوت، یہ اقتدار بھی ہے کہ ہم تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئیں۔ ہم ایک خدا ہیں اور تمہیں پتہ ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں؟ ہم کرتے یہ ہیں کہ اس قسم کی جو تمہارے جیسی قومیں ہوتی ہیں، ہم ان کو زندہ قوموں کی صف سے الگ کر دیا کرتے ہیں اور ان کی جگہ دوسری قوم لے آیا کرتے ہیں جو خیرا مه. ہیں، یعنی جو اس سے بہتر ہوتی ہے۔ **ثُمَّ لَا یَكُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَكُمۡ** (47:38) پھر وہ ان جیسی نہیں ہوتی ان سے بہتر قوم ہوتی ہے۔ قوموں کی جگہ دوسری قومیں آ جاتی ہیں۔ کہا: یاد رکھو، ہم ایسا کر سکتے ہیں، تم ہمارے راستے میں حائل نہیں ہو سکتے، تم ہمیں عاجز نہیں کر سکتے کہ ہم ایسا نہ کریں۔ اس کے بعد جماعتِ مومنین اور نبی اکرمؐ سے کہا ہے کہ **فَذَرۡهُمۡ یَخُوۡضُوۡا وَیَلۡعَبُوۡا** ❶ (70:42)۔ یہ عجیب چیز ہے۔ **یَخُوۡضُوۡا** کے معنی ہیں: باتیں ہی باتیں کرتے چلے جانا، بحثیں ہی بحثیں کرتے چلے جانا، کانفرنسیں، سیمینار، مذاکرات، گفتگوئیں، باتیں ہی باتیں کرتے چلے جانا۔ کہا کہ انہوں نے زندگی کا یہ مقصد سمجھا ہے کہ باتیں ہی باتیں کرو۔ **وَیَلۡعَبُوۡا** اور قوم سے کھیلتے رہو۔ کہا: ان کو ان چیزوں کے اندر چھوڑ دو، ان کو یہ سب کچھ کرنے دو اور اس کے بعد یہ ہوگا کہ ان کی جگہ دوسری قوم لے لے گی اور وہ قوم ان سے بہتر ہوگی۔ **حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَهُمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ** (70:42) تا آنکہ وہ انقلاب ان کے سامنے آ کھڑا ہو، وہ دن آ جائیں جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے اور پھر جب ان کی تباہی ہو اور ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لے۔ دیکھیے یہ ''یوم'' وغیرہ اسی دنیا میں ہی ہو رہا ہے کہ ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے۔ انہوں نے زندگی کو مذاق اور کاروانِ انسانیت کو بے منزل سمجھ رکھا ہے۔ اس روش اور ذہنیت کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

تم تیر کی طرح اپنی حفاظت کے نشانے کی طرف بھاگو گے

عزیزانِ من! اس تباہی کے دن **یَوۡمَ یَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمۡ اِلٰی نُصُبٍ یُّوۡفِضُوۡنَ** (70:43) یہ اپنے اپنے ٹھکانوں سے تیزی سے نکلیں گے اور یوں نکلیں گے جیسے تیر اپنے نشانے پہ جاتا ہے۔ یہ کسی حفاظت کی جگہ کی تلاش میں اس طرح بھاگ رہے ہونگے اور یوں یہ کشاں کشاں اپنی تباہی کے مقام پر جمع ہو جائیں گے۔ اس وقت ان کی یہ حالت ہوگی۔ اور **خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ** (70:44) عجز و وا ماندگی سے نگاہیں جھکی ہوئی، ندامت اور شرم سے چہرے سیاہ ہوئے ہوں گے۔ یہ بتایا انجام ایسی قوم کا۔

---

❶ سو تو ان کی پرواہ مت کر، انہیں ان کے بے معنی منصوبوں اور بے مقصد کوششوں، بے منزل سفر اور فطری مباحثوں، بیکار گفتگوؤں اور کھیل تماشوں میں مشغول رہنے دے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

عزیزانِ من! **ذِلَّةٌ** (70:44)۔ انسانیت کا سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ خدا نے انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ہے، مگر انسان ذلیل ہو جائے، ذلیل محسوس کرنے لگ جائے، دنیا اسے ذلیل کہنے لگ جائے۔ قرآنِ کریم نے یہ سب سے بڑا عذاب بتایا ہے۔ **ذٰلِکَ الۡیَوۡمُ الَّذِیۡ کَانُوۡا یُوۡعَدُوۡنَ** (70:44) یہ ہے وہ دن جس کے متعلق ان سے کہا جاتا تھا کہ اس سے ڈرو، اس سے بچو، یہ دن نہ آنے دو، تباہ ہو جاؤ گے، دنیا کے اندر ذلیل ہو جاؤ گے، اور تم ہو کہ تقاضے پر تقاضا کرتے چلے جا رہے ہو کہ وہ یوم...... اس انقلاب کا دن...... جلدی کیوں نہیں آتا (70:1)۔

عزیزانِ من! سورۃ المعارج اس آیت پہ ختم ہوتی ہے! آئندہ ہم اگلی سورۃ نوح لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀❀❀......❀

بارھواں باب: سورة النوح (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1983ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ نوح سے ہو رہا ہے: (71:1)

عذاب یا تباہی

جیسا کہ میں ہر بار اس کی یاد دہانی کراتا ہوں کہ ان آخری پاروں میں بالخصوص اس تباہی کا ذکر آ رہا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی دعوت کے مخالفین کی طرف سے مسلسل تیئیس سال اور بالخصوص آخری سات آٹھ سال میں ابھر کر سامنے آتی رہی۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ ان

تباہیوں کو، جو قوموں پر آتی ہیں، یا تو خارجی حوادث کے تشبیہات کے رنگ میں پیش کرتا ہے یا اس قوم کے اندر جو خلفشار پیدا ہوتا ہے، وہ اس انداز میں پیش کرتا ہے۔ اسے عذاب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اصل میں ہم جو مذہب کے خوگر ہو گئے ہیں تو جب عذاب یا عذابِ خداوندی کے الفاظ سنتے ہیں تو ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ آسمان سے کسی قسم کی بلائیں اترتی ہیں اور اس طرح سے اس قوم کو مصیبت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ عذاب کے معنی قوم کی تباہی کیجیے، بات صاف ہو جاتی ہے۔

قرآنِ کریم کا انداز

قرآنِ کریم اقوامِ سابقہ کی تاریخ اور ان کی داستانیں بیان کرتا ہے۔ وہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ اس کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک دعویٰ کرتا ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ غلط خطوط پر متشکل نظام بالآخر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ قوم کی تباہی کی شکل ایک تو یہ ہوتی ہے کہ وہیں اپنے ہی ملک کے اندر باہمی فسادانگیزیوں، خوں ریزیوں کے ہاتھوں ہی وہ ختم ہو جائے یا کوئی دوسری قوم اس قوم کی جگہ لے لے۔ دعویٰ وہ یہ کرتا ہے اور اس دعوے کے ثبوت میں پہلے وہ دلائل پیش کرتا ہے۔ خالص علمی سطح پہ گفتگو کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ یہ بتاتا ہے کہ تاریخ کے اوراق سے اس کی شہادت پوچھیے کہ جس قوم نے اس قسم کا غلط نظام قائم کیا، اس کا انجام کیا ہوا۔ وہ اس کے لیے شہادات میں عام طور پہ وہ قومیں پیش کرتا ہے جن سے قرآنِ کریم کی اولیں مخاطب قوم یعنی قریش یا حجاز کے عرب پہلے سے ہی مانوس اور متعارف تھے۔ وہ ان قوموں کی تاریخ کو جانتے تھے۔ اس کے انجام سے واقف تھے۔ ان کی اجڑی ہوئی بستیوں سے صبح شام گزرتے تھے۔ آپس میں باتیں کرتے رہتے تھے۔ چرچا ہوتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ یہی سمجھتے تھے کہ آسمان سے کوئی بجلی گری اور یہ سب تباہ ہو گئیں۔

قوموں کی تباہی کی بنیادی وجوہات

قرآن اس کے مقابلے میں بتاتا یہ ہے کہ تباہی کے نشانات تو تم دیکھتے ہو، اس کی وجہ کی طرف تم توجہ نہیں دیتے۔ وہ وجہ یہ تھی کہ اس قوم کے اندر نظام غلط تھا، جرائم عام ہو گئے تھے، اور اس وجہ سے وہ قوم تباہ ہو گئی تھی۔ اور وہ اس کے بعد کہتا یہ ہے کہ اگر تمہارا نظام بھی اسی قسم کی غلط بنیادوں پر استوار ہے، اگر تم اس سے باز نہ آئے، تو تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو اقوامِ سابقہ کا ہوا ہے۔ یہ ہے اقوامِ سابقہ یا انبیاء گزشتہ کی داستانیں بیان کرنے کا مقصد۔ اقوامِ سابقہ میں خرابیاں تو بہت عام ہوتی تھیں لیکن قرآن ان میں سے اس خرابی کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے، جو ان کو لے ڈوبنے والی ہوتی ہے۔ وہ خرابی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ لہٰذا قرآن خاص طور پہ اس خرابی کا ذکر کرتا ہے، اور شروع کرتا ہے، داستانِ حضرتِ نوح علیہ السلام سے۔ اب آپ دیکھیے کہ وہ جو قوموں کی تباہی کے یا عذاب کے جرائم یا اسباب گنا تا ہے، ان میں کس کس قسم کی چیزیں آتی ہیں۔ خصوصی طور پر حضرتِ نوحؑ کی قوم کا جرم گناتا ہے کہ اس میں طبقاتی تفریق بہت زیادہ تھی۔ جسے Class Discriminaion (نسلی امتیاز) کہتے ہیں۔ وہ کام کاج کرنے والے، کمی کمین کا طبقہ تھا، انہی کے ہاں بڑے بڑے مترفین، سردارانِ

قوم' بڑے بڑے جاگیردار' بڑے بڑے زمیندار کا طبقہ تھا۔ انہوں نے اپنے ہی ہاں کام کرنے والے جنہیں وہ کامی' کمی' کمین' سمجھتے تھے' رکھے ہوئے تھے۔ اس قوم کے ڈوبنے کا' اس قوم کی تباہی کا' قرآن نے جرم ہی یہ بیان کیا ہے کہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہاں طبقاتی تفریق شدت تک پہنچی ہوئی تھی۔ اب دیکھتے چلے جایئے کہ یہی جرائم جب ہمارے زمانے میں آئیں گے تو قومیں انہی کے ہاتھوں سے تباہ ہوئی ہیں۔

قریش کے ہاں بھی یہ نسلی امتیاز بڑی چیز تھی۔ نسلی امتیاز کی بناء پر ان کے ہاں برہمن اور شودر کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ بہرحال وہ حضرتِ نوح علیہ السلام سے ابتداء کرتا ہے۔ اس قوم کے اندر طبقاتی تفریق تھی جس کی وجہ سے وہ تباہ ہوئی۔

قومِ عاد کا جرم

اس کے بعد وہ قومِ عاد کو لیتا ہے تو کہتا یہ ہے کہ ان کے ہاں کے اربابِ اقتدار کی حکومت ڈنڈے کے زور پر تھی۔ تکبر تھا' استکبار تھا' استحصال تھا' سرکشی تھی۔ کوئی قانون نہیں تھا۔ اگر تھا تو وہ صرف جنگل کا قانون تھا۔ اس میں استکبار اور استحصال والی بات تھی۔ یہ بات قرآن نے کہی ہے لیکن قومِ عاد کے قصے میں قرآن ایک ایسا نکتہ بیان کر گیا ہے جس کی تفسیر تو شاید میں کبھی بعد میں بیان کرونگا مگر وہ ہے بڑی اہم چیز۔ وہ چیز یہ ہے کہ وہ جو اربابِ اقتدار تھے' انکا تو یہ بتایا کہ وہ اس قسم کے استحصال اور استکبار' اور اس قسم کی سرکشی سے حکومت کرتے تھے جب کہ قوم کا جرم یہ بتایا کہ وہ خاموشی سے ان کی ان تمام چیزوں کو برداشت کیے چلی جاتی تھی۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ کبھی میں بیان کرونگا وہ مکالمہ جو قرآن دوزخ میں' جہنم میں' ان نیچے کی قوم اور اس قوم کے اکابرین کے مابین بتاتا ہے۔ قوم خدا سے یہ کہتی ہے کہ انہیں دہرا عذاب دیجیے: ایک ان کے اپنے جرم کی وجہ سے' اور دوسرا اس وجہ سے کہ ہمیں بھی انہوں نے گمراہ کیا۔ جواب ملتا ہے کہ تمہیں بھی دہرا عذاب ہوگا کیونکہ ان کی قوت تو تمہارے ہی دست و بازو کی رہینِ منت تھی۔ یہ قوت کہاں سے لائے تھے۔ تم نے انہیں خدا بنایا تو یہ خدا بن بیٹھے' ورنہ ان کی تو اپنی حیثیت ہی کچھ نہیں تھی۔ عزیزانِ من! اس جرم کی پاداش میں قوم تباہ ہوتی ہے۔

قومِ ثمود کا جرم

آگے قومِ ثمود آتی ہے۔ ان کے ہاں کی معیشت Agriculture (زراعت) تھی' زرعی معیشت تھی۔ وہ عام طور پہ مویشی پالتے تھے۔ بڑے بڑے سرداروں نے چشموں اور چراگاہوں پہ قبضہ کر رکھا تھا۔ خدا کے ان ذرائع رزق کو ذاتی ملکیت بنا رکھا تھا اور غریبوں کے مویشیوں کو وہ آگے آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ جب کبھی وہ چھوڑ کر چلے گئے تو بقایا پانی' تھوڑا بہت گھاس بچ رہا' تو وہ ان کے حصے میں آ گیا ورنہ انہوں نے زمین اور ذرائع پر ذاتی قبضہ کر رکھا تھا۔ ذرائع پیداوار کو استحصال کے طور پہ اپنے قبضے میں لینا قوم ثمود کا جرم بتایا گیا۔

قومِ مدین کا جرم

قرآنِ کریم شعیب علیہ السلام کے سلسلے میں قومِ شعیب یا قومِ مدین کا ذکر کرتا ہے۔ ان کے ہاں معیشت کاروباری تھی۔ یہ کہا کہ وہ کاروبار میں ڈنڈی مارتے تھے۔ کبھی پورا تول نہیں دیتے تھے۔ اکانومی (معیشت) اس قسم کی رکھی ہوئی تھی۔ بات آج بھی وہی ہے' انداز کچھ ایسے بدلے ہوئے ہیں کہ اس کے لیے اصطلاحات' (Terms)' کچھ بدل گئی ہیں' بات ڈنڈی مارنے کی ہے جو قرآن کہتا ہے۔ یہ ہے جرم قومِ شعیب علیہ السلام کا جس کے ہاتھوں وہ تباہ ہوئی ہے۔

فرعون کا جرم اور دیگر جرائم

اس کے بعد فرعون [1] آتا ہے۔ اس کا جرم کیا ہے؟ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ **اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى** [2] (79:24)۔ اس نے رزق کی ساری چیزیں اپنے کنٹرول میں رکھی ہوئی تھیں' جسے جتنا چاہے' اتنے کی پرچی اس کو دیدے۔ یہ جرم ہے فرعون کا۔ یہ اس قسم کے وہ موٹے موٹے جرائم ہیں جن کی وجہ سے قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ قرآن بار بار ان کا ذکر کرتا چلا آتا ہے۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہودیوں کے مذہبی پیشوا کی تھیوکریسی کو وہ اس قوم کی تباہی کا موجب بتا رہا ہے۔ تھیوکریٹک سسٹم (مذہبی پیشوائیت) میں آخری اقتدار یا اتھارٹی مذہبی پیشواؤں کی ہوتی ہے کہ شریعت میں یہ کہا ہے' وہاں یوں آیا ہے اور اس کے بعد کوئی ان کے خلاف کچھ نہیں کہتا تھا۔ سب بے دست و پا ہوتے ہیں۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہودیوں کا یہ جرم گنایا ہے اور اس کے بعد ان کی تباہی کی داستان بتائی ہے۔ یہ ہیں وہ اسبابِ تباہی' اسبابِ عذاب جو قرآن بتاتا چلا آ رہا ہے۔ وہ قریش کو بار بار کہتا ہے کہ ان اسباب و عمل میں سے تم خود دیکھ لو کہ تمہارے معاشرے میں کون کون سے جرائم پھل رہے ہیں اور پھر وہ پوچھتا ہے کہ بتاؤ! کیا تم بچ جاؤ گے؟

قوموں کی تباہی کی وجوہات

اب قریش سے آگے بڑھ کر آج کے دَور کے اندر آ جایئے کہ جس نظام کی بنیاد بھی ان جرائم میں سے کسی ایک جرم پہ بھی ہوگی اور آپ جانتے ہیں کہ آج تو ایک ایک قوم میں ان اسباب و علل میں سے کتنی ہی چیزیں پائی جاتی ہیں' وہ قوم بچ نہیں سکتی۔ یہ تاریخی داستانیں نہیں ہیں' یہ زندگی اور موت کے وہ اصول ہیں جو ہمیشہ تک زندہ و پائندہ رہیں گے۔ ہر دَور میں جو بھی نظام ایسا ہوگا' جن میں ان میں سے

---

[1] فرعون کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرِ نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' ص۔109' فٹ نوٹ نمبر 1۔

[2] تمہارا سب سے بڑا رب میں ہوں۔ (میں ہی تمہارا ''ان داتا'' ہوں) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کوئی جرم ہوگا' وہ تباہ ہو کے رہے گا' جو اصلاح کر لیں گے انہیں زندگی حاصل ہوگی۔ یہ ہے ماحصل قرآنِ کریم کی ساری تعلیم کا' عزیزانِ من! اور اس کے بعد کہا کہ اپنے نظام کو' اپنے معاشرے کو' دیکھو پھر اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو کہ ان میں کوئی جرم تمہارے ہاں تو نہیں پایا جاتا۔ اگر پایا جاتا ہے اور تم اس کی اصلاح کی فکر نہیں کرتے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ خدا کا قانونِ مکافات تو اٹل ہے' اس کے نتائج برآمد ہو کر رہتے ہیں۔ یہ ہے مقصد' عزیزانِ من! ان کہانیوں کا' ان داستانوں کا' جو اقوامِ سابقہ کی بیان کی گئی ہیں۔

قوموں کے جرائم اور تذکرہ حضرت نوح علیہ السلام کا

عزیزانِ من! پچھلی دو تین سورتوں کے اندر بار بار قریش کی توجہ اس چیز کی طرف دلائی گئی ہے کہ تمہارا یہ نظام کہ جس میں نسبی تفاوت بھی ہے' طبقاتی امتیازات بھی ہیں' سودی کاروبار بھی تم کرتے ہو' مذہبی پیشوائیت بھی تمہارے ہاں اتنے زوروں کی ہے' یہ بچ نہیں سکتا۔ ان کے ہاں یہ جرائم اتنے اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس کے بعد قرآن اپنے انداز کے مطابق' تاریخی شہادت پہ آیا' اور اس نے بات شروع کی۔ وہ سب سے پہلے سلسلہ وحی کی ابتداء حضرتِ نوح علیہ السلام سے کرتا ہے۔ اس نے اس قوم کا ذکر کیا اور پوری سورۃ میں اس کے متعلق کہا۔ اس میں خاص طور پہ جرائم نہیں گنائے گئے کیونکہ وہ متعدد مقامات پر گنائے گئے ہیں۔

قرآن حکیم کا انداز

آپ قرآن کا انداز دیکھیے۔ یہ لوگوں کے ذہن میں نہیں آتا کہ بار بار کتنے مقامات پر قرآن انہی قصوں کو کیوں دہراتا چلا جاتا ہے۔ یاد رکھیے کہ یہ قرآن کوئی بیٹھ کر لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے کہ اس کے ہاں اس Chapter (باب) میں یہ لکھنا ہے' اگلے Chapter (باب) میں یہ لکھنا ہے۔ اور اس کے بعد یہ تیئیس سالہ حضور ﷺ کی دورِ نبوت کی زندگی ہے جو مختلف مقامات' پر مختلف تقاریب پر ہے جس میں مختلف لوگ مخاطب تھے' یہ Chapter (باب) ان کے حسبِ حال ہے۔ یہ ایسا کچھ ابواب (Chapters) کی صورت میں نہیں ہے۔ اسے تو بس یوں کہیے کہ جیسے کچھ خطابات یا ایڈریسز (Addresses۔ خطبات) ہیں' ان کو مخاطب کر کے یہ چیزیں کہی گئی ہیں۔ تو جو چیز تیئیس سال میں مختلف مقامات پہ کہی جائے گی' اس میں' جسے آپ تکرار کہتے ہیں' وہ تو دہرایا جائے گا لیکن وہ تکرار بھی ایسی نہیں ہے کہ من وعن اسی شکل میں وہ بیان کی جائے۔ ہر بار جو قصہ کسی قوم کا' یا کسی نبی کا' آئے گا اس میں کوئی نہ کوئی نکتہ ایسا آئے گا جو وہاں وجہ بصیرت ہوگا۔

اربابِ تنذیر

عزیزانِ من! اب یہاں حضرتِ نوح علیہ السلام کی داستان آ رہی ہے۔ کہا کہ اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِهٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ

مِـنۡ قَبۡـلِ اَنۡ یَّـاۡتِیَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ❶ (71:1)۔قرآن نے یہ واضح طور پہ کہا ہے کہ جب بھی کسی قوم کی حالت یوں بگڑتی تو پہلے وہاں وہ آتے جوان کو وارن کرتے، تنبیہہ کرتے کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ تباہی ہوگا۔اب بھی اصلاح کرلوتو بچ جاؤ گے۔اسے قرآن نے خدا کے قانونِ مکافات میں مہلت کا قانون کہا ہے کہ ایک غلط کار معاشرے کی تباہی میں اس قسم کا وقت ہوتا ہے کہ اس میں اگر اصلاح کرلے تو بچ رہتا ہے۔اس وقت میں وہ وارن کرنے والا آتا ہے جس کو یوں کہا جائے۔نبی اکرم ﷺ کے بعد رسول یا نبی تو کوئی آئے گا نہیں، لیکن خدا کی کتاب محفوظ شکل کے اندر قیامت تک موجود ہے۔اس کی وارننگ (تنبیہ) یہ ہے کہ جو کوئی قوم سے قرآن کی بات کہے تو اس نے قرآنی تعلیمات کو پہچانے کا فریضہ امتی ہونے کی حیثیت سے ادا کیا۔قرآن نے جو کہا ہے اس کو پیش کیا گیا: اَنۡ اَنۡـــــذِرۡ قَـوۡمَکَ مِـنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (71:1)۔اس سے کہا گیا کہ اس قوم کو آگاہ کردو کہ قبل اس کے کہ ان کے اوپر آخری تباہی آجائے۔اب بھی اگر تم اپنی اصلاح کرلو، اپنے معاشرے کے نظام میں تبدیلی پیدا کرلو تو بچ جاؤ گے ورنہ تباہ ہوگے۔اگلی ہی آیت میں کہا کہ قَـالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ (71:2) کہا: اے میری قوم! میں تمہیں وارن (تنبیہ) کرنے آیا ہوں۔آگاہ کرتا ہوں اور مبہم الفاظ میں نہیں، یہ ایسی چیز نہیں کہ بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔میں نہایت واضح الفاظ میں تمہیں بتانے کے لیے آیا ہوں کہ یہ ہے تمہارے نظام کی وہ غلط روش اور یہ ہوگا اس کا نتیجہ۔

عبادت سے مراد خدا کی محکومیت ہے

لہٰذا یہ کہنے کے لیے آیا ہوں کہ اَنِ اعۡبُـدُوا اللّٰہَ ❷ (71:1)۔قرآن میں خاص طور پہ سورۃ ھود میں آپ دیکھیے کہ یہ جتنے انبیاء کرام علیہم السلام ہیں وہاں ان کا ایک ہی جگہ ذکر آیا ہے اور باقی مقامات میں بھی ہے۔سب سے پہلے وہ ایک ہی بات کہتے تھے کہ اَنِ اعۡبُـدُوا الـلّٰـهَ ❷ (11:50;61:84)۔ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ہوگیا: خدا کی پرستش کرو۔خدا کی پرستش اور پوجا تو سب قومیں کرتی ہیں۔یہ جو عبادت عَبَـدَ یَـعۡبُـدُ کی بات ہے اگر اس کا صحیح مفہوم ہو تو ساری بات سمجھ میں آجاتی ہے۔یہاں کہا کہ محکومیت صرف خدا کی اختیار کرو۔کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون کی نہیں۔ہر نبی کی تعلیم کا نکتہ آغاز یہ ہے کہ وہ اشخاص کی محکومیت کو بدترین جرم قرار دیتا ہے۔قرآن میں محکومیت کے لیے حکومت کا حق کسی انسان کو نہیں ہے۔یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔اس لیے ہر نبی یہ کہتا تھا کہ خدا کی محکومیت اختیار کرو۔آپ عبادت کا ترجمہ یہ کردیجیے تو بات واضح ہوجاتی ہے۔قرآنِ کریم کے مطابق کسی اور انسان کے بنائے ہوئے

---

❶ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ انہیں غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کردے، قبل اس کے کہ دردناک تباہی کا عذاب ان کے سر پر آکھڑا ہو۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

❷ تم قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ (ایضاً)

نظام کی، قانون کی، اطاعت ہی نہیں ہے۔ اطاعت صرف خدا کی ہے۔

متقی کا مفہوم

عزیزانِ من! اس کے ساتھ ہی کہا کہ وَاتَّقُوْهُ (71:3) اس کے احکام کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ اب اِس واتقوا کے لیے ہمارے ہاں ''متقی'' کا لفظ آیا اور متقی، پرہیزگار تو ہم عام بولتے ہی ہیں اور آپ کو پتہ ہی ہے کہ پھر متقی کا ہمارے ذہن کے اندر کیا تصور آتا ہے، متقی دراصل واتقوہ سے ہے۔ متقی وہ ہے جو ان قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرنے سے جو تباہ کن انجام ہوتا ہے، اس سے خوف کھاتا ہے۔ کہا کہ احساس پیدا کرو کہ اگر غلط روش پر قائم رہو گے تو تباہی آ جائے گی۔ اس لیے ان قوانین کی نگہداشت کرو اور ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ وَاَطِيْعُوْنِ ❶ (71:3)۔ عزیزانِ من! یہاں قرآن دو الفاظ کے اندر پورا نظام دے گیا ہے: اُعْبُدُوا اللّٰهَ (71:3) تو خدا کی محکومیت ہے۔ خدا تو ایک غیر محسوس ہی نہیں، انسانوں کے خیال و قیاس و وہم و گمان سے بھی بالاتر ہے: سبحان الله تعالیٰ عما یصفون ❷۔ نہ کبھی سامنے آئے، نہ کبھی کسی کے سامنے گفتگو کرے، نہ ہم اس کی بات سنیں۔ تو سوال یہ ہے کہ اس کی محکومیت کیسے اختیار کی جائے۔ محکومیت تو اسی کے قوانین کی ہوئی۔ لیکن ایک زندہ اتھارٹی ہوگی جو ان قوانین کو نافذ کرے گی۔ تو یہ اس کی نافذ کرنے والی اتھارٹی ہے۔ اعبدوا الله...... اطیعون (71:3) اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ میری اطاعت کرو۔ میں خدا کے احکام نافذ کرونگا۔ اس لیے ان قوانین کی محکومیت کی عملی شکل یہ ہوگی کہ یہ جو محسوس اتھارٹی ہے، اس کی اطاعت کرو۔

عزیزانِ من! قرآن کریم دو الفاظ میں اپنا پورا نظام دے گیا ہے۔ اتھارٹی صرف خدا کے قوانین کی اطاعت کراتی ہے۔ لیکن خدا کے قوانین کی اطاعت Abstract (غیر محسوس، نظری) طور پہ نہیں ہوتی ہے، اپنے اپنے طور پہ بھی نہیں ہوتی ہے، وہ ایک نظام کے تابع ہوتی ہے۔ اس نظام میں اس کے احکام کی آخری اتھارٹی ہوتی ہے۔ وہ خدا کے احکام کو نافذ کراتا ہے۔ اپنے احکام نہیں نافذ کراتا۔ یہاں کہا ہے کہ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ (71:3)۔ قرآن دو الفاظ کے اندر پورا نظام اسلامی دے گیا ہے۔

خدا کے قوانین کی حکمرانی، خدا کی حکمرانی

عزیزانِ من! یہ قرآن عجیب کتاب ہے، آدمی وجد میں آ جاتا ہے۔ کہا کہ اس کا یہ طریقہ ہے اگر اُعْبُدُوا اللّٰهَ نہیں ہے، محکومیت خدا کے قوانین کی نہیں ہے تو وہ نظام اسلامی نہیں ہے۔ اگر آدمی اپنے اپنے طور پہ سمجھتا ہے کہ جس طرح میرا جی چاہے گا میں اس کی اطاعت

---

❶ (قوانین خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرنے کا عملی طریق یہ ہے کہ) تم اس نظام کی اطاعت کرو جسے میں (نوح علیہ السلام) ان قوانین کے نفاذ کے لیے متشکل کر رہا ہوں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ یہ لوگ خدا کے متعلق جس قسم کا تصور رکھتے ہیں، وہ اس سے بہت بلند اور منزہ ہے۔ (ایضاً)

کرونگا تو وہ نظام اسلامی نہیں ہے۔ اس نظام میں جو اطاعت کرانے والا ہے اگر وہ بھی اپنی ذات کی اطاعت کراتا ہے' تو شرک ہو گیا۔ یہ نظامِ خداوندی نہیں ہے۔ خدا کے احکام کی اطاعت ایک مرکزی اتھارٹی کے تھرو Through (ذریعے) ہوگی۔ یہ اسلامی نظام یوں' زندہ اتھارٹی ہے' اس لیے اطاعت کرنے والوں کی طرف سے کہا گیا ہے کہ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (2:285) ہم نے بات سنی ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ تو سنتا تو اسی کا ہے جو کوئی سنانے والا ہو۔ اگر خالی کتاب کی اطاعت ہی مقصود ہوتی' تو نہ اس نظام کی' نہ رسول کے بھیجنے کی' ضرورت تھی۔ کتاب کو کسی چٹان پہ لکھ دیتے' آسمان سے اتار دیتے' لکھی لکھائی آجاتی مگر اس سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ نبی کا فریضہ خدا سے احکام پانا ہے' وحی کو حاصل کرنا ہے۔ یہ نبوت ہے۔ اس کے بعد فریضۂ رسالت ہے کہ اس نبوت کے مطابق' خدا کے احکام کے مطابق' عملاً ایک معاشرہ متشکل کیا جائے۔ اس طرح پہلے تو ایک امت بنائی جائے' انسان بنائے جائیں' پھر ایک معاشرہ یا ایک نظام متشکل کیا جائے۔ اس کے ذریعے خدا کے احکام کی اطاعت ہوگی۔ یہ ہے جسے آپ اسلامی نظام کہتے ہیں۔ اگر یہ اتھارٹی نہیں ہے' تو دین نہیں ہے' مذہب ہے۔ اگر یہ اتھارٹی صرف اپنے ہی قوانین یا احکام کی اطاعت کراتی ہے تو یہ دین نہیں' شرک ہے۔ احکامِ خداوندی کی اطاعت ایک زندہ اتھارٹی کی وساطت سے ہے جو وہ زندہ اتھارٹی اپنی حکومت نہیں قائم کرے گی' خدا کے احکام کو نافذ کرے گی۔ یہ ہے اُعْبُدُوا اللّٰهَ ...... وَ اَطِيْعُوْنَ (71:3) عزیزانِ من! بات میں سے بات آجاتی ہے۔

رسول بحیثیت اتھارٹی

قرآن نے یہ کہا تھا کہ یہ رسول ہے' اس نے یہ نظام قائم کیا ہے' اس کی اطاعت کرو' یہ نہ سمجھو کہ پھر اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور تم اپنے عہدِ جاہلیت کی طرف چلے جاؤ گے یعنی اسی پہلے نظام کی طرف۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ سلسلہ رسول اللہ ﷺ کے بعد تک تھا۔ جب تک یہ نظام آپ کے ہاں قائم رہا ہے' وہ کچھ وقت کے لیے بھی کیوں نہ رہا ہو' وہ اسلامی تھا اور جب اس کے بعد آپ کے ہاں ملوکیت آئی' احکامِ خداوندی کی اطاعت نہیں' بلکہ آپ کے ہاں اربابِ اقتدار کی اطاعت آ گئی تو اس کے بعد اسلام کا نظام ختم ہو گیا۔ خدا کی عبادت کا ترجمہ پرستش کیا گیا: وہ تو پڑھ لی نماز۔ محکومیت بادشاہ کی' خلیفہ کی' سلطان کی' اختیار کی گئی۔ اس زمانے میں ایک شخص کی ہوتی تھی' آج مغربی جمہوریت کی ہے' وہ کچھ اشخاص جمع ہو جاتے ہیں' بات انسانوں کی حکومت کی ہے۔ خدا نے کہا تھا: اُعْبُدُوا اللّٰهَ (71:3) تم قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو: وَ اَطِيْعُوْنِ (71:3) اس نظام کی اطاعت کرو جسے میں ان قوانین کے نفاذ کے لیے متشکل کر رہا ہوں۔ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ (71:4) وہ جو تمہاری چھوٹی موٹی لغزشیں ہو جاتی ہیں' ان کے جو نقصانات ہوتے ہیں اس اطاعت سے ان نقصانات کی تلافی ہو جائے گی' ان نقصانات سے تمہیں حفاظت مل جائے گی کیونکہ یہ خدا کا قانون ہے' اس کی رحمت ہے کہ وَ يُؤَخِّرْكُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى (71:4) ذرا لغزش ہوئی تو وہ فوراً گرفت نہیں کر لیتا۔

مہلت کا موقع رحمتِ خداوندی ہے

عزیزانِ من! اس کو اصلاح کا موقع دیتا ہے' Respite (مہلت) دیتا ہے' ایک وقتِ معین کے لیے مہلت دیتا ہے' وہ اس کو Postpone (ملتوی) کر دیتا ہے۔ وہ یہ کچھ اس لیے کر دیتا ہے کہ اس دوران ان کو وارن کیا جائے' بار بار ان کی اصلاح کے لیے ان کو متنبہ کیا جائے۔ اس وقت مؤخر کرنے کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ یہ ایسے ہی نہیں ہے کہ وہ اس لیے مؤخر کر دیتا ہے کہ ''اچھا چل' آج تے سانوں ویل نہیں۔ پھر کسی ویلے پھڑاں گے تہانوں۔'' [1] یہ بات نہیں ہے۔ اب یہ اس پہ بڑی رحمت ہے جو درمیان میں تاخیر ہوتی ہے اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ لَوْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ [2] (71:4)۔ اور جب اس میں بھی تم باز نہیں آتے ہو تو اسے یوں سمجھو کہ اب پھر وہ جو ڈوبنے والی کشتی پہ اتنا زیادہ بوجھ آ جاتا ہے تو پھر وہ ڈوب کے رہتی ہے' اس میں پھر نہ ذرا سی تاخیر ہوتی ہے' نہ تقدیم ہوتی ہے' نہ ایک سیکنڈ وہ پہلے آ سکتی ہے' نہ بعد میں آتی ہے' پھر وہ وقت پہ آ جاتی ہے۔ اس وقت خدا کہتا ہے کہ موت سامنے آئے تو پھر توبہ قبول نہیں ہوتی کیونکہ اصلاح کرنے کے لیے جو مہلت کا وقفہ ہوتا ہے وہ گزر چکا ہوتا ہے اور جب وقت ہی نہ رہے' اصلاح کی گنجائش ہی نہ رہے تو پھر توبہ کے تو معنی کچھ نہیں ہوتے' پھر قوم نہیں بچ سکتی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی درخواست

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَہَارًا ۝ فَلَمْ یَزِدْہُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا [3] (71:5-6) اب حضرتِ نوح علیہ السلام کی خدا سے یہ درخواست آئی کہ میں نے دن رات کوشش کر دیکھی کہ یہ قوم تباہی سے بچ جائے۔ خدا کا رسول اپنے دل میں انسانیت کی بڑی ہمدردی رکھتا ہے' یہ بڑا غم خوار ہوتا ہے' دن رات گالیاں کھاتا ہے' طعن سنتا ہے' مار کھاتا ہے' یہ سب کچھ برداشت کرتا ہے لیکن ان کی اصلاح کے لیے کام کیے جاتا ہے اور ساتھ یہ بھی ہے کہ بار بار کہتا ہے کہ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ (25:57) میں اس کے لیے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ کتنا بڑا غم خوار ہے۔ بہر حال حضرتِ نوح علیہ السلام نے کہا کہ میں نے دن رات اس قوم کے لیے ایک کر کے دیکھ لیا کہ یہ کسی طرح سے اصلاح کی طرف آ جائے مگر فَلَمْ یَزِدْہُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا (71:6) ہوا یہی ہے کہ میں نے ان کو بلایا اور یہ

---

[1] اچھا' کوئی بات نہیں' آج تو ہمیں فرصت نہیں ہے۔ پھر کسی دوسرے وقت ہم تمہاری گرفت کر لیں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] جب تک تم صحیح راستے پہ چلتے رہو گے' تباہی سے محفوظ رہو گے۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور وہ عذاب تمہارے سر پر آ گیا تو پھر اسے کوئی نہیں ٹال سکے گا۔ اے کاش! تم خدا کے اِس قانونِ مکافات کو سمجھ سکتے۔ (ایضاً)

[3] اس نے اپنے نشوونما دینے والے سے کہا کہ میں اس قوم کو دن رات تیرے راستے کی طرف دعوت دیتا رہا۔ لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ میں جوں جوں انہیں اس طرف بلاتا ہوں یہ اس سے اور دور بھاگتے ہیں۔ (ایضاً)

بھاگ گئے' بات سننے کے لیے کھڑے ہی نہیں ہوئے۔ اس طرح یہ کیفیت ہوجاتی ہے کہ وَ اِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُھُمۡ لِتَغۡفِرَ لَھُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَھُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِھِمۡ وَ اسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَھُمۡ وَ اَصَرُّوۡا وَ اسۡتَكۡبَرُوا اسۡتِكۡبَارًا (71:7) جب بھی میں نے دعوت دی ہے' جب بھی میں ان کو بلاتا ہوں کہ آ ؤ! میں تمہیں بتاؤں کہ کس طرح تمہاری غلط روش تمہیں تباہ کردے گی ان کی کیفیت پہلے تو یہ ہے کہ وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں' وہ سنتے ہی نہیں۔

لفظ ثیاب کا مفہوم

عزیزانِ من! ایک ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ بات سنی ہی نہ جائے۔ دوسری چیز یہ ہوتی ہے کہ بہر حال سن تو لیا جائے مگر رہیں منافقانہ انداز سے۔ یہ ایک بات قرآن نے کہی ہے۔ یہ جو قرآن میں ہوتا ہے کہ اسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَھُمۡ (71:7) تو ثیاب کے معنی کپڑے ہی نہیں ہوتے' اس کے معنی انسان کی شخصیت ہوتی ہے اور وہ بھی جسے دہری شخصیت کہتے ہیں۔ یہ معنی ہوتے ہیں اس کے یعنی Dual Personality یعنی منافقت۔ اس دور میں اس کا یہ ترجمہ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہیں کہ پہلے تو بات یہ ہے کہ سنتے ہی نہیں ہیں اور اگر کبھی میری بات سنتے بھی ہیں تو منافقت اختیار کر لیتے ہیں۔ بظاہر وہ کہتے ہیں کہ ہاں ہم نے سمجھ لیا' ٹھیک ہے' ہم ایسا ہی کریں گے مگر دل سے مانتے نہیں ہیں' عمل سے وہ کرتے نہیں ہیں اس کے برعکس وہ اصــــروا ہیں۔ اس طرح وہ اپنی جو پہلی روش ہوتی ہے' یہ اسی پہ اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ انہیں ہزار سمجھاؤ وَ اسۡتَكۡبَرُوا اسۡتِكۡبَارًا (71:7) مگر وہ اپنی سرکشی میں اور زیادہ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ ثُمَّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُھُمۡ جِھَارًا o ثُمَّ اِنِّیۡۤ اَعۡلَنۡتُ لَھُمۡ وَ اَسۡرَرۡتُ لَھُمۡ اِسۡرَارًا (71:8-9) میں نے کھلے بندوں بھی اعلان کر کے ان کو دعوت دی' ان کی اصلاح کے لیے یہ کچھ کہا' الگ الگ' خلوت میں بھی ان لوگوں کو بلا بلا کے میں نے یہ کچھ کیا اور یہ کچھ کہا فَقُلۡتُ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ط اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا o یُّرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَیۡكُمۡ مِّدۡرَارًا [1] (71:10-11)۔ عزیزانِ من! آگے مغفرت کی بات آتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ان سے کہا کہ کوئی بات نہیں پہلے تم جو لغزشیں بھی کر چکے ہو' اُن پہ گرفت نہیں ہوگی' وہ معاف کردی جاتی ہیں' ان سے حفاظت کا سامان دیدیا جاتا ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ تم جو صحیح کام کرو گے' ان کے جو وزنی نتائج ہونگے' وہ ان کمیوں (Deficiencies) کو پورا کردیں گے جو اس سے پہلے تمہاری لغزشوں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ میں ان سے یہ کچھ کہتا رہا' میں نے یہ کہا کہ یہ چیز اب خدا کی پہلی نعمت ہے۔

---

[1] میں نے ان سے بار بار کہا کہ تمہاری غلط روش بڑے تباہ کن نتائج پیدا کرے گی۔ تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے ذریعے اس تباہی سے بچنے کا سامان پیدا کرو۔ خدا کا قانون تمہیں اس سے بچالے گا۔ (اور علاوہ اُخروی زندگی کی سرفرازیوں کے' وہ تمہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی خوش حالیاں اور خوش گواریاں عطا کرے گا۔) وہ ایسی بابرکت بارش برسائے گا جس سے تمہاری بنجر زمینیں سیراب ہوجائیں گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

عزیزانِ من! معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی بارانی زمینیں تھیں' آبپاشی کا انتظام نہیں تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ پہلی چیز یہ ہے کہ خدا تمہاری زمینوں کے اوپر بھرپور بارش برسائے گا یُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ (71:12) تمہارے مال و دولت میں بھی اضافہ ہوگا اور تمہارے افرادِ خاندان میں بھی کثرت ہوگی۔ اس زمانے میں قبائلی زندگی میں افراد کی اکثریت ایک بہت بڑی وزنی چیز تھی کہ قبیلے کے افراد کتنے ہیں' ان کی کثرت (Majority) کتنی ہے' آج بھی شکل وہی ہے۔ وہ جو ووٹرز کی تعداد ہوتی ہے وہ وہی ہے جو اس زمانے میں قبیلے کی کثرت کی تعداد ہوتی تھی: جتھہ کس کا بھاری ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ خدا تمہاری اولاد میں بھی برکت دے گا' تمہاری دولت میں بھی برکت دے گا۔ پھر کہا کہ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (71:12) صحیح انتظام کرو گے تو پھر یہ زمینیں بارانی نہیں نہری ہو جائیں گی' تمہارے ہاں باغات پیدا ہونگے' ان کی سیرابی کے لیے پانی کی ندیاں رواں ہوں گی۔

قرآنِ حکیم کا نظریہ ارتقا

پھر کہا کہ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ❶ (71:13-14) عزیزانِ من! یہاں تو بات ہی عجیب آ گئی۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ انسانی تخلیق مختلف ارتقائی مدارج سے گزرتی ہوئی یہاں تک آئی ہے۔ ہر اگلا درجہ پہلے درجے سے زیادہ سکون اور وقار اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر اضطرابی کیفیت رہے تو جسے وہ کشتی کا ڈولنا کہتے ہیں وہ چیز نہ ہو۔ کسی ایک مقام پہ کوئی چیز ٹھہر ہی نہ سکے۔ جو چیز کسی ایک مقام پہ ٹھہر ہی نہ سکے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ قرآن نے کہا ہے کہ ارتقاء کا نظریہ یا قانون یہ ہے کہ ایک شے ایک منزل میں آ کر کچھ وقت کے لیے ٹھہرتی ہے۔ وہاں اسے اتنی قوت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اس سے اگلی بلند منزل میں زندگی بسر کرنے کی اہل ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اگلی منزل میں چلی جاتی ہے۔ اس کے الفاظ تو یہ ہیں کہ پچھلی منزل اسے اگلی منزل میں بطور امانت سپرد کر دیتی ہے اور یوں یہ بڑھتی ہوئی زندگی آگے تک پہنچتی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہاں تمہارا بھی یہی انداز ہوگا۔ اس وقت تم پستی کی منزل میں ہو' وہ یہاں تمہارے لیے ایسا انتظام کر دے گا کہ تم اس سے آگے' جو بلند منزل ہے' اس میں پہنچ جاؤ۔ بلند منزل کا انداز کیا بتایا؟ اس کے لیے کہا: وَقَارًا (71:13) باوقار زندگی بسر کرو گے۔ اس کے معنی ہونگے کہ یہ جو ہر وقت کا اضطراب ہے' یہ جو ہر وقت کانپتے رہتے ہو'

---

❶ (میں حیران ہوں کہ) تمہیں کیا ہو گیا ہے جو اس قسم کی باوقار زندگی کی آرزو نہیں کرتے جو قوانین خداوندی کے اتباع سے مل سکتی ہے یعنی ایسی زندگی جس میں ٹھہراؤ ہو' استحکام ہو' بخود خریدن ہو' اپنے پاؤں پر جم کر کھڑے ہو جانا ہو' محکمیت ہو' ثبات ہو' توازن ہو' یونہی ایک جھٹکے سے بکھر یا پگھل جانا نہ ہو۔ (اس سے تمہاری ذات میں بھی ایسا استحکام پیدا ہو جائے کہ وہ موت کے بعد مزید ارتقا کی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے)۔ یہ زندگی کیسے حاصل ہو گی' اس کے لیے تم قانونِ تخلیق کی کارفرمائی پر غور کرو جس کے مطابق تم مختلف تخلیقی مراحل طے کرتے ہوئے' انسانی پیکر تک پہنچے۔ (ان تخلیقی مراحل میں تمہارا ہر قدم آگے کی طرف بڑھتا گیا' اور تم اوپر کی طرف اٹھتے گئے۔ یہ سب تمہارے اختیار و ارادہ کے بغیر ہوتا رہا لیکن جونہی بات تمہارے اختیار و ارادہ تک پہنچی تم نے غلط راستے اختیار کر لیے جس سے تم پستی کی طرف گرتے چلے گئے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تمہارے قدم ڈگمگاتے رہتے ہیں' اس میں یہ نہیں ہوگا۔ استحکام پیدا ہو جائے گا' جم کے کھڑے ہو جاؤ گے' تمہاری زندگی باوقار ہو جائے گی۔ باوقار زندگی بڑی چیز ہے۔

لفظ وقار کا مفہوم اور آسمانی کرّوں کی مثال

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو اب ''وقار'' کے معنی بھی کچھ اور ہی آ گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں: ''ڈگمگانا یا اضطراب کی بات کا باقی نہ رہنا۔'' اس کے دوسرے الفاظ ہیں: ''بڑا سکون ہونا' جم کے کھڑے ہو جانا۔'' یاد رکھیے! سکون جمود نہیں ہے۔ جمود تو عدمِ حرکت کا نام ہوتا ہے۔ وقار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں کوشش بھی ہوتی ہے' حرکت بھی ہوتی ہے لیکن اس میں ڈگمگاہٹ نہیں ہوتی۔ اس قسم کی زندگی کے بیان کرنے کے لیے قرآن عجیب الفاظ استعمال کر جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ تمہیں ایسی زندگی عطا کر دے گا' تم ذرا غور تو کرو کہ خدا کے قانون کے مطابق جو کوئی بھی زندگی بسر کرتا ہے اس کے اندر اتنا وقار آ جاتا ہے کہ وہ اپنے مقام پر جما ہوا کھڑا ہے' محکم کھڑا ہے اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ❶ (71:15) ذرا آسمانی کرّوں کی طرف غور کرو ہر وقت مصروفِ گردش ہیں لیکن وقار کی کیفیت یہ ہے کہ ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصے کے برابر بھی کہیں لغزش نہیں آتی' وہ اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتے۔ وقار ہے تو اتنا' حرکت ہے تو اتنی۔ عزیزانِ من! قرآن کی کیا مثالیں ہیں! قوم ہو' اس میں حرکت بھی ہو' اور وقار بھی ساتھ ہو' قرآن نے اس کی آسمانی کرّوں سے تشبیہ دی ہے' پھر دیکھو کہ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ❷ (71:16)۔ اس نے (انہی آسمانی کروں میں سے) چاند اور سورج جیسے کرّے بھی بنائے۔ میں یہ کسی دوسرے مقام پہ عرض کرونگا کہ سائنسدان علم الافلاک والے آج یہ انکشاف کر رہے ہیں کہ سورج کی تو اپنی روشنی ہوتی ہے' چاند کی روشنی اپنی نہیں ہوتی' یہ سورج سے مستعار لیتا ہے اور پھر یہ روشنی اس سے صرف منعکس Reflect ہوتی ہے۔

---

❶ تم دیکھو کہ اللہ نے فضا کی پنہائیوں میں اِن مختلف کرّوں کو پیدا کیا ہے تو وہ کس طرح باہم دگر کامل موافقت اور ہم آہنگی سے چلتے رہتے ہیں۔ وہ اس قدر تیز گردش کے باوجود اپنے اپنے مقام پر محکم اور قائم رہتے ہیں۔ (یہ اس لیے کہ وہ انفرادی زندگی بسر نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک کی کشش دوسرے کے ثبات کا موجب بنتی ہے اور اس طرح یہ سارا نظامِ فلکی بغیر کسی تصادم کے مصروفِ عمل رہتا ہے۔ ان کے برعکس تم اپنی زندگی کو دیکھو کہ اس میں قدم قدم پر ایک دوسرے سے تصادم ہوتا ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اس نے (انہی کرّوں میں سے) چاند کو کس طرح نورانی قندیل' اور سورج کو جگمگاتا چراغ بنا دیا۔ (لیکن تم اپنی زندگی کو دیکھو کہ وہ کیسی بھیانک تاریکیوں میں گزر رہی ہے۔ اگر تم بھی قوانین خداوندی کا اتباع کرو تو نہ صرف یہ کہ تمہاری اپنی زندگی کی راہیں روشن ہو جائیں' تم دوسروں کے لیے بھی قندیل راہ بن جاؤ۔) (ایضاً)

قرآن نے سورج کے لیے ضیاء کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں: اپنی روشنی' کسی چیز کا Glow (چمکنا) کرنا جیسے خود موم بتی یا لیمپ یا جو کچھ جلے وہ اس کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ چاند کے لیے اس نے نور کہا ہے۔ اس کے معنی ''دوسروں کی روشنی کو منعکس کرنا'' ہیں۔ مورس بوکائے (Dr Maurice Bucaille- 1920--?) ❶ سے پوچھیے۔ وہ لکھتا ہے اور ان دو الفاظ کے اوپر آ کر وجد میں آ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے دنیا کے سائنسدانوں! خدا کے لیے سوچو کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پیشتر عرب کی سرزمین میں ایک اَن پڑھ شخص یہ تفریق کر سکے گا۔

چاند سورج سے روشنی کی بھیک مانگتا ہے

مورس بوکائے ورطہ حیرت میں ڈوب کر کہتا ہے کہ: جس حقیقت تک ہم آج پہنچے ہیں' کیا یہ قرآن کسی انسانی فکر کی پیداوار ہوسکتا ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ وہ اس کے بعد یوں کہتا ہے' اور یہ عجیب چیز ہے۔ یہاں بھی قرآن نے قمر کے لیے ''نور'' کہا اور شمس کے لیے ''دیا اور چراغ''۔ چراغ کی روشنی مانگی ہوئی نہیں ہوتی' اس کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ ''نور'' مانگا ہوا ہوتا ہے اور اس مانگنے کے لیے تو قرآن نے یہاں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ سورج تو اپنی روشنی رکھتا ہے' چاند اس کے پیچھے پیچھے بھیک منگوں کی طرح جاتا ہے کہ ''دے جا' بابا! خدا کے نام پہ۔'' قرآن کے یہی الفاظ ہیں۔

ارتقا کے سلسلہ میں درخت کی مثال

عزیزانِ من! انسان کس کس مقام پہ کھڑا ہو کہ یہاں تو

زی فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

قرآن کا ہر مقام دامن پکڑ کے کہتا ہے کہ کھڑے ہو جاؤ' تھوڑی دیر کے لیے دیکھو کہ میں کیا کہتا ہوں۔ وَاللّٰهُ اَنۢبَتَكُمْ مِّنَ

---

❶ ڈاکٹر مورس بوکائے Dr. Maurice Bucaille کی مندرجہ ذیل پانچ کتب لائق مطالعہ ہیں:

1- The Bible, The Quran and Science.

2- Mummies of the Pharaohs _ Modern Medical Investigation (St. Mortins Press, 1990).

3- What is the Origin of Man (Seghers, 1988).

4- Moses and Pharaoh, the Hebrews in Egypt (NTT Mediascope Inc, 1994).

5- Reflexions surle Coran (Mohamed Talbi & Mourice Bucaille, Seghers, 1989).

الْاَرْضِ نَبَاتًا [1] (71:17)۔ یہ دیکھو تو سہی کہ قرآن وقار اور زندگی کی حرکت کی مثالیں دے رہا ہے: آسمانی کرّے اور درخت کی مثال ہے۔ درخت ایک مقام پہ جم کر کھڑا ہوا بھی ہے۔ اس کے وقار کی یہ کیفیت ہے اور نمود کی یہ کیفیت ہے کہ اتنے سے بیج میں سے ایک کونپل پھوٹتی ہے اور اس کے بعد وہ اتنا بڑا درخت بن جاتا ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیسے بن جاتا ہے، کس وقت بن جاتا ہے۔ اپنے مقام پہ کھڑا بھی ہے اور بڑھ بھی رہا ہے، پھل پھول بھی رہا ہے۔ یہ ہے انسان کی زندگی کہ اس کی ذات یا Personality (شخصیت) کی Development (نشوونما) بھی ہو جائے۔ وہ اپنے مقام کے اوپر قائم بھی ہوتا ہے اور اس کی نشوونما بھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہا کہ اس طرح سے اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ ثُمَّ یُعِیۡدُكُمۡ فِیۡهَا وَ یُخۡرِجُكُمۡ اِخۡرَاجًا [2] (71:18)۔ اور پھر زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے، مادی زندگی نہیں ہے۔ یہاں پھر درخت کی زندگی میں اور انسانی زندگی میں فرق ہو گیا۔ یہ درخت تو ایک وقت کے بعد جا کے کھوکھلا ہو کر، بس گر جاتا ہے، اس کی لکڑیاں جلا دی جاتی ہیں، وہ ختم ہو جاتا ہے۔ انسان کی زندگی یہ نہیں ہے۔ یہ بڑھتا پھولتا ہے تو اس کے بعد اگلی زندگی بھی اس کے ساتھ آتی ہے۔ یہ اسی طرح سے آگے چلا جاتا ہے۔

کرّۂ ارض کی مثال

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ بِسَاطًا ۙ لِّتَسۡلُكُوۡا مِنۡهَا سُبُلًا فِجَاجًا [3] (71:19-20) اور تمہارے لیے دیکھو تو خدا نے کیا کچھ نہیں پیدا کیا۔ زمین گول ہونے کے باوجود تمہارے لیے ایسی چپٹی ہے کہ کسی مقام پہ آ کر یہ نہیں ہوتا کہ تم گر پڑو حالانکہ ہر گول چیز کے کسی کنارے پہ جاؤ تو آدمی دھڑام سے نیچے چلا جاتا ہے۔ عجیب انداز ہے اس ارض کا کہ اتنا بڑا یہ گولا ہے کہ کبھی ہم نے دیکھا ہی نہیں ہے کہ اس کے کنارے کی گولائی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ گننا تو ایک طرف رہا، ساری دنیا کے کرہ ارض کے چکر لگا کر آ جاتے ہیں

---

[1] (تمہارا باہمی ٹکراؤ اس لیے ہوتا ہے کہ تم سب اپنے آپ کو ایک دوسرے سے الگ سمجھتے ہو۔ انفرادی مفاد پرستی کی پچروں (Wedges) نے تمہیں جدا جدا کر رکھا ہے (2:36) حالانکہ خدا نے تمہاری تخلیق نباتات کی طرح کی ہے۔ (کہ زمین سے ایک تنا اوپر کو ابھرتا ہے لیکن آگے جا کر اس کی بے شمار شاخیں اِدھر اُدھر پھیل جاتی ہیں۔ اس کے باوجود، ان کا باہمی تعلق اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ جڑ زمین سے خوراک حاصل کرتی ہے، وہ اُسے اپنے لیے سمیٹ کر نہیں رکھ لیتی۔ وہ اُسے پتی پتی تک بقدر ضرورت پہنچاتی ہے اور اگر پتیاں ہوا سے نمی اور حرارت جذب کرتی ہیں تو وہ انہیں درخت کی رگ رگ تک پہنچا دیتی ہیں۔ یوں پورے کا پورا درخت سرسبز وشاداب رہتا ہے۔ پوری نوعِ انسانی کی تخلیق بھی ایک شجر طیب کی طرح ہوئی ہے۔ اس کی سرسبزی و برومندی کا راز باہمی ربط وضبط اور اشتراک وتعاون میں ہے۔ یہی ہے وہ نظام جس کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] یوں بھی انسان کی تخلیق کی ابتداء (نباتات کی طرح) بے جان مادہ سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد زندگی مختلف مراحل میں سے گزرتی، گردشیں کرتی، انسانی پیکر تک آئی ہے۔ زندگی کا یہی ارتقائی پروگرام، موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ (ایضاً)

[3] (اُس نے تمہیں دنیا میں پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی تمہاری زیست کے عجیب وغریب سامان پیدا کر دیئے۔ سب سے پہلے تو کرّہ ارض پر غور کرو کہ اس نے اسے گول ہونے کے باوجود) ایسا بسیط قطعہ بنا دیا کہ تم اس کے کشادہ راستوں میں جہاں جی چاہے، چل پھر سکتے ہو۔ (ایضاً)

وہ کہیں نہیں بتلاتے کہ فلاں مقام پہ ہم نے اسے فٹ بال کے گیند کی طرح دیکھا کہ وہاں اس کا کنارہ یوں ہو گیا ہوا تھا۔ چلے جاؤ' چلتے چلے جاؤ' چپٹی نظر آتی ہے۔ کہنے لگے کہ اگر یہ صورت نہ ہوتی تم اس کے اوپر رہ ہی نہ سکتے' گول ہونے کے باوجود اِسے ایسا بنایا ہے کہ تمہیں محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ گول ہے۔تم کہیں گرتے ہی نہیں ہو' پھر اسکے اندر تمہارے لیے راستے بنائے ہوئے ہیں۔تم ان راستوں میں چلتے پھرتے ہو۔

حضرتِ نوح علیہ السلام نے کہا کہ میں اس انداز سے مثالیں دے کر ان لوگوں کو سمجھا چکا ہوں لیکن انہوں نے اس کی ایک نہ مانی' آخر اس نے اپنے رب سے فریاد کی کہ **قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِىْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا** (71:21) او میرے پرودگار! ''جنوں پنجابی اچ کیندے نیں: میں ٹل لا کے ویکھ لئی۔''[1] میں نے انتہائی کوشش کر کے دیکھ لیا کہ کسی طرح سے ان میں اصلاح پیدا ہو جائے لیکن ہر بار' جو کچھ میں نے کہا' یہ اس کی خلاف ورزی کرتے چلے آ رہے ہیں۔میرے مقابلے میں بات اُن کی مانتے ہیں' جن کی خصوصیت اتنی ہی ہے کہ مالدار ہے' بہت بڑا خاندان ہے' ووٹ بھی بہت زیادہ ہیں' اس کے پاس دولت بھی بہت ہے' یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کہتا کیا ہے' حالانکہ اس کا مال اور اس کی دولت نے بالآخر نقصان کے سوا کوئی نتیجہ نہیں پیدا کرنا' لیکن میری نہیں سنتے' مانتے اس کی ہیں۔ **وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا** (71:22) اور پھر کمینگی کی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ میری اس دعوت کے خلاف ایک بات کھلے بندوں نہیں کرتے' خفیہ تدبیریں کرتے ہیں' بڑی بڑی تدبیریں کرتے ہیں۔ان کی یہ کیفیت ہے۔ **وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا** (71:23) وہ کہتے یہ ہیں' خود بھی یہ کرتے ہیں' دوسروں کو بھی یہ کہتے ہیں کہ اس کے کہنے میں آ کر اپنے معبودوں کو مت چھوڑ دینا' نہ ود کو' نہ سواع کو' نہ یغوث و یعوق کو اور نہ ہی نسر کو۔تو یہ ان بتوں کے نام ہیں جو غالباً حضرتِ نوحؑ کے زمانے میں یا پہلی اقوامِ سابقہ کے زمانے میں مختلف بتوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک خدا کی بات ماننے کی نہیں ہے۔بس ان بتوں کو مانو' ان کو مت چھوڑو۔

بتوں کو ماننے کی وجہ جواز

آپ کو معلوم ہے کہ ان کے لیے بتوں کو نہ ماننے میں کون سی چیز مانع ہے۔یہ بت وہ ہیں کہ آپ اپنے طور پہ' جو جی میں آئے ان سے کہتے رہیے' وہ آپ کو کچھ نہیں کہتے کہ یہ کرو' یہ نہ کرو۔خدا کو تو اس لیے نہیں مانتے کہ وہ تو قدم قدم پہ کہتا ہے کہ یہ نہ کرو اور وہ کرو۔وہ ایسے خدا کو کیوں مانیں' ایسے کو کیوں نہ مانیں جو ساکت مٹی کا مادھو بنا ہوا کھڑا رہے: آپ جو جی میں آئے' وہاں جا کے اس کو کہتے رہیں' وہ سامنے سے کچھ کہے ہی نہیں۔انہیں اس قسم کے معبود چاہئیں۔ **وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا** (71:24)

---

[1] جسے پنجابی میں کہتے ہیں: میں نے انتہائی کوشش کر کے دیکھ لیا۔

یہ خود گمراہ ہوئے ہیں اور بہت سوں کو انہوں نے گمراہ بھی کیا ہے۔ ان کا دہرا جرم ہے۔ اس لیے کہا کہ ان کی یہ روش' ان کو ان کے ظلم میں' ان کی گمراہی میں' اور بڑھاتی چلی جاتی ہے۔

عزیزانِ من! وہ ایک (Momentum) (زورِ دروں) ہوتا ہے' وہ تو یوں کہیے کہ اگر آپ نے کسی کو گھمانا ہو تو پہلی دفعہ یا دوسری دفعہ بہت زور لگا کر اسے دو چار چکر گھمانا پڑتا ہے جب وہ چکر دیدیئے جاتے ہیں تو پھر اس میں اپنی ہی قوتِ دروں ہوتی ہے' اسی زور کے اوپر پھر وہ آگے چلا جاتا ہے۔ یہی کیفیت گمراہی کی ہوتی ہے۔ اس پہ شروع میں تو کچھ زیادہ زور لگتا ہے۔ جب موٹر کا فرسٹ اسپارک (First Spark) ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ پتہ نہیں اس میں کتنی بجلی صرف ہوتی ہے اور اس کے بعد تو پھر وہ موٹر خود ہی بجلی پیدا کرتی ہے اور اسی زور پہ خود ہی چلی جاتی ہے۔

پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرنے کی مثال

عزیزانِ من! یہ جو غلط روش ہوتی ہے اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ قرآن نے اس کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کی طرف آنے یا گرنے سے تشبیہہ دی ہے کہ جب چوٹی سے نیچے گرتا ہے شروع میں تو اس کی رفتار بہت تھوڑی ہوتی ہے' جوں جوں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے' رفتار تیز ہوتی چلی جاتی ہے' اپنے ہی زورِ دروں سے تباہی کے جہنم میں جا گرتا ہے۔ کہا کہ اب ان کی یہ کیفیت ہو چکی ہے کہ گمراہی کے زورِ دروں سے یہ وہاں چلے جاتے ہیں۔

اب وہ بات آ گئی کہ اس طرح سے یہ کیوں ہو رہا ہے۔ کہا کہ مِمَّا خَطِيٓـٰٔتِهِمْ (71:25) انہوں نے غلط کاریاں اور خطا کوشیاں کیں۔ پھر آگے ہے: اُغْرِقُوْا (71:25) چنانچہ وہ غرق ہو گئے۔ یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ قرآن نے یہاں تفصیل بیان نہیں کی' دوسرے مقامات میں کی ہے کہ اس وادی میں بہت بڑا طوفان آ رہا تھا۔ یہ بات میں دوسرے مقام پہ عرض کرونگا کہ یہ جتنی تباہیاں آئی ہیں' انبیاء کرام علیہم السلام کے جو قصے آ گئے ہیں ان تباہیوں میں جس طریق سے حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام ان سے محفوظ رہے ہیں' اس میں کوئی چیز فوق الفطرت نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان کے بچاؤ کے لیے کوئی ایسا الگ سامان کیا گیا ہے جو دوسروں نے نہ کیا ہو' یا ان کے بچاؤ کے لیے کوئی آسمان سے اترا ہو اور جو دوسری قوم ہے وہ تباہ ہوئی ہو۔ بیشتر تو وہی ہیں جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اس تباہی آنے سے پیشتر ان کی نگاہ نے بھانپ لیا' وہ اس مقام کو چھوڑ کر ہی چلے گئے۔ حضرتِ نوح علیہ السلام کے متعلق کہا کہ طوفان آنے والا ہے۔ یہ اس قوم کو کہہ رہے ہیں' اپنے متعلق کہہ رہے ہیں کہ پانی سے نجات کیسے ہوگی۔ کہا گیا کہ کشتی بناؤ۔ سوچیے عزیزانِ من! خدا کے لیے کیا مشکل تھا کہ ان لوگوں کو' تھوڑے سے تو لوگ تھے' یہاں سے اٹھا کر کسی دوسرے مقام پہ لے جاتے۔ یہ بچ جاتے کیونکہ ان کو بچا لینا مقصود تھا۔ یہاں سے اٹھا کے کسی دوسرے مقام پہ لے جانا مشکل کیا تھا' لیکن وہ پھر ہمارے لیے ایک نظیر یا مثال نہ بن سکتی کہ اگر طوفان آئے تو اس میں بچنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ پہلا طوفان آیا ہے' پہلا ہی نبی ہے جس کو کہا جاتا ہے کہ ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔ تو نظر آتا ہے کہ

معاملہ ابھی ایسا تھا کہ انسان نے کشتی بنانا بھی نہیں سیکھا تھا' جبھی کہا کہ ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔ عزیزانِ من! کشتی بنانے کے لیے بھی وحی آتی تھی اور پھر یہ بھی کہ ہم نگرانی بھی کرتے جائیں گے' دیکھتے جائیں گے کہ ٹھیک جگہ تم کیل لگاتے ہو' ٹھیک جگہ یوں تختہ لگاتے ہو لیکن بنوائی ہے کشتی ہی' کشتی کے ذریعے سے ہی اس طوفان سے نجات دلائی ہے۔ آج بھی یہ صورت ہے کہ غلط نظام کی وجہ سے تباہیاں تو آئیں گی لیکن تباہیوں سے بچنے کے لیے سامان اسی قسم کا پیدا کرنا پڑے گا۔

قرآن نے کہا کہ وہ غرق ہوئے کیونکہ مِمَّا خَطِيٓـَٔتِهِمْ (71:25) انہوں نے غلط کاریاں اور خطا کوشیاں کی تھیں۔ اپنی غلط روش کی بناء پر وہ غرق ہوئے تھے۔ غلط کاریوں اور غلط کوشیوں کی بناء پر وہ غرق ہوئے تھے' تباہ ہوئے تھے۔ وہاں یہ ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام بیٹھے کشتی بنایا کرتے تھے اور وہ ان کے ہاں کے بڑے بڑے جو سردار تھے اگر وہ اپنی قوت کے نشے میں بدمست نہ ہوتے تو کھڑے ہو کر کسی وقت پوچھتے کہ یہ کیا کر رہے ہو' تم یہ کیا چیز بنا رہے ہو' کیوں بنا رہے ہو' اس کا کیا فائدہ ہوگا' سمجھنے سوچنے کی صلاحیت باقی رہتی تو انہوں نے بھی کشتی بنائی تھی وہ بھی بنا لیتے۔

نشہ قوت انسانی صلاحیتوں کو سلب کر دیتا ہے

عزیزانِ من! لیکن قرآن بتاتا یہ ہے کہ یہ جو قوت کا نشہ ہے' یہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اس میں انسان کے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں' سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ وہ دیکھ رہے ہیں اور مذاق کر کے آگے بڑھ رہے ہیں کہ اس کی مت ماری گئی ہے' یہ کیا کر رہا ہے۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ غرق ہوئے کیونکہ ان کی ذہنیت یہاں تک بگڑ چکی تھی کہ عام فہم و فراست' عقل و فکر اور بصیرت کی رو سے جو چیز انسان سمجھ سکتا ہے ان میں وہ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ قوت کا نشہ عام فہم و فراست اور بصیرت کو بھی سلب کر دیتا ہے۔ اکھاڑے سے باہر کھڑے ہوئے وہ لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں اور کہہ رہے ہوتے ہیں کہ صاحب! دیکھو' اس کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آ رہی۔ عزیزانِ من! ان کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آ رہی ہوتی۔

حضرتِ شعیب علیہ السلام کو اُن کی قوم نے یہی کہا تھا کہ شعیب علیہ السلام! تم یہ جو کچھ کہتے ہو کہ اس کاروبار میں دیانت برتو' تمہاری یہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ آپ علیہ السلام انہی کی زبان میں بات کر رہے تھے' انہی میں سے تھے' پھر یہ کہنا کہ تمہاری بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی ان کی بگڑی ہوئی ذہنیت کی غماز ہے اور واقعی' یہ جو اونچے اونچے اڑتے ہیں' نیچے والوں کی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں کہا گیا ہے کہ وہ اپنی خطا کوشیوں کی بناء پہ غرق ہو گئے۔ فَاُدْخِلُوْا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا [1] (71:25)۔ وہ

---

[1] اور پھر جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ سو انہوں نے دیکھ لیا کہ خدا کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں تھا۔ (وہ جن بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے نہ تو وہ ہی ان کی مدد کو پہنچے اور نہ ہی وہ لیڈر جن کا وہ اتباع کرتے تھے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

آگ میں جھونک دیئے گئے۔ ہمارے ہاں یہ تصور ہے کہ یہ کچھ قیامت میں ہوگا۔ عزیزانِ من! وہ قیامت اور اس کی جہنم اپنے مقام پہ ہے' وہ اس سے الگ ایک عذاب ہے' مگر یہ قیامت' یہ عذاب تو اس دنیا کے اندر ہے۔ آگے یہ بات بتادی کہ **فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا** (71:25) پھر خدا کے سوا ان کا کوئی بچانے والا نہیں تھا اور خدا نے بچانے کا جو طریقہ بتایا تھا وہ انہوں نے مذاق میں اڑا دیا تھا۔ جب کیفیت یہ ہو تو پھر تو کوئی چیز بھی باقی نہیں بچتی۔ آپ اندازہ لگایئے کہ وہ کس مقام پر پہنچے تھے۔ ایک غم خوار دل ہے جو ابھی ابھی کہہ رہا ہے کہ یا اللہ! میں نے دن رات ان کے بتانے کے لیے ایک کر دیا لیکن انہوں نے ایک قدم بھی اصلاح کی طرف نہ اٹھایا۔ وہ پوری کی پوری قوم اس حد تک سرکشی میں آگے بڑھ چکی تھی اور ان کے جرائم ایسے متعدی ہو رہے تھے کہ دوسرے انسانوں کو ان کے اثرات سے بچانا نہایت ضروری تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر **وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا** [1] (71:26)۔ یہ سرکشی میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں' ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ چھوڑ۔ یہ ٹھیک ہے کہ مقام ایسا ہی آ گیا ہوگا۔ وہ بھی خدا کے نبی تھے۔ معلوم نہیں اس قوم کی کیا کیفیت تھی جس کے لیے آگے خدا بتا رہا ہے۔ میں ابھی اس پر آتا ہوں لیکن بات دوسری طرف آ گئی پہلے میں وہ بتادوں۔

کسی کو چھوڑو تو وہ بھی حسن کارانہ انداز سے چھوڑو

نبی اکرم ﷺ سے بھی یہ کہا گیا تھا: **وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا** [2] (73:10) ان میں اب کسی قسم کی اصلاح کی گنجائش باقی نہیں رہی' اصل تو یہ ہے کہ ان میں بچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی ہے' اس لیے اب ان سے اعراض برتو' ان میں اپنا وقت ضائع نہ کرو' یہی وقت کسی اور تعمیری کام میں صرف کرو' مدینے چلے جاؤ' ان کو چھوڑ دو' لیکن انداز یہ ہے کہ **هَجْرًا جَمِيْلًا** (73:10) چھوڑو بھی تو بڑے ہی حسین انداز سے چھوڑو' یہی نہیں ہے کہ کسی کے ساتھ دوستی کرو تو حسن کارانہ انداز سے کرو۔ قرآن کی تعلیم کا اندازہ لگاؤ کہ ان کو چھوڑو بھی تو حسن کارانہ انداز سے چھوڑو۔ اور آگے وہ فرق ہے جس کے لیے میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ میں اس کی طرف آتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ ان کو چھوڑو بھی تو قرآن کی بات ان تک پہنچاتے جاؤ تاکہ یہ نہ ہو کہ ان میں سے اگر کسی میں بچنے کا امکان ہے تو وہ اس لیے ختم ہو جائے کہ قرآن کی آواز ان تک نہیں پہنچی تھی: چھوڑو' جمیل انداز سے چھوڑو' اور قرآن کی آواز اس کے باوجود پہنچاتے رہو۔ اس میں رسول کی غم خواری اور خدا کے رؤف و رحیم ہونے کی دونوں چیزیں آ جاتی ہیں۔ خدا کے لیے تو ہم غم خوار اور غم گسار جیسے الفاظ بھی استعمال نہیں کر سکتے لیکن ہمارے پاس اور الفاظ کیا ہیں! آخری انداز میں تباہی کے جہنم میں گرنے لگتا ہے تو اس وقت بھی خدا بڑے حساس انداز

---

1. نوحؑ نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ ان سرکشوں میں سے کسی ایک گھرانے کو بھی ملک میں بسنے کے لیے باقی نہ چھوڑ۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)
2. اپنے مخالفین کی طرف سے صرف نظر کرتے ہوئے' اپنے دامن کو ان خاردار جھاڑیوں سے' حسن کارانہ انداز سے بچاتے ہوئے' الگ ہٹتے چلے جاؤ۔ (ایضاً)

سے کہتا ہے کہ میرے بندے! تم نے اپنے ساتھ کیا کر لیا۔ یہ کسی ظالم اور انتقامی کا انتقام نہیں ہے کہ بیت پڑیں اور وہ خوش ہو کہ اچھا ہوا' تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ کہتا ہے کہ او میرے بندو! یہاں اس نے حسرت کا لفظ خود استعمال کیا ہے۔ تو گویا یہ کیفیت ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا ہے کہ ان میں اصلاح کا امکان نہیں ہے' ان کو چھوڑ دو اور اس کے بعد ان سے یہ کہا ہے کہ قرآن بھی پہنچاتے رہو۔ یہ جو کہا تھا کہ ان میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑ' اس سے آگے کہا کہ اِنَّکَ اِنۡ تَذَرۡهُمۡ یُضِلُّوۡا عِبَادَکَ وَ لَا یَلِدُوۡۤا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا (71:27) اس لیے کہ مجھے ان کا اندیشہ ہے کہ یہ ایسی سطح پہ' ایسے مقام پہ' پہنچ چکے ہیں کہ اگر کوئی بھی ان میں سے باقی رہا تو یہ اس کے بعد دوسروں میں فتنہ پھیلاتا چلا جائے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ اسی گمراہی کی حالت میں' فسق وفجور میں مبتلا رہے تو ان کی اولاد بھی اسی قسم کی ہوگی۔ اس لیے ان کا سلسلہ ہی ختم کر دے کہ نوعِ انسانی بھی آگے چلے تو صالحین کی اولاد ہو جو آگے چلے۔ یہ بڑی چیز کہی ہے اور واقعی وہ اولاد بھی اسی قسم کی ہوتی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِمَنۡ دَخَلَ بَیۡتِیَ مُؤۡمِنًا (71:28) اے میرے پرودگار! حفاظت کا سامان مجھے دے' میرے والدین کو بھی دے' وہ مومن ہونگے کیونکہ جو بیٹا تھا وہ تو ان میں سے نہیں تھا۔ اور لِمَنۡ دَخَلَ بَیۡتِیَ مُؤۡمِنًا (71:28) یہ نہیں ہے کہ جو میرے گھر میں آ جائے اس کو بھی محفوظ کر دے' حفاظت دیدے' نہیں۔ بلکہ ایمان کے ساتھ جو میرے گھر میں داخل ہوٗ اس کو بھی حفاظت دے۔ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ (71:28) تمام مومنین کو' تمام مومنات کو وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا تَبَارًا (71:28) اور ہم جانتے ہیں کہ یہ جو ظالم ہیں' ان کے اوپر جو تباہی ہے' یہ تو بڑھتی چلی جائے گی اور یہ ختم ہو جائیں گے۔

اعلان

عزیزان من! سورۃ نوح کا اختتام ہوا اگلے درس کی بات بڑی اہم ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ جو قوم اپنے محسنوں کو یاد نہیں رکھتی پھر اس قوم میں محسن پیدا ہونے بند ہو جایا کرتے ہیں۔ ہمارے اس دور میں میری نگاہ سے تین محسنین گزرے ہیں: سرسید احمد خاں (1898-1817ء)' ڈاکٹر محمد اقبال (1938-1877ء)' اور قائداعظم محمد علی جناح علیہم الرحمۃ (1948-1876ء)۔ یہ ہم پر ملتِ ہندیہ مسلماں کہہ لیجیے' یا پاکستانیہ' پر بہت بڑا احسان ہے۔ پچیس دسمبر عام طور پہ قائداعظمؒ کا یومِ پیدائش ہوتا ہے۔ اس پہ بھی میں ایک خطاب پیش کیا کرتا ہوں تو پچیس دسمبر نہیں بلکہ ہم جمعہ کے دن یہ کیا کرتے ہیں کیونکہ درس کا وہی دن ہے۔ اگلا درس تیس دسمبر کو آئے گا' تو تیس دسمبر کا جو درس ہے' اس کا خصوصی عنوان ہے: ''منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے۔'' جنہوں نے پاکستان کی اتنی مخالفت کی تھی' یہ فطرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ وہ آج پاکستان کے مالک بنے پھرتے ہیں۔ میں پاکستان کی تحریک میں شامل تھا۔ اسے یوں کہیے کہ مجھے وہاں ساتھ شامل رہنے کا شرف حاصل ہے تو میں پاکستان کی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ کچھ عرض کرونگا کہ جن لوگوں نے

وہاں تحریک پاکستان کی، مطالبہ پاکستان کی، قائداعظمؒ کی، اقبالؒ کی، اتنی مخالفت کی تھی، وہ جو آج یہاں، آپ کے ہاں، پاکستان کے اقتدار کے حصول کی ہوس لیے بڑے معتبر بنے پھرتے ہیں۔ یہ تمام علماء حضرات، یہ تمام کسی قسم کے جتنے بھی سیاسی لیڈر آپ کے ہاں نمایاں طور پہ نظر آرہے ہیں، انہوں نے بڑی مخالفت کی تھی۔ اس خطاب میں، میں یہ عرض کرونگا کہ انہوں نے پاکستان کے مطالبہ اور تحریک میں کس طرح مخالفت کی اور یہاں آنے کے بعد پھر کس طرح انہوں نے کہا کہ صاحب! یہ سب کچھ ہمارے ہاتھ میں دیدیجیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ''منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے''۔ ان احباب نے اس کے کارڈ چھپوالیے ہیں اور آپ احباب نے تو یہ اعلان سن لیا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

تیرھواں باب: سورة الجن (آیات 1 تا 15)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1984ء کی چھ تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الجن سے ہو رہا ہے۔ یہ 72 ویں سورۃ کا آغاز ہے۔

عربی لغت کے تحت ''جن'' کا مفہوم

بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ جونہی وہ سننے میں آئیں یا دیکھنے میں آئیں' ان کے اندر جو ایک مضمر مفہوم چلا آتا ہے' وہ ہمارے ذہنوں سے ایسا چپکا ہوا ہوتا ہے کہ ہم اس کی کوشش اور کاوش ہی نہیں کرتے کہ اس لفظ کے صحیح معنی معلوم کریں بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جو پہلے سے متصور معنی ہوتے ہیں' وہی ذہن کے اندر آجاتے ہیں۔ ان الفاظ میں ''جن'' کا لفظ تو بہت ہی زیادہ طاقتور ہے۔ لہٰذا ''جن'' کا لفظ جس وقت بھی کسی کی زبان پر آتا ہے تو اپنے اپنے تصور کے مطابق فوراً ایک خاص شکل سامنے آجاتی ہے۔ پہلے تو پھر بھی یہ متخیلہ کے خاکے ہوتے تھے اور اب ٹی وی (ٹیلی ویژن) کے طفیل تو ان کی مجسم شکلیں سامنے آجاتی ہیں۔ اس سے ہماری آنے والی نسلیں تو اپنی آنکھوں

کے سامنے ''جن'' دیکھ لیتی ہیں اور ہمارے ذہنوں میں ''جن'' کے جو معنی پیوست ہوتے ہیں' وہ ذہن سے الگ ہی نہیں ہوتے۔ اب بھی میں نے سورۃ جن کہا ہے تو ''جن'' کے لفظ سے آپ کے ذہن میں فوراً وہی کچھ آ گیا۔ ایسے الفاظ کے متعلق ضروری ہوتا ہے کہ انہیں ذرا غور سے دیکھا' سنا اور سمجھا جائے۔ اصل میں یہ لفظ عربی زبان کا ہے اور اس کا مادہ ''ج ن ن'' ہے جس کے بنیادی معنی ہیں: ''ہر وہ شے جو نگاہوں سے اوجھل ہو''❶ اس طرح جب تک کوئی چیز نگاہوں سے اوجھل ہو وہ ''جن'' رہتی ہے اور جب وہ نگاہوں کے سامنے آ جائے تو پھر وہ جو کچھ ہوتی ہے وہ وہی کچھ بن کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں انسانی زندگی یا زندگی کی جو ارتقائی منازل آئی ہیں' ان کے متعلق سائنس کے انکشافات نے یہ چیز بتائی ہے کہ جب یہ مختلف مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھی ہے تو یہ سائنسدان اسے بن مانس تک لے آئے ہیں اور اس کے بعد جب یہ آگے بڑھی ہے تو وہ اسے اُس مخلوق تک لے آئے جسے وہ چمپانزی (Chimpanzee) کہتے ہیں اور اس کے بعد ان کی تحقیق کے مطابق پھر انسانی پیکر آتا ہے۔ اب تک ان کی تحقیق یہ ہے کہ درمیان میں ایک Missing Link (گم شدہ کڑی) ہے یعنی ارتقا کی ایک کڑی ایسی ہے کہ جو ابھی تک سامنے نہیں آ سکی۔ اس کے متعلق یہ لوگ بڑی کاوش کر رہے ہیں اور ان چیزوں کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں کہ جو ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں آتیں کہ آیا وہ اس قابل ہیں کہ ان پہ تحقیق کی جائے۔ یہ لوگ اس تحقیق و تدقیق پہ چلے گئے ہیں' وہ کہیں افریقہ کے صحراؤں اور کہیں آسٹریلیا کے جنگلوں میں کھدائی کر رہے ہیں یا پھر کہیں کہیں ہڈیوں اور پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ رہے ہیں کہ انہیں وہ ایک Missing Link (گم شدہ کڑی) مل جائے۔ قرآنِ کریم نے اسے بھی ''جن'' یا ''جان'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ خدا کی کیا بات ہے! چودہ سو سال پہلے قرآن نے سورۃ الحجر میں کہا کہ **وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ**

---

❶ بقول تاج العروس' انگریزی زبان میں عربی کے مشہور لغت Lane's Lexicon اور سعید الخوری الشرتونی اللبنانی کی مشہور لغت اقرب الموارد اَلْاِنْس کے مطابق وہ قبیلہ ہے جو کسی جگہ مقیم ہو۔ اور انس کے برعکس' وہ خانہ بدوش قبائل جو جگہ جگہ پھرتے رہتے ہیں اور اس طرح عام نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں جن کہلاتے ہیں۔ انہی کی تائید میں بقول صاحب لغات القرآن جلد اول ''عربوں میں الانس ان قبیلوں کو کہتے تھے جو ایک مقام پر مستقل طور پر سکونت پذیر ہو جائیں لیکن ''جن'' وہ قبائل تھے جو جنگلوں اور صحراؤں میں جگہ بہ جگہ پھرتے رہتے تھے اور اس طرح شہر والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے انہیں خانہ بدوش قبائل (Nomadic Tribes) کہا جاتا ہے۔ اب بھی دنیا میں جہاں جہاں اس قسم کے قبائل پائے جاتے ہیں وہ شہر والوں سے دور دور' جنگلوں بیابانوں میں رہتے ہیں۔ شہر والوں اور اِن خانہ بدوش' صحرا نشینوں کے تمدن و معاشرت' عادات و اطوار' خصائص و خصائل اور ذہنی اور نفسیاتی کیفیات وغیرہ میں اس قدر فرق تھا کہ یہ دونوں ایک نوع کے افراد نظر نہیں آتے تھے۔ عربوں میں یہ صحرا نشین قبائل بہت زیادہ تھے۔ (انہیں بدو یا اعراب کہا جاتا تھا) چونکہ قرآن کا پیغام شہریوں اور صحرا نشینوں سب کی طرف تھا اس لیے اس نے جِنٌّ وَاِنْسٌ دونوں گروہوں کو مخاطب کیا ہے۔'' (پرویز: لغات القرآن۔ ص: 446)

مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ o وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ [1] (15:26-27)۔قرآن کتنی واضح بات کرتا ہے یہاں ''مِنْ قَبْلُ'' نے بات واضح کردی کہ انسان کی تخلیق سے پہلے یہاں ایک ایسی مخلوق تھی جو اب تمہاری نظروں سے اوجھل ہے۔اس کا کوئی نام نہیں رکھا۔قرآن نے یہی کہا ہے کہ وہ ایک مخلوق تھی جو اب تمہاری نظروں سے اوجھل ہے۔

سائنس کے انکشافات

عزیزانِ من! یہ چیز بھی سائنس کے انکشافات میں ہے کہ خود ہمارا کرّہ ارض بھی کبھی بالکل آتشیں گولا ہوتا تھا' پھر آہستہ آہستہ اس کے اوپر کا حصہ جس پہ ہم رہ رہے ہیں' ٹھنڈا ہوا جبکہ اس کے اندر ابھی تک وہی پگھلے ہوئے مادے ہیں' دھاتیں ہیں' جو گاہے گاہے آتش فشاں پہاڑ کی شکل میں نکلتے ہیں۔ جب کبھی یہ اوپر کا حصہ جو بہت گرم تھا' اس وقت اس حصے پر ایسی مخلوق' جو اس قسم کے درجہ حرارت کے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی تھی' موجود تھی۔گویا اس سے پہلے زندگی کی' لائف (LIfe) کی ایک کڑی تھی جو' اب انسانی نگاہوں سے اوجھل ہے اور یہی ہے وہ چیز جس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اُسے آگ سے پیدا کیا گیا تھا۔اِسے ہم ''جن'' کہتے ہیں۔اس میں اتنی زیادہ شدید درجہ حرارت برداشت کرنے کی صلاحیت تھی لیکن وہ اب موجود نہیں ہے' نگاہوں سے اوجھل ہے۔ غالبًا یہ وہی درمیان کی Missing Link (گم شدہ کڑی) ہے جس کی تلاش میں مغرب کے یہ سائنسدان کس قدر کاوشیں اور کوششیں کر رہے ہیں۔ بہر حال یہ ایک کڑی (Link) تھی جس کا ہم سے اس لیے تعلق نہیں ہے کہ وہ اب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ایک تو یہ چیز یاد رکھیے۔

انسانی ذہن کا عہد طفولیت

عزیزانِ من! دوسری یہ بات یاد رکھیے کہ جب انسان اپنے ذہن کے عہدِ طفولیت میں تھا اور ہنوز اس کی علمی تحقیقات کی کاوشیں اتنی بلند سطح پہ نہیں پہنچی تھیں' بیشمار چیزیں ایسی تھیں جن کے متعلق وہ کچھ بھی معلوم نہیں کر سکتا تھا' خاص طور پہ اس زمانے میں جو بیماریاں ایسی آتی ہیں جن پر Scientific (سائنسی) تحقیقات کی جا سکتی تھیں تو ایسی وہ بیماریاں جن کے اسباب انہیں معلوم نہیں ہوتے تھے ان کے متعلق ان کا واہمہ تھا' توا ہم تھا' تخیل تھا۔وہ یہ کہتا تھا کہ اس قسم کی کوئی قوتیں ہیں جو آ کر اثر انداز ہوتی ہیں' جسے کہتے ہیں کہ وہ چمٹ جاتی ہیں۔وہ کہتے تھے کہ یہ بیماریاں ان کی وجہ سے ہوتی ہیں۔عام طور پر عورتوں میں ہسٹریا (Hysteria) اور مردوں میں دیوانگی' جنون' اور پاگل پن اسی قبیل سے ہیں۔اس زمانے میں تو چیچک کا مرض' تپ دق تک کے امراض' جن کی ان کے ہاں تحقیق نہیں ہو سکتی تھی' اسی قسم کی

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کی ابتداء سیاہ کیچڑ سے ہوئی جو سوکھ کر کھنکھنانے لگتا ہے [یعنی وہ طینِ لازب ہے جس سے زندگی کا اوّلین جرثومہ وجود میں آیا (37:11)]۔واضح رہے کہ انسانی تخلیق سے پہلے کرّہ ارض میں بے پناہ حرارت تھی اس لیے ابتداءً یہاں ایسی مخلوق کی ابتداء ہوئی جس میں حرارت برداشت کرنے کی بڑی صلاحیت تھی۔وہ مخلوق اب باقی نہیں رہی۔انسان اسی کا جانشین ہے (2:30)۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

اثر انداز ہونے والی قوتوں کی وجہ سے سمجھے جاتے تھے۔ ان امراض کی تشخیص نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ہوتی بھی کیوں؟ اس وقت تو سائنسی تحقیق نہیں تھی۔ جہاں ان کی یہ "کیوں" رک جاتی تھی، وہ کہتے تھے کہ کچھ ایسی قوتیں ہیں جو آ کر انسان پہ اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کی وجہ سے یہ امراض پیدا ہوتے ہیں۔ یہ جتنی قوتیں تھیں، ان کو چونکہ یہ نظر نہیں آتی تھیں، اس لیے انہیں بھی انہوں نے بھوت، پریت، جن، پریاں، چڑیلیں نام دے رکھے تھے، پھر وہ ان کی پرستش بھی کرتے تھے۔ پرستش کے معنی ہیں کہ وہ ان کی منتیں کرتے تھے، ہاتھ جوڑتے تھے، ان کے سامنے سجدے کرتے تھے کہ تم اس طرح سے ہمیں تکلیف نہ دو، آ گئے ہو تو چلے جاؤ۔ ان کے بڑے بڑے سیانے، جو اس زمانے میں کہلاتے تھے، وہ یہ مذہبی پیشوا ہی ہوتے تھے۔ وہ آ کر ان پہ ٹونے، ٹوٹکے، گنڈے، تعویذ کرتے تھے۔ جس قسم کے جہالت پر مبنی وہ امراض تھے اُسی قسم کے جہالت پر مبنی ان کے علاج ہوتے تھے۔ اس دور سے بھی انسان گزرتا چلا آیا تا آنکہ علم کی روشنی نے جہالت کی ان تاریکیوں کو رفتہ رفتہ دُور کیا۔ جس حد تک یہ دُور ہوتی چلی گئیں اس حد تک وہ چیزیں جو آنکھوں سے دیکھی نہیں جاتی تھیں، وہ مشہود ہونی شروع ہو گئیں۔ امراض کے اسباب معلوم ہو گئے، تشخیص ہونے لگ گئی، تو اوہام پرستیوں کو علم کی روشنی نے کافور کر دیا۔ آپ ابھی کل تک یورپ کی تاریخ دیکھیے۔ وہ اس قسم کی جہالت میں، تو اہم پرستیوں میں، ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں ہر قسم کے بھوت، پریت، جن، چڑیلیں، اور امراض کے متعلق بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔ آج چونکہ علم کی دنیا میں جسے Scientific (سائنسی) علم کہتے ہیں، باقی اقوام سے یہ آگے ہے، ان ملکوں کے اندر اب ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے: نہ جن ہے، نہ بھوت ہے، نہ پریت ہے، کچھ نہیں ہے حتیٰ کہ اب ان امراض کے متعلق بھی یہ کچھ نہیں ہے، جن کی وجہ سے خاص طور پہ ہمارے ہاں کی لڑکیوں کو جو ایک دورہ پڑتا ہے اور پھر جو کچھ ان بچیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، اس سے خدا پناہ دے۔ وہ بچیاں بیمار ہوتی ہیں۔ وہ بیماری ہسٹیریا (Hysteria) ہے۔ اُس کا علاج ہے اور پھر اب انہوں نے Psychiatry (طبِ نفسی) سے علاج شروع کیا ہے۔ وہ تو بہت آگے چلے گئے ہیں۔ وہ ان چیزوں کا قوتِ خیال سے ہی علاج کرتے ہیں کیونکہ ان امراض کا زیادہ تعلق اعصاب سے ہوتا ہے اور یہ قلندر [1] تو ہر چہ گوید دیدہ گوید ہے۔ یہ تو آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ یہ کچھ تو میں خود کرتا رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ یہ چیزیں بھی علم کی روشنی میں آتی چلی جاتی ہیں۔

قرآنِ کریم کے نزول کا مقصد خدا نے یہ بتایا تھا کہ اس کے ذریعے تم انسانیت کو تاریکیوں سے روشنی میں لے آؤ۔ یہ اس کا فریضہ تھا، اس امت کی ذمہ داری تھی کہ وہ نوعِ انسانی کو قرآن کے ذریعے تاریکیوں سے روشنی میں لے آئے لیکن بہر حال اس امت نے نہیں کیا۔ جس نے بھی یہ کیا ہے، انسانیت کے اوپر اس کا احسان ہے۔ علم کی دنیا میں جو قوم آگے بڑھی ہے، جہالت کی تاریکیاں وہاں سے رفتہ رفتہ سمٹتی چلی گئی ہیں۔ اب امراض میں بھی کوئی مرض ایسا نہیں رہا جن کے متعلق یہ کہہ نہ سکیں کہ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ اگر وہ بیماری

---

[1] پرویزؒ کا اپنی ہی طرف اشارہ ہے۔

Physical (جسمانی) نہیں ہوتی تو پھر وہ Psychological (نفسیاتی) ہوتی ہے۔ وہ نروس (اعصابی :Nervous) بیماری ہوتی ہے۔ یہاں تک یہ آ گئے ہیں لیکن ہم تو ابھی ساری دنیا سے پیچھے اسی سطح کے اوپر ہیں جہاں انسان اپنے عہدِ طفولیت میں ہوتا تھا۔ ہم میں علم تو ہے نہیں، سائنس قطعاً نہیں ہے، اس لیے ان چیزوں کے متعلق بھی تا حال یہی صورت ہے اور پھر اس قسم کی جو قومیں ہیں ''اوناں وچ تے ایہو جئے جن چمڑ دے نیں جیہڑے نظر نئیں اوندے ہوندے کہ گلوں لتھ دے نئیں ہیگے۔'' ❶ یہ قومیں ان کو بھی برداشت کرتی ہیں جسمانی علاج کراتی ہیں یا نفسیاتی۔ تو یہ ہیں وہ قوتیں جنہیں آپ جنات کہیں گے۔

نزولِ قرآن کے وقت آبادی کی حالت

عربوں کے ہاں زمانہ نزولِ قرآن میں اور آج بھی ان کے ہاں آبادی کی صورت یہ ہے کہ وہاں بہت تھوڑے شہر ہیں۔ آج بھی آپ عریبیہ میں جا کے دیکھیے یا ان کے ہاں کی معلومات لیجیے: سارے دو تین شہر ہیں۔ آپ اسے برِاعظم کہہ لیجیے کیونکہ یہ اتنا بڑا ملک ہے۔ اس کے اندر شہر کتنے ہیں؟ دو تین شہر ہیں۔ اور یہی دو تین شہر ہیں، جن کا نام اس زمانے میں بھی ملتا ہے: مکہ، مدینہ اور طائف۔ ان شہروں میں رہنے والے لوگ جنہیں Social Animal (سماجی حیوان) کہتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مانوس ہوتے تھے۔ ان مانوس لوگوں کو وہ لوگ اپنی زبان میں ''الناس'' کہتے تھے یا ''انسان'' کہتے تھے جو ایک دوسرے کے ساتھ مانوس ہوتے ہیں اور ان کے ہاں کی باقی ساری آبادی خانہ بدوش، صحرانشین، بدو ہوتے تھے۔ کوئی اس نخلستان کے نیچے دو چار دس خیمے گاڑ لیے، ایک قبیلہ یہاں آ گیا، کوئی پچاس میل دُور کہیں اس کو نخلستان ملا اس کے نیچے اس نے اپنی ''ٹپڑیاں جنوں کیندے نیں'' ❷ ڈال لیں۔ یہ اس قسم کے لوگ تھے۔ یہ خانہ بدوش تھے یعنی اپنے کندھے پہ اپنا گھر اٹھائے ہوئے پھر رہے تھے۔ یہ ہمیشہ باہر جنگلوں میں رہتے تھے، صحراؤں میں رہتے تھے کبھی کبھار ان میں سے کوئی شہر میں آ جاتا تھا۔

خانہ بدوش نظروں سے دُور رہنے والی مخلوق

میرا خیال ہے کہ آپ احباب، جو ہماری نسل کے ہیں، انہیں پتہ ہوگا کہ جن کو ہم خانہ بدوش کہتے ہیں ان کے ہاں کے مرد، بندر نچانے والے، ریچھ نچانے والے، شہروں میں آتے تھے اور دن بھر یہ کچھ کرتے تھے اور شام کو یہ کہیں چلے جاتے تھے۔ ان کی عورتیں آتی تھیں۔ اب ان کو میں کیسے سمجھاؤں ''گگھو گھوڑے ویچن والیاں ❸ تھیں''۔ وہ یہ چھوٹی چھوٹی سی چیزیں لے کر آ جاتی تھیں اور گھروں میں،

---

❶ ان میں تو اس قسم کے ''جن'' چپکتے ہیں جو نظر ہی نہیں آتے، ان سے تو گلوخلاصی ہی نہیں ہوتی۔

❷ جنہیں جھونپڑیاں کہتے ہیں۔

❸ مٹی کے بنے ہوئے گھوڑے اور گھوڑے نما جانور بیچنے والی عورتیں

محلوں میں، پہنچتی تھیں اور پھر شام کو کہیں گم ہو جاتی تھیں۔ یعنی پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ لوگ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں۔ یہ شہر سے دُور خانہ بدوش لوگ ہوتے تھے۔

عربوں کے ہاں بھی اسی قسم کے خانہ بدوش لوگ ہوتے تھے۔ ہمارے یہاں بہت کم تعداد میں یہ بات تھی کیونکہ شہری آبادیاں زیادہ تھیں۔ اُن کے ہاں چونکہ شہری آبادی بڑی قلیل تعداد میں تھی، اس لیے بیشتر آبادی انہی کی تھی۔ یہ لوگ چونکہ شہریوں کی نگاہوں سے اوجھل جنگلوں میں رہتے تھے وہ ان کو بھی ''جن'' کہتے تھے۔ قرآن میں ''جن'' اور ''انس/ الناس'' جہاں آتا ہے اس کے معنی یہ دو قسم کی آبادیاں ہیں: بدوی/ دیہی، خانہ بدوش اور شہری۔ ان دونوں کی تمدنی، ثقافتی، علمی اور عقلی سطح میں بہت فرق تھا۔ اب تو یہ خانہ بدوش بھی حتیٰ کہ گاؤں والے بھی، شہریوں کے ساتھ ایسے مل جل گئے ہیں کہ ان میں کچھ زیادہ تفاوت نہیں رہا۔ آج سے بیس تیس چالیس پچاس سال پہلے ان گاؤں والوں اور شہر والوں کے تمدن میں، ان کی ثقافت میں، ان کی معاشرت میں، بڑا فرق ہوتا تھا۔ شہر والے تو ان کو گنتی میں ہی نہیں لاتے تھے۔ اک گل کہہ دینی ''پئی اے پینڈو اے۔''[1] بس معاملہ ختم ہوا۔ ہمارے ہاں دیہات اور شہر میں اتنا فرق تھا۔ شہری آبادی اور ان کے ہاں کی یہ بدوی آبادی، جو خیمہ بدوشوں کی تھی، صحراؤں میں رہنے والے۔ ان میں سے بیشتر تو وہ تھے جنہوں نے کبھی شہر دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اس قسم کی چیزیں بنانے والے، لگھو گھوڑے[2] ہی نہیں، وہ چھوٹے چھوٹے چاقو، درانتیاں، چھاج، چھلنیاں، یہ چیز بنا کے بھی شہروں میں لاتے تھے۔ وہ عرب میں بھی یہ کچھ کرتے تھے۔ ان کا شہروں کے اندر آنا جانا صرف اس حد تک تھا، باقی اس کے بعد پھر وہ شام کو گم ہو جاتے تھے۔

عزیزانِ من! عرب تو زبان کے اعتبار سے بڑی محسوساتی قوم تھی۔ یہ جو شہر سے گم ہو جانے والے تھے، انہیں وہ ''جن'' کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں جہاں مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (114:6) آتا ہے، ''جن اور ''الناس'' کے الفاظ آتے ہیں، یاد رکھیے! اس لفظ ''جن'' کے معنی ''اس زمانے کے بدو خانہ بدوش اعراب'' تھے اور ''الناس'' وہ تھے جو ''شہروں میں آباد'' ہوتے تھے۔ قرآنِ کریم میں ایک تو یہاں (72:1) سورۃ الجن میں یہ بات آئی ہے کہ ''جنوں'' کا ایک گروہ تھا۔ اس نے قرآن سنا اور اس سے بڑا متاثر ہوا۔ انہوں نے پھر آپس میں Discussion (گفتگو، تبادلہ خیال) کی کہ ہم کیا چیز سن کر آئے ہیں۔ ان میں سے بعض ایمان لائے۔ بعض تھے، جنہوں نے انکار کیا۔ اس ایک مقام پہ، سورۃ الجن، میں یہ آیا ہے، دوسرا (46:29-30) میں سورۃ احقاف میں ہے کہ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ (46:29)۔ وہاں (72:1) میں بھی یہی ہے اور یہاں (46:29) میں بھی یہی ہے، انہی کا ذکر ہے

---

[1] صرف یہ ایک بات کہہ دینا کہ ''یہ دیہاتی ہیں۔''

[2] مٹی کے بنے ہوئے گھوڑے اور گھوڑے نما جانور

جنہوں نے قرآن سنا' اور پھر انہوں نے جا کر اپنی قوم سے کہا۔

عزیزانِ من! اس سے نظر آتا ہے کہ وہ جو آئے تھے وہ یا تو کسی طرح سے یہودی تھے یا ان کے عقائد اس قسم کے تھے کیونکہ انہوں نے اپنی قوم میں یہ کہا ہے کہ **قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ** (46:30) ہم ایک ایسی کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد (محمد ﷺ پر) نازل ہوئی ہے۔ اور اس کے کلام سے نظر آتا ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے بعد اس قسم کا کلام یہیں آیا ہے گویا انہیں یہ معلوم تھا کہ اس سے پہلے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف کچھ کتاب آئی تھی اور وہ اس کتاب کو جانتے تھے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ یہ جو ہم سن کر آئے ہیں' یہ اس کتاب کی تعلیم کی تصدیق کرتی ہے' تائید کرتی ہے' جو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف نازل ہوئی تھی۔ گویا یہاں' جو سورۃ احقاف (46:29-30) میں بتایا گیا ہے' اُس سے نظر آتا ہے کہ یہ یہودی تھے یا یہودیوں کے سے اعتقادات سے متاثر ہوئے افراد تھے۔ یہ ''جن'' تھے یعنی یہ وہی خانہ بدوش قبائل تھے' وہی نگاہوں سے اوجھل' بدوی زندگی بسر کرنے والے لوگ تھے۔ یہ آئے ہیں اور انہوں نے آکر یہ قرآن کھلے بندوں نہیں' چھپ کر سنا ہے کیونکہ قرآنِ کریم میں یہ ہے کہ **قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ** [1] (72:1) اللہ تعالیٰ نے اِن کو خبر دی کہ آج ان بدوی قبیلوں میں سے کوئی قبیلہ' کوئی ایک گروہ آیا تھا۔ اس نے چپکے سے' چھپ کر' قرآن سنا ہے۔ وہاں (46:29-30) میں بھی ہے اور یہاں (72:1) میں بھی ہے کہ وہ سامنے جرأت کر کے نہیں آئے بلکہ انہوں نے اس طرح سے قرآن کو سنا ہے۔ گویا ایک وہاں (46:29-30) میں ہے' ایک اس سورۃ الجن (72:1) میں بھی یہی چیز آئی ہے۔ ابھی جب میں آگے ان آیتوں میں چلونگا تو نظر آجائے گا کہ یہ کوئی وہ ''جن'' نہیں تھے۔ جو ہمارے ذہنوں میں ہیں' یہ انسان ہی تھے' وہ اسی طرح سے کہ ان میں سے کچھ مسلمان ہوئے' بعض ایسے تھے جنہوں نے انکار کیا۔ یہ آپس میں Discussion (گفتگو' تبادلہ خیال) کر رہے ہیں' دلائل دے رہے ہیں۔ یہ ساری باتیں وہی ہیں جو انسان کرتے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ صرف انسانوں کی طرف ہی مبعوث ہوئے تھے

عزیزانِ من! اب اگلی چیز یہ ہے کہ وہ جو کہتے ہیں کہ ان ''جنوں'' نے قرآن سنا' انہوں نے کہا' ان میں سے وہ بھی تھے جنہوں نے کہا کہ ہم خدا پہ ایمان لاتے ہیں' قرآن پہ ایمان لاتے ہیں' رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاتے ہیں۔ تو اب یہاں سے ایک بات سامنے آتی ہے کہ قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہر مقام پہ یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ کو انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے' کہیں یہ نہیں کہا ہے کہ آپ ﷺ کو انسانوں اور ''جنوں'' کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ گویا یہ جو ایمان لائے تھے' یہ انسان ہی تھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ تو صرف انسانوں کی طرف رسول ہیں۔ فرض کیجیے کہ اگر یہ اس قسم کی کوئی ایسی مخلوق بھی تھی تو رسول ان کی طرف مبعوث ہوئے

---

[1] (اے رسولؐ!) اِن سے کہہ دو کہ مجھے بذریعہ وحی بتایا گیا ہے کہ.............(مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہی نہیں تھے۔ ان کا قرآن سن کر ایمان لانے' اتباعِ رسالت کرنے' اور اطاعت کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپؐ ان کی طرف تو رسول تھے ہی نہیں۔ آپ دو ایک ریفرنسز یعنی حوالے اس کے لیے بھی لے لیجیے۔ ایک تو (7:158) ہے جس میں ''حصر'' کے ساتھ قرآن نے یہ کہا ہے۔ ''حصر کا'' معنی ہوتا ہے: بالتحقیق تمام نوعِ انسانی سے پکار کر کہنا' صرف انہی کو اعلان کر کے کہنا۔ **قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعًا** (7:158)۔ اے رسول! کہہ دو: اے نوعِ انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔ عزیزانِ من! یہ الناس کی طرف ہی رسول ہیں۔ ایک اور حوالہ لے لیجیے: **وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا** [1] (34:28)۔ اس آیت میں یہ جو **وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ** ہے یہ وہ ''حصر'' ہے' یہ پکار کر کہنا ہے کہ ہم نے اے رسول! تمہیں صرف انسانوں کی طرف رسول بھیجا ہے۔ تو **کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ** ہے۔ وہاں (7:158) میں جمیعًا تھا' یہاں کافۃ للناس (34:28) آتا ہے۔ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں: تمام انسانوں کی طرف' صرف انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ یہ نظر آ گیا کہ یہ لوگ' جنہوں نے قرآن سنا' اس پر ایمان لائے اور پھر یہ کہا کہ ہم اطاعت کرتے ہیں' تو یہ انسان ہی تھے۔ قرآن کے ان حوالوں کی بنا پر' تصریحات کی رو سے' یہ انسان تھے کیونکہ حضور ﷺ تو انسانوں ہی کی طرف رسول بن کر آئے تھے' یہ وہ ''جن'' تھے جو بادیہ نشین تھے' صحراؤں میں رہنے والے خانہ بدوش تھے' جو شہری آبادیوں کی نگاہوں سے دُور رہتے تھے۔

قرآنِ کریم میں ''جن'' اور الناس کا لفظ بار بار آئے گا' تو اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ ان دونوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تمہارے لیے یہ قوانین ہیں' یہ ہدایت ہے' یہ سب کچھ ہے۔ اگر یہ جن انسانوں میں سے نہ ہوتے تو قرآن کا یہ دعویٰ معاذ اللہ غلط ہو جاتا کہ رسول اللہ کو انسانوں کی طرف ہی رسول بنا کر بھیجا ہے۔ تو یہ انسان ہی تھے جن کا ذکر' الناس اور الجن کے الفاظ میں آیا ہے۔ لہٰذا اگر قرآن کریم کی کچھ بنیادی وضاحتیں' آیات کی روشنی میں لی جائیں تو پھر اس سلسلہ میں کوئی دشواری باقی ہی نہیں رہتی۔ جہاں یہ کہا ہے کہ ''جنوں'' نے قرآن سنا' وہ ایمان لائے اور انہوں نے اس کے متعلق Discussion (گفتگو' تبادلہ خیال) وغیرہ بھی کی' تو یہ کسی اُس ''جن'' کا قرآن میں ایسا ذکر نہیں ہے جو چمٹ جاتا ہے۔ یہ اب ان کی تو اہم پرستیاں جو اس طرح کے تصور کو جنم دیتی ہیں' ویسے تو شہری زندگی میں بھی تو اہم پرستیاں کچھ کم نہیں ہوتیں لیکن یہ جو باہر کی خانہ بدوش ہیں' جو اس قسم کی بادیہ نشین' صحرا نشین آبادیاں ہیں' ان میں تو اہم پرستیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں کے یہ جو بڑے بڑے مذہبی پیشوا ہوتے ہیں یہ لوگ اپنے ہر معاملہ میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں' وہیں سے یہ تصورات آتے ہیں۔ اب بھی ان اقوام میں' ان براعظموں میں چلے جایئے' افریقہ' آسٹریلیا وغیرہ کے اندر چلے جایئے تو وہاں آپ

---

[1] ہم نے' اے رسول! انہیں تمام نوعِ انسانی کی طرف اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ تم لوگوں کو بتاؤ کہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج کس قدر خوشگوار ہوں گے (بشیراً) اور ان کی خلاف ورزی کرنے کے عواقب کس قدر الم انگیز ہوں گے' نیز جو لوگ ان قوانین کی مخالفت میں آگے ہی آگے بڑھتے جائیں انہیں اس سے روکا جائے۔ (نذیراً) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دیکھیں گے کہ ان کا سارا دارومدار ان مذہبی پیشواؤں کے اوپر ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہر معاملے میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں' یہ اس مذہبی پیشوا کی اتھارٹی ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی طرف سے کوئی بات کرے تو اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ یہ آسمان کی باتیں ہیں جو ہم معلوم کرتے ہیں اور تمہیں آکر بتاتے ہیں۔ اس سے بڑا رعب پڑتا ہے اور اس کا اثر بھی بڑا ہوتا ہے۔

علم کی روشنی سے دُور مسلمان کی حالت

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو اہم پرستیاں مسلسل ومتواتر چلی آ رہی ہیں اور وہ قوم جسے قرآن ملا تھا اور جس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ دنیا کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے گی اس کی حالت یہ ہے کہ وہ آج علمی دنیا میں سب سے پیچھے ہے۔ وہ ابتدائی انسانوں سے آگے نہیں بڑھ پائے جنہیں میں افریقہ یا اسٹریلیا کے جنگلوں میں رہنے والے الناس سمجھتا تھا ان کے مقابلے میں آج مسلمان علم کی دنیا میں سب سے پیچھے ہے۔ نیز یہ کہ سائنس کی روشنی اُن ترقی یافتہ ملکوں سے مستعار لے رکھی ہے' ان سے مانگ کے لی ہوئی ہے۔ آج انہی کی بنائی ہوئی چیزیں آپ کے ہاں موجود ہیں۔ ایک جنریٹر (Generator) ان کا بنایا ہوا نہ ہو تو ساری بجلیاں گل ہو جائیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آج کل بھی لوڈ شیڈنگ آ رہا ہے۔ ہم آج بھی تاریکیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ رمل' جفر' پیشین گوئیاں' فالیں لینا' استخارے کرنا' یہ جو ساری چیزیں ہیں' یہ آج بھی اسی عہد کی چلی آ رہی ہیں' جنہیں ہم افریقہ کے' آسٹریلیا وغیرہ کے جاہل قبائل کہتے ہیں۔ ان کے اندر یہ چیزیں آج بھی ہیں۔ ان تمام چیزوں کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ ایک دانش مند' سمجھدار' آپ کو کوئی مشورہ دیتا ہے تو وہ علم کی بناء پر' ذہن کی بنا پر' بصیرت کی بنا پر' شعور اور فکر کی بناء پر' دیتا ہے۔ وہ دلیل دیتا ہے لیکن جب کوئی حضرت جی آپ کو کوئی مشورہ دیتے ہیں وہ کسی دلیل وبصیرت کی بنا پہ نہیں دیتے۔

خدا تعالیٰ سے براہِ راست معلومات کا حصول

عزیزانِ من! ان کے ہاں کا ایک لدنی علم ہوتا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ یہ کیا ہے کہ جی! ہم براہِ راست اللہ میاں سے لیتے ہیں۔ یہ جتنے بھی اس قسم کے علم لدنی کے ماننے والے ہیں' وہ آسمان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ قبائلی لوگوں کے ہاں جو بڑے بڑے مذہبی پیشوا تھے' ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم' جو تمہیں بتاتے ہیں' یہ ہم آسمان کی خبریں لاتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن نے' جو اگلی بات بتائی ہے' وہ بڑی علم ودانش کی ہے۔ قرآنِ حکیم کی روشنی سے قبل' سرزمینِ عرب میں' ان کی تاریکیاں' ان کی توہم پرستیاں اور ان کی جہالتوں کا عروج تھا لیکن نزولِ قرآن کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد' انہی کے اندر' انہی کے ہاں کے جو مذہبی پیشوا' اتنے اتنے دعوے کرتے تھے' آسمان کی خبریں لانے کے دعوے کرتے تھے' وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ بھئی! ٹھیک ہے' ہم اس سے پہلے تو آسمان پر جا کے خبریں لے آیا کرتے تھے لیکن اب تو ہماری کیفیت یہ ہے کہ اگر کوئی ہم میں سے وہاں جانے کی کوشش کرتا ہے تو "علم

وآ گہی'' کی آ گ کے ایسے شعلے برستے ہیں کہ آ گے جانے کی جرأت ہی نہیں پڑتی۔ کیا بات ہے!

قرآنِ حکیم کے نور کی آ گ

یہ کونسی آ گ تھی جس کے شعلے پڑتے تھے؟ یہ قرآن کے نور کی آ گ تھی جس کے شعلے پڑتے تھے۔ وہ تو بھاگ اٹھے' انہوں نے تو یہ کچھ چھوڑ دیا لیکن نظر یہ آ تا ہے کہ وہاں سے انہوں نے چھوڑا نہیں' ہماری طرف منتقل کر دیا۔ وہ ساری چیزیں ہم اپنے ہاں مانتے ہیں۔ ہم حضرت صاحبوں کے علم کو مانتے ہیں' ان کے علمِ لدنی کو مانتے ہیں' ان کی پیشین گوئیوں کو مانتے ہیں' اور جفر کو اور رمل کو مانتے ہیں۔ ہم تو فٹ پاتھ پہ جو طوطا لے کر بیٹھا ہوا ہوتا ہے' اس کے متعلق بھی مانتے ہیں کہ قسمت کا حال بتا رہا ہے۔

قسمت کا حال طوطے بتاتے ہیں

عزیزانِ من! اب اس قوم کی جہالت کا کیا کہنا جو انسان کی قسمت طوطے سے سن رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی قسمتوں کے اوپر بھی خدا اسی قسم کے لوگ مسلط کر دیتا ہے۔ جہالت سے یہی ہوتا ہے۔ ان کے ہاں تو یہ ہے کہ وہ کہہ اٹھے کہ نہیں بھئی! اب ہمارا گزارا نہیں ہے' اب وہاں آسمان سے شعلے پڑتے ہیں' ہم اب وہاں نہیں جا سکتے۔ یہ ابتدا ہی ہے۔ حضور کی زندگی میں ہی قرآن کے نزول کے تھوڑا ہی عرصہ بعد جبکہ ابھی قرآن کی تکمیل بھی نہیں ہوئی ہے' تو وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ نہیں' بھئی! اب نہیں۔ تو گویا قرآن کی بصیرت اور علم کی اس قدر نور پاشیاں تھیں کہ اس کے زمانہ نزول کے دوران ہی وہ لوگ یہ پکار اٹھے کہ نہیں' وہ ہماری توہم پرستیاں تھیں جن میں ہم نے تمہیں الجھا رکھا تھا' اب وہ دَور چلا گیا ہے' اب تو اگر کوئی ہماری طرح آسمان پہ جا کر کچھ سننے کی کوشش کرتا ہے' تو وہاں سے اس کو آگ کے شعلے پڑتے ہیں۔ یہ وہ لوگ کہہ اٹھے' انہیں تو قرآن کی آگ کے شعلے پڑتے تھے' ہمیں نہیں پڑتے۔

ان تمہیدی کلمات کے متعلق یہ کچھ کہنا نہایت ضروری تھا جو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو قرآن میں ''جن'' آتے ہیں تو کم از کم ان کے معنی کیا ہیں۔ ان ''جنوں'' کے مروجہ مفہوم سے یہ تائید لینا کہ وہ انسانوں کو چمٹ جاتے ہیں' اس کا تو ہمارے ہاں پوچھو نہیں' جگہ جگہ آپ کے ہاں کے بڑے بڑے حضرت صاحبوں کے آستانے ہیں' ان کے ہاں ہر جگہ ''جن'' ہوتے ہیں۔

جِنوں کے قصے

آپ میری کتاب ''تصوف کی حقیت'' میں ہی دیکھ لیجیے جو ان کے جنات کے قصے میں نے لکھے ہیں۔ پھر بار بار بیچ میں ''میں'' آتی ہے جس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ اس دورِ جہالت میں تو یہ گناہگار [1] بھی ''جن'' نکالا کرتا تھا۔ ان ''جنوں'' کے قصے تھے: حضرت صاحب کے ہاں کا ایک جن تھا' وہ ہمارے ہاں' وہاں جہاں ہم پڑھتے تھے' وہاں پہ تھا۔ یہاں اس مسجد کے اندر باقی لڑکے بھی

---

[1] یہ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف اشارہ ہے۔

پڑھا کرتے تھے تو ان کے ہاں ایک ''جن'' لڑکا بھی انسان کی شکل میں پڑھا کرتا تھا۔ ''جن'' تو ہر شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ''جن'' جو ہے' اس میں بڑی طاقت ہوتی ہے' انسان بھی بن جاتا ہے۔ ہاں تو وہ پڑھا کرتا تھا' ایک دن مسجد کے صحن میں یہ سارے بچے ''لکن میٹی'' سمجھدے ہونا جیہڑی ہوندی ہیگی اے۔ ❶ بچے کھیلتے ہیں' ایک بھاگتا ہے' دوسرے چھپتے ہیں۔ تو وہ بھاگ رہے تھے' چھپ رہے تھے۔ وہ جو جن لڑکا تھا' وہ بھاگ رہا تھا۔ اسے کہیں چھپنے کو جگہ نہ ملی' تو مسجد کے لوٹے میں جا چھپا۔ اب وہ لوٹے میں جو چھپ گیا تو باقی بچوں نے شور مچایا اور رونا شروع کر دیا۔ بڑی بات تھی جناب! اس کے بعد ان حضرت صاحب نے بچوں کو چپ کرایا اور پھر اس جن لڑکے سے کہا کہ بیٹا! اب یہ راز فاش ہو گیا ہے' اس لیے اب تم یہاں سے چلے جاؤ' پھر وہ چلا گیا۔ یہ اس مسجد کے لوٹے میں ہوا تھا جہاں ہم پڑھا کرتے تھے۔ میں پھر عرض کرونگا کہ وہ ''جن'' نکالنے تو بڑے آسان تھے' جو میں نکالا کرتا تھا' ان جنوں کو بھگانا بھی کچھ مشکل نہیں تھا مگر یہ جو انسان جن بن جاتا ہے اسکو نکالنا بڑا دشوار ہے:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا' پرانا پاپی ہے' برسوں میں نمازی بن نہ سکا ❷

انسانی جن کو نکالنا بڑا مشکل کام ہے

یہ ''جن'' نہیں نکلتے صاحب! یہ قرآن کے علم کی روشنی سے ہی نکل سکتے ہیں۔ اور ان جنات کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ شمع نورانی اس امت کی طرف کبھی نہ آنے پائے۔ یہ انہی جہالت کی تاریکیوں کے اندر جیئے اور انہی کے اندر مرتا چلا جائے: پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے۔ پختہ تر کر دو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان لوگوں کی طرف سے یہ جتنی ساری کوششیں' ہو رہی ہیں' وہ یہ ہیں کہ اسے ان توہم پرستیوں میں پختہ تر کر دیجیے۔ وہ آپ نے طلوعِ اسلام میں دیکھا ہوگا۔ میں ان چیزوں کو کبھی کبھی لے آتا ہوں۔ ہندوستان بھر کے مفتی اعظم' پہلے وہ دیو بند کے مفتی تھے یعنی مفتی شفیع صاحب' پھر پاکستان میں مفتی اعظم ہوئے۔ ان کے ہاں کی وہ تفسیرِ قرآن آپ دیکھیے کہ یہ ان کے ہاں کی تفسیر کیسے چل رہی ہے۔ ان مفتی اعظم اور مفسر اعظم نے خود کہا ہے کہ میری بیوی پر ''جن'' کا سایہ تھا' وہ آیا کرتا تھا۔ ہمیں معلوم ہے اور ہم ان کے ساتھ یہ کیا کرتے تھے' پھر وہ منت کیا کرتے تھے یعنی ''جن'' کو تسلیم کر رہے ہیں۔ جہاں یہ کیفیت ہو کہ آپ کے ہاں کے مفسرِ قرآن اور مفتی اعظم اسے مانیں کہ وہ ''جن'' آتا تھا اور پھر اس ''جن'' کے لمبے چوڑے بڑے قصے ہیں۔ عزیزانِ من! اس قوم سے یہ ''جن'' نہیں نکل سکتے جو ذہنوں کے تراشیدہ ہیں۔ تو یہ ''جن'' اس طرح سے اپنی قوت کے زور پہ چپکتے ہیں اور ''جن'' کی

---

❶ چھپنے اور ڈھونڈنے کا کھیل۔ آپ اسے سمجھتے ہیں کہ یہ ایک گیم ہوتی ہے۔

❷ اقبالؒ: بانگِ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ء ص۔ 306۔

قوت تو آپ جانتے ہیں کہ کیا ہوتی ہے۔ پھر جب یہ ''جن'' مذہبی مقدس پیراہن اوڑھ کر آئیں پھر تو ان کا پوچھو ہی نہیں۔ وہ تو نکل ہی نہیں سکتے۔

عزیزانِ من! اس تمہید کے بعد میں سورۃ الجن کی طرف آتا ہوں۔ اس سورۃ کی ابتدا ہوتی ہے کہ **قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ** (71:1) اے رسول! بتا دو کہ خدا نے مجھے اس کی اطلاع دی ہے کہ ایک بادیہ نشین قبیلے کے کچھ لوگ آئے تھے اور وہ چپکے سے' چھپ کر' قرآن سن کے گئے ہیں۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اپنے ہاں جا کر Discussion (گفتگو' تبادلہ خیال) کی ہے۔ تو وہ چیز ہے جو وحی کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کو بتائی گئی کیونکہ وہ تو سامنے نہیں آئے تھے اور انہوں نے قرآن کریم کو سنا۔ اب پتہ نہیں وہ کس قبیلے کے لوگ تھے جو وہاں چلے گئے۔ اب یہاں تو یہی چیز آئی ہے کہ وہ آئے اور چلے گئے۔

روایات کے تحت سورۂ جن کے افسانے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا کہ قرآن نے تو یہ بتایا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کو تفاسیر' روایات و احادیث کی رو سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ لی ایک آیت' اور اس کے ساتھ ہی وہاں جو سورۃ احقاف میں ''جن'' کی آیتیں ہیں' ان کی تفسیر آپ بخاری اور مسلم کی احادیث میں دیکھیے یا اِن آیات کی تفسیر ان کے ہاں جو معتبر ترین کتابیں ہیں' ان میں دیکھیے۔ ان آیات کی تفسیر میں سچ مچ کے ''جن'' کے اتنے اتنے لمبے افسانے ہیں کہ ''جن'' کب آئے تھے' کہاں آئے تھے' اور ان کے ساتھ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں کہ رسول اللہ نے ان کو ساتھ لے لیا تھا۔ بڑا دلچسپ افسانہ ہو اور پھر وہ ہو ''جنوں'' کا' تو پوچھو ہی نہیں کہ وہ کتنا دلچسپ ہوتا ہے: رسول اللہ ﷺ جا رہے تھے' حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو بہت جلیل القدر صحابی ہیں' ساتھ تھے۔ آپؐ نے کہا کہ تم آگے نہ بڑھنا۔ ایک دائرہ کھینچ لیا۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ ایک حصار باندھا کرتے ہیں۔ وہ تو ہم بھی باندھا کرتے تھے۔ یہ اس خیال سے کہ ''جن'' اس کے اندر نہیں آ سکے گا اور یہاں سے باہر نکلو گے تو وہ تمہیں پکڑ لے گا۔ اب بھی یہ حصار کھینچتے ہیں اور پھر اس کی سند حضور کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے کہ آپ بھی اس قسم کے دائرے کھینچا کرتے تھے چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کہا کہ تم یہاں کھڑے رہو' باہر نہ نکلنا' ورنہ یاد رکھو! وہ ''جن'' تمہیں دبوچ لے جائیں گے' میں جنوں کی طرف جاتا ہوں اور ان کو قرآن سناتا ہوں۔ پھر آپ وہاں گئے اور ان کو قرآن سنایا۔ جبکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ ہم نے تمہیں وحی کے ذریعے یہ بات بتائی' تمہیں اس کا پتہ نہیں تھا اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ وہاں گئے اور وہاں جا کر ''جنوں'' کو قرآن سنایا اور آخر میں لکھا ہے کہ پھر انہوں نے کہا کہ ہمیں بھوک لگی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں ہڈیاں اور لید کھانے کے لیے دیں کیونکہ ''جنوں'' کی یہی خوراک ہوتی ہے۔ یہ ہے آپ کے ہاں کی روایات اور تفاسیر کی کتابوں میں ان آیتوں کی تفسیر۔ اب جو آپ کو ان کی تفسیر یہ ملے تو پھر آپ ان جنات سے انکار کیسے کر دیں۔ سند مل گئی۔ اور اس کے بعد تحریر ہے کہ ''جنوں'' نے

قرآن سنا اور اپنے ہاں واپس قبیلے میں چلے گئے جبکہ قرآن کہتا ہے کہ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (72:1) پھر انہوں نے وہاں جا کے آپس میں یہ Discussion (گفتگو) کی اور یہ کہا کہ ''ایک عجیب وغریب کتاب ہے جو آج ہم سن کے آئے ہیں۔'' اس آیت میں کیا ایک لفظ ہے: عَجَبًا۔ وہ لوگ (بادیہ نشین' صحرانورد' خانہ بدوش) وحی کی ماہیت کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ وحی کی رو سے جو کتاب آئے یا سنی جائے' وہ ہوتی کیسی ہے۔ وہ سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ یہاں لفظ ہے: عجبًا۔ عجیب لفظ ہے صاحب! عجیب کتاب ہے! یہ کتاب کیا کرتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ کتاب يَهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ [1] (72:2)۔ انکی سمجھ بوجھ کا اندازہ لگایئے کہ اتنے ہی میں انہوں نے کہا کہ ''وہ صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔'' اور پھر کہا کہ فَاٰمَنَّا بِهٖ (72:2) ہم تو اس پر ایمان لے آئے۔

''جنوں'' کی قرآن فہمی

اب سوچیے کہ معاذ اللہ یہ لید کھانے والے' معاذ اللہ' جن کیا یہ Discussion (گفتگو' تبادلہ خیال) کریں گے کہ قرآن سنا اور وہاں جا کر کہنے لگے کہ عجیب وغریب چیز ہے' وہ صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہے' ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اس کے بعد کہا کہ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (72:2) نہیں' بھائی! اب ہم بالکل خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ نظر آیا کہ اس سے پیشتر یہ خدا کو مانتے تھے۔ عربوں کے ہاں سارے اللہ کو مانتے تھے لیکن وہ بت پرستیوں میں' توا ہم پرستیوں میں' جنات پرستیوں میں' انہیں خدا کے شریک بناتے تھے۔ یہاں کہا کہ نہیں بھائی! اس کتاب نے ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہوسکتا' اب ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے کیونکہ وَاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا [2] (72:3)۔ اِس سے یہ نظر آیا ہے کہ یہ عیسائی تھے کیونکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس سے پہلے مانا کرتے تھے کہ خدا کی بیوی بھی ہے' خدا کا ایک بیٹا بھی ہے' مگر اب کہتے ہیں کہ نہیں بھئی! وہ گمراہی کی بات تھی' تو بہ توبہ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ اس کی بیوی ہو اور اس کے بیٹا بھی ہو۔ اب ہم یہ نہیں مانیں گے۔ گویا یہ نظر آیا کہ قرآن کی تعلیم کا حاصل یہ تھا۔ اب یہ ضروری نہیں کہ انہوں نے قرآن کہیں ایک ہی دفعہ سنا ہو۔ قرآن یہ بتاتا نہیں ہے۔ وہ تو صرف ایک واقعہ کی بات بتاتا ہے۔ یہ چیز وحی کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کو بتاتا ہے۔ اس سے نظر آتا ہے کہ انہوں نے یہ چیز کہیں چپکے سے سنی ہے لیکن وہاں جا کر یہ ساری Discussion (گفتگو) جو انہوں نے اپنے قبیلے کے لوگوں سے کی ہے' وہ ہے جو قرآن وحی کے ذریعے آپؐ سے کر رہا ہے اور وہ یہ بتا رہا ہے کہ اس سے پہلے ہم ان گمراہیوں میں مبتلا تھے' اب ہم وہاں سے نکل آئے ہیں کیونکہ وَاَنَّهٗ

---

[1] بالکل سیدھے راستے کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[1] ہمارے نشوونما دینے والے کی شان بہت بلند ہے۔ اس کی نہ کوئی بیوی ہے' نہ اولاد۔ (ہمارے یہ عقائد توہم پرستی پر مبنی تھے جن سے ہم تائب ہوتے ہیں۔) (ایضاً)

كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ❶ (72:4)۔اس قسم کے اعتقادات کہ خدا کی بیوی بھی ہے' بچے بھی ہیں' اس کے ساتھ شریک اور خدا بھی ہیں' یہ بات ہمارے ہاں عام تھی لیکن بہت بیوقوف احمق لوگ تھے جنہوں نے یہ باتیں مشہور کر رکھیں تھیں۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں کے یہ لوگ احمق تھے' یہ عقل وفکر کی بات نہیں ہے' خدا کا منزہ تصوراس کتاب کی رو سے سامنے آتا ہے۔اس سے یہ نظر آتا ہے کہ وہ اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے بیوی اور بچے بھی ہوں۔اس کے بعد کہا وَاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ❷ (72:5)۔یہاں انس وجن دونوں آگئے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا خیال یہ تھا کہ وہ ہمارے ہاں کے آبادیوں کے لوگ ہوں' ہمارے ہاں کے مذہبی پیشوا ہوں' یہ بڑے بڑے پروہت اور پنڈت ہوں یا یہ شہر سے آنے والے بڑے بڑے مولوی صاحب ہوں' ہم سمجھتے تھے کہ کم ازکم خدا کے خلاف یہ جھوٹ نہیں بولیں گے' کوئی جھوٹی بات خدا کی طرف منسوب نہیں کریں گے۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ اَنَّا ظَنَنَّا (72:5) یہ کم ازکم ایسا نہیں کریں گے تو گویا یہ ان کے پھیلائے ہوئے غلط خیالات تھے جن سے ہم لوگ متاثر ہوئے ہیں۔

یہ سب مذہبی پیشوائیت ہی کا پروپیگنڈا تھا

پھر آگے کہا کہ وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (72:6) ہوتا یہ رہا ہے کہ اِدھر اُدھر آبادیوں میں ہمارے کچھ اخلاط ہونا شروع ہوگیا۔شہری آبادیوں کے لوگ اِدھر آتے تھے۔ ہمارے ہاں کے جو بڑے بڑے لوگ تھے' ان کے ہاں مہمان رہتے تھے' ان سے ملتے جلتے تھے۔ انہوں نے یہ خیالات پھیلائے' انہوں نے اس کی ابتداء کی' اور پھر اس کے بعد یہ بات بڑھتی چلی گئی۔جبکہ حقیقت میں یہ سب افسانے ہی افسانے تھے اس کے باوجود بات آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ انہوں نے کہا کہ وَاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا (72:7) وہ لوگ جن میں یہ خیالات پھیلائے گئے تھے' وہ بھی ہماری طرح یا تمہاری طرح یہ سمجھتے تھے کہ اب کوئی پیغمبر وغیرہ نہیں آئے گا' جو تعلیم ہمارے ہاں پیچھے سے چلی آرہی ہے بس وہی آخری تعلیم ہے' اسی لیے اسی تعلیم کا ماننا' خدا کی طرف سے وحی کا ماننا' یا خدا کی کتاب کا ماننا ہے کیونکہ عقیدہ یہ پھیلایا گیا تھا کہ اب پیغمبر نہیں آئے گا۔لیکن ہم نے یہ دیکھا ہے کہ یہ کتاب جو ہم سن کر آئے ہیں یہ تو بہت آگے چلی گئی ہے۔یہ پیغمبر ہے جس کی یہ کتاب ہے۔

عزیزانِ من! اب آگے وہ بات ہے جو میں نے کہا تھا کہ ہمارے وہ کاہن' پروہت اور منتری' اپنی کہانت' نجوم اور توہم پرستیوں میں کہتے تھے کہ اس سے پہلے تو تم لوگ ہم سے آکے اپنی قسمتیں پوچھا کرتے تھے' اپنی اپنی تقدیروں کے احوال پوچھتے تھے' ہم دعویٰ کیا

---

❶ یہ جہالت آمیز عقائد' ہم میں سے کچھ بیوقوف لوگوں نے اپنے ذہن سے وضع کیے اور پھر انہیں خدا کی طرف منسوب کر دیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ حالانکہ ہم (سادہ لوح) یہ خیال کرتے تھے کہ انسان' خواہ شہری ہوں یا صحرائی' کم ازکم خدا کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔(ایضاً)

کرتے تھے کہ ہم آسمان سے جا کے یہ خبریں لاتے ہیں پھر وہ تمہیں آ کے بتاتے ہیں۔اس سلسلے میں کہا کہ وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا (72:8)اب تو قرآن کے سامنے آ جانے کے بعد ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ آسمان کی خبریں لانا انسان کے بس کی بات نہیں۔اب تو ہماری صورت یہ ہے کہ آسمان کے اندر پہنچنا تو ایک طرف' اگر کہیں اس کو چھو بھی جائیں تو وہاں سے ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں بڑے بڑے سخت پہرے دار ہیں۔ وہاں تو آگ کے شعلے برستے ہیں' وہ ہمیں آگے ہی نہیں جانے دیتے۔ وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (72:9)اس سے پہلے ہم یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہم گھات میں بیٹھ کر آسمانی باتیں سن لیتے ہیں لیکن اب جو کوئی سننے کی کوشش کرتا ہے' اپنے سامنے (علم و برہان کے) شعلے دیکھتا ہے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ پہلے ہم تمہیں کہا کرتے تھے کہ ہم تو وہاں جا کر آسمانوں پر گھات میں بیٹھے رہتے تھے' کمین گاہوں میں چھپ کر' چوری چوری' ہم وہاں سے' یہ باہر جو آسمان کی خبریں تھیں' ہم ان کو سن لیتے تھے اور سن کر پھر تم سے آ کر کہتے تھے کہ یہ ہوا اور وہ ہوا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جتنے بھی مذہبی پیشوا بنتے ہیں وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ ہم خدا کیطرف سے یہ علم پاتے ہیں اور اس علم کی رو سے یہ باتیں تمہیں بتاتے ہیں۔ جو ہم بتا رہے ہیں یہ دعویٰ ہوتا ہے' اسی میں ان کی عظمت ہوتی ہے۔ کہا کہ ہم یہ کہا کرتے تھے کہ ہم وہاں جا کر آسمانوں پہ' کمین گاہ میں' بیٹھتے تھے اور چوری چھپے ہم وہاں سے جو وہاں آسمان کی باتیں ہوا کرتی تھیں سنتے اور تمہیں آ کر بتاتے تھے۔ یہ عقیدہ تھا کہ قسمتیں اور تقدیریں آسمانوں پر متعین ہوتی ہیں تو وہ کہتے تھے کہ وہاں سے ہم سن پاتے تھے۔بس اتنا ہی تھا کہ وہ بعد میں یہاں پہنچتی تھیں' ہم پہلے آ کر تم لوگوں کو بتا دیا کرتے تھے لیکن اب اگر کوئی اس قسم کی کوشش کرتا ہے تو سن رکھو! وہ جھوٹ بولتا ہے' اب وہاں کوئی کسی کو نہیں بیٹھنے دیتا' اب کوئی وہاں سے خدائی علم کی بھنک تک اپنے کان میں لے کر نہیں آتا' یہ نہیں ہو سکتا۔

یہ سب تو ہم پرستیوں پر مبنی جہالت کی باتیں ہیں

عزیزانِ من! آپ اب دیکھتے ہیں کہ قرآن کی سورۃ الجن میں ''جن'' کے لفظ سے ہم سمجھتے تھے کہ بس اس میں وہ ساری توہم پرستیاں ہونگی جو ہماری قوتِ متخلیہ نے جنات کے ساتھ وابستہ کر رکھی ہیں کہ وہ ایسا کرتے ہیں' وہ ایسا ہوتے ہیں' وہ یہ صورت ہوتی ہے۔ سورۃ الجن ان توہم پرستیوں کو مٹانے کے لیے آ رہی ہے۔اس نے نہ صرف یہ کہ جنات کا اس قسم کا وجود ہے' جس قسم کا ہمارے ذہنوں کے اندر ہے' اسے مٹایا بلکہ پیشن گوئیاں کرنا' قسمت کا حال بتانا اور علم لدنی کی چیزیں' جو عقائد کی بنا پر ہم لیے آ رہے ہیں' انہیں بھی اس سورۃ نے مٹا دیا۔ وہ دورِ جہالت کی بات تھی جس میں ہم یہ کچھ کہا کرتے تھے اور تم لوگوں سے منوالیا کرتے تھے' اب وہ دَور گیا۔اب تو اگر

وہاں کوئی جانے کا ارادہ بھی کرتا ہے' کہیں کوئی کوشش بھی کرتا ہے تو وہاں سے تو بڑی مار پڑتی ہے۔ اب وہاں کوئی نہیں جاسکتا۔ اس خوبصورت انداز میں' ان تمام باطل عقائد کی' توہم پرستیوں کی' قرآن نے تردید کر کے رکھ دی ہے۔

قرآنِ کریم نے اگلی ہی آیت میں کہا کہ وَاَنَّا لَا نَدۡرِیۡۤ اَشَرٌّ اُرِیۡدَ بِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اَمۡ اَرَادَبِھِمۡ رَبُّھُمۡ رَشَدًا ❶ (72:10)۔ جو کچھ ہم لوگوں نے خدا کے متعلق کیا ہے' وہ ہم نہیں جان سکتے۔ اس سے تو یہ نظر آتا ہے کہ تباہی آجائے گی کیونکہ خدا کے خلاف اتنی بڑی جرأتیں کرنا' اس قسم کے جھوٹے افسانے خدا کی طرف منسوب کرنا' اس قسم کے عقائد وضع کر کے ان کو خدا کی تعلیم بتانا' یہ کوئی چھوٹا جرم نہیں ہے' یہ بڑا ہی سنگین جرم ہے۔ نظر تو یہ آتا ہے کہ اس سے تو واقعی تباہی آئے گی لیکن ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد آیا ہم نے ان عقائد سے توبہ کر لی یا ان سے باز آگئے' نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد خدا ہمارے ساتھ کیا کرے گا یا ان لوگوں کے ساتھ کیا کرے گا جو یہ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے مذہبی پیشوا ہیں۔ یہ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا وہ ان کو تباہ و برباد کرے گا یا ان کی یہ توبہ کی بازگشت قبول کرلے گا۔ وَاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوۡنَ وَمِنَّا دُوۡنَ ذٰلِکَ ؕ کُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا (72:11) یہ ٹھیک ہے کہ ہم میں اب بھی کچھ لوگ تو وہ ہیں جو ایمان لانے کے بعد صالحین بن گئے ہیں' ان کے اعمال صالح ہیں' نیک اعمال ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو دوسرے انداز کے ہیں' جو ابھی صالحین تک نہیں پہنچے' بس انہیں بین بین کہہ لیجیے یا ابھی ان میں فاسقین بھی ہیں یعنی ہم نے اپنے ہاں متفرق طریقے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہ سب کے سب ایک ہی طریق پر ہوں۔ پہلے تو ہم سب کے سب ایک ہی طریق پر تھے خواہ وہ باطل کا طریقہ تھا۔ اب ان میں سے بعض صحیح طریقے پہ آگئے ہیں اور بعض ابھی تک اسی پرانے طریقے پر ہیں۔ اس سے باہمی تصادم کا بھی امکان ہے جس کا نتیجہ خوں ریزی ہوگا۔ ہم نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ خدا کا اقتدار اس قدر زبردست ہے کہ وَاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنۡ لَّنۡ نُّعۡجِزَ اللّٰہَ فِی الۡاَرۡضِ وَلَنۡ نُّعۡجِزَہٗ ھَرَبًا (72:12) ہم نہ تو اسے اپنے ملک میں شکست دے سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے بھاگ کر کسی ایسی جگہ جاسکتے ہیں جو اس کے حیطہ ادراک سے باہر ہو۔

خدا کے قانون کے ساتھ مقابلہ

خدا کا قانونِ مکافات ہر جگہ موجود ہے۔ اس طرح اب ہمیں یہ یقین ہے کہ غلط طریق کے جو تباہ کن نتائج ہوتے ہیں وہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے آتے ہیں۔ ان کو کوئی نہیں روک سکتا' ان کو کوئی ناکام نہیں کرسکتا اور نہ ہی ان کی حدود سے بھاگ کر کہیں اور جاسکتا ہے۔ کتنے صحیح عقائد چلے آرہے ہیں! لہٰذا یہاں رہ کر تو دو ہی طریقے ہوتے ہیں کہ یا تو خدا کے ساتھ (یعنی خدا کے قانون کے

---

❶ ہم نہیں کہہ سکتے تھے کہ اس انقلاب کا' جس کا پیامبر قرآن ہے' ردِعمل کیا ہوگا۔ کیا لوگ اس کی مخالفت کر کے' تباہ و برباد ہوں گے' یا یہ صحیح راستے پر آکر' خیر و برکت سے ہم کنار ہوں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ساتھ) مقابلہ کریں اور اُسے شکست دیدیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہوسکتا یا دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے دائرہ کار سے باہر چلے جائیں۔ دنیا کی سلطنتوں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی ایک مملکت کے اندر گرفت کا خطرہ ہوتا ہے تو وہاں سے کسی طرح دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ وہاں گرفت کا خطرہ نہیں ہوتا۔ یہاں کہا کہ نہیں' اس کی مملکت تو زمین و آسمان کو گھیرے ہوئے ہے' اس سے نکل کر' بھاگ کر بھی' کہیں نہیں جاسکتے اور کہیں کھڑے ہو کر بھی اس کو شکست نہیں دے سکتے۔ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔ ہم تو اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ ان قوانین کا تسلیم کرنا ہی باعث عافیت ہے۔ وَاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ [1] (72:13) اور ہماری تو صورت یہ ہے کہ ہم نے وہ صحیح راستے کی طرف لے جانے والی تعلیم کو سن لیا' ہم اس پہ ایمان لائے۔ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا [2] (72:13) اور ہم یہ جانتے ہیں کہ جو بھی خدا کے اس راستے پہ ایمان لے آئے تو نہ تو اس کے حقوق میں کوئی کمی ہوگی اور نہ ہی اس کو ذلیل کیا جائے گا۔

قرآن نے بتایا ہے کہ ذلیل ہونا خدا کا عذاب ہے عزیزانِ من! اس سے انسان بچ سکتا ہے۔ وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ (72:14) اور ہم پھر اقرار کرتے ہیں کہ ہم میں وہ بھی ہیں جو خدا کے قوانین کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور وہ بھی ہیں جو ابھی تک اس سے سرکشی برتتے ہوئے ہیں۔ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (72:14) اور جو خدا کے قوانین کے سامنے جھکا ہے اور پھر صحیح راستے کی طرف جانے کے لیے وہ سرگرم عمل ہوتا ہے' تو یہی ہے وہ جو رشد و ہدایت کے حصول کے لیے عزیمت مندانہ قصد کرتا ہے۔ اس طرح اگلی بات صرف ایمان لانا ہی نہیں ہے بلکہ سرگرم عمل ہونا بھی ہے۔ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (72:15) اور وہ جو ان قوانین سے سرکشی برتتے ہیں تو پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے۔ یوں کہیے کہ وہ اس جہنم کے ایندھن ہوتے ہیں جو تباہ کر کے راکھ کا ڈھیر بنا دیا کرتا ہے۔

عزیزانِ من! وہ جو قرآن سن کر گئے تھے' ان کی اپنے قبیلے میں جو Discussion (گفتگو' تبادلہ خیال) ہوئی تھی' قرآن نے اسے یہاں تک کوٹ (حوالہ Quote) کر دیا ہے۔ اس کے بعد پھر اگلی بات خدا کی بات شروع ہوتی ہے۔ آج ہم سورۃ الجن کی آیت پندرہ تک آ گئے۔ خدا کی وہ بات ہم سولھویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

---

1. یہ وجہ تھی کہ ہم نے جب اس ہدایت (قرآن) کو سنا تو ہم اس کی صداقت پر ایمان لے آئے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)
2. ہمیں یقین ہے کہ جو کوئی بھی خدا پر ایمان لے آتا ہے' اسے نہ اپنے حقوق میں کمی یا سلب و نہب کا احتمال ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی ذلت و رسوائی کا خوف۔ اِسے اس کے اعمال کا پورا پورا نتیجہ ملے گا اور وہ عزت و سربلندی کی زندگی بسر کرے گا۔ (ایضاً)

چودھواں باب: سورة الجن (آیات 16 تا 22)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1984 کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الجن کی آیت 16 سے ہو رہا ہے:(72:16)۔ سابقہ آیات میں یہ بتایا گیا تھا کہ صحرانورد بادیہ نشین بدوؤں کے قبیلے کے کچھ لوگوں نے قرآن سنا' پھر انہوں نے جا کر اپنے قبیلے کے باقی لوگوں کو یہ بتایا کہ ہم کیا ہی ایک عجیب وغریب پیغام سن کر آئے ہیں۔ اس تعلیم کا ملخص سن کر ان میں سے بعض لوگ ایمان بھی لے آئے۔ اس پر ان پہلی پندرہ آیات میں انہی کا ذکر تھا اور انہی کی وہ باتیں تھیں جو جا کر انہوں نے اپنے قبیلے والوں سے کہیں۔ اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ اب بات یہاں پر اِدھر کی شروع ہو رہی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ اے رسول اللہ! ان سے کہہ دیجیے کہ **وَاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا o لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ط وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا** (72:16-17) جو صحیح طریقے پر استقامت سے چلتا رہے گا ان کی زندگیوں میں سیرابیاں اور شادابیاں آئیں گی۔ یہ ہے وہ کھلا ہوا معیار جس کے مطابق یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کے راستے پر چلنے والے کون ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے خدا کے قانونِ ربوبیت سے روگردانی کرتا ہے وہ سخت مصیبت میں مبتلا رہتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ عربوں کے ہاں تو پانی ان کے لیے نعمتِ کبریٰ تھی۔ اس لیے قرآنِ کریم نے سایہ دار درخت' پانی کی نالیوں یا ندیوں کا شمار ان نعماء میں کیا ہے جسے کہا ہے کہ یہ جنت کی نعمت ہے۔ قرآن نے اس پہلی اولیں مخاطب قوم کو سمجھانے کے لیے یہ ساری چیزیں بتائی اور یہ شاداب وسیراب تو ویسے بھی زبان کے محاورے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی شاداب وسیراب نعما میں سے گنی جاتی ہے۔ اب اگلی بات یہ ہے کہ جو خدا کے قوانین سے اعراض برتتا ہے' اس پر سخت قسم کی تباہی مسلط ہو جاتی ہے۔ یہاں صرف اسے عذاب ہی بتایا ہے۔

قوانینِ خداوندی سے اعراض کا نتیجہ روزی کی تنگی کی شکل میں ہوتا ہے

قرآنِ کریم کے سمجھنے کا طریقہ تو اب آپ کو معلوم ہے کہ جو بات ایک جگہ کہیں مجمل طریق پہ بیان ہوتی ہے اس کی تشریح اور تفسیر دوسرے مقام پہ کی جاتی ہے۔ اب یہ خدا کے ذکر سے جو اعراض ہے وہ یہاں خدا کے قوانین سے اعراض برتنا ہے۔ اس کے لیے یہاں کہا ہے کہ سخت قسم کا، جاں گسل قسم کا، ایک عذاب ہے جو اس پر مسلط ہو جاتا ہے اور خدا کے ذکر سے اعراض برتنے سے جو عذاب مسلط ہوتا ہے یہ کہہ کر اس کی تشریح دوسری جگہ کر دی کہ وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ (20:124) جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے تو فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا (20:124) اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ قوانینِ خداوندی کے اعراض کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ یاد رکھیے! قرآن کی رو سے بھوک اور خوف خدا کے عذاب ہیں۔ سورۃ نحل میں یہ چیز موجود ہے۔ اس آیت (72:17) میں وہی الفاظ ہیں جو (20:124) میں آئے ہیں۔ تو یہاں کہا کہ خدا کے قوانین سے اعراض برتنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کی روزی تنگ ہو جاتی ہے: بھوک، فکر، افلاس، یہ مسلط ہو جاتا ہے۔

عزیزانِ من! اگلی بات یہ آئی ہے کہ جو قوم اس بھوک، فکر، افلاس پہ مطمئن ہو جائے اور اپنا نظریہ زندگی ہی یہ اعتقاد بنا لے کہ یہ کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ اور اسے خدا کی رحمت شمار کرنے لگ جائے تو فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى (20:124) یہاں بھی اس کی روٹی تنگ ہوگی اور قیامت کے دن وہ اندھا اٹھایا جائے گا: یہ زندگی بھی ذلت اور خواری کی زندگی اور اخروی زندگی بھی نابینائی کی زندگی۔

امارت کے سہارے جنت کا حصول

یہ بھوک اور افلاس کا وہ عذاب ہے، جس کے متعلق پھر لوگوں کو مطمئن رکھنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ سب خدا کی طرف سے آتا ہے، یہ دونوں طبقے خدا نے پیدا کر دئے ہیں، غریب بھی اس نے پیدا کیے، امیر بھی اسی نے پیدا کیے اور اس کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ غریب اور بھوکے نہ رہیں تو صدقہ اور خیرات کس کو دیا جائے یعنی امیر جنت خریدنے کے لیے جو صدقہ اور زکوٰۃ دیتے ہیں اُسے لینے والے کوئی ہونے چاہئیں کیونکہ اگر یہ نہ رہیں تو پھر وہ جنت کس طرح سے خریدیں گے۔ گویا یہ سب کچھ، جو کچھ بھی ہے: یہ دین، یہ قرآن، یہ اسلام، یہ سب کچھ، دولت مند طبقے کے لیے ہی ہے، Directly یا Indirectly (بالواسطہ یا بلا واسطہ) ان کے لیے ہی حصولِ مراعات کا ذریعہ ہے۔ یہاں بھی وہ سب کچھ دولت کے زور پر خریدتے چلے جائیں، لیتے جائیں، اور وہ قیامت میں بھی پھر یہ کچھ کہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اگر غریب نہ رہیں تو وہ صدقہ زکوٰۃ کس کو دیا جائے۔ تو یہ غریبوں کا طبقہ رہنا ضروری ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ سرمایہ داری کا نظام اور ملوکیت کا نظام کہاں پہنچا دیتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ روزی کا تنگ ہو جانا خدا کا عذاب ہے اور جس کا یہاں رزق تنگ ہو جائے اور پھر وہ اس قسم کے

عقائد وضع کرلے تو پھر وہ قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔ تو یہ اعراض برتنا کہا ہے: وَمَنۡ یُّعۡرِضۡ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّہٖ یَسۡلُکۡہُ عَذَابًا صَعَدًا (72:17) جو شخص اپنے خدا کے قانونِ ربوبیت سے روگردانی کرتا ہے' وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

آیات کے غلط مفہوم کا نتیجہ

اب یہاں (72:17) میں ذکرِ رب خدا کے قوانین سے اعراض برتنے کا آیا ہے۔ اس کے بالکل Opposite' یعنی اس کے برعکس 'تمسک' اطاعت' فرمانبرداری' قوانینِ خداوندی کی اطاعت کی کیفیت ہوتی ہے۔ اگلی آیت میں ساتھ یہ بات کہی کہ وَاَنَّ الۡمَسٰجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا [1] (72:17)۔ عزیزانِ من! اگلی تین آیتیں بھی اس کے ساتھ ہی آئی ہیں: وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰہِ یَدۡعُوۡہُ کَادُوۡا یَکُوۡنُوۡنَ عَلَیۡہِ لِبَدًا ؁ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ وَلَاۤ اُشۡرِکُ بِہٖۤ اَحَدًا [2] (72:17)۔ یہ عظیم آیات ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی انداز زیادہ موزوں رہے گا کہ پہلے میں قرآن کی رو سے' صحیح اسلام کی رو سے' عرض کروں کہ ان آیات کا مطلب کیا ہے اور بعد میں پھر یہ بات آئے کہ جب یہ دین اسلام کی بجائے مذہب بن گیا تو اس کی رو سے ان آیات کا مطلب کیا ہو گیا' جس سے بھوک اور پیاس بھی خدا کی رحمت شمار ہونے لگی۔

آپ کو یاد ہوگا میں اکثر مغربی فلاسفر کا یہ قول دہرایا کرتا ہوں کہ اگر آپ مجھے یہ بتادیں کہ فلاں قوم نے کس قسم کا معبود اپنے لیے تجویز کر رکھا تھا' تو میں بتادوں گا کہ اس قوم کی تہذیب' تمدن' معیشت' ثقافت کس قسم کی ہے۔ اس نے یہ بڑی اہم بات کہی ہے۔ اس نے تو کہا ہے کہ اس نے کس قسم کا معبود تجویز کر رکھا تھا' اپنے لیے کس قسم کا خدا بنا رکھا تھا تو اس سے میں زندگی کی اصل بنیاد بتادونگا۔ قرآنِ کریم کی رو سے یہ کہیے کہ دین کا نکتہ ماسکہ یا محور جس کے گرد اس کی ساری تعلیم گردش کرتی ہے' خدا کا صحیح تصور ہے' اور خدا کا صحیح تصور وہ ہوگا جو اس نے خود اپنے متعلق بتایا ہے۔ وہ تصور اگر صحیح طور پر ذہنوں میں ہو' عقیدے میں ہو' نظریئے میں ہو' زندگی میں ہو' تو پھر ساری زندگی اور پورے کا پورا معاشرہ دین کے مطابق ہوتا ہے' قرآن کے مطابق ہوتا ہے۔ اور اگر یہ صحیح تصور اپنے مقام سے ہل جائے یعنی خدا کا تصور قرآنی نہ رہے تو پھر اسلام کی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی۔

---

[1] اطاعت و فرماں پذیری صرف قوانینِ خداوندی کی ہو سکتی ہے۔ جھکنا صرف انہی قوانین کے سامنے چاہیے۔ اس کے ساتھ کسی اور کے قانون کو شامل نہیں کرنا چاہیے۔ کسی اور کی اطاعت اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] (ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ خود خدا کے قوانین کے سامنے جھکنا تو ایک طرف) جب خدا کا ایک بندہ (رسول اللہؐ) اس دعوت کو لے کر اٹھا تو یہ لوگ مخالفتوں کے ہجوم کے ساتھ اس پر یوں اُمڈ پڑے گویا اسے کچل ہی ڈالیں گے (22:72)۔ ان سے کہہ دو کہ میرا ''جرم'' اس کے سوا کیا ہے کہ میں خود بھی خالص قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا ہوں اور تمہیں بھی اس کی دعوت دیتا ہوں' اور اس میں کسی دوسرے کے قانون اور فیصلے کو شریک نہیں کرتا۔ (ایضاً)

ایمان باللہ کا مفہوم

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم نے پہلے ہی پارے' پہلے ہی ورق سے آخری پارے' آخری ورق تک' سارا زور ایمان باللہ پہ دیا ہے۔ یہ ایمان باللہ کیا ہے؟ ہمارے ہاں والی بات آ گئی' تو آگے مذہبِ مُلّا آ جائے گا۔ اُس میں بس **اٰمنوا بالله** کہا تو وہ خدا پر ایمان ہو گیا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ ہم نے تو کبھی وہ **امنوا بالله** کا سوچا ہی نہیں' ہم تو پیدائشی مسلمان ہیں۔ کبھی کبھی پرانے زمانے میں نکاح کے وقت ملا چھ کلمے پڑھا دیا کرتا تھا' اب وہ چیز بھی نہیں رہی۔ اب تو بس فارم پہ دستخط ہی کر دینے کافی ہو جاتے ہیں۔ تو اب وہ **امنوا بالله** کے معنی ہو گئے: خدا پر ایمان۔ آپ نے کبھی سوچا کہ آیا ہماری زندگیوں پر اس کا کوئی اثر بھی مرتب ہوتا ہے۔ جب ہم یہ کہہ رہے ہوتے ہیں تو ہم ان الفاظ کے معنی ہی نہیں سمجھ رہے ہوتے کہ اس کا زندگی پہ کیا اثر ہونا ہے۔ دین کی ساری بنیاد اس **امنوا بالله** پر ہے۔ یوں کہیے کہ الدین کی' انسانی زندگی کی' ساری بنیاد اس پر ہے کہ اس میں خدا کا تصور کس قسم کا ہے۔

اللہ کا جو لفظ ہے وہ ''ال الہٰ'' ہے۔ الہٰ کے معنی ہوتے ہیں: ''وہ جس کی محکومیت اختیار کی جائے'' جسے اتھارٹی کہا جاتا ہے اور ال الہ ہے: The only authority' صرف وہی حاکم ہے۔ اللہ کے معنی ہیں: حقِ حکومت صرف اسی کو حاصل ہے' وہی ایک حاکم ہے۔ اس کی محکومیت کا نام ایمان باللہ ہے اور خالص اسی کی محکومیت کے معنی ہیں کہ اس میں کسی اور کی محکومیت کو شامل ہی نہ کیا جائے۔ یعنی یہ وہ ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن کی رو سے کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں ہے۔ اگر کسی انسان کی حکومت کا تصور کیا جائے یا اس کے احکام کی اطاعت کی جائے تو یہ شرک ہے۔ اس طرح کسی انسان کے قانون یا حکم کی اطاعت شرک ہے۔ اطاعت صرف خدا کے احکام کی ہے۔ اللہ کا جو صرف ''ال الہٰ'' کا تصور ہے' اس میں یہ چیز آ جاتی ہے۔ جب یہ کہیں گے کہ میں اسے مانتا ہوں' تسلیم کرتا ہوں' تو یہ وہی ہے جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ میرا ایمان یہ ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے اور میں اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کرتا۔ یہ ہوا ایمان باللہ کا بنیادی مفہوم۔ اب اس کے گرد ساری چیز گردش کرے گی: وہ حاکم الہٰ' انسان عبد' محکوم۔ تو عبادت کے معنی ہوئے: خدا کی محکومیت اختیار کرنا اور عبد ہوا: خدا کی محکومیت اختیار کرنے والا اور سجدہ ہوا' اس کی عملی تعبیر۔

حقیقی نظریہ خدا کی محکومیت تھا

اس طرح ایک عقیدہ' ایک نظریہ' خدا کی محکومیت اختیار کرنا تھا۔ اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا سجدہ ہوا۔ وہ مراکز جہاں خدا کی اطاعت کے عملی پروگرام طے ہوں' ان پر عمل کرنے کے طریقے سوچے جائیں' Discussions (گفتگو' تبادلہ خیال) ہوں' بحثیں ہوں' وہ ہوئی مسجد۔ جب یہ کہا گیا کہ ''محکومیت صرف خدا کی ہے' حکومت صرف خدا کی ہے'' تو اس کے ساتھ ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ **اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ** (72:18) مساجد وہ مراکز ہیں جہاں بیٹھ کر یہ پروگرام اور اس کی عملی تنفیذ طے کی جائے' Discussion (گفتگو'

تبادلہ خیال) کی جائے، بحث وتمحیص کی جائے، جو خدا کی گورنمنٹ کا Secretariat (سیکرٹیریٹ، معتمدی) ہو تو وہاں تو خدا کی حاکمیت کے سوا کوئی دوسری بات ہی نہیں ہو سکتی۔ اگر وہاں کسی اور کے حقِ حکومت کو بھی تسلیم کیا جائے، وہاں بات یہ کی جائے کہ اس قانون میں کچھ خدا کا لے لیجیے مثلاً نماز اس کی پڑھ لیجیے اور کاروبارِ معیشت بہر حال دنیا کے کاروبار کی طرح کر لیجیے، تو یہ تو شرک ہوگا، یہ مساجد اللہ نہیں رہیں گی، مسجد للہ وہ رہے گی جہاں صرف یہ ہو کہ خدا کے احکام کو نافذ کرنے کے لیے، اس کی اطاعت کرنے کے لیے، کیا تدابیر ہوں، کیا طریقے ہوں، کیا سسٹم ہو، کیا نظام ہو۔ اور یہ جو خدا کے احکام کی اطاعت کرنے کا نظام ہے، اسے کہتے ہیں نظامِ صلوٰۃ۔ صلوٰۃ کے معنی ہوتے ہیں: کسی کے پیچھے پیچھے اس طرح چلے جانا کہ اُس کے اور اپنے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو، کوئی گیپ نہ ہو، مسلسل التزاماً کسی کے پیچھے چلے جانا۔

خدا کو پکارنے سے کیا مراد ہے

یہ ہوا مساجد کا اللہ کے لیے ہونا۔ یہ زندگی کا ایک نظام ہوا، حکومت کا طریق ہوا، مملکت کی وجہ جواز ہوئی کہ احکامِ خداوندی کی اطاعت کس طرح کی جائے، کیا طریق ہو کیونکہ یہ ایک اجتماعی چیز ہے۔ دین کے معنی ہیں: وہ اجتماعی نظام جس میں یہ طے کیا جائے کہ خدا کے احکام کی اطاعت کیسے کی جائے، ان کو نافذ کیسے کیا جائے، ان کو عام کیسے کیا جائے اور اطاعت اس انداز کی کی جائے کہ کوئی بھی معاملہ درپیش ہو، اس میں یہ غور کیا جائے، یہ سوچا جائے کہ اس کی بابت خدا کا حکم کیا ہے۔ اسے کہتے ہیں: خدا کو پکارنا، جس کے معنی اب آ گئے اس کی طرف رجوع کرنا، عام نظامِ حکومت میں بھی آپ دیکھیے کہ جب کوئی مسئلہ پیش ہوگا، کوئی معاملہ درپیش ہوگا، تو یہ دیکھا جائے گا کہ اس کے لیے Law (قانون) کونسا ہے، Regulations (قواعد وضوابط) کونسے ہیں، حکومت نے اس کے متعلق کیا طے کیا ہے۔ اس کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہیں: دعوت الی اللہ۔

دعوت الی اللہ کا مفہوم

عام الفاظ میں اب ہمارے ہاں تو اس کا ترجمہ ''پکارنا'' ہی رہ گیا ہے۔ یہ عام الفاظ میں وہ ہے جسے ہم ''رجوع کرنا'' کہتے ہیں یا جسے ہم انگریزی میں Refer it to him کہتے ہیں۔ کوئی معاملہ پیش ہو، اس کے متعلق یہ بات طے کی جائے کہ بھئی! اس کے متعلق خدا کا حکم کیا ہے تو پھر آگے بات چلے گی، پھر Discussion (بحث وتمحیص) بھی ہوگی کہ اس کو نافذ کیسے کیا جائے، اس پہ عمل کیسے کیا جائے۔ یہ تمام امور جس مقام پہ، جس پارلیمنٹری ہاؤس میں، طے ہوتے تھے، اسے ''مسجد'' کہا جاتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے لیے ایک مرئی چیز، جسے ہم نماز کی شکل کہتے ہیں، وہ بھی ابتداً اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ یہ بالکل اسی طرح سے تھا جس طرح اب ہمارے ہاں جلسے ہوتے ہیں تو ان میں رسماً تلاوتِ قرآنِ کریم کر دیتے ہیں۔ اب تو ساری باتیں ہی رسماً رہ گئی ہیں۔ بہر حال ابتدا اس سے کی جاتی ہے۔ اسلام اس

نظامِ حکومت کا نام ہے جس میں اطاعت خالص خدا کے احکام کی ہوتی ہے۔ یہ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ❶ (7:29) ہے۔ اور آگے چلیے۔ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں سورۃ الانعام کی دو آیات میں کہا کہ قُلۡ اِنِّیۡ نُہِیۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (6:56) ان سے کہہ دو کہ مجھے اس سے منع کیا گیا ہے' روکا گیا ہے' کہ یہ لوگ جو خدا کے سوا دوسروں کی اطاعت' محکومیت اختیار کرتے ہیں میں بھی ویسا ہی کروں۔ قطعاً نہیں' مجھے اس سے روکا گیا ہے۔ اس کے آگے یہ ہے کہ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ❷ (6:57)۔ اس آیت میں تو ''حکم'' کا لفظ بھی آ گیا کہ حکومت کا حق تو صرف خدا کو حاصل ہے۔ قرآن کی بنیاد ہی اس دعوے پہ ہے کہ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ (6:57)۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے

یہ وہی چیز ہے جسے مفکرِ اسلام ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) نے بزبانِ شعر کہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ''داع'' کیساتھ واضح کر دیا کہ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ (6:57) جس کے لفظی معنی آپ ''پکارنا'' کہیں گے۔ اس کے معنی ہونگے: احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنا' خدا کی محکومیت قبول کرنا' اختیار کرنا۔ دوسرے مقام پہ بھی ذرا اور واضح الفاظ میں آیا ہے کہ وَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ❸ (28:87)۔ بات ہی یہاں سے شروع ہوئی ہے کہ مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی وَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ❹ (28:88) خدا کے ساتھ کسی اور کو الہٰ نہ بناؤ۔ میں نے ابھی چند منٹ پہلے عرض کیا تھا اور اب یہاں تدع (28:88) کا لفظ آ گیا۔ چند منٹ پہلے کہا یہ تھا کہ لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّا ہُوَ (28:88) الٰہ صرف وہی ہے' The only Authority ہے۔ میں نے کہا تھا کہ صرف اس کو حقِ حکومت حاصل ہے' حاکم وہی ہے اور اسی آیت میں آگے پھر وہی لفظ آیا ہے: لَہُ الۡحُکۡمُ (28:88) حقِ حکومت صرف اس کے لیے ہے۔ لہ الحکم نے واضح کر دیا' دعوت الی اللہ کے معنی بھی واضح ہو گئے' صلوٰۃ کے معنی بھی واضح ہو گئے' مسجد کے معنی بھی واضح ہو گئے' شرک کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ لَہُ الۡحُکۡمُ (28:88) حقِ حکومت صرف اس کے لیے ہے۔ اب یہ جتنے عناصر بھی میں نے ابھی آپ کو گنائے ہیں' یہ سارے اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ (6:57) کی تفسیر' تشریح اور عملی پروگرام کی تکمیل کے لیے ہیں۔ حقِ حکومت' اطاعت یعنی Obedience صرف خدا کے احکام کی ہے۔ یہ ہوا الدین' یہ ہوا الاسلام۔ اگر کسی اور کا حقِ حکومت تسلیم کیا تو یہ شرک ہے۔ خدا کے احکام کے ساتھ کوئی اور احکام بھی ملا لیے' کسی انسانوں کے وضع کردہ احکام ملا لیے تو یہ ہوا شرک۔ دعوتِ الی اللہ خالصتاً اس کی' اطاعت اس کے احکام کی' صرف اس کے

---

❶ اطاعت کو اسی کے الدین کے لیے خاص کر دو۔

❷ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔

❸ مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔

❹ تم کسی دنیاوی اقتدار کو اس کی دعوت نہ دو کہ وہ اقتدارِ خداوندی کے ساتھ شریک ہو جائے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

احکام کی محکومیت' دعوت الی اللہ ہے۔ مساجد وہ مراکز ہیں جہاں خدا کی حکومت سے متعلق معاملات طے ہوں۔ عبادت ''خدا کی محکومیت اختیار کرنا' اس کی اطاعت اختیار کرنا ہے۔'' اس اعتبار سے آپ دیکھیے گا کہ ان الفاظ کے یہ معنی عربی زبان کی رو سے بھی ہیں۔ خود قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر ان کی وضاحت کی گئی ہے اور خدا کے یہ معنی متعین کیے گئے ہیں۔ جب یہ اسلام دین تھا تو اس میں ان احکام کے یہی معنی لیے جاتے تھے' دین پر عمل کے بھی یہی معنی تھے کہ خدا کے احکام کی خود اطاعت کرنا' دوسروں سے کرانا' ان کا نفاذ کرنا' ان کی تنفیذ کرنا' عملاً یہی مقصود و مفہوم اور مطلوب تھا۔ دین قائم تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے (11-40AH بمطابق 632-661AD) میں' جب اسلام دین کی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھا تو اس میں اسلام کا عملی نظام صرف خدا کے ہی احکام کی اطاعت تھا۔

دین اور مذہب میں بنیادی فرق

عزیزانِ من! اس کے بعد دین مذہب میں تبدیل ہوگیا۔ دین اور مذہب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہب میں خدا کی پرستش کی جاتی ہے' خدا کی حاکمیت کا تصور نہیں ہوتا۔ خدا کی حاکمیت کا تصور ایک حاکم یا ایک اتھارٹی کے اعتبار پہ نہیں مانا جاتا بلکہ وہ معبود کے معنوں میں ہوتا ہے' جس کی پرستش کی جائے۔ عبادت کے معنی پرستش ہوتا ہے۔ مذہب میں صلوٰۃ نماز میں بدل گئی جو کہ صرف ایک مرئی سی چیز ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ نظامِ صلوٰۃ نہایت ضروری ہے جب خدا کی محکومیت کا یا خدا کی حاکمیت کا نظام قائم ہوگا تو اس کے اندر یہ اجتماعات ضروری ہونگے۔ انہیں اجتماعاتِ نماز کہتے ہیں لیکن یہ سب اس کی حاکمیت کا' اس کی حکومت کا' اس کی گورنمنٹ کے کاروبار کا' ایک حصہ ہوگا۔ مذہب میں اللہ کے معنی ہوگئے ''وہ جس کی پرستش کی جائے یعنی پرستیدہ۔''

پرستش خدا کی اور حاکمیت ملوکیت کی

عزیزانِ من! یہ پرستیدہ اور پرستش وہی ایرانی الفاظ ہیں جو آپ کے ہاں بھی آ گئے۔ ان کا یہ سارا مفہوم بھی وہاں سے آیا تھا۔ پرستش اور پرستیدہ فارسی الفاظ ہیں۔ دنیائے مذہب میں پرستیدہ خدا ہے اور پرستش بمعنی پوجا پاٹ خدا کے لیے ہے۔ اب مذہب میں یہ ہوگیا کہ خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو یعنی اطاعت تو جس کی جی چاہے کرتے چلے جاؤ' حکومت تو ملوکیت کی اختیار کرتے چلے جاؤ یعنی انسانوں کی حاکمیت تسلیم کرتے چلے جاؤ لیکن پرستش خدا کی کرو۔ مسلمان مطمئن ہوگیا کہ میں بتوں کی پرستش تو نہیں کرتا مگر محکومیت انسانوں کی اختیار کیے ہوئے ہے اور مطمئن ہے کہ میں شرک نہیں کرتا' مشرک نہیں ہوں کیونکہ میں بتوں کی پرستش نہیں کرتا۔ صلوٰۃ کا وہ نظام جو حکومتِ خداوندی کا تھا وہ صرف اس وقتی نماز میں بدل گیا جس میں صرف حرکات و سکنات ہوتی ہیں' رکوع اور سجود وغیرہ کی ساری بحث اس کے اوپر ہوتی ہے۔ آپ نے ٹی وی (ٹیلی ویژن) پہ بھی دیکھا ہے۔ اب انہوں نے وہ شکل دکھانی شروع کی ہوئی ہے کہ نماز

اور وضو کیسے ہے اور بتاتے ہیں کہ اس میں یہ ہوتا ہے: دونوں پاؤں کے درمیان اتنا فاصلہ ہونا چاہیے' ہاتھ فلاں جگہ باندھنے چاہئیں' رکوع اس طرح کرنا چاہیے' سجدہ اس طرح کرنا چاہیے۔ اس سجدے سے' اس جھکنے سے' اس صلوٰۃ سے' اس عبادت سے' مقصود کیا ہے' یہ کہیں نہیں ذکر آتا' کیونکہ وہ تو یہ آئے گا کہ خالص خدا کے احکام کی محکومیت اور اطاعت ہو۔ مذہب میں مسجد صرف اس مقصد کے لیے رہ گئی کہ وہاں پانچ وقت کے لیے اکٹھے ہو کر نماز پڑھ لی جائے' یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ یہ جو داع اور تدعوا اور دعوت الی اللہ ہے' اس کا ترجمہ تو میں نے کہا ہے کہ ''پکارنا خدا کو'' کرلیا۔ خدا کو پکارنے کا ذہن میں کوئی مفہوم ہی نہیں آتا۔ مذہب میں یہ ایک مسئلہ بن گیا یعنی زندگی کا جو نظام تھا وہ مذہب میں پہنچ کر اب مسئلوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ کس چیز پہ بحث ہوتی ہے؟ خدا کو پکارنے پر۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اہلحدیث حضرات اور بریلوی حضرات کے درمیان بڑی شدید بحث ہوتی ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ وہ ''یا اللہ'' کے ساتھ ''یا رسول اللہ'' بھی کہتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ شرک ہوتا ہے' یا رسول اللہ نہیں کہنا یعنی وہ جو سارا خالص اللہ کو' خالص خدا کو پکارنا تھا' اس میں پکارنے کے معنی ہو گئے کہ یہ یا رسول اللہ نہیں کہہ سکتے۔

ہمارے ہاں کی بحثیں اور مناظرے

اب ہماری ساری بحثیں اس پر ہیں' اسی پر جنگ وجدل ہوتا ہے' اسی پر آپس میں اتنے سخت مناظرے ہوتے ہیں کہ ''یا اللہ'' یہ توحید ہو گئی اور اس کے ساتھ جو یا رسول کہنا ہے' یہ شرک ہو گیا بلکہ وہ تو آ گیا: یا عبدالقادر جیلانی یعنی کسی اور کے ساتھ جو ''یا'' کہنا ہے وہ شرک ہے۔ اب یہ مسئلہ ہو گیا کہ یا صرف اللہ کے لیے کہا جا سکتا ہے یعنی ''یا'' کا لفظ کسی اور کے ساتھ کہا جائے تو شرک ہے لیکن اگر اس کی جگہ انسانوں کی محکومیت اور اطاعت اختیار کرنے سے جو شرک عظیم ہوگا اس کا تصور ہی ختم ہو گیا اور اب صرف خدا کو پکارنے کے معنی ہو گئے: یا اللہ کہنا' اور شرک ہوا کسی اور کے ساتھ ''یا'' کا لفظ استعمال کرنا۔ ان اہل حدیث اور بریلوی حضرات کے ہاں بڑی شدت سے یہ بحثیں ہوتی ہیں۔ آپ اخبارات میں دیکھیے اب تو یہ بحثیں لندن اور برمنگھم کی مسجدوں میں بھی جا پہنچی ہیں۔ سر پھٹول ہوتی ہے' لٹھ چلتے ہیں۔ کس پہ؟ اس مسئلہ پہ کہ یہ رسول اللہ کے ساتھ ''یا'' کہتا ہے۔ بس یہ رہ گئی سمٹ سمٹا کے بات۔

نظام صلوٰۃ کے قیام کی بجائے صرف نماز پڑھنا

قرآن نے اقیموا الصلوٰۃ کہا تھا۔ کہا تھا کہ صلوٰۃ قائم کرو۔ آپ دیکھیں گے کہ جہاں بھی **اقیموا الصلوٰۃ** آئے گا: صلوٰۃ قائم کرو' ان کے ہاں وہاں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ نماز قائم کرو۔ اب تو ٹی وی (ٹیلی ویژن) پہ بھی اس کے بہت اشتہار آتے ہیں' اس کے اعلانات آتے ہیں' تو وہاں ہوتا ہے کہ نماز قائم کرو۔ اب چونکہ کسی کی سمجھ میں بات آتی نہیں کہ نماز قائم کرو' کیا ہے؟ یہ جتنے بھی نماز پڑھنے جاتے ہیں ان سے پوچھو: کہاں گئے تھے؟ ہر ایک کہتا ہے: نماز پڑھنے گیا تھا۔ پوچھو: کہاں سے آ رہے ہیں؟ کہتے ہیں: نماز پڑھ کر آ رہے ہیں۔ کبھی کسی کو آپ نے یہ کہتے سنا کہ میں نماز قائم کر کے آ رہا ہوں۔ یعنی تعلیم میں تو آتا ہے' اور ٹی وی (ٹیلی ویژن) پہ بھی آتا

ہے مگر یہ صرف پڑھنا ہوتا ہے۔ کبھی کسی نمازی سے آپ نے یہ سنا کہ وہ کہے کہ میں نماز قائم کر کے آیا ہوں یا نماز قائم کرنے جا رہا ہوں۔ وہ نماز پڑھنے جاتا ہے' نماز پڑھ کے ہی آتا ہے۔ اب وہ قائم کرنا' پڑھنے میں تبدیل ہو گیا۔ لفظ تو قائم کرنا ترجمے میں بھی آ گیا اور ٹی وی (ٹیلی ویژن) پہ بھی' مگر وہ پڑھنے کے لیے گیا' پڑھ کے ہی آیا' اس لیے کہ یہاں پوچھنے سے الجھن پیدا ہوتی ہے کہ صاحب! وہ قائم کرنا کیا ہے۔ قرآن نے ہر جگہ کہا ہے کہ ''صلوٰۃ'' قائم کرو۔ قرآن نے کہیں نماز پڑھنا کہا ہی نہیں۔

نماز کا تو لفظ ہی قرآن میں نہیں ہے۔ یہ لفظ تو ایران کا ہے' فارسی کا ہے۔ اب وہ جو صلوٰۃ کے نظام کو قائم کرنا تھا' To establish the system وہ جو نظامِ خداوندی کا Establish (قائم) کرنا تھا جس میں اطاعت احکامِ خداوندی کی ہو' جب اس کا تصور پرستش میں آیا تو اس تصور کے ساتھ یہ ساری چیزیں جتنی بھی تھیں' یہ سب چیزیں' پوجا پاٹ کے اندر تبدیل ہو گئیں۔ اب ''صلوٰۃ کا نظام'' قائم نہیں کیا جاتا' نماز پڑھی جاتی ہے' اب مسجد حکومتِ خداوندی کا مرکز نہیں رہا' اس کی سیکرٹریٹ کا مقصد' اس کی پارلیمنٹ کا مقصد نہیں ہوا' اس میں مقصد صرف نماز پڑھنا ہو گیا' جو داع ہے جو تدعوا' یدعوا الی اللہ ہے یا جو یدعوا ہے الی اللہ بھی نہیں' اس کے معنی ہو گئے: خدا کو پکارنا اور جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے: پکارنے پہ مسئلہ آ گیا کہ ''یا اللہ'' کہنا تو ٹھیک ہے' یہ توحید ہے مگر اللہ کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ ''یا'' کہنا شرک ہو گیا۔ یہ آ گیا شرک۔

اب یہاں بات کیا ہوئی؟ کہا ہے کہ **لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ** (72:19) جب اللہ کا ایک بندہ' رسول اللہ' یہ کہنے کے لیے کھڑا ہوا کہ حکومت صرف اللہ کی ہے تو **كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا** (72:19) اس کے خلاف یہ مشرکین' جو اس کو نہیں تسلیم کرتے تھے پل پڑے' گویا اسے کچل ہی ڈالیں گے (22:72)۔ اب یہ **قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ** (72:19) خدا کا بندہ اس دعوت کو لے کر اٹھا کہ حکومت صرف اللہ کی ہے' تو ان کے ہاں اس کا ترجمہ ہو گیا کہ ''یا اللہ'' صرف اللہ کے لیے کہنا چاہیے اور وہاں اس آیت میں تھا کہ جب اس نے یہ کہا کہ حکومت صرف اللہ کی ہے تو یہ مخالفین ہجوم کر کے اس پر پل پڑے' جس طرح اب یہ مناظروں میں ایک دوسرے کے اوپر پل پڑتے ہیں کہ اس نے ''یا رسول اللہ'' کیوں کہا۔ اس پر فساد ہوتا ہے' دنگا ہوتا ہے' لٹھم لٹھا ہوتے ہیں کہ صاحب! قرآن میں یہ بھی تو تھا کہ **كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا** [1] (72:19)

خدا حاکم مطلق کی بجائے صرف پرستش تک رہ گیا

یہ کہتے ہیں کہ اسی طرح سے وہ بھی حضور ﷺ کے ساتھ لٹھم لٹھا ہوتے تھے کہ یہ ''یا اللہ'' کیوں کہتا ہے' یہ تمام آیات یہاں سمٹ کے آ گئیں۔ کس بنا پہ آئیں؟ اللہ کا تصور' حاکمِ مطلق کی بجائے' پرستش کرنے کی چیز رہ گیا۔ بس جونہی وہ تصور Object of Worship (مقصدِ پرستش) بنا' نیچے کا سارا نظام بدل گیا' سارا نظام دین سے مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اب اللہ نہ حاکم رہا' نہ اس کی عبادت اس کی محکومیت رہی' نہ اس کی صلوٰۃ وہ نظام رہا جس میں اطاعت صرف خدا کی کی جائے' نہ مساجد اس کے نظامِ حکومت کے مراکز رہ گئیں' نہ داع

---

[1] یہ لوگ مخالفتوں کے ہجوم کے ساتھ اس پر یوں امڈ پڑے گویا اسے کچل ہی ڈالیں گے (22:72)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کرنا تھا' جس کے معنی اس کے احکام کی طرف رجوع کرنا تھا' رہا یہ خدا کو پکارنا ہو کر رہ گیا۔ یہ سارا کچھ خدا کا' اللہ کا' ایک تصور تھا۔ آپ دیکھیے کہ اس مغرب کے مفکر نے نے ٹھیک کہا تھا۔ ان کی بڑی گہری نظر ہوتی ہے۔ اب مسلمانوں کی ساری تاریخ' ساری زندگی' سارا تمدن' تہذیب' ثقافت' معاشرت' معیشت' مذہب کے نقطۂ نگاہ سے' ایک خدا کے تصور کے بدل جانے سے' سب کچھ بدل گیا۔ اگر آپ نیچے سے ان چیزوں کی اصلاح کی طرف جاتے ہیں تو اصلاح کرنا تو بڑی بات ہے' آپ قرآن کی آیات کا جو مفہوم بیان کرتے ہیں تو اس کے اوپر آپ کی مخالفت ہوتی ہے' کفر کے فتوے لگ جاتے ہیں۔ وہ بھی سچے ہیں کہ اگر خدا کا تصور پرستیدہ کا' رہے گا' جس کی پرستش کی جائے گی' تو نیچے کے یہ جتنے مفہوم میں نے ابھی عرض کیے ہیں' وہ اس میں فٹ ان (موزوں:Fit-in) نہیں ہونگے' یہ بات ان میں سے اکثر کی سمجھ میں بھی نہیں آئے گی۔ وہ ٹھیک بات ہے: یہی پڑھا گیا ہے' یہی پڑھایا گیا' یہی ہزار برس سے ان کو کتابوں میں لکھا ہوا مل رہا ہے۔ قرآن کی تو ثواب کی خاطر تلاوت ہوتی ہے' مردوں کو بخشانے کی خاطر اس کو پڑھا جاتا ہے' عملی زندگی میں اس کا واسطہ ہی کچھ نہیں ہے۔

غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق مولانا اسلم جیراج پوریؒ اور مولانا مودودیؒ کی بحث

ایک دفعہ مولانا اسلم [1] جیراج پوری علیہ الرحمۃ کی غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق بحث ہوئی کہ یہ قرآن کی رو سے جائز نہیں ہے۔ مرحوم سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ساتھ یہ بحث تھی۔ قرآنی آدمی تھے' قرآنی دلائل انہوں نے دیئے اور اس سے ثابت کیا کہ یہ غلط ہے۔ مودودی [2] مرحوم (1978-1903) نے آخر میں یہ لکھا کہ ان کی غلطی یہ ہے کہ یہ صرف قرآن سے احکام مستنبط کرتے ہیں۔ "غلطی یہ ہے"! اور کہا کہ یہ خبطی ہیں' الٹی کھوپڑی کے لوگ ہیں۔ کیا جرم ہے؟ کہ جی! قرآن سے احکام مستنبط کرتا ہے۔ اس سے آگے چلے تو ان کے امین احسن اصلاحی نے میرے متعلق کہا: مرتد ہے کہ قرآن سے صرف احکام کو مستنبط کرتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ جب اسلام کا تصور وہ ٹھہرا تو یہ کچھ تو ہوگا۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ وہی اللہ کا ایک تصور ہے۔ جرم ہمارا یہ تھا کہ ہم نے خدا کا وہ تصور قائم کیا جو قرآن قائم کرتا ہے۔ خدا کا یہ تصور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ [3] (6:58) ہے۔

---

[1] علامہ اسلم جیراجپوری (1955-1879) حوالہ: منصور سرمدی: رفتید' ولے نہ از دل ما (علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری)' طلوعِ اسلام مارچ 2006ء ص ص۔5 تا 9۔

[2] تاریخ پیدائش 25 ستمبر 1903ء' جائے پیدائش حیدرآباد دکن، ولادت اورنگ آباد' (بھارت) امریکا کے ہسپتال میں پاکستان کے وقت کے مطابق شام پونے چھ بجے 22 ستمبر 1979ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ تدفین لاہور میں ہوئی' بحوالہ روزنامہ جسارت کراچی' مجریہ 25 ستمبر 2003ء مولانا مودودیؒ پر خصوصی اشاعت)

[3] حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

فرقوں کے نام پر مساجد کا وجود

عزیزانِ من! اور آگے بڑھیے۔ تو اس نے کہا تھا کہ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ ❶ (72:18)۔ چلیے صاحب! ان کی مسجدیں ہی لے لیجیے۔ ان میں یہ تو ہو کہ اللہ کی مسجد ہو مگر آپ دیکھیے کہ یہاں سے وہاں تک مسجدوں کے باہر لکھا ہوگا: مسجدِ غوثیہ نظامیہ' مسجد رضویہ' آپ سارے شہر میں جائیے' کسی مسجد کے باہر آپ کو یہ لکھا ہوا نہیں ملے گا کہ یہ اللہ کی مسجد ہے۔ ذہن میں زور دیجئے' اگر میں کہیں غلطی کرتا ہوں تو بتائیے کہ کسی مسجد کے باہر یہ لکھا ہوا ہے۔ وہاں تو آپ کو غوثیہ' رضویہ ہی لکھا ہوا نظر آئے گا: مسجدِ اہلحدیث' مسجد حنفیہ' مسجد حنفیہ رضویہ' مسجد حنفیہ رضویہ غوثیہ۔ جب آپ ایک خدا کو چھوڑیں گے تو پھر اس کے ساتھ یہ سارے چلے آئیں گے۔ شرک میں یہی تو موج ہوتی ہے کہ ہزاروں خدا بن جاتے ہیں مگر صحیح تصورِ اسلام میں تو ایک سے دوسرا نہیں بن سکتا۔ یہ کچھ چلا ہوا ہے' مسجدوں کے باہر یہ کچھ تو ہوگا اور پھر اس پر آپ دیکھتے ہیں کہ روز لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں' پولیس آجاتی ہے' تالے پڑ جاتے ہیں۔ کس بات کے اوپر؟ کہ جی! یہ تو صرف حنفیہ کی مسجد ہے' اہلحدیث یہاں نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اور کہا یہ جائے گا کہ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ (72:18) معاف رکھیے گا' اس بیچارے اللہ کے حصے میں تو اب وہ خانہ بھی نہیں آتا: کوئی مسجد نہیں ہے جس پہ یہ ہو کہ یہ اللہ کی مسجد ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے!

یہ مراکز صرف حکومتِ خداوندی کے لیے مختص ہونے چاہئیں

عزیزانِ من! اب تو یہ باتیں کرنا بھی جرم ہو گیا ہے۔ اب تو ان حضرات کے یہ عقائد آہستہ آہستہ قوانین بنتے چلے جائیں گے۔ ہاں' تو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا (72:18) یہ مراکزِ حکومت خداوندی صرف اطاعتِ خداوندی کے لیے مختص اور مخصوص ہیں۔ ان کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کا تصور تک بھی ذہن میں آئے گا تو یہ شرک ہو جائے گا۔ اور کہا کہ یہ اتنا بڑا انقلابی دعویٰ ہے کہ اس دعوت کو لے کر اٹھنے والے کے لیے کہا کہ وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ (72:19) اور جب خدا کا ایک بندہ (رسول اللہؐ) اس دعوت کو لے کر اٹھا۔ یہاں صرف ایک لفظ کہا ہے کہ یہ اللہ کا بندہ: عبداللہ۔ کیا بات لے کے اٹھا ہے؟ اس کے جواب میں یہاں ''قام'' کا لفظ آیا ہے۔ آپ سوچیے کہ پھر کیا ہوا جو یہ اٹھا۔ ان کے مطابق یہ نماز میں آ کے صرف قیام ہو گیا۔ ٹھیک ہے قیام تو ہے لیکن اِن کے ہاں ان آیات کے معنی یہ ہو گئے کہ جب یہ اللہ کا بندہ نماز کے لیے ''قیام'' میں اٹھا تو ''قیام'' میں یہ اس کے اوپر پل پڑے' رکوع میں چلا گیا تو پھر کچھ نہیں کہا کیونکہ یہاں لفظ قام آیا ہے۔ عزیزانِ من! کتنا بڑا انقلابی قدم ہے جب یہ اس دعوت کو لے کر اٹھا کہ اطاعت و محکومیت صرف خدا کی ہے۔ اٹھا: کیا لفظ ہے قام کا یہاں! ہر زبان میں اس مقصد کے لیے یہ قام کا لفظ آتا ہے' کسی ایک انقلاب کے لیے' جو اٹھنا ہوتا ہے وہ قام ہے۔ اس کے لیے اقبالؒ (1938-1877) کی رباعی تو کسی کو یاد نہیں ہے۔

---

❶ مساجد وہ مراکز ہیں جہاں بیٹھ کر قوانین خداوندی کے پروگرام اور ان کی عملی تنفیذ طے ہوتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

یہ اس دَور کا ملا کیا جانے! قیامت ہا کہ در قد قامت اوست۔ صلوٰۃ کی قد قامت کے اعلان میں جو قیامت پوشیدہ ہے اس کو یہ کیا جانے! قد قامت الصلوٰۃ، قامت الصلوٰۃ۔ قیامت کا لفظ ''قام'' سے ہی تو ہے۔ ارے اس کے معنی انقلاب کے ہیں۔ جب وہ اٹھا' کیا الفاظ ہیں قرآن کے! پھر یہ دیکھیے کہ جب یہ اللہ کا بندہ صرف خدا کی حکومت کی دعوت لے کر اٹھا ہے اور اس کے لیے خدا اس کو اپنا عبد کہتا ہے کہ کہیں اس کی حکومت نہ سمجھ لینا کہ یہ اپنی حکومت کی دعوت دینے کے لیے اٹھا ہے۔ ''عبد'' کا لفظ صاف کہہ دیا ہے۔ یہ قرآن ہے۔

ہر انسانی حکومت کے بالمقابل قرآنی حکومت

عزیزانِ من! یہ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ ایک ایک لفظ میں وہ اپنی ساری حقیقت بیان کر دیتا ہے۔ کہاں لایا ہے عبد کا لفظ! کہ کہیں یہ بات نہ سمجھ میں آ جائے یا یہ نہ اس کے ذہن میں آ جائے معاذ اللہ یا تم یہ بات نہ سمجھ لو کہ یہ اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا ہے۔ قام عبداللہ: کاہے کے لیے اٹھا ہے؟ کہا: **يَدْعُوْهُ** (72:19) دعوتِ قوانینِ خداوندی کے لیے۔ منصب رسالت اس طرح سے پاکیزہ' منزہ شکل کے اندر یعنی **مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ** (72:19) اطاعت کو اسی کے الدین کے لیے مختص کر دو۔ یہاں آیا ہے: **قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ** (72:19) خدا کا ایک بندہ اس دعوت کو لے کر اٹھا۔ سوال یہ ہے کہ کاہے کے لیے؟ کہا: یدعوہ۔ تو یہ انقلابی آواز تو ساری دنیا کے لیے اعلانِ بغاوت تھا' اعلانِ جنگ تھا۔ پھر کیا ہوا؟ کہا کہ **كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا** (72:19) پل پڑیں گے ایسے جیسے اس کی تکہ بوٹی کر دیں گے۔ ٹھیک ہے ان کی ساری زندگی کے جتنے بھی پروگرام ہیں وہ اس ایک آواز میں ختم ہو جاتے تھے کہ سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے۔ کہا کہ وہ اس پر پل پڑیں گے۔ پھر اسے کہا کہ ان کے ان حملوں سے' ان کی ستیزہ کاریوں سے' دبنے کی کوئی بات نہیں ہے' استقامت کی بات ہے: **قُلْ** (72:20) ان سے کہہ دو۔ یاد رکھیے! وہ تو یہ کہہ کے لپٹ پڑتے ہیں۔ یہاں کہا کہ **قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ** (72:20) ان سے کہہ دو کہ میں صرف اپنے رب کی حکومت کی دعوت دینے کے لیے کھڑا ہوا ہوں اور **وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا** (72:20) اس کے ساتھ کسی اور کو میں شریک نہیں کر سکتا۔

عزیزانِ من! دیکھا ان آیتوں کے اندر کتنی بڑی قیامتیں پوشیدہ ہیں اور ان کا ترجمہ اب صرف یہ رہ گیا کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں' پرستش اسی کی کرنی چاہیے' نماز اس کے لیے ہی پڑھنی چاہیے' اس کے سوا کسی اور کے لیے نہیں کرنی چاہیے۔ اب یہ جو پل پڑتے ہیں' یہ وہ ہیں جو ''یا رسول اللہ'' کہنے والوں کے خلاف یا جو ''یا اللہ'' کہنے والے حملہ کرنے آ جاتے ہیں ان کا مطلب یہ ہے پولیس والے آ جاتے ہیں۔ اب ان آیتوں کا یہ مفہوم رہ گیا۔

میرے پاس کسی کو نفع نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں

عزیزانِ من! اپنی ذات کے متعلق یہاں عبد کہا تھا پھر اس کے لیے تردید کی کہ کہیں اس میں اس کی ذاتی حکومت نہ سمجھ لینا۔ کہا کہ

قُلۡ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ لَکُمۡ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (72:21) میں تمہارے لیے کسی قسم کے نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ مملکت کا سب سے بڑا جسے آپ اتنی بڑی سلطنت کا ہیڈ آف دی سٹیٹ کہتے ہیں' وہ سربراہِ مملکت ہے اور عام الفاظ میں کہیے تو یہ وہ ہے جسے آپ ''ڈکٹیٹر'' کہتے ہیں' یہ رسول ہے' سربراہِ مملکت ہے' کہتا ہے: اس مملکت کی جو میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں' حکومت قائم کر رہا ہوں' میں تمہیں کسی قسم کا نفع نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اللہ اکبر! سربراہِ مملکت ہے تو کسی کو ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا کیونکہ اس مملکت کے قیام کے تو معنی خدا کے احکام کی تنفیذ ہے۔ میرا کیا ہے جو میں تمہیں یہ نفع نقصان دونگا۔

عزیزانِ من! یہ ہے حکومتِ خداوندی' یہ ہے اسلامی مملکت کا آئین کہ سربراہِ مملکت کو بھی یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی کو کسی قسم کا خدا کے قوانین کے خلاف نقصان یا فائدہ پہنچا سکے۔ کہا کہ قُلۡ اِنِّیۡ لَنۡ یُّجِیۡرَنِیۡ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ ۙ۬ وَّلَنۡ اَجِدَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مُلۡتَحَدًا (72:22) ان سے کہہ دو کہ میں بھی اگر کسی قسم کی یہ چیز اپنے لیے اختیار کر لوں تو خدا کے عذاب سے پناہ دینے والا مجھے کوئی نہیں ملے گا' مجھے کوئی پناہ نہیں دے سکے گا۔ میرا کیا ''جرم'' ہے کہ میں یہ کہوں کہ مجھے دستورِ خداوندی میں کچھ اختیار حاصل ہے۔ عزیزانِ من! کسی انسان کو دوسرے انسان کے اوپر کوئی اختیار ہی حاصل نہیں ہوتا۔ کہا کہ میں اگر یہ چیز تصور بھی کر لوں یا ایسا کروں تو خدا کے عذاب سے مجھے کوئی پناہ نہیں دے سکے گا: وَلَنۡ اَجِدَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مُلۡتَحَدًا (72:22) اس کو چھوڑوں گا تو دنیا میں کسی جگہ مجھے پناہ نہیں مل سکے گی۔ یہ کچھ رسول کہہ رہا ہے۔ کیوں کہہ رہا ہے؟ عبد ہے' غلام اپنے آقا کو چھوڑتا تھا تو پھر اسے کہیں پناہ نہیں ملتی تھی اور جب آقا ہی ہزاروں بنا رکھے ہوں تو پھر ہر جگہ پناہ ملتی ہے: اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِسٰلٰتِہٖ (72:23) میرا کام یہ ہے کہ میں قوانین خداوندی کو جو اس نے مجھے دیے ہیں تم تک پہنچا دوں۔ یہ بات اگلی آیت میں بھی چلی آرہی ہے۔

عزیزانِ من! وقت ختم ہوا۔ ہم سورۃ الجن کی آیت 22 تک آ گئے' 23 سے آئندہ ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

❀......❀❀❀......❀

پندرھواں باب: سورۃ الجن (آیات 23 تا اختتام)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عزیزانِ من! آج جنوری 1984ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الجن کی آیت 23 سے ہو رہا ہے: (72:23)۔ سابقہ آیات میں' آپ کو معلوم ہے' میں نے عرض کیا تھا کہ وہ انقلاب' جس کی ابتداء نبی اکرم ﷺ کی مکہ کی زندگی میں ہوئی' اس کی رفتار شروع میں بڑی دھیمی اور نرم تھی' آہستہ آہستہ آگے بڑھتی گئی اور آخر میں آ کر اس نے پوری شدت اختیار کر لی اور پھر حضور ﷺ قرآن کے الفاظ میں **وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰهِ یَدۡعُوۡهُ** (72:19) اس انقلاب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ قام یہی چیز ہے اور یہی وہ چیز تھی کہ جب مخالفین نے دیکھا کہ اب تو اس تصادم کی آخری منزل آ گئی ہے تو **کَادُوۡا یَکُوۡنُوۡنَ عَلَیۡهِ لِبَدًا** (72:19) وہ پورے جوش و خروش سے حملہ کر کے آ گئے' لپٹ پڑے یعنی اب یہ اسٹیج آ رہی ہے۔

آپ کو یاد ہے کہ جب 29 واں پارہ شروع ہونے لگا تھا تو میں نے کہا تھا کہ اب ان آخری دو پاروں میں اُس تصادم کا ذکر ہے جو اتنے عرصے تک یوں اس نرم روی سے چلا آ رہا تھا۔ اب یوں کہیے کہ وہ جو Confrontation (تصادم) ہے' جو تزاحم ہے' جو ٹکراؤ ہے' وہ اب سامنے آ جائے گا۔ لہٰذا قرآن کی ان آخری سورتوں میں اسی تصادم کی ایک تصویر کو پیش کیا گیا ہے جن سے پورا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ تو یہاں سے اس تصادم کی ابتداء ہوگئی۔ جب حضور ﷺ اس پیغام کو دینے کے لیے اٹھے تو یہ عالمگیر پیغام' جو ایک انقلابی پیغام تھا' کیفیت یہ ہوئی کہ تمام مخالفت کی قوتیں ہجوم کر کے حضور ﷺ کے خلاف آ گئیں۔

بلاشرکتِ غیرحکومت

عزیزانِ من! اب یہاں سے بات آگے چلی۔ حضور ﷺ نے کہا کہ جس پیغام کی میں دعوت دے رہا ہوں اس میں لَآ اُشۡرِکُ بِہٖۤ اَحَدًا (72:20) خالصتاً خدا کے احکام وقوانین کی ہی اطاعت ہوگی اور اس میں کسی انسان کی اطاعت کو شریک نہیں کیا جائے گا حتیٰ کہ یہ پیغام دینے والا جسے سربراہِ مملکت کہا جاتا ہے اور حضور ﷺ تو سب سے پہلی اسلامی مملکت کے سربراہِ اولیں تھے' ان کے متعلق بھی یہ کہا کہ قُلۡ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ لَکُمۡ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا (72:21) مجھے ذاتی طور پہ تمہارے لیے کسی نفع اور نقصان کا قطعاً کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیات کیا آ رہی ہیں: احکامِ خداوندی کی اطاعت بلاشرکتِ غیر اور اگر کسی انسان کے کسی حکم وقانون کا اس میں اشتراک ہو جائے گا تو یہ شرک ہوگا۔ شرک کے تو معنی ہی یہ ہیں۔

قرآن اور سربراہ مملکت کی اصطلاح

عزیزانِ من! اگلی خصوصیت ہی یہ بتائی کہ یہ جو انقلاب برپا کرنے والا ہے' مملکت قائم کرنے والا ہے' جسے آج کی اصطلاح میں سربراہِ مملکت کہا جاتا ہے' قرآن نے تو اس کے لیے یہ اصطلاح بھی استعمال نہیں کی' وہ کسی کو مملکت کا سربراہ بھی نہیں مانتا' وہ تو مشاورت سے پوری ملت کی مملکت مانتا ہے۔ قرآن کے احکام کو نافذ کرنا اس ملت کا فریضہ قرار دیتا ہے' تو سربراہی کا ہے کی لیکن بہرحال کوئی تو ایک مرکز ہوگا۔ میں نے اپنے ہاں اس کے لیے مرکز کا لفظ استعمال کیا ہے تو یہ جو اس اطاعت کا مرکز ہوگا وہاں اطاعت صرف خدا کی ہوگی' قرآنِ کریم کی ہوگی جس پر عمل کرانے والا مملکت کا ایک مرکز ہوگا' جسے نبی اکرم ﷺ کہا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ مجھے ذاتی طور پر تمہیں نفع نقصان پہنچانے کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ اب دیکھتے چلے جا رہے ہیں کہ بظاہر عام تفاسیر سے تو یہی ظاہر ہوگا کہ یہ ''جنوں'' کی باتیں ہو رہی ہیں لیکن غور فرمایئے: کس کس کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ہاں تو یہ کہا کہ سربراہِ مملکت کی طرف سے کسی کو کوئی نفع نقصان نہیں ہوگا۔

حضور ﷺ کا اپنے متعلق فرمان

حضور ﷺ نے کہا کہ یہ چیز تو ایک طرف رہی: اِنِّیۡ لَنۡ یُّجِیۡرَنِیۡ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ وَّ لَنۡ اَجِدَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مُلۡتَحَدًا (72:22) اگر میں بھی اس کے قوانین کی نافرمانی کروں تو دنیا میں مجھے بھی کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔ یہ خود رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں: پھر مجھے بھی کہیں پناہ نہیں مل سکے گی' نہ مجھے کوئی پناہ دینے والا ہوگا' نہ میں کہیں پناہ پا سکوں گا۔ اس آیت کے اندر یہ دونوں چیزیں آئی ہیں۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں کسی قسم کی قوت اور اختیار رکھتا ہوں۔ میرا فریضہ یہ ہے کہ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِسٰلٰتِہٖ (72:23) میں خدا کے پیغامات تم تک پہنچاؤں یعنی وہ قوانین واحکامات تم تک پہنچاؤں' جو اس نے مجھے

دیئے ہیں۔ اس کے مطابق ایک نظام قائم کروں اور پھر سب سے پہلے اَنَـا اَوَّلُ الْـمُسْـلِمِیْنَ (6:163) ان قوانین کی خود اطاعت کروں۔ خدا کی اطاعت' خدا کے قوانین ہی کی اطاعت کے لیئے' یہ رسول آتا ہے۔ یہ سب سے پہلا مرکزِ اطاعت بن رہا ہے اور کہتا یہ ہے کہ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ تم ان قوانین خداوندی کو مانو یا ان کی مخالفت کرو لیکن اتنا سن رکھو کہ وَمَـنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا (72:23) اور جو قوانینِ خداوندی کی' اس نظام کی' جسے میں نے قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لیے قائم کیا ہے' کی معصیت کرے' نافرمانی کرے' سرکشی برتے' تو اس کے لیے جہنم کا عذاب ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

عزیزانِ من! یہ چیز تو اب آپ کے ذہن میں آ گئی ہو گی' میں برسوں سے یہ کہے جا رہا ہوں کہ جہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کا ذکر ہے وہاں اس نظامِ خداوندی کے مرکز کی اطاعت کا ذکر ہے جو خدا کے قوانین نافذ کرنے کے لیے رسول اللہؐ نے سب سے پہلے قائم کیا تھا اور اس کے بعد جب تک وہ قائم رہا وہی نظام تھا۔ یہاں کہا کہ جو بھی اس کی معصیت کرے گا اس کے لیے جہنم کا مقام ہو گا۔ مگر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے تو اپنے ہاں جہنم' قیامت' بہشت' یہ سارا کچھ' آخرت کی زندگی تک ملتوی کر رکھا ہے۔ میں پھر دہرادوں اور ہر بار دہراتا ہوں کہ حیاتِ اخروی تو ہمارے ایمان کا جزو ہے اور جزو اولیں ہے۔ اگر اس سے انکار کیا جائے تو باقی اقرار یا ایمان کوئی کام ہی نہیں دیتا۔ اس کی اتنی اہمیت ہے' لیکن یہ نہیں ہے کہ یہ جو اس قسم کی سرکشیاں' اس قسم کی قوانینِ خداوندی کی نافرمانبرداریاں ہیں' ان سب کے نتائج قیامت میں ہی جا کر نکلیں گے۔ یہ ٹکراؤ اسی دنیا میں شروع ہو رہا تھا' اس کا انجام تو فتح مکہ کے دن ان لوگوں کے سامنے آ گیا تھا۔ قرآن کی ان آیات میں آپ دیکھیں گے کہ یہی وہ ٹکراؤ ہے جس کا ذکر بار بار آئے گا' میدانِ جنگ کا ذکر آئے گا' ہتھیاروں کا ذکر آئے گا' زنجیروں کا ذکر آئے گا' ہتھکڑیوں کا ذکر آئے گا' قید کا ذکر آئے گا' پابندیوں کا ذکر آئے گا' اور پھر وہ شکست خوردہ قوم' اور قوم بھی قریش کی سی تھی' جس نے کبھی کسی کے سامنے جھکنا سیکھا ہی نہیں تھا' وہ قوم کہ جو اس سے پیشتر اس جماعت کے افراد کے ساتھ جنگ تک کرنا بھی اپنی توہین اور تذلیل سمجھتی تھی' وہ لوگ اس طرح سے ان کے سامنے زنجیروں میں بند' گرفتار شدہ آئے' تو آپ ان کی اس حالت کا سوچ سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے جہنم کے متعلق کہا ہے کہ خِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (41:16) ان کے لیے اس دنیا کی زندگی کے اندر ذلت اور رسوائی ہے۔ ابھی اگلی ہی آیت میں یہ پتہ چل جائے گا کہ یہ جو کہا ہے کہ ان کے لیے جہنم ٹھکانہ ہے: حَتّٰـی اِذَا رَاَوْا مَـا یُوْعَـدُوْنَ فَسَیَـعْـلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا [1] (72:24)۔ یہاں سَیَـعْلَمُوْنَ آیا ہے کہ ابھی' عنقریب تم دیکھو گے' یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے' ان کو آج بڑا ناز ہے کہ ہمارے لشکر کی تعداد بہت بڑی ہے' ہتھیار اور ساز و سامان بہت کثرت سے ہمارے پاس ہے' اس گھمنڈ اور غرور پہ یہ مقابلے میں کھڑے ہیں۔ ان سے کہا کہ حَتّٰـی اِذَا رَاَوْا مَـا یُوْعَدُوْنَ

---

[1] جب وہ تباہی ان کے سامنے آئے گی تو اُن پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کس کے حمایتی کمزور ہیں اور کس کی جماعت کی تعداد کم ہے؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

فَسَيَعْلَمُوْنَ (72:24) جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم اپنی ضد پہ اڑے رہے تو یہ تباہی آ جائے گی۔ یہ جو کہا جاتا ہے: ''جب یہ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ واقعی وہ تباہی آ گئی ہے''، تو آنکھوں سے تو اسی دنیا میں ہی دیکھا جائے گا۔ پھر آگے تو قرآن بتا رہا ہے کہ **فَسَيَعْلَمُوْنَ** (72:24) عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا معلوم ہو جائے گا؟ **مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا** (72:24) کس کے حمایتی تھوڑے تھے اور کس کی تعداد زیادہ تھی؟ اس کا ابھی پتہ چل جائے گا۔

عزیزانِ من! اب یہ پوچھتے تھے کہ وہ تباہی کب آئے گی۔ قرآن میں بار بار ان کے لیے یہ چیز آئی ہوئی ہے اور وہ بار بار یہ بتاتا ہے کہ اعمال اور ان کے نتائج کے محسوس شکل میں برآمد ہونے میں مہلت کا ایک وقفہ ہوتا ہے اور اسے یعنی اس مہلت کے وقفے کو خدا نے اپنی رحمت قرار دیا ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ شاید چھوٹے چھوٹے جھٹکوں سے بات ان کی سمجھ میں آ جائے اور پھر یہ اپنی اصلاح کر لیں یعنی اس اصلاح کے لیے ایک Opportunity (موقعہ) دیا جاتا ہے، فوری گرفت نہیں ہوتی۔ وہ تو قرآن نے کہا ہے کہ اگر خدا انسانوں کے اعمال پہ فوراً ہی گرفت کر لے تو دنیا میں کوئی انسان ہی باقی نہ رہے اور بات تو ٹھیک ہے: کون انسان ہے جس سے کبھی کوئی لغزش نہیں ہوتی اور اگر اس لغزش پر فوراً ہی اس کو ختم کر دینا ہو تو وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ پھر دنیا میں تمہیں کوئی انسان ہی نظر نہ آئے۔

مہلت کے وقفے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا نتیجہ

مہلت کا یہ وقفہ ہماری رحمت ہے۔ ہم مہلت کا وقفہ دیتے ہیں، تنبیہ کیے چلے جاتے ہیں، بتاتے چلے جاتے ہیں کہ اس غلط روش، اس غلط نظام، کا انجام تباہی ہوگا، اس میں تبدیلی کر لو، ترمیم کر لو، اصلاح کر لو، بدل لو، تمہیں وقت دیتے ہیں، تمہیں مہلت دیتے ہیں، اور اسی سے قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ اسی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ کہتے تھے کہ صاحب! خوامخواہ روز ہمیں ڈراتا چلا جاتا ہے کہ یہ ہوگا اور تباہ ہو جاؤ گے، برباد ہو جاؤ گے، ہوتا کچھ بھی نہیں ہے، ہم تو پھولتے پھلتے چلے جا رہے ہیں، پنپتے چلے جا رہے ہیں۔ یہی چیز تھی اور پھر یہاں بھی یہ اعتراض ہوا کہ وہ تباہی کب آئے گی۔ کہا کہ **قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا** ❶ (72:25)۔ اب یہاں رسول ﷺ کی اگلی بات آئی کہ یہ تو مجھے یقین ہے کہ وہ تباہی آ کر رہے گی لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب آئے گی۔ جلدی آ جائے گی یا دیر میں آئے گی، یعنی اس کا علم رسول کو بھی نہیں ہے لیکن یہ یقین ہے کیونکہ خدا نے اس کے متعلق کہا ہوا ہے، وعدہ کیا ہوا ہے۔ اسے اس کا یقین ہے کہ یہ آ کر رہے گی لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ میں نہیں جانتا کہ یہ کب آئے گی: قریب ہی ہے یا بعید ہے۔ **اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا o عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا o اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا** (72:25-27) کہ آیا میرا نشوونما دینے والا اسے لمبا کر دے گا، مستقبل کا علم صرف خدا کو ہوتا ہے۔ وہ اس

---

❶ ان سے کہہ دو کہ میں نہیں جانتا کہ وہ عذاب جلدی آئے گا یا میرا نشوونما دینے والا اس کی موت کو لمبا کر دے گا (اور وہ دیر میں واقع ہوگا۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کے متعلق کسی کو خبر نہیں دیتا البتہ وہ جس شخص کو نبوت کے لیے منتخب کرتا ہے' اسے مستقبل کے متعلق جس قدر بتانا مقصود ہوتا ہے' وحی کے ذریعے بتا دیتا ہے اور اس کی وحی کی حفاظت کے لیے اس کے آگے اور پیچھے محافظ مقرر کر دیتا ہے۔عزیزانِ من! یہ جو آنے والی بات ہے' جو اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے' اسے غیب کہا جائے گا۔ یہ Future (مستقبل) کی بات ہے' یہ حال کی بات نہیں ہے' یہ غیب کی بات ہے۔اسے تو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے' جس حد تک کوئی غیب کی بات بتانا چاہتا ہے' وہ اتنی سی بات وحی کے ذریعے اس کو بتا دیتا ہے' اس سے زیادہ رسول کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا۔

رسول کو کتنا غیب کا علم تھا

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو ہر بات مسئلہ بن جاتی ہے' پھر بحثیں شروع ہو جاتی ہیں' مناظرے شروع ہو جاتے ہیں' قرآن کی طرف تو کوئی آتا نہیں ہے۔ یہ بحثیں صدیوں سے شروع ہیں۔ان بحثوں میں پہلی بات یہ آتی ہے کہ کیا رسول کو غیب کا علم حاصل تھا یا نہیں؟ قرآن کی طرف آئیں' اس نے ہر چیز واضح کر دی ہے۔ یہاں رسول کہہ رہا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ وہ تباہی کب آئے گی' مجھے بھی صرف غیب کا اتنا علم ہوتا ہے جتنا خدا بذریعہ وحی مجھے بتا دیتا ہے' اس سے زیادہ نہیں۔اور پھر وہ رسول تو ایک طرف رہے' جب یہ بات آگے چلتی ہے تو چل سو چل ہوتا ہے۔ جب بند کھول دیا جائے پھر تو سیلاب کا تو پوچھو نہیں کہ کہاں تک جاتا ہے۔ پھر تو ہر حضرت پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ یہ پیشین گوئی کرنا کیا ہوتا ہے؟ پیشین گوئی کے تو معنی یہ ہیں کہ واقعہ کے نمودار ہونے سے پہلے اس کے متعلق بتا دینا۔ یہی تو غیب کا علم ہے۔ یہاں تو رسول کہہ رہا ہے کہ مجھے بھی علم نہیں ہے کہ وہ تباہی کب آئے گی' مگر یہ تقدیروں کے حالات بتاتے ہیں' مقدرات اور قسمت کی باتیں بتاتے ہیں' روز رات کو جا کر' عرش کے اوپر رکھی ہوئی لوحِ تقدیر کو پڑھ کے آتے ہیں' پھر اس کے متعلق آ کر غیب کی ساری باتیں بتاتے ہیں' ہر حضرت جی کو غیب کا علم ہوتا ہے' یہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ اس نے پیشین گوئی کی۔ ذرا یہ فارسی کا لفظ چھوڑ کے عربی کا لفظ لے آیئے۔ یہ غیب ہی کی بات ہے جسے یہ پیشین گوئی یا پیش گوئی کہتے ہیں۔اور کسی کو بھی یہ کہتے ہوئے ذرا کرک نہیں آتی کہ وہ پیشین گوئیاں کرتے ہیں اور سچی نکلتی ہیں۔تو گویا جو آنے والے واقعات اس وقت غیب میں ہیں ان کا انہیں علم ہو جاتا ہے۔ یہ کچھ مانا جاتا ہے۔

علم غیب کے حدود

عزیزانِ من! اگر اس غیب کے متعلق قرآن میں آیئے تو اتنی تحدی سے خدا نے یہ کہا ہے کہ خدا کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں ہے اور وہ اپنے رسولوں میں سے بھی جسے چاہتا ہے اور جتنے حصے تک کسی بات کے متعلق چاہتا ہے وحی کے ذریعے سے صرف اسی حد تک ان کو بتاتا

تھا' اور جو وحی ہے اب وہ ختم ہوگئی۔ اس کے بعد تو رسول ہی آنے یا نبی آنے ہی بند ہوگئے۔ وہ تو سلسلہ ختم ہوگیا' لیکن نہیں' ان کے ہاں یہ علمِ غیب موجود ہے۔ یہ جتنے بھی اولیاء کرام ہیں' ان کو پھر اُسی طرح سے یہ سب کچھ ہوتا ہے اور پھر آپ کے ہاں پیشین گوئیاں جب سال آیا یا سال کا آخر ہوا' آنے والے سال کی پیشن گوئیاں منجم کرتے چلے جاتے ہیں' ستاروں سے انسانوں کی قسمت کا حال بتاتے ہیں۔ اندازہ لگائیے۔ باقی قوموں کا تو چھوڑ دیجیے' وہ تو قیاس آرائیوں کو صرف علمی سطح پہ لیتے ہونگے۔ اگر وہ انہیں پیشین گوئیاں بھی کہیں تو بھی ہمیں ان سے تعرض نہیں ہے مگر یہ جو ہاتھ میں قرآن لے کر یہ کہتے ہیں کہ یہ آنے والے واقعات کا' یعنی غیب کا علم' جانتے ہیں اور پیشین گوئیاں کرتے ہیں اس کا کیا کہیں گے!! اور ہمارے ہاں تو اس کے اوپر پوچھو نہیں' کتنی بحثیں ہوتی چلی جاتی ہیں جبکہ رسول یہ کہہ رہا ہے کہ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا o اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (72:26) خدا غیب کا علم صرف رسول کو وحی کے ذریعے دیتا ہے اور پھر اس وحی کی وہ خود حفاظت کرتا ہے۔ قرآن کے متعلق تو خود قرآنِ کریم میں ہے کہ خدا نے اس کو نازل کیا ہے: وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) ہم نے اسے نازل کیا' ہم اس کے محافظ ہیں۔ قرآن کی محافظت یہی ہے کہ اس میں کوئی ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر سے نہ آئے لیکن ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ ہم نے کہا: جی ٹھیک ہے' آپ اپنے قرآن کے الفاظ کی حفاظت کیے رہیے' ہم اس کے ایسے معنی کریں گے کہ قرآن کا ایک لفظ باقی نہ رہے۔ کرلو کیا کرتے ہو!! (معاذ اللہ) ہمارے ہاں وہ تفسیریں ہیں جن کے متعلق خود ان لوگوں نے کہا ہوا ہے کہ ان قرآن کی تفاسیر میں قرآن کے سوا سب کچھ ہے' اور پھر اس کی تاویلوں میں تو پوچھیے نہیں کہ بات کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے۔ بہرحال اس نے یہ کہا تھا کہ ہم نے اس کی حفاظت کرنی ہے اور اس حفاظت کے لیے الفاظ یہ ہیں کہ اس کے آگے اور پیچھے ہم پہرے دار کھڑے کر دیتے ہیں کہ کوئی اس کو Touch (مس) نہ کرنے پائے۔

قرآن کا معجزہ

یہ بھی قرآن کا معجزہ ہے کہ تمام مبینہ کتبِ آسمانی میں صرف قرآن ایسی کتاب ہے جس کے لیے غیر مسلم مورخ اور محقق بھی اپنی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی یا ترمیم و تنسیخ نہیں ہوئی۔ قرآن لفظاً لفظاً وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ نے امت کو دیا ہے۔ اور اگلی بات تو پھر ایمان کی ہوئی کہ حضور ﷺ نے اپنی طرف سے نہیں دیا۔ یہ خدا کی وحی تھی جو حضور ﷺ نے انسانوں تک پہنچائی۔ تو یہ جو خدا نے پہرے مقرر کیے تھے وہ پہرے دار اس قدر سخت قسم کے تھے کہ قرآن میں کسی ایک لفظ کی بھی تبدیلی نہیں ہوسکی لِيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (72:28) اس سے یہ معلوم ہوجائے گا کہ رسولوں نے خدا کے پیغامات لوگوں تک پہنچا دیئے یا نہیں۔ رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (72:28) اس میں رسول کی کوئی اپنی بات نہیں۔ وہ تو اپنے نشو ونما دینے والے کا صرف پیغامبر ہے۔

رسول کے معنی ہی قاصد اور پیامبر کے ہوتے ہیں۔ وہ تو صرف پیغام پہنچاتا ہے۔ اس نے اس پیغام کو محفوظ کر کے رکھ دیا تا کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ یہ وہی پیغام ہے جو خدا نے اس کو دیا تھا جسے یہ انسانوں تک پہنچا رہا ہے۔ **وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا** (72:28) اور وہ جو ہم نے پہرے دار مقرر کیے ہیں، اس کا وہ احاطہ کیے ہوئے ہیں تا کہ کسی طرف سے بھی کوئی خائن اس کی طرف نہ آنے پائے۔ اتنا سخت پہرہ لگا دیا ہے اور ہر چیز اس طرح گِن رکھی ہے کہ ہر وقت گنی جا سکے کہ واقعی وہ ٹھیک ہے۔ کسی شے کے یقینی ہونے کے متعلق یہ عجیب چیز ہے کہ کہا جائے کہ یہ دیکھیے دس ہیں، یہ دیکھ لو، اس وقت گن لو اور اس کے بعد دیکھ لیا جائے کہ دس ہی ہیں، پھر ہو گا کہ اس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی۔ تو یہ قرآن ہے انقلابِ خداوندی کا دعویدار جسے نبی اکرم ﷺ نے پہنچایا۔

عزیزانِ من! سورۃ الجن یہاں ختم ہوئی۔ اب آگے سورۃ المزمل [1] لیتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀......❀❀❀......❀

---

[1] اس سورۃ کے لیے سولھواں باب دیکھیے۔ اس کا یہ ابتدا اسی درس کا حصہ ہے:

سولھواں باب: سورۃ المزمل (ابتدائیہ)[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المزمل کی اہمیت

عزیزانِ من! میں قریباً پچاس برس سے اس قرآن پر غور وتدبر کرتا چلا آ رہا ہوں۔ یقین مانیے بعض سورتیں ایسی ہیں کہ جب بھی وہ سامنے آتی ہیں تو میں ان کی ہیبت سے' ان کی عظمت سے' ان کے گراں قدر ہونے سے' کانپ اٹھتا ہوں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ان آخری دو پاروں کے شروع میں اس انقلابی پروگرام کا ذکر ہے جو نرم خرامی سے چلا آ رہا تھا۔ اب اس میں سرعت آ گئی۔ مکی زندگی میں اس کی تیاریاں سست رفتاری سے تھیں' پروگرام ایک ہی تھا۔ ابھی قرآن کے یہ الفاظ آئیں گے' وہ پروگرام نہایت مناسب' متوازن اور صحیح (تناسب) Proportion کے تابع آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ یونہی نہیں تھا بلکہ پہلے دن سے آخری دن تک' اس پروگرامِ نبوی یا پروگرامِ خداوندی کا مقصود ومطلوب اور اس کی آخری منزل نبی کے سامنے تھی' اس کا نبی کو بتا دیا گیا تھا۔

رفقاء کی ضرورت

عزیزانِ من! تاریخ میں چیزیں ملتی ہیں کہ حضور ﷺ نے پہلے ہی خطاب میں قوم سے یہ کہا تھا کہ میں عرب وعجم کی ان ملوکیتوں اور شہنشاہتیوں کو الٹنے کے لیے ایک پیغام لے کر اٹھا ہوں۔ مجھے کچھ رفقاء کی ضرورت ہے۔ بتاؤ: کون اس بوجھ کو بٹانے والا میرے ساتھ شریک ہوتا ہے؟ یہ قوم سے پہلا خطاب تھا۔ ابھی اس آواز کو سیکنڈ کرنے والا ابھی کوئی نہیں تھا۔ کہا تھا اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ[2] (6:164)۔ یہ پہلی آواز اٹھی ہے اور پہلی ہی آواز میں یہ کہا جا رہا ہے۔ آپ تاریخوں میں یہ پڑھ رہے ہیں کہ قریش نے اس پیغام کے خلاف ازحد مزاحمت کی' مخالفت کی' تصادم کیا۔ وہ ساری مکی زندگی میں یہ کچھ کرتے رہے اور اس کے بعد مدنی زندگی میں تو باقاعدہ لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ تاریخی بیان کے مطابق سات سال کے عرصے میں بیاسی کے قریب' جنگیں لڑی گئیں جن میں چھوٹی موٹی لڑائیاں' اور

---

[1] یہ درس سورۃ الجن والے درس کا ہی حصہ ہے کیونکہ سورۃ الجن کے اختتام پر سورۃ المزمل کا یہ درس شروع کر دیا گیا تھا۔

[2] سب سے پہلے' میں نے خود اس حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

بڑے بڑے جنگ شامل ہیں' تا آنکہ مکہ فتح ہو گیا۔ قریش کو آخری شکست یونہی نہیں ہوگئی' وہ تو آخری وقت تک' آخری انسان تک' مخالفت کرتے رہے۔

مخالفت کی وجہ جواز

یہ کیوں اور کیا تھا کہ جس کی وہ اتنی مخالفت کر رہے تھے؟ کیا وہ یہی بات تھی کہ آپ نماز کیوں پڑھتے ہیں؟ نماز پڑھنے والے تو اسلام سے پہلے خود ان کے ہاں موجود تھے' جنہیں حنیف کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا دعویٰ تھا کہ ہم ملتِ ابراہیمی کی پیروی کرتے ہیں۔ ملتِ ابراہیمی کی نسل میں سے ہونے کا دعویٰ تو یہ سارے قریش یا یہ عرب بھی کرتے تھے۔ ان کے اندر ایسے بھی تھے جن کا یہ کہنا تھا کہ ہم ملت ابراہیمی کی پیروی کرتے ہیں' اور وہ بت پرست نہیں تھے بلکہ وہ اپنے زعم کے مطابق خدا کی عبادت کرتے تھے جیسے ہم کرتے ہیں۔ ان کے اندر بھی آپ ﷺ کی مخالفت کرنے والے تھے لیکن انہیں تو یہ کچھ نہیں کہتے تھے۔ کیا یہ حضور ﷺ کی ہی ''نماز'' ایسی تھی جس پر ان کی مخالفت تھی؟ اِن کی کیفیت یہ تھی کہ تیرہ سال مکی زندگی کے بعد سات سال مدنی زندگی میں یہ لوگ میدانِ جنگ تک چلے گئے۔ خون ریزیاں کیے جا رہے ہیں تو آخر اس کی وجہ کیا تھی۔ دراصل حضور کی نماز (نظامِ حیات) سے تو اُن کا سارا خود ساختہ نظام الٹ رہا تھا چنانچہ ان لوگوں کی مخالفت اس قدر شدید تھی کہ آپ اپنے Followers یعنی ساتھیوں کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے۔ اِس کے باوجود پھر یہ کیا تھا کہ یہ یہاں مکے سے اٹھ کر لشکر لے لے کر' وہاں مدینہ منورہ چلے گئے۔ کیوں؟ کہ وہاں نماز نہ پڑھیں؟ ارے تمہیں ان کی اس نماز سے کیا ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! انہیں پتہ تھا کہ یہاں ہی نہیں اگر کسی جگہ بھی یہ نظام قائم ہو گیا تو آس پاس میں کسی جگہ بھی باطل کا نظام باقی نہیں رہ سکے گا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ یہ نظام کہیں بھی قائم نہ ہو۔ کیا تھا قریش کا نظام' ایران کا نظام' رومن کا نظام؟ آپ کو معلوم ہے کہ مدنی زندگی کے اندر ان کے ساتھ ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ اتنی بڑی قریش کی قوت اور یہ اس قدر قلیل التعداد: نہ سامان موجود' نہ کوئی پورے ہتھیار موجود' پناہ گزینوں کی طرح مدینے میں آ کے بیٹھے ہوئے' دوسرے ہی سال انہوں نے ہجوم کر کے حملہ کر دیا۔ حالات تو ایسے' اور حضور ﷺ روما کے شہنشاہ' ایران کے شہنشاہ' حبشہ کے بادشاہ' کو چٹھیاں لکھ رہے ہیں۔ کیا بات ہے ان حالات میں! آپ ﷺ نے لکھا تھا کہ ہمیں معلوم ہو رہا ہے کہ تمہارے ہاں کے مزدوروں اور کسانوں کے اوپر ظلم ہو رہا ہے' اس سے باز آ جاؤ' ورنہ ان کے ظلم کا بدلہ تم سے لیا جائے گا۔ یہ چٹھی لکھی جا رہی ہے' اس کی طرف سے' مدینے میں جو کہ پناہ گزینوں کی حیثیت رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ہے پیغامِ نبوی' یہ ہے انقلابِ محمدی' یہ ہے یقینِ محکم! یہ کچھ ان حالات میں لکھا جا رہا تھا جب نظر آتا تھا کہ شاید قریش کے مقابلے میں' یہ زندہ بھی نہ رہیں۔ یہ کچھ شہنشاہوں کو لکھا جا رہا تھا۔ کون تھے یہ شہنشاہ؟ یہ تھے رومن شہنشاہ' ایران کے کسریٰ' روما کے قیصر' حبشہ کے نجاشی۔ یہی ارد گرد تھے اور پھر

رومن اور ایران کی Empire (سلطنت) کا آپ تاریخ سے پوچھیے۔صدیوں سے' دنیا میں' یہ دو ہی مملکتیں' یہ دو ہی تہذیبیں تھیں۔ یہ کچھ انہیں کہا جا رہا تھا اور جو کہا گیا اسے پھر کر کے بھی دکھا دیا: دونوں مملکتوں کا نظام الٹ کے دکھا دیا۔ یہ تھی وہ صلوٰۃ' عزیزانِ من! جو یہ قریش جانتے تھے' سمجھتے تھے کہ ''قیامت ہا کہ در قد قامتِ اوست''۔ یہ ہمارے ہاں قد قامت الصلوٰۃ نماز کے وقت جماعت کے کھڑے ہونے پر کہا جاتا ہے۔ مفکرِ قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے کہ اس دور کا یہ بیچارہ سطحی نگاہ والا یہ مسلمان کیا جانے: کہ یہ قیامت ہا کہ در قد قامتِ اوست کیا ہے؟

قد قامت صلوٰۃ کا قرآنی مفہوم

اس صلوٰۃ کے متعلق' جب یہ کہا گیا کہ یہ قیام اس صلوٰۃ کا ہے تو اس میں جو قیامتیں پوشیدہ ہیں' وہ آنکھوں والے جانتے ہیں۔ وہ قریش جانتے تھے کہ اس ''قد قامت'' کے اندر کیا قیامتیں پوشیدہ ہیں: نہ ان کا نسبی تفاخر باقی رہ سکتا تھا' نہ ان کی تجارت باقی رہ سکتی تھی' نہ مدینے میں ربوٰ۔ یہودیوں کا سارا کاروبار ربوٰ پہ تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ کچھ نہیں باقی رہ سکتا: نہ ملوکیت رہ سکتی ہے' نہ کسی انسان کا اختیار رہ سکتا ہے' نہ کوئی حکومت باقی رہ سکتی ہے۔ یہ انقلاب ہے' یہ زندگی کے ہر شعبے میں الٹ کے رکھ دینے والی بات ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر یہ انسانیت ساز انقلاب آ گیا اور اگر انہوں نے غلاموں تک کو بھی اٹھا کے کسی بڑے سے بڑے قریشی کے ہم مرتبہ رکھ دیا تو پھر کوئی بھی جگہ ایسی نہیں ہوگی جہاں یہ انقلاب مؤثر نہ ہو سکے۔ وہ اس کو جانتے تھے۔ یہ تھا' عزیزانِ من! وہ پروگرام۔ اب اس لحاظ سے ہجرت کے معنی ہی یہ تھے کہ اب پروگرام کی دوسری منزل شروع ہو رہی تھی۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس انقلاب کے لیے پھر للکار کر آواز دی جا رہی تھی۔

تفسیروں کی رو سے مزمل کی تفصیل

عزیزانِ من! یہاں سے وہ پہلی بات شروع ہوتی ہے جہاں کہا تھا: يَـٰٓأَيُّهَا ٱلْمُزَّمِّلُ (73:1)۔ خدا کی طرف سے کیا خطاب ہے! قبل اس کے کہ میں بتاؤں کہ خدا کی طرف سے یہ کیا خطاب تھا' اپنی تفسیروں کی طرف' روایات کی طرف' ترجموں کی طرف آ جائیے۔ ان میں لکھا ہے: اے کملی اوڑھنے والے! یہ ترجمہ ہے جی' يَـٰٓأَيُّهَا ٱلْمُزَّمِّلُ (73:1) کا۔ اے کملی اوڑھنے والے! کیا بات ہے؟ پھر جب یہ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلْمُزَّمِّلُ شاعروں کے ہاتھ چڑھا' جب یہ قوالوں کے ہاتھ میں گیا' تو آپ سوچ لیجیے کہ یہ کیا سے کیا ہو گیا۔ عزیزانِ من! اس ہزار سال کی ملوکیت میں ساری سازش یہ تھی کہ قرآن کے انقلابی پیغام کی طرف امت کی نگاہ نہ اٹھنے پائے: مست رکھو ذکر و فکر و صبحگاہی میں اسے۔

مقامِ نبوت‘ مقامِ وحی اور تصوف کی حقیقت

شریعت تو ایک طرف رہی‘ تصوف بھی در آیا۔ نبوت کے متعلق خود خدا نے رسول اللہ کو یہ بتایا تھا کہ اے رسول! تو ایک دن پہلے تک جانتا نہیں تھا کہ تجھے یہ وحی ملنے والی ہے۔ یعنی اِس وحی کا خدا کی طرف سے دیا جانا ایک ایسا علم تھا جس کے متعلق تجھے ایک ثانیہ پہلے پتہ ہی نہیں تھا کہ تجھے یہ علم ملے گا‘ چہ جائیکہ تو اس کے لیے کچھ تیاریاں کرتا‘ کچھ کوششیں کرتا‘ کچھ مشقتیں کرتا کہ تجھے یہ مل جائے۔ تجھے تو علم بھی نہیں تھا کہ تجھے یہ ملے گا۔ یہ تو وہ علم ہے جسے وہبی علم کہتے ہیں‘ وہ نازل ہونا ہوتا ہے‘ نیچے سے اوپر نہیں آنا ہوتا‘ اندر سے باہر نہیں آنا ہوتا‘ یہ اوپر سے آتا ہے‘ خارج سے آتا ہے‘ یہ ملتا ہے۔ لفظ نزول نے وحی کی یہ ساری حقیقت بیان کر دی ہوئی ہے۔ یہ لفظ نزول ہے‘ یہ نازل ہوتا ہے‘ لیکن یہاں تصوف‘ شریعت‘ طریقت میں کیا کہا جا رہا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ تصوف میں ریاضتیں ہوتی ہیں‘ جن سے اولیائی کا مرتبہ ملتا ہے۔ وہ کیا ہوتی ہیں؟ تصوف میں چلے ہیں‘ مراقبے ہیں‘ ریاضتیں ہیں۔ میں یہ آپ بیتی کہہ رہا ہوں۔ یہ گنہگار آپ کے سامنے موجود ہے۔ کیسے ہوتا ہے وہ؟ کہ جی‘ وہ ذرا سا پانی لیا‘ تھوڑا سا کچھ کھانے کو لیا‘ کسی غار میں جا کر بیٹھ گئے۔ چالیس چالیس دن تک وہ کسی غار میں جا بیٹھے۔ اُس دَور میں غاریں تو ہوتی نہیں تھیں۔ ہم حجروں میں ہی بیٹھا کرتے تھے‘ انہیں غاریں بنا لیا کرتے تھے۔ غار میں‘ تو خیر پہلے ہوتا ہی اندھیرا ہے‘ ان حجروں میں تو دروازے تھے‘ روشنی آتی تھی‘ انہیں بند کر لیتے تھے کہ کہیں سے روشنی کی کرن نہ اندر آنے پائے۔ جتنی تاریکی زیادہ ہوگی‘ بس اتنا ہی نور زیادہ آئے گا۔ وہ جا بیٹھتے تھے جی غاروں میں۔ تصوف کی اولیائی کا یہ طریقہ ہے۔ وہاں جا کر مراقبے میں بیٹھتے تھے۔ یہ وہی ہے جسے گیان دھیان کہتے ہیں۔

ہر جگہ پر تصوف کی ایک ہی شکل ہے

تصوف خواہ عیسائیوں میں ہے‘ خواہ ہندوؤں میں ہے‘ خواہ یہودیوں میں ہے‘ خواہ مسلمانوں میں ہے‘ اس کا ایک ہی طریقہ ہے: اسی طرح سے‘ گیان دھیان میں‘ تاریکیوں کی ریاضتوں میں‘ مراقبوں میں بیٹھنا۔ اب تصوف میں‘ جو یکسر ایک غیر اسلامی تصور تھا‘ کو سند دینے کے لیے کہا کہ رسول اللہ ﷺ بھی نبوت ملنے سے پہلے‘ یہ آپ کی روایات‘ آپ کی احادیث میں‘ متفقہ طور پر آتا ہے کہ تھوڑے سے ستو‘ تھوڑا سا پانی لے کر‘ غارِ حرا میں چلے جاتے تھے۔ وہاں جا کر چالیس چالیس دن بیٹھے رہتے تھے۔ ذرا سوچیے! حرا کی غار ہے۔ اس کی زیارت کرنے کا مجھے بھی شرف حاصل ہوا ہے۔ یہ خاصے اونچے پہاڑ میں ہے۔ اس کا راستہ بڑا ہی دشوار گزار ہے۔ اس میں کہیں الگ سی اتنی سی جگہ ہے‘ یہاں یہ کہتے ہیں کہ آپؐ جا بیٹھتے تھے۔ غار کا یہ تصور تو انہوں نے لیا ہی ہندوؤں سے ہے۔ بہر حال یہ کہتے ہیں کہ جی! وہاں آپ چلے جاتے تھے: تھوڑے سے ستو اور تھوڑا سا پانی لے کر۔ چالیس دن تک وہیں رہتے تھے۔ سیدھی سی بات ہے کہ پھر غار میں کیا کرتے تھے۔

علم لدنی کے حصول کے لیے کوشش

اب یہی چالیس دن تک غارِ حرا میں بیٹھنا ان کی سند آ گئی۔ یہ اپنے مراقبوں کی سند اس سے لیتے ہیں کہ یہ تو سنتِ رسول اللہ ﷺ کا اتباع ہے۔ اچھا جی! تم نے یہ ریاضتیں کیں، یہ کوششیں کیں، یہ مراقبے کیے تو پھر تمہیں یہ اولیائی آ گئی، تمہیں علم حاصل ہو گیا۔ اسے یہ لوگ علمِ لدنی کہتے ہیں یعنی وہ علم جس میں انسان کی اپنی کوشش کا دخل نہ ہو، جو خدا کی طرف سے ملے۔ یہ ہے تصور۔ تو اسی کو تو وحی کہتے ہیں، مگر ہم کہتے ہیں کہ ہم اسے وحی نہیں کہتے۔ اس کو علمِ لدنی کہتے ہیں۔ تو گویا انسان کی اس کاوش اور کوشش سے یہ حاصل ہوتا ہے۔ بعینہٖ اسی مقام کے اوپر انہوں نے نبی کو رکھ دیا کہ حضور ﷺ بھی اسی طرح سے جا کر چلے کیا کرتے تھے اور ایسے چلے کے بعد، اس کے نتیجے میں، علمِ لدنی ملتا تھا۔ اس طرح حضور ﷺ کو ایک روز اس غار میں وحی مل گئی (معاذ اللہ)۔

چادر کے اوڑھنے پر پیش کردہ روایت

عزیزانِ من! بات میں مزمل کی کر رہا تھا۔ اب اس کے لیے دو تین قسم کی روایتیں ملتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ قریش نے ایک دفعہ جمع ہو کر یہ کہا کہ (معاذ اللہ، معاذ اللہ) اس شخص کا کچھ نام رکھنا چاہیے، اسے اس کے اصل نام سے نہیں بلانا چاہیے۔ یہ نام ایسا رکھنا چاہیے جس میں (معاذ اللہ، معاذ اللہ) کچھ نفرت کا پہلو نکلے تو ہم وہی نام لیا کریں تو سمجھ جایا کریں کہ کس کے متعلق آپس میں بات کی ہے۔ کسی نے کہا: اسے کاہن کہا جائے، کسی نے کہا: اسے شاعر کہا جائے، کسی نے کہا: اسے مکذب کہا جائے۔ تو اس روایت میں آگے یہ ہے کہ یہ باتیں سن کر حضور ﷺ بڑے مغموم ہوئے، افسردہ خاطر ہوئے۔ اس کی وجہ سے، اسی افسردگی کے اندر، غم آلودگی کے اندر، بہت مایوسی کی حالت میں، آپ ﷺ ایک چادر اوپر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ وہ چادر کمبل کی ہو سکتی ہے۔ اس زمانے میں کمبل ہی ہوتے تھے کہ اتنے میں جبریل آئے۔ تو انہوں نے جب آ کے دیکھا تو کہا: او کملی والے! عزیزانِ من! آپ نہ ہنسیے۔ اس قوم کے مقدر پہ روئیے، یہ ہے جی ان کے ہاں المزمل۔

پہلی وحی کے نازل ہونے پر روایاتی بیان

اس کے علاوہ دوسری روایات ہیں کہ نہیں، جب غارِ حرا میں پہلی دفعہ نزولِ وحی ہوا تو آپ ﷺ کے پاس جبریل آئے اور آپ ﷺ کے سامنے ایک کاغذ رکھا اور کہا کہ اقراء، پڑھ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تو پڑھنا نہیں جانتا یعنی خدا نے کچھ لکھ کر بھیجا، جبریل اس لکھے ہوئے کو لے کر آ گیا، کہا کہ اس کو پڑھ، پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ پڑھنا نہیں جانتے، (معاذ اللہ، معاذ اللہ) معافی چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے کہا تو ان کو بات سمجھ میں آئی کہ آپ ﷺ پڑھنا نہیں جانتے، تو پھر جبریل نے سینے سے لگایا، چاروں طبق روشن ہو گئے، آپ ﷺ نے فٹا فٹ پڑھنا شروع کر دیا لیکن آپ ﷺ پہ بڑی دہشت طاری ہوئی۔ اب آگے اس روایت کی بڑی لمبی چوڑی تفصیل ہے۔ یہ روایت

بخاری میں ہے۔ ہاں، تو جب جبرائیل نے آپ ﷺ کو سینے سے لگایا تو دہشت کی یہ ساری کیفیت ہی بدل گئی۔ یہ ہے وہ کیفیت جہاں سے وحی کی ابتداء ہوئی۔ تو آپ یہ ساری تفصیل اس میں دیکھیے (معاذ اللہ، معاذ اللہ) یہ کیفیت ایسے افسانوی انداز میں لکھی ہے: وہاں سے آپ ﷺ کے اوپر دہشت طاری ہوئی، آپ ﷺ کانپتے ہوئے، بھاگتے ہوئے، گھر آئے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ❶ بیوی سے یعنی ام المومنین حضرت خدیجہؓ سے کہا کہ مجھے بہت جاڑا ❷ لگ رہا ہے، میں کانپ رہا ہوں۔ مجھے کچھ لحاف اوڑھا دو، کمبل اوڑھا دو۔ تو اس دہشت میں جو آپ ﷺ وہ کمبل یا لحاف اوڑھ کے لیٹے، اس پہ خدا نے دیکھا تو پھر وہاں سے یہ کہا کہ یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ (73:1) او لحاف اوڑھنے والے! اگلی سورۃ مدثر آئے گی۔ ان دونوں (مزمل۔ مدثر) کے معنی یہی لیے جاتے ہیں۔

عزیزانِ من! مدثر پہ تو میں بعد میں آؤنگا، یہ اگلی سورۃ ہے، یہ مزمل تو ہمارے سامنے ہے۔ چار لفظوں میں اگلی بات بھی میں بتادوں تاکہ یہ پوری کہانی ظاہر ہوجائے۔ حضور ﷺ نے اپنی بیوی حضرت ام المومنینؓ سے یہ کہا اور انہوں نے تسلی دی کہ آپ کیوں ڈر رہے ہیں، آپ تو بڑے نیک انسان ہیں، غریبوں کی ہمدردی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو ایسی حالت میں نہیں چھوڑے گا جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔ پتہ تو نہیں ہے کہ یہ کیا ہے جو آپ کے ساتھ ہوا ہے۔ نہ آپ کو پتہ ہے، نہ ان کو پتہ ہے۔ معلوم ہی نہیں کہ ہوا کیا ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ایک چچازاد بھائی تھا۔ یہ عیسائی عالم تھا، ورقہ بن نوفل نام تھا۔ یہ بوڑھا آدمی تھا۔ آپ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں کہ چلو اس کے پاس چلتے ہیں، اس سے پوچھتے ہیں۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ نبوتِ محمدی کے متعلق عیسائی راہب کے پاس جا رہے ہیں۔ بیوی، ہانپتے کانپتے، حضور ﷺ کو معاذ اللہ، معاذ اللہ، میں ہر بار معاذ اللہ کہے جاؤنگا، آپ ﷺ کو وہاں لے گئی۔ وہ جنہوں نے یہ افسانے بنا دیئے مقامِ نبوت کو جانتے ہی نہیں تھے۔ وہ راہب بات سن کر کہتا ہے کہ افوہ! یہ جو آپ کے پاس آیا ہے، یہ تو وہی ناموس ❸ تھا، جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا، جو عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا، خدیجہ مبارک ہو، انہیں تو نبوت ملنے والی ہے۔ یہ کچھ وہ راہب بتا رہا ہے۔ تو جب اسے یہ یقین ہوگیا کہ یہ نبی ہیں، یہ وہی جبریل آیا ہے تو اس عیسائی راہب کو بیعت کرنے کے لیے سب سے پہلے ہاتھ بڑھانا چاہیے تھا! وہ راہب آخر تک مسلمان نہیں ہوا۔ عزیزانِ من! آگے، زبان زیب نہیں دیتی جو میں کہوں کہ اس میں سازش ہے۔ دیکھیے! یہ مبارک باد دے رہے ہیں اور جنہیں یہ نبوت مل رہی ہے جن کے پاس جبرائیل آ رہا ہے، انہیں اُس راہب کے کہنے پر کچھ ہو رہا ہے کہ ہاں کچھ ایسی ہی بات نظر آتی ہے، اب بیوی بھی راہب کے کہنے پہ مان رہی ہے، اور اُس عیسائی راہب کے پاس چلے آ رہے ہیں۔ کیا بتایا جائے! یہ ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' ہے یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ❹ کی یہ کتاب، صحاح ستہ تو چھ کتابیں ہیں، ان میں سرِ فہرست ہے۔ یہ بخاری کی پہلی حدیث ہے اور اتنی تفصیل

---

❶ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا انتقال 10 نبوی کو ہوا (حوالہ: پرویزؒ: معراجِ انسانیت، ادارہ طلوعِ اسلام، کراچی، 1949، ص۔ 247۔)

❷ سردی ❸ حضرت جبرئیل کا لقب

❹ امام محمد اسماعیل بخاری بخاریؒ (260 یا 256۔194 ھ) وطن بخارا، آپ نے کل چھ لاکھ احادیث جمع کیں۔ ان میں سے مکررات حذف کرنے کے بعد 2762 اپنے مجموعے میں درج کیں۔

سے لکھی ہوئی ہے کہ اس پر دو تین صفحے بھرے ہوئے ہیں۔ان کے ہاں وحی کی ابتداء اس طرح سے ہوئی۔ یہ مزمل اور مدثر کی تفسیر آ گئی: او کملی والے! اولحاف اوڑھنے والے! اور یہ دونوں تفسیریں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ قرآن سمجھنا ہو تو احادیث کی رو سے سمجھیے۔عزیزانِ من! غور کرنے پر یہ معلوم ہو جائے گا کہ نبی اکرم جس عالمگیر دعوت کو لے کر آئے تھے اس میں ایک انقلاب تھا اور اس انقلاب کے لیے پہلی چیز ایک جماعت کی تشکیل تھی رفقاء کی تشکیل تھی۔سیدھی سی بات ہے کہ یہ اتنا عظیم القدر پروگرام تھا اس میں قیامت خیز انقلابی تبدیلیاں تھیں جو اس سے رونما ہونی تھیں۔پہلی چیز یہ تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ جنہیں ہم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کہتے ہیں وہ ایمان لائے تھے حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ظاہر ہے کہ اس قسم کا جو پروگرام سامنے تھا اس کے لیے جماعت سازی میں بھی ایک اور قسم کی ترتیب چاہیے تھی اور ایک آہنگ (Harmony) چاہیے تھا ایک کمانڈ (Command) چاہیے تھی۔اس نکتہ نگاہ سے بھی ہمارے ہاں بعض احباب نے نبی اکرم ﷺ بحیثیت کمانڈران چیف تحقیق کی ہے۔ عسکریت تو میرا موضوع نہیں لیکن انہوں نے جو ایک ایک جنگ میں تحقیق کی ہے تو جو بتایا گیا ہے اس میں بدرجہ اتم آپ ﷺ کی کمانڈ کی صلاحیتوں کے بارے میں کہا گیا ہے۔ میں نے بھی اس موضوع پر بہت لکھا ہے کہ میدانِ جنگ کے اندر نبی اکرم ﷺ بے نظیر کمانڈنٹ نظر آتے ہیں لیکن عزیزانِ من! اس مرحلے سے پہلے بہر حال ایک مرحلہ جماعت سازی کا تھا کہ کس کے ساتھ کس کو کھڑا کرنا تھا۔

مزمل کا قرآنی اور لغوی مفہوم

اب سنیے کہ یہ مزمل کیا ہوتی تھی۔عربوں کے ہاں قافلے چلتے تھے اونٹوں کے اوپر سواری ہوتی تھی اونٹ کا ایک کجاوہ ہوتا ہے کجاوے میں دائیں بائیں دو سواریاں بیٹھتی ہیں۔اب یہ جو میر کارواں ہوتا تھا اسے بہت سی باتوں کا خیال رکھنا ہوتا تھا۔وہاں ماہر موجود تھے۔ان میں سے بعض ایسے تھے جو بڑے ہی Expert (ماہر) تھے ان کی بڑی شہرت تھی۔کیا بات تھی اس میں!! کہ ہر اونٹ پر دو سواریاں اس قسم کی بٹھائی جائیں کہ ان میں پہلی چیز تو یہ ہو کہ وہ ہم وزن ہوں ان کا وزن توازن میں رہے اور اس کجاوے کا توازن برقرار رہے۔ٹھیک بات ہے۔اس کے برعکس اگر ایک طرف ایک بڑا سا پہلوان بٹھا دیں اور دوسری طرف ایک منحنی سا کوئی کم وزن بٹھا دیں تو آپ سوچیے کہ اس اونٹ کا کیا حشر ہوگا ان سواریوں کی کیا کیفیت ہوگی۔ یہ چل ہی نہیں سکیں گے۔پہلی چیز تو یہ ہوتی تھی۔لیکن یہ تو تھی Physical طبعی چیز۔آخری چیز یہ ہے کہ یہ مہینوں کا سفر ہوتا تھا یہ دو ہی ایک اونٹ پہ بیٹھے ہوئے ہوتے تھے انہوں نے آپس میں باتیں کرنا ہوتی تھیں۔تو دوسری چیز وہ میر کارواں یہ دیکھتا تھا کہ ان دو سواریوں کے باہمی وزن کے علاوہ ان کے مزاج اور ذوق میں بھی کامل ہم آہنگی ہونی چاہیے۔لہٰذا اس سوچ کے تحت اس طرح کے دو رفقاء کا انتخاب کرنا کہ جن میں اس طرح کی کامل ہم آہنگی ہو اس میر کارواں کا اہم کام تھا۔اس لحاظ سے وہ جو دو آپس میں ایک ہی کجاوے میں بیٹھے ہوتے تھے یہ عرب ان کو ایک دوسرے کا ''زمیل'' کہتے

تھے اور یہ جو اس طرح سے سواریوں کو تیاریاں کر کے بٹھاتا تھا اسے مزمل کہتے تھے۔ پتہ نہیں ان مفسرین کو کیا ہو گیا!! آج بھی اس کے یہی معنی ہیں۔

عزیزانِ من! مجھ پہ خدا نہ کرے کوئی وحی تو نازل نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے لغت [1] میں جو کچھ لکھا ہے اس کے ایک ایک معنی کے لیے انہی کی لغاتوں کے حوالے دیئے ہیں۔ وہ آج بھی ان رفیقوں کو ''زمیل'' کہتے ہیں۔ اس قسم کے رفیق جو کامل ہم آہنگ ہوں، ایک دوسرے کیساتھ یک رنگ ہوں۔ انہیں وہ آج بھی زمیل کہتے ہیں۔ اس قسم کے کارواں کی تیاریاں کرنے والے کو جس میں ان صلاحیتوں کے انتخاب کی بڑی شدت ہو وہ آج بھی مزمل کہتے ہیں۔ تزمل اس عمل (Process) کا نام ہوتا ہے جس میں اس قسم کی جماعت تیار کرنے والے، اس قسم کے رفقاء تیار کرنے والے ہوں، جو ایک دوسرے سے کامل ہم آہنگ ہوں۔ پہلی چیز اس انقلاب آفرینی کی مہم کے لیے اس قسم کی جماعت تیار کرنی تھی اور اس کی ابتداء نبی اکرم ﷺ نے کی کہ کون کس کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ عسکریت کے ماہر میرے جو بھائی یہاں میرے سامنے بھی بیٹھے ہیں، وہ اس کی اہمیت پہچانتے ہونگے کہ میدانِ جنگ کے اندر ایک دوسرے کیساتھ کھڑے ہونے والے کس قسم کے ہونے چاہئیں اور اس کے اندر کیا بات ہے۔ ایک کمانڈر کی یہ کتنی بڑی خوبی ہے کہ وہ اس قسم کے رفقاء تیار کرے۔ اس قسم کی جو جماعت تھی ان میں سے ہر فرد ایک دوسرے کا زمیل کہلاتا تھا۔ ایسا کرنا عملِ تزمیل کہلاتا تھا۔ اس عمل کرنے والے کو مزمل کہتے تھے۔ اس کی ابتداء اس قسم کی جماعت سازی سے ہوئی۔ اس کے لیے قرآن میں ہے کہ خدا نے حضور ﷺ کو، آپ ﷺ کی اس خصوصیت کی بناء پہ **يَآَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ** (73:1) او جماعت تیار کرنے والے کہا!

کمر توڑ دینے والا پروگرام

عزیزانِ من! نظر آتا ہے کہ یہ پروگرام بڑا مشقت طلب تھا، بڑا ہمت طلب تھا، بڑا اجرأت آزما تھا، حوصلہ شکن تھا، جسے کہتے ہیں کہ استخواں شکن، کمر شکن، کمر توڑ دینے والا پروگرام تھا۔ اس کے تین ہی آیتوں کے بعد آیا ہے کہ **اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا** (73:5) وہ پروگرام تمہارے ذمہ لگایا جا رہا ہے جس سے تمہاری کمر ٹوٹ جائے گی۔ سورۃ الم نشرح میں آگے چل کر آئے گا کہ **اَلَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ** خدا نے آہستہ آہستہ تمہارے رفقاء کی ایک جماعت پیدا کر دی اور اس طرح تمہارا وہ بوجھ بھی ہلکا ہو گیا۔ عزیزانِ من! دیکھا کہ جب یہ کامیابیاں ہو گئی تھیں، فتح ہو گئی، معرکے سر ہو گئے تو اس وقت کہا تھا کہ دیکھا خدا نے کس طرح اس بوجھ کو تمہارے اوپر سے اٹھا دیا جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی۔ یہ تھا پروگرام نبی اکرم ﷺ کے ساتھ۔ اتنا بڑا پروگرام، اس قدر تصادمات اور

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء، ص۔ 154-155، نیز فٹ نوٹ نمبر 2۔

Confrontation (ٹکراؤ)! خود قریش ہی ''مان'' نہیں تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ یہ عرب اور عجم کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ اور مقابلے میں ان چار خس وخاشاک کی ایک جماعت جو کامل ہم آہنگی کے ساتھ اکٹھی ہوئی ہے۔ سوچیے تو اس سربراہ' اس کمانڈر ان چیف' اس انقلابی لیڈر کی اس کے اوپر کتنی بڑی ذمہ داری تھی' دن بھر اس پروگرام کی تکمیل کے لیے تگ وتاز میں گزرتا: اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا ❶ (73:7)۔

عزیزانِ من! اب تو سبح کے معنی ہمارے ہاں تسبیح ہو جاتی ہے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ دن میں جو تمہیں اتنی تگ وتاز کرنا پڑتی ہے' بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے' سرگردانی ہوتی ہے' وہ بہت زیادہ ہوتی ہے' راتوں کو کچھ سوچ بھی لیا کر۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے۔ نظر آتا تھا کہ دن بھر اس پروگرام پہ سوچ بچار کی جاتی تھی' اس کو Execute (نافذ) کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا ہوگا۔ خدا خود یہ کچھ کہہ رہا ہے کہ اس عسکری مہم کی تیاریوں میں اس قدر مصروف! ہمیں معلوم ہے کہ دن بھر تجھے کس قدر مشقت طلب پروگرام ہوتا ہے' اُس سے انسان تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں رات کو' دن بھر کی اس تمام کاروائی پہ غور کرنا ہوگا' اس پر Review (نظر ثانی) کرنا ہوگا' کل آنے والے پروگرام کی تیاریاں کرنا ہونگی۔ دن بھر کی تگ وتاز کے بعد پھر اس کے لیے رات آتی تھی' راتوں کو یہ غور وخوض کرتے تھے۔ انہماک کی یہ کیفیت تھی اور واقعی جس کے سامنے اتنی بڑی ذمہ داری ہو اور اس کی جذب وکشش کی یہ کیفیت ہو' پھر وہ کھانا پینا سونا جاگنا جانتا ہی نہیں ہے لیکن یہ بھی بڑی ضروری چیز ہے اور یہ بھی واقعی ٹھیک بات ہے کہ کھانے پینے کی بھی ہوش نہیں رہتی۔

عزیزانِ من! اب یہاں ایک چھوٹی سی بات درمیان میں آ گئی۔ 1965ء کی انڈو پاک (Indo- Pak) کی جنگ کے اندر میں بھی قصور کے محاذ پر محاذ دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ اس کا ذکر طلوع اسلام میں کیا گیا ہے۔ وہاں جو کھڑے تھے۔ وہ یہ تھے جنہوں نے تین دن اور تین راتیں اس محاذ کے اوپر کھڑے ہو کر جنگ لڑ کے فتح کیا تھا۔ تو میں ان سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ وہاں ہمارے ہاں کے ضلع میانوالی وغیرہ کے وہ جمعدار یا صوبیدار تھے۔ میں نے اس سے پوچھا: تین دن اور تین راتیں تم لوگ میدانِ جنگ میں کھڑے رہے ہو تو کچھ کھانے پینے میں بھی لیا؟ میں پنجابی میں بتاتا ہوں: کچھ کھان پین واسطے وی لیا۔ اوکین لگا کہ میاں صاحب! کھانا پینا تے کم ویلیاں دا ہوندااے۔'' ❷ یہ پوٹلیاں ہمارے پاس تھیں' پانی کی وہ کپیاں بھی ہمارے پاس تھیں' تین دن تین راتیں کس کو خیال آتا تھا کھانے اور پینے کا؟ ''اوہدے لفظ ساری عمر مینوں یاد رہن گے کہ کھانا پینا تے کم ویلیاں دا ہوندااے۔'' ❸

---

❶ پھر یہ بھی ہے کہ دن میں تجھے مخالفتوں کے ہجوم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں تیرے سامنے اتنے کام ہوتے ہیں کہ تجھے سارا سارا دن سرگرداں رہنا پڑتا ہے (لہٰذا جن امور کے لیے قدرے سکون کی ضرورت ہو' ان کے لیے دن میں وقت ہی نہیں مل سکتا۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ کیا کچھ کھانے پینے کو بھی لیا؟ اس نے کہا کہ میاں صاحب! کھانا پینا تو ان کا کام ہے جو کام سے فارغ ہوتے ہیں۔

❸ اس کے وہ لفظ مجھے تاحیات یاد رہیں گے کہ ''کھانا پینا تو فارغ لوگوں کا کام ہوتا ہے۔''

خدا کو بھی یہ کہنا پڑا

عزیزانِ من! میں اب سمجھتا ہوں کہ یہ کیا کیفیت تھی کہ خدا کو یہ کہنا پڑا کہ قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا (73:2) راتوں کو کچھ سو بھی لیا کر۔ یہ ہے مقامِ رسالت، عزیزانِ من! اور کیا یہ آپ کو معلوم ہے کہ پھر آپ کے ہاں اس آیت کی تفسیر کیا ہوئی: قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا (73:2) کہ جی: یہ نبی اکرم ﷺ رات بھر اتنے نفل پڑھا کرتے تھے کہ حضور ﷺ کے پاؤں سوج جایا کرتے تھے۔ نفل پڑھا کرتے تھے!! صبح کو جس نے جنگ لڑنی ہے، وہ ساری رات نفل پڑھتا رہے گا کہ پاؤں سوج جائیں؟ کس مقام پہ انہوں نے پہنچا دیا: یہ رسالت اور نبوت سمجھ ہی نہیں سکے۔ مذہب میں سمجھا ہی نہیں جا سکتا کہ دین کے تقاضے کیا ہوتے ہیں اور جو دین کا علمبردار ہے اسے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہی سمجھ سکتا ہے کہ دن بھر میں جو کہا ہے کہ سبحاً طویلاً کہ تم نے لمبی لمبی تسبیحاں پڑھنی ہوتی ہیں۔ وہاں تسبیحاں آ گئیں۔ رات کو جو ساری رات آپ ﷺ کا جاگنا ہوتا تھا، وہاں آ گیا کہ آپ ساری رات نفل پڑھا کرتے تھے اور اس کے بعد پھر آپ دیکھ لیں گے، آپ کو اولیاء کرام کے تذکرے ملیں گے۔ یہ باتیں میں نے "طلوعِ اسلام" میں اور "تصوف کی حقیقت" میں شائع کی ہیں کہ فلاں صاحب جناب! رات بھر میں دو ہزار رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ ذرا حساب کر کے دیکھیے تو سہی کہ ایک رکعت میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے تو پھر رات میں گنیے تو سہی کہ کیا ایسا ہوتا بھی ہے؟ وہ کہنے لگے: "لوحساب کتاب۔ اے مقام اوئیں، جتھے حساب کتاب ہوندا ہیگا کہ نفل بغیر حساب کتاب او پڑھدے سن، تے دو ہزار کیویں گن لیا تسی فیر، لیکن اوتھے تے عقل دی گل کرنا تے کفر ہوندا اے۔"[1] بہر حال اس آیت کا ترجمہ یہ ہو گیا کہ حضور ﷺ رات بھر نفل پڑھتے تھے، پاؤں سوج جایا کرتے تھے۔ لیکن قرآن میں خدا کہتا ہے کہ اس انقلاب کے لیے افراد کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ دن میں تجھے فرصت کم ہو گی اس لیے اس مقصد کے لیے رات کو بھی جاگنا ہو گا لیکن ساری رات نہیں نِصۡفَہٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡہُ قَلِیۡلًا ۙ اَوۡ زِدۡ عَلَیۡہِ (73:3-4) آدھی رات تک اور اگر کبھی دیکھو کہ کام زیادہ ہے، تو تھوڑا سا بڑھا لیا کرو، اگر کام تھوڑا سا کم ہے تو اور بھی کم کر لیا کرو۔ وہ کیوں؟ اس لیے کہ اِنَّ لَکَ فِی النَّہَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا (73:7) دن میں جو تمہیں پروگرام ہے، وہ بہت لمبا چوڑا ہے۔ اس کے لیے تجھے سارا سارا دن سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح سے آیات کا ربط ملتا ہے۔ کیا پروگرام ہے جو دیا جا رہا ہے؟ یہ کہ یٰۤاَیُّہَا الۡمُزَّمِّلُ (73:1) اے رسول! فریضۂ رسالت کی عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے بعد، تیرے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ تو ایسے رفقائے سفر تیار کر جن میں کامل ہم آہنگی اور یک رنگی ہو۔ اب عظمت کھلی اس بات کی، عزیزانِ من! کہ یہ کیا کہا گیا تھا۔ اور آگے ہے کہ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ

---

[1] لو! اِسے اس کا حساب دو۔ یہ وہ مقام نہیں ہے کہ جہاں حساب کتاب ہوتا ہے۔ اگر وہ بے حساب نفل پڑھتے تھے تو پھر آپ نے کیسے گن لیا کہ دو ہزار نفل پڑھتے تھے۔ لیکن وہاں تو عقل کی بات کرنا ہی کفر ہوتا ہے۔

تَرۡتِیۡلًا ❶ (73:4)۔

وقت ہوگیا ہے اور یہ بات بھی ایسی ہے کہ تھوڑی سی فرصت چاہتی ہے' سکون واطمینان سے باتیں کریں گے۔ ہم تو باتیں ہی کریں گے' عزیزانِ من! نہ یہ پروگرام دیکھیے نہ ان کی سمجھ میں ہماری بات آئی' زور سارا یہی ہے کہ نماز پڑھ لیا کرو' رات بھر نفل پڑھا کرو' دن بھر تسبیح پھیرا کرو' سارا کچھ ہوجائے گا۔ انہوں نے کہا کہ یہی مقام نبوت تھا' یہی مقامِ رسالت تھا' یہ اصلیت کو کیا جانیں۔ ہم نے تو حقیقت کو افسانہ بنادیا ہوا ہے۔ سورۃ المزمل کی پہلی دو تین آیتیں ہی سمجھ لیجیے کہ ہم نے لی ہیں' آئندہ درس میں باقی آگے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ؕ

❀......❀❀❀......❀

---

❶ تو انہیں قرآن کو اس طرح سمجھا کہ اس کا حسنِ ترتیب اور نظم وربط' ابھر کر ان کے سامنے آجائے پھر اسی ترتیب اور نظم وضبط کے ساتھ اسے عمل میں لاتے چلے جاؤ۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سترھواں باب: سورۃ المزمل (آیات 1 تا 9)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1984ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز یوں کہیے کہ سورۃ المزمل سے ہو رہا ہے:(73:1)

انقلاب کے مقابلے میں انقلاب

سابقہ دو درسوں میں جو حقائق سامنے آئے میں نے دیکھا کہ انہوں نے سامعین کے ذہنوں میں ارتعاش پیدا کر دیا اور یہ علامت بڑی خوش آئند ہے کہ کچھ جمود ٹوٹا۔ احباب یکے بعد دیگرے آتے رہے اور ایک ہی سوال دہراتے رہے۔ اس سوال کا ملخص یہ تھا کہ قرآن کی رو سے نبی اکرم ﷺ جو انقلاب لائے وہ یقیناً بڑا حیرت انگیز تھا لیکن اس کے بعد یہ جو انقلابِ معکوس آیا' یہ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہے۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ کیسے ہوا؟ یہ واقعی بڑا اہم سوال ہے کہ یہ ہوا کیسے؟ یعنی یہی چیز جو ایک لفظ تھا کہ حضور ﷺ سے کہا گیا کہ ''قُــــمْ'': اس انقلابِ عظیم کا جھنڈا لے کر اٹھیے! اس انقلابِ عظیم کا دنیا کے اندر اعلان کیجیے۔ یہ اتنا بڑا انقلاب تھا کہ جس نے ملوکیت' سرمایہ داری اور برہمنیت کی تمام شعبدہ کاریوں کو ختم کر کے رکھ دیا اور انسانیت کو صحیح آزادی سے سرفراز فرمایا۔ اس انقلاب کے بعد یہ ملوکیت اور اس کے ساتھ یہ سب چیزیں جو مٹ گئی تھیں' وہ تمام کی تمام بارِ دیگر' پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے اسی معاشرے کے اندر' اسی امت کے اندر' اسی قوم کے اندر' آ ثبت ہوئیں۔ یہ ہوا کیسے؟

یہ ہوا کیسے؟ اس کی بنیادی وجہ کیا ہوئی؟

یہ واقعی تعجب انگیز بات ہے۔ امیہ کے دور (750-661 عیسوی بمطابق 132-41) ہجری میں تو یہ چیز ایسے نہیں ہوئی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ موروثی بادشاہت تو آ گئی تھی لیکن اس دَور میں قرآن کے سوا عربوں کے پاس کوئی اور کتاب ہی نہیں تھی۔ یہ عربی ملوکیت ہی تھی۔

اس کے بعد جو عباسیوں کا دَور (1258-750 عیسوی بمطابق 656-132) ہجری آیا ہے تو اس میں نہ قرآن باقی رہا' نہ عربیت باقی رہی۔ ان کی بادشاہت' ان کی سلطنت' ایرانیوں کی رہینِ منت تھی اور یہ ایرانی آ کر اس معاشرے پر چھا گئے تھے۔ اقبالؒ (1938-1877) جو عربی اور عجمی اسلام میں تفریق کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ عجمی اسلام کی ابتداء یہی عجم سے ہوئی تھی۔ اس کیساتھ ملوکیت اور یہ دونوں جذام' برہمنیت اور سرمایہ داری' در آئے۔ اب قرآن کی موجودگی میں' ان میں سے کسی کے لیے بھی تائید و دلیل ملنا تو ایک طرف رہا' ان کے جواز کے لیے بھی کوئی وجہ ہی نظر نہیں آتی تھی۔ قرآن کی موجودگی میں ان کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا: نہ ملوکیت کا' نہ سرمایہ داری کا' نہ برہمن کی اس مذہبی پیشوائیت کا۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا تھا۔ اس میں تو ایک لفظ کی بھی تبدیلی نہیں کی جا سکتی تھی۔

قرآن کا مفہوم بدل دیا گیا

چنانچہ اسکیم یہ سوچی گئی کہ قرآن کے الفاظ تو اسی طرح رہیں لیکن قرآن کا پورا مفہوم بدل دیا جائے۔ قرآن کے ساتھ ہی نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ تھی' وہ اس انقلاب کی زندہ شہادت تھی۔ اگر وہی روش' وہی سنت' وہی حضور ﷺ کی سیرت' ہی سامنے آتی رہی ہوتی تو بھی یہ انقلابِ معکوس کبھی نہ آتا۔ اللہ تعالیٰ نے تو یہ انتظام کیا تھا کہ قرآن دیا اور قرآن کے اندر ہی نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے اصولی خدوخال بھی دیدیئے۔ نبی اکرم ﷺ کی صحیح سیرت قرآن سے ہی مرتب ہوتی ہے اور آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں نے جو سیرت نبی اکرم ﷺ ''معراجِ انسانیت'' کے نام سے لکھی ہے اس کا انداز ہی یہ ہے کہ سرنامہ قرآن کی آیت ہے اور اس کے نیچے قرآن کے مطابق جو کچھ حضور ﷺ کی زندگی کے احوال و کوائف آتے ہیں' وہ اس کے نیچے آتے ہیں کیونکہ سیرت نبی پیش کرنے کا یہی ایک صحیح طریق ہے۔ اس کے برعکس خود ساختہ روایات کے تحت سیرت نبوی ﷺ کو کیا سے کیا بنا دیا گیا۔ میں اتنا واضح کردوں' عزیزانِ من! کہ یہ کچھ جو میں کہونگا اسے ہمارا آج کا ماحول' آج کی فضا' قبول کرنا تو ایک طرف رہا' اس کے سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوگی۔ وہ آپ احباب کی اطلاعات کے لیے بھی ہے جو میں عرض کرونگا لیکن درحقیقت میرے سامنے آنے والا مورخ ہے۔

میری ذاتی معروضات

یہ ہماری بڑی خوش نصیبی ہے کہ ہمیں یہ ایسے ذرائع میسر آ گئے ہیں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں' وہ منضبط ہو رہا ہے' ٹیپ کے اندر محفوظ ہو رہا ہے' تو میں اس وقت مخاطب کرونگا اپنے آنے والے کسی مؤرخ کو کہ آپ کے لیے اور قرآن کے لیے اگر فضا سازگار ہو جائے تو اس وقت یہ کچھ جو آج میری معروضات ہیں جنہیں میں آج پیش کر رہا ہوں' یہ آپ کے لیے نشانِ منزل بن سکیں گی کہ اس دور میں کسی نے یہ بات کہی تھی اور اس سے یہ بات آگے چل سکے گی' آج بہت مشکل ہے۔ تو جو کچھ میں آج پیش کر رہا ہوں' وہ صرف آپ احباب کے لیے ہی نہیں' آنے والے مورخ کے لیے بھی ہے۔ اقبالؒ (1938-1877) نے بھی اپنے آپ کو شاعرِ فردا کہا تھا' وہ ہوتا ہی یہ ہے قرآن پیش

کرنے والے کے لیے، ابھی تک بھی، اس کا موجودہ ماحول سازگار نہیں ہے اور اقبالؒ کے دور میں تو ابھی اتنی شدت نہیں تھی۔ آج تو مذہبی پیشوائیت کی جو شدت ہے وہ انتہا تک پہنچی ہوئی ہے، ماحول بہت پیچھے چلا گیا ہے، وہ ٹھیک کہا تھا اقبالؒ نے کہ

خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

یہ پچھلی صدی ہمارے لیے خوش بختی کی صدی تھی کہ اس میں سرسید احمد خاںؒ (1898-1817ء) جیسی شخصیت پیدا ہوئی۔ اس نے یہ جتنی بھی برہمنیت کی، مذہبی پیشوائیت کی، قدامت پرستی کی، تاریکیاں تھیں انہیں دُور کرنے کی بڑی حد تک کوشش کی اور قرآن کو اِس فضا میں لے آیا۔ فضا میں قرآن کی بات گونجی۔ اس کے بعد مفکر قرآن محمد اقبالؒ (1938-1877ء) آ گیا۔ اس نے اس کے لیے بہت کچھ کیا۔ اس کے بعد اسی روش کے اندر قائداعظم محمد علی جناحؒ (1948-1876ء) نے بھی قرآن کی بات آگے بڑھائی۔ قرآن اور صرف قرآن، یہی کچھ کہا۔ اس کے بعد آگے بات کرنے سے مجھے کچھ تھوڑی سی ہچکچاہٹ آتی ہے کہ اپنا ہی نام آ جاتا ہے۔ میں نے بھی اسی سلسلے کو آگے چلایا۔ مجھے قرآن کہتے ہوئے پچاس برس ہو گئے ہیں لیکن یہ دَور اس کے خلاف اس شدت سے ابھرا ہے کہ آج یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری۔ لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ یہ غنیمت ہے کہ یہ چیزیں محفوظ ہو رہی ہیں۔

قرآنی نظام ایرانی سازش اور عجمی سازش کا شکار ہو گیا

میں کہہ یہ رہا تھا کہ پھر ہوا کیا؟ عباسیوں کے دور (1258-750ء بمطابق 656-132ھ) میں یہ عجمی سازش جو ایرانی سازش تھی پوری شدت سے اٹھی۔ اِن ایرانیوں نے عربوں کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ انہوں نے اس شکست کا بدلہ عربوں سے ہی نہیں لینا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ سب کچھ قرآن ہی کی وجہ سے ہوا ہے تو انہوں نے یہ سارا انتقام قرآن سے لینا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس انتقام کے لیے کیا کیا جائے۔ اس کا حل یہ تھا کہ نہ قرآن اپنے الفاظ میں رہے، نہ قرآن کا مفہوم قرآنی رہے، نہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت قرآنی رہے۔ مؤرخ کے لیے یہ لمحے بڑے غور طلب ہیں کہ اس سے پیشتر آپ کے ہاں احادیث کا کوئی مجموعہ ہی نہیں تھا۔ ایک مجموعہ ہے جسے مؤطا امام مالک کہتے ہیں۔ اس میں انہوں نے صرف مدینے میں جو اصحابِ رسول ﷺ تھے، صرف ان کا جو مسلک تھا، وہی لکھا ہے۔ ان کی بھی کیفیت یہ تھی کہ وہ ہر سال اپنے اس مجموعے میں سے خود ہی روایات کم کرتے جاتے تھے۔ اس کے اندر زیادہ سے زیادہ تین سو سے پانچ سو تک روایات ہیں اور وہ مدینہ کے اصحاب کا مسلک ہے۔

روایات کے مجموعے کس طرح مرتب ہوئے

عزیزانِ من! یہ جو پھر بعد میں ہمارے ہاں مجموعے ہوئے، ان میں ایک ایک راوی کو چھ چھ لاکھ حدیثیں ملیں اور ان کا سارا مجموعہ

گنا جائے تو وہ قریباً دس لاکھ کے قریب بنتا ہے۔ اس میں سے انہوں نے منتخب کر کے ایک ایک مجموعہ مرتب کیا۔ ان میں بھی وہ ہزاروں کی تعداد کے اندر احادیث آئیں۔ ان مجموعوں میں چھ تو ایسے ہیں جن کو صحاحِ ستہ یعنی صحیح ترین قبول کیا گیا۔ پھر انہی میں سے بخاری اور مسلم دو ایسی ہیں جن کو صحیحین کہا گیا۔ یہ عجیب چیز ہے کہ یہ چھ کے چھ ہی ایرانی [1] تھے یعنی ان میں کوئی عرب محدث ایسا نہیں ہے کہ جس نے یہ جمع کی ہوئی روایات اور احادیث کے مجموعے مرتب کیے ہوں۔ ان مجموعوں کے اندر کوئی ایک بھی عرب نہیں ہے۔ بہر حال وہ اب بھی موجود ہیں' دیکھے جا سکتے ہیں۔ انہی کی بنیاد پر نبی اکرم ﷺ کی سیرت مرتب ہوئی تھی۔

نبی اکرم ﷺ کی مصروفیات

آپ کو اس پر تعجب ہوا کہ قرآن نے تو کہا تھا کہ **قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا** [2] (73:2) کیونکہ **اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا** (73:7) اے رسول! تمہارے سامنے دن بھر اتنا بڑا بھرپور پروگرام ہوتا ہے کہ تمہیں وہ فرصت ہی نہیں مل سکتی' اس لیے ٹھیک ہے پھر رات کو سوچنا ہوتا ہے: آج جو کچھ کیا ہے اس پہ نظرِ ثانی کرنا' کل کے لیے پروگرام مرتب کرنا' صحابہ کی تربیت کرنا' ان کو اس کے لیے تیار کرنا۔ وہ اتنا عظیم پروگرام ہے۔ اس کا ہم سے نہ پوچھیے۔ یہ جو غیر مسلم مؤرخ مستشرق ہیں' ان سے پوچھیے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ پتہ نہیں ان کے پاس کیا قوت تھی کہ چند سالوں کے عرصے میں ایران اور روما جیسی سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے' مملکتیں ہی نہیں الٹ دیں' ان کی تہذیبوں کی' ان کی تمدنوں کی' جڑیں نکال دیں۔ ایک فردِ عرب کی سرزمین سے اٹھا اور اس نے یہ کچھ کر کے رکھ دیا۔ ان کی سمجھ میں بات نہیں آتی کہ یہ کیا ہوا؟ اتنا عظیم انقلاب!! تاریخِ انسانیت اس کی مثال نہیں پیش کر سکتی۔ عرب اور عجم یا ایران اور روم ہی نہیں' انسانیت کی پوری تاریخ' اتنا عظیم انقلاب' اتنے تھوڑے عرصے میں' اتنے کم ذرائع کے ساتھ' اس کی کہیں کوئی مثال ہی نہیں ملتی' وہ دانتوں میں انگلی دبا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ذرا پڑھیے' ان کے ہاں' جو کچھ انہوں نے' جس طرح لکھا ہے۔

عزیزانِ من! پہلی چیز جو ہوئی اس کے بارے میں' میں نے عرض کیا تھا کہ وہ یہی بات تھی کہ جس کے لیے خدا کو یہ بات کہنا پڑی کہ **قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا** (73:2) ٹھیک ہے ضرورت ہے کہ دن میں اتنا کام ہوتا ہے کہ تمہیں فرصت نہیں ملتی کہ اس پر سکون و سکوت کے ساتھ' یکسو ہو کر' پھر غور و فکر کیا جائے۔ آپ سوچیے کہ اس بات کی کتنی ضرورت ہوتی ہے کہ جو کچھ کیا ہے' اس پہ نظرِ ثانی ہو' کل آنے والا

---

[1] اِن نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 199-218 نیز فٹ نوٹ نمبر 1 ص۔ 201۔

[2] اس (انقلاب) کے لیے ان (احباب) کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ (دن میں تجھے فرصت کم ہوگی' اس لیے) اس مقصد کے لیے رات کو بھی جاگنا ہوگا (76:26 ;17:79)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

پروگرام مرتب کیا جائے' پھر اپنے ساتھیوں کو تیار کیا جائے' سمجھایا جائے' تربیت دی جائے' پوائنٹس دیئے جائیں۔ یہ دن رات کا کام ہے۔اسی لیے کہا اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا ❶ (73:7)۔ یہ چیز تھی جس کے لیے یہ کہا تھا۔ میں ابھی اور عرض کرونگا کہ قرآن نے یہ کہاں کہاں کہا۔ قرآن کی رو سے یہ چیز آتی تو معلوم ہوتا کہ یہ کونسا محیرالعقول انقلاب تھا جس کے لیے اس پروگرام کی ضرورت تھی' جبکہ ہمارے ہاں نہایت آسانی سے یہ تصور عام کر دیا گیا کہ نبی اکرمؐ رات کو' جب ساری دنیا سوتی تھی' نفل پڑھنے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے اور وہ ساری رات اتنے نفل پڑھتے تھے کہ حضور ﷺ کے پاؤں سوج جایا کرتے تھے۔اب یہ ہوگئی سیرت نبی اکرم ﷺ اور قُمِ الَّیۡلَ (73:2) کا یہ مفہوم ہوگیا۔ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں بھی حضور ﷺ کی سیرت کے متعلق کچھ چیزیں آئی ہیں ان کے فوراً ہی ساتھ ایک روایت آ گئی ہے اور وہ اسی انداز کی ہے کہ سیرت میں یہ آیا' ملوکیت کی تائید میں' سرمایہ داری کی تائید میں' برہمنیت کی تائید میں' یہ سارا انبار اس کے اندر اکٹھا کر دیا۔

روایات کی رو سے قرآن کی پہلی تفسیر اور پہلی تاریخ

اب باری آئی قرآن کی۔ جب یہ سارا کچھ اس طرح' ایک طرف مرتب ہو گیا تو پھر ایک صاحب ایران سے آئے۔ وہ طبرستان کے تھے' طبری ❷ ان کا نام تھا۔ دوسرے بخاری ❸ ہیں' یہ بخارا سے تھے' تیسرے مسلم ❹ ہیں' یہ نیشاپور کے ہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ ایک صاحب طبری نام کے طبرستان کے تھے۔ انہوں نے قرآن کی تفسیر مرتب کی۔ یہ قرآن کی پہلی تفسیر ہے۔ یہ انہوں نے انہی احادیث اور روایات کی رو سے مرتب کی۔ جو کچھ کہنا تھا یا جو کچھ روایات میں لکھا تھا' انہوں نے' قال رسول اللہ کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا

---

❶ پھر یہ بھی کہ دن میں تجھے مخالفتوں کے ہجوم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں تیرے سامنے اتنے کام ہوتے ہیں کہ تجھے سارا سارا دن سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ (لہٰذا جن امور کے لیے قدرے سکون کی ضرورت ہو' ان کے لیے دن میں وقت ہی نہیں مل سکتا)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ ان کا نام امام محمد بن جریر طبری ہے۔ آپ طبرستان کے قصبہ ''امل'' میں (224ھ) پیدا ہوئے اور 311ھ میں وفات پائی۔ آپ کے دادا کا اصل نام رستم تھا اور اسلام قبول کرنے کے بعد یزید نام رکھا گیا۔ ابن جریر خالص شیعوں کے لیے جو کتاب لکھتے تھے اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن رستم لکھتے تھے اور سارے مسلمانوں کے لیے جو کتاب لکھتے تھے اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن یزید لکھتے تھے۔ (حوالہ: پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' طلوعِ اسلام ادارہ' لاہور' 1987ء' ص 504)۔

❸ ان کا نام امام محمد اسماعیل بخاری ہے۔ یہ 194ھ میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ ان کا سال وفات 258ھ ہے' بعض کے نزدیک 260ھ ہے۔ یہ سمرقند کے قریب فوت ہوئے۔ انہوں نے چھ لاکھ احادیث جمع کیں۔ ان میں سے مکررات حذف کرنے کے بعد 2762 اپنے مجموعے میں درج کیں۔ اس نکتہ کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ الکہف وسورۃ مریم' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص۔ 325۔

❹ ان کا نام امام مسلم بن حجاج ہے۔ آپ 204ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سال وفات 261ھ ہے۔ آپ نے تین لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے 4348 اپنے مجموعے میں درج کیں۔

اور آگے پھر وہ لکھ دیا۔ اب جب کسی کے سامنے یہ کچھ آئے کہ قرآن کی اس آیت کے متعلق حضور ﷺ نے یہ فرمایا تو اس کے بعد کس کو جرأت ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہے یا اس سے انکار کرے۔ اس طرح پورے قرآن کی تفسیر ثبت کر دی۔ اب وہ تفسیر آ گئی۔ اب ایک یہ چیز تھی کہ بھئی! تاریخ سے ہی کچھ معلوم کرو کہ وہ دَور کس قسم کا تھا۔ انہی صاحب نے ایک تاریخ بھی مرتب کر دی۔ اس طرح قرآن کی یہ پہلی تفسیر، پہلی تاریخ، احادیث کے پہلے مجموعے، یہ سارے عجمیوں کے مرتب کردہ تھے تو ان کی رو سے، عزیزانِ من! کیا آپ کے سامنے اس انقلاب کا نقشہ آئے گا جو محمد رسول اللہ والذین معہ کے ہاتھوں آیا تھا، برپا ہوا تھا؟ کیا وہ نقشہ آئے گا جس میں نہ یہ ملوکیت باقی رہ سکتی تھی، نہ سرمایہ داری باقی رہ سکتی تھی، نہ یہ برہمنیت باقی رہ سکتی تھی؟ وہ نقشہ تو آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے اس پورے لٹریچر کے اندر اتنی مقدس سندیں مہیا کر دیں کہ ہزار برس سے اسلام ہی یہ رہ گیا، اسلام نام ہی اسی کا رہ گیا۔ آج بھی بے حد و نہایت ہر شے کی ذاتی ملکیت اسلام میں جائز ہے۔ آج بھی غلام اور لونڈیوں کے یہ فتوے جاری ہیں۔ آپ کے ہاں، ان بادشاہوں کے ہاں، تین تین ہزار لونڈیاں موجود تھیں، چاندی اور سونے کے ذخائر کا تو پوچھیے نہیں کہ کیا کیفیت تھی، موروثی ملوکیت ان کے ہاں تھی۔ وہ بادشاہ **ضل اللہ علی الارض** ❶ تھے۔ یہ سب کچھ کرنے والے یہ مذہبی پیشوا تھے۔ یہ ہے، عزیزانِ من! قرآن کی وہ تفسیر، نبی اکرم ﷺ کی وہ سیرت، جسے سنتِ رسول اللہ ﷺ کہا جاتا ہے۔ ان کی رو سے اسلام کا یہ ہیولا اور یہ نقشہ بنا جو ہمارے ہاں آج تک مرتب چلا آ رہا ہے۔ ملوکیت، اس کے خلاف کسی کو لب کشائی کرنے ہی نہیں دیتی تھی۔ اسی اندازِ حکومت کے لیے پھر قوانین بنے، جنہیں آپ فقہ کے قوانین کہتے ہیں، وہ سارے قوانین انہی پہ مبنی ہیں، ان کو ابدی قرار دیا، غیر متبدل قرار دیا کہ اسی طرح سے، وہ قیامت تک کے لیے، امتِ مسلمہ پر نافذ کیے جائیں گے۔

مجھے کسی کی تحقیر مقصود نہیں

عزیزانِ من! میں اتنا عرض کر دوں کہ مجھے یہ جتنے بھی ہمارے ہاں حضرات گزرے ہیں ان کی تحقیر مقصود نہیں ہے۔ ان کا نام بھی تعظیم سے لینا چاہیے۔ یہ تو بہر حال بزرگوں ہی کی صف میں مشہور ہیں۔ اس لیے مجھے کسی کی تنقید اور تحقیر مقصود نہیں۔ یہ تاریخ کے واقعات ہیں۔ انہیں ان لوگوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یہ معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے یہ کچھ کہا تھا یا نہیں۔ اس زمانے میں تو کوئی چھاپے خانے (Printing Presses) بھی نہیں تھے کہ ان کی کوئی چھپی ہوئی کتاب ہی ہوتی۔ فقہ حنفی جو ساری دنیا کے اندر اتنی مشہور چلی آ رہی ہے، آج یہ خود کہا جا رہا ہے کہ امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ (767-699/150-80ھ) نے فقہ کی کوئی کتاب مرتب کر کے ہی نہیں دی تھی، تو پھر یہ ساری حنفی فقہ کہاں سے آ گئی۔ اس سے تو ہمیں غرض نہیں ہے کہ یہ حضرات کس حد تک اس کے ذمہ دار تھے۔ ان کی طرف منسوب کردہ، یہ

---

❶ زمین پر اللہ کا سایہ

ساری کتابیں' آج موجود ہیں۔اب اس کا نام تو یہی لیا جائے گا: بخاری کہا جائے گا' مسلم کہا جائے گا' فقہ حنفی کہا جائے گا۔ جو کچھ بھی ہے جو بھی اس کے ذمہ دار تھے وہ یہی کچھ ہے۔اشخاص سے غرض نہیں ہے' اس کا جو کچھ ماحصل ہمارے پاس موجود ہے' جو سند پیش کی جاتی ہے' اس سے غرض ہے۔جس نے یہ بات کہی تھی' اس سے غرض نہیں کیونکہ بھئی! قرآن موجود ہے۔

اصل معیار' اصل کسوٹی صرف اور صرف قرآن ہے

قرآن کی رو سے ان کو ایک دفعہ چھان پھٹک کر تو دیکھ لو۔جو اس کے مطابق ہے' اسے صحیح سمجھو۔ جو اس کے خلاف جاتا ہے' سمجھ لو کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف غلط منسوب ہوئی ہے' اس بات کو تختہ دار پہ لٹکا دو مگر ان شخصیات کا تقدس برقرار رہے' ان کے خلاف آواز نہ برپا ہو۔ بہرحال' عزیزانِ من! یوں ان آیات کی تفسیریں مرتب ہوئیں' یوں نبی اکرم ﷺ کی سیرت مرتب ہوئی' یوں انہیں ایسا بنا دیا کہ وہ ان چھ بن گئے کہ اس پہ تنقید نہ کی جا سکے' چھان پھٹک تو بہت بڑی بات ہوتی ہے۔

تسبیح کی حقیقت

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ قرآن نے کہا کہ **قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا** [1] (73:2)۔کہا تو یہ گیا تھا کہ **اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا** (73:7)۔بات بڑی صاف تھی کہ ''دن میں اتنا کام ہے۔'' اب وہ جو سبحاً طویلاً ہے وہ سبح' تسبیح کے اوپر آ گئی۔ صاحب! وہاں (ایران) سے ایک لفظ تسبیح آئی اور تسبیح آ گئی یہ دانے والی۔ اسلام تو ایک طرف' مومن تو ایک طرف' خود عرب اس دانے والی تسبیح سے ناآشنا تھے۔یہ جو دانوں والی تسبیح ہوتی ہے' یہ بدھوں کی ہے۔وہاں سے عیسائیوں کے راہبوں نے لی۔ وہاں سے شام کے راستے سے' کوئی دو سو سال کے بعد' مسلمانوں میں آئی۔اب قرآن میں' جہاں بھی یہ سبح کا لفظ آیا' وہ تسبیح آ گئی کہ دن بھر تسبیح پھیرتے رہا کرو' رات کو نفل پڑھتے رہا کرو۔سورۃ بنی اسرائیل کی وہ بڑی اہم آیت ہے جس کو عام طور پہ دہرایا جاتا ہے۔وہ آیت ہے: **اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ط اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا** [2] (17:78) عزیزانِ من! میں اِدھر چلا جاؤں گا' تو موضوع سے دور نکل جاؤں گا۔کتنا عظیم پروگرام یہاں دیا ہوا ہے۔اتنا تو صرف عرض کر دوں کہ یہ

---

[1] اس (انقلاب) کے لیے ان (احباب) کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔(دن میں تجھے فرصت کم ہوگی' اس لیے) اس مقصد کے لیے رات کو بھی جاگنا ہوگا (17:79; 76:26)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] (اس کے لیے تمہارا پروگرام یہ ہونا چاہیے کہ) علی الصبح' طلوعِ آفتاب سے پہلے' قرآنی حقائق پر غور و تدبر کیا جائے اور دیکھا جائے کہ معاملات پیشِ نظر کے متعلق وہاں سے کیا راہ نمائی ملتی ہے......علی الصبح' اس لیے کہ فجر کے سکوت افزا سمے میں' انسان کے خیالات میں اس قدر یکسوئی ہوتی ہے کہ اس سے قرآنی حقائق محسوس و مشہود شکل میں سامنے آ سکتے ہیں اور دل ان کی صداقت کے لیے بے اختیار گواہی دیتا ہے۔اس کے بعد طلوعِ آفتاب سے لے کر ابتدائے شب کی تاریکی (یعنی صبح سے شام) تک اس پروگرام پر مسلسل عمل پیرا رہا جائے۔اس مقصد کے لیے ایسے اجتماعات بھی منعقد کیے جائیں جن میں باہمی مشاورت سے معاملات طے کیے جائیں۔(42:38) (ایضاً)

جو **اَقِمِ الصَّلٰوۃَ** (17:78) ہے' قیامِ صلوٰۃ ہے' اس میں الصلوٰۃ صرف یہ نماز ہی نہیں ہے' یہ پورا ایک نظام ہے جس کے اندر ہر فرد قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتا ہے۔ ''پیچھے چلنا'' ''الصلوٰۃ'' کے معنی ہوتا ہے۔ اس میں ہر فرد قوانین خداوندی کی اطاعت کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں ''قیام'' کے لفظ پہ غور ہی نہیں کیا جاتا۔ یہ تو کسی نظام کا قائم کرنا ہے' اس کا Establish (ثبت) کرنا ہوتا ہے۔

صلوٰۃ کو قائم کرنا نظام کو قائم کرنا تھا

جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ آج بھی جو نماز پڑھتے ہیں' وہ کبھی نہیں کہتے کہ ہم نماز قائم کر کے آئے ہیں یا میں نماز قائم کرنے جا رہا ہوں۔ لکھنے میں تو یہ آتا ہے کہ نماز قائم کرو۔ یہ ایک نظام کا قیام تھا اور اس میں **لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ** (17:78) تھا۔ یہ طلوعِ آفتاب سے لے کر ابتدائے شب کی تاریکی تک تھا۔ یہ بات پھر دوسری طرف چلی جائے گی۔ بات تو یہ ہے کہ طلوعِ آفتاب سے لے کر شام غروب ہونے تک' یہ سارا **لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ** ہے۔ تھوڑی سی عربی جاننے والے بھی جانتے ہیں کہ یہ سارے دن کا کوئی پروگرام ہے' کہ اس میں یہ کچھ کرو اور قران الفجر' طلوعِ سحر سے پیشتر کا وقت کہا ہے۔ یہ وقت سوچنے کے لیے' غور کرنے کے لیے' بڑا سکوت افزا ہوتا ہے' بڑا ہی توجہ طلب وقت ہے' وہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کا مفہوم اور معنی ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ انسان کے سکوت اور سکون میں' یکسوئی میں' یہ کچھ کرو' دن بھر یہ پورا پروگرام کرو۔ **وَمِنَ الَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ نَافِلَةً لَّکَ** ❶ (17:79)۔ صلوٰۃ کے ابتدائی دَور میں تو سورۃ المزمل میں آیا ہے کہ آپ کے ساتھ رفقاء بھی ہوتے تھے۔ آپ سے کہا کہ اس کے بعد' جب یہ ان کے ساتھ معاملہ ختم ہو جائے تو رات کے آخری لمحات میں' یا آخری ساعتوں میں' جسے Late hours in the night (رات کے آخری لمحات) کہتے ہیں' اس وقت پھر اٹھو' لیکن یہ باقیوں کے لیے نہیں ہے' صرف آپ کے لیے ہے۔ تنہا اٹھ کر' پھر اس پر غور کرو۔

''تہجد'' کے معنی ہوتا ہے اس طرح سے' رات کی آخری تنہائی کے وقت غور و فکر کے لیے اٹھنا۔ اب ہمارے ہاں یہ تہجد' نمازِ تہجد ہو گئی۔ اب ساری بحثیں اس پہ چلی آ رہی ہیں کہ تہجد کی نماز میں کتنی رکعتیں ہوتی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کا یہ کاہے کے لیے اٹھنا تھا؟ سارا دن یہ کچھ کرنا' رات کے ابتدائی حصے میں اپنے رفقاء کے ساتھ بحث و تمحیص کرنا' پھر رات کے آخری وقت' آخری Hours (لمحات) میں تنہا اٹھنا' یہ سارا صرف اس لیے تھا تا کہ اس میں مزید غور و فکر کیا جا سکے۔ یہ تہجد ہے۔ یہ آپ کے لیے ہے اور ''نافل'' کے معنی ہوتا ہے جو

---

❶ اور اگر حالات کا تقاضا اس سے بھی زیادہ کا ہو' تو تم رات کے کچھ حصے میں بھی' اس مقصد کے لیے جاگتے رہو' اور معاملات پر غور و فکر کرو۔ یہ اضافہ خصوصیت سے تمہارے لیے ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

چیز Voluntary (اپنے ارادے سے) کی جائے' فریضہ نہیں ہے۔ یہ آپ کے ذمہ ہے کہ اس وقت اٹھو' کیونکہ **قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡهُوۡدًا** (17:78) اس وقت یکسوئی میں جو غور و فکر کیا جاتا ہے تو اس کے مفہوم و مطالب' مشہود طریق پر' سامنے آ جاتے ہیں۔ کہا کہ یہ کچھ کرو۔ اس پروگرام پہ عملدرآمد کرو۔ اس سے یہ ہوگا کہ **عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا** (17:79) ساری دنیا میں حمد و ستائش کے تمہارے بگل بج جائیں گے' عنقریب خدا تمہیں مقامِ محمود دیدے گا' حمد و ستائش ہوگی۔ کہا گیا کہ یہ جو حضور ﷺ کا مقامِ محمود ہے یہ دیا گیا ہے۔ مگر ہمارے ہاں یہ کہنے لگے کہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ یہ دنیا میں جتنی نعتیں حضور ﷺ کی پڑھی جاتی ہیں کسی کی بھی نہیں پڑھی جاتیں۔ چلیے جی! مقامِ محمود ہو گیا حالانکہ پروگرام یہ تھا کہ **وَ قُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّ اَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ** (17:80)۔ اے میرے پروردگار! اس مہم میں' اس پروگرام میں' میں جہاں داخل ہوں' توفیق عطا فرما کہ وہ بھی صدق و صفا اور خلوص کے ساتھ داخل ہوں' اس میں کسی قسم کا اور جذبہ شامل نہ ہو۔ اور اگر مجھے وہاں سے لوٹنا بھی پڑے' پلٹنا بھی پڑے تو وہ بھی اسی طرح سے جو قرآن کی رو سے صدق و صفا کا ہوتا ہے۔ **وَ اجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا** (17:80) اور اپنی طرف سے توفیق اور نصرت عطا فرماتا چلا جا کہ ہر مہم میں کامیاب لوٹوں۔

روشنی کا عدم ہی اندھیرے کا وجود ہوتا ہے

اس کے بعد کہا کہ اے رسول! تو اس پروگرام کا اعلان کر دے کہ **قُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَ زَهَقَ الۡبَاطِلُ** [1] (17:81)۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ کیا تہجد کی رکعتوں سے یہ چیز ہوتی ہے؟ کہا کہ اے رسول ﷺ! اعلان کر دے کہ ہاں' حق آ گیا' باطل ختم ہوا' باطل کی تو فطرت میں چلے جانا تھا بشرطیکہ حق آ جاتا۔ روشنی کے آنے سے اندھیرا نہیں رہ سکتا۔ اندھیرے کا وجود نہیں ہوتا۔ یہ جو Absence of Light (فقدانِ روشنی) ہوتی ہے یعنی یہ جو روشنی کا عدم ہے' کسی جگہ روشنی کا نہ ہونا ہے' وہ ہوتا ہے جسے تاریکی کہا جاتا ہے۔ کہنے لگا کہ یہ تو اس وقت ہے جس وقت یہ روشنی نہیں آئی۔ دیکھیے' عزیزانِ من! یہ کہاں آیا ہے! **قُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَ زَهَقَ الۡبَاطِلُ** [1] (17:81)۔ روشنی کا عدم ہی اندھیرے کا وجود ہوتا ہے۔

اہلحدیث اور اہل فقہ کے باہمی جھگڑے

یہ تھا وہ پروگرام جس کے لیے کہا ہے کہ **قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا** [2] (73:2)۔ ہمارے ہاں اس میں یہ ہوا کہ حضور ﷺ نفل پڑھتے رہتے تھے: **فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّکَ** (17:79)۔ اس پر بحثیں شروع ہوئیں کہ تہجد کی نماز کی کتنی رکعتیں ہیں۔ یہ بڑے مسائل ہیں کہ

---

1. للکار کر کہہ دے کہ اب نظامِ حق و صداقت کا دور آ گیا اور باطل کی تخریبی قوتوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)
2. اس مقصد کے لیے رات کو بھی جاگنا ہوگا۔ (ایضاً)

نوافل وتر کے آخر میں پڑھے جاتے ہیں یا اول پڑھے جاتے ہیں۔ پھر اہلحدیث اور اہلِ فقہ میں اس بات پر جھگڑے شروع ہوئے کہ آیا وہ جو وتر ہیں‘ کیا وہ جو عشاء کی نماز کے ساتھ پڑھ لیے جاتے ہیں‘ جائز ہے؟ پھر وتروں کی کتنی رکعتیں ہوتی ہیں‘ ایک رکعت ہے‘ تین رکعتیں ہیں‘ پھر اس کے بعد کہا کہ یہ تہجد کے بعد پڑھے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ہیں۔ پھر امت ہزار برس سے بس چلی ہوئی ہے‘ یہی طے نہیں ہو پایا۔ یعنی جو بات اصل میں تھی‘ وہ تو گئی۔ اس کی جگہ یہ چیزیں آئیں اور ان کو پھر اتنی اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ اس پر اتنی اتنی ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں: تہجد کی رکعتیں کتنی ہوتی ہیں۔ وہ پروگرام کیا تھا‘ یہ کیسے سامنے آتا؟ اس سے یہ سارا جتنا باطل تھا ختم ہو جاتا اگر یہ پروگرام سامنے آ جاتا۔ **وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ** ❶ (17:81)۔ اس کے بعد حق کو تو آنے ہی نہیں دیا گیا کہ کہیں باطل چلا نہ جائے۔ اس طرح مسائل در مسائل رہے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کی رو سے نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ بڑی شان سے مرتب ہوتی ہے۔ **اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا** ❷ (76:23) اے رسول ﷺ! تجھ پر قرآن نازل کیا۔ اب غور فرمایئے کہ حضور سے کہا جا رہا ہے کہ **فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ** (76:24) خدا کی اس حکومت کے لیے استقامت سے جمے رہو۔

حضور ﷺ سے استقامت کی تاکید

عزیزانِ من! خدا کی اس حکومت کے لیے استقامت سے جمے رہنا‘ کتنا بڑا جاں گسل‘ مشقت طلب‘ اور کمر شکن مرحلہ تھا کہ حضور ﷺ کو تاکید کی جا رہی ہے کہ اس پر جم کر کھڑے رہنا‘ استقامت سے کھڑے رہنا‘ یہ سب کچھ برداشت کیے چلے جانا۔ پھر کہا کہ **وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا** ❸ (76:24)۔ ان کے ساتھ کوئی مفاہمت نہ کرنا‘ کوئی ذرا سی بات نہ ماننا‘ اپنی بات پہ جم کے کھڑے رہنا۔ **وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا** ❹ (76:25)۔ عزیزانِ من! صبح شام‘ ہمارے ہاں عام محاورہ ہے۔ اسے سارا وقت کہتے ہیں۔ یہاں کہا کہ خدا کے قوانین کو‘ اس کے اسم کو‘ سارا وقت اپنے سامنے رکھو۔ اب ان کے ہاں اس آیت میں جو رب کا یہ ذکر آیا ہے‘ یہ وہی ہے جو یہاں آپ نے عشاء کے بعد مسجدوں کے اندر دیکھا اب یہ ذکر شروع ہوا ہے‘ صبح کے بعد وہ ذکر جس طرح

---

❶ اور باطل کی تخریبی قوتوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔

❷ ہم نے تجھ پر قرآن (ضابطہ حیات) بتدریج نازل کیا تا کہ اس پر ساتھ کے ساتھ عمل ہوتا رہے۔

❸ اور ان میں سے کسی ایسے شخص کی بات نہ مان جو اس کے خلاف راستے پر گامزن ہو۔ ذاتی مفاد پرستی کے غلط راستے پر چلنے سے انسان کی قوتِ عمل مضمحل ہو جاتی ہے یا اس کی صلاحیتیں دبی کی دبی رہ جاتی ہیں۔ جو شخص ایسے لوگوں کی بات پر کان دھرے گا اس کی بھی یہی حالت ہو جائے گی (کہ یا تو اس کی انسانی صلاحیتوں کی نمود ہی نہیں ہو سکے گی اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو وہ انہیں تخریبی کاموں میں ضائع کر کے‘ مضمحل ہو جائے گا اور یوں کاروان انسانیت سے پیچھے رہ جائے گا۔)

❹ تو صبح و شام‘ ہر وقت‘ خدا کی صفت ربوبیت کو اپنے سامنے رکھ اور اس کی روشنی میں نظامِ ربوبیت کی تشکیل میں سرگرمِ عمل رہ۔ (۱-۲-۳-۴ مفہوم القرآن- پرویز)

سے ہوتا ہے' اُن کے ہاں' اس آیت میں یہ ذکر آ گیا۔ **وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ** [1] (76:25)۔ اب رات کو بھی یہ ذکر ہے۔ ان کے ہاں یہ اس کی اطاعت ہے کیونکہ یہاں ہے: فاسجد۔ سجدہ تو اطاعت کے معنی میں آتا ہے: **فَاسْجُدْ لَهٗ** ۔ یہ تو ہوا ذکر۔ اب عشاء کی نماز کی رکعتیں آتی ہیں کیونکہ رات کا ذکر آ گیا۔ مسئلہ یہ ہوا کہ وہ رکعتیں کتنی ہوتی ہیں' ان میں وتر شامل ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے۔ پھر اس کے سارے مسائل آئے اور ان پر اتنے لمبے جھگڑے ہوتے ہیں۔ **فَاسْجُدْ لَهٗ وَ سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا** [2] (76:26)۔ اب پھر یہاں سبحہ آ گیا۔ اس کا ترجمہ کیا کہ رات کو لمبی لمبی تسبیح پھیرا کرو۔ عزیزانِ من! قرآن کے یہ سارے مفاہیم یوں مرتب ہوئے' یوں سیرت مرتب ہوئی اور اس طرح سے یہ فقہ کے قوانین بنے۔

مسلمان ممالک میں ملوکیت کا راج

آپ کے ہاں آج تک ملوکیت ہی چلی آ رہی ہے۔ آج مغربی دنیا کی وجہ سے ہی سہی' بہرحال' ان کے ہاں کی جمہوریت نے ملوکیت کا وہ نقشہ تو بدل دیا لیکن آج بھی ملوکیت مسلمانوں کے ملکوں کے اندر ہے۔ جہاں نہیں ہے' وہاں یہ تمام مسائل موجود ہیں یا جس قسم کی حضور ﷺ کی یہ سیرت مرتب ہوئی ہے' اس کو اتنی اہمیت اور تقدس حاصل ہے کہ اگر وہاں حکومت نہیں بھی ہے تو بھی اس کو ہاتھ نہیں لگانے دیا جاتا' اس پہ تنقید نہیں کی جا سکتی' اسے پرکھا نہیں جا سکتا' قرآن کی رو سے کسی معاملے پہ بحث نہیں کی جا سکتی۔

غلام اور لونڈیوں کا مسئلہ

میں نے پچھلی دفعہ بھی کہا تھا کہ مودودی صاحب [3] کے ساتھ غلام اور لونڈیوں پہ بحث ہو رہی تھی۔ مولانا اسلم جیراجپوری علیہ الرحمۃ دوسری طرف تھے۔ قرآن کی رو سے مولانا اسلم جیراجپوری علیہ الرحمۃ (1955-1879ء) ثابت کیے جا رہے تھے کہ اسلام میں کسی قسم کے غلام اور لونڈیاں جائز ہی نہیں ہیں۔ مولانا مودودی [3] کے پاس جب کوئی جواب نہیں تھا تو انہوں نے آخر میں کہا کہ ''ان کی غلطی یہ ہے کہ یہ قرآن کی رو سے غلامی کے عدمِ اصول کو ثابت کر رہے ہیں۔'' ان کی غلطی یہ ہے۔ اور ساتھ دو تین گالیاں بھی دیں: خبطی ہیں' سر پھرے ہیں۔ جرم کیا ہے؟ قرآن کی رو سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ اسلام میں غلامی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ غلامی کہاں سے ثابت ہوئی؟ اِن تمام روایات کے اندر' طبری کی تفسیر کے اندر' عباسیوں کے محلوں کے اندر۔ اسلام یہ ہو گیا' (معاذ اللہ) قرآن پڑا چلا تا رہے کہ اسلام میں کسی قسم کی غلامی کا سوال ہی نہیں ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ قرآن سے غلامی کا عدمِ اصول تلاش کرنا ان کی بنیادی غلطی ہے' یہ خبطی

---

1. دن ہو یا رات' ہمیشہ اسی کے قوانین کے ساتھ جھک (مفہوم القرآن۔ پرویز)
2. اسی کے قوانین کے سامنے جھک اور اپنے پروگرام کی تکمیل کی فکر میں' اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ منہمک رہ (73:1-3)۔ (ایضاً)
3. سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ (1979-1903ء)

ہیں، سر پھرے ہیں۔ آج آپ یہ بات تو سوچیے کہ جب ملوکیت تھی تو اس کے زمانے میں قرآن کا لفظ زبان پہ لانا کیا کچھ نہ کرتا ہوگا۔

تاریخ میں کہیں کہیں قرآن کی آواز سنائی دیتی ہے

یہاں تو غنیمت ہے کہ انہوں نے صرف گالی تک ہی اکتفا کیا۔ اُس زمانے میں تو پھر معلوم نہیں کہ قرآن کی آواز اٹھانے والوں پر کیا ہوتا ہوگا۔ اس زمانے میں بھی، قرآن کی تاریخ میں کہیں کہیں قرآن کی آواز تو اٹھتی ہوئی سنائی دیتی ہے لیکن ان کی تحریر کا کوئی ورق تک باقی نہیں چھوڑا۔ ان لوگوں کا کہیں نام بھی نہ آتا، وہ تو اتفاق یہ ہوا کہ جس طرح اپنے ہاں انہوں نے یہ کہا ہے کہ ان کو دیکھیے: پرویز صاحب کو، اور اسلم صاحب کو، کہ یہ قرآن سے غلامی کا عدمِ اصول ثابت کرتے ہیں، وہاں ان کا نام تو ان کے ہاں بھی آ گیا۔ اسی طرح یہ جو ہمارے ہاں کی قدیم تفسیریں یا تاریخیں ہیں، ان میں یہ ہے کہ دیکھیے: یہ سیدھی سی بات ہے کہ اس طرح سے اتنے غلام اور لونڈیاں لے لیجیے کہ یہ ثابت ہے اور وہ دیکھیے کہ فلاں صاحب ہیں جی! وہ کہتے ہیں کہ نہیں جی، قرآن کی رو سے غلام اور لونڈیاں ثابت ہی نہیں ہیں، تو وہاں گالی کے ساتھ اتنا سا نام تو ان کا آ گیا۔ اس سے ہم لوگوں کو پتہ چلا کہ کوئی ایسے تھے جنہوں نے قرآن کی بات کی تھی ورنہ ان کا نام و نشان تک مٹا دیا جاتا ہے۔

کل بھی سیرتِ طیبہ کا مرکز قرآن ہوگا

عزیزانِ من! بحث کی ایک ہی چیز ہے جب کبھی بھی کسی دَور میں، کسی قوم میں، مسلمانوں کے کسی دَور میں، یا کسی نے بھی چاہا کہ اسلام اپنی صحیح شکل میں، سیرت طیبہ ﷺ اپنی اصلی صورت کے اندر، دنیا کے سامنے آ جائے تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہوگا کہ قرآن اس کا محور، اس کا مرکز ہوگا، اس کا معیار ہوگا، اس کی سند ہوگی، اس کی تائید ہوگی: جو اس کے مطابق ہے وہ صحیح ہے اور جو اس کے خلاف جاتا ہے وہ غلط ہے۔ پھر وہ آئینہ ہوگا، پھر وہی سیرت مرتب ہو سکے گی، وہی قرآن آ سکے گا۔ ورنہ وہی کچھ رہے گا کہ جو کچھ ملوکیت کے زمانے میں آپ کے ہاں اسلام کے نام سے مرتب ہوا۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ جب ذرا سا بھی قرآن آنے لگتا ہے ''تو پھر سلا دیتی ہے حکمراں کی ساحری۔ جب یہ دَور چلا جائے گا اور قرآن کا دور آئے گا تو پھر اس کے معنی سمجھ میں آئیں گے کہ **یٰٓاَیُّهَا الۡمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۝ نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِيۡلًا ۝ اَوۡ زِدۡ عَلَيۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا** [1] (73:1-4) کیا ہے۔

---

[1] اے رسولؐ! فریضہ رسالت کی عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے بعد، تیرے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ تو ایسے رفقائے سفر تیار کرے جن میں کامل ہم آہنگی اور یک رنگی ہو (تاکہ یہ کارواں، شاداں و فرماں، منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھاتا چلا جائے۔ اس قسم کا عمل تزمیل سالارِ کارواں کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔) اس کے لیے ان کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ (دن میں تجھے فرصت کم ہوگی، اس لیے) اس مقصد کے لیے رات کو بھی جاگنا ہوگا (6:26؛ 17:79؛7)۔ لیکن ساری رات نہیں۔ آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا ذرا زیادہ۔ راتوں کی ان مجالس میں تو انہیں قرآن کو اس طرح سمجھا کہ اس کا حسن ترتیب اور نظم وضبط، ابھر کر ان کے سامنے آ جائے۔ پھر اسی ترتیب اور نظم وضبط کے ساتھ اسے عمل میں لاتے چلے جاؤ۔ (ہم نے قرآن کو جس حسن ترتیب و تناسب کے ساتھ مربوط کیا ہے (25:32) اسی حسن نظم و ترتیب کے ساتھ تم اس پر عمل کرتے جاؤ۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

رتل اور ترتیل کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! کیا بات ہے دَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلاً کی! یہاں ایک اور بات آ گئی۔ یہ الفاظ ہیں: رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلاً (73:4) خود قرآنِ کریم کے متعلق یہاں تو یہ ترتیل رتل اور رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ ہے۔ یہاں حکم دیا گیا ہے کہ قرآن کو یہ کرنا ہے۔ رتل کے معنی بعد میں عرض کروں گا پہلے ترتیل کے عرض کرونگا۔ خود خدا نے قرآن کے متعلق کہا ہے کہ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِیْلًا (25:32) ہم نے اس کو ترتیل سے نازل کیا ہے۔ یہ ترتیل کیا چیز ہوتی ہے۔ کوئی فارمولا' کوئی پروگرام' کوئی نظام' اس صورت میں کامیاب ہوتا ہے کہ اس میں ایک خاص نظم ہوتا ہے' ایک ترتیب ہوتی ہے' ایک تناسب ہوتا ہے مثلاً گھڑی کے پرزے۔ وہ ہوتے کیا ہیں؟ چند گراریاں' ایک فنر (Funner) اس کے اندر لیور' یہ اس قسم کی چیزیں ہیں۔ اس کے پیچ کھول کے میز پہ الگ الگ رکھ دیجیے۔ رکھے رہیں' کوئی نتیجہ ہی مرتب نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح حکیم کا نسخہ ہے۔ اب تو خیر یہ نسخے لکھتے ہی نہیں ہیں۔ اس نسخے کے اندر تمام دوائیاں الگ الگ' ان کے اجزاء الگ الگ' ان کے اوزان الگ الگ' لکھے ہوئے ہیں۔ وہ دوائیاں الگ الگ لے کر رکھ لیجیے۔ رکھ ہی نہ لیجیے' الگ الگ پھانک کے بھی دیکھ لیجیے' کچھ نتیجہ ہی نہیں نکلے گا۔ ان میں ایک خاص ترتیب سے نظم ہے' ترتیل ہے' تناسب ہے۔ گھڑی کے یہ پرزے یہ چیزیں ہوتی ہیں' وہ اس نظم و ترتیب کے ساتھ جوڑے جاتے ہیں۔ اس کے بعد دیکھیے کہ کس طرح سے ڈائیل کے اوپر نتیجہ آ جاتا ہے۔ اس نسخے کو اس ترتیب و نظم کے ساتھ استعمال کیجیے' دیکھیے کہ اس میں سے کس طرح شفا ابھر کر آ جاتی ہے۔ یہ جتنے بھی اس قسم کے پروگرام ہیں' ان میں ایک خاص نظم ہوتا ہے' ایک ترتیب ہوتی ہے۔ اس کے مطابق عمل کیا جائے تو اس کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ یہ جو عربوں کے ہاں لفظ ترتیل ہے' جیسے ہمارے ہاں حسنِ ترتیب اور حسنِ نظم کہا جاتا ہے' یہ لفظ موتیوں کی لڑی کے لیے آتا ہے اور اس کے بعد وہ کہتے تھے کہ اسی قسم کے جو کسی کے خوبصورت سفید دانت ہوتے تھے ان کے لیے بھی یہ لفظ آتا تھا۔ کتنی محسوس مثالوں سے یہ قوم اپنے الفاظ کا مفہوم سمجھا دیتی تھی۔ موتی بکھرے ہوئے ہوں یا بکھرے ہوئے ہیں' وہ لڑی میں پروئے جاتے ہیں تو ان میں ایک نظم ہوتا ہے' ایک ترتیب ہوتی ہے۔ خوبصورت دانت' صحت مند دانت' میں بھی ایک ترتیب اور نظم ہوتی ہے' اور فطرت نے جو اس کے ہاں ترتیب رکھی ہے اس کا تو پوچھیے ہی نہیں۔ اگر داڑھیں سامنے ہوتیں اور یہ دانت پیچھے ہوتے' پھر دیکھتے کچھ کھا پی کے آپ۔ یہ سامنے کے دانت' چیزوں کو چھوٹا چھوٹا کاٹتے ہیں پھر وہ ان کو پیچھے پہنچاتے ہیں تو وہ ہیں جو اس کو پیستے ہیں۔ اور ذرا علاوہ اس چیز کے خدا تو حسن و خوبصورتی کو بھی ملحوظ رکھنے والی ذات ہے۔ اگر یہ داڑھیں سامنے ہوتیں تو دیکھیے انسان کا حلیہ کیا ہوتا۔ یہ قوم ترتیل کا مفہوم کیسے سمجھاتی تھی! خوبصورت سفید دانتوں کی لڑی سے' موتی کی لڑی سے' تشبیہہ دے کر' یہ سمجھایا ہے۔

قرآن کا مفہوم تو موتیوں کی طرح پرویا ہوا ہے

خدا نے کہا ہے کہ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلاً (73:4) ہم نے قرآن میں ایک خاص نظم رکھا ہے۔ خود ہی کہا ہے کہ یہ نظم قائم ہوگا۔ ہم نے تصریفِ آیات سے یہ بات رکھی ہے، مختلف مقامات پر یہ چیزیں ہیں، ان کو ایک ربط کے ماتحت ایک جگہ لے کے چلے آیئے موتیوں کی لڑی کی طرح قرآن کا مفہوم پرویا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! اسے تبویب کہتے ہیں، اسے Classification کہتے ہیں اور یہ عجیب چیز ہے۔ یہ چیزیں تو بہرحال، یہ کہنے والا گنہگار [1] اپنے ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر کہتا ہے۔ میری تو عمر اس میں گزری، میری کتابیں موجود ہیں، تبویب القرآن موجود ہے، آپ کے ہاں مفہوم القرآن موجود ہے۔ تبویب القرآن میں اس انداز سے قرآن کی آیات کو ایک ایک موضوع کے اعتبار سے Classify کر کے رکھا گیا ہے۔ آپ اس عمل تبویب کو لے آیئے اور قرآن کے نظم کے اعتبار سے ان کو ترتیب دیجئے، آپ دیکھیے کس طرح قرآن کا مفہوم ابھرتا ہوا سامنے آجاتا ہے۔

قرآنی نظام کی ترتیب کے لیے مرحلہ وار پروگرام موجود ہے

ہم تو ابھی صرف الفاظ تک ہی رہتے ہیں، تحریروں میں یہ بات آتی ہے۔ اگر کہیں وہ قرآنی نظامِ حکومت کی بات آجائے تو وہ جو قرآن نے پھر اس میں نظم اور خود ترتیب بتائی ہے یہ اس کے مطابق ہوگا: ابتداء کیسے کی جائے گی؟ شروع کا پروگرام کیسے ہوگا؟ کس طرح آگے بڑھتے چلے جائیں گے؟ قرآن میں، عزیزانِ من! یہ سارا پروگرام دیا ہوا ہے۔ قرآن میں، کیسے، کب، کس طرح، کیوں، کا جواب ملتا ہے۔ یہ مکی اور مدنی زندگی یونہی تاریخی حادثے نہیں ہیں، یہ وہی نظمِ قرآنی کا پروگرام ہے، اسی کے مطابق یہ سب کچھ ہوا تھا جو حضور ﷺ نے کیا تھا۔ اور جب بھی کبھی پھر اسی انداز کی مملکت یا نظام قائم ہوگا وہ تو اسی انداز، اسی ترتیب، سے ہوگا۔ جب بھی گھڑی گھڑی بنے گی تو اس میں وہی نظم ہوگا جو گھڑی کے پرزوں میں رکھا جاتا ہے۔

قرآن کشمکش حیات کا عملی پروگرام دیتا ہے

اب آیئے اصلی موضوع پر۔ کہا: یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ (73:1) اے وہ کہ جو اب جماعت کی تیاری میں مصروف ہو! مزمل کی بات آپ کو سمجھ میں آگئی۔ یہ بات پچھلے درس میں، پچھلی دفعہ، سامنے آئی تھی۔ کہا تھا کہ تمہیں دن بھر بڑا کام کرنا ہوتا ہے، تھکے ہوئے ہوتے ہو، رات کو جاگتے ہو، یہ بھی ضروری ہے لیکن زیادہ وقت نہ جاگو، صحت پہ بڑا اثر پڑے گا، پھر ساتھی بھی آگے آتے ہیں، وہ بھی تھکے ہوئے ہوتے ہیں، بیمار بھی ہوتے ہیں، ان کو جانے دیا کرو: قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلاً o نِصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلاً o اَوْ زِدْ عَلَیْهِ (73:1-4)

---

[1] یہ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف اشارہ ہے۔

اس مقصد کے لیے رات کو بھی جاگنا ہوگا لیکن ساری رات نہیں۔ آدھی رات تک حسبِ ضرورت، کبھی کم کبھی کچھ زیادہ، یہ کچھ کرو۔ یہ کچھ کا ہے کے لیے کرو؟ کہا کہ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (73:4) جو پروگرام تمہارے سامنے ہے، قرآن کی رو سے اس میں ایک نظم پیدا کرو۔ صحابہؓ کے ساتھ اس لیے جاگنا تھا کہ کل کا پروگرام کیا ہوگا، بھئی! قرآن کیا ہدایت دیتا ہے۔ قرآن، عزیزانِ من! مسائل ہی نہیں بتاتا، کشمکشِ حیات کے اندر ایک عملی پروگرام دیتا ہے، پروگرام کی ترتیب دیتا ہے، اس کا نظم دیتا ہے، اس کا تناسب دیتا ہے، اس کا توازان دیتا ہے۔ اس لیے کہا کہ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (73:4) پھر اسی ترتیب اور نظم کے ساتھ قرآن کو عمل میں لاتے چلے جاؤ۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (73:5) یہ ایک بہت بوجھل وزنی پروگرام ہے جو تمہارے ذمہ لگایا جانے والا ہے۔ یہ بہت بڑا پروگرام ہے۔ اسے قَوْلًا ثَقِيْلًا کہا ہے۔

پروگرام کی تکمیل بہت بڑا بوجھ تھا

سورۃ الم نشرح میں کہا ہے کہ اس پروگرام کے ابتدائی مراحل سختی منزل تنہائی سفر کے احساس اور وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ o الَّذِيْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (94:2-3) ذمہ داریوں کے بوجھ سے تمہاری کمر ٹوٹ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ خدا نے تمہارے رفقاء کی ایک جماعت پیدا کر دی اور اس طرح تمہارا وہ بوجھ بھی ہلکا ہو گیا۔ اس طرح کیا یہ چیز باعثِ شکر گزاری نہیں کہ وہ بوجھ جس نے اے رسول! تمہاری کمر توڑ رکھی تھی، اس کو خدا نے کس قدر آسانی سے اٹھا دیا، یہ تھا وہ بوجھ۔ سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (73:5) یہ بہت بڑا بوجھ تھا، بڑا وزن دار پروگرام ہے جو تمہیں دینے والا ہے۔ یہ اس کے پروگرام کے لیے تھا کہ زیادہ نہ جاگو، تھوڑا جاگو، سویا بھی کرو، پروگرام کے نظم وضبط وترتیب کی آپس میں Discussion (تبادلۂ خیال) کیا کرو، صحابہ رضی اللہ عنہم کو پروگرام دیا کرو: اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (73:5) بہت بڑی وزنی بات تھی یہ بڑا ہمت طلب اور صبر آزما مرحلہ ہے۔

قولاً ثقیلاً کی تشریح روایات کی رو سے

عزیزانِ من! اب آیئے بخاری شریف کی طرف۔ قرآنِ کریم نے کہا: قَوْلًا ثَقِيْلًا (73:5) بوجھ بہت ہے۔ بخاری شریف میں یہ ہے کہ جب رسول اللہؐ پر وحی آتی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن اس قدر زیادہ وزنی ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم دیکھتے تھے کہ اگر ان کی کسی ران کے اوپر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سر رکھا ہوا ہے اور آپ کہیں استراحت فرما رہے ہیں تو ان کو پتہ چل جاتا ہے۔ وحی آتی تھی تو ایسے ہوتا تھا جیسے ران کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ اتنا وزن ہو جاتا تھا۔ یہ قولاً ثقیلاً کا لفظ جو آیا تو اس کی تفسیر یہ ہوگئی۔ یہاں وحی کے نزول کے متعلق بڑی لمبی چوڑی ابتدا بیان کی گئی ہے چنانچہ اس پہلی آیت کے سلسلہ میں، میں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے ہاں روایت بخاری شریف درج کی ہے، پڑھنے کی بات ہے کہ یہ پہلی وحی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسے ہوئی جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ وحی کی کیفیت وماہیت ونوعیت نبی کے

سوا کوئی دوسرا جان ہی نہیں سکتا لیکن یہاں تو اندر کی کیفیت تک کو بیان کر دیا گیا ہے کہ کبھی گھنٹیوں کی آواز حضور کو آیا کرتی تھی' کبھی پسینہ آجایا کرتا تھا' بوجھ اتنا بڑھ جاتا تھا کہ اگر کسی کی ران پہ سر ہے تو ہڈی ٹوٹنے لگ جاتی تھی' کبھی کسی قسم کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ یہ کوئی ڈھائی تین سو سال کے بعد بخاری صاحب [1] کو وحی کی ماہیت کا یہ معلوم ہوا ہے۔

وحی قلب نبی پر نازل کی

عزیزانِ من! یہ وہ وحی ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ روح الامین اس کو قلب محمد پہ نازل کرتا ہے۔ خدا وحی کا بھیجنے والا ہے۔ اسے یوں سمجھیے کہ جس کے Through (توسط سے) جس کی وساطت سے وحی کو بھیجا' اس کو روح الامین کہا ہے کہ وہ خود اس میں کچھ نہیں کرے گا' وہ صرف لے کے آتا ہے اور قلب محمد پہ نازل کرتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ وہ وحی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب وہ آتی تھی تو گھنٹیوں کی آواز آیا کرتی تھی اور آپ ﷺ کا اتنا بوجھ ہو جایا کرتا تھا کہ صاحب! ہڈی ٹوٹنے لگ جاتی تھی۔ یہ کیوں جی؟ کہا کہ یہاں **قَوْلاً ثَقِيلاً** (73:5) جو آ گیا ہے' یہ اس کی تفسیر آ گئی۔ قرآن نے کہا ہے کہ **اِنَّا سَنُلْقِىْ عَلَيْكَ قَوْلاً ثَقِيلاً ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِىَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلاً** [2] (73:5-6)۔ اب اس میں خود ہی بتا دیا کہ رات کا یہ جاگنا کاہے کے لیے ہے۔ اگر ساری رات نفل ہی پڑھنا ہو گا تو جو اگلی آیت ہے اس کو کیا کریں گے۔ وہ آیت ہے۔ **نَاشِئَةَ الَّيْلِ** (73:6)

لفظ ناشئة کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ ناشئة اس طرح کا اٹھنا ہے جیسے بیج میں سے پودا اٹھتا ہے' یہ صرف اٹھنا ہی نہیں ہے' یہ ساتھ ہی بڑھنا یعنی نشو و نما پانا بھی ہے۔ یہ آخری سورتیں ہیں' ان میں ایک ایک لفظ پہ کھڑا ہونا پڑے گا' ان سورتوں کے اندر سارے قرآن کی تعلیم کا ملخص آ گیا ہے اور یہ اس لیے بھی ہے کہ حضور ﷺ کا وہ پروگرام آخری منزل میں پہنچا ہوا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب قرآنِ کریم کی آخری منزل میں پہنچتے ہیں تو اس میں پھر ایک تو قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ اس میں بڑا ہی ارتکاز ہے' چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں' چھوٹی چھوٹی آیتیں ہیں' بعض اوقات ایک ایک لفظ کی آیت ہے لیکن اس میں معنی کا جہان چھپا ہوا ہے۔ یہ لفظ ہے ناشئۃ' ناشۃ' نشۃ۔ اس کا مادہ ''ن ش و'' ہے۔ اس

---

[1] امام محمد اسماعیل بخاریؒ (260 / 258-194ھ)

[2] ہم تجھ پر ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد کرنے والے ہیں۔ (اب قرآن کے ذریعے معاشرے میں انقلاب برپا کر کے' نظامِ خداوندی کی عملی تشکیل کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ یہ بہت بڑا ہمت طلب اور صبر آزما مرحلہ ہے۔ ہم نے جو کہا تھا کہ اپنے رفقاء کی تعلیم و تربیت کا کام رات کے وقت کیا کرو تو اس کی کئی وجوہات ہیں۔) ایک تو یہ کہ رات کے قیام سے' انسان سہل انگاری کے جذبات پر قابو پالیتا ہے اور اس طرح کسی قوتِ عمل میں پختگی آجاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ رات کے سکوت میں' انسانی معاملات پر غور و فکر بھی اچھی طرح ہو سکتا ہے اور بات ابھر اور نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کے ٹھیک معنی ہیں: اٹھنا' لیکن اس ''اٹھنے'' کے لیے تو عربی زبان میں بیسیوں اور لفظ ہیں۔ ''نشوونما'' تو آپ کو معلوم ہے۔ اس لفظ کے معنی ہیں: اس طرح اٹھنا جیسے پودا اٹھتا ہے' جیسے بیج میں سے کونپل' یہ اٹھنا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ اس کا بڑھنا بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ لفظ نشوونما' Development کے معنی میں آتا ہے۔ یہ صرف اٹھنا ہی نہیں ہے بلکہ نشوونما پانا بھی ہے۔ اِس آیت میں جو کہا ہے کہ رات کے وقت یوں نیند سے جاگنا' اٹھنا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ اٹھنا کاہے کے لیے ہے؟ عزیزانِ من! اس میں ارتقاء کی بات ہے' ابھرنے کی بات ہے' آگے بڑھنے کی بات ہے۔

وَطًا کا مفہوم

اِن ساری چیزوں سے ارتقائی منازل طے ہو رہی تھیں۔ اس کے لیے کہا کہ رات کے وقت اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے اٹھنا اَشَــدُّ وَطْــاً [1] (73:6) ہے۔ وطا کا مادہ ''وطا'' ہے۔ اس کے معنی ہوتا ہے: دو چیزوں کے اندر موافقت ہونا' عمل اور قول کے اندر موافقت کا ہو جانا۔ یہاں کہا ہے کہ یہ رات کی تنہائیوں میں اٹھنے سے' اس پروگرام کی رو سے' نشوونما حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لیے دیکھنا یہ ہے کہ جو پروگرام قرآن دیتا ہے' ہم عملاً اس پر کس طرح کارفرما ہونگے۔ یہاں کہا ہے کہ وَطْــاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلاً [2] (73:6)۔ دو دو لفظ ہیں' عزیزانِ من! اِس آیت میں تین ٹکڑے آ گئے: (1) نَـاشِئَةَ الَّيْلِ' رات کا نشوونما کے لیے اٹھنا' (2) اشد وطًا' یعنی سرکش جذبات کو بہت زیادہ مغلوب کرنا اور (3) اقوم قیلاً' یعنی رات کی سوچ کا پروگرام یا بات کو بڑا پختہ کرنا' یہ دیکھنا کہ اس میں ارتقائی منازل کیسے طے کی جائیں گی' غور و فکر کرنا۔ یہاں کہا ہے کہ اس عمل سے قرآن مشہود ہو جائے گا' بات ابھر اور نکھر کر سامنے آ جائے گی۔ اور اس کے بعد دیکھنا کہ بات کیسے پختہ ہوگی۔ اب یہ لفظ تو ''بات'' ہی ہے۔ آپ کے ہاں بھی ''بات'' کے معنی' آپ دیکھتے ہیں' کہ کتنے زیادہ ہوتے ہیں: میاں پکی بات کرو' بات کا بڑا کچا ہے' ہمارے ہاں قول اقرار کہا جاتا ہے۔ یہ چیز کہ اس طرح کا پروگرام جو طے کیا ہوا ہوگا' وہ بڑا پختہ' وزنی' مضبوط' محکم' پائیدار اور نتیجہ خیز ہوگا۔ اس کے اندر یہ سب باتیں آ گئیں اور ''اقوم'' صیغہ بھی Superlative کا ہے یعنی یہ سب سے زیادہ محکم ہوگا۔ یہ رات کا جاگنا اس کے لیے ہوا' نفل پڑھنے کے لیے نہیں تھا۔ اگر انسان نفل پڑھنے میں مصروف ہو جائے تو پھر یہ ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں کر سکتا۔ یہ اقوم قیلاً ہے۔ اس لیے کہ یہ جو کہا ہے کہ کچھ سویا بھی کرو تھوڑی رات جاگا کرو' اس لیے کہ اِنَّ

---

[1] سرکش جذبات کو بہت زیادہ مغلوب کر دیتا ہے یا (اس سے) انسان کی قوتِ عمل اس کے ارادوں اور فیصلوں کا مَــرْکَــبْ بن جاتی ہے (کیونکہ بقول صاحب محیط المحیط وَطَأَ الْفَرَسَ کے معنی ہیں ''وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔'')

[2] رات کی تنہائیوں میں اٹھنے سے' اس پروگرام کی رو سے' نشوونما حاصل ہوتی ہے اور رات کے سکوت میں' انسانی معاملات پر غور و فکر بھی اچھی طرح ہو سکتا ہے' اور بات ابھر اور نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لَکَ فِی النَّھَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا (73:7) دن بھر جو مصروفیتیں ہیں، جو مخالفتوں کے ہجوم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، جو تیرے سامنے اپنے کام ہوتے ہیں کہ تجھے سارا سارا دن سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔

سبح کا قرآنی مفہوم

میں نے بتایا تھا کہ ''سبح'' کے معنی ہوتا ہے ''اپنی پوری کوشش سے، انتہائی کوشش سے بلکہ پوری کی پوری استعداد اور قوت صرف کر کے کسی بات کے لیے سرگرداں ہونا''۔ یہاں کہا ہے کہ **اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا** (73:7) یہ اس قسم کا پروگرام ہے جس کے لیے تجھے سرگرداں رہنا پڑے گا، مسلسل جدوجہد کرنا پڑے گی، یہ دن میں تمہارے لیے بڑا لمبا پروگرام ہوتا ہے، دن میں سوچنے کی، معاملات پہ غور کرنے کی، تبصرہ اور تنقید کرنے کی، فرصت نہیں مل سکتی، رات کو اس لیے ہے کہ دن میں اس کے لیے فرصت نہیں مل سکتی۔ اب ہمارے ہاں یہ ہو گیا کہ دن میں تسبیحاں پھیرو اور رات کو نفل پڑھا کرو۔ پھر آخر رات میں تہجد پڑھا کرو۔ اگلی آیت ہے: **وَاذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ وَ تَبَتَّلۡ اِلَیۡہِ تَبۡتِیۡلًا** [1] (73:8)۔ اس آیت میں **تَبَتَّلۡ اِلَیۡہِ تَبۡتِیۡلًا** کے معنی ہوتا ہے: یکسو ہو جانا، سب سے کٹ کر ایک خدا کی طرف متوجہ ہو جانا۔ حنیف کے معنی بھی یہی ہوتے ہیں یعنی یہی چیز جس کو یکسو ہو جانا کہتے ہیں، اپنی توجہ کسی ایک نقطے پہ مرکوز کر دینا، ایں اور آں کی طرف سے ہٹ کر خالص اپنے پروگرام کے اوپر تمام توجہات کو مرکوز کر دینا۔

بتول کا مفہوم

تبتیل کے یہ معنی ہوتے ہیں، ویسے تو ان کے ہاں بتول نام بھی رکھتے تھے۔ بتول نام حضرت فاطمۃ الزہرۃ رضی اللہ عنہا کا لقب تھا یعنی جو اِدھر اُدھر سے توجہ ہٹانے والی، پاک باز، باعصمت بچی تھی۔ یہ جو یکسوئی تھی، اس کے لیے یہ تھا کہ رات کے پچھلے پہر اٹھ، پھر قرآن کے اوپر اپنے پروگرام کے لیے غور و فکر کرو۔

مشرق سے مغرب تک ربوبیت عالمینی کا پروگرام

وہ پروگرام کیا ہے؟ وہ پروگرام مقامی نہیں ہے، لوکل نہیں ہے، وہ پروگرام ہے: **رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ** (73:9) تیرے سامنے ایک عالمگیر انقلاب کا پروگرام ہے، مشرق و مغرب کا ربوبیت کا پروگرام ہے۔ اصل پروگرام کی ابتدا، قرآن کریم کی پہلی ہی سورۃ میں یوں آئی ہے: **اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ** (1:1) عالمگیر ربوبیت کا پروگرام ہے۔ اب اس پروگرام میں یہ دیا ہے کہ یہ حکومت

---

[1] اس طرح، دن رات، اپنے نشو و نما دینے والے کی صفات کو اپنے سامنے رکھ (کہ انہی صفات کو معاشرہ میں عملاً نافذ کرنا مقصود ہے۔) اور اپنی تمام توجہات کو دوسری طرف سے ہٹا کر، اسی ایک نقطہ پر مرکوز کر دے، اور نہایت حسن کارانہ انداز سے اس مقصد کے حصول کے لیے مصروف عمل رہ۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کرنے کے لیے نہیں، قوت حاصل کرنے کے لیے نہیں، مملکتیں بنانے کے لیے نہیں، دوسروں کی سلطنتیں چھیننے کے لیے نہیں، یہ سارا پروگرام ربوبیت کا پروگرام ہے، اور ربوبیت مقامی نہیں۔ جب ہم مشرق و مغرب کہتے ہیں تو اس کے اندر یہی چیز آتی ہے، عالمگیریت اس میں ہوتی ہے، ساری دنیا اس کے اندر آتی ہے۔ اس زمانے میں اگر دیکھا جائے تو عرب کے مشرق اور مغرب کے اندر پوری آباد دنیا آجاتی ہے لیکن خدا نے مشارق و مغارب بھی کہا ہے کہ یہ پروگرام عالمگیر ربوبیت کا پروگرام ہے: مشرق اور مغرب کے متعلق اقبالؒ (1877-1938ء) نے بھی کہا ہے:

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کا قرآنی مفہوم

یہ ربوبیتِ عالمینی کا پروگرام مشارق اور مغارب تک پھیلے گا، یاد رکھو! اور وہ کیا چیز ہے جس کی رو سے پھیلے گا؟ وہ چیز ہے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُـوَ (73:9) یہ پروگرام قرآن کے نظام کا مرکز ہے، قرآن کی تعلیم کا مرکز ہے۔ یہ ایک ہی چیز ہے کہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُـوَ (73:9) کائنات میں کوئی ایسی اتھارٹی نہیں ہے جس کی اطاعت کی جائے، جس کے قانون کو مانا جائے، جس کی حکومت کو مانا جائے۔ یہ اتھارٹی صرف اس ذات کی حکومت کو ہے جو الٰہ ہے، اس کے سوا کوئی اور اتھارٹی نہیں ہے۔ یہی ایک لفظ الٰہ کے معنی ہیں، یہی آج کی اصطلاح میں صحیح مفہوم ادا کرتا ہے، جس کو حقِ حکومت حاصل ہو، جس کو اتھارٹی حاصل ہو، جس کا کنٹرول ہو، اقتدار ہو۔ یہ ہے ماحصل، ملخص، قرآن کی تعلیم کا یعنی مشرق و مغرب میں یہ تعلیم عام کرنا، اس قسم کا نظام قائم کرنا کہ جس میں حکومت کسی انسان کی نہ ہو، صرف خدا کی ہو، اور وہ کاہے کے لیے ہو؟ کہا کہ وہ حکومت ربوبیت عالمینی کے لیے ہو۔ الٰہ کے یہ معنی تھے۔

ملوکیت کے دَور کی قرآنی تفسیر

اب اس کے بعد جب دَورِ ملوکیت کی آپ کی یہ تفسیر آ گئی تو اس میں یہ کہنا کون برداشت کرسکتا تھا کہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں ہے۔ وہ حق تو ملوکیت میں ختم ہو جاتا ہے، وہ حکومت خداوندی باقی ہی نہیں رہ سکتی، وہ انسان کی حکومت ہی نہیں ہے اور حقِ حکومت تو صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس دور میں الٰہ کے یہ معنی کوئی نہیں کرنے دیتا۔ اس کے معنی کر دیئے گئے: ''وہ جو عبادت کے لائق ہے، جو پرستش کے لائق ہے، کوئی اور ہے ہی نہیں، عبادت اسی کی کی جائے گی۔

حکومت بادشاہوں کی اور پرستش خدا کی

اس طرح حکومت بادشاہوں کی اور پرستش خدا کی ہو گئی۔ اللہ کے معنی ہو گئے: الٰہ، وہ جو صرف معبود ہے۔ معبود کے معنی ہو گئے:

''جس کی پرستش کی جائے۔'' عبادت کے معنی ہوگئے: ''پرستش کرنا' محکومیت اختیار کرنا نہیں۔'' انہوں نے ایک الہ کے معنی یوں کیے تو ملوکیت ہر قسم کے استبداد اور طعن و تشنیع سے بچ گئی۔ اب یہ ملوکیت دو قسم کی تھی: ایک وہ جو مملکت اور سلطنت کے اندر ان بادشاہوں کی اتھارٹی سے تھی' اور دوسری مسلمانوں کے عقائد میں' مسالک میں' نمازوں میں' روزوں میں' اس میں اتھارٹی مختلف فرقوں کے ملاؤں کو تھی' یہ دونوں الہ ہوگئے۔ اسی سے قرآن نے یہ کہہ کر منع کیا تھا کہ اِلٰـهَيۡـنِ اثۡـنَيۡنِ (16:51) یہ دو الہ نہ مان لینا۔ یہاں کہا کہ گھبراؤ نہیں کہ اس ایک کی حکومت کو ماننے سے یہ سارے حکمران خلاف ہوجائیں گے۔ ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذۡهُ وَكِيۡلًا (73:9) تمہارا Protector' (محافظ) تمہارا سہارا' تمہارا قابلِ اعتماد سہارا' کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اس پہ بھروسہ رکھ کر اپنے پروگرام پر چلو۔ تمہارا وہ انقلاب یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی اقتدار و اختیار کو ختم کر کے' اس کی جگہ ایک خدا کی حکومت قائم کر دی جائے' انسان قوانین خداوندی کے علاوہ کسی اور کا محکوم اور اطاعت گزار نہ ہو۔ اس لیے تو قانونِ خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کر کے آگے بڑھتا چلا جا۔ عزیزانِ من! آگے ایک اور بات بھی اس کے ساتھ چلتی تھی۔ کیا بات ہے اس پروگرام کی! قرآنِ کریم نے کہا کہ وَاصۡبِـرۡ عَـلٰـى مَـا يَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِيۡـلاً o وَذَرۡنِىۡ وَالۡمُكَذِّبِيۡنَ اُولِى النَّعۡمَةِ وَ مَهِّلۡهُمۡ قَلِيۡلاً (73:10-11) اللہ اکبر! یہ بات ذرا لمبی ہے' اسے پھر آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ط

❀......❀❀❀......❀

اٹھارھواں باب: سورۃ المزمل (آیات 10 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1984ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المزمل کی آیت 10 سے ہو رہا ہے:(73:10)۔

سابقہ درس کا پس منظر

اس سورۃ کا پس منظر اور سابقہ آیات کی تفصیل گزشتہ دو درسوں میں آپ کے سامنے آ چکی ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ اب وہ مقام آ گیا ہے جہاں وہ کشمکش جو گزشتہ اتنے سالوں سے حق اور باطل میں، نبی اکرم ﷺ اور مخالفین میں، آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی، اب وہ اپنے آخری مراحل میں پہنچ گئی اور تصادم کی شکل اختیار کر گئی، مخالفین نکھر کر، کھل کر سامنے آ گئے اور یہ بھی بتایا تھا کہ یہ جو آخری پاروں کی سورتیں ہیں ان میں انہی واقعات کے متعلق کچھ تفصیل بیان کی گئی ہے۔ سابقہ دو درسوں میں اس سورۃ کی پہلی آیات کے متعلق میں نے ان کا پس منظر کچھ یوں بیان کیا تھا کہ اب یہ اتنا مصروفیت کا دَور آ گیا کہ قرآن نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اس پروگرام کا تقاضا ہے کہ اس کے لیے رات کو بھی جاگا جائے لیکن اس میں اتنا زیادہ نہ کیجیے۔ یہ جسمانی طور پر، طبعی طور پر، زیادہ عرصے تک جاری نہیں رکھا جا سکے گا۔

اس جاگنے میں کچھ کیجیے کیونکہ اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا (73:7) دن بھر میں اتنی مصروفیت ہوتی ہے' آپ کو اس قدر تگ و دو کرنا پڑتی ہے' اس قدر کوششیں' کاوشیں اور مصروفیتیں ہوتی ہیں کہ آپ کو سارا سارا دن سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ اس سے تو نظر آیا کہ یہ دن بھر کا پروگرام تھا اور پھر رات کو' سکون کے ساتھ' جو کچھ سارا دن کیا تھا' اس کا ایک جائزہ لینا' اس پر نظرِ ثانی کرنا اور کل کے لیے نیا پروگرام مرتب کرنا' ہوتا تھا۔ اس کے لیے یہ تھا جو قرآن نے کہا: قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا (73:2) رات کا تھوڑا حصہ جاگا کرو۔

میں نے عرض کیا تھا کہ جب دین مذہب میں تبدیل ہوا ہے تو پھر انہی آیات کے معنی' مفہوم اور ان پر عمل کرنے کے طرق و اسالیب بدل گئے۔ ان میں شکل یہ ہوئی کہ قُمِ الَّیۡلَ (73:2) کے متعلق کہا کہ رسول اللہ ﷺ رات کو نفل پڑھا کرتے تھے اور اتنی لمبی رات تک نفل پڑھتے تھے کہ حضور ﷺ کے پاؤں سوج جایا کرتے تھے۔ اس کے لیے کہا گیا کہ ''دن بھر میں کچھ کم کیا کرو۔'' اس عمل میں ایک لفظ سبحاً تھا۔ وہ سبح کا لفظ ہمارے ہاں تسبیح کے لیے استعمال ہوا۔ گویا وہ اتنے بڑے نظام کا سارا پروگرام جو ایک انقلابِ عظیم برپا کرنے کا تھا جب دین سے مذہب میں تبدیل کر دیا تو اب یہ جتنے بھی احکام اور آیات تھیں ان کا مفہوم بدل گیا۔ مذہب میں عبادت کے معنی ہی پرستش ہو گئے' وہ رات کا جاگنا' نفل پڑھنے کے لیے کھڑا ہونا ہو گیا' دن میں جو اِدھر اُدھر کی تگ و تاز تھی وہ تسبیح کے لیے چلی گئی۔ اب یہی چیزیں سنتِ رسول اللہ قرار پا گئیں' یہی ان آیات کی تفسیر قرار پا گئی' یہی اس کا مفہوم رہ گیا۔ دین سے مذہب کی اس ایک تبدیلی سے خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تو اس کے ساتھ ہی یہ سارا کچھ بدل گیا۔ ایک سوئچ آف کیا تو اب سارا مفہوم بدل گیا' اس کے بعد کوئی چارہ نہیں تھا۔ جب ان تمام چیزوں کو مذہب میں تبدیل کیا جائے گا تو یہ سب پرستش کی چیزیں آپ کے سامنے آ جائیں گی۔ عبادت کو پرستش میں تبدیل کر دیا۔

میں عرض کر رہا تھا کہ اگر اِن چیزوں پر قرآن کی آیات کی روشنی میں' قرآن کی رو سے' غور کیا جاتا تو بات سمجھ میں آ جاتی کہ یہ پوجا پاٹ کی یا پرستش کی یا بھگتی کی بات نہیں ہے' یہ کچھ تصادم کی بات ہے' کچھ ایسا ہو رہا تھا جس کے لیے خدا کو نبی اکرم ﷺ سے اگلی ہی آیت میں یہ کہنا پڑا کہ وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ (73:10) برداشت کرو جو کچھ یہ تمہارے ساتھ کر رہے ہیں' استقامت برتو' ثبات سے اس کو جھیلو' ہمت نہ ہارو' ان کی طرف سے صرفِ نظر کر کے' اپنے پروگرام پر ثبات اور استقامت سے جمے رہو۔ گویا یہ چیزیں کچھ ایسی تھیں کہ جن کے لیے بڑی ہی استقامت کی ضرورت تھی' بڑی برداشت کی ضرورت تھی' بڑے حوصلے کی ضرورت تھی۔ ورنہ سیدھی سی بات ہے کہ اگر یہی مفہوم تھا کہ نبی اکرم ﷺ رات کو کھڑے ہو کے آدھی رات تک نفل پڑھا کرتے تھے اور پھر تہجد کی نماز میں آ جاتے تھے تو اِن مخالفین کے لیے کوئی وجہ شکایت ہی نہیں تھی۔ بھئی! ٹھیک ہے' پڑھتے رہیے' ساری رات پڑھتے رہیے' آپ دن بھر بھی پڑھتے رہیے' اس کا ہم پہ کیا اثر۔

اعتراض نماز پر نہیں ہوتا' نظام پر ہوتا ہے۔

آج بھی یہ جتنا کچھ پرستش کی بات ہے اس پر غیر مسلم حکومتیں کوئی اعتراض نہیں کرتیں۔ ہمارے ہاں ہندوستان کی حکومت' گو مسلمان کو ایک نظر نہیں دیکھ سکتی لیکن وہاں بھی کوئی اس پہ اعتراض نہیں کرتا ہے کہ یہ رات کو کیوں نفل پڑھتا رہتا ہے اور دن میں نماز کیوں پڑھتا رہتا ہے۔ یہ وجہ اعتراض ہی نہیں ہوسکتا تھا اور وہاں تو پھر حضور ﷺ مکے کو چھوڑ کر مدینے بھی تشریف لے آئے' دن میں ان مخالفین سے کچھ نہیں کہا جارہا۔ اب ان کی تفسیر کے مطابق' آپ ﷺ رات کو نفل پڑھتے رہتے تھے تو یہ کونسی ایسی بات تھی کہ جس کے بعد یہ کہنا پڑا کہ **وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ** ❶ (73:10)۔ اور اسٹیج وہ آ گئی جو آخری مراحل میں ہوا کرتا ہے۔ اگلا فقرہ ہے کہ **وَاهْجُرْهُمْ** (73:10) ان سے الگ ہٹتے چلے جاؤ۔ بہتیری ہو چکی۔ آپؐ نے اپنی ایک عمر ان میں صرف کی کہ ان لوگوں کو سمجھایا جائے' ان کو بتایا جائے کہ تباہی اور بربادی تمہارے سر پہ منڈلا رہی ہے' اپنی روش میں تبدیلی پیدا کرو تو بچ جاؤ گے مگر انہوں نے ایک نہیں مانی۔

نبی اکرم ﷺ کی غمگساری کی کیفیت

قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پہ نبی اکرم ﷺ کو غمگسار' غم خوار کہا گیا اور ان پر واضح کیا گیا کہ ان کی خاطر اپنی جان مت گھلاؤ' یہ ضدی ہیں' تمہارے انقلاب سے ان کے مفاد پہ زد پڑتی ہے' ان کی سمجھ میں بات آ چکی ہوئی ہے لیکن اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر یہ بات نہیں مانیں گے۔ اور آخری چیز یہ ہے کہ اپنی ساری عمر یہ کچھ کرنے کے بعد اب بات یہ ہے کہ ان سے کنارا کش ہو جاؤ' انہیں چھوڑ دو' اب ان کے ساتھ قطع تعلق کر لو' تو گویا یہ آخری مرحلہ آ گیا' یہ کوئی ایسی آسان سی بات نہیں تھی۔ کسی طبیب کا مریض سے یہ کہہ کر' اٹھ کر چلے جانا کہ نہیں' میرے بس کی بات نہیں رہی' وہ ختم ہوا۔ اٹھتے ہوئے جو آہ بھر کر یہ کہہ دے کہ یوں خدا کی خدائی برحق ہے' مگر ہمیں تو اس کے جینے کی آس نہیں۔ اس کے بعد تو وہ جیتے جی ہی مر جائے گا۔ آج تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ یہ کہہ دیا کہ اچھا' تمہارا میرا کوئی واسطہ نہیں' کوئی تعلق نہیں لیکن آپ گہرائی میں جا کے دیکھیے کہ ایسا طبیبِ مشفق جو ان کی حفاظت کے لیے' ان کی بہتری کے لیے' اپنی جان گھلا رہا تھا وہ اُن کے متعلق یہ بات کہہ دے کہ ٹھیک ہے بھئی! میرا کچھ واسطہ نہیں ہے' میں اب تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ بہت بڑی چیز تھی۔

علیحدگی لیکن وہ بھی حسن کارانہ انداز سے

عزیزانِ من! اس کشمکش کے اندر پھر آخری مرحلہ ہے۔ اور قرآن کہتا ہے کہ **وَاهْجُرْهُمْ** (73:10) ان سے الگ ہٹتے چلے جاؤ۔ اس کے بعد ہی فوراً کہا کہ **هَجْرًا جَمِيْلًا** (73:10) یہ بات بھی حسن کارانہ انداز سے کہو' اپنے دامن کو ان خاردار جھاڑیوں سے

---

❶ اپنے مخالفین کی کسی بات سے اثر پذیر مت ہو' بلکہ ان کی طرف سے صرفِ نظر کر کے' اپنے پروگرام پر ثبات اور استقامت سے جمے رہو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

حسن کارانہ انداز سے' بچاتے جاؤ۔ مخالفت' مخاصمت' تصادم' دشمنی اور مقابلہ تو ایک طرف رہا' کنارہ کشی اور علیحدگی بھی اختیار کرو تو حسن کارانہ انداز سے اختیار کرو۔ یہ فرق ہے دنیاوی سیاست میں اور قرآنی سیاست میں۔ لیکن بہر حال یہ **وَاهْجُرْهُمْ** ❶ (73:10) کی منزل تو آ گئی' معلوم ہو گیا کہ اب اگلا قدم وہ نہیں ہو گا جو اس سے پیشتر اتنے سالوں تک ہوتا رہا ہے کہ تنزیل ہو' آگہی ہو' وارن کرنا ہی ہو' بلکہ اب کوئی وہ منزل آ گئی ہے جس میں تصادم ناگزیر ہو جائے گا۔ اب یہ کہہ دیا کہ اچھا بھئی! اب تمہارا میرا کوئی تعلق نہیں رہا لیکن یہ بھی **هَجْرًا جَمِيلًا** (73:10) حسن کارانہ انداز سے ہے۔

یہ ساری تگ و تاز اور یہ سارا ٹکراؤ کس چیز کے لیے تھا

عزیزانِ من! اب اگلی آیت وہ بات واضح کر دیتی ہے جو میں پچھلے تین درسوں سے کہتا چلا آ رہا ہوں کہ اب یہ منزل کونسی تھی' ٹکراؤ کس بات سے تھا۔ اسے میں پھر دہرا دوں کہ نبی اکرم ﷺ جو یہ انقلاب کی آواز بلند کر رہے تھے اور اس کو برپا کرنے کے لیے یہ عملی جدوجہد ہو رہی تھی' اس میں ان قریش کا کچھ باقی نہیں بچتا تھا۔ قریش قبیلے کے اعتبار سے بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ وہ آج کل کی ہمارے ہاں کی برادریوں' ذاتوں اور گوتوں ہی کی طرح تھا۔ آج بھی ہمارے ہاں سید کے بلند مقام کا تو پوچھو ہی نہیں۔ اسی طرح قریش کا تو پوچھو ہی نہیں کہ اپنے قبائل میں ان کا نسبی اعتبار پر' صرف قریشی ہونے پر' مقام کتنا ممتاز تھا' اِدھر یہ کیفیت اور اُدھر اس انقلابی آواز کی یہ کیفیت کہ حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ بلال کو سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کہتے تھے۔ وہ بلال حبش کا رہنے والا' سیاہ فام (معاذ اللہ) آزاد کردہ غلام تھا اور وہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ قریش کے بھی اتنے ممتاز گھرانے کی اتنی بڑی شخصیت تھی۔ سب کی یہ صورت کہ وہ اس قسم کے غلام کو بھی اپنا سردار کہہ کر پکارتے تھے۔ مساواتِ انسانیہ کی تو یہ کیفیت تھی۔ قریش سے تو یہ سب کچھ چھن جاتا تھا۔ کعبے کی تولیت کوئی چھوٹی چیز نہیں تھی۔ اس تولیت کعبہ سے ان کو اتنا بڑا مقام حاصل ہو گیا تھا کہ **رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ** ❷ (106:2) اس ملک میں' ان حالات میں' جہاں کسی کا کچھ محفوظ ہی نہیں رہا کرتا تھا' کارواں تو دن دیہاڑے لٹ جایا کرتے تھے۔ ان کے کارواں' قرآن نے خود بتایا کہ سردی اور گرمی میں رواں دواں رہتے ہیں' کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا اور یہ کوئی چھوٹی چیز نہیں تھی۔ تجارت اور اتنی محفوظ تجارت تھی! نسبی افتخار اس قدر زیادہ تھا اور تولیتِ کعبہ انہیں اتنا بلند و بالا مقام عطا کیے ہوئے تھی۔ جسے آپ مہاجنی کہتے ہیں' اس لحاظ سے بنارس کے پنڈت ہی کچھ کم نہیں ہوتے تھے۔ اوقاف بننے سے پیشتر' یہ بڑے بڑے مزاروں کے مجاور تھے۔ پوچھو نہیں وہ کیا ہوتے تھے۔ قریش کا یہ سب کچھ تھا مگر اس انقلاب سے ان کا کچھ بھی باقی نہیں بچتا تھا۔

---

❶ اپنے مخالفین کی کسی بات سے اثر پذیر مت ہو بلکہ ان کی طرف سے صرفِ نظر کر کے' اپنے پروگرام پر ثبات اور استقامت سے جمے رہو۔

❷ اُن کے قافلوں کو کوئی نہیں لوٹتا تھا۔ چنانچہ یہ سردی اور گرمی' سال بھر' اپنے تجارتی قافلے مسلسل اِدھر اُدھر بھیجتے اور وہ ہمیشہ محفوظ رہتے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

فرمانِ خداوندی کہ میں ان سے خود نپٹ لوں گا

عزیزانِ من! اگلی آیت ہی نے یہ بات واضح کردی کہ یہ ٹکراؤ کن سے ہو رہا تھا۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَذَرْنِی** (73:11) ان سے الگ ہوجاؤ، ان سے قطعِ تعلق کرلو۔ **وَذَرْنِی وَالْمُكَذِّبِيْنَ أُولِي النَّعْمَةِ وَ مَهِّلْهُمْ قَلِيْلاً** [1] (73:11) اور انہیں چھوڑ دو، تم ان سے الگ ہوجاؤ، میں ان سے نپٹ لونگا۔ خدا کہہ رہا ہے۔ آپ سوچ لیجیے جن سے نپٹنے کے متعلق خدا کہہ دے کہ تم الگ ہٹ جاؤ، میں ان سے نپٹ لونگا۔ اس آیت میں ساری بات واضح ہوگئی کہ یہ مکذبین کون تھے۔ پہلے تو یہ کہا کہ یہ لوگ بات بات پہ یہ کہنے والے تھے کہ یہ بالکل جھوٹ کہتا ہے کہ ہمارے نظام میں خدا کی طرف سے تباہی اور بربادی آجائے گی۔ یہ بالکل غلط ہے، یہ جھوٹ ہے۔

عزیزانِ من! یہ کہنے والے کون تھے؟ قرآن نے ایک لفظ میں بتا دیا۔ یہ ان کے اور سرمایہ داروں کے درمیان تصادم ہو رہا تھا۔ قرآن انہیں **اُولِی النَّعْمَةِ** (73:11) سرمایہ دار کہہ رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ سرمایہ داروں میں کیا کھلبلی مچ گئی تھی۔ اگر وہ رات بھر نفل پڑھتے رہتے، دن بھر تسبیح پھیرتے رہتے، انہیں اس سے کیا نقصان تھا۔ یہ اُن **اُولِی النَّعْمَةِ** (73:11) کے ساتھ ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ اور پھر یہ جو قریش کے نعمۃ (سرمایہ دار) تھے، ان میں نسبی تفاخر کی بناء پر، تولیتِ کعبہ کی بناء پر، تجارت کے محفوظ ہونے کی بناء پر، یہ ساری نعما حاصل تھیں۔ اب ان کے ساتھ ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ یہ ہے جو قرآنِ کریم نے ایک لفظ میں کہہ دیا کہ آپ تو ان سے حسن کارانہ انداز سے الگ ہو جائیے۔ میں ان سے نپٹ لونگا، مجھے اور انہیں تنہا چھوڑ دیجیے، اس میدان کے اندر ذرا چھوڑ دیجیے، میں خود دیکھ لونگا، آپ ان سے الگ ہٹ جائیے۔ یہ کون ہیں؟ یہ سرمایہ دار طبقہ ہے۔

یہ سارا باطل کا نظام عین دین قرار پا گیا

عزیزانِ من! یہ تھا تصادم، یہ تھا ٹکراؤ، یہ تھا وہی نظام سرمایہ داری، جو ملوکیت کے زمانے میں آپ کے ہاں عین دین بن گیا۔ آج بھی ہمارے ہاں کے جو سب سے بڑے مفسر [2] اقامتِ دین کے داعی ہیں، وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام نے اِس اکتناز زر پہ کوئی پابندی نہیں لگائی، بے حد و نہایت قسم کی دولت جمع کرو، سامان اکٹھا کرو، جتنا کچھ جی چاہے اکٹھا کرتے جاؤ، اس میں کچھ تھوڑی سی خیرات کے طور پر ڈھائی ٹکے دے دیا کرو۔ مگر یہاں یہ **اُولِی النَّعْمَةِ** (73:11) تھے جن کے ساتھ یہ ٹکراؤ تھا اور پھر یہ مقام آیا جہاں آپ ﷺ سے کہہ دیا گیا کہ آپ اِن سے الگ ہو جائیے۔ ذرا مجھے اور انہیں چھوڑ دیجیے، میں دیکھ لوں گا کہ یہ اس میدان کے اندر کیا مقابلہ کرتے ہیں

---

[1] یہ لوگ، جو اپنی دولت کے نشے میں بدمست اندھا دھند، ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے چلے جاتے ہیں، انہیں ہمارے قانونِ مکافات کے حوالے کر دو اور تھوڑی سی مہلت دے دو۔ ہمارا قانون ان سرمایہ داروں سے خود نپٹ لے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ (1979-1903) مراد ہیں۔

لیکن مَهِّلۡهُمۡ قَلِیۡلًا (73:11) تھوڑی سی مہلت دے دو۔قرآن نے اپنے قانونِ مکافات میں ایک چیز بار بار گنائی ہے کہ یہ خدا کی رحمت ہے کہ وہ ایسے وقت میں بھی فوری گرفت نہیں کرتا۔ جب یہ کہا کہ آپ ان سے الگ ہوجائیے' مجھے اور انہیں چھوڑ دیجیے' پھر بھی انہیں کہا کہ تھوڑا وقت اور انتظار کرلو۔ یہ آخری اعلان جو ہم نے تمہارے خلاف کیا ہے شاید اس سے ہی کم از کم تمہارے ہوش ٹھکانے ہوجائیں۔اس لیے کہا کہ تھوڑا سا وقت دے دولیکن اگر اس پہ بھی یہ باز نہ آئے تو کہا کہ یہ بات نہیں ہے کہ ہم نے اس دوران کہیں سے کوئی اسلحہ منگوانا ہے' کہیں سے کوئی فوج اکٹھی کرنی ہے' نہیں بلکہ اِنَّ لَدَیۡنَاۤ اَنۡکَالًا وَّ جَحِیۡمًا (73:12) اِن کے لیے ہمارے ''پاس'' انکال موجود ہیں جنہیں ہتھکڑیاں یعنی بیڑیاں کہتے ہیں۔

لفظ جہنم کی بجائے جحیم کا استعمال

یہاں قرآن جحیم کا لفظ لایا ہے' جہنم بھی نہیں لایا۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے۔اس کے ایک ایک لفظ پہ کھڑے ہونا پڑتا ہے۔''جحیم'' وہ چیز ہوتی ہے جہاں کوئی رک جائے' جہاں کسی کی ترقی بند ہوجائے' رفتار ختم ہوجائے' جہاں اسے روک دیا جائے۔جحیم رک جانا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وہ روک دیئے جائیں گے۔ پہلی چیز انکال ہی کم نہیں تھی۔ یہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ہیں۔قرآن اس کے فوراً بعد جحیم کا لفظ لایا ہے کہ یہ روک دیئے جائیں گے' یہ آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔سرکشوں کو روک دینا بڑی چیز ہے۔ یہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں اور روک دینا' کوئی کم چیز نہیں ہے۔ یہ نظر آ رہا ہے کہ یہ جو آنے والے جنگ تھے' یہ ان کے ہی عواقب کا ذکر ہو رہا ہے۔اور پھر جس انداز سے جنگی قیدیوں کی طرح فتح مکہ کے وقت یہ قریش آئے ہیں وہ تو عبرت اور موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ دنیا کے مورخین انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ یہ قریش' جو اتنے بڑے بڑے پہاڑ تھے' ان کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں بندھے ہوئے سامنے کھڑے ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ لَدَیۡنَاۤ اَنۡکَالًا وَّ جَحِیۡمًا (73:12) ان کے لیے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ہونگی' یہ ان سے روک دیئے جائیں گے' اب انہیں بڑھنے نہیں دیا جائے گا' اب ان کی سرکشیاں ختم ہوجائیں گی۔

نظامِ سرمایہ داری کے تحت ملنے والا رزق

عزیزانِ من! اس کے بعد ہے کہ وَ طَعَامًا ذَا غُصَّۃٍ (73:13) اور انہیں ایسا کھانا دیا جائے گا جو حلق میں جا کر اٹک جائے۔کیا بات ہے قرآنی الفاظ کی! کھانے کو تو بہر حال دیا ہی جائے گا۔ یہ چونکہ اُولِی النَّعۡمَۃِ (73:11) تھے' بڑے ناز و نعمت والے' بڑی دولت والے' بڑے Capitalist' بڑے بڑے سرمایہ دار تھے' ان کے ہاں تو اِس ناز و نعمت کا پوچھو نہیں۔ یہ جو لفظِ کھانا ہے' اس کے اندر صرف یہ روٹی والی بات ہی نہیں ہوتی' اس میں ہر وہ چیز آ جاتی ہے جو اس طرح سے پرورش کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ ہاں' تو کہا کہ یہ

سارے ناز و نعمت میں پلے ہوئے ہیں۔ انہیں (طعاماً) یعنی کس قسم کی روٹی ملے گی؟ کیا بات ہے قرآنِ کریم کی! ایک لفظ **ذَا غُصَّةٍ** (73:13) میں بتا دیا کہ انہیں ایسی روٹی ملے گی، جو حلق میں اٹک جائے، نگلی بھی نہ جائے، اگلی بھی نہ جائے:

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(اقبالؒ)

انہیں یہ ملے گا: حلق میں اٹک جائے گا، نگل نہیں سکیں گے، اُگل بھی نہیں سکیں گے۔ اس کے فوراً بعد کہا کہ **وَعَذَابًا اَلِيۡمًا** (73:13) ان پر یہ عذاب کتنا دردناک ہوگا! کتنا دردانگیز ہوگا! سوال یہ ہے کہ کس دن یہ بات ہوگی؟ کہا کہ یہ اس دَور کی بات ہے، اس دن کی بات ہے، جب **يَوۡمَ تَرۡجُفُ الۡاَرۡضُ وَ الۡجِبَالُ** [1] (73:14)

جبال کے مجازی معنی

اب اگر یہاں پھر وہی لفظی یعنی معنی لیے جائیں کہ ''ترجف رجف'' کے معنی ہوتا ہے: ہل جانا، کانپ جانا، لغزش میں آ جانا، تھرتھرا جانا، زلزلہ آ جانا زمین میں اور پہاڑ میں، **الارض والجبال** میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ اب اس طرح اگر اس کے یہ لفظی یعنی لغوی معنی لیے جائیں، مجازی معنی نہ لیے جائیں تو زمین اور جبال میں زلزلہ آ جائے گا تو یہاں بات اعتراض پہ آتی ہے کہ جب زمین میں زلزلہ آئے گا تو کیا یہ خود پہاڑوں پہ نہیں آئے گا؟ وہ تو زمین پہ ہی کہہ دینے کی بات کافی ہو جاتی ہے۔ یہ زمین اور اس کے ساتھ جبال ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جبال اور ارض کیا ہیں؟ آیئے ان عرب والوں کی طرف، ان سے، ان کی زبان میں، پوچھیں کہ وہ انہیں کیا کہتے تھے؟ وہ جبال اپنے بڑے بڑے سرداروں کو کہتے تھے جو پہاڑوں کی طرح محکم کھڑے ہوتے تھے، اور پھر ان کی بڑائی، سرفرازی، سرکشی، محکمیت اور استقامت ہوتی تھی، وہ ایک مقام پر جمے ہوئے تھے۔ تو واقعی ان کے سردار وہ پہاڑ ہوتے تھے اور باقی جتنے لوگ ہوتے تھے وہ بچھی ہوئی زمین کی طرح ان کے پاؤں تلے روندے ہوئے ہیں، جو چیز بھی پستی میں ہوتی تھی وہ اس کو ارض کہتے تھے، جب وہ چیز سرکشی اختیار کرتی تھی تو اسے جبال کہتے تھے۔ یہ بڑی عمدہ تشبیہیں ہیں۔ یہاں کہا کہ اس دن یہ بڑے بڑے سرکش، اور ان کے یہ Followers (سارے متبعین) جنہیں یہ پاؤں تلے روندتے ہیں، یہ سب کے سب، سردار اور ان کی فوجیں، ان سب میں ایک زلزلہ پیدا ہو جائے گا، جو نیچے روندے ہوئے ہیں ان پہ تو یہ اتنی سی ہی لغزش کافی ہو جائے گی۔ اس سے آگے ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ کہا کہ **كَانَتِ الۡجِبَالُ**

---

[1] اُس وقت، یہ تمام بڑے بڑے سردار (الجبال) اور اُن کے متبع عوام (الارض)...... (تمہاری قوت کے سامنے)...... کانپ اٹھیں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

كَثِيْبًا مَّهِيْلًا [1] (73:14) اور یہ جو بڑے بڑے جبال ہیں "سرکڈ کیندے نیں پنجابی اچ ایناں نوں۔" [2] وہ جبال کی بات صحیح ہوتی ہے کہ یہ بڑے بڑے سرداراور سرغنے پہاڑوں کی طرح' آج جم کر کھڑے ہوئے ہیں اور اتنے استحکام سے ہیں' صرف ایک پتھر کا استحکام ہی کچھ کم نہیں ہوتا' یہ تو پورے پہاڑ کا استحکام ہے' پھر ان کے ہاں کے پہاڑ کی قد وقامت دیکھیے اور ذہن میں ایک نقشہ لائیے اور آگے دیکھیے کہ کیا کہتے ہیں۔ یہ کھڑے ہوئے پہاڑ پتھروں جیسے محکم ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ریت کے تودے ہو جائیں گے۔

جبال کے بعد کثیب کا لفظ

عزیزانِ من! یہ کثیب کی اتنی سی بات بھی کچھ کم نہیں تھی کہ قرآن اس کے ساتھ "مھیلاً" بھی لے آیا۔ یعنی ایسی ریت جس کی بنیاد نیچے سے سرک رہی ہو' اور سرکتے سرکتے وہ سمندر میں گر رہی ہو' یا دریا میں گر رہی ہو۔ یعنی یہ پہاڑ ریت کے تودے اور ایسی ریگِ رواں ہے جو صحرا کے اندر ہوتی ہے۔ یہ ریت بھی اپنے مقام پہ کھڑی نہیں ہے بلکہ اپنے مقام سے' اپنی بنیادوں سے' سرک رہی ہے اور سرکتی ہوئی دریا میں گر رہی ہے۔ پہاڑوں کی یہ کیفیت ہو جائے گی۔ میں پھر یہ عرض کر دوں کہ ٹھیک ہے اگر یہ کوئی آنے والے واقعات کی بات تھی تو ہوا کرے۔ قرآن نے آگے کہا ہے کہ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ (73:19) ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں ایک تاریخی حقیقت اور واضح بیان ہے جو عبرت اور موعظت کے ہزار ساماں اپنے اندر رکھتا ہے۔ تمہارے لیے اس میں موعظت اور تذکرے ہیں' یاد دہانیاں ہیں جو ہم تمہیں بتا رہے ہیں کہ ان چیزوں سے تم سبق حاصل کرو' عبرت حاصل کرو۔ اگر پہاڑ کسی زمانے میں ریت کے ٹیلے بن جائیں گے اور سرکتے جائیں گے تو اس کا ہم سے کیا تعلق ہے۔ یہ کوئی Physical Phenomenon (طبعی مظہر) ہے' طبعی مظاہر کی چیزیں ہیں' تو ہوا کریں۔ "جبال" ان عربوں کی زبان میں بڑے بڑے سردار' سرمایہ دار' سرغنے تھے۔ اس طرح جبال کے ان مجازی معنوں کو لو تو پتہ چلتا ہے کہ حقیقت کیا تھی۔ قریش کے جو اتنے اتنے بڑے سردار تھے وہ جانتے تھے کہ یہ قرآن کیا کہہ گیا ہے کہ کیا ہوگا: پہاڑ ریت کے تودے بن جائیں گے اور وہ تودے ایسی ریت کے ہوں گے جو سرک رہی ہو اور رفتہ رفتہ' آہستہ آہستہ' دریا میں' اور سمندر میں' جا رہی ہو۔ ان کا یہ حشر ہو جائے گا۔ یہ حشر سامنے ہی ہو گیا۔

---

1. ان کے سرداروں کی' ان کے سرغنوں کی' جو اس وقت پہاڑ کی طرح محکم نظر آتے ہیں' بالخصوص یہ حالت ہو گی گویا ریت کے تودے ہیں جو خود بخود ڈھلتے چلے جا رہے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)
2. پنجابی زبان میں "اونچے سر والے" کو کہتے ہیں۔

فتح مکہ کی مثال ایک زندہ شہادت ہے

عزیزانِ من! 8 ھ میں ہی جب مکہ فتح ہوا ہے تو اِن بڑے بڑے سرداروں کا پوچھو نہیں کہ ان کی کیا کیفیت تھی۔ کہا کہ ان سے کہو کہ یہ کچھ ہو جائے گا۔ اور آگے یہ کہہ کر بات واضح کر دی کہ اِنَّآ اَرۡسَلۡنَآ اِلَيۡكُمۡ رَسُوۡلًا شَاهِدًا عَلَيۡكُمۡ كَمَآ اَرۡسَلۡنَآ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ❶ (73:15)۔ یہاں کہا کہ یہ رسول تمہاری طرف بھیجا ہوا ہے۔ پہلے تو یہ دیکھیے یہ رسول "اِلَيۡكُمۡ" ہے یعنی ان سب کی طرف بھیجا ہوا رسول ہے مگر اس کے ساتھ ہی شَاهِدًا عَلَيۡكُمۡ ہے، وہ تمہارے اوپر نگران ہے اور دیکھ رہا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔ اور آگے جو بتایا ہے، جو تمثیل دی ہے کہ وہ کس طرح کا ہے۔ کہا کہ وہ ایسا ہی ہے جیسا فرعون کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام ❷ کو ہم نے بھیجا تھا۔ یہ کہہ کر بات صاف کر دی۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کشمکش کی داستان قرآن میں پھیلی ہوئی ہے اور سارے انبیاء کرام میں سے ان کی داستان زیادہ تفصیل ❷ کے ساتھ ہے۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ انسانیت کے کچلنے کے لیے یہاں تین ہی تو بلائیں ہیں: ملوکیت یعنی انسانوں کی انسانوں پر حکومت، سرمایہ داری یعنی قارونیت اور مذہبی پیشوائیت یعنی ہامانیت۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہ تینوں ایک جگہ اکٹھی تھیں اور اپنے پورے زور اور عروج پر تھیں۔ اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى ❸ (79:24) کہنے والا فرعون تھا، ہامان کے جنود تھے، اور قارون کہتا تھا کہ میری دولت پہ کوئی انگلی بھی نہیں رکھ سکتا، یہ میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے جو میں نے اسے کمایا ہے، اس پہ کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کشمکش

عزیزانِ من! یہ ساری لعنتیں ایک ہی جگہ اکٹھی تھیں اور ان کے نیچے بنی اسرائیل، تڑپتی پھڑکتی ہوئی انسانیت۔ انکی طرف صاحبِ ضربِ ❹ کلیم کو بھیجا تھا۔ یہاں کہا کہ اسی طرح تمہاری طرف یہ رسول آیا ہے۔ فرعون کی طرف موسیٰ علیہ السلام آیا تھا۔ ایک تشبیہہ نے ساری بات واضح کر دی کہ یہ کشمکش کیا ہو رہی تھی، یہ ٹکراؤ کس قسم کا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پروگرام، راتوں کا یہ جاگنا، یہ کچھ نفلیں پڑھنے کے لیے

---

❶ اے رسولؐ! تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ یہ مقصد، جس کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے، کوئی نیا مقصد نہیں ہے اور نہ ہی مخالفین کا ایسا انجام جس طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کوئی نرالا انجام۔ اسی قسم کی انقلاب آفرینی کے لیے سابقہ انبیائے کرام آتے رہے اور اسی قسم کا انجام ان کے مخالفین کا ہوا۔ ان میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں لایا ہوا انقلاب اور فرعون کا انجام بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ہم نے اسی مقصد کے لیے تمہیں ان لوگوں کی طرف بھیجا ہے تاکہ تو ان کے اعمال کی نگرانی کرے اور دیکھے کہ یہ کون سی روش اختیار کرتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اس کی مکمل تشریح کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء۔

❸ تمہارا سب سے بڑا رب میں ہی ہوں۔ (میں ہی تمہارا سب سے بڑا "ان داتا" ہوں۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❹ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو

نہیں تھا۔ یہ پروگرام تھا' یہ کشمکش تھی' یہ تصادم تھا ویسا ہی جیسا موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے اندر ہوا تھا۔ اسے ہی قرآن نے کہا ہے کہ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (73:15) بالکل ایسے ہی جیسے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا مگر فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ (73:16) فرعون نے بات نہ مانی' سرکشی اختیار کی۔ اس سرکشی کا نتیجہ کیا ہوا؟ اس کے لیے کہا کہ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ❶ (73:16) کیا بات ہے! ہم نے پھر اسے پکڑا اور پکڑنے کے بعد کیا کیا؟

عزیزانِ من! میں بار بار یہ عرض کروں گا کہ پتہ نہیں' زندگی ہے' یا نہیں' پھر موقع ملے یا نہ ملے' یاد رکھیے! جب تک قرآن کے مفردات' الفاظِ قرآنی کے وہ معنی آپ کے سامنے نہ ہوں جو نزولِ قرآن کے زمانے میں عرب ان سے لیتے تھے' قرآن سمجھ میں نہیں آئے گا۔ یہ قرآن کے وہ الفاظ ہیں جو وہاں استعمال کیے گئے ہیں' یہ ان کے ہاں ان معنی میں استعمال ہوتے تھے جن میں وہ استعمال کرتے تھے۔ وہ معنی اگر آپ کے سامنے آجائیں تو پھر قرآن اپنے تمام تر معانی و مطالب سے اپنی عقلی سطح کے مطابق سمجھ میں آجاتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ کبھی کبھی ''میں'' درمیان میں آجاتی ہے۔ وہ جو میری ''لغات القرآن'' ہے' اس میں میں نے یہی کیا ہے۔ وہ ایک لغات میری مدت العمر کا ماحصل ہے کہ جس میں' میں نے عربی کی مستند لغت ❷ سے ان الفاظِ قرآنی کے معنی بتائے ہیں جو اس زمانے میں لیے جاتے تھے۔ جن دوستوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے انہوں نے یہ کہا ہے کہ اگر گہری نظر سے اِس لغات القرآن کا مطالعہ کرلیا جائے تو قرآن سمجھ میں آجاتا ہے۔ سمجھ کی تو یہی بات ہے کہ یہ الفاظ ہی تو ہیں۔ یہ قرآن لسانِ عربی مبین میں نازل کیا ہے۔ یہ پتہ چل جائے کہ وہ اس زمانے کی عربی مبین کیا تھی' اگر یہ معنی آپ کے سامنے آجائیں تو پھر جسے عربی زبان کی Construction (ترکیب) کہتے ہیں' وہی باقی رہ جاتی ہے کہ کس ترکیب سے یہ چیز آئی ہے۔ میں جس زمانے میں لغات القرآن مرتب کرتا تھا' ایسا ہوتا تھا کہ وہ الفاظ' وہ معنی' میرے سامنے آتے تھے اور اپنی کوئی زبان اس کی متحمل نہیں ہوتی تھی کہ اس کو واضح کیا جائے۔ اس وقت عجیب قسم کی ایک کیفیت میرے اندر پیدا ہوتی تھی' ادھر عربی زبان کی وہ چیز سامنے آتی تھی اور اُدھر دوسری طرف' خواہ اس کے لیے کہہ دیجیے کہ میری مادری زبان پنجابی کی چیز سامنے آجاتی تھی تو اس میں مفہوم واضح ہوجاتا تھا لیکن میں اس لغت میں تو پنجابی نہیں لاسکتا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک تو یہ علمی زبان ہی نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بات اسی سے سمجھ میں آتی تھی۔

---

❶ ہمارے قانونِ مکافات نے اسے ایسی سختی سے پکڑا کہ وہ اس کی گرفت سے نکل نہ سکا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اس کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 155-154' فٹ نوٹ نمبر 2۔

لفظ وبیل کا مفہوم

عزیزانِ من! اب میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ یہاں آیا ہے: اَخْذًا وَّبِيْلًا (73:16) پکڑا ہم نے ایسا۔ اور پھر کیا کیا؟ تو اب مجھے پھر اجازت دیجیے کہ میں آپ کو تھوڑا سا پنجابی میں بتاؤں، وہیں سے بات سمجھ میں آئے گی کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ وبیل کیا۔ ویسے ''وبیل'' کے معنوں کے لیے اپنے ہاں کا ایک لفظ ''وبال'' تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ اس کے مادے ''و ب ل'' کے معنی تو یونہی ہے لیکن ان کے ہاں بات اور تھی، وبیل اور چیز ہوتی تھی۔ اب ہمارے ہاں کے یہ نوجوان نسل کے طالبعلم تو وہ بات بھی نہیں سمجھ سکیں گے۔ دھوبی کپڑے دھوتا ہے یا گھر میں بھی کپڑے دھوئے جاتے ہیں۔ اب تو استریاں ہیں۔ ہمارے ہاں اس دُھلے ہوئے کپڑے پر استری پھیر دیتے ہیں تو وہ کپڑا صاف ہموار اور بغیر سلوٹوں کے ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے استریاں نہیں ہوتی تھیں۔ خود میرے بچپن کے زمانے میں بھی، میں نے دیکھا ہے کہ وہ دھوبی کپڑے دھو کے لاتے تھے۔ دھلا ہوا کپڑا اس زمانے میں Wash & Wear تو نہیں ہوتا تھا۔ اس دھلے ہوئے کپڑے میں تو کتنے ہی شکن ہوتے تھے، کتنی ہی ناہمواریاں ہوتی تھیں۔ اس قسم کا شکنوں اور سلوٹوں والا وہ کپڑا ہوتا تھا۔ استری (Iron) ہوتی نہیں تھی تو وہ کرتے یہ تھے کہ ''اک موگری اوہدے کول ہوندی سی، لکڑی دی موٹی ساری۔ نیچے تختے، پہ پھٹے پہ، اس کپڑے نوں وچھاندا سی۔ تے موگری ہتھ اچ پھڑ لیندا سی۔ تے او کٹ کٹ کے اونوں پدرا کر دا سی۔''❶

اب آ گئی پنجابی۔ اب مجھے یوں کہنا پڑ رہا ہے کہ جیسے کہ کیا آپ کہیں فرانسیسی جانتے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ پنجابی جانتے ہیں تو آپ کو پتہ ہے کہ ''محاورہ ساڈے اے، ایہدی کھنب ٹھپ دے ذرا۔ میرا خیال ہے آج پہلی مرتبہ آپ کو پتہ چلا ہوگا کہ ایہدے معنی کی ہیگے نیں؟ اوہ جیہڑا دھو کے لے آندا اے نا کپڑا، اونوں کھنب کیندے سی۔ او کھنب ایس واسطے کہ اوہدی جیہڑی بھٹی سی، او بھٹی چڑھاندا سی نا: کھنبے چاڑھیا ہویا کپڑا۔ اونوں ایہہ کھنب کیوں کیندے سی۔''❷

یہ پنجابی زبان عجیب ہی چیز ہے۔ بڑی وسیع زبان ہے۔ ''او اوہنوں، دھوتے ہوئے کپڑے نوں، کھنب کیوں کیندا سی؟ اے کھنبیاں، تہانوں پتہ ہیگا کہ کُنّیاں کِنّیاں چِٹّیاں ہوندیاں نیں، برسات اچ جیہڑی اوندیاں نیں۔ او سفید جیہڑا رنگ ہوندا اے نا کھنبی دا، اوتھوں اونہاں نے لفظ لیا کھنب۔ چٹا تے کر دتا اوس کپڑے نوں۔ اوہدیاں ہن سلوٹاں تے، شکناں تے، اوہدی ناہمواریاں جیہڑیاں سن،

---

❶ اس کے پاس لکڑی کا ایک موٹا سا ڈنڈا ہوتا تھا۔ وہ اس کپڑے کو ایک تخت کے اوپر بچھا دیتا تھا اور لکڑی کا وہ ڈنڈا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیتا تھا۔ پھر اس سے کوٹ کوٹ کر اس دھلے ہوئے شکنوں والے کپڑے کو صاف ہموار، بغیر شکنوں اور سلوٹوں کے کر دیتا تھا۔

❷ ہمارے ہاں یہ محاورہ ہے کہ ''ذرا اس کی کھنب نکال دو۔'' میرا خیال ہے کہ آج آپ کو پہلی مرتبہ پتہ چلا ہوگا کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ وہ اس دھلے ہوئے کپڑے کو ''کھنب'' کہتے تھے۔ وہ اس لیے اسے ''کھنب'' کہتے تھے کہ اس کی جو کپڑے دھونے کی بھٹی ہوتی تھی وہ اس اَن دھلے کپڑے ڈالتا تھا اور اسے ''کھنب چڑھایا ہوا کپڑا کہتا تھا۔'' وہ اسے ''کھنب'' کیوں کہتے تھے؟

اونہاں نوں سیدھا کرنے واسطے اوہدا کیا گیا: پئی' اے کھنب ذرا ٹھپ دے۔ اوٹھپ کس طراں دیندا سی؟ اوموگری ہتھ اچ ہوندی سی' پھٹے تے وچھا دیندا ہیگا سی' مار مار کے پدرا کر دیندا سی اونوں۔ اے پدرا کرنا وی محاورہ اے۔ پتہ ہے نا تہانوں؟ ذرا اینوں پدرا کر دیو۔ اج وی تسی کسے پنڈاں اچ جاؤ نا' جیناں پنڈاں وچ شہرئے نئیں زیادہ ڈھلے جاکے' اوہ تے آج وی کیندے ہیگے نیں کہ اوذرا اے بڑا چڑھدا پیا ہیگا' ایہدی ذرا کھنب ٹھپ دے۔ کھنب ٹھپ دے۔ گل اے کئی کہ فرعون نے سرکشی اختیار کتی' تے بڑا اڈا ہویا' تے بڑے اونہے سلوٹ دِتے۔ ایس طراں اسی اوہدی کھنب ٹھپ دِتی۔ آ گیا ناں سواد گل دا فیر! کوئی ضرورت ہے کوئی ہور تفسیر دی' کوئی کسی قسم دی کہانی پان دی' لیکن جے ایہہ کھنب ٹھپن دی گل نہ سامنے ہووے تے فیر ایہہ سمجھ ای نہیں آسکدی' پئی اے کی کیندا اے: **فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا** (73:16) لے آؤ اونہوں' تے پھڑ کے اوہدی تے اسی کھنب ٹھپ دتی ہے۔''[1] کیوں بیٹیو! بات سمجھ میں آئی؟ میری بیٹیو! میں نے کہا تھا کہ اگلی نسل کو یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ میں یہ کیا پنجابی بولتا ہوں۔ بیٹی! میں نے ابھی کھنبی کہا ہے اور ''پتہ ہے کھنبی کی ہوندی اے؟ او وی نئیں پتہ۔ پتہ پدرا کنوں کیندے نیں؟ او وی نئیں پتہ۔ برسات میں' بیٹا! یہ جو مشروم ہوتی ہیں اونوں کھنبیاں کیندے نیں۔[2] Mushroom کو کہتے ہیں۔ انگریزی محاورہ ہے کہ He is as white as ice[3] یعنی وہ اتنی سفید

---

1. وہ اس دھلے ہوئے کپڑے کو ''کھنب'' کیوں کہتا تھا؟ آپ کو ''کھنمیوں'' کا علم ہے کہ کتنی سفید ہوتی ہین۔ یہ برسات کے موسم میں اگتی ہیں۔ اس کھمبی کا جو سفید رنگ ہوتا ہے وہاں سے انہوں نے کھنب کا لفظ لیا۔ اس نے اس کپڑے کو تو سفید کر دیا۔ اب اس کی جو سلوٹیں' شکنیں اور ناہمواریاں تھیں' انہیں نکالنے کے عمل کیلیے کہا گیا کہ اس کی ذرا ''کھنب'' نکال دو۔ وہ یہ ''کھنب'' کس طرح نکالتا تھا؟ اس کے ہاتھ میں موگری ہوتی تھی' کپڑے کو وہ تخت پر بچھا دیتا تھا اور اسے کوٹ کوٹ کر ''پدرا'' یعنی ہموار کر دیتا تھا پھر اس میں کوئی' کسی بھی طرح کی' سلوٹ اور شکن نہیں رہتی تھی۔ یہ ''پدرا'' کرنا بھی محاورہ ہے۔ کیا آپ کو اس کا علم ہے؟ ''ذرا اسے پدرا کر دو۔'' آج بھی اگر آپ اُن دیہاتوں میں جائیں جہاں شہروں کے رنگ وروپ میں وہ دیہاتی زیادہ نہیں ڈھلے۔ وہ آج بھی یہ کہتے ہیں کہ ''ذرا دیکھو' یہ بڑا ابڑھ چڑھ رہا ہے' اس کی ذرا ''کھنب'' نکال دو۔'' ''اس کی کھنب نکال دو۔'' بات یہ کہی ہے کہ فرعون نے سرکشی اختیار کی ہے' اپنے آپ بہت ہی ''بڑا'' بن چکا ہے...... ظالم' کلی اختیارات کا مالک۔ اس نے اپنے آپ میں بڑی شکنیں پیدا کر لی ہیں۔ اس طرح ہم نے اس کی ''کھنب'' نکال دی۔ اب آپ کو بات کا مزہ آیا! اب کیا کسی اور تفسیر' کسی اور کہانی بیان کرنے کی ضرورت ہے؟ لیکن اگر یہ ''کھنب'' نکالنے کی بات ذہن میں نہ ہو تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ یہ کیا کہتا ہے: **فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا** (73:16) اسے لے آؤ۔ پھر اسے پکڑ کر' ہم نے اس کی ''کھنب'' نکال دی۔ اس کا بھرکس نکال دیا۔
2. کیا آپ کو معلوم ہے کہ ''کھنب'' کیا ہوتی ہے؟ یہ بھی معلوم نہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ پدرا کسے کہتے ہیں؟ وہ بھی معلوم نہیں۔ بیٹی! یہ جو برسات میں مشروم (Mushroom) اُگتی ہیں' انہیں کھنمیاں کہتے ہیں۔
3. وہ اتنا سفید ہے جتنی برف

ہوتی ہے۔تو ہمارے ہاں' پنجابی میں' جو چیز سب سے زیادہ سفید ہے وہ کھنبی ہوتی تھی بالکل سفید: ''کھنبی وانگوں کسے چیز نوں کر دینا۔ دھوبی جو کپڑے لے جاتا تھا' دھونے کے بعد' سکھانے کے بعد' وہ اس کو کھنبی وانگوں سفید کر دیندا سی۔ایتھوں لفظ آیا کھنب۔ وہ سفید کرنے کے لیے بھٹی پہ جب چڑھاتا تھا تو کیندے سی انوں کھنب چاڑھ دتی اونے۔ وہ سفید کپڑے' دھونے کے بعد' سکھانے کے بعد' ایہہ کپڑے کھنب کہلاندے سن۔ ❶ اب اس ''کھنب'' میں سفید یہ تو ہوگئے' جو سلوٹیں ہیں' شکن ہیں' ناہمواریاں ہیں' ان کو دُور کرنے کے لیے آج تو آپ اُن پر Iron (استری) کر دیتے ہیں۔اُس زمانے میں ان کے پاس Iron (استری) نہیں تھی۔ان کے پاس وہ موگری ہوتی تھی۔اس موگری سے وہ اِن کو کوٹتا تھا۔کوٹ کوٹ کے اس کی سلوٹیں ٹھیک کرتا تھا' جیسے ہر فرعون کی سلوٹ اسی طرح سے ٹھیک کی جاتی ہے۔موگری نہ ہو' عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد۔''موگری ہتھ اچ نہ ہووے تے' فیر کھنب نئیں ٹھپی جاندی کسے دی وی۔'' ❷ قرآن کا انداز تو کہاں سے لاؤں لیکن بہرحال اس سے نیچے اتر تا ہوں تو اس کے بعد یوں ہے جو میں سمجھ جاتا ہوں کہ بات کیا تھی۔اس وقت کے سامعین یا اس کے بعد بھی جن کے پاس یہ درس جائے گا' وہاں جو حضرات پنجابی نہ سمجھتے ہوں' میں آج ان سے معذرت چاہتا ہوں کہ یہ بات کچھ اسی طرح سے بن پڑتی تھی۔ ''کھنب ٹھپن دی گل' ایہدے بغیر سمجھ اچ آ ہی نئیں سکدی ہیگی سی۔'' ❸ فَعَصٰی فِرْعَوْنُ (73:16) فرعون نے قوانین خداوندی سے سرکشی برتی۔فرعون کی پہلی بات تو یہ تھی کہ ''او بڑا سر کڈیا ہویا سی:'' ❹ سلوٹیں' شکنیں' ناہمواریاں' سرکشیاں اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔اتنی چیزیں اس میں آ گئی تھیں۔ایک ''وبیل'' کا لفظ کہنے سے' کہ ''یہ سارا کچھ جو تھا اونوں پدرا کر دتا سی' ❺ پوری بات سمجھ میں آ گئی۔کہا کہ ان کو یہ کچھ سنا دو۔ جو جانتے تھے کہ وبیل کیا ہوتی ہے اور کس طرح سے پھر سلوٹیں دُور کی جاتی ہیں' وہ سمجھ گئے تھے۔ پھر اس کے بعد فتح مکہ میں سامنے آنے کے بعد' آپ ﷺ نے پوچھا تھا کہ تمہارے ساتھ اب کیا کیا جائے؟ انہوں نے کہا کہ جو ایک شریف بھائی دوسرے بھائیوں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

---

❶ کھنب (Mushroom) کی طرح کسی چیز کو سفید کر دینا۔ دھوبی جو کپڑے لے جاتا تھا' دھونے اور سکھانے کے بعد وہ ان کپڑوں کو کھنب (Mushroom) کی طرح سفید کر دیتا تھا۔ یہاں سے لفظ کھنب (Mushroom) آیا۔ جب وہ کپڑے سفید کرنے کے لیے بھٹی پر چڑھاتا تھا تو کہتے تھے کہ ''اس نے انہیں کھنب (Mushroom) چڑھا دیا۔ وہ سفید کپڑے' دھلنے اور سکھانے کے بعد کھنب کہلاتے تھے۔

❷ اگر موگری ہاتھ میں نہ ہو تو پھر کسی کا بھی بھرکس نہیں نکالا جا سکتا' اس کی سلوٹیں اور شکنیں نہیں نکالی جا سکتیں۔

❸ ''کھنب ٹھپنے کی بات'' اس کے بغیر آج سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔

❹ وہ بڑا اکڑفوں اور سرکش و سرغنہ تھا۔

❺ اس کی یہ تمام سلوٹیں اور شکنیں نکال دی گئیں۔

فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ کا اہل قریش سے حسن سلوک

عزیزانِ من! کیا بات تھی ان قریش کی! رحم نہیں مانگا۔ بڑے ''سرکڈ'' واقع ہوئے تھے۔ معافی نہیں مانگی۔ شریف بھائی کہہ دیا اور بھائی کو بھی جب شرافت کے ساتھ متمسک کیا تو پھر اس نے وہ شرافت کا ثبوت دیا کہ دنیا میں ضرب المثل بن گئی: **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَـوْمَ** ❶(12:92)۔ جاؤ! کھول دو ان کی بیڑیاں' ہتھکڑیاں کہ شریف بھائی کا سلوک مانگتے ہیں۔ یہ ہے سلوک شریف بھائی کا۔ اب وہ **اَخْذًا وَّبِيْلًا** (73:16) نہیں ہوا۔ بھر کس نہیں نکالا ان کی سلوٹیں اور شکنیں نہیں نکالیں۔ فرعون نے ان کے ساتھ یہ نہیں کیا تھا' ہاں یہ صورت واقع ہوئی: **اَخْذًا وَّبِيْلًا ○ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ○ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ** ❷ (73:16-18)۔ یہاں کہا کہ ان سے کہو کہ اب بھی تمہیں اس دن سے خوف نہیں آتا جس دن کی سختی بچوں کو بوڑھا کر دے گی۔ یہ محاورہ ہوتا ہے کہ میرے یہ بال سفید ہو گئے ہیں ہم کہتے ہیں: تمہیں کیا ہوا کہ یہ بال سفید ہو گئے؟ کہنے لگے: جواں بیٹے کی موت نے ایک دن میں بال سفید کر دیئے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ ڈرو اس دن آنے والی تباہی سے' جس دن بچے بوڑھے ہو جائیں' ان پر آسمان پھٹ پڑے گا اور مزید کہا کہ ان سے کہو کہ یہ دھمکی نہیں ہے بلکہ **كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا** (73:18) جو کہا جا رہا ہے یہ ہو کر رہے گا۔ یہ تباہی اٹل ہے' واقع ہو کر رہے گی۔

اصل بات تصادمات کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا

عزیزانِ من! یہ تھیں ان تصادمات کی منزلیں جن میں راتوں کو جاگنا ہوتا تھا اور دنوں کو سرگرمِ عمل رہنا ہوتا تھا۔ یہ نفل پڑھنے کی بات نہیں ہے۔ یہ کچھ کہنے کے بعد ہمیں اور انہیں مخاطب کیا جا رہا ہے کہ **اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ** (73:19) یہ تمہارے لیے ایک یاددہانی ہے کہ سوچ لو اس قسم کی روشِ زندگی کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔ تاریخ سے پوچھنا ہے تو فرعون سے پوچھو۔ سامنے ہے' تو ان قریش سے پوچھو۔ بعد میں آنے والو! تاریخ کے اوراق سے پوچھو ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں ایک تاریخی حقیقت اور واضح بیان ہے جو عبرت اور موعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس لیے **فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا** (73:19) جس کا جی چاہے اس سے عبرت حاصل کر کے خدا کے نظامِ ربوبیت کے طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے۔ ہم تو کسی کو مجبور نہیں کرتے' بات سمجھا دیتے ہیں اور بتا دیتے ہیں' یاد

---

❶ جاؤ! اب آج تم پہ کوئی سرزنش نہیں۔

❷ ہمارے قانونِ مکافات نے اسے ایسی سختی سے پکڑا کہ وہ اس کی گرفت سے نہ نکل سکا۔ ان سے کہو کہ (جب فرعون جیسا صاحب قوت و جبروت مستبد حکمران ہماری گرفت سے نہ بچ سکا' تو تم ہمارے قوانین سے انکار اور سرکشی برت کر' کیسے بچ جاؤ گے؟ تم پر وہ تباہی آئے گی جس کی شدت اور سختی بچوں کو بوڑھا کر دیا کرتی ہے (عام قانون کی رو سے بچپن مائل بہ عروج ہو کر شباب تک پہنچتا ہے اور پھر زوال شروع ہو جاتا ہے لیکن اس انقلاب کی رو سے' غلط نظام فوراً مائل بہ زوال ہو جائے گا۔ یہ جوان ہونے ہی نہیں پائے گا کہ اس پر بڑھاپا چھا جائے گا۔) ایسی سختی' جس سے آسمان پھٹ پڑے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دہانی کرادیتے ہیں کہ سوچ لو یہ ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد تمہاری مرضی' جس کا جی چاہے' صحیح راستہ اختیار کرلے' جس کا جی چاہے غلط راستے پر چلا جائے۔ یہی جو ہم کہہ رہے ہیں کیونکہ **كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا** (73:18) یہ تباہی اٹل ہے' واقع ہوکر رہے گی۔ یہ ہوگا اسی طرح۔ نہ فرعون پہ بات ختم ہوئی اور نہ قریش پہ معاملہ ختم ہوا۔ خدا کے یہ قوانین ابدی اور ازلی ہیں' قیامت تک کے لیے ہیں' جب تک انسان موجود ہے ہر دور میں یہی ہوگا۔ ہر دور میں جب بھی فرعون سرکشی اختیار کرے گا یہی کچھ ہوگا۔ ''جناں کپڑیاں اچ وی اے شکناں ہون گیاں' اوناں نوں فیر پدرا کیتا جاوے گا۔''❶ **كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا** (73:18) خدا کے یہ وعدے قیامت تک کے لیے ہیں۔ جو کہا گیا ہے' اسی کے مطابق ہوگا۔ قانون کہتے ہی اس کو ہیں۔ آپ کو قانون کی Definition (تعریف) معلوم ہے؟ وہ ہے: If then ever یعنی یہ کرو گے تو یہ ہوگا اور ہمیشہ ہوگا۔ اس لیے یہ **كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا** (73:18) ہے۔ عزیزانِ من! اب آگے کہا کہ جہاں سے بات چلی تھی' ہم تیری توجہ پھر اسی نکتہ کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں: بات چلی تھی راتوں کو جاگنے کی۔

قرآن کے لفظ ''تقوم'' کا مفہوم

قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ **اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ** (73:20) تمہارا یہ رب تمہیں دیکھ رہا ہے کہ کبھی تو دو تہائی رات گئے تک اس پروگرام میں مشغول رہتا ہے' کبھی نصف رات تک اور کبھی ایک تہائی شب تک اور تیرے رفقاء کی ایک جماعت بھی تیرے ساتھ ہوتی ہے اور اللہ نے رات اور دن کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ رات کے وقت آرام کرنا بھی ضروری ہوتا ہے (78:9-11)۔ تقوم کے معنی کھڑا رہنا ہی نہیں ہوتا' اس کے معنی مصروف رہنا ہوتا ہے' کسی کام میں سرگرمِ عمل رہنا ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ راتوں کا کتنا بڑا حصہ' کبھی دو تہائی' کبھی نصف اور کبھی ایک تہائی کام میں مصروف رہنا ہوتا ہے اور تمہارے ساتھ تمہارے ساتھی بھی ہوتے ہیں تو گویا اب نظر آ گیا کہ یہ کوئی اکیلی بات نہیں تھی' کام کی انتہائی مصروفیت تھی۔ مگر بقول ان کے حضور ﷺ تو ساری رات نفل پڑھتے رہتے تھے۔ پھر کہا کہ یہ باقی ساتھی وہاں بیٹھے ہوئے صرف آپ کو دیکھا کرتے تھے کہ حضور ﷺ نفل پڑھ رہے ہیں اور یہ بھی ساتھ ہیں مگر قرآن تو کہتا ہے کہ **وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ** (73:20) ہم نے رات اور دن کے پیمانے مقرر کیے ہوئے ہیں جن میں قرآن نے کہا ہے کہ رات سکون کے لیے ہوتی ہے (78:9-11) دن میں جتنی بھی زیادہ تھکان واماندگی ہوتی ہے' رات اسے Remove (ختم) کردیتی ہے۔ اس کے لیے نیند ضروری ہے۔ اس سے انسان دوسرے دن کے لیے تیار ہو جاتا ہے' اس لیے کہا کہ ہم نے دن اور رات اس کے لیے مقدر کردیئے ہوئے ہیں اور اس مصروفیت کے کام میں تمہارے ساتھ تمہاری ایک جماعت بھی ایسی ہے جن کے لیے قرآن نے

---

❶ جن ''کپڑوں'' میں بھی یہ شکنیں ہوں گی' انہیں (موگری سے) ہموار کیا جائے گا' ان کا بھرکس نکال دیا جائے گا۔

والذین معہ کہا ہے۔ ان کے مقام کا تو پھر پوچھو نہیں کہ کیا تھا! مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (48:29) محمد رسول اللہ ﷺ اور اس کے رفقاء کار کی جماعت کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں لیکن باہمد گر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد ہیں (5:54)۔ اب پوری جماعت کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے۔ جمع کا صیغہ ہے۔ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْہُ (73:20) ہم جانتے ہیں کہ تم ہمیشہ کے لیے مستقل طور پر اسے نباہ نہیں سکو گے' بیمار ہو جاؤ گے۔ تمہاری بیتابی تمنا اور وفورِ شوق کا تقاضا ہے کہ یہ پروگرام جلد سے جلد تکمیل تک پہنچ جائے' اس لیے تم اپنی نیند اور آرام کا قطعاً خیال نہیں کرتے۔ تم رات کو جاگنے کی اس مصروفیت کو نباہ نہیں سکو گے۔ فَتَابَ عَلَیْکُمْ (73:20) اس لیے خدا بھی تمہیں اس چیز کیلیے کچھ گنجائش دیتا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ رعایت برتتا ہے۔ یوں اس طرح سے مبالغے میں آ کے' ایک ہی دم' یہ کچھ نہ کر سکو گے' تھک جاؤ گے۔ یہ بڑی چیز ہے' آخر تک یہ روش چل نہیں سکے گی' آہستہ آہستہ کرو' اس میں زیادہ وقت بھی دیا جا سکتا ہے لیکن عام حالات میں حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ اس لیے سوال یہ ہے کہ اب کیا کرو؟ اس کے لیے کہا کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (73:20) خدا تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے لہٰذا تم قرآنی تعلیم کے جتنے حصے کی اپنی جماعت کے قلب کی زمین میں بآسانی تخم ریزی کر کے اسے قابل کاشت بنا سکو' اتنے ہی پر اکتفا کرو:

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے راہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

قم الیل کی تفسیر

پھر مشکل مقام آیا: بقول ان کے قُمِ الَّیْلَ (73:20) کی تفسیر آ گئی کہ حضور ﷺ نفل پڑھا کرتے تھے۔ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (73:20) اس کے متعلق یہ ہوا کہ قرآن قرأت کے ساتھ پڑھا کرو۔ قرآن کا مصرف صرف قرآن کا پڑھنا ہے۔ ایک چیز تو تلاوتِ قرآنِ کریم ہوتی ہے وہ تو آجکل ویسے ہی عام ہو رہی ہے۔ جو جلسہ ہونا ہوتا ہے اس میں سب سے پہلے تلاوتِ قرآنِ کریم ہوتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے خط کے اوپر ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھتے تھے' نیچے چاہے گالیاں ہی لکھی ہوئی ہوں۔ خود لفظ تلاوت کے معنی ہیں پیروی کرنا' اتباع کرنا' کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ یہ اسی لیے تو ضابطہ ہدایت ہے۔ کتاب تو کہا ہی ضابطہ قوانین کو جاتا ہے۔ اسے پڑھا اس لیے جائے تا کہ سمجھا جائے۔ اس کی پہلی بنیادی شرط تو یہ ہے لیکن کسی کتاب کا سمجھ لینا مقصود بالذات نہیں ہے' یورپ کے مستشرق ہم سے زیادہ بہتر طور پر اس عربی زبان کی کتاب کو سمجھتے ہیں۔ سمجھنا ہی آخری چیز نہیں ہے پھر اس کو Follow (اتباع) کرنا' اتباع کرنا' پیروی کرنا' ضروری امر ہے۔ تلاوت کے معنی یہ تھے۔ اب یہاں یہ آیا کہ فَاقْرَءُوْا [1] (73:20) تو بقول ان کے اب یہ قرأت آ گئی۔

---

[1] اس کی پیروی و اتباع کرو۔ اسے اپنے قلب کی زمین میں (بآسانی تخم ریزی کر کے) قابل نشو و نما بناؤ۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لفظ قرآن کے معنی اور اقراء کا مفہوم

عزیزانِ من! ہمارے ہاں خود قرآن کا لفظ آیا۔ یہ لفظ قرآن خود غور طلب ہے۔ یہ نام خدا نے تجویز کیا ہے۔ اس کے لیے بنیادی لفظ قراء ہے۔ بعض لغوین کا خیال ہے کہ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں: Proclamation (اعلامیہ)۔ یہ وہی ہے جو کسی حکومت کی طرف سے اعلامیہ شائع ہوتا ہے۔ اسے منشور یا Proclamation ہی کہتے ہیں۔ یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ اعلانِ عام کر دیا جائے۔ اگر یہ عبرانی لفظ ہے تو اس کے معنی ہیں: اعلانِ عام۔ اِقْـرَاْ بِـاسْـمِ رَبِّکَ (96:1) اٹھ اعلان کر، ساری دنیا کے اندر کہ ربوبیتِ عظمٰی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اِقْـرَاْ (96:1) بلند کر، اعلانِ عام کر دے۔ یہ نہیں کہ لو پڑھ قرآن کو۔ اقراء بڑی چیز ہے۔ اگر اس لفظ کو عربی زبان کے اعتبار سے لیا جائے تو اس کا مادہ ہے: ''ق ر ء'' قرء۔ کیا بات ہے اس قوم کی کیا زبان ہے! انہوں نے کیا زبان بنائی تھی! اس ''قرء'' کے ایک معنی تو ہوتے ہیں: کسی چیز کو جمع کرنا، اکٹھا کرنا۔ لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ اس قوم کے ذہن کی باریکیوں کی طرف جایئے تو اس کے اندر جمع کرنا اور محفوظ رکھنا دونوں آ جاتے ہیں۔ لیکن ایک چیز جمع کر کے اکٹھی رکھنا ہے، جیسے آپ نے کچھ روپیہ، سو روپیہ، ہزار روپیہ جمع بھی کیا، اکٹھا بھی کیا، محفوظ بھی رکھا۔ آپ نے اپنی تجوری میں یا الماری کے اندر رکھ دیا۔ اب وہ رکھا ہوا ہے: مہینہ، دو مہینے نہیں، سال دو سال نہیں، جتنا عرصہ جی چاہے رکھا رہے، وہ سو کا سو ہی رہے گا۔ محفوظ تو رہے گا، اس میں نشو و نما نہیں ہوگا۔ اس کے لیے ان عربوں نے ایک بات کی ہوئی تھی: یہ جو ''قرء'' کا لفظ جمع کرنا، محفوظ رکھنا تھا، وہ اس انداز سے تھا جیسے عورت کے رحم میں نطفہ محفوظ اور جمع ہوتا ہے۔ وہاں وہ محفوظ بھی ہوتا ہے اور وہیں نشو و نما پا کر بچہ بن جاتا ہے۔ اس قسم کی کسی شے کی جو حفاظت ہوتی تھی کہ پہلے تو وہ شے جمع کی جائے۔ جمع کا لفظ تو آپ سمجھتے ہی ہیں کہ Pregnancy (حمل) میں پہلا ہی لفظ ''جماع'' کا آ جاتا ہے پھر اس کی حفاظت کی بات رحمِ مادر کے اندر ہے۔ وہاں وہ محفوظ رہتا ہے تو آگے بچہ بنتا ہے۔ لیکن اس قسم کی حفاظت کہ محفوظ بھی رہے اور روپے کی طرح جامد نہ رہے بلکہ وہ نشو و نما پاتا ہوا چلا جائے۔ ایک اس قسم کا ضابطہ قوانین کہ جو جمع کیا ہے، اس کو ضابطہ بنایا ہے، متفرق قوانین نہیں بلکہ ضابطہ حیات مرتب ہے، پھر اس کو محفوظ کیا گیا ہے اور کیفیت یہ رکھی ہے کہ وہ قیامت تک، زمانے کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا، ارتقائی منازل طے کرتا چلا جائے۔ ایک لفظِ قرآن کے اندر یہ سب باتیں آتی ہیں۔ یہ جامد نہیں ہے، اس نے قیامت تک انسانیت کا ساتھ دینا ہے، اس میں جمع، حفاظت، ارتقاء اور نشو و نما کی صلاحیتیں موجود ہوں گی۔ یہ تھا قرأتِ قرآن۔ اس طرح قرآن کو پڑھا جائے سمجھا جائے اور سمجھنے کے بعد عمل میں لایا جائے تو اس سے زیادہ اور بہتر حفاظت کسی چیز کی نہیں ہو سکتی۔ پڑھ کے دکھا دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ جوں جوں زمانے کے تقاضے بڑھتے چلے جائیں یہ اس کا ساتھ دیتا ہوا چلا جائے، اس سے یہ نشو و نما خود ہوتی چلی جائے۔ اور یہ جو عمل تھا جس میں ایسا کچھ ہوا اس کو قرأت کہتے تھے۔ اس کے لیے کہا تھا: قُـمِ الَّيْـلَ (73:2) رات کو بھی جاگا کر۔ مگر

بقول ان کے جو کام کی مصروفیت کے لیے رات کا جاگنا تھا وہ تو ہو گئے نفل اور وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (17:79) اور اگر حالات کا تقاضا اس سے بھی زیادہ کا ہو تو تم رات کے کچھ حصے میں بھی اس مقصد کے لیے جاگتے رہو اور معاملات پر مزید غور و فکر کرو۔ یہ اضافہ خصوصیت سے تمہارے لیے ہے۔ مگر اب بقول ان کے یہ ہو گئی تہجد کی نماز اور یہ جو فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (73:20) تھا' یہ ہو گئی قرأت۔ چل بھئی موج ہو گئی۔

ہمارے ہاں قرأت کا مفہوم

عزیزانِ من! اب وہ قرآت والی بات جو تھی اس کے لیے پہلے تو ناظرہ قرآن پڑھانا شروع کیا۔ یہ لفظوں کے اعتبار سے کہانی شروع ہو گئی۔ ایک بھی لفظ کے معنی بتائے بغیر یہ کہانی شروع ہوئی۔ یہ تو صرف پڑھانے ہی والا تھا۔ اِن کے بعد آگے آئے تو پھر یہ ذریعہ رزق بنتا ہے' پھر وہ حافظ آئے' انہوں نے حفظ کرانا شروع کر دیا' سارا قرآن حفظ کرا دیا۔ ایک لفظ کے معنی بھی نہیں جانتے: نہ وہ پڑھانے والا جانتا ہے' نہ وہ پڑھنے والا جانتا ہے۔ پھر اس کے شیپنے ہونے شروع ہو گئے۔ اب حفظ بھی کرا دیا' پڑھا بھی دیا' اب اور لوگ آ گئے۔ ان کے لیے گنجائش کہاں نکلے؟ انہیں کہا کہ قرأت ایک الگ فن ہے' قرآن کا علم ہے اس طرح سے یہ حرف یہاں سے نکلے گا' یہ یہاں سے نکلے گا۔ اب یہ الگ قاریوں کا ایک طائفہ ہوا: وہ یہ کچھ بتاتے ہیں' اس میں بھی کوئی معنی کی بات نہیں ہے' قرآن کے الفاظ ہی ہیں' ویسے کے ویسے ہی۔ اس میں کسی نشو و نما اور ارتقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' نہ Follow کرنے کا ہوتا ہے' نہ اتباع کا ہوتا ہے' الفاظ ہیں۔ قاری کا بھی یہی حال ہے۔ اسے کسی لفظ کے معنی معلوم نہیں۔ پھر قرأت کے بڑے بڑے قاری آتے ہیں۔ یہاں کے قاری' مقامی نہیں' باہر کے قاری ہیں جو آپ کے ہاں طائفے آتے ہیں' گروہ آتے ہیں: مصر کے' حجاز کے۔ قرأت ایک فن بن گئی۔ اور قرآن کا قاری ایک الگ فن کا جاننے والا ماہر بن گیا۔ وہ قاری لے سے پڑھتے ہیں' لے سے قرأت کرتے ہیں۔ میں پھر آپ کو عرض کروں کہ ''پنجابی اچ او راءِ نال قرآن پڑھدا ہیگا۔ کدی سنیا جے اے لفظ؟ ہم نے یہ لفظ ہی نہیں سنے: ڈاہڈے چنگے راء نال پڑھدا ہیگا قرآن۔''[1] یہ خوبی ہو گئی۔ اب جو قاری آتے ہیں ان کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ''بڑے چنگے راء نال پڑھدے ہیگے۔''[2] یہ قرأتِ حجاز میں پڑھتے ہیں یہ قرأتِ مصر میں پڑھتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ دو قرأتیں ہیں۔ اس میں کیا فرق ہوگا؟ کہا کہ فنِ قرأت کے لحاظ سے جو ہو گا وہ الگ ہو گا۔

---

1. میں پھر آپ کو پنجابی زبان میں عرض کروں کہ وہ بڑی ہی عمدہ لے سے قرآن پڑھتا ہے۔ کیا کبھی آپ نے یہ لفظ سنا ہے؟ ہم نے یہ الفاظ ہی نہیں سنے: بڑی ہی عمدہ لے سے قرآن پڑھتا ہے۔
2. بڑی ہی عمدہ لے سے پڑھتے ہیں۔

بھیروں راگ اور بھیرویں راگ کی وضاحت

عزیزانِ من! میں کچھ موسیقی بھی جانتا ہوں۔ یہ جو حجازی قرأت ہے وہ ایک راگ ہوتا ہے۔ اسے بھیروں کہتے ہیں۔ یہ سورج نکلنے سے پیشتر جو آخری شب ہوتی ہے اس میں یہ ہندوؤں کا راگ تھا۔ یہ راگ ہندوؤں کے ایجاد کیے ہوئے ہیں۔ وہ اس سے اپنے ہاں کے دیوتاؤں کو جگاتے تھے۔ یہ ایسا راگ ہے جس میں بڑا ہی سوز ہوتا ہے' نرمی ہوتی ہے' لطافت ہوتی ہے۔ یہ بھیروں کے اندر ہے۔ اس طرح جو حجازی قرأت ہے وہ بھیروں راگ میں ہے۔ اس کے بعد ایک راگ آتا ہے' وہ بھیرویں کہلاتا ہے۔ وہ دن چڑھے شروع ہوتا ہے۔ اس میں کچھ جوش' تھوڑی سی مسرت' انبساط' خوشی کا پہلو ہوتا ہے۔ یہ مصری لے ہے۔ یہ بھیروی میں ہوتی ہے۔ اب جہاں آپ ان قاریوں پر بے ساختہ جھومتے ہیں وہ مقام ہوتا ہے جہاں اس راگ کی ایک لے آتی ہے۔ بہر حال بقول ان کے راگ حرام اور ان راگوں کے اندر جو قرأت ہے وہ اتنا بڑا ثواب! یہ قرأت' یہ قاری اور یہ اقراء۔ وہ نفل ہو گئے' قرآن میں تلاوت اور قرأت رہ گئی۔ کرتے رہو پھر۔ یہ ایک ایک رات کے اندر قرآنِ کریم ختم کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے قاری آ رہے ہیں۔ اب تو ان کے بلانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے کیسٹ گھر گھر موجود ہیں۔ اب قرآن کا اور بھی زیادہ جوش و خروش ہے اور خوش ہو رہے ہیں کہ قرآن کی بڑی نشر و اشاعت ہو رہی ہے۔ گھر گھر یہ کیسٹ موجود ہیں' گایا جا رہا ہے' پڑھا جا رہا ہے۔ ''راءِ نال پڑھیا جا ریا ہیگا۔ [1] قرآن کی قرأت ہو رہی ہے' اس سے زیادہ کسی دَور کے اندر اسلام کا اور کیا نفاذ ہوگا' اتنی بڑی چیز ہو گئی!! یہ الگ بات ہے کہ اس لاؤڈ اسپیکر کو جو شروع میں آیا ہے تو اس کو مفتی صاحبان نے حرام قرار دیا تھا' اب وہ لاؤڈ اسپیکر ہی نہیں ہیں' اب تو سارے معاملے وی سی آر تک چلے ہوئے ہیں' اب یہ دین کی احیاء ہو رہی ہے: قرأت' تلاوت' حفظ قرآن' تجوید قرآن۔ کہا کہ یہ جو سارا کچھ ہے' یہ تم نے کہاں سے لیا؟ کہنے لگے: قرآن میں ہے۔ دیکھو لو لکھا ہے: فَاقْرَءُوْا (73:20) جتنا سا ہو سکے' آسانی سے' اتنا سا پڑھ لیا کرو۔ اب یہ سارا کچھ' دن بھر کی تگ و تاز کے بعد' اکٹھے ہوئے' نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم آ کے جمع ہوئے۔ کاہے کے لیے یہ سب کچھ ہوا' یہ سب جمع ہوئے؟ کہ وہ تھوڑا سا قرآن پڑھ لیا کرو جناب۔ عزیزانِ من! خدا یہ کہہ رہا ہے کہ ''وہ تھوڑا سا پڑھیا کرو' زیادہ نہ کریا کرو' تسی سونا وی ہیگا اے رات نوں' تھوڑا جیا پڑھیا کرو۔'' [2]

سب کچھ بدل دیا گیا

ایک چیز یوں بدل گئی: خدا کی حکمرانی کی بجائے انسانوں کی حکمرانی آئی' نیچے سے سب کچھ بدلا گیا۔ ملوکیت کے اندر یہ قرأتیں' یہ

---

[1] بڑی ہی عمدہ لے سے پڑھا جا رہا ہے۔

[2] وہ تھوڑا سا پڑھا کرو' زیادہ نہ کیا کرو' تمہیں رات کو سونا بھی ہوتا ہے' تھوڑا سا پڑھا کرو۔

تلاوتیں قرآن کے اِن الفاظ کو فٹ ان (موزوں:Fit-ni) نہیں کر سکتی تھیں' ان کے وہ مفہوم پیدا کر دیئے جو اس مشینری میں فٹ کر جائیں۔ اب اس میں جتنا زیادہ زور دیئے چلے جائیں گے اتنا ہی زیادہ نفاذِ اسلام' احیائے اسلام' ہوتا چلا جائے گا' یا للعجب! لیکن آپ اس پر ذرا اعتراض کر کے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے۔ اب تو جنودِ ہامان کی یلغار ہے۔

قرآنی پروگرام کی تکمیل کے لیے ہدایات

آپ اس بات پر غور کریں کہ قرآن کی حکمرانی کے لیے کیا کچھ کرنا ہوگا جو یہ کچھ کرے گا امامت اس کے حصے میں آئے گی اس لیے کہا تھا کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (73:20) [1] بیٹھو حضور ﷺ ' اور آپ کے ساتھی بھی راتوں کو بیٹھیں اور پھر یہ سوچو کہ یہ کیسے کیا جائے گا' پروگرام اس طرح سے بناؤ کہ اس پہ عمل کیا جاسکے اور یہ ناممکن العمل نہ ہو' جتنا ممکن ہو وہ کرو Gradually (بتدریج) کرو' Progressively (مسلسل والتزاماً) کرو' آہستہ آہستہ اس کو کرتے چلے جاؤ۔ اس لیے کہا کہ عَلِمَ اَنْ سَیَکُوْنُ مِنْکُمْ مَّرْضٰی وَ اٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (73:20) وہ جانتا ہے کہ تم میں سے بعض کی صحت کمزور ہے اس لیے وہ اس طرح بیمار پڑ جائیں گے۔ بعض ایسے ہیں جنہیں تلاش معاش کی خاطر دوسرے مقامات کی طرف سفر کرنا پڑتا ہے اور انہی میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں اس نظام کی حفاظت کے لیے میدانِ جنگ میں بھی جانا ہو گا جس کے لیے عمدہ صحت اور تنومندی نہایت ضروری ہے۔ اس طرح یہ دیکھو تو سہی کہ تمہارے پاس یہ کام اتنا ہی تو نہیں ہے کہ رات کو بیٹھ گئے اور یہ اتنا کچھ کیا' یہ بھی دیکھو کہ یہ جو رات کو تمہاری بیٹھک ہے' اس میں کتنا وقت چاہیے اور کیا کیا پروگرام بنانا چاہیے۔ پھر کہا کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ (73:20) [1] جتنا اس پروگرام کے تابع آسانی سے ممکن ہو' اتنا ہی کرو۔ انسان کی ایک عجیب فطرت ہوتی ہے کہ جب معاملہ آگے بڑھتا ہے یا جب معاملہ پڑتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ کسی طرح سے یہ سب کچھ آج ہی ہو جائے یہ بڑی خواہش ہوتی ہے۔ انسان کے دل میں جو بڑا ذوق اور جذبہ ہوتا ہے وہ بڑا تیز ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ دیکھنا پڑا کہ انہیں خدا کو روکنا پڑ رہا ہے۔ کہا کہ تھک جاؤ گے۔ ''یہ بڑی لمبی بات ہیگی اے۔ اے منزلاں جیہڑیاں نیں' اے بڑیاں کٹھن ہیگیاں نیں۔ سوچ سمجھ کے تھوڑا تھوڑا کرو۔ کوئی گل نئیں۔'' [2]

نبی اکرم ﷺ کی تمنائے بے تاب کا اظہار

عزیزانِ من! ایک چیز رسول اللہ ﷺ کے ذہن میں تھی۔ میں کہا کرتا ہوں کہ وہ ایک بڑی معصوم سی آرزو تھی کہ یا اللہ! میری ساری عمر' اسی طرح سے' ان مشکلوں میں' ہی گزر جائے گی یا یہ جو ہمارے سامنے منزلِ مقصود ہے وہ حاصل بھی ہو جائے گی۔ یہ چیز تھی جس

---

[1] لہٰذا تم قرآنی تعلیم کے جتنے حصے کی اپنی جماعت کے قلب کی زمین میں بآسانی تخم ریزی کر کے' اسے قابل نشو و نما بنا سکو' اتنے ہی پر اکتفا کرو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] یہ معاملہ بڑا لمبا ہے' یہ بڑی ہی کٹھن منازل ہیں' سوچ سمجھ کر کام کرو' کوئی بات نہیں (معاملات حل ہوتے چلے جائیں گے۔)

کے لیے یہ نظر آتا ہے کہ آپ بہت شدت سے' تیزی سے' آگے بڑھ رہے تھے' روکا گیا اور واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تمہارا ذمہ یہ نہیں کہ تمہاری زندگی میں یہ کچھ ہو جائے' تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ اِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ (13:40) اس کو پہنچاتے چلے جاؤ۔ یہ ہمارا قانون دیکھے گا کہ نتائج کب ظہور میں آتے ہیں' اس کام نے کب ہو جانا ہے' تمہارا کام یہ ہے کہ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَیَسَّرَ مِنۡہُ (73:20) تم قرآنی تعلیم کے جتنے حصے کی اپنی جماعت کے قلب کی زمین میں بآسانی تخم ریزی کر کے' اسے قابل نشو ونما بنا سکو' اتنے ہی پر اکتفا کرو یعنی تم قرآن اُتنے ہی حصے کو اس طرح ذہن نشین کراؤ کہ جتنا ہو سکے اور دیکھو کہ اس کے بعد اس پروگرام کا کتنا حصہ آگے ہے جو کرنا ہے مگر ان کے ہاں یہ ہو گیا: رات کو کھڑے ہو کے نفل پڑھیے' قرآن کی قرأت کیجیے' قاری بن جایئے۔ اس کے بعد کیا ہوگا اور پھر اس پروگرام کا کیا بنے گا؟ انہوں نے کہا کہ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (73:20) نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو۔

عزیزانِ من! ہر روز یہ لکھا ہوا آتا ہے کہ نماز قائم کیا کرو' نماز پڑھا کرو' زکوٰۃ دیا کرو۔ یہ جو آپ کے ہاں بینک میں سود کی رقم ہے' اس میں سے اڑھائی فی صد ادا کر دیا کرو۔ بقول ان کے پروگرام یہ ہوا۔ یہ اس پروگرام کی بات نہیں تھی۔ اس میں کہا یہ تھا کہ اس طرح آہستہ آہستہ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرتے جاؤ اور نوعِ انسانی کی نشو ونما کا انتظام کرو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی دولت وَ اَقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا (73:20) اس نظام کو بطور قرض دے دو جو تمہیں کئی گنا ہو کر واپس مل جائے گی۔ یہاں کہا کہ خدا کو حسنہ قرض دیا کرو۔ کیا بات تھی اس حسنہ کی!

قرضِ حسنہ کسے کہتے ہیں؟

عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ میں ان لوگوں کے ہاں قرض حسنہ کیا چیز تھی؟ آپ نے جگالی کرنے والے جانور' مویشی' دیکھے ہونگے۔ کبھی اونٹ دیکھے ہوں تو نظر آتا ہے کہ انہیں اتنی جلدی ہوتی ہے کہ وہ کھائے جاتے ہیں' کھائے جاتے ہیں' نگلے جاتے ہیں۔ کھائے نہیں جاتے بلکہ جلدی جلدی نگلے جاتے ہیں گویا کہ ان کے پیچھے ڈنڈا ہوتا ہے' وہ انہیں فرصت نہیں دیتا اس لیے وہ صرف نگلے جاتے ہیں۔ جب پھر اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں تو آپ کو پتہ ہے کہ وہ اتنا بڑا گولا اندر سے ''آ ووم''[1] کر کے لاتے ہیں اور پھر اسے لا کر' منہ میں رکھ کر' بڑے مزے میں سر ہلا ہلا کر' دانتوں سے اِسے آہستہ آہستہ پیستے رہتے ہیں۔ یہ جو چیز ہے کہ دی جائے تو وہ اس طرح ہو اور وہ واپس ملے تو ایسے کہ وہ نشو ونما کے لیے جسم کا ایک حصہ بن جائے اسے قرض کہتے ہیں۔ لیا تو تم نے یوں تھا' وہ اس قسم کا ہی تھا جیسے وہ چارہ تھا۔ یہ جو نظامِ خداوندی ہے یہ اسے پھر اس طرح سے پیتا ہے کہ وہ معاشرے کی نشو ونما کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ یہ اس قسم کا (عمل) Process ہے کہ جسے قرض حسنہ کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ اپنی دولت اس نظام کو دو' ہم کھا نہیں جائیں گے' تمہیں اس طرح سے

---

[1] بڑی تیزی سے' دھڑام سے۔

واپس لوٹائیں گے جیسے کہ اونٹ کے منہ میں وہ چارہ واپس لوٹتا ہے اور پھر وہ جگالی کر کے اس کو اپنی نشوونما کا حصہ بنالیتا ہے۔ ایسے کرو۔

اس پروگرام کے ابتدائی دور میں **وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا** (73:20) جو اچھا کام کبھی تم کرو گے' اسے ہم تمہارے کھانے میں جمع کرتے جائیں گے آخر الامر' وہ سب کا سب تمہیں واپس مل جائے گا اور اس کا اجرِ عظیم الگ ہوگا۔ یہ نظام تمہاری پائی پائی واپس لوٹا دے گا اور تمہاری ذات کی نشوونما اس پر مستزاد ہوگی۔ اس طرح یہ سب کچھ کرنے کے بعد کہا کہ **مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ** (73:20) اور یہ سارا کچھ' جو کچھ بھی ہے' ہم اپنے لیے نہیں کہتے۔ یہ تو تمہارے اپنے ہی لیے ہے۔ سوچ لو' تم نے اپنے لیے پہلے سے آگے کیا بھیجنا ہے۔ منزل پہ پہنچ کر تھکے ہوئے ہوگے' وہاں کچھ انتظام کرنا ہوگا۔ بس یہ وہ ہے کہ وہاں پہنچے اور یہ سارا کچھ مل جائے گا' یہ اجرِ عظیم ملے گا۔ یہ ہے وہ طریق جس سے تم **وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ** (73:20) اپنے خدا سے' ان مخالفین کی طرف سے پیدا کردہ خطرات سے حفاظت کا سامان طلب کرتے رہو۔ یہ بڑی چیز ہے۔ اس سے ہر قسم کے خطروں سے' اندیشوں سے' حفاظت ملے گی۔ **اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** (73:20) وہ تمہیں ان خطرات سے محفوظ بھی رکھے گا اور تمہاری نشوونما کے فراواں اسباب بھی عطا فرمائے گا۔ اس طرح حفاظت ہی نہیں' سامانِ نشوونما بھی ملے گا۔

عزیزانِ من! سورۃ المزمل کا پروگرام یہاں ختم ہوتا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

انیسواں باب: سورۃ المدثر (آیات 1 تا 6)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1984ء کی دس تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المدثر سے ہو رہا ہے۔ یہ قرآن کریم کی 74ویں سورۃ ہے۔

جیسا کہ پچھلے درسوں میں آپ کے سامنے وہ انقلابِ عظیم آ تا رہا ہے جسے برپا کرنے کے لیے حضورِ نبی اکرم ﷺ کا ظہورِ قدسی ہوا اور قرآن کا نزول ہوا۔ آخری پارے کی یہ سورتیں اِس انقلابِ عظیم کا پورا منظر سامنے لاتی ہیں۔ نزولی ترتیب کو تو کوئی اہمیت نہیں ہے۔ قرآن اس شکل اور ترتیب سے قرآن ہے جسے نبی اکرم ﷺ نے ہمیں دیا' امت کو دیا ہے' لیکن مضمون کے مفہوم کے اعتبار سے یوں نظر آتا ہے کہ یہ اس انقلاب کے آغاز کی سورتیں ہیں جس کا ظہور آگے چل کر ہوا ہے۔ ایک انقلابِ عظیم دنیا میں آ رہا تھا۔ سورۃ المزمل تو پچھلے دو تین درسوں میں آپ کے سامنے آ گئی۔

مروجہ تراجم میں مدثر کے معنی

اب یہ سورۃ المدثر ہے۔ اس کا آغاز اس سے ہوتا ہے: **يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ o قُمْ فَاَنْذِرْ o وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ o وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ** (74:1-4)۔ عزیزانِ من! قبل اس کے کہ میں ان الفاظ پہ آؤں اور ان کا مفہوم پیش کروں بہتر یہ ہے کہ ہمارے ہاں جوان سورتوں کے' ان آیات کے' عام ترجمے ملتے ہیں' پہلے میں انہیں سامنے لے آؤں۔ ہمارے ہاں کے تراجم میں ویسے تو وہی طرحی غزلیں ہیں۔ طبری [1] نے ایک تفسیر لکھی اور مفسرین اسی پر چلے آ رہے ہیں' لیکن فی الجملہ مولانا امام الہند شاہ محمود الحسن علیہ الرحمۃ [2] کا ترجمہ مروجہ

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (310-224ھ) ان کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرِ نگرانی) مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص۔ 31

[2] ربیع الاوّل 1327ھ میں آپ نے ترجمہ قرآن مجید کی ابتدا فرمائی۔ سوا تین سال کے عرصہ میں 25 جمادی الثانی 1330ھ کو صرف دس پاروں کا ترجمہ کیا۔ 7 ذیقعدہ 1333ھ کو عزم بیت اللہ فرمایا۔ 29 ربیع الثانی 1335 کو مالٹا پہنچے اور عزلت و تنہائی کی فارغ البالی میں شوال 1335ھ کو ترجمہ کا سلسلہ شروع کیا۔ 2 شوال 1336ھ کو مکمل کر لیا۔ دو ماہ صاحب فراش رہ کر 18 ربیع الاول 1338ھ کو سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔ (منظور الحق: بیسویں صدی میں قرآن پاک کے اردو تراجم' شعبہ اردو' سندھ یونیورسٹی' حیدر آباد' 66-1965)

تراجم میں ایک بلند مقام رکھتا ہے: وہ ان آیات کا ترجمہ کرتے ہیں کہ اے لحاف میں لپٹنے والے! کھڑا ہو، پھر سنا دے، اور اپنے رب کی بڑائی بول، اور اپنے کپڑے پاک رکھ، اور گندگی سے دور رہ۔ یہ ان آیات کا ترجمہ ہوا۔ اس ترجمے سے، آپ کی روح میں کوئی ارتعاش، دل میں کوئی کپکپی، روح میں کوئی حرارت، ذہنوں میں کوئی جلا، آنکھوں میں کوئی بالیدگی، کچھ بھی اس سے پیدا نہیں ہوا۔ مدثر سے کیا نقشہ ہمارے سامنے آیا؟ کچھ بھی نہیں۔ عربی زبان کے لغت موجود ہیں، اور جیسا کہ میں ہر بار کہا کرتا ہوں، انہی لغات کا ایک ملخص خود میری تصنیف لغات القرآن ہے۔

مزمل کا لغوی معنی

میری اس لغات میں ان الفاظ کا یا قرآنِ کریم کے تمام الفاظ کا، جنہیں مفردات کہتے ہیں، جو مفہوم یا ترجمہ دیا گیا ہے، وہ میرا اپنا نہیں ہے۔ یہ تو میں جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی الہام نہیں ہے، اس کے تو ہم قائل ہی نہیں ہیں۔ یہی عربی زبان کے جو لغات اور مستند لغات ہیں، انہی میں یہ سب کچھ ہے، وہیں سے میں نے لیا ہے، لیکن یہ آپ دیکھیے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے۔ مزمل میں تو آپ نے دیکھا تھا کہ تزمیل جماعت بندی کو کہتے ہیں۔ اس سورۃ کا یہاں سے آغاز ہوا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ جو المدثر ہے وہ شاید اس سورۃ المزمل کے بعد کا یہ مقصد آیا تھا۔ یہ اعلانِ عظیم ہے۔ یہ پوری کائنات میں انقلاب برپا کرنے کا ایک اعلان ہے۔ یہ انقلاب اس طرح سے آ رہا ہے۔

یہ الفاظ ہیں: **مُدَّثِرٌ، دَثْرہ، دَثَّرَ، تَدْثِیر**. خزاں کے موسم میں درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں، اس کے بعد بہار کا آغاز ہوتا ہے۔ انہی ٹنڈ منڈ شاخوں سے نئی نئی کونپلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسے **دثر** کہتے ہیں۔ اور ایسا کرنے والے کو مدثر۔ آج کل تو موسم خزاں آ ہی گیا ہے۔ اس میں تمام سابقہ کہنہ پتے جھڑ جاتے ہیں، شاخیں بالکل ٹنڈ منڈ رہ جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! بات وہ آ رہی ہے جس کے متعلق فارسی میں ہی کہنا پڑتا ہے کہ نگہ برہم مزن تا نشکن رنگِ تماشا را۔ وہ کہتا تھا کہ آنکھ بھی نہ جھپک، تماشے کا رنگ ٹوٹ جائے گا۔ بات ایسی آ رہی ہے کہ میں اسے بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ یہاں میرے سامنے کچھ ہل جل ہو، اس سے رنگِ تماشا ٹوٹ جاتا ہے۔

''دثر'' کے بارے میں، میں نے عرض کیا تھا کہ آج کل اتفاق سے خزاں کا موسم ہے۔ پرانے سب پتے جھڑ جاتے ہیں، شاخیں بالکل برہنہ ہو جاتی ہیں۔ وہ ٹنڈ منڈ رہ جاتی ہے اور اس کے بعد بہار کا آغاز ہوتا ہے۔ انہی شاخوں سے نئی نئی سرسبز کونپلیں پیدا ہوتی ہیں، اور اس صحنِ خزاں دیدہ کے اوپر ایک بہارِ نو جلوہ فرما ہوتی ہے۔ خزاں دیدہ درخت کے اوپر اک نئی قسم کی رنگ برنگ سرسبز و شاداب کونپلوں، شگوفوں کا جو آنا ہے، اسے تدثیر کہتے ہیں۔ ایسا کرنے والے کو مدثر کہتے ہیں۔ دوسرے معنی میں وہ عرب جو اس کو استعمال کرتے تھے وہ یہ تھا کہ پرندے اپنے پرانے گھونسلوں کے جو بوسیدہ تنکے ہوتے ہیں، وہ جھاڑ دیتے ہیں، نئے تازہ اور مضبوط تنکے لا کر، نئے سرے سے، اپنے گھونسلے اور نشیمن کو سنوارتے ہیں۔ اس طرح سے نشیمن کو از سرِ نو سنوارنے والے کو مدثر کہتے ہیں۔ اس طرح **یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ** (74:1)

کے معنی ہوئے: اے کائنات کے چمنِ خزاں دیدہ پہ بہارِ نولانے والے! اے نشیمنِ عالم کو از سرِ نو سنوارنے والے! قُـــمْ (74:2) اٹھ! عزیزانِ من! آپ نے غور فرما لیا کہ فریضہ کیا عائد کیا گیا ہے' اس بعثت نبوی کا مقصد کیا تھا۔ ایک لفظ ''قم'' کے اندر یہ ساری باتیں سما گئیں: قُمْ (74:2) اٹھ!

مغرب کے دانشور اور قرآن

کبھی کبھی یہ ذہن میں آتا ہے اور میں اس کا اظہار بھی کیا کرتا ہوں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہم جو قدامت پرستی میں چلے آرہے ہیں' یعنی جو کچھ ہمارے ہاں ہوتا چلا آرہا ہے ہم اس سے ذرا بھی نہیں ہٹ سکتے' قرآن کے مفاہیم کے لیے بھی ادھر سے نہیں ہٹ سکتے' مغرب کے مفکرین کی یہ حالت نہیں ہے۔ مغرب کے یہ دانشور' جو غیر متعصب طور پر' سیرتِ نبوی کا' اور قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں' وہ ہمارے مقابل میں' ہمارے سے مراد ہماری قدامت پرستی کے مقابلے میں' جلدی صحیح نکتے پر پہنچ جاتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' یہ میرے پاس آتے ہیں۔ وہاں کے اِن بڑے بڑے دانشوران کے ہاں یہ بات نہیں ہوتی۔ وہ کبھی یہ نہیں پوچھتے کہ جو تم کہتے ہو یہ پہلے بھی کسی نے کہا ہے اور کس نے کہا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے۔ وہ پوچھتے صرف یہ ہیں کہ اس کی سند کیا ہے جو کچھ تم کہتے ہو۔ عزیزانِ من! بس! جو اس مقام پہ آ گیا وہ صحیح قرآن کے اوپر آئے گا۔

ایک مغربی مورخ کے تاثرات

آپ نے دیکھا کہ شجرِ خزاں دیدہ پہ بہارِ نو آنا تدثیر ہے اور ایسا کرنے والا مدثر ہے۔ ہمارے ہاں تو اس کا یہ ترجمہ ہے: اے لحاف میں لپٹنے والے! کھڑا ہو۔ ان لوگوں نے اسے کیا سمجھا؟ نبی اکرم ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کرنے والے' قرآن کے انقلابِ عظیم پہ جن کی نگاہ تھی' انہوں نے اسے کیا سمجھا؟ علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے اپنے خطبات ❶ کے چھٹے خطبہ میں اس عظمت کی توصیف کی ابتداء کی ہے۔ اس میں یہ کہا ہے کہ تہذیب کا ایک بہت بڑا مورخ زمانہ بعثت نبوی ﷺ کا نقشہ اس طرح سے کھینچتا ہے۔ انہوں نے اس کا نام نہیں لکھا تھا۔ میں نے اس کے بعد اس کی تحقیق کی۔ صاحبِ علم احباب کی اطلاع کے لیے عرض کروں کہ وہ ڈینیسن (Danison) ہے جس کی اپنی کتاب کا نام ہے: Emotion as the basis of civilization یہ بڑی عظیم کتاب ہے اور اس کا مصنف بڑا نامور مورخ ہے۔ آپ یہی سمجھ لیجیے کہ جس کا اتنا بڑا اقتباس اقبالؒ اپنے ہاں دیتا ہے وہ عجیب کتاب کتنی عظیم ہے اور اس کا مصنف کتنا معتبر و مستند۔ Emotion as the basis of civilizaion by Denison کہیں سے ملے' تو اُسے دیکھیے گا۔ وہ یوں ابتداء کرتا ہے'

---

❶ Reconstruction of Religious Thought in Islam.

یوں ظہور نبوی ﷺ کا ایک منظر پیش کرتا ہے کہ ''اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا'' میں پھر یہ عرض کروں کہ آپ مدثر کے یہ معنی ذہن میں رکھیے اور پھر اسے سنیے کہ یہ شخص کیا کہتا ہے ہاں تو وہ یہ کہتا ہے کہ ''اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصرِ مشید' جس کی تعمیر میں چار ہزار سال صرف ہوئے' منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے' اور نوعِ انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی ہے جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین وضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین ومسالک اپنی قوت واحترام کھو چکے تھے۔ اس لیے اب ملوکیت کے اندازِ کہن کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن آئین ودساتیر کو رائج کیا تھا' وہ نظم وضبط اور وحدت و یک جہتی کے بجائے تشتت وافتراق اور ہلاکت وبربادی کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وقت وہ آ چکا تھا جبکہ ہر طرف فساد ہی فساد نظر آ تا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند وبالا درخت جس کی سرسبز وشاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ سائنس اور لٹریچر کے زریں ثمرات سے بہرہ یاب ہو چکی تھیں' اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت واحترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ سلسلہ حرب وضرب کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے اور یہ ٹکڑے صرف رسوماتِ پارینہ کے بندھن سے ایک جگہ قائم تھے لیکن ان کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ نہ معلوم کب گر پڑیں۔'' اس کے بعد وہ مؤرخ پوچھتا ہے کہ ''کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوعِ انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نکتے پر جمع کر دیتا اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لیتا؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیے تھا' اس لیے کہ پرانی رسومات اور آئین وضوابط سب مردہ ہو چکے تھے اور ان ہی جیسے اور آئین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔'' یہ تھا تہذیب کا نقشہ' وہ تھا بلند وبالا درخت اور یہ تھی اس کی حالت۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ ''یہ امر موجب حیرت واستعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر سرزمین عرب سے پیدا ہوا اور اس وقت پیدا ہوا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی۔'' **یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ** (74:1)۔ اے وہ کہ جس کے ذمے' انسانیت کو سنوار کر' ایک جہانِ نو کو وجود میں لانے اور اس طرح حق کے نظام کو ہر باطل نظام پر غالب کرنے کا انقلابی پروگرام ہے۔

کارلائل کی عقیدت مندی

کارلائل [1] کی ایک کتاب ہے: ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ (Hero and Hero Worship) وہ بھی جب دنیا کے قدیم ہیروز کا ذکر کرنے کے بعد نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی تک پہنچتا ہے وجد میں آ جاتا ہے۔ وہ کتاب بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے: ''عربوں کے لیے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکی سے نور کی طرف لے آئی تھی۔ عرب اس کے ذریعے پہلی دفعہ زندہ ہوا۔ ایک ایسی قوم' جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی' ان کی طرف ایک رسول آیا' جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام

---

[1] Carlyle, Thomas (1795-1881)

لایا جس پر وہ قوم ایمان لے آئی۔ وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشان ملت میں تبدیل ہوگئی۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک آ گئے تھے۔ اس کے بعد سینکڑوں برس ہو چلے ہیں کہ یہ اسی شان و شوکت اور درخشندگی و تابندگی سے کرۂ ارض کے ایک عظیم حصہ پر مسلط ہیں۔ (یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا۔) ایمان بہت بڑی چیز ہے۔ ایمان ہی سے زندگی ملتی ہے، جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا، اس قوم کی تاریخ، اعمال میں نتائج اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی بن گئی۔ وہ عرب...... یہ محمد ﷺ......اور ایک سو سال کا عرصہ! کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں جیسے ریت کے کسی سیاہ گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی کی لہر آ گرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتش گیر مادہ میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آ جائے؟ ''نوعِ انسانی'' کیا الفاظ ہیں! نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ، اس بطلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا۔ اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔''[1]

عزیزانِ من! **یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ** کون سمجھا ہے؟ مدثر کے اس معنی کو یہ سمجھے ہیں: مدثر کے اس معنی کو کارلائل سمجھا ہے، ڈینسن سمجھا ہے۔ اور کیا یہ عجیب اتفاق نہیں کہ جو اس کے بنیادی معنی تھے کہ وہ شاخِ خزاں دیدہ یا شجرِ خزاں دیدہ پہ بہار نو آنا، وہ تشبیہ و تمثیل بھی وہی ہے جو ان مقالات کے اندر آپ کے سامنے آئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بڑے بڑے فاضل تھے، انہوں نے اس کے بنیادی معنی بھی لیے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ خود اپنے ہی تخلیقی ذہن سے اس نتیجے پہ پہنچے ہوں اور تشبیہ بھی ان کی یہی ہو۔ لیکن یہ کیا حسنِ اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو لفظ انتخاب فرمایا اور قرآن میں دیا تو اس کا جو بنیادی مفہوم تھا یہ لوگ اپنے طور پہ ہی اگر پہنچے ہیں تو وہ اس تک پہنچ گئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ذہن کو اس بت کدے سے صاف کر دیا جائے تو خالی الذہن ہو کر بھی انسان جو سوچتا ہے وہ قرآن کے قریب آ جاتا ہے۔ مگر ہمارے سامنے تقلید کے وہ بت ہیں جو ہمیں وہاں تک نہیں آنے دیتے۔ یہ ہے: **یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ** عزیزانِ من! اس طرح مخاطب کرنے کے بعد فوراً ہی قرآن نے کہا کہ **قُمْ** (74:2) اُٹھ۔

لفظ قم کا قرآنی مفہوم

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ''قم''، عظیم چیز ہے۔ وہ جو ہمارے سامنے قدیم تراجم ہیں، ان میں ایک محمود الحسنؒ (1338ھ) کا ہی نہیں، آپ کسی کا بھی ترجمہ اٹھا کر دیکھیں یہ ملے گا کہ اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھ۔ Rise انگریزی کا لفظ ہے۔ یہ لفظ ایک انقلاب کے لیے اٹھنے کے لیے آتا ہے۔ یہ ''قم''، وہی ہے۔ یہ ایک عظیم الشان انقلاب ہے، جس کے لیے یہ آواز بلند کرنی ہے، جس کے لیے اٹھنا تھا۔ اٹھنے کا لفظ اس معنی میں بھی آ سکتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں 'وہ صلوٰۃ اور صلوٰۃ میں جو قم ہے اور وہ جو **قد قامت الصلوٰۃ** آتا ہے، یہ قام کا

---

[1] Carlyle, Thomas: Heroes and Hero Worship, p.66

قیامِ صلوٰۃ کا لفظ ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں ''قائم کرو'' کا لفظ تو باقی ہے لیکن اس کا عمل ''نماز پڑھو'' میں ہی آتا ہے۔ کوئی نہیں کہتا کہ میں صلوٰۃ قائم کر کے آیا ہوں' میں صلوٰۃ قائم کرنے جا رہا ہوں۔ یہ صرف ٹی وی کے اعلانات میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ آپ روز یہ دیکھتے ہیں: کبھی صلوٰۃ قائم کرو' کبھی نماز قائم کرو' کی تاکید ہوتی ہے اور کبھی کوئی نماز پڑھنے والا نہیں کہتا کہ میں نماز قائم کر کے آیا ہوں۔ یہ دونوں چیزیں (قائم کرنا اور پڑھنا) ملتی نہیں ہیں۔ یہ آپس میں اَن مل ہیں۔ یہ قیام ایک ایسی چیز تھی جسے اقبالؒ نے ہمارے ہاں ان معنی کو دیا ہے۔ ان کا یہ قطعہ بڑا خوبصورت ہے:

دو گیتی را صلا از قرأت اوست

قرء کے معنی ''دعوت ہوتی ہے' اعلان کرنا ہوتا ہے'': دو گیتی را' دو عالم را' صلا از قرأت اوست

مسلماں لا یموت از رکعت اوست

لا یموت: زندہ جاوید' جس پر موت نہ آئے: مسلماں لا یموت از رکعت اوست

نداند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز

عصرِ بے سوز اور اس کا کشتہ! اس شخص کی بھی کیا بات ہے! عصرِ بے سوز کا یہ کشتہ کیا جانے!

قیامت ہا کہ در قدقامت اوست

اس کی آواز میں جب قدقامت اوست آتا ہے تو اس قیام کے معنی یہ کشتہ عصرِ بے سوز کیا جانے! قیام یہ تھا۔

دو عالم کے لیے رحمۃ للعالمین

عزیزانِ من! یہاں آیا ہے: قُمْ (74:2) اٹھ! کتنی بڑی ذمہ داری تھی! یہ کتنا بڑا مشن عظیم تھا! کیسا پروگرام تھا جس کے لیے کہا گیا کہ اے وہ کہ جس کے ذمہ خزاں دیدہ شجرِ کائنات پہ بہار نو لانا ہے' نشیمنِ کائنات کو از سرِ نو سنوارنا ہے! تیرے ذمہ یہ پروگرام ہے۔ اب اس کے لیے قُمْ (74:2) اٹھ۔ اس پروگرام کے ابتدائی مراحل میں' سختی منزل اور تنہائی سفر کے احساس وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ o الَّذِيْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (94:2-3) اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے تمہاری کمر ٹوٹ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ خدا نے تمہارے رفقاء کی ایک جماعت پیدا کر دی اور اس طرح تمہارا وہ بوجھ بھی ہلکا ہو گیا۔ اس طرح آخر میں کہا ہے کہ کیا وہ بوجھ ہم نے تمہاری کمر سے نہیں اتار دیا جس نے تمہاری کمر کو توڑ کے رکھ دیا تھا۔ یہ قم ایسا تھا۔ یہ کوئی چھوٹا پروگرام نہیں ہے اسی لیے آپ ﷺ کو کائنات کے لیے' دو عالم کے لیے' رحمۃ للعالمین کہا گیا۔ یہ کوئی مقامی پروگرام نہیں ہے' کسی خاص نسل اور قوم کے لیے نہیں ہے۔ دو گیتی را صلوٰۃ از قرأت اوست۔ یہاں کہا کہ قُمْ فَاَنْذِرْ (74:2) یہ پوری دنیا کے لیے اعلان ہے کہ اے راستہ کو بھلائے ہوئے لوگو! اے غلط راستوں

کے اوپر جانے والے لوگو! خیال کرو کہ تمہارا یہ راستہ تمہیں کن تباہیوں کی طرف لے جا رہا ہے۔ رکو' ٹھہرو' آگے کنواں ہے' تم اندھے ہو' اس کے اندر گر جاؤ گے۔ قُمْ فَاَنْذِرْ (74:2) اٹھ! اور خود فراموش انسانوں کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔

عزیزانِ من! پہلا مرحلہ انذار کا ہوتا ہے۔ للکارنا اس اندھے کو ہوتا ہے جس کے آگے کنواں آتا ہے کہ تو رک جا' ٹھہر جا۔ یہ رک جا اور ٹھہر جا' بہت زور سے کہنا پڑتا ہے۔ یہ جو ابتدائی تنذیر کا مرحلہ ہوتا ہے اس میں بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔ یہ سارے زمانے' ساری دنیا سے الگ' ایک پکار ہوتی ہے کیونکہ پورے کا پورا نوعِ انسانی کا کارواں غلط راستے پر چلا جا رہا ہوتا ہے۔ یہ ایک شخص وہ کہنے والا ہوتا ہے۔ وہ اس کو کہتا ہے کہ او! رکو' ٹھہرو' تباہی اور بربادی کی طرف چلے جا رہے ہو۔ کسی ایک خود سر آدمی کو روکنا ہی کچھ کم ہمت طلب نہیں ہوتا مگر وہ تو پہلا اپنے اس پیغام کو ماننے والا ہوتا ہے۔ اس کا تو کوئی سیکنڈ کرنے والا بھی نہیں ہوتا۔

یہ انذار سارے کے سارے اہلِ مذاہب کو پکارنا تھا

عزیزانِ من! پوری نوعِ انسانی کو روکنا' ان تمام کارواں در کارواں گیتی [1] والوں کو للکارنا اور سب سے کہنا کہ تم غلط راستے پہ جا رہے ہو' کچھ آسان کام نہیں تھا۔ یہ سیکولرازم والے تو اس زمانے میں کچھ کم ہوتے تھے کہ جن کا کوئی مذہب ہی نہ ہو۔ یہ سارے اہلِ مذاہب ہی تھے اور وہ اپنے اپنے مذہب' اپنی اپنی تعلیم میں مگن تھے کہ ہم سچائی پر ہیں۔ ان کے پیغمبروں کی سچائیوں کو یہ خود پکارنے والا بھی تسلیم کرتا تھا' اعلان کرتا تھا' اعتراف کرتا تھا۔ انہیں یہ کہنا کہ جس راستے پہ تم چل رہے ہو تباہی کی طرف لے جائے گا' بڑا ہی مشکل کام تھا۔ یہ ہے فَـاَنْذِرْ (74:2)۔ کہ ان خود فراموش انسانوں کو ان کے غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرو۔ یہ اس پروگرام کا دوسروں کو ان کے اعمال کے تباہ کن نتائج سے روکنے کا پہلو ہے۔ اس لحاظ سے یہ اس پروگرام کا محض Negative (منفی) پہلو ہے۔ یہ دراصل کسی چیز کو روکنا ہے۔

منفی پہلو کے بعد مثبت پہلو

عزیزانِ من! یہ اتنا ہی پروگرام نہیں ہے۔ یہ تو اس پروگرام کا ایک منفی پہلو ہے یعنی کسی کو روک دینا۔ یہ Positive (مثبت) نہیں' یہ کچھ کرنے کی بات نہیں۔ کرنے کی یہ بات آگے آتی ہے۔ اس کے لیے کہا کہ روکنے کے بعد مثبت پروگرام سامنے رکھ۔ اس کے لیے عظیم لفظ ہیں' عزیزانِ من! اس سے ایک عجیب سرکل (دائرہ) بنتا ہے۔ ربوبیتِ عالمینی ہی پروگرام ہے' قرآن کا اعلان ہی یہ ہے۔ اس نظام کا مقصد پوری نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا ہے۔ یہی نہیں کہ رات کو کوئی بھوکا نہ سوئے بلکہ یہ بھی کہ کوئی انسان ایسا نہ ہو کہ جس کی صلاحیتوں کی نشوونما نہ ہو چکی ہو۔ یہ پروگرام ہے تیرے ذمہ۔ اس کے لیے قرآن لفظ ہی ''رب'' کا لایا ہے۔ اس

---

[1] دنیا۔ جہان

پروگرام کے لیے کہا کہ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ (74:3) اور خدا کے نظامِ ربوبیت کو اس طرح متمکن کر دے کہ کبریائی (Supreme Sovereignty) صرف اسی کے لیے ہو۔ اس طرح اسے غالب کر دے کہ دنیا کا کوئی نظام اس کے سامنے ٹھہر ہی نہ سکے' کبریائی صرف ربوبیتِ خداوندی کی ہو جائے۔

عزیزانِ من! یہ دو لفظ ہیں: رَبَّکَ فَکَبِّرْ (74:3) کبریائی قائم کر دے اپنے رب کی تا کہ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) یہ نظام' تمام نظامہائے عالم پر غالب آ جائے کیونکہ اس نظام کو تمام نظام ہائے عالم پر غالب آنا ہے۔ یہ پہلا قدم ہی کوئی کم ہمت شکن نہیں تھا: پہلے ان کو ان کے غلط روشِ حیات کے تباہ کن نتائج سے روکنا تھا۔ اِس روکنے کے بعد اب اس پروگرام کا مثبت (Positive) پہلو آیا ہے۔ تو سوچیے تو سہی کہ یہ پروگرام کیا ہے؟ یہ نظام ہے ربوبیتِ عالمینی کا۔ یہ تمام نوعِ انسانی' تمام افرادِ انسانیہ کی ربوبیت کا پروگرام ہے اور ظاہر ہے کہ ان کی نشو ونما تو اسی صورت میں ہو سکے گی کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ذرائع اور سامانِ نشو ونما تھے ان سے لیا جائے گا اور اس نظام کی تحویل میں دیا جائے گا تا کہ یہ نوعِ انسانی کی پرورش کا کام دے سکے۔ یہ پروگرام تھا۔ اور پھر اس پروگرام کا مقصد یہی نہیں تھا کہ انہیں دوسروں کی سطح پہ لایا جائے گا۔ یہ رَبَّکَ فَکَبِّرْ (74:3) تھا۔ یعنی خدا کے نظامِ ربوبیت کو اس طرح متمکن کرنا تھا کہ کبریائی صرف اسی کے لیے ہو اور اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:138) اس سے خود تمہیں بھی بڑائی حاصل ہو جائے گی۔ اس طرح تمہیں بھی اتنا بلند اور بالا اور اتنا غالب کیا جائے گا کہ اس کبریائی کے مقابلے میں کسی کی کبریائی نہ آ سکے مگر شرط ہے رَبَّکَ فَکَبِّرْ کی۔

انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ربوبیت عالمینی کو بلند کرے

عزیزانِ من! رَبَّکَ فَکَبِّرْ میں ایک لفظی لطیفہ بھی ہے: اسے اِدھر سے پڑھیے جب بھی رَبَّکَ فَکَبِّرْ آتا ہے اور اُدھر سے یعنی پیچھے کی طرف لوٹایئے' جب بھی رَبَّکَ فَکَبِّرْ آتا ہے۔ یہ ایک دائرہ بنتا ہے۔ اس اعتبار سے آپ دیکھیے کہ یہ کیا دائرہ بنتا ہے: تم خدا کی کبریائی کو قائم کرو' خدا تمہاری کبریائی کو قائم کر دے گا۔ اور یہ قرآن ہی کا ایک لفظ ہے کہ فَاذْكُرُوْنِیْۤ اَذْكُرْكُمْ (2:152)۔ اللہ اکبر! مقامِ انسانیت ملاحظہ فرمایئے: خدا یہ کہہ رہا ہے کہ ''تم میرے شرف و مجد کو دنیا میں بلند کرو اور میں کیا کرونگا: اَذْكُرْكُمْ (2:152) میں تمہارے شرف و مجد کو بلند کرونگا۔ یعنی یہ کوئی خدا کا کام نہیں' جو یہ کر رہا ہے۔ یہ اپنے ہی شرف و مجد کی بلندی کے لیے یہ طریق اختیار کیا گیا ہے۔ کیا خوبصورت انداز میں ہمارے ہاں کے کسی شاعر نے کہا ہے۔ یہ کہنے والے شاعر بھی عجیب چیز پیدا کرتے تھے' لیکن میری مشکل پھر وہی ہے کہ یہ چیزیں فارسی میں ہیں۔ میں نے یہی کہا ہے کہ خدا کا ذکر کرو۔ ذکر کے معنی شرف اور مجد اور تکریم اور اعزاز ہوتا ہے: فَاذْكُرُوْنِیْۤ اَذْكُرْكُمْ (2:152) میرے شرف و مجد کو بلند کرنے کے لیے یہ کچھ کرو' میں تمہارا شرف و مجد

بلند کر دونگا۔ اس سے تمہارا ہی شرف اور مجد بلند ہوگا' تمہیں ہی شرف حاصل ہوگا۔ پھر فارسی شعر کی بات وہی آ گئی کہ

حکایت قدِ آں یارِ دلنواز کنم

اس یارِ دلنواز کے قد کی داستان خوبصورت میں بیان کر رہا ہوں

بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

اصل میں اس بہانے سے میں اپنی عمر بڑھا رہا ہوں۔ بڑی خوبصورت چیز ہے۔ یہ جو ''ذکر'' خداوندی ہے' یہ بظاہر کچھ اور کرنا ہے' اور وہ ہے: بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم۔ **فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ** (2:152) تم خدا کے شرف و مجد اور عظمت و اعزاز کو قائم کرو گے تو وہ تمہارے شرف و مجد کو بلند کرے گا اس لیے **رَبَّكَ فَكَبِّرْ** (74:3) خدا کے نظام ربوبیت کو اس طرح متمکن کر دے کہ کبریائی صرف اُسی کے لیے ہو۔ اس سے خود تمہیں بھی دنیا میں بڑائی حاصل ہو جائے گی۔

عزیزانِ من! بات یاد آ گئی جہاں روزے فرض ہوئے ہیں وہاں یہ بھی کہا ہے کہ **لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ** (2:185) تا کہ خدا کے اس ضابطہ قوانین کو جس سے اس نے تمہاری راہ نمائی کی ہے' دنیا کے تمام قوانین وضوابط پر غالب کر سکو۔ یہ **تُكَبِّرَ** اس لیے ہے۔ اس کے لیے پروگرام دیا گیا کہ تم خدا کی کبریائی کو قائم کرو: **لِتُكَبِّرُ اللّٰهَ**۔ آپ کو پتہ ہے کہ اس چیز کے لیے ہمارے ہاں تعمیل کیسے ہوتی ہے؟ عید کی نماز میں جو چھ تکبیریں زیادہ ہوتی ہیں اس کے یہ معنی ہوتے ہیں یعنی **رَبَّكَ فَكَبِّرْ**: چھ تکبیریں زیادہ کہہ دیجیے' یہ فریضہ پورا ہو گیا۔ بہرحال یہ باتیں کرنے کی نہیں ہیں' دل میں خراش پیدا ہو جاتی ہے۔ کہا گیا کہ **رَبَّكَ فَكَبِّرْ** (74:2) ربوبیتِ عالمینی کو دنیا کے اندر اتنا بلند کرو کہ اس کی کبریائی کا جواب کہیں سے کوئی نہ مل سکے۔ دیکھا! المدثر کے ذمہ یہ پروگرام کیا لگایا جا رہا ہے۔ پہلے منفیانہ پہلو ہے کہ **فَأَنْذِرْ** (74:2) روک' ان کو آگاہ کر دے ان کو' اندھے ہیں' آگے نہ بڑھنے دے۔ اور دوسری طرف مثبت پروگرام یہ ہے کہ یہ ربوبیتِ عالمینی کے پروگرام کے نظام کو اتنا بلند لے جا کہ دنیا کا کوئی نظام اس کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکے۔ کبریائی اسی کی قائم ہو۔

اپنے قلب کی بات

عزیزانِ من! اس پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے ایک بنیادی بات کہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ **وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ** (74:4)۔ اس کا ترجمہ آپ نے سن لیا تھا کہ ''اپنے کپڑوں کو پاک رکھ' گندگی سے دور رہ۔'' جی نہیں چاہتا کہ بار بار اس تنقیدی بات کے اندر وہی باتیں پھر دہراؤں ورنہ سوچیے عزیزانِ من! ہم نہیں' باقی دنیا کے لوگ کیا کہیں گے کہ رسول اللہ ﷺ کو خدا کی طرف سے یہ حکم آ رہا ہے کہ اپنے کپڑے پاک رکھا کر اور اگلی بات ساتھ لے لیجیے کہ **وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ** (74:5) اور گندگی اور پلیتی کو پاس نہ آنے دیا کر۔ کیا اس

کے لیے بھی خدا کی طرف سے وحی آنے کی ضرورت تھی؟ رسول اللہ ﷺ کے متعلق اس وحی کے بغیر کیا تصور سامنے آتا ہے کہ خدا کو یہ بھی کہنا پڑا کہ کپڑے پاک اور صاف رکھا کر، ان کو گندگی سے آلودہ نہ ہونے دیا کر۔ جو کسی کے جی میں آئے سمجھے، عزیزانِ من! میں کیا کہہ سکتا ہوں! میں تو اپنے قلبِ دردآگیں کی بات کہتا ہوں کہ میں تو ناموسِ پیغمبر ﷺ کو اتنا بلند سمجھتا ہوں کہ میں یہ نہیں سمجھتا کہ حضور ﷺ کے لیے خدا کی طرف سے یہ کہنے کی ضرورت تھی کہ کپڑے صاف رکھا کر۔

ثیاب، ثوب اور ثواب کا مادہ ''ث و ب'' ہے۔ ابتدائی معنوں میں کپڑے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن آگے چلیے، عربوں سے بھی، عزیزانِ من! پوچھیے کہ وہ بنیادی طور پر اسے کیسے استعمال کرتے تھے۔ کسی زبان میں بھی کوئی لفظ بنیادی طور پر لیجیے پھر آگے دیکھیے کہ وہ استعمال کیسے ہوتا ہے۔ جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ پانی تو وہ بھی ہے جو پینے کی بات ہے لیکن جب یہ کہیں گے کہ ''پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات''❶ تو وہاں یہ ''پانی کا کٹورا'' نہیں ہے، وہاں تو بات ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ ان عربوں سے پوچھیے کہ وہ ''ثیاب'' کو کن کن معنوں میں استعمال کیا کرتے تھے۔ آپ کے ہاں ثوب سے ہی تو ''ثواب'' ہے، وقت نہیں ورنہ میں یہ بتاتا کہ کس طرح الفاظ بدلنے سے ان کے وہ بنیادی معنی وہاں رہتے ہی تھے۔ یہ جو ثیاب اور ثوب ہے جو کپڑے کے لیے ہے خود عرب اس کے معنی ''شخصیت (Personality)'' لیتے تھے، ''ذات (Self)'' لیتے تھے۔ ایک تو وہ یہ معنی لیا کرتے تھے۔ میں پہلے طہر کے معنی کر دوں کہ اس کے معنی ''پاکیزگی'' تو ہوتا ہے مگر وہ اس کے معنی ''ہر غلط چیز سے کسی چیز کو دور رکھنا، پاک رکھنا'' لیتے تھے۔ اس طرح عرب ''ثیاب'' کے معنی شخصیت، Personality، اپنی ذات (Self) لیتے تھے اور ثِیَابَکَ فَطَهِّرْ (74:4) کے معنی ذات کی، شخصیت کی، Personality کی، پاکیزگی اور بلندی لیتے تھے۔ اس لحاظ سے ثِیَابَکَ فَطَهِّرْ (74:4) کے معنی ہوئے کہ اس پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی سیرت و کردار (شخصیت) کو نہایت پاکیزہ بنایا جائے اور اس دعوت و تحریک کو ہر قسم کے ناپسندیدہ عناصر سے پاک و صاف رکھا جائے اس لیے کہ یہ کوئی ایسا میکانکی نظام نہیں ہے کہ جس نے چاہا اسے چلا لیا۔ اس کے لیے خود اس دعوت کا صاف اور شفاف رہنا اور اس میں شامل ہونے والوں کے قلب و نگاہ کا پاکیزہ ہونا بنیادی شرط ہے۔

لفظ تثویب کا مفہوم

عزیزانِ من! خود ''ثاب'' کے معنی ''جمع ہونے'' کے ہیں۔ جس Text (متن) میں، جس سیاق اور سباق میں یہ لفظ آیا ہے اُس کے لحاظ سے عربوں کے ہاں ایک اور معنی بھی ہیں۔ جب انہوں نے کسی بڑے کام کے لیے، لوگوں کو اکٹھا کرنا ہوتا تھا، اس زمانے میں لاؤڈ سپیکر تو تھے نہیں، ان میں سے ایک شخص کسی اونچے مقام پہ کھڑے ہو کر، عام طور پہ ٹیلے پہ یا چھوٹی سی پہاڑی پہ، ایک کپڑا لے کر اور اس کو جھنڈی سے باندھ کر، زور زور سے ہلاتا تھا، وہ اس سے سمجھ جاتے تھے کہ کوئی اہم معاملہ ہے جس کے لیے اکٹھا کرنے کے لیے یہ نشان

---

❶ پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات   تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من   (اقبالؒ)

دیا گیا ہے۔ وہ اُسے اپنی زبان میں تَثْوِیْبٌ کہتے تھے۔ آج بھی کہتے ہیں۔ کپڑے کا اس طرح ہلانا جس سے لوگ جمع ہو جائیں تَثْوِیْبٌ ہے یعنی لوگوں کو آواز دے کر بلانا' اکٹھا کرنا۔ اب بھی ان کے ہاں یہ جو صبح کی نماز کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کہا جاتا ہے تَثْوِیْبٌ کہلاتا ہے۔ اس فقرے کے لیے لفظ تَثْوِیْبٌ آج بھی رائج ہے۔ کوئی کھڑا ہو کر نہیں سوچتا کہ یہ تَثْوِیْبٌ کیوں ہے۔ یہ جمع کرنے کے لیے آواز ہے۔ اب بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح اسے کہتے ہی تَثْوِیْبٌ ہیں اور یہی تو وہ ثیاب ہے: دعوت' اجتماعیت' جمع کرنا' لوگوں کو دعوت دینا۔ اس طرح اس میں دونوں چیزیں آ گئیں: انفرادی طور پہ ''شخصیت'' اور اجتماعی طور پہ اس ''اجتماع کے لیے دعوت۔''

اب سوال یہ ہے کہ اپنی اس دعوت کو' اس پروگرام کو' اس نظام کو' کرنا کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ کسی قسم کی کوئی غلط چیز اس کے اندر شامل نہ ہو جائے' اس لیے غلط چیزوں کو دور رکھ۔ طھر کے معنی ان چیزوں کو ''دور رکھنا'' ہوتا ہے: شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول۔ دیکھنا' احتیاط برتنا۔ یہ جو تمہاری ثیاب ہے تمہاری تثویب ہے' تمہاری دعوت ہے' معلوم نہیں اس کے اندر کس کس قسم کے لوگ آ جائیں گے' اس کے لیے بڑا ضروری ہے کہ اس دعوت کو اس قسم کی ناپسندیدہ شخصیتوں سے ''دور رکھا'' جائے' جو اس میں شامل ہوں ان کی شخصیت' ان کا کریکٹر' ان کی سیرت' پاکیزہ ہو۔ خود یہ دعوت بھی صرف خدا کے لیے ہو' اس میں کسی اور قسم کی اور تثویب نہ پیدا ہو جائے' کسی اور چیز کی شرکت اس کے اندر نہ ہو جائے' یہ ہے ثِیَابَکَ فَطَهِّرْ (74:4)

نوعِ انسانی کے لیے پروگرام ربوبیت عالمینی

عزیزانِ من! اس سورۃ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی تھی: يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ o قُمْ فَاَنْذِرْ (74:1-2) اے وہ کہ جس کے ذمے عالم انسانیت کو سنوار کر ایک جہانِ نو کو وجود میں لانے اور اس طرح حق کے نظام کو ہر باطل نظام پر غالب کرنے کا انقلابی پروگرام ہے! اٹھ! اور خود فراموش انسانوں کو ان کی غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔ اس کے لیے پہلا کام یہ ہے کہ روک ان غلط کاروں کو۔ اور پروگرام یہ ہے کہ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (74:3) خدا کی ربوبیتِ عالمینی کا نظام اتنا بلند لے جا کہ دنیا کے باقی سب نظامہائے عالم کے اوپر یہ غالب آ جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (74:4) اپنی شخصیتوں کو' اور ان کی سیرت و کردار کو جو اس جماعت میں شامل ہونے والے ہیں' خود اپنی اس تحریک کو' کسی بھی قسم کے غیر خداوندی عناصر کو اس میں شریک نہ ہونے دے' ان سے اسے پاکیزہ رکھ' عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں پروگرام کی کیا کڑیاں آ رہی ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ (74:5) اس قسم کے رفقاء کو اپنے ساتھ لے اور ان کی ایسی تربیت کر کہ ان کی سیرت میں پختگی پیدا ہو جائے' جس سے وہ اس بارِ عظیم کو آسانی سے اٹھا سکیں اور ان کے پائے استقلال میں کہیں لغزش نہ آ جائے۔ وہ اس بوجھ کو لے کر اٹھیں تو ان کی ٹانگیں لڑکھڑا نہ جائیں۔

دماغ کے بت خانے کو صاف کرنا

عزیزانِ من! یہی جو وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (74:4) ہے' وہ یہی نہیں ہے کہ اس میں جو چیزیں محسوس طور پر شامل ہو جاتی ہیں' تو

اُسے ان سے دور رکھ مثلاً یہ کہ بت پرستی نہیں ہونی چاہیے' کعبہ سے بت نکال دینے چاہئیں' یہ کچھ نہیں۔ بات کچھ اور ہے۔ میں پھر لوٹ کر اس کی طرف آ گیا ہوں اس لیے کہ آج ہمارے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ جو اسلام کی دعوت دینا ہے' خدا پر ایمان لانا ہے' یہ اپنے آپ کو اور اپنی اس دعوت کو کون کونسی چیزوں سے پاکیزہ رکھنا ہے۔ اِسے تو ہر قسم کے غیر قرآنی تصورات' نظریات' اعتقادات' مسالک' شعائر' جو بھی غیر قرآنی ہے' سے پاکیزہ رہنا چاہیے' پھر وہ خدا کی رو سے ایمان ہوگا' قرآنی ایمان ہوگا قرآنی تصورات ہوں گے اسی لیے کہا کہ **مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ** (7:29) تم اطاعت کو قوانین خداوندی کے لیے اس طرح خاص وخالص کر دو کہ اس میں کوئی ذرا سا' بال برابر' شائبہ بھی غیر قرآنی نہ آنے پائے۔ اسی لیے **وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ** (54:17) ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے بڑا آسان بنا دیا۔ قرآن تو کچھ ایسا مشکل نہیں ہے لیکن سب سے پہلے ضروری ہے جو خود قرآن نے کہا ہے کہ جو **مطھرین** ہیں یہ بات انہی کی سمجھ میں آ سکتی ہے' اس کے ساتھ مَس ہی وہ کر سکتے ہیں جو پہلے مطّہر ہوں۔ اب اگر یہ چیز ان کے ترجمے میں لی جائے کہ قرآن کو پڑھنے کے لیے غسل کر لینا چاہیے' وضو کرنا چاہیے' کپڑے صاف پاک ہونے چاہئیں۔ ٹھیک ہے عزیزانِ من! یہ چیزیں تو عام شعائر کی چیزیں ہیں کہ اس میں تو مسلم اور کافر سارے ہی شامل ہوتے ہیں بلکہ ہندوؤں کے ہاں تو ہم نے دیکھا ہے ان کے ہاں صبح کا اشنان کرنا لازم ہوتا تھا۔ ہمارے ایک دوست کہا کرتے تھے کہ دیکھیے کہ یہ ہندو آج صبح غسل کرتے ہیں' نہاتے ہیں' پھر یہ دوپہر کو نہیں نہاتے' شام کو نہیں نہاتے' رات کو نہیں نہاتے' پھر کہیں جا کر دوسری صبح کو نہاتے ہیں اور یہ مسلمان دیکھیے کہ روز' جمعہ جمعہ' روز جمعہ جمعہ نہاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ غسل' وضو اور صاف کپڑے تو وہ شعائر ہیں جو ہر ایک کر سکتا ہے۔ یہ کونسی طہارت' تطہیر ہے جس کے لیے یہاں زور دیا گیا ہے؟ وہ ہے طہارت وتطہیر شخصیت وذات کی بھی اور دعوت کی بھی۔ تطہیر قرآن کے مس کرنے کے لیے کہا ہے کہ یہ مطہر ہونے چاہئیں۔ تطہیر کیا ہے؟ ہمارے دَور میں یہ شخص [1] اسے بیان کر گیا ہے:

بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے؟

یہ دماغ کے بت خانے کو صاف کرنا ہے۔ ہمارے ہاں اس پہ تو بہت زور دیا جاتا ہے کہ فتح مکہ کے دن نبی اکرم ﷺ نے کعبے سے تین سو ساٹھ بتوں کو نکال کر باہر پھینک دیا تھا۔ ٹھیک ہے یہ ہوگا' یہ کچھ مشکل نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے جو پروگرام طے کیا تھا وہ یہ تھا اور ہے کہ ان کے دل ودماغ میں جو بت تھے' ان بتوں کو وہاں سے نکال دیا تھا اور یہ مشکل ترین کام ہے۔ یہ تو ایسے بت ہیں جن کا نکالنا از حد محال ہے۔ دوسری جگہ یہی شخص [1] کہہ گیا ہے:

رہ مدہ اقبالؒ را در کعبہ اے شیخ حرم

---

[1] مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938)

ارے اقبال کو کعبہ میں نہ جانے دینا۔ ارے یہ تو صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ہے Suited booted ہے۔ کیا بات ہے! اسے کیوں نہ کعبہ میں جانے دینا؟ کیونکہ

ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس کی آستیں کے اندر اتنے بت چھپے ہوئے ہیں کہ ایک کے اندر ایک ہے۔ ایک نکالو تو اس کے اندر سے ایک اور نکل آتا ہے۔ ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر۔ یہ جو خداوندے دگر ہیں' ان کو قلب و نگاہ سے نکالنا ہے۔ عزیزانِ من! یہ جب کعبہ صاف ہوگا تو پھر خدا کا گھر یہ بنے گا۔ وہ بڑا غیور واقع ہوا ہے۔ وہ تو پہلے کسی دوسرے بسنے والے کی چارپائی بھی اندر رہ گئی ہو تو بھی اندر نہیں آتا۔ کہتا ہے پہلے اس کو باہر نکالو' پھر وہ کوئی اسپرے بھی کرتا ہے۔ یوں جو دماغ کی تطہیر ہے' وہ قلب و نگاہ کی پاکیزگی ہے۔ یہ ہر غیر قرآنی تصور سے اس کی پاکیزگی ہے۔

ہر نوع کے بتوں سے نجات حاصل کرنا ہوگی

وہ [1] تو یہ کہتا ہے کہ می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر۔ میری فکر ہر دم ایک نیا بت' نیا خدا تراشتی ہے' یہ پتھر کے ٹکڑے کو تراش کر اس میں سے بت بناتے ہیں یہ تراشیدن ہی تو ہے:

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

ایک بندش سے اس کو چھڑاؤ' آزاد کرو' اس کی کیفیت یہ ہے کہ اسی قسم کے ایک اور بند کے اندر جا پھنستا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ......

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر

یہ میری فکر نئے نئے بت' نئے نئے معبود' تراشے چلی جاتی ہے: ہر دم خداوندے دگر۔ یہ تھے وہ بت: فکری' نظریاتی' اور اعتقادی۔ یہ تھے وہ اصنام' یہ تھے وہ بت جن کو دل اور دماغ کے بت خانے سے نکالنا ضروری تھا۔ یہ ہے وہ تطہیر جس کے لیے کہا کہ وَ ثِيَابَکَ فَطَهِّرْ (74:4) اس جماعت میں جو آنے والے ہیں ان کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ ان کے قلب اور دماغ میں کسی غیر قرآنی تصور کا شائبہ تک باقی نہ رہے۔ اس کا عملی طریق یہ تھا کہ وہ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِکَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ [2] (2:129)۔ کیا بات ہے وہ تعلیمِ کتاب و حکمت سے يُزَكِّيْهِمْ انہیں پاکیزہ کر دیتا ہے' ان کی نشوونما کر دیتا ہے' سابقہ بتوں

---

[1] مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938)

[2] انہیں تیرے ضابطہ حیات (کتاب) کی تعلیم بھی دے اور یہ بھی بتائے کہ ان قوانین کی غرض و غایت کیا ہے اور اس پر عمل کرنے کے کیا نتائج مرتب ہوں گے اور (صرف نظری طور پر ہی یہ تعلیم نہ دے بلکہ عملاً ایسا نظام متشکل کر دے جس میں) لوگوں کی صلاحیتوں کی برومندی اور ان کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

میں سے کسی کا سایہ تک باقی نہیں رہنے دیتا۔

لا الٰہ سے پہلے الا اللہ نہایت ضروری ہے

عزیزانِ من! مذہب کے اندر سوچنا تو حرام قرار دے دیا جاتا ہے اس لیے ہم نے تو کبھی غور ہی نہیں کیا' کہ یہ لا الہ کیا ہے؟ کیوں الا اللہ سے پہلے یہ ضروری ہے؟ الا اللہ تو خدا پر ایمان ہے۔ ٹھیک ہے' لیکن الا اللہ تک پہنچنے سے پہلے' لا الہ ضروری قرار دیا گیا ہے' اکیلے الا اللہ ایمان نہیں بنتا۔ لا الہ کے معنی یہ ہیں کہ ہر قسم کے الہ کو دماغ سے نکالا جائے تو پھر الا اللہ آتا ہے' وہ اس لیے کہ کوئی انسان بھی الا اللہ کی منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتا' اگر لا الہ کی منزل پہلے نہ ہو' یوں کوئی الہ باقی نہیں رہتا۔ کیا بات ہے اس لا الہ کے دو لفظوں کے اندر' عزیزانِ من! قرآن کی دو دو لفظ ہوتے ہیں۔ الہ کا لفظ لایا ہے کہ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں' کوئی صاحبِ اختیار نہیں' کوئی اس قابل نہیں کہ اس کے سامنے جھکا جائے' کوئی اس قابل نہیں کہ اس کو حاکم مانا جائے۔ ہر قسم کی نفی لایا ہے: لا لا' [1] یہ بھی لا' وہ بھی لا' کرتا چلا گیا' کاٹتا چلا گیا' اس سلیٹ [2] کو صاف کرتا چلا گیا۔ جب سلیٹ بالکل صاف ہو گئی تو پھر کہا: الا اللہ۔ ہاں' ایک الہ ہے اور وہ ہے الہ حقیقی' وہ ہے خدا۔ یہ ایمان بنتا ہے لا الہ کا۔ یہ لا الہ جو ہے' یہ ہے **ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ** (74:4)۔

اب اگلی چیز آ گئی **وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ** (74:4)۔ ترجمہ آپ نے سن لیا تھا کہ گندگی سے دور رہو' اپنے کپڑوں کو پاک رکھو' گندگی سے دور رہو۔ عزیزانِ من! **اَلرُّجْزُ** کا مادہ ''ر ج ز'' ہے۔ اس سے رِجْز یارُجْز یارَجْز کے الفاظ آتے ہیں۔ پھر ذہن میں رکھیے کہ اِس پروگرام کے لیے ایک جماعت تیار ہو رہی ہے' غلط رو قافلے کو للکارا جا رہا ہے کہ ٹھہر جاؤ' رک جاؤ' آگے نہ چلو۔ ان میں سے جو لوگ رکتے ہیں' ٹھہرتے ہیں' وہ اِدھر آتے ہیں۔ اِن کی تطہیرِ فکر و نظر کے لیے یہ پہلی منزل ہے۔ ان کے دل و دماغ سے ہر قسم کے غیر خداوندی بتوں کو نکالا جا رہا ہے' ان کی شخصیتوں کو نکھارا جا رہا ہے' خود اپنی دعوت کے متعلق یہ دیکھا جا رہا ہے کہ یہ غیر قرآنی تصورات سے پاک ہے۔ اس عمل کے لیے احتیاط برتی جا رہی ہے اور یہ احتیاط بڑی ضروری ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے افراد میں پاکیزگی سیرت ہو لیکن آپ کی دعوت کے اندر ایسا عنصر آ کر مل جائے جو غیر قرآنی ہو۔

عملِ تزمیل اور ''رُجز'' کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اس قافلہ سالار کی ذمہ داریاں بڑی دُور رس اور گہری ہوتی ہیں' اسی لیے تو عملِ تزمیل میں یہ بات کہی گئی کہ اس طرح سے ان سواریوں کو چن چن کر اکٹھا کر۔ یہ اس قسم کی جماعت تھی۔ اب آگے اور بات آئی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ **وَالرُّجْزَ**

---

[1] نہیں' نہیں' قطعاً نہیں۔

[2] اس سے مراد ذہن و فکر ہے' قلب و نگاہ ہے' تدبر و تفکر ہے' زاویہ نگاہ ہے۔

فَاهْجُرْ (74:5) ➊۔ پروگرام ایسا ہے جس کے لیے بڑی استقامت کی ضرورت ہے۔ اس میں جم کر کھڑے ہو جانا بڑی مستحکم چیز ہے۔ اونٹوں میں ایک بیماری ہوتی تھی' وہ ہمارے ہاں بیلوں میں بھی ہو جاتی تھی۔ اس میں ہوتا یہ تھا کہ اس سے عام طور پہ ان کی ٹانگوں میں ایسی کمزوری آ جاتی تھی کہ وہ جھٹکے سے اٹھنے لگتے تھے' ایک دم ان سے اٹھا نہیں جاتا تھا' وہ گر پڑتے تھے' کمزور ہو جاتے تھے' دو تین دفعہ جھٹکے لے کر اٹھتے تھے اور جب اٹھتے تھے تو پھر بھی اُن کی ٹانگیں لڑکھڑاتی تھیں' ان میں استقامت نہیں ہوتی تھی۔ اس قسم کی کمزوری ہوتی تھی' اسے رجز کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ یہ دیکھ لینا کہ تمہاری جماعت کے اندر جو لوگ آئیں ان کی اس قسم کی کیفیت نہ ہو۔ یہاں استقامت کی ضرورت ہوگی۔ یہ نہ ہو کہ ان کے پائے استقلال میں لغزش آ جائے' وہ اس بوجھ کو لے کر اٹھیں تو ان کی ٹانگیں لڑکھڑا جائیں۔ **اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا** (41:30) وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنہوں نے یہ کہہ دیا کہ ہاں' ہمارا رب اللہ ہے اور اس کے بعد آگے انہیں اس پہ جم کر کھڑے ہو جانا ہے۔ یہاں (74:5) میں کہا ہے کہ دیکھنا ان کی ٹانگوں میں ایسی لڑکھڑاہٹ نہ پیدا ہو جائے کہ وہ اس بارِ عظیم کو اٹھا نہ سکیں۔ پہلی چیز تو یہی ہے کہ اٹھتے وقت بھی ٹانگوں کے اندر اتنی قوت ہونی چاہیے کہ ایک ہی جھٹکے سے اٹھے۔ آپ نے Weight Lifter (وزن اٹھانے والا) کو دیکھا ہوگا' یہ ٹی وی پہ عام طور پہ نظر آ جاتا ہے۔ اس کی کامیابی کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ جب وہ وزن اٹھاتا ہے تو ایک ہی جھٹکے کے اندر اس کو اٹھا لیتا ہے۔ اگر کہیں ایسا ہو جائے کہ ایک ہی جھٹکے کے اندر اس کی ٹانگیں کمزور ہو جائیں تو وہ اس وزن کو اٹھا ہی نہیں سکتا۔ رجز کی پہلی چیز یہ ہے اور اس کے بعد پھر یہ بات ہے کہ جب وہ کھڑا ہو تو اس کی ٹانگیں کانپیں نہیں۔ اس پروگرام میں اتنی بڑی استقامت کی ضرورت ہوگی۔ اس پروگرام کو اٹھانے والوں' اس بارِ گراں کو اٹھانے والوں' کے اندر اتنی قوت ہونی چاہیے کہ ''قم'' (74:2) کے وقت لڑکھڑا کر نہ اٹھیں' ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوں اور اٹھ کھڑے ہونے کے بعد پھر ان کے اندر اتنی استقامت ہو کہ لڑکھڑائیں نہیں۔ ان کی ٹانگیں کمزور نہیں ہونی چاہئیں۔ یہ جماعت اس قسم کے افراد کی ہونی چاہیے۔ اس لیے کہا کہ **وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ** (74:5) اگر ان کے اندر رجز ہے تو پہلے دیکھو کہ وہ غیر قرآنی عنصر ان میں سے نکل جائے' اس کی ان میں اصلاح ہو جائے' اتنی تقویت پیدا ہو جائے۔ جو جماعت تم نے بنانی ہے' اس جماعت کو لے کر تمہیں ربوبیتِ عالمینی کے پروگرام کی ابتداء کرنی ہے۔

پروگرام کی تکمیل کے لیے ایک خصوصی شرط

عزیزانِ من! اس جماعت کے اندر جو بنیادی اور خصوصی شرط ہے وہ اگلی آیت کے دو لفظوں کے اندر آتی ہے لیکن اگلی آیت تک آنے سے پیشتر میں چاہتا ہوں کہ ذرا اس کا وہ ترجمہ دہرا دوں جو آپ نے پہلے دیکھا ہے۔ ہمارے ہاں عام تراجم کے اندر آپ کو یہی

➊ اس قسم کے رفقاء کو اپنے ساتھ لے (73:1) اور ان کی ایسی تربیت کر کہ ان کی سیرت میں پختگی پیدا ہو جائے' جس سے وہ اس بارِ عظیم کو آسانی سے اٹھا سکیں' اور ان کے پائے استقلال میں کہیں لغزش نہ آنے پائے۔ وہ اس بوجھ کو لے کر اٹھیں تو ان کی ٹانگیں لڑکھڑا نہ جائیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ملے گا' اے لحاف میں لپٹنے والے! کھڑا ہو' پھر سنا دے' اور اپنے رب کی بڑائی بول' اور اپنے کپڑے پاک رکھ' اور گندگی سے دور رہ۔ الفاظ کے معنی' لغت عرب کے محاورۂ عرب کی رو سے' میں نے پیش کر دیئے ہیں۔ جو غیر مسلم دانشور' جنہوں نے اس تحریک کا' اسلام کا از خود مطالعہ کیا ہے' وہ جس نتیجے پہ پہنچے ہیں' وہ میں نے بتا دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرا عمر بھر کا مسلک یہ ہے کہ میں نے قرآنی الفاظ کے معنی پہلے اس طرح متعین کیے کہ زمانہ نزولِ قرآن میں ان کا مفہوم کیا لیا جاتا تھا اور لغات القرآن مرتب کی پھر اس لغات کی بنیاد پر سارے قرآنِ کریم کا مفہوم مرتب کیا۔ جی نہیں چاہتا کہ آگے بڑھ جاؤں اور جو مفہوم میں نے متعین کیا ہے' وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کی رو سے ہے' خود اپنے متعلق نہیں کچھ کہتا۔ ان آیات کا جو مفہوم ''مفہوم القرآن'' میں آیا ہے وہ میں پڑھ دیتا ہوں:

مفہوم القرآن میں دیا جانے والا مفہوم

''اے وہ کہ جس کے ذمہ عالمِ انسانیت کو سنوار کر' ایک جہانِ نو کو وجود میں لانے' اور اس طرح حق کے نظام کو ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کا انقلابی پروگرام ہے' اٹھ!'' اب جو اس طرح سے کسی کو خطاب کیا جائے گا تو پھر اس کے بعد اس اٹھ کے معنی تو خود ذہن میں آ جائیں گے: Rise ''اٹھ'' ''اور خدا فراموش انسانوں کو ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔ اور خدا کے نظامِ ربوبیت کو اس طرح متمکن کر دے کہ کبریائی صرف اسی کے لیے ہو۔ (اس سے خود تمہیں بھی دنیا میں بڑائی حاصل ہو جائے گی۔ (2:152) اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی سیرت و کردار کو نہایت پاکیزہ بنایا جائے اور اس دعوت و تحریک کو ہر قسم کے ناپسندیدہ عناصر سے پاک اور صاف رکھا جائے (اس لیے کہ یہ کوئی ایسا میکانکی نظام نہیں کہ جس نے چاہا اسے چلا لیا۔ اس کے لیے خود اس دعوت کا صاف اور شفاف رہنا اور اس میں شامل ہونے والوں کے قلب و نگاہ کا پاکیزہ ہونا بنیادی شرط ہے۔) اس قسم کے رفقاء کو اپنے ساتھ لے۔ (73:1) اور ان کی ایسی تربیت کر کہ ان کی سیرت میں پختگی پیدا ہو جائے جس سے وہ اس بارِ عظیم کو آسانی سے اٹھا سکیں اور ان کے پائے استقلال میں کہیں لغزش نہ آنے پائے۔ وہ اس بوجھ کو لے کر اٹھیں تو ان کی ٹانگیں لڑکھڑا کر نہ رہ جائیں۔''

عزیزانِ من! مفہوم القرآن میں' میں نے اس کا یہ مفہوم دیا ہے۔ اس قسم کی جماعت تیار کرنے کے بعد اگلی تاکید میں کہا گیا ہے کہ اب اس پوری جماعت کو بتا دے کہ اس نظام کا ایک بنیادی اصول ہے اور وہ ہے: وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ (74:6)۔ اسے پھر ہم آئندہ درس میں لیں گے آج وقت ختم ہو گیا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀❀❀......❀

بیسواں باب: سورۃ المدثر (آیات 6 تا26)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1984ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المدثر کی آیت 6 سے ہو رہا ہے:(74:6)۔ آپ کو یاد ہے کہ میں نے ان دو سورتوں 'المزمل اور المدثر' میں عرض کیا تھا کہ یہ ایک انقلاب تھا جس کی تیاریاں اتنے عرصے سے ہو رہی تھیں' اب اس کا آخری دَور آ گیا ہے۔ یوں سمجھیے گویا Confrontation کا' تصادم کا' ٹکراؤ کا' زمانہ آ رہا ہے۔ اس کے لیے سورۃ المزمل میں ایک جماعت کی تیاری کے لیے کہا تھا اور پھر بتایا تھا کہ اس جماعت کے افراد کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں۔ اس کے بعد سورۃ مدثر کے سلسلہ میں' میں نے عرض کیا تھا کہ مدثر کے معنی ''کائنات کے چمنِ خزاں دیدہ کو بہارِ نو سے آشنا کرانے والے'' کے ہیں۔ سورۃ المدثر کی دوسری آیت میں کہا تھا کہ قُمْ فَاَنْذِرْ (74:2) اُٹھ! اور خود فراموش انسانوں کو ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔ یہ ''قم'' تو عظیم چیز ہے۔ اس کے بعد کہا تھا کہ یہ پروگرام ہے جس کے لیے رَبَّکَ فَکَبِّرْ (74:3) آیا ہے یعنی تو خدا کے نظامِ ربوبیت کو اس طرح متمکن کر دے کہ کبریائی صرف اسی کے لیے ہو۔ اس سے خود تمہیں بھی دنیا میں بڑائی حاصل ہو جائے گی۔

رَبَّکَ فَکَبِّرْ کیا تھا؟

یہ ساری تیاریاں' یہ تصادمات' یہ انقلاب آفرینیاں' اسلام کا مقصد' دین کا منتہیٰ' تھیں مگر یہ رَبَّکَ فَکَبِّرْ (74:3) مذہبی پیشوائیت کے لیے تو بڑا آسان ہو گیا: اپنے رب کی بڑائی کر اور عیدین کی نمازوں میں عام تکبیروں کے علاوہ چھ چھ تکبیریں زائد پڑھ لیں' فریضہ ادا ہو گیا۔ جس کے لیے یہ سارا کچھ رسول اللہ سے کہا جا رہا ہے' یہ تیاریاں کی جا رہی ہیں' اس کے لیے نمازِ عید میں چھ تکبیریں زائد

کرلیا کر' اپنے رب کی بڑائی کر اور پھر **ثِیَابَکَ فَطَھِّرْ o وَ الرُّجْزَ فَاھْجُرْ** (74:4-5) کے لیے تو میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے معنی ''اپنی جماعت کے افراد کی تطہیر کرنا ہے۔ اس لیے کہا تھا کہ اپنی جماعت کے افراد کی سیرت و کردار کو پاکیزہ رکھ' اپنی دعوت کو بھی ہر طرح کے غیر خداوندی عناصر سے پاک رکھ **وَ الرُّجْزَ فَاھْجُرْ** (74:5) اور اِس میں کسی قسم کی کوئی ایسی چیز' جو آپ کے ہاں باطل کی آمیزش کرنے والی ہو' مخل نہ ہونے پائے۔ یہ ہے تطہیر۔ یعنی ان کی ایسی تربیت کر کہ ان کی سیرت میں پختگی پیدا ہو جائے تا کہ **وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ** (74:5) تمہارے پائے استقلال میں کہیں لغزش نہ آنے پائے' اٹھنے میں تمہاری ٹانگیں لڑکھڑائیں نہیں۔ آپ غور کیجیے کہ اس کے لیے کیا کیا شرائط دی جا رہی ہیں لیکن آپ کے ہاں پھر وہی آسان حل ہے کہ اپنے رب کی بڑائی کر' اپنے کپڑوں کو پاک رکھ' ناپاکی سے دُور رہ۔ مقصد حل ہو گیا: قم یعنی یہ کچھ کرنے کے لیے اٹھ۔ بہر حال میں نے عرض کیا تھا کہ یہ کتنا بڑا عظیم انقلابی پروگرام ہے جس کے لیے کہا تھا کہ **قُمْ فَاَنْذِرْ** (74:2) اٹھ! اور خود فراموش انسانوں کو یاد دلا کہ تم جس روش پہ چلے جا رہے ہو اس کا نتیجہ تباہی ہے۔ ان سے کہو کہ تمہاری یہ روش غلط ہے۔ صحیح روش کے لیے دنیا میں اس پروگرام کا رائج کرنا ہوگا۔ **ربک** (74:3) ربوبیت عالمینی کا یہ پروگرام صرف رائج ہی نہیں کرنا بلکہ **فکبر** (74:3) دنیا کے ہر نظام کے اوپر اس کو غالب کرنا ہے۔

قرآنِ حکیم کا پہلا ہی لفظ ربوبیت عالمینی ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کا پہلا ہی حرف الحمد ہے۔ اس میں کہا ہے: **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ** (1:1) اور اس الحمد کے بعد پہلی چیز **رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (1:1) ہے۔ ربوبیتِ عالمینی ہے۔ قرآن کا' اس کے پروگرام کا' مقصد اور منتہیٰ ربوبیت ہے' تمام نوعِ انسان کی نشوونما ہے' انسانیت کے جوہروں کی Development (نشوونما) ہے۔ اس کے اندر پہلی چیز تو یہ ہے کہ کم از کم اس میں کوئی فرد بھوکا نہ رہے۔ بھوکا رہنے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ کوئی فردِ معاشرہ ضروریاتِ زندگی سے محتاج نہ رہے اور جب اسے انسانیت پر پھیلائیں گے تو آپ دیکھیے کہ یہ کتنا عظیم پروگرام ہے۔ یہ تو براہِ راست سرمایہ داروں کے خلاف پہلا اعلان ہے۔ یہ تو وہ **اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی** کہنے والے جو اربابِ اقتدار ہیں' جو اپنے ہاتھ میں روٹی رکھتے ہیں تا کہ لوگوں کو اپنے سامنے جھکائیں' ان کو ختم کر دینے والا اعلان ہے۔ **رَبَّکَ فَکَبِّرْ** (74:3) یہ کوئی چھوٹا اعلان نہیں ہے' اور اسے صرف نافذ ہی کرنا' فکبر کے معنی ہیں: غالب کرنا' دنیا کے ہر نظام پہ۔ اس سے وہ تمام نظامہائے زندگی مغلوب ہو جائیں' ختم ہو جائیں اور یہی ایک نظام باقی رہے۔ لا الہ کے معنی یہ ہیں کہ ان کو ختم کر دیا جائے گا اور الا اللہ یہ ہے کہ یہ نظام ہوگا جو تمام نظاموں کے اوپر غالب ہوگا اور اس کے لیے پہلی ضروری نفسیاتی چیز یہ ہے کہ ان کے قلب و نگاہ کی پاکیزگی ہو' سیرت و کردار کی بلندی ہو۔ یہ ہیں وہ افراد جن کے ہاتھوں یہ انقلاب برپا ہوگا۔

اسلامی نظام کوئی مکینکل چیز نہیں

عزیزانِ من! جسے آپ اسلامی نظام' اسلامی معاشرہ' اسلامی مملکت' کہتے ہیں' یہ کوئی مکینکل چیز نہیں ہے' یہ قانون سازی نہیں ہے۔ آپ جتنے بھی قانون بنائیں گے یا جنہیں آپ اپنے ہاں کے قانون کہیں گے' یہ ٹھیک ہے کہ آپ ان پہ چلیے' کچھ تھوڑا بہت فرق ہے' آج بھی ان میں صحیح ترمیم واضافہ کی ضرورت ہے' ورنہ دنیا میں وہی قانون رائج ہے کہ چوری نہ کرو' جھوٹ نہ بولو' دھوکا نہ دو' فریب نہ کرو۔ اگر دیکھا جائے تو اسلام میں یہ قانون سازی نہیں بلکہ یہ تو انسان سازی ہے۔ عزیزانِ من! ذرا سوچیے کہ یہاں بتایا یہ گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو **يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ** (59:9) دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں' آپ تنگی ترشی میں گزارا کرتے ہیں' دوسروں کو آسائش پہنچاتے ہیں۔ دنیا کا کونسا قانون ہے جس کے ذریعے آپ یہ کر سکتے ہیں۔ کیا یہ قانون کی بات ہے؟ نہیں' یہ تو آپ کے اندر ایک نفسیاتی تبدیلی کا نام ہے' یہ تو شخصیت کی تبدیلی کا نام ہے' یہ تو سیرت کی تبدیلی کا نام ہے' قلب و نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے۔ اس تبدیلی کے ذریعے تو آپ یہ کچھ کر سکتے ہیں مگر کسی قانون کے ذریعے آپ یہ نہیں کر سکتے کہ اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دیں' خود تنگی ترشی میں گزارا کریں' دوسروں کو دیکھیں کہ انہیں محتاجی نہ ہو۔ دنیا کا کوئی قانون یہ نہیں کرتا۔ یہ قانون سازی نہیں ہے۔ یہ انسانوں کے اندر تبدیلی پیدا کرنا ہے۔

نفسیاتی تبدیلی کے بغیر قرآنی نظام متشکل نہیں ہوسکتا

عزیزانِ من! قرآن نے اسی لیے کہا تھا کہ کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں پیدا ہوسکتی تاوقتیکہ اس قوم کے افراد کے اندر تبدیلی پیدا نہ ہو۔ یہ ہے **رَبَّکَ فَکَبِّرْ** [1] پروگرام جو دیا جا رہا ہے' یہ ہے ربوبیت عالمینی کا پروگرام جسے دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کرنا ہے۔ اس کے لیے پہلی شرط تھی: **وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ** (74:4) سیرت میں' کردار میں' ذہن میں' زاویہ نگاہ میں' ایک تبدیلی' پاکیزگی پیدا کرنا اور خود اِس دعوت و تحریک کو ناپسندیدہ عناصر سے پاک وصاف رکھنا۔ اس کے لیے اب دیکھیے کہ یہ یقیناً کوئی اتنا بڑا مرحلہ ہے جس کے لیے اتنی تاکید کی جا رہی ہے کہ **وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ** (74:5) سیرت و کردار کی اتنی پاکیزگی ہو کہ جس سے ان میں اتنی قوت آ جائے کہ جب وہ اس بارِ عظیم کو اٹھائیں تو اس سے لڑکھڑائیں نہیں' ان کے پاؤں میں لغزش نہ آنے پائے۔ یہ بڑائی بولنے سے نہیں ہوگا۔ اسی میں ''خدا کی بڑائی بول'' کی ہی ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو کوئی بہت بڑا اہم انقلاب ہے جسے برپا کرنا ہے۔ یہ تو ساری دنیا کے ساتھ ٹکر لینا ہے بلکہ یہ تو پورے نظاموں کو' جو دنیا کے اندر رائج ہیں' چیلنج ہے اس لیے کہا ہے کہ پہلے اپنی جماعت میں یہ دیکھ کہ کہیں ان کے پاؤں میں لغزش نہ آ جائے۔ اب' عزیزانِ من! اس پروگرام کے متعلق دو لفظوں میں بتا دیا ہے۔ ان میں سارا اسلام سمٹ کے آ گیا ہے'

---

[1] خدا کے نظام ربوبیت کو اس طرح متمکن کر دے کہ کبریائی صرف اسی کے لیے ہو۔ (اس سے خود تمہیں بھی دنیا میں بڑائی حاصل ہو جائے گی۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اس کے اندر تشریح ہوگئی کہ رَبَّکَ فَکَبِّرْ ❶ (74:3) کیا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ اپنے رفقاء کو یہ بھی سمجھا دے کہ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (74:6) اس سے' بغیر کسی معاوضہ کے اور بغیر کسی شکریہ کے' ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا ہے' محتاجوں کو دینا ہے' بھوکوں کو کھلانا ہے۔

یہ سب کچھ اس نیت سے نہیں کرنا ہے کہ اس کے بدلے میں تمہیں کچھ ملے گا۔ یہ ہے پروگرام! یہ ہے جس نظام کو غالب کرنا ہے! اس نظام کا اصول یہ ہے کہ تم اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشوونما کے لیے کھلا رکھو اور ضرورت مندوں کی امداد کرو۔ اس عمل سے یہ نہیں ہوگا کہ تَسْتَكْثِرُ (74:6) تمہیں اس کے ذریعے کچھ زیادہ ملے گا۔ زیادہ ملنا تو ایک طرف رہا پھر تمہاری کیفیت یہ ہوگی کہ تم کہو گے کہ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُورًا (76:9)۔ یہ ساری دنیا کے محتاجوں کی محتاجی کو دُور کریں گے' ان کی ضروریات پورا کریں گے اور کہیں گے کہ ''ہم تم سے اس کے بدلے میں کچھ لینا تو ایک طرف رہا' ہم تو شکریہ کے بھی متمنی نہیں ہیں۔'' یہ ہیں اسلامی مملکت قائم کرنے والے افراد: شکریئے تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔ لَا نُرِيدُ (74:9) جزاء تو بڑی چیز ہوتی ہے: کسی کے بدلے میں کچھ لینا' ہم تو تم سے اسکے بھی متمنی نہیں ہیں۔ یہ کچھ اندر کی تبدیلی کرے گی۔

لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ کا مفہوم

دنیا میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو قانون کی ضرورت کے تحت یہ چیز پیدا کردے۔ یہ ہے: لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ❷ (74:6)۔ یہ اتنی بڑی پہلی چیز ہے۔ اب اس کے لیے پہلا درجہ' کم از کم یہی سہی' کہ اپنی ضروریات سے جو کچھ زائد ہے' قُلِ الْعَفْوَ (2:219) وہ دوسروں کی ضروریات کے لیے کھلا رکھ دیا جائے۔ تو کم از کم اس میں اپنی ضروریات تک کی بات آ گئی۔ یہ بھی کوئی چھوٹی بات نہیں ہے کہ محنت پوری استعداد کے ساتھ' استطاعت کے ساتھ کرے' جان مارے' مسلسل محنت کرتا چلا جائے اور جو کچھ اس کا ماحصل ہو' اس میں صرف اپنی ضروریات کے لیے لے اور باقی سارا دوسروں کے لیے دیدے۔

یہ پروگرام ایک دن کا پروگرام نہیں' زندگی بھر کا سلسلہ ہے

عزیزانِ من! یہ ایک دن کی بات نہیں' ایک وقت کی بات نہیں۔ فَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ❸ (2:132)۔ یہ

---

❶ خدا کے نظام ربوبیت کو اس طرح متمکن کردے کہ کبریائی صرف اسی کے لیے ہو۔ (اس سے خود تمہیں بھی دنیا میں بڑائی حاصل ہوجائے گی۔)

❷ اپنے رفقاء کو یہ بھی سمجھا دے کہ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تم اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشوونما کے لیے کھلا رکھو اور ضرورت مندوں کی امداد کرو تو اس نیت سے نہیں کہ یہ ان پر احسان ہے جس کے بدلے میں وہ تمہیں اس سے زیادہ لوٹا کردیں گے۔ (3:39;76:9)

❸ لہٰذا تمہیں اپنی تمام زندگی اس کے مطابق بسر کرنی چاہیے اور مرتے دم تک اس کی اطاعت کرتے رہنا چاہیے۔ (۱-۲-۳ مفہوم القرآن۔ پرویز)

ساری عمر کا پروگرام ہے۔ آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ بات کہاں تک جا رہی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب اس میں تصادمات بھی آئیں گے' میدانِ جنگ میں بھی جانا پڑے گا لیکن کسی فوج میں جان دے دینا تو بہرحال بڑی چیز ہے۔ عزیزانِ من! ایک دفعہ جان دیدینے کے مقابلے میں یہ ساری عمر کے لیے کام کرتے چلے جانا بہت بڑی ہمت طلب اور حوصلہ شکن چیز ہے۔ یہ ساری عمر کا پروگرام ہے: جان مار کر محنت کرتے چلے جاؤ' اپنی ضروریات کے لیے کم از کم لو' وہ لینے کی بھی صرف اجازت ہے' ورنہ اگلا درجہ یہ ہے کہ اپنے پر دوسروں کو ترجیح دو۔ ساری عمر یہ پروگرام رکھو۔ بات تو یونہی وہ غالب کی غزل کی ہے لیکن بات ایسی ہے جو گہری سوچ کی متمنی ہے:

یہ سسک سسک کے مرنا غمِ ہجر میں بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا ❶

یہ ایک بار کا مرنا نہیں ہے یہ تو ساری عمر کا مرنا ہے' عزیزانِ من! قرآن تو کہتا ہے کہ **لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ** ❷ (74:6)۔ اب آپ کی سمجھ میں بات آئی کہ یہ اتنی تاکید کیوں ہو رہی تھی کہ ایسی جماعت تیار کر' اس قسم کی ان کی سیرت اور کردار میں تبدیلیاں پیدا کر' اس قدر پاکیزگی پیدا کر' یہ دیکھ کہ لغزش نہ آنے پائے۔ یہ تھا وہ پروگرام! ایک دو دن کی بات نہیں' یہ عمر بھر کا قصہ ہے اور اسی کے لیے اب دیکھیے کہ آگے کی جو بات ہے وہ کیا ہے۔ جہاں کہا تھا کہ **وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ** ❸ (74:3)۔ اس کے آگے یہ سارا کچھ ہے کہ **لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ** ❷ (74:6) اور پھر آگے ہے **وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ** ❹ (74:7)

فاصبر کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! یہاں اس ربوبیتِ عالمینی کے پروگرام کے لیے 'فَاصْبِرْ'' آیا ہے۔ یہ وہی ہے جس کے لیے آپ کہیں گے: استقامت دکھاؤ' استقلال پہ رہو' جم کر رہو۔ یعنی یہ کوئی ایسا پروگرام ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کو تاکید کرنا پڑ رہی ہے کہ دیکھنا کہیں لغزش

---

❶ دیوانِ غالب میں یہ شعر یوں ہے:
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے' شب غم بری بلا ہے — مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
(مرزا اسداللہ خاں غالب: دیوانِ غالب' جہانگیر بک ڈپو' لاہور' 2002' ص۔ 37)

❷ اپنے رفقاء کو یہ بھی سمجھا دے کہ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تم اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشوونما کے لیے کھلا رکھو اور ضرورت مندوں کی امداد کرو تو اس نیت سے نہیں کہ یہ ان پر احسان ہے جس کے بدلے میں وہ تمہیں اس سے زیادہ لوٹا کر دیں گے۔ (3:39;76:9)

❸ خدا کے نظام ربوبیت کو اس طرح متمکن کر دے کہ کبریائی صرف اسی کے لیے ہو (اس سے خود تمہیں بھی دنیا میں بڑائی حاصل ہو جائے گی۔ 2:152)

❹ یہ ہے وہ نظامِ ربوبیت' جس کے قیام و استحکام کے لیے تمہیں نہایت ثبات و استقامت سے سرگرمِ عمل رہنا ہے اور اس سکون و اطمینان سے آمادہ بمنزل ہونا ہے کہ تمہاری کشتی ڈگمگائے نہیں۔ (۲۔۳۔۴، مفہوم القرآن۔ پرویز)

نہ ہو اس پروگرام پر جم کر کھڑے ہو جاؤ' بڑا لمبا' بڑا اہمت شکن پروگرام ہے۔ عزیزانِ من! یہ کوئی آسان بات نہیں مگر جب دین مذہب میں تبدیل ہوا تو یہ چیز ہی آسان ہو گئی۔ آپ کو پتہ ہے کہ وَ لِرَبِّکَ فَاصْبِرْ (74:7) کا کیا ترجمہ ہوا؟ یہ کہ اپنے رب کے لیے صبر کر۔ سمجھ لیجیے کہ ہمارے ہاں جو صبر کا مفہوم ہے اس کے حساب سے اس آیت کا کیا مفہوم بنا۔ بہر حال انہوں نے رَبَّکَ فَکَبِّرْ کا ترجمہ کیا کہ اپنے رب کی بڑائی کرو' لِرَبِّکَ فَاصْبِرْ (74:7) کا ترجمہ کیا کہ اپنے رب کے لیے صبر کر۔ اس کے بعد راوی عیش لکھتا ہے کہ جنت ملے گی جب کہ خدا نے یہ کہا تھا کہ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ [1] (74:6)۔ جب نظام ربوبیت قائم ہو تو اس وقت کی صورت قرآن نے بتا دی۔ پروگرام یہ ہے کہ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (2:219)۔ اب یہ پوچھتے ہیں کہ ہم دوسروں کی ضروریات کے لیے کتنا کھلا رکھیں؟ ان سے کہو کہ وہ سب کا سب جو تمہاری ضروریات سے زائد ہے۔ یہ ہوا عمر بھر کا پروگرام۔ اب اس میں کسی سے زائد لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لفظ ربوا کی حقیقت

عزیزانِ من! یہ جو درمیانی عرصہ ہے جب یہ پروگرام ابھی پوری طرح سے متشکل نہیں ہوا' دوسروں کی مدد کرنے کا پروگرام ہے' ٹھیک ہے جسے ہم ضرورت مندوں کی مدد کرنا کہتے ہیں' اس دوران میں یہ بھی ہوگا کہ دوسروں کو کچھ قرضہ بھی دیا جائے لیکن اس عبوری دور (Interim Period) میں بھی پہلی چیز یہ کہی کہ یہ جو ربٰو ہے وہ حرام ہے۔ ربٰو کے معنی ہیں: اپنے اصل کے اوپر کچھ زائد لینا۔ وہ آگے چل کر میں بتاؤں گا کہ جب سے ہمارے ہاں دین مذہب میں تبدیل ہوا ہے' ربٰو کے معنی سود ہوئے اور سود خاص طور پہ قرضے والا ہو گیا اور باقی سب کچھ جائز قرار پا گیا جبکہ ربٰو کے معنی ہی یہ ہیں: اپنے اصل سے کچھ زائد لینا' اور قرآن نے جہاں ربٰو کہا ہے خود اس کی تشریح کر دی ہے۔ یہ سورۃ بقرۃ کی 219 آیت ہے۔ ربٰو کی آیات وہی ہیں۔ جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں عربی معاشرے کے اندر یا بہر حال' ان لوگوں کے اندر' یہی چیز تھی کہ محتاج کی' غریب کی' مفلس کی' ضرورت مند کی' ضرورت کے لیے اسے قرضہ دیدیتے تھے اور قرضہ کے بعد پھر سود لیتے تھے۔ ظاہر ہے یہ سود تو ہمارے ہاں ربٰو کا پھر فارسی میں ترجمہ ہوا ہے۔ اصل میں ربٰو وہ ہے جو اس پر اصل سے کچھ زائد لیتے تھے۔ قرآن نے یہ بتا دیا کہ اس قسم کی بھی جو کسی کو مدد کرو' کچھ دو فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ [2] (2:279) صرف اپنا Principle Money (اصل زر) اپنا روپیہ' جسے راس المال کہتے ہیں واپس لے سکتے ہو۔ اصلِ زر کے اوپر کسی شکل میں بھی کچھ زیادہ لینا ربٰو ہے۔

---

[1] اپنے رفقاء کو یہ سمجھا دے کہ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تم اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشو و نما کے لیے کھلا رکھو اور ضرورت مندوں کی امداد کرو تو اس نیت سے نہیں کہ اس کے بدلے میں وہ تمہیں اس سے زیادہ لوٹا دیا کریں گے۔

[2] تم اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو۔ (۱-۲، مفہوم القرآن۔ پرویز)

اس کی اجازت نہیں ہے۔

اصل زر کے اوپر جو کچھ بھی ہے وہ ربٰو ہوگا

ویسے تو قرآنِ کریم نے بہت سے ایسے جرائم گنائے ہیں جن کا ارتکاب بہت ہی بری بات ہے لیکن یہ ایک ایسا جرم ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ❶ (2:278)۔اب ہم نے یہ حکم دیدیا کہ جو ربٰو ہے اُسے چھوڑ دو، یہ حرام ہے۔ پچھلے معاملے بھی جو تم نے کیے ہوئے ہیں، ان میں اگر کسی کے ذمہ تمہارا یہ ربٰو باقی ہے تو اس کو بھی چھوڑو: وَذَرُوْا مَا بَقِيَ (2:278) اس کے ذمہ جو باقی ہے اس کو بھی چھوڑنا ہوگا۔فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ❷ (2:279)۔ یہ ایک جرم ہے جس کے متعلق یہ آیا ہے کہ اگر تم یہ نہیں کرو گے تو تمہارے خلاف اسلامی مملکت کی طرف سے، خدا اور رسول کی طرف سے، اعلانِ جنگ ہے۔اس سے آپ یہ اندازہ لگائیے کہ اس جرم کی نوعیت کیا ہوئی۔ یہ نہیں ہے کہ تمہارے خلاف مقدمہ ہے، عدالت سزا دے گی، پھانسی کی بھی سزا دیدیجئے، کوئی بات نہیں مگر یہاں تو کہا ہے کہ یہ خدا اور رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے یعنی یہ اتنا بڑا جرم ہے۔ ایسا کیوں کہا گیا؟ صرف بغاوت کے متعلق قرآن نے اعلانِ جنگ کہا ہے۔

اسلام کے بنیادی نظام، ربوبیت عالمینی کے خلاف بغاوت

یہ بغاوت کیا ہے؟ اسلامی مملکت کا بنیادی نظام، ربوبیت کا نظام ہے۔محتاج کی، مفلس کی، جس میں کام کرنے کی طاقت نہ رہی ہو، معذور ہو چکا ہو، مسکین ہو چکا ہو، ان سب کی مدد کرنا اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ یہ ہے آپ کے ہاں کی مملکت کا نظام! اس نظام کے خلاف کوئی دوسرا نظام کہ جس میں دوسرے کی مدد کر کے اپنے اصل سے کچھ زیادہ لے لیا جائے، اس نظام کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ اس کے علی الرغم ایک دوسرا نظام قائم کرنا ہے یعنی ربوبیت کے نظام کے خلاف سرمایہ داری کا نظام قائم کرنا ہے۔ اِس نظام کے خلاف خدا اور رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ کسی اور جرم کے متعلق یہ کچھ نہیں آیا، قرآن میں اس کے متعلق یہ اتنا کچھ آیا ہے۔ آپ دیکھیے کہ کتنا بڑا جرم ہے: خدا اور رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ (2:279) ان حالات میں صرف اصل زر لے سکتے ہو باقی چھوڑنا ہوگا لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ❸ (2:279)۔ بس اس سے اتنا ہے کہ تم اپنا اصل لے لو گے تو تم پہ کچھ

---

❶ اے جماعت مومنین! تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو، اور ربٰو میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی رہ گیا ہے اسے معاف کر دو۔ تمہارے ایمان کا یہی تقاضا ہے۔

❷ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو یاد رکھو! تمہاری اس روش کو نظامِ خداوندی کے خلاف اعلانِ جنگ سمجھا جائے گا۔

❸ تا کہ نہ تم پر کوئی زیادتی ہو، نہ مقروض پر۔ (۱-۲-۳، مفہوم القرآن - پرویز)

زیادتی نہیں ہوگی تو گویا کسی سے اپنے اصل سے زیادہ لینا ظلم ہوگیا۔ یہ اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت ہوگئی۔ یہ اس کی طرف سے اعلانِ جنگ ہوگیا۔

اگر کوئی اصل بھی دینے کے قابل نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے؟

عزیزانِ من! قرآن کی طرف آیئے تو یہ Lightly (غیر سنجیدہ طور پر) لینے کی چیزیں نہیں ہیں کہ یونہی آدمی کہہ کر گزر جائے۔ سوچیے تو سہی کہ دو لفظوں میں جرم کتنا عظیم بتایا ہے۔ اصل سے زائد لینے کو نظامِ سرمایہ داری کہتے ہیں' یعنی اِدھر اسلامی مملکت میں تو یہ کیفیت تھی کہ اپنی ضرورت سے زائد سارا دوسروں کو دیدو۔ اگلی بات یہ تھی کہ اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دینا۔ نظام تو یہ تھا اور اس کے خلاف یہ کہ جونہی کوئی محتاج ہو' غریب ہو' مصیبت میں پڑے' اس کی مصیبت کو Exploit (فائدہ اٹھانے کے لیے تصرف میں لانا' ناجائز فائدہ اٹھانا) کیا جائے' یعنی اُسے مدد دی جائے' پھر اپنا اصل بھی لیا جائے اور اس کی محنت کے ماحصل میں سے اس دیئے گئے اصل کے اوپر زائد بھی لیا جائے' تو یہ تو اس نظام کے خلاف بغاوت ہے۔

عزیزانِ من! اب آگے ایک فقرہ ہے جس میں کہا ہے کہ وَ اِنۡ کَانَ ذُوۡ عُسۡرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیۡسَرَۃٍ ؕ وَ اَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ [1] (2:280)۔ اس میں کہا ہے کہ تم صرف اپنا راس مال' اصلِ زر واپس لے سکتے ہو' اور اگر وہ غریب ہے' ابھی اس قابل نہیں ہے کہ کچھ ادا کر سکے تو اُسے مہلت دو۔ اگر اصل پہ سود (Interest) لینا ہو تو مہلت میں تو وہ سود اور بھی بڑھ جاتا ہے جبکہ سود تو آپ نے اس کے اوپر لینا ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اُسے آپ مہلت دیدو اور پھر اگر وہ اس مہلت کے باوجود اس قابل نہ ہو کہ اصل زر واپس کر سکے تو اُسے سارا ہی چھوڑ دو۔

غیر قرآنی حکومت ہمیشہ سرمایہ دار ہوتی ہے

یہ ہے نظام' عزیزانِ من! اب آ گیا ہمارے ہاں کا نظامِ ملوکیت۔ ملوکیت کے ساتھ ہی سرمایہ داری کا نظام آیا۔ غیر قرآنی مملکت سب سے بڑی سرمایہ دار خود ہوتی ہے۔ اس میں غریبوں کے اوپر اتنے ٹیکس Taxes لگتے ہیں کہ پوچھو نہیں۔ غیر قرآنی مملکت تو یہ ذمہ داری لیتی ہی نہیں ہے کہ ملک میں رات کو کوئی بھوکا نہ سوئے۔ اسلامی مملکت میں تو پہلی چیز یہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس بستی میں رات کو کوئی ایک فرد بھی بھوکا سو گیا اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہوگئی۔ اور انسان ہی نہیں وہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ (581-644ء) کا قول ہے کہ دجلہ کے کنارے کتا بھی بھوک سے مر گیا تو مجھ سے اس کا بھی مواخذہ ہوگا۔ یہ تو تھی اسلامی مملکت۔ جب

---

[1] اگر مقروض تنگدست ہے تو اُسے اتنی مہلت دو کہ وہ قرض بسہولت واپس کر سکے اور اگر تم اسے بالکل ہی معاف کر دو تو یہ تمہارے لیے بہت اچھا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اس کے بعد ملوکیت آ گئی، دین مذہب میں بدلا، یہ تمام معاملات بگڑ گئے۔

انسانیت کے خلاف تین بڑی لعنتیں

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن نے انسانیت کش، یعنی انسانیت کو تباہ کرنے والی تین ہی سب سے بڑی لعنتیں گنائی ہیں: پہلا فرعون، ملوکیت کا استبداد ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی ❶ (79:24)۔ یہ روٹی اپنے ہاتھ میں رکھنا ہے۔ دوسرا ہامان، مذہبی پیشوائیت ہے، جس کا اقتدار بادشاہوں سے بھی زیادہ غالب ہوتا ہے، بادشاہ تو مرجاتا ہے، اس کی سلطنت ختم ہو جاتی ہے، حکومت بدل جاتی ہے، ان کے قانون ختم ہو جاتے ہیں مگر اِن کے قانون جو انہوں نے ہزار برس پہلے بنائے تھے، آج بھی جاری ہیں، اور تیسری لعنت قارون ہے، جس میں دوسرے کی محنت کو Exploit (استحصال) کرنا اور خود محنت نہیں کرنا۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں اگر صرف سو روپیہ الماری میں، تجوری میں، رکھا رہے تو سو سال کے بعد بھی دیکھو تو وہ سو ہی ہوتا ہے، وہ بچے نہیں دیتا۔ نظامِ سرمایہ داری یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کو دیدیا جائے تو پھر وہ سو کا سوا سو، ڈیڑھ سو، ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں وہ کتنے بچے دیتا ہے مگر تم نے اس میں کچھ نہیں کرنا۔ اسلامی نظام میں یہ جو دیا ہے وہ زائد از ضرورت تھا، اس نظام میں تو زائد از ضرورت کوئی اپنے پاس رکھ ہی نہیں سکتا۔ نظامِ سرمایہ داری سرپلس منی Surplus Money (زائد از ضرورت روپیہ) پر چلتا ہے۔ اگر اپنی ضرورت سے زائد روپیہ پاس ہو تو وہ اسے کسی اور کو دے گا اور پھر اس سے دیئے گئے روپے کے اوپر وصول کرے گا۔ قرآن نے کہا ہے کہ لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ❷ (53:39) معاوضہ محنت کا ہے کیپٹل (سرمایہ) کا نہیں ہے۔ اب آیا دورِ ملوکیت۔ ایک شکل تو بالکل ظاہر نظر آتی تھی کہ کسی غریب آدمی کو قرضے کے طور پر کچھ دیا جائے، اس قرضے کے اوپر کچھ پانچ روپے، دس روپے، وصول کئے جائیں۔ ہمارے ہاں بھی جو بات چلی آئی اس کو بڑا ہی مکروہ سمجھا جاتا تھا، گناہ بھی سمجھا جاتا تھا۔ اُسے سود خور کہتے تھے۔ پٹھان آیا کرتے تھے۔ وہ صرف یہ سود تھا۔ نظر آتا ہے کہ اتنی جرأت تو نہ تھی کہ اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ یہ اتنا حصہ ممنوع ہے، ناجائز ہے، غیر اسلامی ہے لیکن اپنے سرپلس منی (Surplus Money) پر، اپنے زائد از ضرورت روپے پر، دوسروں سے زائد وصول کرنے کی کتنی ہی شکلیں رکھ دی گئیں مگر بات ایک ہی ہے۔

زمین کی بٹائی اور مضاربت دونوں حلال

کسی کسان کو کسی زمیندار سے زمین کا ٹکڑا مل رہا ہے، پیسے اس کے پاس نہیں ہیں وہ کہتا ہے کہ اگر آپ مجھے ہزار روپیہ دیدیں تو میں

---

❶ تمہاری پرورش میں کرتا ہوں (کھانے پینے کو میں دیتا ہوں۔ میں ہی تمہارا ''ان داتا'' ہوں۔) تمہارا سب سے بڑا رب میں ہی ہوں۔

❷ انسان کو وہی نتائج مل سکیں گے جن کے لیے اس نے محنت اور کوشش کی ہوگی۔ جیسی جدوجہد، اسی قسم کے اس کے نتائج ...... خدائی پیمانے کے مطابق، معاوضہ صرف محنت کا ہوگا۔ (۱۔۲ مفہوم القرآن۔ پرویز)

وہ ٹکڑا زمین کا لے لونگا' کاشت کرونگا' بچوں کو بھی پالوں گا' تمہارے پیسے بھی دیدونگا۔ اب اگر وہ یہ کہتا ہے کہ اچھا! میں ہزار روپیہ دیتا ہوں' ایک ہزار پچیس یا پچاس زیادہ لونگا' تو یہ تو ہو گیا سود۔ وہ لینا تو معاشرے میں اس کی بڑی بدنامی ہے۔ سودخور کو بڑی نفرت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس نے کہا کہ نہیں جی' کوئی بات ہی نہیں ہے۔ میں تمہیں یہ زمین کا ٹکڑا لے کر دیے دیتا ہوں۔ اب اُس نے وہ ٹکڑا زمین کا لے کر اس کو کاشت پہ دے دیا اور اس کی بٹائی میں سے اس نے آدھا لے لیا' اپنا جو اصل ہے وہ اس کے سر پہ کھڑا ہے۔ وہ زمین تو اس نے لی ہوئی ہے وہ تو محفوظ ہے۔ سال بھر اس نے محنت کی ہے۔ وہ اگر سود لیتا تو پانچ دس روپے ہی لیتا مگر اب وہ شیر مادر کی طرح حلال آدھی بٹائی لیے چلا جا رہا ہے۔ کیونکہ اس کا نام ربٰو نہیں' اس کا نام مضاربت ہے۔ وہ کچھ کاروبار کرتا ہے۔ یہ وہ ہے جسے آپ Sleeping Partner کہتے ہیں۔ یہ اس کو کچھ روپیہ Invest کر دیتا ہے کہ شامل کر لو' یہ خود کچھ نہیں کرتا' سب کچھ وہ کرتا ہے۔ جتنا منافع ہوتا ہے اس کا آدھا Sleeping Partner لیے چلا جاتا ہے۔ یہ کس چیز کا منافع ہے؟ وہ اصل روپیہ جو دیا تھا' یہ اس کا منافع ہے۔ اُسے سود نہیں کہا گیا کیونکہ معاذ اللہ سودخور ہونا تو صاحب! حرام خور ہونا ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ ہے مضاربت۔ الفاظ بدل دیئے' اصطلاح بدل دی' اس کا نام تبدیل کر دیا' اُسے مضاربت کہہ دیا ہے۔ زمانہ مہذب ہوتا چلا جا رہا ہے' غیر مہذب زمانے میں ہر چیز کی شکل کچھ اور ہوتی تھی۔ جوں جوں زمانہ مہذب ہوتا ہے' یہ جتنی بھی ابلیسیت کی شکلیں ہیں' Refine (صیقل) ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اب بینکنگ کا کاروبار ہے۔ اب وہ مضاربت' مشارکت نہیں ہے یہ بلاسود بینکاری ہے۔ ارے یہ بینکاری کیا ہوئی؟ روپیہ ان کو دیدو' کاروبار وہ دینے والے خود کرتے ہیں اور اس کے بعد وہ Announce (اعلان) کرتے ہیں کہ صاحب! انہیں اتنے فیصد منافع دیا جائے گا۔ آج یہ بلاسود بینکاری ہے۔ بلا سود اس کو کہا ہے تو کوئی بات سود بھی تو ہونی چاہیے۔ اسی بینک میں ایک اور باسود بینکاری ہوتی ہے۔ وہ پہلے بتا دیتے ہیں صاحب کہ آٹھ فیصد تم کو مل جائے گا۔ یہ باسود بینکاری' وہ بلاسود بینکاری۔ اور پھر اس بلاسود بینکاری سے آگے جنت بھی ساتھ۔ اس باسود بینکاری کے اوپر بینک میں جو جمع ہوتا ہے اس کے اوپر زکوٰۃ کاٹی جاتی ہے۔ زکوٰۃ جس کے معنی ہی پاکیزہ ہیں۔ اس سود سے' اس ربٰوا' سے کچھ رقم کاٹی جاتی ہے جسے قرآن نے بہ نصِ صریح حرام کہا ہے' خدا اور رسول کے خلاف بغاوت کہا ہے' اس میں سے کاٹ کے وہ زکوٰۃ ہو جاتی ہے:

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں

اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

یہ تو جوانی سے بھی کچھ زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ لات و منات جو ہیں۔ ڈاہڈے تگڑے ہوندے نیں اے تے۔ [1] اس عمومیت سے یہ سود کا

---

[1] یہ تو بڑے ہی طاقتور ہوتے ہیں۔

کاروبار اس غیر مہذب دور میں کبھی بھی نہیں ہوتا ہوگا۔

بنک کا سود حلال اور سور کا گوشت حرام

قرآن ہے' عزیزانِ من! اندازہ لگائیے وہ خدائے علیم وخبیر ہے جس کے یہ احکام ہیں۔ یہ اس کی نگاہوں میں تھا کہ یہ بھی شکل ہوگی کہ دوسرے اپنے کیپٹل (سرمایہ :Capital) سے کچھ کاروبار کریں گے اور یہ اس کے کیپٹل (Capital) پہ کچھ اپنا کیپٹل (Capital) ملا دے گا' پھر اس کیپٹل (Capital) پہ حصہ لے گا۔ یہی چیز ہوتی ہے جسے آپ کے ہاں مضاربت یا مشارکت کہتے ہیں یا یہ جو بینکنگ کا کاروبار ہے کہ دوسرے کے روپے میں اپنا روپیہ ملا دیا جاتا ہے۔ کاروبار وہ کرتے ہیں' یہ صرف روپیہ ملاتا ہے۔ یہ اس کی شکل ہے' اور پھر اس پہ بڑی بحثیں چلتی ہیں کہ جی! بینک کا جو سود ہے وہ حلال ہے' وہ طاہر ہے' اگر سور کا یا اس کی ران کا گوشت ہو تو حرام ہے' یعنی اس کی ''مچھلیوں'' ❶ کا گوشت حلال ہے۔ میں ''مچھلی'' کا لفظ غلط کہہ گیا' وہ ہوتی ہے بکرے کی ران یعنی بکرے کی مچھلیاں۔ مچھلیاں ❶ نہ کہو' سینہ کہیے کہ اس کا ران کا گوشت تو حرام ہے' سینے کا گوشت حلال ہے۔ اب اس طرح اس کے روپے میں ملا دینا حلال ہو گیا۔ قرآن ہے' عزیزانِ من! جانے ہی نہیں دیتا۔ آپ کو راستہ ہی نہیں چھوڑتا **وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِىۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ** (30:39) جو روپیہ تم دوسرے کے مال میں شامل کر دیتے ہو کہ تمہیں اس سے زیادہ ملے ربٰو ہے۔

خدا کے ہاں زیادہ کیسے ہوگا؟

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ **فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ** ❷ (30:39)۔ خدا کے ہاں زیادہ تو وہ ہوتا ہے جو اپنے مال میں سے دوسروں کی نشوونما کے لیے اس طرح سے دے کہ شکریہ تک کا بھی متمنی نہ ہو۔ خدا کے ہاں تو زیادہ یہ ہوتا ہے۔ اب یہ ابلیسی نظام میں بہت زیادہ ہوتا ہے کہ اپنا روپیہ تم دوسرے اموال الناس میں شامل کر دو۔ یہ اس کی بنیاد ہے۔ عزیزانِ من! قرآن کی ایک ہی آیت اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتی ہے کہ **لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى** (53:39)۔ معاوضہ محنت کا ہے' روپے کا نہیں' خواہ اس کی کوئی شکل بھی ہو' کچھ نام بھی رکھ لیا جائے۔ اب آپ کے ذہن میں آیا ہوگا کہ قرآن جو یہ انقلاب لا رہا تھا' اس کے لیے یہ اتنی ساری تیاریاں کرنے کا کہہ رہا ہے' ایسی جماعت تیار کر رہا ہے' رسول اکرم ﷺ

---

❶ اس سے مراد ''ران'' ہے۔

❷ قانونِ خداوندی کی رو سے' اس سے تمہارے مال و دولت میں کچھ اضافہ نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس' جو کچھ تم اس لیے دو کہ اس سے دوسروں کی نشوونما ہو جائے' اور اس میں تمہیں کسی قسم کے ذاتی معاوضہ کا خیال نہ ہو' بلکہ تم یہ اس لیے کرو کہ اس سے تمہاری زندگی قوانین خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائے تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے دیئے ہوئے مال میں فی الحقیقت اضافے ہوتے ہیں (3:139; 2:275-276 اور 74:6) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

جو آخری انقلابی نبی ہیں' انہیں تاکیدیں یہ ہو رہی ہیں کہ یہ کرو' سیرت و کردار پاک کرو' لوگوں کے اندر یہ جذبے پیدا کرو' محنت زیادہ سے زیادہ کرو' کم از کم خود لو' زیادہ سے زیادہ دوسرے کو دو' یہ ایک نظام قائم کرو' کسی سے کچھ زائد لینے کی تمنا دل کے اندر نہ کرو۔

لفظ العقبہ کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ آپ نے سمجھ لیا کہ یہ کتنا مشکل اور ہمت طلب مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ تھا وہ نظام جس کے لیے یہ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہ تلواریں ہاتھ میں لے کر "علی علی" کر کے جا پڑنا نہیں تھا۔ اس کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہ تھا وہ نظام جو لانا تھا۔ اس نظام کے متعلق۔ عزیزانِ من! ایک ہی تشبیہہ ہے۔ کہا کہ پوچھتے ہیں کہ دین کیا ہے؟ کہا کہ دین ہے **الْعَقَبَةُ** ❶ (90:12)۔ قرآن ہے تو سامنے رکھیے۔ یہ عجیب آیات ہیں۔ عَــقَبَةُ کے معنی ہوتا ہے "پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا۔" ہموار میدان میں سفر کرنا آسان ہوتا ہے گھاٹی پر چڑھنا مشکل' اس میں آدمی ایک ایک قدم کر کے چڑھتا ہے' سانس پھول جاتی ہے۔ یہ گھاٹی پر چڑھنا ہے۔ کہا کہ یہ کیا بات ہوئی؟ **مَآ اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ** (90:12) تمہیں خدا کے سوا اور کون بتائے کہ عقبہ کس کو کہتے ہیں۔ سنیے عقبہ کیا ہے؟ پہلی شق' عزیزانِ من! یہ ہے **فَکُّ رَقَبَةٍ** (90:13) جہاں کہیں بھی کوئی انسان کسی دوسرے کی محکومی و غلامی میں ہو' اس کو غلامی سے آزاد کرانا۔ یہ پہلی چیز ہے۔ اس میں کوئی کہیں بھی ہو' اسے اس قابل بنانا ہے کہ وہ گردن اٹھا کر چلے' اسے جسمانی' ذہنی اور قلبی آزادی حاصل ہو۔ اب آپ دیکھیے کہ آپ کے دورِ ملوکیت میں کیا ہوا؟ ایک ایک خلیفے کے گھر میں تین تین ہزار لونڈیاں ہوتی تھیں۔ کیا یہ **فَکُّ رَقَبَةٍ** (90:13) والی قوم ہے؟ کیا پوچھتے ہیں کہ کیا ہوا اس قوم کو' کیا ہوا اسلام کے ساتھ؟ یہ وہی اسلام ہے جس کا آج Fundamentalism (بنیاد پرستی) کے ذریعے احیاء کیا جا رہا ہے۔ یہ تھی پہلی شق عقبہ کی: **فَکُّ رَقَبَةٍ** ۔ اور آگے ہے کہ **اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ** (90:14) گرانی کے زمانے میں' کمیابی کے زمانے میں' قحط سالی کے زمانے میں' جس زمانے میں عام خوراک نہ ملے' اس میں ہر ایک کی روٹی کا انتظام کرنا۔ آپ غور فرما رہے ہیں کہ دین پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنا ہے۔ اس کے لیے کیا کچھ بتایا جا رہا ہے: خدا کی بڑائی بول اور یہ یہ نہیں بلکہ یہ ہے جو کچھ کہا جا رہا ہے۔ اور آگے کہا کہ **یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ** ❷ (90:15)

یتیم کس کو کہتے ہیں؟

قرآن ہے' عزیزانِ من! اگر آپ ادبی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو بھی جھوم جانے کو جی چاہتا ہے۔ **یَتِیْـمًـا ذَا مَـقْـرَبَةٍ** وہ شخص جو "بھری دنیا میں" اپنے آپ کو "تنہا محسوس" کرتا ہے یعنی **ذَا مَقْرَبَةٍ** (90:15) گرد و پیش سب انسان بس رہے ہیں اور ان میں یہ مصیبت زدہ

---

❶ پہاڑ کی گھاٹی کا راستہ

❷ (وہ نظام ان لوگوں کے رزق کی فکر کرے جو) معاشرے میں' ہزار ہا انسانوں کے قریب رہتے ہوئے بھی' اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار پائیں۔ (۱۔۲ مفہوم القرآن۔ پرویز)

اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ اس کی صرف احتیاج اور محتاجی کو ہی دور نہیں کرنا' تم اس کو واجب التکریم قرار دو' اس کی عزت کرو۔ جتھے والے کی تو سب عزت کرتے ہیں' جو اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہے اس کی عزت کرو۔ جہنم میں جانے والوں کے متعلق کہا کہ وہ کہتے تھے کہ ہم اس کی عزت نہیں کرتے تھے جو تنہا رہ جاتا تھا' عزت اسی کی ہے جس کے پاس بہت زیادہ ووٹ ہوں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ تم اُن لوگوں کے رزق کی فکر کرو جن کا اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (90:16) یہ کاروبار کل تک چل رہا تھا' حرکت تھی' اب کوئی ایسا حادثہ ہو گیا ہے کہ بیچارے کی حرکت بند ہو گئی' جمود ہو گیا ہے' کاروبار رک گیا ہے اور اس رکنے کے بعد کیفیت یہ ہے کہ صبح سے شام تک مٹی میں لتھڑا رہتا ہے پھر بھی ضرورت کے مطابق کما نہیں سکتا۔ کہا کہ ان کو ان حالات سے نکالو۔

عزیزانِ من! دین یہ ہے لیکن یہ پہاڑ کی گھاٹی پہ چڑھنا ہے۔ اسی لیے تاکید کی جارہی ہے کہ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (74:7) یہ ہے ربوبیت کا وہ انتظام جس کے لیے بڑے ہی استقامت اور استقلال کی ضرورت ہے۔ یہ بڑا ہمت شکن نظام ہوگا۔ کہا کہ یہ تیاریاں کرو اس لیے کہ یہ جو تجوریوں والے سانپ بن کر اپنے خزانے پہ بیٹھے ہیں آسانی سے نہیں چھوڑیں گے' یہ آخری دم تک مخالفت کریں گے' میدانِ جنگ تک بھی آنا ہوگا۔ یہ اس نظام کو ختم کرنے کا پہلا حصہ لا الہ کا ہے۔ اس میں یہ مشکلات ہونگی۔ اس لیے انہیں یہ بھی بتا دو کہ یہ دعوت پھولوں کی سیج نہیں' کانٹوں بھری راہ ہے۔ ہر طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور سخت مخالفت ہوگی۔ اس کے بعد اگلا حصہ اس نظام کو قائم کرنے کا ہوگا پھر فَاِذَا نُقِرَ فِى النَّاقُوْرِ o فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ o عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ (74:8-10) اس کے لیے تصادم بھی ہوگا' ٹکراؤ بھی ہوگا' دشمن ہر طرف سے تمہیں ٹھونگیں ماریں گے لیکن کوئی بات نہیں' ڈرو نہیں' اگر تم نے اپنی سیرت و کردار میں پاکیزگی پیدا کی' ٹانگوں میں اتنی مضبوطی پیدا کی کہ ان میں ضعف نہ آئے' لغزش نہ آئے' استقامت دکھائی تو ٹکراؤ کے یہ دن ان مخالفین کے لیے عذاب اور مشکل کے دن ہونگے' تمہارے لیے نہیں۔

عزیزانِ من! کونسے لوگ ہیں جو سامنے آرہے ہیں؟ سورۃ المزمل کی 11 ویں اور 12 ویں آیت میں دیکھیے' وہاں کہا تھا کہ وَذَرْنِىْ وَ الْمُكَذِّبِيْنَ اُولِى النَّعْمَةِ (73:11) تم اپنے پروگرام کے اندر لگے رہو' ان کو چھوڑ دو' ان کو میرے حوالے کر دو۔ یہ کون ہیں؟ یہ اولی النعمۃ ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں بہت سی آسائشیں اور نعمتیں میسر ہیں۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ ''ہمارا نظام غلط ہے'' یہ جھوٹ ہے۔ یہ لوگ اولی النعمۃ ہیں یعنی وہ ہیں جنہیں بہت سی آسائشیں اور نعمتیں میسر ہیں۔ یہ وہی ہیں جن کے متعلق کہا کہ ان کے ساتھ ٹکراؤ ہو رہا ہے اور یہاں بھی کہا ہے کہ ان صاحب آسائش و نعما کو ہمارے قانونِ مکافات کے حوالے کر دو۔ ان کے لیے یہاں ''ذرنی'' کا لفظ ہے۔ بڑے محاکاتی انداز میں ایک بات کہی ہے کہ اس دوران تمہارے مخالفین کی پوری پوری کوشش ہوگی کہ وہ تمہیں اِدھر اُدھر کی باتوں میں الجھائے رکھیں' اور اس طرح تمہیں اپنے تعمیری پروگرام میں آگے نہ بڑھنے دیں لیکن تم ان سے الجھے بغیر' اپنی راہ چلتے

جانا ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ❶ (74:11)۔قرآن ایک لفظ میں ساری بات کہہ گیا۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے' عزیزانِ من! وہ اپنے ساتھ ایک ٹکا بھی نہیں لاتا' اس کا ایک کپڑا بھی اپنا نہیں ہوتا کہ اس سے اپنا تن بھی ڈھانپ سکے۔اس طرح سے بغیر کسی ساز و سامان کے اور بغیر دولت کے وہ تنہا اور الگ اس دنیا میں آتا ہے۔کوئی بچہ نہ امیر ہوتا ہے' نہ غریب ہوتا ہے۔اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں "ذرنی" کہا ہے کہ اسے چھوڑ دو' اسے میرے حوالے کر دو۔اب یہ کسی ایک فرد کی بات نہیں ہے۔ یہ اس نظام کے نمائندہ کی بات ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آپ آگے دیکھیں گے کہ قرآن نے بڑے ہی خوبصورت' محاکاتی انداز' میں ایک بات بیان کی ہے کہ ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا (74:11) جو پیدا ہوا تھا وہ کچھ ساتھ لے کر پیدا نہیں ہوا تھا' کوئی سرمایہ اس کے پاس نہیں تھا' یہ اور اس کے محل کے ساتھ Cottage (جھونپڑی) کے اندر' جھونپڑے کے اندر' جو مزدور کا بچہ تھا' وہ اور یہ دونوں ہی یکساں حیثیت سے پیدا ہوئے تھے۔ وہ بھی اسی طرح سے ننگا پیدا ہوا تھا' یہ بھی اسی طرح سے ننگا پیدا ہوا ہے۔ وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا (74:12) اور اس کے بعد بڑی کثرت سے مال و دولت ملی ہے۔اب دیکھیے کہ اس دولت کے ساتھ جو کچھ ہم نے اور دیا ہے وہ اس کے ساتھ کیا کرتا ہے: وَ بَنِیْنَ شُهُوْدًا (74:13) اور وہ بیٹے دیئے جواب ہماری مخالفت میں اپنا سارا زور لگا رہے ہیں۔

گاؤں کے امیر زادوں کی مصروفیات

جنہوں نے روٹی کمانی ہوتی ہے وہ تو روٹی کمانے کی فکر میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔وہ جاتے ہیں' کام کاج کرتے ہیں۔ یہ جو امیر زادے ہوتے ہیں وہ گھر پہ بیٹھے رہتے ہیں۔کوئی کام نہیں کرتے۔ یہ بات شہروں میں زیادہ نظر نہیں آتی۔ وہ پھر بھی اپنے آپ کو کہیں مصروف رکھتے ہیں۔شہروں میں کئی شعبے ہوتے ہیں' کلبیں ہوتی ہیں' کئی قسم کے پروگرام ہوتے ہیں' یہ امیر زادے اِن میں چلے جاتے ہیں۔اس کے برعکس گاؤں میں ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب! یہ بڑے بڑے زمینداروں کے لڑکے ہمیشہ گھر پہ ہی لٹھ لیے ہوئے رہتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ پھر جن کو یہ کچھ ملا' ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اب گھر پہ بیٹھے رہتے ہیں کام ہی کوئی نہیں کرتے: ڈانگاں ہتھاں لیاں ہویاں۔ ❷ سارا گاؤں ان سے تھر تھر کانپتا تھا۔وہ جو نوابزادے تھے' یہ جو زمینداروں کے بڑے بڑے گھروں کے اندر لڑکے ہوتے تھے' گھروں کی زندگی یہ تھی۔جس کے ہاں اتنے بڑے بڑے جوان بیٹے ہوں اور وہ بیکار بیٹھے ہوئے ہیں' گھر میں کام نہیں' کوئی کاج نہیں۔ اب یہی ہے کہ کوئی کہیں سے ذرا سی بات ہوئی وہ اٹھ کے کھڑے ہو گئے۔قرآن کہتا ہے کہ وَ بَنِیْنَ شُهُوْدًا (74:13) مال بھی ہے'

---

❶ ان سے ہمارا قانونِ مکافات خود نپٹ لے گا۔ان مفاد پرست' مخالفین کا سرغنہ وہ ہے جسے ہم نے بے سروسامان تنہا پیدا کیا تھا یعنی یہ پیدائش سے اپنے ساتھ وہ دولت اور قوت نہیں لایا تھا جس کے بل بوتے پر اس قدر سرکشی برت رہا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ (قوت کے) ڈنڈے ہاتھ میں لیے ہوتے ہیں۔

بیٹے بھی ہیں' ان کا جتھہ بنا ہوا ہے۔ وہ ایسے ہیں کہ ان کو کسی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وَ مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا [1] (74:14)۔ وہ اچھی خاصی آسائش کی زندگی بسر کر رہا ہے ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ (74:15) اب اس کے بعد اس کی ہوس شروع ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ اور زیادہ ملے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ o حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) پھر ایک دوسرے سے بڑھنے کی ریس (دوڑ :Race) جاری ہو جاتی ہے اور وہ قبر تک جاتی ہے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ یہاں تک تو ٹھیک ہے' آسائش کی زندگی ہے' کھانے پینے کو مل رہا ہے' اپنوں کو بھی مل رہا ہے' بچوں کو بھی مل رہا ہے۔ اس کے بعد ہے کہ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ (74:15)۔ پھر اس کے بعد چلتا ہے' ریس چلتی ہے۔ پھر یہ ہے وہ مقام جہاں آ کے سرمایہ داری شروع ہو جاتی ہے۔ اَزِيْدَ (74:15) وہ چاہتا ہے کہ ہم اسے اور زیادہ قوت اور دولت دیتے جائیں اور وہ ان کے بل بوتے پر حق کی مخالفت میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔

سرمایہ داری کی ابتدا

سنیئے عزیزانِ من! قرآن کہاں آ کے کہتا ہے: ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ (74:15) وہ چاہتا ہے کہ اس سے زیادہ اور ملتا چلا جائے۔ کہا: كَلَّا (74:16) یہ نہیں ہو سکے گا۔ کیا بات ہے اس كَلَّا کی! کیا اعلان ہے یہ! وہاں تک ٹھیک ہے کہ کھانے پینے کو ملنا چاہیئے آسائش کی زندگی ہونی چاہیے لیکن یہ بات کہ اب سارا مال و دولت سمٹ کر اسی کے پاس آنا چاہیئے ''كَلَّا'' یہ نہیں ہوگا۔ یہ تھا وہ رَبَّكَ فَكَبِّرْ (74:3) اور یہ تھا وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (74:7)۔ کہا کہ یہ سارا مال و دولت سمٹ کر نہیں آئے گا۔ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ خود بخود تو اس سے باز نہیں آئیں گے ان کو تو پھر اب روکا جائے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اتنی اتنی بڑی لڑائیاں تھیں جو اندرونِ ملک ہوئیں۔ تو آخر یہ کیا بات تھی۔ میں نے کہا تھا کہ جب حضور ﷺ مکہ میں تھے تو قریش کے مذہب کے مطابق بات اگر نماز' روزے کی ہوتی تو اس سے قریش کا کیا جاتا تھا کہ اس کی اتنی مخالفت ہو رہی تھی کہ وہاں سے چھوڑ کر چلے آئے۔ مدینے میں تین سو میل کا فاصلہ (اور پھر اس زمانے کا) کوئی واسطہ نہیں' کوئی تعلق نہیں' کچھ نہیں لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اپنا ایک ہزار کا لشکر لے کر آپ ﷺ کے پیچھے آ گئے۔ آخر کیا مخالفت تھی آپس میں ان کی؟ دراصل اس کی تمام ترجیہ وہ قرآنی نظام تھا جس کی یہ اس قدر مخالفت کر رہے تھے۔ ان کی یہ کوشش تھی کہ کچھ بھی ہو جائے یہ نظام باقی نہ رہے کیونکہ قرآن کے پیش کردہ نظام میں نہ سرمایہ داری کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی مذہبی اجارہ داری کی جبکہ قریش کے ہاں یہ دونوں چیزیں تھیں۔ ایک تیسری بھی چیز تھی کہ باہر کی کوئی حکومت نہیں تھی۔ یہ تھا جس کے ذمہ یہ آ گے اب ٹکراؤ کی بات آ رہی ہے اور اس کے مقابلے میں آپ کا یہ فرمان تھا كَلَّا (74:16) یہ نہیں ہونے دیا جائے گا اور آخر کار سرمایہ داری کا وہ دور دب گیا۔ اِنَّهٗ كَانَ

---

[1] غرضیکہ ہم نے اس کے لیے زندگی کے راستے ہموار کر دیئے۔ اس طرح کا سامانِ آسائش عطا کیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لِاٰیٰتِنَا عَنِیۡدًا ❶ (74:16) یہ دیکھیے کہ یہ ہمارے قانون کے خلاف سرکشی برتی جارہی تھی۔

دراصل یہ ٹکراؤ دو نظاموں کا تھا

عزیزانِ من! یہ کیا دو چیزیں تھیں جن میں ٹکراؤ ہو رہا تھا؟ یہ دو فوجوں میں ٹکراؤ نہیں تھا' یہ دو قوموں میں ٹکراؤ نہیں تھا' دو نظام تھے جن میں ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ یہ جو ہزار برس سے آپ کے ہاں ہو رہا ہے وہ یہی کچھ ہے کہ جو دین تھا وہ اب مذہب بنا ہوا ہے۔ یہ وہی کچھ ہے جو ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں اقبالؒ (1877-1938) نے ابلیس کی زبان سے کہلوایا:

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں

ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دیں

یہ وہی تو قریش کی سرمایہ داری تھی جس سے ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ لِاٰیٰتِنَا عَنِیۡدًا (74:16) وہ ہمارے قوانین' ہمارے نظام کے خلاف سرکشی برت رہا ہے۔ یہ نظام تھا جس کے خلاف سرکشی برتی جارہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر کسی ایک جگہ بھی ان کا نظامِ ربوبیت قائم ہو گیا' متشکل ہو گیا' تو کسی جگہ بھی نظامِ سرمایہ داری باقی نہیں رہ سکتا۔ پھر یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (110:3) ہوتا ہے: پھر تو خلقت جوق در جوق اس کی طرف آ جاتی ہے' پھر اُس کی طرف کوئی نہیں آئے گا؟ سبھی انہی کے ہاں آئیں گے۔ ان کو یہ ڈر مار رہا تھا۔ اس لیے وہ مدینے میں بھی اسے قائم نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ پیچھے چلے آرہے تھے۔ میں نے عرض کیا ہے سن 7ھ تک اگر یہ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں' اور تاریخ میں بڑی بڑی لڑائیاں اکٹھی کی جائیں تو قریباً اسی (۸۰) بیاسی (۸۲) بن جاتی ہیں۔ حضور ﷺ کی ساری عمر ہی اس میں گزر گئی: انہی کے خلاف' اس نظام کو مٹانے کے خلاف' نظامِ ملوکیت' نظامِ سرمایہ داری' نظامِ مذہبی پیشوائیت کے خلاف۔ یہی تو تھی ساری چیز۔ اب اس انقلاب کا زمانہ آ رہا ہے جس میں سَاُرۡهِقُهٗ صَعُوۡدًا ❷ (74:17) ہے۔ کوئی بات نہیں جو ایسی مشقتوں میں پڑیں گے انہیں یاد آ جائے گا کہ کس کے ساتھ ٹکراؤ ہوا ہے۔

محاکاتی انداز میں ایک واقعہ کا ذکر

اب آیا وہ واقعہ جس کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ وہ ایک بڑے ہی محاکاتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اسے آج کل ڈرامائی انداز کہتے ہیں۔ قرآن نے عجیب انداز میں بات کی ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کا ایک نمائندہ آتا ہے' آپ نبی اکرم ﷺ اسے سمجھاتے ہیں کہ بھئی! تمہارے خلاف کوئی ذاتی رنجش نہیں ہے' کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ یہ بات ہی نہیں ہے مگر یہ ہے وہ نظام جو ہم برپا کرنا چاہتے

---

❶ اس لیے کہ یہ ہمارے قوانین سے سرکشی برت رہا ہے۔

❷ اسے سخت مشکلات کا سامنا کرنا اور مصائب کی گھاٹی چڑھنا ہوگا۔ (۱-۲ مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہیں۔ اس پر قرآن بتاتا ہے کہ اِنَّہٗ فَكَّرَ ❶ (74:18)۔ عزیزانِ من! یہ ایک آیت ہے۔ اتنی سی عربی تو سیکھ چھوڑ یئے۔ قرآن کی عربی کوئی مشکل نہیں اور قرآنِ کریم کا نسخہ کم از کم اپنے سامنے رکھیئے' دیکھیے الفاظ کو! کہا کہ اِنَّہٗ فَكَّرَ (74:18) اس نے سوچا' دونوں نظام اپنے سامنے رکھے' خوب غور کیا۔ پھر وَ قَدَّرَ (74:18) اور پھر اس نے دونوں کو ماپا اور اس کے بعد ایک نتیجہ پہ پہنچا۔ کس نتیجہ پہ پہنچا؟ آپ ذرا اس کا اندازہ لگائیے۔

ادب کی چاشنی ایمائیت کی شکل میں

عزیزانِ من! ادب میں جو Suggestiveness (ایمائیت) ہوتی ہے وہ بڑی ہی عجیب چیز ہوتی ہے۔ ایمائیت اس کو کہتے ہیں کہ براہِ راست کوئی بات نہ کی جائے' بلکہ اشارتاً اس طرح کہی جائے کہ دوسرے کا ذہن خود فیصلہ کرے کہ بات کیا ہوئی تھی؟ مثلاً

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا' مری جو شامت آئی
اٹھا' اور اٹھ کے قدم میں نے پاسبان کے لیے

(غالب)

اس نے کچھ بات نہیں کہی' فقط یہ بتایا کہ "جوتیاں کیوں پیاں۔" ❷ اسے ادب میں ایمائیت کہا جاتا ہے۔ یہاں کہا کہ وَ قَدَّرَ (74:18) دونوں راستوں کا باہمی مقابلہ کیا اور پھر اس بات کا اندازہ لگایا کہ کون سی راہ اس کے لیے فائدہ مند ہے۔ یہاں قرآن کہتا ہے کہ سوچنے کے بعد کچھ فیصلہ کیا' پھر اس فیصلے کے بارے میں بتاتا ہے کہ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (74:19) تباہ ہو' اس کا ستیاناس ہو کہ اس نے کیا غلط فیصلہ کیا! بتایا نہیں کہ فیصلہ کیا کیا۔ قتل میں بات ساری آ گئی کہ جس میں تباہی تھی۔ فیصلہ کیا تو وہ فیصلہ کیا جس میں اپنے لیے تباہی تھی۔ کہا کہ ایک ہی بار نہیں' پھر سوچا' اس نے پھر غور کیا: ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (74:20) او پھر اس کا ستیاناس! اسی نتیجہ پہ پہنچا جس پہ پہلے پہنچا ہوا تھا۔ پھر ثُمَّ نَظَرَ (74:21) اس کی طرف غور سے تاکا۔ رسول اللہ ﷺ بھی کبھی سامنے ہونگے' یا جو بھی تھا' اسے غور کے ساتھ' تنقید کی نگاہ سے' تاکا۔ نظر' تنقیدی نگاہ بھی ہوتی ہے۔ تنقیدی نگاہ سے تاکا کہ یہ یہ کہہ رہے ہیں: ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (74:22) ماتھے پہ شکن پڑے' اس نے بسر' منہ بسورا ثُمَّ اَدْبَرَ (74:23) پھر پیٹھ موڑی وَ اسْتَكْبَرَ (74:23) اور سر اٹھاتے ہوئے سرکشی اور نہایت تکبر کے ساتھ یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ (74:24) یہ وہی جھوٹی باتیں ہیں جو مدت سے پچھلوں سے چلی آ رہی ہیں اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (74:25) یہ جو کہہ رہا ہے کہ یہ خدا کا نظام ہے' خدا کی باتیں ہیں' یہ سب غلط ہے۔ یہ اس کا اپنی ہی

---

❶ اس نے اس پر غور کیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اُسے جوتے کیوں پڑے۔

طرف سے بنایا ہوا ہے۔ یہ کہتا ہوا وہ منہ موڑ کر چلا گیا۔ کیا بات ہے صاحب! کیا نقشہ کھینچا گیا ہے!! ٹھیک ہے اس نے یہ کہا اور وہ چلا گیا اور خدا نے یہ کہا کہ **سَاُصۡلِیۡهِ سَقَرَ** (74:26) دیکھیے اب یہ اسے کس طرح جہنم میں پہنچائے گا۔ کیا بات ہے! یہ تھے ٹکراؤ' یہ تھے ان لوگوں کے اندازے' یہ تھا ان کا تقابل' یہ تھا پھر تصادم جو ہوا' اور پھر یہ کہ اس کے ساتھ ابھی دیکھو کہ وہ کس طرح جہنم میں جاتا ہے! **وَمَآ اَدۡرٰکَ مَا سَقَرُ** (74:27) تمہیں بتائیں کہ "سَقَرَ" کیا ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! وقت ہو گیا' اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے کہ "سَقَرَ" ہوتا کیا ہے۔

ہم سورۃ المدثر کی آیت 26 تک آ گئے' 27 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀❀❀......❀

اکیسواں باب: سورۃ المدثر (آیات 27 تا 32)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1984 کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المدثر کی آیت 27 سے ہو رہا ہے:(74:27)۔

سابقہ آیات میں نفسِ مضمون

سابقہ آیات میں محاکاتی انداز میں ایک منظر سامنے لایا گیا تھا کہ نظامِ سرمایہ داری کا ایک نمائندہ کس طرح سے آیا' اسے سمجھایا گیا کہ تمہارے اس نظام اور جو نظام ہم پیش کر رہے ہیں' میں کیا فرق ہے۔ اس نے غور کیا' وہ کسی نتیجے پہ پہنچا اور کہا گیا کہ خدا اُسے غارت کرے کہ وہ کس قدر غلط نتیجے پر پہنچا' پھر اسے سمجھایا گیا' پھر اس نے غور کیا' پھر وہ اسی نتیجے پہ پہنچا۔ اسے کہا گیا کہ تم کس قدر غلط نتیجے پہ پہنچے ہو' پھر اس نے غور کیا' پھر وہ اسی نتیجہ پہ پہنچا۔ اور اس کے بعد قرآن کے الفاظ میں اس کا یہ نقشہ آیا ہے کہ اس نے منہ بسورا' ماتھے پہ شکن ڈالے' پیٹھ موڑی' نہایت متکبرانہ انداز میں کہا کہ یہ وہی جھوٹ ہے' جو آج تک چلا آ رہا ہے کہ تباہ ہو جاؤ گے' برباد ہو جاؤ گے' جہنم میں چلے جاؤ گے۔ یہ جو دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے' یہ خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ یہ خود ہی یہ چیزیں بنا تا ہے اور ہمیں خدا کی کہہ کر ڈراتا رہتا ہے: اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ [1] (74:25)۔ یہ انسان ہی کی بات ہے۔

---

[1] یہ سب باتیں اس شخص کی اپنی وضع کردہ ہیں (جنہیں یہ خدا کی وحی کہہ کر پیش کرتا ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

جہنم کے متعلق ہماری غلط نگہی

عزیزانِ من! اس کے بعد قرآن نے دو الفاظ کا ایک ہی فقرہ کہا کہ **سَاُصۡلِیۡهِ سَقَرَ** [1] (74:26)۔ ہمارے ہاں یہ جہنم، جحیم، سقر، نار وغیرہ کے جتنے الفاظ آتے ہیں اُن کا ترجمہ دوزخ کیا جاتا ہے اور دوزخ کے متعلق یہ تصور ہے کہ اخروی زندگی میں، قیامت کے بعد، وہاں جا کے، یہ کچھ ہوگا۔ گویا یہاں اس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا، وہاں جا کر یہ نتیجہ نکلے گا۔ اس زندگی کی قیامت، جہنم، جنت، جو کچھ قرآنِ کریم نے بتائے ہیں، اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر تو بڑا اہم ایمان ہے لیکن ہماری غلط نگہی یہ ہے کہ ہم یہاں کے ان غلط اعمال کا، سب کا سب نتیجہ، وہاں پر ہی اٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں بھی اُن کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ قرآن کے مطابق صحیح اعمال کا نتیجہ ایک جنتی زندگی ہے جو یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے خلاف جانے سے یہاں جو معاشرہ قائم ہوتا ہے، وہ جہنمی زندگی ہے، وہ یہاں سے شروع ہو جاتی ہے۔

قرآنِ کریم نے یہی سقر، نار، جحیم اور جہنم کے الفاظ و اصطلاحات یہاں کی اِس زندگی کے متعلق بھی استعمال کیے ہیں۔ اصل میں تو زندگی مسلسل چلتی ہے۔ یہاں جہنم کی زندگی ہے تو وہاں بھی جہنم کی زندگی ہے۔ آگ تو انسان اپنے ساتھ ہی لیے جاتا ہے۔ یہ کہا: **سَاُصۡلِیۡهِ سَقَرَ** [1] (74:26)۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہم عنقریب اسے دوزخ میں ڈال دیں گے۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے، دوزخ کے متعلق تصور یہ ہے کہ مرنے کے بعد ایک زندگی ہے، اس میں وہ دوزخ ہوگا، یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ آخرت کی زندگی، وہاں کا دوزخ، وہاں کا جہنم اور جو تفاصیل قرآن نے دی ہیں، اُن پر ہمارا ایمان ہے لیکن غلط نگہی یہ ہے کہ ہم انہیں وہیں پر اٹھا رکھتے ہیں، یہاں سے اس کی ابتداء نہیں کرتے۔ ویسے بھی گرامر کے اعتبار سے ''س'' اس کے ساتھ آ رہا ہوتا ہے، جلدی اس کے معنی ہوتے ہیں۔ اس ''س'' کے معنی عنقریب ہوتے ہیں۔ اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ یہ مخالفین نہ تو قیامت کے قائل تھے، نہ وہاں کی جہنم کے قائل تھے۔ اب ان سے یہ کہنا کہ تم جو یہ غلط روش اختیار کیے ہوئے ہو، تم دیکھو گے کہ اس کا نتیجہ آخرت میں جہنم کی شکل میں نکلے گا۔ تم جہنم میں ڈالے جاؤ گے۔ وہ تو جہنم کو مانتے ہی نہیں تھے۔ یہ کچھ کہنے سے مراد، اُن کو معاذ اللہ انتقامی طور پر کچھ کہنا تو مقصد نہیں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ تم اپنی غلط روش کو چھوڑ دو، اس کا نتیجہ تباہ کن نکلے گا اور صحیح روش اختیار کرو۔

عزیزانِ من! قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ دیکھیے، یہ شخص کہہ رہا ہے کہ جب مر جاؤ گے، تمہاری جتنی بھی ہڈیاں ہیں، گل

---

[2] عنقریب اس کی دولت و حشمت کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ اُسے جھلسا دینے والی آگ میں جھونک دیا جائے گا جو اس کی ساری سختی کو پگھلا کر رکھ دے گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سڑ جائیں گی‘ اس کے بعد پھر دوبارہ زندگی ملے گی‘ اٹھائے جاؤ گے‘ میزان ہوگی‘ قیامت ہوگی‘ جہنم ہوگی‘ اور اس کے بعد وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ جو اِسے مانتا ہی نہیں تھا وہ تو مذاق اڑائے گا۔ مقصد یہ نہیں تھا کہ اس کو وہاں کی زندگی کے متعلق منوانا تھا۔ بتانا یہ تھا کہ جو تمہاری روش ہے اس کا نتیجہ ہلاکت انگیز ہوگا تاکہ تم اس روش کو چھوڑ دو۔ جو اسے مانتے ہی نہیں‘ وہ کیسے چھوڑ دے گا‘ وہ تو مذاق کرے گا۔ یہ کہنا کہ سنکھیا نہ کھانا‘ اس سے ہلاکت ہو جائے گی۔ وہی اس سنکھیے سے باز رہے گا جو مانتا ہو کہ سنکھیے سے ہلاکت ہو جاتی ہے‘ جو اسے مانتا ہی نہیں‘ اس کے لیے یہ تنذیر کچھ کارگر ہی نہیں ہو سکتی‘ خود قرآن میں ان لوگوں کے متعلق یہ ہے کہ وہ مانتے ہی نہیں تھے کہ مرنے کے بعد کی بھی زندگی ہوگی‘ جنت جہنم تو ایک طرف رہی۔ تو ان سے یہ کہنا کہ ہم تمہیں عنقریب جہنم میں ڈال دیں گے اور جہنم وہ ہوگی جو قیامت کو آئے گی‘ جسے وہ مانتے ہی نہیں‘ اس انذار کا ان کے اوپر کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ اور جیسے کہ آپ تعجب سے سنیں گے ہم پہ کوئی اثر نہیں ہوگا اس لیے کہ ہمارا بھی اس پہ ایمان نہیں ہے کہ واقعی یہ مکافاتِ عمل حقیقت ہے اور اس زندگی میں بھی ان کا نتیجہ ملے گا اور اگر یہاں ان کا نتیجہ نہیں ملا تو مرنے کے بعد زندگی ہے‘ قیامت ہے‘ میزان ہے‘ جہنم ہے‘ اس میں ملے گا‘ مگر ہم اسے نہیں مانتے۔ آپ اس پہ تعجب تو کریں گے کہ یہ کتنی بڑی بات کہہ گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ [1] (2:8)۔ یہ ہمارے ہی متعلق تو ہے کہ ”وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن درحقیقت ان پر ایمان نہیں ہوتا۔“ اگر یہ یقین ہو جائے کہ سنکھیا ہلاکت انگیز ہے پھر کوئی صاحبِ عقل و ہوش سنکھیا نہیں پھانکتا۔

ہم دن میں کتنی بار یہ سنتے ہیں کہ ہمارے ہر غلط عمل کا عذاب ہوگا‘ ہر گناہ کے لیے جہنم ہے‘ ہر جرم کے متعلق سزا ہوگی‘ خدا کے ہاں سے یہ کچھ ہوگا۔ اس سے مطلب یہ تھا کہ تم اس سے باز آ جاؤ۔ کوئی شخص بھی‘ جو اپنا نفع نقصان جانتا ہے‘ جب اسے یقین ہو جائے کہ اس سے مجھے نقصان ہوگا تو صاحب عقل و ہوش تو اس کے بعد وہ کام نہیں کرے گا لیکن اس کے باوجود‘ وہ اس پر اڑا رہتا ہے‘ وہی کچھ کرتا رہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اس کو مذاق سمجھا ہے‘ وہ سمجھتا ہی نہیں ہے کہ واقعی ایسا ہوگا۔ اگر یقین یہ ہو‘ عزیزانِ من! کہ مکافاتِ عمل ہے اور دین کی ساری بنیاد ہی اِس پر ہے کہ انسان کا ہر عمل حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا خیال بھی ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے‘ ہر غلط عمل اور غلط ارادہ تباہ کن نتیجہ‘ ہر اچھا عمل اور اچھا ارادہ خوشگوار نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ ایمان پیدا ہو جائے کہ واقعی ایسا ہوتا ہے تو اس کے بعد‘ جسے آپ گناہ یا جرم کہتے ہیں‘ وہ انسان سے سرزد ہی نہیں ہوتا‘ وہ انسان عقل و ہوش والا ہونا چاہیے‘ ایک پاگل کی تو اور بات ہے۔ پاگل کی Definition (تعریف) یہ ہے کہ یہ اپنا نفع نقصان بھی نہیں سمجھتا‘ اس کو تو چھوڑ دیجیے۔ اس کے باوجود اگر وہ وہی کچھ کیے چلے جا رہے

---

[1] ایسے لوگوں کا گروہ بھی ہے جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں یعنی اس ضابطہ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور قانونِ مکافات اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے لیکن وہ حقیقت میں ان پر ایمان نہیں رکھتے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہیں جس کا نتیجہ جہنم بتایا جا رہا ہے' وہ کیسے چلے جا رہے ہیں' عقل وہوش بھی موجود ہے تو کونسی چیز ہے جس کی وجہ سے کیسے چلے جا رہے ہیں؟ اس کے اوپر یقین نہیں ہے کہ ایسا ہوگا۔ یقین ہو' عقل وہوش ہو کہ یہ ہلاکت انگیز ہے تو اس کے بعد انسان کبھی وہ نہیں کرے گا۔

سال بھر کوئی مقدمہ نہیں آیا: ایک بے مثل نظیر

عزیزانِ من! جنہیں مکافاتِ عمل پہ یقین تھا' اس معاشرے کی صورت یہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت (632-634ء) میں ایک مجسٹریٹ کی پوسٹ (آسامی) Create (پیدا) کی اور حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ (581-644/645ء) کو اس پہ Appoint (تعینات) کیا۔ سال بھر کے بعد انہوں نے کہا کہ صاحب! اس پوسٹ (آسامی) کو Abolish (ختم) کر دیجیے' کوئی مقدمہ ہی نہیں آیا۔ وہ آتا کس طرح سے؟ آخرت پر ان کا ایمان تھا' جہنم پر ان کا ایمان تھا' مکافاتِ عمل پر ایمان تھا حتیٰ کہ دل میں گزرنے والے خیالات کے متعلق بھی ایمان تھا کہ ان پر بھی گرفت ہوگی۔ مقدمہ کیسے آ سکتا ہے۔ اگر ایمان بالآخرت یہ ہو تو اس معاشرے کے اندر جرائم ہو ہی نہیں سکتے۔ یہاں ہمارے ہاں کروڑوں انسان بستے ہیں۔ ہر پنساری' ہر دوا فروش کی دوکان پر زہر مل جاتا ہے۔ کتنے ہیں جو روز زہر پھانکتے ہیں؟ کیوں نہیں پھانکتے؟ یقین ہے کہ وہ ہلاکت انگیز ہے تو اگر اسی طرح سے ہمیں یقین ہو کہ جھوٹ بولنے سے' فریب دینے سے' چوری کرنے سے' بدعنوانی سے' استبداد سے' تکبر سے' ہلاکت ہو جائے گی جیسے سنکھیے سے ہلاکت ہوتی ہے' تو پھر صاحبِ عقل وہوش تو یہ کرے گا ہی نہیں۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ **وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ** (2:8) انہیں اس پہ یقین ہی نہیں حالانکہ وہ **يَقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ** (2:8) زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہاں (2:8) میں قرآن ''یقول'' کہہ کر ہمارا ہی تو نقشہ کھینچ رہا ہے۔ ایک تو یہ لوگ تھے جو یہ کہتے تھے کہ یہ غلط بات ہے' ہم اسے مانتے ہی نہیں ہیں تو ان کے لیے سوال ہی نہیں تھا کہ ان سے کہا جاتا کہ مرنے کے بعد قیامت میں تم دیکھو گے کہ کیا ہوگا۔ وہ تو اس تنذیر سے باز نہیں آ سکتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی اس غلط روش سے باز آ جائیں مگر وہ اسے مانتے نہیں تھے۔ ان سے یہ چیز کہنا' جو یہ مانتے ہی نہیں' نتیجہ خیز ہو ہی نہیں سکتی۔ جو مانتا ہی نہیں ہے تو پھر ان سے یہ کہنا کہ عنقریب دیکھو گے کہ ہم تمہیں جہنم میں لے جائیں گے' بے کار ہے۔ جو جہنم کو مانتے ہی نہیں تھے ان سے یہ کچھ کہنا وقت کا زیاں ہے۔ اور مقصد محض دھمکی دینا نہیں۔ یہ بڑا غور طلب مسئلہ ہے۔ ڈرانا مقصد نہیں تھا۔ عزیزانِ من! مقصد یہ تھا کہ وہ اس سے باز آ جائیں۔ اور جو مانتا نہیں ہے' وہ تو اتنا کہنے سے باز نہیں آئے گا کہ دیکھو اس کا انجام کیا ہوگا۔

دوسری قسم کے لوگ

میں نے عرض کیا کہ قرآنِ کریم نے ایک کیٹگری (قسم) یہ بتائی ہے کہ وہ دھڑلے سے کہتے تھے کہ ہم اسے نہیں مانتے۔ یہ غلط ہے۔ وہ اس

کا مذاق اڑاتے تھے: مرنے کے بعد کی زندگی کا' قانونِ مکافات عمل کا۔ یہ ایک کیٹیگری تو اُن لوگوں کی ہے جو یا تو کھلے بندوں اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں' یا کھلے بندوں اِس سے انکار کرتے ہیں۔ایک دوسری کیٹیگری اُن لوگوں کی ہے جو نظام خداوندی اور اس کے قائم کرنے والی جماعت مومنین سے دورُخی چالیں چلتے ہیں۔ دراصل یہ ہماری ہی کیٹیگری (قسم) ہے۔ یہاں اس کیٹیگری (قسم) کے بارے میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ❶ (2:9)۔ یہ لوگ دھوکا دیتے ہیں' عزیزانِ من! سنیے کہ ہمارے متعلق کیا کہا ہے۔ دھوکا دیتے ہیں' خدا کو نہیں' جماعتِ مومنین کو نہیں' بلکہ خود اپنے آپ کو وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ ❷ (4:113)۔ وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ جو کہے کہ سنکھیا مہلک نہیں ہوتا اور پھر پھانک لے' تو وہ کسی دوسرے کو ہلاک نہیں کرتا' اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے۔ اور اگر یہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! اس سے کچھ نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اور اس کے باوجود یہ جرائم کرتے ہیں۔ جو اس چیز پر ایمان رکھتا ہے' جو یہ یقیناً جانتا ہے کہ بائیں طرف جانا خلافِ جرم ہے اور چوراہے پر سنتری بھی کھڑا ہے' وہ پکڑ بھی لے گا' وہیں جرمانہ کر دے گا' وہ بائیں نہیں چل سکتا۔ اسے ایمان بالآخرت کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! انہیں تو یہ ایمان تھا ہی نہیں۔ ان کے متعلق یہ ہے کہ وہ بار بار کہتے کہ یہ کہاں سے یہ کچھ لے آیا۔ موت کے بعد کی زندگی کہاں ہے اور وہاں کا عذاب اور وہ جہنم کہاں ہے۔ وہ تو یہ کچھ مانتے ہی نہیں تھے پھر کونسی چیز تھی کہ جو ان کو ان جرائم سے روک سکتی تھی جن سے ان کو روکنا مقصود تھا۔ عزیزانِ من! دیکھیے کہ جہاں کہا جائے کہ "عنقریب" ہم یہ کر دیں گے' ایسا "ابھی" ہو جائے گا' وہ قیامت تک کے لیے اٹھا رکھنے کی بات نہیں ہوتی۔ یہ تو ہوتا ہے کہ ابھی دیکھیے کہ یہ جسے بہت بڑا اچھنے خاں ❸ بنا پھرتا کہتے ہیں' کس طرح سر اٹھا کے' تیوری ڈال کے' اور منہ بسور کے' یہ کہہ کے چلا گیا ہے کہ یہ غلط ہے' اس سے یہ کہنا کہ دیکھو مرنے کے بعد جہنم میں تمہارے ساتھ کیا ہو گا' بے کار ہے۔ اسے تو یہ کہنا ہے کہ یہ "عنقریب" دیکھ لے گا کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ وہ تو یہ بات ہو گی۔ جو یہ کہے اور چلا جائے' اس سے یہ کہنا کہ دیکھو مرنے کے بعد جہنم میں تمہارے ساتھ کیا ہو گا' وہ مذاق کر کے چلا جائے گا' وہ جہنم کو مانتا ہی نہیں ہے' وہ اخروی زندگی کو مانتا ہی نہیں ہے۔ وہ قیامت موجود ہی ہونی چاہیے جس میں اس کو پتہ ہو کہ یہ ہوا ہے۔ یہ ہے سَأُصْلِيهِ (74:26) اور چند دنوں کے بعد وہ قیامت موجود ان کے سامنے آ گئی۔

عرب کے یہ قریش اس تباہی اور بربادی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی صدیوں سے یہ کیفیت ہو چکی تھی کہ نہ اُن کی حکومت تھی'

---

❶ بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں فریب دے رہے ہیں حالانکہ اگر یہ عقل و شعور سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ وہ خود اپنے آپ کو فریب میں رکھ رہے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ وہ اپنے آپ کو صحیح راستے سے بھٹکا رہے ہیں۔ (ایضاً)

❸ تکڑم باز

نہ مملکت' نہ قوت' نہ فوج اور ایک علاقہ کے اوپر حکمرانی کر رہے تھے اور جن کے متعلق قرآن کہہ رہا ہے کہ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ ❶ (106:2)۔ ساری دنیا کے قافلے لٹ رہے ہیں' ان کے قافلے کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ کعبہ کے متولی تھے۔ نسباً حسبًا' حسب اور نسب پر ان کا مدار تھا' کوئی دوسرا مقابلہ میں ہی نہیں تھا یعنی عزت و وقار کے جتنے معیار تھے' وہ ان میں بلند ترین مقام پر تھے۔ تجارت میں اتنے بڑے بڑے تاجر تھے' ان کے قافلے محفوظ تھے' وہ کعبے کے متولی تھے' نسل کے اعتبار سے قریشی تھے' انہوں نے اپنی تاریخ میں کہیں نہیں دیکھا تھا کہ ذلت اور تحقیر ان کے حصے میں آئی ہو۔ ان سے یہ کہنا کہ دیکھو تو سہی مرنے کے بعد تم کیسے جہنم میں جاؤ گے' یہ تحدی' یہ تنذیر' یہ انذار' انہیں ان جرائم سے روک نہیں سکتا۔ وہ تو اسے مانتے ہی نہیں' وہ تو الٹا اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ ہے وہ سقر' یہ ہے وہ جہنم اور یہ تھی وہ نار۔ اس کے لیے اُسے کہا کہ یہ ہے وہ جو ابھی آئے گی۔ عزیزانِ من! خدا کی وہ نار آئی تھی۔ یہ یونہی ڈراوا نہیں تھا' دھمکی نہیں تھی۔ یہ مکافاتِ عمل پر ایمان کا نتیجہ تھا۔

مکافاتِ عمل کی اہمیت

عزیزانِ من! قرآن نے مکافاتِ عمل پر واقعی ایمان کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ وحی کا' انبیائے کرام کا' کتابوں کا' یہ سارا سلسلہ ہی مکافاتِ عمل کے لیے ہے۔ قانون کی کتاب یہ بتانے کے لیے ہے کہ آیا یہ روش قانون کے مطابق ہے' کہیں قانون کے خلاف تو نہیں ہے۔ خدا کی وحی کا یہ سارا سلسلہ جبریل لے کر آتا ہے' رسول تک' نبی تک' پہنچاتا ہے' نبی اسے آگے پہنچاتا ہے۔ یہ سارا سلسلہ کیا ہے؟ یہ بتانے کے لیے ہے کہ اِس قسم کے عمل کا نتیجہ یہ ہوگا اور اُس قسم کا یہ ہوگا۔ یہ ہے وہ ساری بات۔ اور اگر یہ سب کچھ ماننے کے بعد یہ نہ مانا جائے کہ واقعی اس کا نتیجہ یہ ہوگا تو یہ سب کچھ بے کار ہے۔ اس کے بغیر ایمان ہی بے معنی ہے۔ اگر یہ یقین ہو جائے کہ یہ واقعی جرم ہے اور اس کی فی الواقعہ یہ سزا ملتی ہے تو پھر کوئی صاحبِ عقل و ہوش جرم نہیں کرتا۔ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے (11-13AH بمطابق 632-634AD) میں انہوں نے مجسٹریٹ کی ایک پوسٹ (آسامی) Create' (پیدا) کی' حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644/645) کو اس پر تعینات کیا۔ سال بھر کے بعد انہوں نے کہہ دیا کہ صاحب! یہ پوسٹ (آسامی) Abolish (ختم) کر دیجیے' اس دوران کوئی مقدمہ ہی نہیں آیا۔ یہ کوئی مقدمہ کیوں نہیں آیا؟ اس لیے کہ ان کا مکافاتِ عمل پر ایمان تھا۔

نہ پولیس کی حاجت' نہ مجسٹریٹوں کی اور نہ ہی جیل خانوں کی ضرورت

عزیزانِ من! اگر مکافاتِ عمل پر ایمان ہو جائے تو قوم کو نہ پولیس کی ضرورت پڑتی ہے' نہ مجسٹریٹوں کی حاجت ہوتی' نہ کہیں جیل

---

❶ سردی ہو یا گرمی' سال بھر یہ اپنے تجارتی قافلے مسلسل اِدھر اُدھر بھیجتے رہتے تھے اور وہ ہمیشہ محفوظ رہتے تھے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

خانے کھولنے پڑتے ہیں۔ ان کا تو سوال ہی نہیں ہے کیونکہ پھر وہ صاحبِ ہوش و عقل ہیں، سنکھیے کے متعلق ایمان ہے کہ یہ مہلک ہے، پھر کون پھانک پائے گا۔ یہاں تو صورتِ حال یہ ہے کہ وہ لوگ بھی ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اس ضابطہ خداوندی کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں اور قانونِ مکافات اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) وہ ان پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے لیے بڑی شدت سے یہ کہا ہے کہ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ [1] (2:8)۔ فریب دیتے ہیں۔ ایک تو یہ لوگ تھے۔ ان کے متعلق یہ کہا کہ وہ لوگ خدا کو، مومنین کو فریب نہیں دیتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو جو دھڑلے سے کہتا ہے کہ میں یہ مانتا ہی نہیں کہ سنکھیا مہلک ہے، وہ دھڑلے سے (کفر کے متعلق) اقرار کرتا ہے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ وہ کسی کو دھوکا دیتے ہیں، البتہ منافق کے متعلق ضرور کہا ہے کہ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ (3:167) وہ زبان سے جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کے دل میں نہیں ہوتا، اس پہ انہیں یقین نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ ایمان جس کے متعلق قرآنِ کریم نے ان سے کہا ہے کہ يَقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ [2] (2:8)۔ لہٰذا یہاں (74:18-25) میں جو کہا ہے، وہ ایک محاکاتی انداز میں کہا ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ نمائندہ آیا، آ کر غور کیا، اس نے تیوری چڑھائی، منہ بسورا۔ یہ نخوت کے انداز ہیں۔ وہ نمائندہ کہتا ہے کہ جو باتیں کر رہے ہو، وہ تو وہی پرانا جھوٹ ہے جو چلا آ رہا ہے، وہی دہرایا چلا جا رہا ہے۔ پھر کہا کہ کہاں کا عذاب، اور کہاں کی زندگی بعد از ممات۔ یہ سب جھوٹ ہے۔

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ اس کے اس عمل اور اس کے نتیجے کے درمیان فاصلہ نہیں ہے۔ اگلی ہی آیت میں قرآن کہتا ہے کہ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ (74:26)۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہے کہ تم ابھی، عنقریب دیکھو گے کہ اس کو ''سقر'' میں ڈال دیا جائے گا۔ اب ہمارے ہاں تو بس جو سقر کی بات چلی ہے اس میں تو اس کا ترجمہ دوزخ کیا جاتا ہے اور کہہ دیا جاتا ہے کہ دوزخ میں، مرنے کے بعد، آخرت میں جا کے، وہاں یہ کچھ ہوگا، یہاں کچھ نہیں اور وہ اِسے مانتے نہیں ہیں، اعلانیہ کہتے ہیں کہ ہم دوزخ کو نہیں مانتے، ہم تو منافقت میں مانتے ہیں، یقین ہم بھی نہیں کرتے۔ یہ وہی ہے جسے قرآن کہتا ہے کہ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) ہمیں اس پر یقین و ایمان نہیں ہے۔ یہ بات کن کے لیے ہے؟ جس سقر کو، جس آخرت کے جہنم کو نہ کافر مانے، نہ ہمارے جیسا ''مومن'' مانے، تو پھر وہ منافقت سے کیسے باز آ جائے!! یہی وجہ ہے کہ ہم ان چیزوں سے باز نہیں آتے۔ آج بھی دوزخ کی بات سنانے والے کوئی کم نہیں ہیں:

---

[1] یہ لوگ نظامِ خداوندی اور اس کے قائم کرنے والی جماعت مومنین سے دو رُخی چالیں چلتے ہیں اور بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں فریب دے رہے ہیں، حالانکہ اگر یہ عقل و شعور سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ وہ خود اپنے آپ کو فریب میں رکھ رہے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لائے لیکن وہ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ (ایضاً)

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی

ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

کہا جا رہا ہے کہ کم بختو! وہاں کی میزان، جہنم اور جنت کے ذکر تو تم بہت کرتے ہو، یہاں جس جہنم کے اندر تم پڑے ہوئے ہو اس کو تو دیکھو۔

مکہ کے میدان میں "ساصلیه سقر" کا نقشہ

یہ کیا اور کونسا جہنم تھا جس میں اس قریش کے نمائندہ یا قریش کی پوری قوم کو یہ کہا گیا کہ **سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ** [1] (74:26)۔ عزیزانِ من! وہ بڑے تکبر سے، نخوت سے، منہ بسور کے، یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ یہ جھوٹ ہے جو چلا آ رہا ہے، جو تم کہتے ہو، وہ جھوٹ ہے۔ اس پر اُسے کہا گیا کہ تم عنقریب دیکھو گے کہ یہ سچ ہے۔ "عنقریب دیکھ لو گے۔" بڑا ہی اہم ہے، جو اسے کہا گیا تھا۔ وہ انہوں نے چار ہی دن کے بعد، مکہ کے میدان میں، دیکھ لیا کہ جو ہم کہتے تھے وہ جھوٹ ہے اور جو یہ کہتے تھے، وہ سچ ہے اور پھر "سقر" کے نقشے کھینچے ہیں کہ قریش کے یہ لوگ زنجیریں پہنے ہوئے ہیں۔ اندازہ لگایئے صاحب! میں نے کہا کہ جن کے نخوت کے ذکر کی یہ بات کئی دفعہ آ چکی، جن کی کیفیت یہ تھی کہ بدر کے میدان میں جب ابوجہل کا سر کاٹنے کے لیے اس کی چھاتی پہ بیٹھ گئے تو وہ کہتا ہے کہ یہ گردن ذرا نیچے سے کاٹنا۔ انہوں نے کہا کہ اس میں تو تمہیں بڑی تکلیف ہو گی، ہڈیاں ہیں۔ کہنے لگا: جی، کوئی بات نہیں، نیچے سے کاٹو۔ کہنے لگے: اس سے کیا ہو گا؟ کہنے لگا: مرنے کے بعد جب سروں کا جلوس نکلے گا، ان کے ہاں یہ رواج تھا کہ بڑے بڑے لیڈروں کے سر نیزے پہ ٹانگ کر ایک جلوس نکلتا تھا، تو اُس نے یہ کہا تھا کہ جب وہ جلوس نکلے گا، تو میرا سر باقیوں سے چار انچ اوپر ہو گا۔ یہ کیفیت تھی اس قوم کی، یہ صورتِ حال تھی ان کے ہاں نخوت کی۔

پا بجولاں قیدیوں میں غیور کی کیفیت

عزیزانِ من! یہ وہی شخص ہے، یہ وہی لوگ ہیں جنہیں انہوں نے ملک بدر کر دیا ہوا تھا، نکال دیا تھا۔ وہ یہاں سے "بھاگ" گئے، ہجرت کر گئے، یہاں سے چھوڑ کر مدینہ چلے گئے تھے۔ ان مہاجرین کی کیفیت یہ تھی کہ وہ بے گھر اور بے در تھے اور ان کے مقابل میں یہ قریش تھے۔ اب ان قریش کی یہ کیفیت تھی کہ وہاں پا بجولاں کھڑے ہیں، اپنی نجات کی "بھیک" مانگ رہے ہیں۔ نہیں، عزیزانِ من! یہ بھیک کا لفظ میں نہیں کہہ سکتا۔ انہوں نے بھیک نہیں مانگی۔ وہ تو بڑے ہی غیور تھے اور انہیں غیور کی شرافت [2] پہ اتنا اعتماد تھا۔ میں کہتا ہوں

---

[1] (مفاد پرست گروہ کا یہ سرغنہ، یہ کچھ کہہ کر چلا گیا۔ اور اس کے پیچھے خدا کے قانونِ مکافات نے پکار کر کہا کہ تم دیکھو گے کہ) عنقریب اس کی دولت و حشمت کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ اسے جھلسا دینے والی آگ میں جھونک دیا جائے گا جو اس کی ساری سختی کو پگھلا کر رکھ دے گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] یہ اشارہ حضور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔

کہ یہ دونوں چیزیں عجیب ثابت ہوتی ہیں۔ قیدیوں کی طرح سامنے پابجولاں کھڑے ہیں اور حضور ﷺ پوچھ رہے ہیں کہ اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ اب تاریخ کے اندر یہ واقعہ ہے۔ اس میں ان لوگوں کا کیریکٹر (کردار) بھی نظر آتا ہے۔ انہوں نے بھیک نہیں مانگی ہے، معافی نہیں مانگی ہے، کسی قسم کی نرمی کی گزارش نہیں کی ہے۔ کہا یہ ہے کہ ''جیسا ایک شریف بھائی دوسرے بھائیوں کے ساتھ سلوک کیا کرتا ہے۔''

آپ ﷺ کی شرافت کی عظمت

عزیزانِ من! کتنا اعتماد تھا اس بھائی کی شرافت کے اوپر! اور شرافت یہ تھی کہ اگر یہی بات ہے تو لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ❶ (12:92)۔ کھول دو ان کی ہتھکڑیاں۔ بھائی سے شرافت کا ثبوت مانگتے ہیں تو یہ بھی شریف ہے۔ اِن قریش کی یہ کیفیت تھی۔ جب وہ ان کا نمائندہ اس طرح سے منہ موڑ کے، منہ بسور کے، پیشانی پر شکن ڈال کے، مذاق کرتا ہوا، چلا گیا کہ یہ وہی جھوٹ ہے جو ہوتا چلا آ رہا ہے، اس سے کہا کہ تم یہ کہتے ہو، سنو! سَأُصْلِيهِ سَقَرَ (74:26) عنقریب تمہاری دولت و حشمت کا نام و نشان تک مٹ جائے گا، جھلسا دینے والی آگ میں جھونک دیا جائے گا جو ساری سختی کو پگھلا کر رکھ دے گی۔ اور پھر کہا کہ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ ❷ (74:27) تمہیں کون بتائے سقر کیا ہے؟ تم کچھ سمجھے کہ سقر کس کو کہتے ہیں؟ ہم نے تو کہہ دیا کہ بس وہ جو مرنے کے بعد دوزخ ہوگا وہ یہ ہے۔ لیکن سنو کہ سقر کیا ہے: لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ❸ (74:28)

قرآن کی آخری سورتوں میں جامعیت کی انتہا ہے

عزیزانِ من! کیا بات ہے! ویسے تو سارا ہی قرآن اعجاز ہے لیکن آخری سورتوں کے اندر تو جو اس کا اعجاز ہے، یعنی جامع بات مختصر طور پہ کہہ دینی، اس میں تو یہ اپنے انتہائی کمال پہ پہنچ گیا ہے۔ ان آخری سورتوں میں قرآن کی بات یہ ہے۔ کہا ہے کہ کیا ہے سقر؟ جواب ہے کہ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ (74:27) یہ ہے کہ یہ کسی کو نہیں چھوڑتی، سب کو اپنے احاطہ میں لینے والی بات ہے۔ اور اس کے بعد یہ تو لے لیا احاطہ میں کہ جن جن چیزوں کے اوپر ان کو غرور اور ناز اور کبر اور تکبر اور یہ سب کچھ ہے، ان میں سے کوئی باقی نہیں چھوڑے گی: (لاتذر) باقی نہیں چھوڑے گی۔ ''تذر'' تو یہ ہے کہ کسی کو نہیں چھوڑے گی اور کچھ بھی باقی نہیں چھوڑے گی۔ یہ ہے سقر۔ یہیں وہ معاملہ سامنے آنا

---

❶ آج کے دن تم پہ کوئی سرزنش نہیں۔

❷ اور کیا تم جانتے ہو کہ وہ جھلسا دینے والی آگ کیا ہوتی ہے اور کیا کر دیا کرتی ہے؟

❸ وہ راکھ کا ڈھیر بنا دیا کرتی ہے۔ وہ کسی چیز کو نہیں چھوڑتی اور جس تک پہنچ جائے اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہنے دیا کرتی۔ وہ نام و نشان تک کو مٹا دیا کرتی ہے۔ (۱۔۲۔۳، مفہوم القرآن۔ پرویز)

تھا۔اور واقعی کچھ نہیں چھوڑا۔اس کے بعد وہی قریش تھے اور ان کا نسلی تفاخر ختم ہو گیا تھا۔

حضور کا خطبہ حجۃ الوداع

حضور ﷺ کا حجۃ الوداع کا ایک خطبہ ہے جس میں کہا ہے کہ گورے میں اور کالے میں، عربی اور عجمی میں، سید میں اور شیخ میں، کوئی امتیاز نہیں بجز تقویٰ کے۔عربِ جاہلیہ کے تمام شعائر و مناسک آج میرے پاؤں تلے روندے ہوئے ہیں۔کیا بات ہے صاحب! یہ جو قرآن نے کہا تھا کہ کسی کو نہیں چھوڑے گی۔وہ تو یہ تھا۔سارے عرب میں سے کوئی ایک قبیلہ بھی باقی نہیں رہا تھا جو یوں نہ آ گیا ہو۔اور لَا تُبۡقِیۡ کے معنی ہیں کہ ان کا کچھ نہیں چھوڑا تھا، جس کے اوپر ان کو اتنا فخر اور ناز تھا۔یہ تھا سقر اور وہ سمجھتے تھے کہ اس کے کیا معنی ہیں۔اس کے معنی ہوتے ہیں ''سخت دھات کی چیزوں کو پگھلا دینے والا'' اس میں یہ بات کہی تھی کہ وہ کس طرح اَدۡبَرَ وَ اسۡتَکۡبَرَ (1) (74:23) ہے۔ عزیزانِ من! اب دیکھیے کہ اس کے مقابلے میں کیا لفظ آ رہا ہے ''استکبر''۔اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ یوں سر کیے ہوئے کھڑا ہوا ہے۔کہا کہ لَوَّاحَۃٌ لِّلۡبَشَرِ (74:29) وہ اس طرح حلیہ بگاڑ دیتی ہے کہ اس کے بعد انسان پہچانا تک نہیں جاتا۔وہ ساری بساط الٹ کر نقشہ بدل دیتی ہے۔اور پھر یاد رکھیے کہ عَلَیۡہَا تِسۡعَۃَ عَشَرَ (74:30) اور یہ ایک ہی تباہی نہیں جسے بیان کیا گیا ہے، اس قسم کی بیسیوں تباہیاں ہیں۔ایک یہ اور انیس (۱۹) اس پر مستزاد۔سوال یہ ہے کہ یہ تباہیاں کون لاتا ہے؟ اس کا جواب قرآنِ کریم نے یہ دیا کہ وَمَا جَعَلۡنَاۤ اَصۡحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِکَۃً ۪ وَّ مَا جَعَلۡنَا عِدَّتَہُمۡ اِلَّا فِتۡنَۃً لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ۙ لِیَسۡتَیۡقِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ وَ یَزۡدَادَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِیۡمَانًا وَّ لَا یَرۡتَابَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ وَ لِیَقُوۡلَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ وَّ الۡکٰفِرُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٰذَا مَثَلًا ؕ کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ مَا یَعۡلَمُ جُنُوۡدَ رَبِّکَ اِلَّا ہُوَ ؕ وَ مَا ہِیَ اِلَّا ذِکۡرٰی لِلۡبَشَرِ (74:31) یہ تباہیاں ہماری متعین کردہ قوتیں ہی لاتی ہیں۔اب رہا ان کی تعداد کا معاملہ تو ایسا محض تمثیلاً کہا گیا ہے۔جو لوگ قرآنِ کریم پر ایمان نہیں رکھتے، وہ اس تمثیلی بیان کو حقیقت پر محمول کر کے، اس پر اعتراض کریں گے اور طرح طرح کی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جائیں گے۔لیکن جن لوگوں کو قرآن کا پختہ اور گہرا علم حاصل ہے وہ سمجھ لیں گے کہ اس قسم کے تمثیلی بیانات سے خدا کا مقصود کیا ہے۔لہٰذا انہیں اس سے یقین حاصل ہوگا (3:7) حتیٰ کہ جماعت مومنین کے دل میں کبھی شک اور اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔لیکن جو لوگ نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں، یا قرآن کے منجاب اللہ ہونے کا کھلے بندوں انکار کرتے ہیں،

---

(1) نہایت سرکش اور تکبر کے ساتھ منہ موڑ کر یہ کہتا ہوا چل دیا کہ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ یُّؤۡثَرُ (74:25) یہ غلط ہے (کہ یہ آسمانی وحی اور خدائی فیصلے ہیں۔) یہ پرانے زمانے کی دقیانوسی باتیں ہیں۔یہ وہی جھوٹ ہے جو صدیوں سے اسی طرح متواتر چلا آ رہا ہے۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

وہ جھٹ سے اعتراض کر دیتے ہیں کہ اس قسم کی مثالوں سے بالآخر خدا کا مقصود کیا ہے؟ (2:26) اس طرح جو شخص اپنے اندر کج نگہی پیدا کر لیتا ہے اور یوں خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق' اپنے اعمال کی وجہ سے' غلط راستے پر چل نکلتا ہے' اس کے سامنے صحیح راستہ نہیں آ سکتا۔ اور جو چاہتا ہے کہ وہ صحیح راستے پر چلے' اُس کی رہنمائی صحیح راستے کی طرف ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں کس کس قسم کی قوتیں کارفرما ہیں' اور خدا کے لشکر کس کس انداز سے' اس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں' اس کا پورا پورا علم خدا ہی کو ہے۔ ان امور کا تمثیلی بیان اس لیے کر دیا جاتا ہے کہ انسان' غور و تدبر سے کام لے اور قوانینِ خداوندی کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔

عزیزانِ من! یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ خدا کا قانونِ مکافات کوئی شے نہیں اور جس انقلاب سے انہیں متنبہ کیا جاتا ہے وہ محض دھمکی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں' وہ انقلاب ایک حقیقت ہے جو واقع ہو کر رہے گا۔ ان سے کہو کہ یہ ذرا کارگہہ کائنات کے نظم و نسق پر' اور جس قانونِ خداوندی کے ماتحت مظاہرِ فطرت مصروفِ نقل و حرکت ہیں' اس پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ جس خدا کی لامحدود قوت یہ کچھ کر رہی ہے اس کے لیے اس قسم کا انقلاب لانا کیا مشکل ہے؟ اس کے لیے قرآن مظاہرِ فطرت کی مثالیں لاتا ہے اور چاند کے متعلق کہتا ہے کہ **كَلَّا وَالْقَمَرِ** (74:32) چاند کا اپنے وقت پر نمودار ہونا اور پھر مختلف منازل سے گزرنا اور اسی طرح **وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ** (74:33) رات کی تاریکی کا صبح کی سپیدی میں تبدیل ہونا پھر **وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ** (74:34) اور پھر روزِ روشن کا سامنے آنا...... یہ تمام تغیرات خدا کے قانونِ قدرت کی زندہ شہادات ہیں۔

عزیزانِ من! آگے بات لمبی آ رہی ہے۔ آج ہم سورۃ المدثر کی آیت 32 تک ہی آ سکے۔ 33 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

بائیسواں باب: سورة المدثر (آیات 33 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1984ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المدثر کی آیت 33 سے ہو رہا ہے: (74:33)

قرآنِ حکیم کا پیش کردہ ضابطۂ حیات ہر آنے والی نسل کے لیے مشعلِ راہ ہے

میں نے سابقہ درس میں عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم مخالفینِ قریش سے کہہ رہا تھا کہ تمہارے اس غلط نظام کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ اس غلط نظام کے لیے عذاب کا لفظ ہوتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ جب بھی ہمارے سامنے عذاب کا لفظ آتا ہے تو ذہن عام طور پر مرنے کے بعد‘ جسے ہم قیامت کہتے ہیں‘ کے دوزخ کے عذاب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ قیامت اور آخرت اور وہاں کی تمام تفصیلات‘ جو قرآن نے دی ہیں‘ پر تو ہمارا ایمان ہے لیکن یہ نہیں ہے کہ یہ نتائج جو باطل نظام کے ہیں یہ صرف وہیں‘ آخرت میں ہی سامنے آئیں گے‘ وہ نتائج اسی دنیا میں بھی سامنے آ جاتے ہیں اور اس طرح یہ جو اس غلط نظام کی تباہیاں سامنے آتی ہیں یہ وہ چیز ہے جو صرف اس بات سے آگاہ کر سکتی ہیں کہ اگر ہم نے بھی اسی قسم کا نظام اپنے ہاں اختیار کیا تو ہمارا انجام بھی یہی ہوگا۔ قرآنِ کریم سابقہ اقوام اور انبیائے کرام علیہم السلام کے جو تذکارِ جلیلہ بھی بیان کرتا ہے وہ ہر قوم کی تباہی کے بعد کہتا ہی یہ ہے کہ کوئی تاریخی واقعہ ایسا نہیں ہے‘ جو ہم نے اس مقصد کے بغیر بیان کیا ہو بلکہ اس کو بیان کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ جس قوم نے اس قسم کا نظام اپنے ہاں قائم کیا اس کا یہ نتیجہ نکلا اور وہ ایسا محسوس نتیجہ تھا کہ کہا یہ گیا کہ تم انکی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات پر دن رات گزرتے ہو‘ ان کی اینٹوں پر لکھی ہوئی‘ ان کی تباہی کی داستان‘ دیکھو۔ فرق اتنا ہی ہے کہ

عام دیکھنے والے صرف یہی کہیں گے کہ یہ فلاں سال میں، فلاں دور میں، فلاں قسم کی قوم تھی، اس کا یہ انجام ہوا اور قرآن یہ کہے گا کہ اس قوم نے اس قسم کا غلط نظام اپنے ہاں قائم کیا تھا اس لیے اس کا یہ نتیجہ نکلا۔ قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ مدین، فرعون کی قوم، قومِ موسیٰ آپ دیکھیے، اسی دنیا میں ان قوموں کے انجام کی شہادات قرآن دے رہا ہے اور موجودہ قوموں کے علاوہ آنے والی قوموں کے لیے، قیامت تک کے لیے، یہ ضابطہ نصیحت پیش کرتے ہوئے ان کو یہ آگاہ کرتا ہے کہ تم دیکھو کہ اس قسم کے غلط نظام کا نتیجہ کیا نکلا تھا اور سوچو کہ یہ ایسی بات نہیں کہ وہ ہنگامی یا اتفاقی طور پہ ایسا ہو گیا تھا بلکہ یہ ایک قانونِ مکافاتِ عمل ہے کہ جس قسم کا کوئی نظام ہوتا ہے اس کے اسی قسم کے نتائج نکلتے ہیں، اس میں نہ تو کسی جگہ کی قید ہوتی ہے، نہ زمانے کی قید ہوتی ہے کہ فلاں وقت ہو اور فلاں جگہ ہو تو ایسا ہوا تھا اب نہیں ہوگا۔ یہ قیامت تک ہوگا اور ہر جگہ، جہاں بھی یہ چیز ہوگی، یہی ہوگا۔ اچھا نظام قائم کیا جائے گا تو خوشگوار نتائج نکلیں گے، غلط نظام ہوگا تو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ قرآن یہ چیز بتاتا ہے۔ جو آخرت ہے، جو وہاں جا کر ہونے والی چیز ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن یہاں ان واقعات کے بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ہر موجود قوم، ہر آنے والی قوم دیکھ لے کہ اس قسم کے غلط نظام کا نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے۔ یہ جو خدا کا مکافاتِ عمل کا قانون ہے، اس کی ساری بنیاد دین کے اس فارمولے پر ہے کہ اگر اس قسم کا نظام قائم کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ اس قسم کا نکلے گا، اسی دنیا کے اندر اس کا نتیجہ سامنے آ جائے گا۔

خارج سے ملنے والی سزا اور عمل کے فطری نتیجہ مرتب ہونے میں فرق

عزیزانِ من! ہمارے ذہن میں سزا کا کچھ تصور یوں ہے کہ خدا کی طرف سے غلط رو قوموں کو سزا ملتی ہے، یہ قرآنی تصور نہیں ہے۔ ایک سزا تو وہ ہے جو خارج سے کسی پر وارد کی جاتی ہے جیسے ہمارے ہاں دنیاوی معاشرے کا عدل کا نظام ہے کہ مقدمہ ہوتا ہے یا کوئی جرم کرتا ہے، پولیس گرفتار کرتی ہے، مقدمہ چلتا ہے، عدالت فیصلہ کرتی ہے، اس کو سزا کا فیصلہ ہوتا ہے پھر سزا والے کو جیل خانہ میں قید کرتے ہیں۔ یہ سارا کچھ خارج سے ہو رہا ہوتا ہے لیکن مکافاتِ عمل کی رو سے، جس کا نام سزا ہے، وہ اس عمل کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً سنکھیا کھانے سے یہ نہیں ہوتا کہ کہیں باہر سے سزا ملتی ہے۔ وہ جو سنکھیا کھانے والے کی ہلاکت ہوتی ہے وہ اس لیے ہے کہ سنکھیے کے اندر یہ چیز موجود ہے کہ جو بھی اسے کھائے گا، ہلاک ہو جائے گا۔ اس میں باہر کا کوئی دخل ہی نہیں ہے، خود سنکھیے کے اندر یہ چیز موجود ہے۔ جو بھی کھائے گا، جہاں بھی کھائے گا، کوئی اسے گرفتار کر کے عدالت میں نہیں پہنچائے گا۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ بند کمرے میں، تنہائی کے اندر بھی، اگر اسے پھانکے گا تو بھی اس کا وہی نتیجہ نکلے گا۔ یہ جو قرآنِ کریم نے کہہ رکھا ہے، جس کا نام ہم سزا کہتے ہیں یا عذاب کہا جائے، تو وہ یہ ہے کہ ''غلط اعمال کے اندر یہ تباہی موجود ہوتی ہے''۔

جہنمی زندگی میں عذاب کے مجازی معانی کا استعمال

عزیزانِ من! یہ وہ چیز ہے جس کی قرآن بار بار تاکید کرتا ہے کہ یہ جو ہم ان اقوامِ عالم کی تاریخ کی شہادات پیش کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب بھی اس قسم کا عمل کیا جائے گا یا اس قسم کا نظام قائم کیا جائے گا' اس کا نتیجہ اس قسم کی تباہی ہوگا۔ وہ جہنم کی زندگی ہے' عذاب کی زندگی ہے' جلا دینے والی زندگی ہے' راکھ کر دینے والی زندگی ہے۔ یہ الفاظ کے مجازی معنی ہیں جو اس قسم کی زندگی کے لیے کہے جاتے ہیں ورنہ جہنم کی زندگی تو ہزار حیف نہ بنی قیامت موجود۔ اگر قومیں نگہ بصیرت سے دیکھیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم تو جہنم کی زندگی بسر کر رہے ہیں' ہم خود عذاب میں مبتلا ہیں۔ اگر یہ چیز' جو قرآن کہتا ہے' ہمارے سامنے ہو تو نظر آ جائے گا کہ ہمیں جہنم کے شعلوں نے لپیٹ رکھا ہے۔

موجودہ دَور میں دنیا بھر کی قوموں کی حالت زار

عزیزانِ من! آج جو دنیا کی بڑی بڑی سپر پاورز ہیں وہ جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ان کے ہاں کوئی ایک دن بھی چین سے سو نہیں سکتا۔ اس وقت ساری قوموں پر اس قدر آنے والے عذاب کی تباہیاں مسلط ہوئی ہیں کہ الامان والحفیظ اور جو ہم جیسی محکوم قومیں ہیں یعنی جو سپر پاورز کی محکوم قومیں ہیں' خواہ قانونی طور پہ آزاد ہی کیوں نہ ہوں' وہ تو دہرے عذاب میں مبتلا ہوتی ہیں: اپنے ہاں کے غلط نظام کے عذاب میں اور اپنے اوپر مسلط سپر پاورز جنہیں ہم صاحبِ اقتدار قوتیں کہہ رہے ہیں' کے لائے ہوئے عذاب میں۔ تو یہ ہے وہ عذاب جس کو دیکھنا چاہیے۔ یہ نہیں ہے کہ یہاں تو کچھ نہیں ہے' جیسا جی چاہے زندگی بسر کرو' مرنے کے بعد' وہاں جا کر' پھر دیکھا جائے گا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ اس مکافاتِ عمل کے قانون پر ایمان کا نہ ہونا ہے جس کی وجہ سے غلط نظام بھی قائم ہوتا ہے اور جرائم بھی ہوتے ہیں۔ اگر یہ ایمان ہو جس طرح یہ ایمان ہے کہ سنکھیا کھانے سے موت واقع ہوتی ہے تو اگر وہ صاحبِ عقل و ہوش ہے تو پھر تو وہ بالارادہ سنکھیا کبھی نہیں پھانکے گا۔ یہ چیز تھی جو میں نے کہا ہے۔ سارے قرآن کی تعلیم کا ملخص یہ ہے کہ جس قسم کا کوئی عمل' کوئی فعل' کوئی نظام' ہوگا اسی قسم کا نتیجہ مرتب ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ کی قریش سے کشمکش اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! اب یہاں قریش سے بات ہو رہی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اس کشمکش کا لمبا عرصہ ہو گیا ہے۔ ان قریش کو مختلف انداز سے' متنوع زاویوں سے' سمجھایا گیا کہ تمہارے اس غلط نظام کا نتیجہ تمہاری تباہی ہوگا۔ تباہی کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ' جس قدر بھی' انہیں Privileges (مراعات) حاصل تھیں' قریش کو جو مقام حاصل تھا' وہ چھن جائے گا۔ اس زمانے کی اقوام کے اندر ان کا بہت بڑا بلند مقام تھا۔ یہ کہا کہ تمہارے اس غلط' باطل نظام کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں' یہ سب اعزازات تم سے چھن جائیں گے' دولت چھن

جائے گی' تولیتِ کعبہ کی بناء پہ جو تمہاری تکریم ہے' وہ تم سے چھن جائے گی' جو تمہاری تجارتیں ہیں وہ تم سے چھن جائیں گی' حسب ونسب کی بناء پہ جو تم اس قدر باعثِ تکریم بنے ہوئے ہو' یہ چھن جائیں گی۔ یہ ہے جو بار بار ان کو ڈرایا جا رہا تھا۔ ڈرانا کیا' انہیں آگاہ کیا جا رہا تھا کہ سنکھیا پھانک رہے ہو' اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ ان کے ذہن میں بھی نہیں آتا تھا کہ ہم اتنی بڑی قوت' دولت' شوکت' حشمت کے مالک ہیں اور یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہارا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ کیسے ہوگا؟ بیان کرتے کرتے قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ مٹھی بھر جماعت' بدر کے میدان [1] میں تو وہ تین سو کے قریب ہی تھے' سارے بے ساز وسامان' ان کے پاس تو گھوڑے بھی پورے نہیں تھے۔ یہ ہے جماعت اور ہمیں یہ اس طرح کا ڈراوا دے رہی ہے کہ ہم تباہ ہو جائیں گے اور یہ کامیاب و کامران ہو جائیں گے۔ یہ کیسے ہوگا؟ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ محسوس مشاہدات کی بناء پر وہ ثبوت پیش کرتا ہے' یا شواہد پیش کرتا ہے' گواہیاں پیش کرتا ہے' دلائل پیش کرتا ہے۔ کہا کہ **كَلَّا** (74:32) تم سن رکھو جو یہ کہہ رہے ہو کہ یہ چھوٹی سی ایک جماعت ہے' یہ کس طرح یہ کچھ کر دکھائے گی؟ اس کے لیے قرآن کریم نے چاند کی مثال دی کہ **وَالْقَمَرِ** (74:32) چاند کا اپنے وقت پہ نمودار ہونا اور پھر مختلف منازل سے گزرنا۔ عزیزانِ من! اندازہ لگایئے کہ قرآن کا انداز کیا ہے! یہ جتنی آیات ہیں' دو دو لفظوں کی ہیں' انہیں سمجھ لیجیے۔ کہا کہ **كَلَّا وَالْقَمَرِ ٥ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ٥ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ٥ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ٥ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ** [2] (74:32-36)

---

[1] نبی اکرمؐ کی ہجرت قریش مکہ پر گراں گزری تھی۔ انہوں نے سارے عرب کو مخالفت و مبارزت کے لیے مشتعل کر دیا۔ مدینہ میں ہجرت سے پہلے عبداللہ بن ابی رئیس الانصار تھا۔ قریش نے اسے خط لکھا کہ ''تم نے ہمارے آدمیوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے' ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ انہیں قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو' ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کر دیں گے اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کر لیں گے (بحوالہ سنن ابی داؤد)'' نبی اکرمؐ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے عبداللہ بن ابی کو سمجھایا کہ اس مخالفت میں تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے' اس لیے کہ اکثر انصار مسلمان ہو چکے تھے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور اس نے قریش کی بات نہ مانی۔ قریش نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۲ھ کے اوائل میں مکہ کے ایک رئیس کرز جابر بن فہری نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور حضورؐ کے مویشی لوٹ کر لے گیا۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب قریش کا قافلہ شام کی طرف تجارت کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس قافلہ کو واپسی پر اسی راستہ سے گزرنا تھا۔ امیر کارواں ابوسفیان کو کسی نے یہ غلط خبر پہنچا دی کہ مسلمان تمہارے قافلہ کو لوٹنے کی فکر میں ہیں۔ اس نے اس کی اطلاع قریش مکہ کو بھیج دی۔ وہ پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ خوئے بدرا بہانہ بسیار ایک لشکر جرار ساتھ لے کر مدینہ کی طرف امنڈ آئے۔ نبی اکرمؐ کو معلوم ہوا تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ 17 رمضان 2ھ (مطابق 13 مارچ 624ء) کی صبح بدر کے میدان میں دو صفیں ایک دوسرے کے سامنے نبرد آزما تھیں۔ پرویز: معراج انسانیت' ادارہ طلوع اسلام' کراچی 1949' ص ص 517-515۔

[1] چاند کا اپنے وقت پر نمودار ہونا اور پھر مختلف منازل سے گزرنا' رات کی تاریکی کا صبح کی سپیدی میں تبدیل ہونا اور پھر روزِ روشن کا سامنے آ جانا...... یہ تمام تغیرات' خدا کے قانونِ قدرت کی زندہ شہادات ہیں۔ اُسی کے قانونِ قدرت کے مطابق' یہ انقلاب آئے گا' جو تاریخ انسانی کے عظیم واقعات میں سے ہے۔ یہ چاند کی طرح بتدریج بڑھے گا۔ اس کی ضوفشانیوں سے باطل کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور حق کی سحر درخشندہ نمودار ہو جائے گی۔ ہم انہیں مطلع کیے دیتے ہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ ہر شخص کو اس سے آگاہ رہنا چاہیے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

قرآنِ حکیم کی فصاحت و بلاغت

عزیزانِ من! اگر آپ کو تھوڑی سی بھی عربی آتی ہو تو آپ ان آیات سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ قرآن کا جو اندازِ بیان ہے' ادبی اعتبار سے بھی اسے قرآن کا معجزہ گنا گیا ہے۔ انہی آیتوں کو دیکھیے دو دو لفظوں کی آیتیں ہیں اور وہ تو ہیں جیسے کافیہ ہوتا ہے: قمر اور اَدْبَرَ قافیہ اور اَسْفَرَ: یہ سارے کا سارا اس کے اندر ہے اور اگر ان الفاظ کے معنی آپ کے سامنے ہوں تو آپ جھوم اٹھیں کہ قرآن کیا کہہ گیا۔ ضمناً میں ایک بات یہ عرض کر دوں کہ یہاں یہ ''کُبَـــرِ'' لفظ ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ اس انداز سے ایک ہی دفعہ آیا ہے۔ میں نے قرآن کے ایک دو نسخوں میں بھی دیکھا ہے کہ یہ لفظ صحیح نہیں لکھا ہوا تھا۔ یہ آپ کے پاس ہے' آپ اسے دیکھ لیجیے کہ آیا یہ صحیح ہے۔ یہ لفظ ''کُبَرِ'' ہے۔ یہ لفظ کِبَر نہیں ہے۔ یہاں کہا ہے کہ كَلَّا وَالْقَمَرِ (74:32) نگاہ اٹھاؤ۔ تم یہ کہہ رہے ہو کہ یہ پہلی رات کا چاند' یونہی لکیر سا' اتنی رات کی تاریکی کو کیا مٹائے گا! کہا کہ ٹھیک ہے شروع میں تو یہ ایک لکیر سا ہی نظر آتا ہے لیکن تم دیکھتے ہو کہ یہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا کس طرح چودھویں کا چاند بن جایا کرتا ہے۔ یعنی چھوٹی سی جماعت ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی' اپنی روشنی پھیلاتی ہوئی' چلی جارہی ہے اور یہاں تک وہ پہنچ رہی ہے۔ یہ تاریکی کی ہی بات تھی کیونکہ آگے ہے کہ وَالَّيْـلِ اِذْ اَدْبَـرَ (74:32) رات کو دیکھو' اس آیت میں کیا بات ہے ''اَدْبَرَ'' کی! میدانِ جنگ میں جس طرح کوئی پیٹھ دکھا کر بھاگتا ہے' یہ ''اَدْبَرَ'' ہے۔ رات کی تاریکی تو اس چاند کے چڑھنے سے ہی کافور ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے یہاں اس کی مثال دی ہے۔

عزیزانِ من! یہاں ایک اور بات عرض کر دوں کہ وَالَّيْـلِ اِذْ اَدْبَرَ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ''اذ'' اور ''اذا'' دو لفاظ ہیں۔ ویسے تو ان دونوں الفاظ کے تقریباً ایک ہی معنی ''جب'' کے ہی ہوتے ہیں' یعنی جب یہ بات ہوگئی' اور دوسرا یہ بات ہوگئی۔ ان دونوں معنی میں فرق ہوتا ہے۔ لفظ ''اذ'' تب آتا ہے جب وہ ماضی کا کوئی قصہ ہو کہ وہ بات ہوگئی جیسے ہم کہتے ہیں ''وہ رات گئی' وہ تاریکی گئی۔'' اس کے لیے تو ''اذ'' آتا ہے اور ''اذا'' کا لفظ وہاں استعمال ہوتا ہے جب کوئی آنے والا واقعہ اچانک ہو جیسا کہ وہ صبح نمودار ہوگئی' وہ رات ہوگئی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کے ایک ایک لفظ پر رک کر غور کرنا چاہیے۔ عزیزانِ من! اس زبان کا کیا کہنا! لیل کے لیے اِذْ اَدْبَرَ ہے' صبح کے لیے اِذَا اَسْـفَرَ ہے۔ ''اذا'' آتا ہے جیسے یا جب کسی نے چہرے سے کوئی نقاب اچانک اٹھایا ہو۔ یہ اس وقت بولتے ہیں کہ وہ دیکھیے' چاند نمودار ہوا' بڑا چھوٹا سا' لکیر سی ہے لیکن تاریکی کے لیے تو یہ بھی کافی ہے اور جوں جوں یہ بڑھنا شروع ہوگا تو وہ رات کی تاریکیاں گئیں اور دیکھو وہ صبح نے اپنے نورانی چہرے سے کس طرح نقاب الٹی اور ساری دنیا جگمگا اٹھی:

شب گریزاں ہوگی آخر جلوہِ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

یہ ہے وَالَّیۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ o وَالصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ (74:33-34)

لفظ اِحۡدَی اور کُبَرِ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! یہاں یہ کہا کہ یہ کچھ ہونے والا ہے اور پھر کہا کہ اِنَّهَا لَاِحۡدَی الۡكُبَرِ (74:35) یہ واقعہ ہے جو ہم تمہیں بتا رہے ہیں کہ یہ آنے والا ہے' ہونے والا ہے۔ پہلے تو یہ دیکھیے کہ یہاں ''احدی'' کہا ہے۔ عربی زبان میں اس احد کے معنی تو ایک ہی ہوتے ہیں لیکن جب یہ ''اِحۡدَی'' کے لیے آئے گا تو اس کے معنی ہوتا ہے ''ایک ایسا واقعہ جس کی نظیر اور مثل کہیں نظر نہ آئے' یا اتنا عظیم واقعہ ہوگا اور اُس واقعے کو کُبَرِ کہا ہے۔ ویسے تو وہی کُبَرِ میں یہ ''ک ب ر''ہی ہے' وہ تکبیر ہی ہے' لیکن جو کُبَرَ آئیگا تو اس کے معنی ہوتا ہے کہ ''اتنا عظیم واقعہ اور ایسا عظیم کہ جس کی تاریخ میں مثال نہ ملے۔'' قرآن دو لفظوں میں ساری بات کہہ جاتا ہے: تمہارا یہ انجام ہونے والا ہے۔ یہ قریش سے کہا جا رہا ہے۔ یہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے' کعبے کے متولی تھے' ان کے تجارتی قافلے محفوظ تھے' حسب ونسب کے اعتبار سے کسی کو اپنی خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے۔ یہ تھی قوم! تعداد ان کی اتنی زیادہ تھی۔ ان کے مقابلے میں یہ گھر بار چھوڑ کر' مکے سے بھاگے ہوئے' مدینے میں جا کر' پناہ لینے والے چند نفوس تھے۔ تعداد ان کی اتنی تھوڑی سی تھی' ساز و سامان کچھ بھی نہیں تھا' یہ تھی ان کی کیفیت ......

ذرہ ناچیز و تعمیرے بیابانے نگر

اور دعوے کتنے بڑے ہیں! اِنَّهَا لَاِحۡدَی الۡكُبَرِ (74:35) یہ تاریخ کا عظیم واقعہ ہوگا جس کی مثال نہیں ملے گی۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کاہے کے لیے کہا جا رہا ہے؟ اس کے جواب میں کہا کہ نَذِيۡرًا لِّلۡبَشَرِ (74:36) انسان کے لیے کہ وہ آگاہ رہے۔

قرآنِ حکیم کی پوری نوعِ انسانی کو وارننگ (تنبیہ)

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ تنذیر یا انذار کے معنی ڈرانا نہیں' آگاہ کرنا ہیں۔ یہ وہی ہے جسے (Warn) آگاہ کرنا کہتے ہیں' جیسے انگریزی میں آنے والے خطرے سے (Warn) آگاہ کیا جاتا ہے کہ یہ پورے انسانوں کو' پوری نوعِ انسانی کو' وارن کیا جاتا ہے کہ جہاں بھی اس قسم کا نظام قائم ہوگا' اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اور اگلی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس دین کے نظام کا' رشد و ہدایت کے طریق کار کا' صحیح راہنمائی کے نظام کا' مقصود کس پر دلالت کرتا ہے۔ میں نے قرآن کے متعلق عرض کیا ہے کہ اس کی تعلیم' کسی خاص نوع کی یا کسی فرد کی زندگی کے متعلق نہیں ہے۔ وہ جسے زندگی کہتے ہیں' لائف کہتے ہیں' آپ کہہ دیجیے کہ جو L کیپٹیل (بڑے حرف) سے لائف (Life) لکھا جائے گا تو اس زندگی کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہ زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی' چلی آ رہی ہے' آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

چودہ سو سال پیشتر نظریہ ارتقاء کی نشاندہی

عزیزانِ من! اس ارتقائی منازل کے اندر وہ ایک ذرہ ہے جسے قرآن نفسِ واحدہ کہتا ہے۔ یہ ایک لائف سیل (Life Cell) جرثومہ حیات ہے، جہاں سے اس کی ابتداء ہوتی ہے، پھر یہ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ قرآن نے یہ چیز چودہ سو سال پہلے کہی۔ اِس دَور میں Evolution (ارتقاء) کی تھیوری (نظریہ) کا بڑا کریڈٹ (اعزاز) Scientists (سائنسدانوں) کو جاتا ہے جنہوں نے اس میں تحقیق کی اور دنیا اس کا سہرا واقعی ان کے سر باندھتی ہے۔ دنیا کی نگاہ اس پہ نہیں گئی اور اب جا رہی ہے کہ قرآن نے چودہ سو سال پہلے یہ بات کہی تھی کہ زندگی کی ابتداء ایک جرثومے سے ہوئی، پھر وہ مختلف ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، آگے بڑھتی گئی۔ اِن ارتقائی منازل میں، یا یہ جو ارتقاء کا نظریہ ہے، اس کی رو سے جو جنس اپنے اندر اتنی قوت یا اتنی صلاحیت پیدا کر لے کہ وہ آگے بڑھ سکے تو وہ اپنی اس منزل سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس کے لیے مُسۡتَقَرٌّ وَّمُسۡتَوۡدَعٌ (6:98) قرآن کے دو الفاظ ہیں۔

زندگی ایک منزل میں ٹھہری ہوئی ہوتی ہے، وہاں وہ اپنے اندر صلاحیتیں پیدا کرتی ہے۔ اگر اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ آگے بڑھ سکے تو پھر وہ پچھلی منزل سے اگلی منزل میں چلی جاتی ہے۔ یہ جو اگلی منزل کی شکل ہے وہ زیادہ بہتر ہوتی ہے یوں رفتہ رفتہ زندگی آگے بڑھتی ہوئی، انسانی پیکر میں آ چکی ہے۔ یہ جو سلسلہ ہے، جس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی، وہ یا تو ختم ہو جاتی ہے، یا وہیں رک جاتی ہے، ویسی کی ویسی رہ جاتی ہے۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی ورنہ میں آج کی سائنس کے جو انکشافات ہیں، ان کی رو سے عرض کرتا۔ میری کتابوں میں یہ سلسلہ ارتقاء لکھا ہوا ہے۔ یہ سلسلہ قرآن کی ایک ایک آیت کے ساتھ ملتا ہوا چلا جاتا ہے کہ جو نوع بھی اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا نہیں کرتی ہے، وہ رک جاتی ہے، یا ختم ہو جاتی ہے، یا وہیں رکی رہتی ہے، آگے نہیں بڑھ پاتی۔ یہ جو کسی مقام کے اوپر رک جانا ہے قرآن نے اس کو جحیم کہا ہے۔ یہ لفظ جہنم کے لیے ہے کہ کسی ایک مقام پہ رک جانا، آگے نہ بڑھ سکنا۔ اور دوسری وہ ہیں، جو صلاحیت پیدا کرتی ہیں، وہ آگے بڑھ جاتی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ یہ تو طبعی زندگی (فزیکل لائف) کی بات ہوئی۔ یہی زندگی ہے۔ ارتقاء کا یہی قانون انسان کی زندگی کے اندر بھی کارفرما ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ شکل تو انسان کی پیدا ہو گئی لیکن انسان اور انسان میں فرق ہے۔ وہ غاروں میں رہنے والا بھی انسان ہی تھا۔ آج کی تحقیقات نے یہ فرق واضح کر دیا۔ اب جو تحقیقات کے بعد اس کی تصویریں سامنے آتی ہیں، اسکے جو کچھ نقشے کھینچے جاتے ہیں، یہ جنہیں افریقہ کے، آسٹریلیا کے اوریجنل (ابتدائی: Original) باشندے کہا جاتا ہے وہ تو اب ہمارے سامنے بھی آتے ہیں۔ آپ سوچیے کہ کہنے کو انہیں بھی انسان ہی کہا جائے گا، بشر ہی کہا جائے گا۔ وہ جو غاروں میں رہنے والے، افریقہ اور آسٹریلیا کے اوریجنل باشندے جنہیں کہا جاتا ہے، وہ اور آج چاند پہ جانے والے انسان کس قدر مختلف ہیں مگر دونوں انسان ہی کہلائیں گے لیکن آپ دیکھتے ہیں دونوں کا فرق کتنا ہے۔

انسان کی ارتقائی منزل، انسانیت کی شکل میں

عزیزانِ من! یہ جو آگے بڑھتے چلے جانے والی چیز ہے، میں نے عرض کیا کہ میں یہ صرف فزیکل لائف کی بات کر رہا ہوں، انسانیت کی جو بات ہے اس میں بھی آپ دیکھیے قرآن اس کے لیے بھی ارتقائی منازل کا کہہ رہا ہے کہ صحیح نظام کے اندر صحیح انداز کی جو زندگی ہے قرآن کے قوانین کے مطابق مستقل اقدار کو ساتھ رکھتے ہوئے اس سے انسانیت ابھرتی ہے۔ اب میں اس کے لیے لفظ انسان کی بجائے انسانیت کہونگا۔ اس سے انسانیت آگے بڑھتی ہے۔ اگر غلط نظام ہو تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ زندگی وہیں رک جاتی ہے، آگے نہیں بڑھتی، اور کچھ عرصہ تک رکی رہے تو اس کے بعد وہ ختم ہی ہو جاتی ہے۔ یہ ہے ملخص قرآن کی تعلیم کا کہ زندگی نے ارتقائی منازل طے کرنا ہیں۔ قرآن کے بتائے ہوئے طریقے پہ اس شاہراہ کے اوپر زندگی چلی جائے گی، تو یہ آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ ایسا نہ ہوگا تو رک جائے گی، ٹھہر جائے گی، ختم ہو جائے گی۔

اب جو ٹکراؤ پیچھے سے چلا آ رہا ہے اس کے لیے کہا ہے کہ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ (74:36) پوری انسانیت کے لیے اس میں سوچنے کا، آگہی کا، وارن کرنے کا، ایک مقام ہے۔ یہ کا ہے کے لیے ہے؟ عزیزانِ من! اگر قرآنِ کریم کے نسخے سامنے ہیں تو دیکھیے، میں عرض کرونگا کہ قرآن یوں سمجھا تا ہے۔ کہا کہ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (74:37) یہ اس لیے ہے کہ جس کا جی آگے بڑھنے کے لیے، چاہے وہ آگے بڑھ جائے، جو آگے نہیں بڑھنا چاہتا وہ پیچھے رہ جائے۔ یہ ساری بات ہے۔ جو آگے بڑھنا چاہتا ہے آگے بڑھ جائے، جو آگے نہیں بڑھنا چاہتا، پیچھے رہنا چاہتا ہے، پیچھے رہ جائے۔ یہ تعلیم ہے، یہ نظام ہے۔ یہ سزا کا، عذاب کا، اور جہنم کی آگ کا یہ سارا تصور اور یہ ساری چیزیں مجازی ہیں جو کہا گیا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن میں جہنم کے لفظ کے تو معنی ہیں: ''وہ جگہ جہاں انسانیت کو جلایا جائے۔'' وہ جہنم ہے۔ یہ ہوتا کیا ہے؟ وہاں جحیم کا لفظ اس کے لیے آیا ہے جس کے معنی ہیں کسی مقام پر ''رک جانا''۔ یہی تو وہ کہہ رہا ہے کہ اب جو آگے بڑھنا ہے وہ اَلسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ [1] (56:10) ہے۔ قرآن میں اب آپ دوسرے مقامات پہ بھی دیکھیں گے، اسی کے لیے اور الفاظ آئیں گے: یعنی آگے بڑھ جانے والے پیچھے رہ جانیوالے۔ ساری بات ہی یہ ہے۔ یہاں آپ دیکھیے کہ دنیا کی مختلف اقوام ہیں۔ ان میں وہ بھی نہیں جنہیں آپ سپر پاور یعنی بڑی طاقتیں کہتے ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ دوسروں کے مقابلے میں آگے بڑھ گئی ہیں، اور یہ پیچھے رہ جانے والی ہیں۔ ان کے الفاظ میں یہ اقوام Developed and Under-Developed (ترقی یافتہ اور ترقی پذیر) ہیں یا Developing and developed (ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ) ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ آگے بڑھ گئے ہوئے اور پیچھے رہ جانے والے۔

---

[1] (تیسرا گروہ ان کا ہوگا) جو مصافِ زندگی میں سب سے آگے آگے تھے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

آج کا مسلمان تو مقامِ آدمیت سے بھی پیچھے ہے

عزیزانِ من! یہ دیکھنے کا تو بڑا محسوس سا معیار ہے کہ قرآن کی میزان کی رو سے ہماری کیا حیثیت ہے' ہم کس مقام کے اوپر ہیں؟ یہاں اقوامِ عالم میں ہی اپنا مقام دیکھ لیں۔ اگر ہم ان کی صف میں پیچھے رہ گئے ہوئے ہیں تو ہمارا نظام قرآن کی رو سے صحیح اور صالح نہیں ہے۔ صالح تو اسے کہیں گے جو انسان کے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر دے۔ اگر آگے بڑھ گئے ہوئے ہیں تو یہ ہے کہ ہم صحیح نظام کے اوپر ہیں' اور انسانیت کا معیار تو بہت آگے جا کر آتا ہے۔ وہ جو بشریت کا مقام ہے وہ صرف فزیکل لائف کا ہے۔ ہم تو دنیا میں اس میں بھی پیچھے سے پیچھے کی صف کے اندر کھڑے ہوئے ہیں۔

عزیزانِ من! ہمارے ہاں ''اثم'' کا ترجمہ گناہ کر دیا جاتا ہے۔ بات ہی سمجھ میں نہ آئی کہ یہ کیا بات ہے۔ اثم کہتے ہیں ''اس قسم کی چیزیں جو انسان کو اس طرح تھکا دیں کہ وہ باقی سب کے ساتھ چل نہ سکے' یہ وہ اونٹنی ہے جو کمزوری کی' ناتوانی کی' وجہ سے باقی کارواں کے ساتھ چل نہیں سکتی تھی' تکان کی وجہ سے پیچھے رہ جاتی تھی' اسے اَلْاٰثِمَة کہتے تھے۔ ❶

عزیزانِ من! یہ بات تو پیچھے رہ جانے اور آگے بڑھنے کی ہے' طبعی زندگی کے اندر بھی' اور پھر طبعی زندگی کے ساتھ انسانیت کی زندگی میں بھی۔ باقی جو ہم اس وقت مقابلہ کرتے ہیں' وہ تو طبعی زندگی ہے کہ وہ تو چاند پہ بھی چلے گئے آواز سے زیادہ تیز رفتار راکٹ پر سوار ہو گئے جبکہ ہمارے ہاں ریل گاڑی بھی صحیح وقت پہ نہیں چلتی۔ یہ طبعی زندگی کی بات ہے اور اب انسانیت کی زندگی کی مثال ہم کہاں دیں کہ اس کے اندر کیا ہوتا ہے' اس کی بات ابھی آ جاتی ہے۔ کہا کہ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ❷ (74:37)

ہر روشِ زندگی اپنا نتیجہ مرتب کرتی ہے

عزیزانِ من! یہ عظیم آیت ہے' یہ دین کا پورا ملخص ہے: ''جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے' جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔'' یہ کوئی باہر سے ملی ہوئی سزا نہیں ہے' یہ تو روشِ زندگی کا لازمی نتیجہ ہے اور پھر اس کے آگے ہے کہ كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ❸ (74:38)۔ عزیزانِ من! ہر قوم افراد سے ہی عبارت ہوتی ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ ہر فرد اپنے اپنے اعمال کے ہاتھوں رہن رکھا ہوا ہے۔ کیا بات ہے رہن رکھنے کی! کوئی شے جو رہن رکھ دی جاتی ہے جب تک اس کی قیمت ادا نہیں کی جاتی وہ وہاں سے آزاد نہیں ہو سکتی' وہ اس کے پاس رہتی ہے' جکڑی ہوئی رہتی ہے' دوسرے کے قبضے میں رہتی ہے۔ یہاں کہا کہ ہر شخص اپنے اعمال کے ہاتھوں رہن رکھا ہوا ہے' جکڑا ہوا ہے' ہل ہی نہیں سکتا' آگے کیا بڑھے گا!

---

❶ عرب المؤ اثم اس اونٹ کو کہتے تھے جو اضمحلال کی وجہ سے چلنے سے جواب دے جائے۔ (تاج العروس)

❷ جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے' جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔ (۳-۲ مفہوم القرآن۔ پرویز)

❸ ہر فرد اپنے اپنے اعمال کے ہاتھوں رہن رکھا ہوا ہے۔

ربوا کے غلط مفہوم نے قرآن کا معاشی نظام ہی بدل دیا ہے

اب بات رہن کی آ گئی تو آپ کہیں گے کہ میں دوسری طرف نکل گیا۔ یہ بات سود یا ربوٰ کی ہے۔ میں اسے Inverted commas (واوین' علامت حوالہ: '' '') میں رکھوں گا۔ یہ وہی ہے جسے آپ ''شریعتِ حقہ'' کہتے ہیں کہ سود جیسی حرام چیز کو جائز قرار دیا ہوا ہے۔ اسے عین مطابقِ شریعت کہا ہے۔ اس میں ایک یہ بھی چیز ہے جسے رہن یا قبضہ کہتے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا: وہ کاشتکار آتا تھا کہ میاں صاحب! تھوڑے سے پیسے چاہئیں۔ لے لیجیے پیسے۔ ایک ہزار روپیہ دے دیجیے۔ اب اگر وہ ہزار روپے پہ کہتا ہے پانچ روپے سینکڑہ سالانہ لونگا تو وہ تو سود ہے' حرامِ قطعی ہے' ہمارے ہاں اسے خنزیر کھاؤں کہتے ہیں' لہٰذا پھر کیا کیا جائے؟ کہا کہ میں ہزار روپیہ کے عوض تمہاری دو ایکڑ زمین رہن با قبضہ لیتا ہوں یعنی اُس صورت میں کہ ہزار روپیہ دے کر تو پانچ روپے سینکڑہ سود کھاتا ہوں لیکن دو ایکڑ زمین کی پیداوار کی شکل میں نہیں۔ ملاحظہ فرمایئے' کتنی فصل ہوگی' پہلے سال میں ہی ہزار روپیہ پورا آ جائے گا' اس سے بھی زیادہ آ جائے گا لیکن یہ حلال وطیب ہے کیونکہ رہن با قبضہ ہے' جب تک وہ ہزار روپیہ نہ دے یعنی یہ جو اس دو ایکڑ کی آمدنی آئی جا رہی ہے' وہ تو آتی چلی جا رہی ہے' یہ ان کی نظر میں منافع ہے' یہ سود نہیں ہے' وہ جب تک ہزار روپیہ نہیں دے گا یہ دو ایکڑ واپس نہیں لیے جائیں گے' یہ ہے كُلُّ نَفْسٍ م بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (74:38) وہ تو جب تک اصل واپس نہیں دے گا وہ رہن کی رہن رکھی جائے گی اور یہ اسی طرح چلا جائے گا' اور یہ اس کی آمدنی شیرِ مادر کی طرح حلال وطیب کھائے چلا جائے گا' اور یہ ناجائز نہیں کیونکہ یہ سود نہیں ہے یہ تو رہن ہے۔

میں نے کہا ہے کہ اس رہن رکھنے میں حیلے نکالے گئے ہیں: یہ ان کے ہاں مشارقت' مضاربت اور منافع ہے جس کا آج کل یہ نام رکھ دیا گیا ہے' انگریز پھر بھی بے ایمان نہیں تھا۔ وہ سود کو Interest ہی کہتا تھا۔ ہم نے تو اس طرح سے نام بدل بدل کر' لارنس گارڈن کا نام جناح گارڈن رکھا' خوش ہو گئے کہ ہمارا گارڈن قائداعظم کا گارڈن ہے۔ بس نام ہی بدل دیا۔ انٹرسٹ کا نام سود کی بجائے منافع رکھ دیا حلال وطیب ہو گیا۔ سچ کہا تھا قرآنِ کریم نے كُلُّ نَفْسٍ م بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (74:38) ہر فرد اپنے ہی اعمال کے شکنجے میں جکڑا ہوتا ہے اور انہی کی وجہ سے اس پر مصیبتیں آتی ہیں لیکن اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ (74:39) اصحاب یمن وسعادت مصیبتوں میں گرفتار نہیں ہوں گے یہ اصحاب الیمین ہیں۔ قرآنِ کریم یہ دو صفتیں قرار دیتا ہے: صاحب یمن وسعادت' بابرکت' خوش نصیب۔ پھر یوں کہیے کہ وہ فِيْ جَنّٰتٍ (74:40) وہ اپنے اعمالِ صالح کے بدلے جنت کی خوشگواریوں میں رہیں گے یعنی یہ جنّت کے اندر خوشگوار زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ يَتَسَآءَلُوْنَ o عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ (74:40-41) ایک دوسرے سے ان مجرموں کے متعلق پوچھیں گے جو جہنم میں رہ جانے والے ہیں' جو تباہیوں کے عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں کہ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ [1] (74:42)۔

---

[1] کونسی چیز تمہیں اس جہنم میں کھینچ لائی۔ وہ تمہارے کون سے جرائم تھے جن کی یہ سزا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہے بات "سَقَرَ" سے شروع ہوئی تھی۔ وہ 26ویں آیت تھی جس میں کہا تھا کہ سَاُصۡلِیۡهِ سَقَرَ ❶ (74:26)۔ بات یوں شروع ہوئی تھی کہ وہ جو نمائندہ آیا تھا' اُس نے تیوری ماتھے پہ ڈالی تھی' منہ بسورا تھا' یہ کہتا ہوا چلا گیا تھا کہ یہ اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں' کہاں کا جہنم' اور کہاں کی تباہی' ہمیں کون چھیڑ سکتا ہے۔ یہ وہی ہے جو سَقَرَ کہا تھا کہ ان سے پوچھا جائے گا کہ یہ کونسی چیز ہے جو تمہیں جہنم میں لے آئی۔ نظری طور پہ تو قرآن میں دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ وہ یہ کہیں گے کہ لَوۡ كُنَّا نَسۡمَعُ اَوۡ نَعۡقِلُ مَا كُنَّا فِیۡۤ اَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ (67:10) اگر ہم بات کو گوشِ ہوش سے سنتے اور پھر عقل وفکر سے کام لیتے تو آج جہنم میں نہ ہوتے۔ تو پہلی چیز تو یہی ہے کہ غور وفکر نہ کرنے والے جہنم کے اندر ہوتے ہیں۔

جہنم میں آنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہم مصلین میں سے نہ تھے

عزیزانِ من! یہاں ایک اور بات آ گئی ہے۔ پوچھا کہ تم جہنم میں کس طرح آ گئے؟ قرآن تو ایک نقشہ کھینچ کر سامنے لاتا ہے جیسے ان سے پوچھا جاتا ہے کہ یَتَسَآءَلُوۡنَ (74:40) تم جہنم میں کیسے آ گئے؟ قَالُوۡا لَمۡ نَكُ مِنَ الۡمُصَلِّیۡنَ ❷ (74:43)۔ انہوں نے کہا کہ ہم یہاں آ گئے کیونکہ ہم مصلین میں سے نہیں تھے۔ مصلین' مصلی' صلوٰۃ' کا ترجمہ نمازی کیا جاتا ہے۔ وہ کہیں گے کہ ہم نمازی نہیں تھے' اس ترجمے کی رو سے تو یہ بات ہوگئی۔ عزیزانِ من! صلوٰۃ یا جو قرآنِ کریم کی دوسری اصطلاحات ہیں' ان کا نہ ترجمہ ہو سکتا ہے' نہ ہی ہمیں ان کا کوئی بدل لفظ لانا چاہیے۔ یہ اپنی اصل کے اعتبار سے ہی وہ معنی دیتی ہیں جس کے لیے یہ آئی ہوئی ہیں۔ یہ بڑی گہری چیز ہوتی ہے۔ اصطلاح بڑی اہم چیز ہوتی ہے۔ وہ وہیں اپنے الفاظ کے اندر اپنا مفہوم رکھتی ہیں۔ جو مفہوم صلوٰۃ کے اندر تھا' وہ نماز کے اندر نہیں ہے۔ اسی لیے بات فٹ نہیں بیٹھتی۔ سارے قرآن میں ''اقامتِ صلوٰۃ'' ہے' نماز ترجمہ ہوا' ہم نماز پڑھتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی وہ نماز قائم کرتے ہیں آتا ہے تو وہاں بات ذہن میں بیٹھتی نہیں ہے کہ یہ اس کے کیا معنی ہوئے۔

قرآنِ حکیم کی اصطلاحات کا مفہوم قرآن ہی سے متعین کرنا ہوگا

صلوٰۃ قرآن کریم کی ایک جامع اصطلاح ہے۔ اس کا مفہوم قرآن سے متعین کیا جائے تو پھر پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک نظام ہے۔ اس میں ''قائم کرنا'' کا لفظ صحیح فٹ بیٹھ جاتا ہے۔ یہ ایک نظام ہے جس کو قائم کرنا ہے' جس کو Establish (ثبت) کرنا ہے۔ یہ بات تو اب ضمناً نہیں آ سکتی۔ میرے ذہن میں یہ ہے کہ اگر وقت ملا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سے توفیق ہوئی تو قرآنِ کریم کی یہ جو اصطلاحات ہیں' ان

---

❶ عنقریب اس کی دولت وحشمت کا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔ اُسے جھلسا دینے والی آگ میں جھونک دیا جائے گا جو اس کی ساری سختی کو پگھلا کر رکھ دے گی۔

❷ وہ کہیں گے کہ ہمارا جرم یہ تھا کہ ہم ان لوگوں میں شامل نہ ہوئے جنہوں نے نظامِ صلوٰۃ قائم کیا تھا۔ (۱-۲ مفہوم القرآن۔ پرویز)

کا مفہوم' قرآن کی رو سے پیش کروں گا۔ مجھے احساس ہے کہ ایک ایک اصطلاح کتنا زیادہ وقت لے لے گی۔ تو بہر حال اگر وقت مل گیا' اللہ تعالیٰ نے توفیق فرما دی' میری صحت رہی تو میں یہ چاہتا ہوں کہ اسکے بعد قرآن کی کم از کم یہ جو بنیادی اصطلاحات ہیں' قرآن کی رو سے ان کا مفہوم میں درسوں میں پیش کر دوں تا کہ بات سمجھ میں تو آئے کہ یہ کہتا کیا ہے۔ اب ہمارے ذہن میں صرف وہ الفاظ یا وہ ترجمے ہی آتے ہیں اور وہ تصور جو ہمارے ہاں مروج چلا آ رہا ہے وہ آتا ہے۔ یہاں **مصلین** کا لفظ ہے۔ اگر میں نے شروع کر دیا کہ مصلی کے بنیادی معنی عربی زبان کی رو سے کیا ہیں' اور قرآن نے جن معنی میں اسے استعمال کیا ہے تو بات دوسری طرف چلی جائے گی۔

مصلین کا لفظ قرآن حکیم میں

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں اس انداز میں مصلین کا یہ لفظ تین جگہ آیا ہے۔ ایک تو یہیں ہے کہ **لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ** (74:43) ہم **مصلین** میں سے نہیں تھے۔ کیا بات ہے؟ سوال یہ ہے کہ وہ کیا نہیں تھے۔ کہا کہ **وَ لَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ** (74:44) ہم معذوروں' غریبوں' مسکینوں کی روٹی کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے۔ اب آپ اس پہ غور کیجیے۔ میں خدانکردہ نماز پہ تنقید نہیں کر رہا۔ وہ تو ایک فریضہ ہے لیکن اس فریضہ کا مقصود بھی تو قرآن نے بتایا ہے۔ وہ اس کے ساتھ یہ بھی بتا رہا ہے کہ ہم کیا نہیں تھے' یا ہم کیا نہیں کرتے تھے؟ اس کے جواب میں کہا کہ جو اپنی روٹی کمانے کے قابل نہیں رہتا تھا' جس کی محنت اس کے بچوں کی پرورش کرنے پر پوری نہیں اترتی تھی' ان کو پوری روٹی نہیں ملتی تھی' اس کی ضروریات پوری نہیں ہوتی تھیں' ہم اس کی ضروریات پوری نہیں کیا کرتے تھے۔ **لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ** (74:43)۔ یہ ایک مقام ہے جہاں مصلین کا لفظ آیا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ دو مقام اور بھی ہیں جہاں مصلین کا لفظ آیا ہے۔ ایک (70:22) ہے۔ اس میں پیچھے سے یہ چلا آ رہا ہے کہ اسے جہنم آوازیں دے دے کر بلا رہی ہے۔ کون کس کو بلا رہی ہے؟ جہنم آوازیں دے دے کر بلا رہی ہے کہ اِدھر آؤ' ادھر اُدھر نہیں' اِدھر آؤ۔ سوال یہ ہے کہ یہ کن کو بلا رہی ہے؟ انہیں بلا رہی ہے جو **جَمَعَ فَاَوْعٰی** (70:18) دولت جمع کرتا تھا اور پھر اسے اپنی گٹھلی میں کس کر باندھ دیتا تھا۔ جی! سنیں کہا کہ **اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ** (70:22) یہ کیفیت **مصلین** کی نہیں ہوتی۔ تو پہلی بات تو یہاں یہ بتا دی کہ جو مال و دولت کو جمع کر کے' کس کے' باندھ کے' رکھتا ہے وہ مصلین میں سے نہیں ہے۔

سارے قرآن میں ''اقامت الصلوٰۃ'' اور ''ایتائے زکوٰۃ'' اکٹھا چلا آ رہا ہے۔ اب ہمارے ہاں صلوٰۃ کو صرف نماز سمجھا' زکوٰۃ کے معنی یہ ہو گئے' کہ جتنا جی چاہے جمع کرو' اور اس میں سے سال بھر کے بعد' کوئی اڑھائی پیسے (2.5 فیصد) دے دیجیے۔ یہاں کہا ہے کہ یہ جہنم آوازیں دے دے کر ان کو بلا رہا ہے کیونکہ **جَمَعَ فَاَوْعٰی** (70:18) وہ مال و دولت کو ربوبیتِ عامہ کے لیے کھلا نہیں رکھتا بلکہ اسے تھیلی میں جمع کرتا ہے اور پھر اس کا منہ اوپر سے کس کر باندھ دیتا ہے مگر **اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ** (70:22) مصلین ایسے نہیں ہوتے۔ کیوں؟ **اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ** (70:23) وہ تو نظامِ صلوٰۃ کو مستقل طور پر قائم کرتے ہیں۔ اس نظام میں کیا ہوتا ہے؟ کہا کہ

وَالَّذِیۡنَ فِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ o لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ [1] (70:24-25)ان کی کمائی میں ان لوگوں کا حق ہوتا ہے جو محتاج ہوتے ہیں، جو ضرورتمند ہوتے ہیں، جو معذور ہوتے ہیں، جو مسکین ہوتے ہیں: سائل اور محروم۔ اُن کی کمائی میں اِن کا حقِ معلوم ہے یعنی ایسا حق ہے جس کا سب کو علم ہے۔ یہ خیرات نہیں ہے۔ یہ لوگ ان کی دولت سے As of right (بطورحق) ڈیمانڈ (طلب) کر سکتے ہیں۔ یہ ہے نظامِ صلٰوۃ وزکٰوۃ کہ جس میں معذور اور مسکین کا حق ہوتا ہے کہ یہ ان کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کریں اور یہ وہ لوگ ہیں جو وَالَّذِیۡنَ یُصَدِّقُوۡنَ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ (70:26) مکافاتِ عمل کے قانون کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کا قیامت پر ایمان ہوتا ہے۔ یہ مصلین کا دوسرا مقام آ گیا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن میں تیسری جگہ بھی یہ لفظ آیا ہے۔ وہ (107:4) ہے۔ یہ سورۃ الماعون ہے۔ یہ تو پوری کی پوری سورۃ اس پر ہے۔ اس کی پہلی ہی آیت یہ ہے کہ: اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ [2] (107:1) یہاں اس سورۃ کی آیت 4 میں یہ لفظ آیا ہے۔

تکذیبِ دین کرنے والے کون لوگ ہیں؟

عزیزانِ من! میں اسے پھر دہرا دوں: آپ سورۃ المدثر کی اس آیت کی طرف آیئے جس میں کہا گیا ہے کہ لَمۡ نَکُ مِنَ الۡمُصَلِّیۡنَ o وَلَمۡ نَکُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡکِیۡنَ [3] (74:43-44) اور اس کے بعد کہا گیا ہے کہ وَکُنَّا نَخُوۡضُ مَعَ الۡخَآئِضِیۡنَ (74:45) ہم ان لوگوں میں شامل تھے جو بڑی بڑی باتیں بناتے تھے لیکن عملاً کچھ نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد کہا کہ وَکُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ (74:46) اس طرح ہم اپنے اس دعوے کی تکذیب کیا کرتے، جھٹلایا کرتے تھے، کہ ہم قیامت کو مانتے ہیں۔ وہاں یہ تکذیبِ دین ہے۔ یہاں اس سورۃ کی ابتداء ہی اس سے ہوتی ہے کہ اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ (107:1) تم نے اس کی حالت پہ بھی غور کیا ہے جو الدین کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ ''الدین'' مکافاتِ عمل ہوتا ہے۔ ہر عمل کا جو نتیجہ مرتب ہونے والا قانون ہے وہ ''الدین'' ہے۔ وہ خدا کے اس قانونِ مکافاتِ عمل کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ انکار کرتا ہے۔ وہ تو مانتا ہی نہیں ہے۔ تکذیب یہ ہے کہ کہتا تو یہ ہے کہ میں مانتا ہوں مگر عملاً اس کے خلاف کرتا ہے۔ یہ ہوتا ہے اپنے دعوے کو آپ

---

[1] اور اس طرح اپنی تنگ دلی کو کشادہ ظرفی سے بدل کر، اس حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا مال صرف ان کے انفرادی مفاد کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اس میں ان لوگوں کا، جن کی ضروریات ان کی کمائی سے پوری نہ ہوتی ہوں، یا جو کمانے کے قابل نہ رہیں اور اس طرح اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائیں، حق ہے، اور حق بھی ایسا جس کا سب کو علم ہے، اور اپنی ضروریات سے زائد اپنے پاس کچھ رکھتے ہی نہیں (2:219)۔

[2] کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتا ہے لیکن عملاً دین کی تکذیب کرتا ہے۔ یعنی اس کا طرزِ عمل اس امر کی دلیل ہے کہ اگر دینداری یہی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا ہے، تو پھر دین کا ہر دعویٰ جھوٹا ہے (95:7; 75:32-33; 53:33)۔

[3] ہم ان لوگوں میں شامل نہ ہوئے جنہوں نے نظامِ صلٰوۃ قائم کیا اور ہم ان لوگوں کے رزق کا سامان نہیں کرتے تھے جو کمائی کرنے کے قابل نہیں رہتے تھے۔ (۱-۲-۳ مفہوم القرآن۔ پرویز)

جھٹلانا۔کون ہے وہ؟ فَذٰلِکَ الَّذِیْ (107:2) یہ وہ ہے جو یَدُعُّ الْیَتِیْمَ (107:2) معاشرے میں تنہارہ جاتا ہے' اس کو دھکے دیتا ہے۔ سنتے جایئے عزیزانِ من! کون ہے تکذیبِ دین کرنے والا؟ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (107:3) جس شخص کی حرکت رک جاتی ہے اور وہ معذور ہو جاتا ہے' اپنی ضروریاتِ زندگی پیدا نہیں کرسکتا' اس کی ضروریات مہیا کرنے کے لیے نہ خود کچھ کرتا ہے نہ کسی دوسرے سے کرنے کے لیے کہتا ہے۔ یہ ہیں تکذیب دین کرنے والے۔اور آگے ہے' عزیزانِ من! فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ (107:4) تباہی ہے اس قسم کے نمازیوں کے لیے۔ یہاں یہ لفظ مصلین تیسری دفعہ آ گیا۔ میں مصلین کا یوں ترجمہ کروں کہ تباہی ہے ان مصلین پر۔ یہ مصلین کونسے ہیں؟ کہا کہ اَلَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (107:5) یہ وہ مصلین ہیں جو صلوٰۃ کے مقصد سے بے خبر ہیں۔ یہ نہیں کہا ہے کہ یہ نماز نہیں پڑھتے ہیں۔ مقصد کچھ اور ہے اور اگلی آیت میں ہے کہ اَلَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ (107:6) یہ وہ لوگ ہیں جو ایسی نقل و حرکت کرتے ہیں جو دیکھی جاسکتی ہے: قیام میں' رکوع میں' سجدے میں' اس میں تو بڑے پکے ہوتے ہیں لیکن جو اس کا مقصد ہے وہ اس مقصد کو بھولے ہوئے ہوتے ہیں۔ گویا دو چیزیں ہوگئیں۔ ایک تو یہ' جو نماز کے ارکان و تعدیل ہیں' رکوع و سجود ہیں' یہ وہ حرکات ہیں جو دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان پہ تو یہ پورے اترتے ہیں اور وہ جو اس کا مقصد تھا وہ اسے بھولے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہا کہ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ o اَلَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ o اَلَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ [1] (107:4-6) عزیزانِ من! یہاں تک وہ سمجھتے ہیں کہ میری نماز ہوگئی' رکوع ہوگیا' سجدہ ٹھیک ہوگیا۔ آج کل تو وہ ٹی وی پر بھی دکھاتے ہیں' وضو کرنا بھی بتاتے ہیں' پھر وہ نماز کی یہ ساری چیزیں بھی دکھاتے ہیں' لیکن اس صلوٰۃ کا مقصد کیا تھا یہ اسے بھولے ہوئے ہیں۔ وہ مقصد یہ ہے کہ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ [2] (107:7) رزق کے اس چشمے کو' جسے بہتے پانی کی طرح ہر ایک کے گھر کے سامنے سے جانا چاہیے تھا' یہ بند لگا کر' اپنے لیے روک لیتے ہیں۔ یہ ہے وَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ (107:4) تباہی مصلین کے لیے۔

---

[1] کام تو ایسے کرتا ہے' لیکن اپنے آپ کو ''دیندار'' ثابت کرنے کے لیے نمازیں بہت پڑھتا ہے۔ اسی قسم کی نمازیں ہیں جن کی نمازیں ان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں' اس لیے کہ یہ نمازیں پڑھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں (یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں) کہ یہ بڑے متقی پرہیزگار ہیں۔ انہیں اس کا پتہ ہی نہیں کہ صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد یہ تھا ایک ایسے معاشرے کا قیام جس میں تمام افراد قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں اور عالمگیر انسانیت کو سامانِ نشو و نما بہم پہنچتا رہے۔ یہ اس کی غرض و غایت سے تو غافل رہتے ہیں اور اس کے محسوس ارکان (قیام' رکوع' سجود وغیرہ) کی ادائیگی کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ ہم فریضہ خداوندی سے سبک دوش ہوگئے (9;54)۔

[2] ان کی اس خود فریبی کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف نمازیں بھی پڑھتے رہتے ہیں اور دوسری طرف رزق کے ان سرچشموں پر' جنہیں بہتے پانی کی طرف ہر ایک کی ضروریات کے لیے کھلا رہنا چاہیے' بند لگا کر' ان پر اپنا قبضہ جما لیتے ہیں' اور اس طرح ضرورت مندوں کو سامانِ زیست سے محروم کر دیتے ہیں۔ (یوں یہ تکذیب دین کرتے اور ننگِ اسلام بنتے ہیں)۔ (۱۔۲ مفہوم القرآن۔ پرویز)

صلٰوۃ کا معیشت کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے

عزیزانِ من! اب سوچ لیجیے' میں اپنی طرف سے تو کچھ نہیں کہہ رہا۔ قرآن میں یہی تین مقامات ہیں جہاں مصلین کا لفظ آیا ہے۔ کتنا تعلق ہے اس کا معیشت کے نظام کے ساتھ۔ صلٰوۃ کا نظام ہی یہ ہے کہ معاشرے میں کوئی فرد رات کو بھوکا نہ سوئے۔ یہی ایتائے زکٰوۃ ہے کہ ان کو سامانِ نشو ونما بہم پہنچایا جائے۔ یہ ہے وہ حقیقی مصلین۔ صلٰوۃ کے معنی ہی ہوتے ہیں کہ ''کسی کے پیچھے پیچھے' مسلسل چلتے چلے جانا' اتباع کیے چلے جانا' قوانینِ خداوندی کی اطاعت کیے چلے جانا''۔ اس میں ایک چیز یہ بھی ہے جسے آج ہم صلٰوۃ کے قیام وسجود اور رکوع کہتے ہیں۔ یہ تو نفسیاتی طور پہ' اپنے آپ کو اس مقصد کے تیار کرنے کے لئے' یہ کچھ کیا جاتا ہے۔ قرآن نے مصلین کا مقصد تو یہ بتایا کہ وَ لَمۡ نَکُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡکِیۡنَ (74:44) اور ہم ان لوگوں کے رزق کا سامان نہیں کرتے تھے' جو کمانے کے قابل نہیں رہتے تھے۔ قرآن بتاتا ہے کہ وہ جہنم میں کیوں آئے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم مصلین نہیں تھے۔ بھئی! کیا نہیں تھے' ذرا بات کھل کے کہو۔ کہ جی' وہ کھل کے کہنے کی تو بات نہیں ہے۔ بات تو یہ تھی کہ وَ لَمۡ نَکُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡکِیۡنَ (74:44) وہ معذوروں کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کا انتظام نہیں کرتے تھے۔ یہ کیا کرتے تھے؟ کہیں جنگلوں میں رہتے تھے' حجروں میں رہتے تھے؟ کہنے لگے کہ جی نہیں' یہ تو بات ہی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ وَ کُنَّا نَخُوۡضُ مَعَ الۡخَآئِضِیۡنَ (74:45) ہم باتیں بڑی بڑی کیا کرتے تھے' Statements (بیانات) بڑے Issue (جاری) کیا کرتے تھے' تقریریں بڑی کیا کرتے تھے' سیمینار منعقد کیا کرتے تھے' مناظرے ہوتے تھے۔ یہ باتیں ہوتی تھیں۔ بہت لمبی چوڑی باتیں کیا کرتے تھے: نظامِ معیشت' نظام معاشرت' اسلامی نظام' اسلامی شریعت' بڑی باتیں کیا کرتے تھے۔ کیا عجیب چیز ہے! ہم مصلین نہیں تھے' ہم صرف باتیں کیا کرتے تھے' ہم نماز کی حرکات وسکنات تک سمجھتے تھے کہ ہمارے ہاں کی نماز ہوگئی۔ ہم یہ نہیں دیکھتے تھے کہ رات کو کوئی بھوکا تو نہیں سویا۔ اب یہاں آیا ہے کہ وَ کُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ (74:46) [1] یوں ہم اپنے اس دعوے کو کہ ہم خدا پر ایمان رکھتے ہیں' آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' ہم عملاً اس کی تکذیب کیا کرتے تھے۔ حَتّٰۤی اَتٰىنَا الۡیَقِیۡنُ (74:47) ہم اسی روش پر قائم رہے تا آنکہ وہ تباہی حقیقت بن کر ہمارے سامنے آگئی۔

جب عمل کرنے کا وقت ہی ختم ہو جائے تو پھر ایمان کوئی فائدہ نہیں دیتا

عزیزانِ من! یقین وہ شے ہوتی ہے جو اس طرح سامنے آجائے کہ اس سے انکار نہ کیا جا سکے۔ عام طور پہ تو کہتے ہیں کہ تا آنکہ

---

[1] اور یوں ہم خدا کے قانونِ مکافات کی تکذیب کرتے تھے' اور اس بات کو جھٹلاتے تھے کہ ایک دن ہمارے اعمال کے نتائج تباہی بن کر ہمارے سامنے آئیں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہم پہ موت نہ آ گئی لیکن میں صرف یہ نہیں کہتا کہ موت ہی کیوں بلکہ تا آنکہ اس غلط نظام کا نتیجہ ہمارے سامنے نہ آ گیا۔ وہاں یہ چیز ہے کہ جب ان قوموں کے متعلق نتیجہ سامنے آتا تھا تو یہ اس وقت پکارتے تھے کہ ہم خدا کے اس قانون پر ایمان لائے لیکن اس وقت کہا جائے گا کہ اب ایمان کا کوئی فائدہ نہیں۔ فرعون نے بھی ڈوبتے ہوئے کہا تھا کہ میں رب موسیٰ اور ہارون پہ ایمان لاتا ہوں اور وہاں سے پھٹکار پڑی کہ آلـئن (10:91) ہاں' اب تو ایمان لایا' موت سامنے آئی تو اب تمہیں یاد آیا' اب ایمان کوئی فائدہ نہیں دے سکتا کیونکہ ایمان کے معنی ہیں صحیح بات کی طرف آ کے اسکے اوپر عمل کرنا اور جب اس کے اوپر عمل کرنے کا وقت ہی باقی نہ رہے' موت میں تو ایمان کیا فائدہ دے سکتا ہے۔ اب یہاں کہا ہے کہ حَتّٰٓی اَتٰـنَا الْیَقِیْنُ o فَـمَا تَنْفَعُھُمْ شَفَاعَۃُ الشّٰفِعِیْنَ ❶ (74:47-48) اس آیت میں شفاعت کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معانی سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

شفاعت کا مفہوم سفارش کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا

عزیزانِ من! شفاعت کا لفظ کئی ایک جگہ آ چکا ہے۔ اس کا مطلب میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں: ''کسی کی حمایت میں کھڑے ہو جانا' کسی کے لیے صحیح گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جانا۔'' سفارش کرنا اس کے نہیں معنی ہوتے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں کا جو غلط نظام ہوتا ہے' اس میں جو بدترین چیز کہنی ہو' وہ سفارش ہوتی ہے کہ صاحب! ایتھے تے کم ای ہن سفارش نال چلدا اے۔ ❷ یعنی آپ سوچیے کہ یہ تو ہم روز کہتے ہیں کہ ''میاں اوتھے درخواست دتی؟ ہاں جی' دے دتی۔ میاں کچھ سفارش دا انتظام کیتا ہیگا ای؟ یعنی دو ای چیزاں ہن رہ گیاں نا پئی: اک تھلے اوہدے پہیئے لائے نیں چاندی دے' تے دوئی گل اے کہ کوئی سفارش وی پہنچائی او۔'' ❸ یعنی کسی نظام کی جو بدترین چیز ہے وہ سفارش ہوتی ہے اور عزیزانِ من! سوچیے کہ ہم خدا کے ہاں کے نظام میں یہ کہتے ہیں کہ وہاں سفارش ہوگی تو پھر یہاں کے نظام میں جو چیز بدترین ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ) وہ ہم خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں' رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہیں' جس رسول ﷺ نے مرتے وقت اپنی بیٹی اور پھوپھی سے کہہ دیا تھا کہ دیکھنا! خدا کے ہاں تمہیں رسول کا رشتہ دار ہونا کچھ کام نہیں دے سکے گا' تمہارے اعمال ہونگے جس کے مطابق فیصلہ ہوگا' وہاں سفارش کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

---

❶ ہم اسی روش پر قائم رہے' تا آنکہ تباہی حقیقت بن کر ہمارے سامنے آ گئی۔ اُس وقت (نہ خود ان کی کوئی پیش جائے گی اور) نہ ہی ان کے حمائیتیوں کی حمایت ان کے کسی کام آئے گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ صاحب! یہاں تو اب کام ہی سفارش پہ چلتا ہے۔

❸ ارے میاں! کیا وہاں آپ نے درخواست دی؟ جی ہاں دی تھی۔ ارے میاں! کچھ سفارش کا بھی انتظام کیا تھا؟ یعنی اب دو ہی باتیں رہ گئی ہیں: ایک یہ کہ کیا اس کے نیچے چاندی کے پہیے لگائے اور دوسری یہ کہ کیا کسی سفارش کا بھی انتظام کیا ہے؟

عزیزانِ من! شفاعت کے معنی ہوتے ہیں ''جیسے عدالت میں سچی گواہی دینے والا کسی مظلوم کے ساتھ کھڑا ہوجاتا ہے۔'' یہ عدالت کی وہ چیز ہوتی ہے۔اس آیت میں کہا ہے کہ اس وقت کسی کا ان کے ساتھ کھڑے ہوجانا بھی کچھ کام نہیں دے گا۔جب غلط نظام کے نتائج آجاتے ہیں تو پھر تو سب اس سیلاب کے اندر ڈوبتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔اس کے بعد کہا کہ **فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ** (74:49) معلوم نہیں کہ جب یہ تمام حقائق اس طرح واضح طور پر ان کے سامنے پیش کر دیئے جاتے ہیں تو پھر انہیں کیا ہوجاتا ہے کہ وہ ان سے یوں روگردانی کرتے ہیں؟

انسان حقیقت سے اس طرح بھاگتا ہے جیسے جنگلی گدھا شیر کو دیکھ کر بھاگتا ہے

عزیزانِ من! اب سارا کچھ کہنے کے بعد یہاں کہا ہے کہ یہ سب کچھ دیکھو تو سہی! اس قسم کی نصیحت آمیز باتوں سے منہ پھیرنے والوں سے پوچھو کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کیا بات ہوئی ہے؟ یہ وہی ہے جو ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ ''او تیری کیوں مت ماری گئی آ۔''[1] تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ ہم جو اتنی واضح باتیں کہتے چلے جارہے ہیں اور تم ہو کہ ان سے روگردانی کرتے چلے جارہے ہو۔یہاں ''معرضین'' آیا ہے۔ **كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ o فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ** (74:50-51) منہ موڑ کے ہی نہیں چلتے بلکہ اس طرح بھاگتے ہیں جیسے جنگلی گدھا شیر کو دیکھ کے، بدک کے، بھاگتا ہے۔قرآن کی آواز سے اس طرح سے بھاگتے ہیں۔آج بھی، عزیزانِ من! قرآن کو الگ چھوڑ کر آپ جتنا جی چاہے، فسانہ تراشیاں، وعظیں، نصیحتیں، تذکرے کرتے چلے جایئے، بہت خوشنودی سے سنتے چلے جائیں گے۔قرآن کی آواز آئی اور اس کے بعد یہ بھاگے۔یہ اس آواز کو برداشت ہی نہیں کرسکتے۔خدا نے کہا ہوا ہے کہ جب قرآن میں، اے رسول! تو خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے تو ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے جیسے موت پڑ جاتی ہے، جب تو اس کے ساتھ اوروں کا ذکر کرتا ہے تو کھل کھلا کے ہنستے ہیں: واہ، سبحان اللہ! شیخ جیلانی کی کیا بات تھی! عزیزانِ من! قرآن کی ایک اور آیت آگئی: **فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ** (74:51) شیر سے ڈر کر بھاگتے ہیں۔پوچھا کہ یہ سب کچھ کیوں کرتے ہیں؟

نظامِ ربوبیت کی روشنی میں نظامِ سرمایہ داری کی حقیقت

نظامِ سرمایہ داری میں ہر فرد اپنی ذات کے لیے سب کچھ کرتا ہے۔اس میں انفرادیت ہوتی ہے۔اس کے اندر Individual Interest (مفادِ خویش) ہوتا ہے، افراد کا اجتماعی انٹرسٹ (مفاد) نہیں ہوتا، انسانیت کا مفاد نہیں ہوتا۔اس کے برعکس نظامِ ربوبیت میں انسانیت کا مفاد ہے، اسی لیے جو پہلی چیز حمد خدا ہے، وہ رب العلمین ہونے کی وجہ سے ہے، جو عالمین کی ربوبیت ہے، جو انسانیت کی ربوبیت ہے۔یہ انسانیت کا صحیح نظام ہے اور انفرادیت ایک فرد کی ہو، یا صرف اپنے گروہ کی ہو، اپنی جماعت کی ہو، اپنی قوم کی ہو، یہ انفرادیت

---

[1] او! تمہاری کیوں عقل پہ پردہ پڑا ہے۔

انسانیت میں آ جائے گی۔ اور نظامِ سرمایہ داری تو بدترین نظام ہوتا ہے۔ اس میں ہر فرد کا اپنا انتظام ہوتا ہے' اسے Individual Interest (مفادِ خویش) کہتے ہیں۔ اس میں فرد صرف اپنا Interest (مفاد) دیکھتا ہے: سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر۔ یہ ہوتا ہے نظامِ سرمایہ داری۔ پوچھا کہ اس قرآن کی آواز سے یہ کیوں بھاگتے ہیں؟ پھر اس کے جواب میں قرآنِ کریم نے خود ہی کہا کہ یہ اس لیے بھاگتے ہیں کہ بَلۡ یُرِیۡدُ کُلُّ امۡرِیًٔ مِّنۡھُمۡ اَنۡ یُّؤۡتٰی صُحُفًا مُّنَشَّرَۃً (74:52) ان میں ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اجتماعی بات نہ کرو' اس میں ہر فرد کا اپنا اپنا ایک پروگرام ہونا چاہیے' ہر ایک کا اپنا اپنا منشور ہونا چاہیے' صرف Individual (فرد) کا انٹرسٹ (مفاد) ہونا چاہیے۔ [1] یہ چاہتے ہیں' اور قرآنِ کریم کا یہ نظام انسانیت کی کلی منفعت چاہتا ہے کیونکہ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ [2] (13:17)

قرآنِ حکیم کا منشور پوری انسانیت کے لیے باعثِ موعظت ہے

عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ جو عمل' جو نظام' پوری انسانیت کی منفعت کے لیے ہوگا' اسی کے حصہ میں بقا آئے گی اور اس کے مقابلے میں یہ چاہتے ہیں' بلکہ ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ میرے لیے الگ الگ Individual (انفرادی) پروگرام ہونا چاہیے لیکن خدا کا ارشاد ہے کہ کَلَّا (74:53) نہیں' ہرگز نہیں' ہرگز ایسا نہیں' یہ نظام پنپ نہیں سکے گا۔ یہ اس لیے کہ ان کی نگاہ صرف مفادِ عاجلہ پر ہے بَلۡ لَّا یَخَافُوۡنَ الۡاٰخِرَۃَ (74:53) یہ نہ مستقبل کی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی اس کی تباہیوں سے خوف کھاتے ہیں۔ یہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے نہیں ڈرتے ہیں۔ اِس غلط نظام میں یہ ہے کہ ہر فرد دوسرے کی محنت کو چھین جھپٹ کر اپنے پاس لے جائے اور قانون اسے جائز قرار دیدے۔ اس طرح اس کے انجام میں جو تباہی آنے والی ہے' یہ اس سے ڈرتے نہیں ہیں لیکن ہم کہہ رہے ہیں کہ کَلَّاۤ اِنَّہٗ تَذۡکِرَۃٌ (74:54) اب ایسا نہیں ہو سکے گا۔ یہ قرآن تو ایک منشورِ نصیحت ہے' موعظت ہے' وارننگ (تنبیہ و آگہی Warning) ہے' تاریخی حقیقت ہے: فَمَنۡ شَآءَ ذَکَرَہٗ (74:55) جس کا جی چاہے اس سے نصیحت حاصل کر لے' اسے اپنے سامنے رکھ کر اس کے مطابق زندگی بسر کر لے۔ یہاں یہ ڈنڈے کے زور سے تو منوایا نہیں جا سکتا۔ یہاں تو یہ ہے کہ جس کا جی چاہے اس سے نصیحت لے لے۔ کہا کہ اس سے کون نصیحت حاصل کرتا ہے؟ پھر خود ہی جواب میں کہا کہ وَمَا یَذۡکُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ [3] (74:56)

---

[1] نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہی Individual Enterprise (شخصی کاراندازی) اور Laissez-Faire (آزاد تجارت) پر ہوتی ہے۔ یعنی اس میں افراد کو کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں اور جس قدر چاہیں دولت سمیٹتے جائیں' اجتماعی نظامِ حکومت' ان کے کاروبار میں دخل انداز نہیں ہوگا۔ ان آیات میں اسی نظام کی طرف اشارہ ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوعِ اسلام ٹرسٹ رجسٹرڈ لاہور' ص۔ 1385' فٹ نوٹ نمبر 1)

[2] جو کچھ نوعِ انسانی کے لیے نفع بخش ہوتا ہے' وہ باقی رہ جاتا ہے۔

[3] اسے اپنے سامنے وہی لوگ رکھ سکتے ہیں جو اپنے مقاصد اور ارادوں کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کر لیں یعنی جو اُسی چیز کو اپنا مطلوب و مقصود قرار دیں جو خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو۔ (۳،۲ مفہوم القرآن۔ پرویز)

چلیے صاحب! اس کا یوں ترجمہ کر دیا کہ پہلے تو یہ کہا ہے کہ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (74:55) جس کا جی چاہے اس سے نصیحت حاصل کر لے لیکن اگلی ہی آیت کے ترجمے نے یہ سارا کچھ ڈبو کر رکھ دیا۔ ایک ترجمے نے اس سارے قرآن کی جس قدر تعلیم ہے' اس پر پانی پھیر دیا کہ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (74:56) نصیحت تو وہی حاصل کر سکے گا جو اللہ چاہے گا' جبکہ پہلے وہ یہ کہہ رہا ہے کہ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (74:55) جس کا جی چاہے۔ ہم نے تو یہ تذکرے کا نظام' موعظت کا نظام' پھیلا کر رکھ دیا' کھول کر رکھ دیا' نہایت وضاحت سے بیان کر دیا' جس کا جی چاہے نصیحت حاصل کرے لیکن آگے جو ترجموں میں بات کہی ہے وہ یہ کہہ دی کہ وہی انسان نصیحت حاصل کرے گا جس کے لیے اللہ چاہے گا کہ وہ نصیحت حاصل کرے اور جس کے لیے وہ نہیں چاہے گا تو وہ کیسے کرے گا' جبکہ وہ کہتا ہے کہ جس کا جی چاہے نصیحت حاصل کرے۔ اور اسکے بعد کہتا ہے کہ وہ تو کر ہی وہ سکتا ہے ''جس کو ہم چاہیں گے وہی کرے گا تم کر ہی نہیں سکتے''۔ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (74:56) ان یشآء والے ترجمے نے' پورے قرآن کی جتنی بھی تعلیم تھی' عزیزانِ من! اس کو مسخ کر کے رکھ دیا' منسوخ کر کے رکھ دیا۔ میں آگے چل کر آپ احباب کو بتاؤں گا کہ یہ بات کہاں آتی ہے۔ ان آیات میں مشیت کا یہ قانون ذرا وضاحت سے بیان کرونگا۔ ایک اور مقام کے اوپر سورۃ الدھر (76) میں بھی کہا ہے کہ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (76:29) یہ ایک تذکرہ ہے' یہ تو موعظت کا صحیفہ ہے جو ہم پیش کر رہے ہیں۔ جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے والے راستے کو اختیار کر لے اور آگے ہے کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ [1] (76:30)۔ پہلے یہ ہے کہ فَمَنْ شَآءَ (76:29) جو چاہے' خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے اور آگے وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ تم تو وہی چاہ سکتے ہو جو اللہ چاہے۔ چلیے' تمہارے چاہنے کا اختیار تو ختم ہو گیا۔

انسان کو چاہیے کہ وہ کچھ چاہے جو خدا چاہتا ہے

عزیزانِ من! اس وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (76:30) کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''تمہیں چاہیے کہ وہ چاہو جو اللہ چاہتا ہے۔'' اس سے بات کہاں سے کہاں پہنچی: ''تم جو چاہو وہ کرو' تمہیں اس کا اختیار ہے' ہم تمہارا اختیار سلب نہیں کرتے لیکن تمہیں یہ چاہیے کہ تم وہ چاہو جو خدا چاہتا ہے۔ قرآن کے متعلق اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے: آں چہ حق می خواہد آں سازد ترا' کہ خدا جو چاہتا ہے کہ تم اس طرح کے بن جاؤ' قرآن تمہیں اس طرح کا بنا دے گا۔ کہا یہ ہے کہ یہ ہم نے کہا ہے کہ جس کا جی چاہے' جونسا راستہ جی چاہے' اختیار کر لے' لیکن تمہیں یہ چاہیے کہ تم چاہو ہی وہ جو خدا چاہتا ہے۔ اور خدا کیا چاہتا ہے؟ وہ اس نے قرآن میں کہہ دیا ہے کہ ہم یہ

---

[1] ان سے کہہ دو کہ یہ اسی صورت میں ہو سکے گا کہ تم اپنے اختیار و ارادہ کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کر لو (تم ویسا ہی چاہو جیسا قانونِ خداوندی کا منشاء ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

چاہتے ہیں کہ تم یہی کرو۔ بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے: فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ❶ (74:55-56) اور اس کے بعد کہا کہ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ (74:56) یہی لوگ ہیں جنہیں آپ اہلِ تقویٰ کہہ سکتے ہیں جو قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رہیں گے۔

چیز یہ ہے کہ ہم نے موعظت کا، نصیحت کا، ایک تذکرہ، ایک منشور دیدیا اور اس میں واضح کر کے بتا دیا۔ اب تمہیں یہ چاہیے کہ تم بھی اس کے مطابق چاہو۔ خود تمہاری خواہشات، تمہارے ارادے، آرزوئیں، مقاصد، مطالب، یہ سب اس کے تابع ہونے چاہئیں۔ بات یوں ہوگئی، تم چاہو، ہی وہ جو خدا چاہتا ہے۔ یہ کہنے کی کیا بات ہے! اب ایک ایک تفصیل دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ اِس معاملے میں ہم کیا چاہیں، اُس معاملے میں ہم کیا فیصلہ کریں۔ تم یہ پوچھو کہ خدا اس معاملے میں کیا چاہتا ہے کہ کرو۔ خدا چاہتا ہے کہ سیدھے راستے پہ چلو تو تم سیدھے راستے پہ چلو، خدا چاہتا ہے کہ دوسرے کو کھلا کر خود کھاؤ تو تم یہ کرو۔ ہم نے یہ کہہ دیا ہے کہ ہم تمہارا ارادہ سلب نہیں کرتے۔ یہ تم پہ چھوڑ دیا ہے کہ جیسا جی چاہے کرو۔ یہ سنکھیا ہے، جی چاہے کھالو، مر جاؤ گے، جی چاہے چھوڑ دو، بچ جاؤ گے۔ تو تم اس کو چھوڑ ہی کیوں نہیں دیتے۔ سیدھی سی بات ہے۔ یہ منشور ہے۔ ہم تمہارے اختیار کو سلب نہیں کرتے: تمہارا جی چاہے اختیار کرو، جی چاہے نہ اختیار کرو، لیکن تمہیں یہ چاہیے کہ تم یہ چاہو جو قرآن چاہتا ہے۔ اس طرح تم اہلِ تقویٰ ہو جاؤ گے، اس طرح تم اہلِ مغفرت ہو جاؤ گے۔

عزیزانِ من! سورۃ المدثر کی آخری آیت بھی آ گئی۔ آئندہ ہم 75 ویں سورۃ، سورۃ القیٰمۃ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؕ

❀......❀❀❀......❀

---

❶ سو جس کا جی چاہے قرآن کی اس نصیحت کو اپنے سامنے رکھ کر اس کے مطابق زندگی بسر کر لے لیکن اسے اپنے سامنے وہی لوگ رکھ سکتے ہیں جو اپنے اختیار و ارادہ کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کر لیں۔ یعنی جو اس چیز کو اپنا مطلوب و مقصود قرار دیں جو خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تیئیسواں باب: سورۃ القیٰمۃ (آیات 1 تا 3)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1984ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القیٰمۃ سے ہو رہا ہے: (75:1)۔

کشمکشِ حق و باطل کے آخری مراحل

آپ کو یاد ہوگا کہ ان سورتوں میں قریباً بیس، تیئیس سال پہلے سے، حق و باطل کی جو کشمکش، چلی آ رہی تھی وہ اب اپنے آخری مراحل میں آ پہنچی ہے۔ اب ان آخری تصادمات کا ذکر آ رہا ہے' اس آخری ٹکراؤ کا ذکر آ رہا ہے۔ یوں تو حق و باطل کے یہ تصادمات پہلے ہی دن سے چلے آ رہے ہیں کہ آدم اور ابلیس دونوں ایک ہی وقت میں اسٹیج پہ آتے ہیں اور ابلیس نے آخری آدمی تک مہلت لے رکھی ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں اس تصادم نے جو کیفیت یا رنگ اختیار کر رکھا تھا' وہ تاریخ کا ایک عدیم النظیر واقعہ ہے۔ اب اس کا آخری دَور آ رہا ہے۔ اب اس سورۃ کی ابتداء ہو رہی ہے۔

عزیزانِ من! پچھلی سورتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ کو ایک جماعت سازی کے لیے کہا گیا۔ کائنات کے ایک شجر خزاں دیدہ پر بہار نو لانے کے لیے یہ کہا کہ قُمْ (74:2) اٹھ۔ اس انقلاب کی اصل جو چیز ہے وہ قُمْ یہ ہے۔ یہ یونہی اٹھنا نہیں ہے۔ To rise کے معنی صرف بیٹھے ہوئے کا اٹھنا ہی نہیں ہوتا' یہ وہ ''اٹھنا'' ہے جسے کسی مقصد کے لیے Rising (اٹھنا) کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہی ہے جو قُم تھا۔ اب وہ قُم ہی ہے' جو آگے چل کے آ رہا ہے۔ کہا کہ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (74:2) ان سے کہو کہ میں قیامت کے حادثۂ واقعہ کو' دَور کو' رنگ کو' دن کو' قیٰمۃ کو' شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ قیام اور قُم کا ایک ہی مادہ (Root) ہے۔ قیام کے ''م'' کے بعد عربی زبان کے اندر جب گول ۃ لگائی جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں: ''وہ کام جو یکبارگی کیا جائے' شدت کے ساتھ' یکبارگی کیا جائے۔'' تو قیامت کا لفظ حقیقت میں قیام ہی ہے' وہ قیام جو بتدریج نہ ہو۔ بتدریج تو وہ آ رہا ہوتا ہے' اب اس میں ایک ایسی اسٹیج آ جاتی ہے کہ جس میں وہ محسوس طور پر یکبارگی اٹھ کے' سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسے قیٰمۃ کہا گیا ہے اور پھر اس کے

شروع میں ''ال'' بھی لگاؤ تو پھر یہ ال عربی و انگریزی کے لفظ The کے مترادف استعمال ہوتا ہے۔**قیـــــامۃ** کے ساتھ ال لگنے سے **الــقیــامۃ** بن گیا' وہ ایک خاص بن گیا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو اس قسم کی قرآن کی اصطلاحات ہیں' جو اس نے واقعات بتائے ہیں' وہ اس دنیا کی' اس قیامت کے متعلق بھی ہیں' یہاں کی جہنم اور جنت کے متعلق بھی ہیں اور جو جہنم اور جنت اس کے بعد یعنی مرنے کے بعد ہے اس پر تو ہمارا ایمان ہے۔ وہ تو ہے ہی۔ تو یہاں بھی وہ جو باطل کا حق کی طرف سے ایک مقابلہ تھا' جو بتدریج ہوتا چلا آ رہا تھا' اب اسمیں پھر ایک Strategy (حکمت عملی) ایسی آتی ہے' ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جہاں پھر یہ چیز انقلابی طور پر' اور ارتقائی طور پر منازل طے کرنے کے بعد' آخر میں سامنے آتی ہے۔ اور وہاں ہے جو **القیامۃ** کہا جاتا ہے۔ یہ قیام سے ہے' جس کے لیے **قم** (74:2) کہا گیا تھا۔

میں یہاں یہ بات پہلے عرض کردوں کہ اس قسم کی جو آیات یا سورتیں یا قرآنِ کریم کے واقعات ہیں' اب ان میں یہ ہے کہ اس **الـقیامۃ** سے مقصود وہ Rising (اٹھنا) ہے' وہ انقلاب مقصود ہے' جو اس کشمکش کے آخری مرحلے میں نبی اکرم ﷺ اور والذین معہ کے ہاتھوں برپا ہوا۔ یہ اس دنیا کے اندر کا قیام ہے' یا اس سے مراد مرنے کے بعد کی قیامت ہے۔ اب اسے تدبر فی القران کہا جاتا ہے۔ اگر کسی نے یہ سمجھا کہ یہ یہاں کے انقلاب ہی کے متعلق ہے تو اس کا کوئی اثر انسان کے ایمان اور عقیدے پر نہیں پڑتا ہے اور پھر وہ انقلاب ختم نہیں ہو گیا بلکہ وہ حق و باطل کا انقلاب ہے' وہ جاری ہے۔ ہمارے لیے بھی یہ احکام ہیں جو نبی اکرم ﷺ یا حضور ﷺ کے ساتھیوں کے لیے تھے' وہ احکام قیامت تک کے لیے تھے اور ہیں اور پھر خاص طور پہ یہ امت جسے قرآن کے الفاظ میں' وارثِ کتاب قرار دیا گیا' اس کے لیے تو قدم قدم پر یہ **القیامۃ** ہے' یہ جو قیامتِ موجود ہے اس کا دیکھنا بڑا ضروری ہے۔

مردہ قوم کو لفظ قم یا القیامۃ کا ادراک ہی نہیں ہوتا

عزیزانِ من! ہر آن میں' اصل میں' تو ہر سانس میں' انسان کے اندر ایک قیامت پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ ہر دَور میں ہوتی ہے' ہر آن میں ہوتی ہے' امت زندہ ہونی چاہیے۔ مردہ کے لیے تو یہ قیامت ہوتی نہیں ہے۔ اٹھنا تو زندگی کے ساتھ ہے۔ مردہ قوم تو جانتی ہی نہیں ہے کہ یہ قیامت ہوتی کیا ہے؟ یہ زندہ قوم کے لیے تھی۔ اگر یہ امت جو وارثِ کتاب ہے زندہ قوم ہو یا زندہ قوم ہو جائے' تو اسے معلوم ہو کہ یہ **الــقیــامۃ** کیا ہوتا ہے۔ میں نے **الــقیــامۃ** کے سلسلے میں عرض کیا ہے کہ یہ تدبر فی القران کی بات ہے کہ فلاں مقام پر قرآن کی اصطلاح سے کیا مفہوم لیا جانا چاہیے' کیا مفہوم موزوں ہے' یہ لے لیجیے یا دوسرا لے لیجیے' تو یہ بات نہ کوئی تنازع کی ہے' نہ خصومت کی' نہ یہ جھگڑے کی بات ہے۔ یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے' یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے بشرطیکہ یہ قرآن کی جو بنیادی تعلیم ہے اس کے خلاف نہ ہو۔ وہ اس کے مطابق ہے جو جس انداز سے بھی بات کو سمجھا جائے۔ یہی تو فکر اور تدبر کے لیے ہے جو قرآن نے راستے کھلے رکھے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ اس پر کفر کے فتوے نہیں لگنے چاہئیں۔

ہمارے ہاں کفر کے فتوے

ہمارے ہاں تو کفر کے فتوے اس پہ بھی لگتے ہیں کہ آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیے یا آہستہ دھیمی آواز سے۔ یہ تدبر فی القرآن تو بڑی چیز ہے بشرطیکہ وہ قرآن کے حدود کے اندر ہو۔ اس کے راستے کھلے ہیں اور اس تدبر کا قیامت تک کے لیے حکم ہے۔ یہی نہیں ہے کہ اس چیز کی اجازت ہے' قرآن کی حامل قوم پر اس چیز کا حکم ہے کہ وہ تدبر کرے۔ تو ہر دور میں قرآن کے اندر تدبر ہوگا۔

کسی دَور یا فرد کا تدبر آنے والے دَور یا فرد کے لیے سند نہیں ہوسکتا

عزیزانِ من! کسی دَور کا تدبر' کسی ایک فرد کا تدبر' آنے والوں کے لیے سند نہیں ہوسکتا کہ وہ اس کی پابندی کریں اور اُسے غیر متبدل سمجھیں۔ غیر متبدل تو صرف کلمات اللہ ہیں۔ انسانوں کی فکر' ان کا تدبر' ان کا غور' ان کا استنباط' ان کے لیے ہوئے معنیٰ' کسی دوسرے کے لیے نہ تو واجب ہوجاتے ہیں اور نہ ہی ہر دَور کے لیے غیر متبدل ہوسکتے ہیں' ورنہ یہ جو تدبر فی القران کا حکم ہے وہ تو ایک خاص دَور پر آ کر ختم ہوجائے گا۔ تدبر فی القرآن کا یہ راستہ اس طرح سے کھلا رہتا تو معلوم نہیں کہ ایک ہزار سال میں قرآن کے کس قدر حقائق بے نقاب ہو کر آج ہمارے سامنے آئے ہوتے لیکن ہم تو وہی ہزار سال پہلے کے دَور پہ رکے ہوئے ہیں' جبکہ انسانی علم کہیں کا کہیں چلا گیا ہے۔ جسے قرآن فطرت کے اشارے کہتا ہے وہ ہم بے نقاب نہیں کرسکے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم فطرت کے حقائق کو بے نقاب کرتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ بات واضح طور پر تمہارے سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ فطرت کے نقاب تو اس دوران اٹھتے گئے' ہم نے ہی آنکھیں بند کررکھی تھیں۔ ہمیں یہ کہا گیا تھا کہ تم آنکھیں نہیں کھول سکتے جبکہ ہماری آنکھیں ہزار برس پہلے کھل گئیں تھیں۔ میں یہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق نہیں عرض کررہا۔ وہ تو مقام ہی کچھ اور ہے۔ وہ نبوت کا مقام ہے۔ ان کے بعد انسانوں کا جو مقام ہے' تدبر ان کے لیے تھا۔ تدبر کے دروازے کھلے ہونے چاہئیں' ہر دَور میں' ہر فرد کے لیے کھلے ہونے چاہئیں اور اس میں کوئی بات ناراضی اور غصے کی نہیں ہے کہ تمہارے تدبر کا نتیجہ میرے تدبر کے نتیجے سے مختلف کیوں ہے۔ یہ سمجھنے اور افہام وتفہیم کی بات ہے۔ اگر اس میں فرق ہو تو آپس میں سمجھ لینا چاہیے کہ جو بہتر نظر آئے' جو زیادہ حقائق کے نزدیک ہو' جو قرآن کی تعلیم سے زیادہ قریب ہو' وہ بہتر تدبر ہے مگر Final (حرفِ آخر) وہ بھی نہیں ہے۔ آخری حرف تو حقیقت میں صرف قرآن کے کلمات اللہ ہیں۔ اس لیے **القیامۃ** کے دونوں مفاہیم میں سے جو مفہوم بھی کوئی لینا چاہے' لے لے۔ وہ انقلاب جو اس دَور میں ہوا' یا وہ جو مرنے کے بعد ہوگا' **القیامۃ** ہے۔ اسے بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے **لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ** (75:1) ان سے کہو کہ نہیں' بات یوں نہیں ہے جیسے تم خیال کیے بیٹھے ہو کہ ہم جس طرح جی میں آئے کریں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ میں دورِ قیامت کو شہادت میں پیش کرتا ہوں' جب اعمال کے ظہور نتائج کا وقت آئے گا۔ **وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ** (75:2) اور اس شخص کو اس پر شاہد ٹھہراتا ہوں جو اپنی غلطی کے احساس

سے نادم ہو[1] (12:53) کہ خدا کا قانونِ مکافات ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ بر آمد کرتا ہے خواہ وہ اس دنیا میں اس کے سامنے آجائے' خواہ مرنے کے بعد۔

نفسِ انسانی پر تحقیق

عزیزانِ من! بات یہ ہے کہ شہادت میں نفسِ لوامہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بات ذرا تفصیل طلب ہے۔ پہلی چیز تو یہی ہے کہ قرآن میں یہ جو نفس ہے یہ شروع سے آخر تک چلا آ رہا ہے۔ اگرچہ عربی زبان کے اعتبار سے اس لفظ کے بہت مختلف اور متعدد معنی ہیں' لیکن جب یہ چیز انسان کے ضمن میں آئے گی تو یہ ایک عجیب چیز ہے کہ جس کے متعلق بتایا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ ہے کیا؟ اس میں شبہ نہیں کہ مغرب کے علم النفس کے ہاں یہ ایک الگ علم ہی کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ انہوں نے بڑی تحقیق کی اور سائیکالوجی کے انداز سے کیے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے ہاں Soul[2] (روح) کا اور سائیکی Psyche کا قصہ چلا آ رہا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی یہ کہا ہے کہ کسی زمانے میں' یونان کی فکر میں' اسے Soul یعنی روح کہا' عیسائیت میں آ کر اسے Spirit[3] کہا۔ اس کے بعد' علم کی دنیا میں آئے' تو اِسے Mind کہا۔ Mind سے بھی آگے بڑھے' اس سے کام نہیں چلا' پھر اسے (Psyche) سائیکی کہا۔ یہ ان کے ہاں کی چیز آ گئی۔ اس پر تحقیق ہو رہی ہے یعنی یہ بات یہ ہے کہ ایک تو انسان کا جسم ہے' جسے Physical Body (طبعی جسم) کہتے ہیں۔ یہ فزیکل باڈی (طبعی جسم) حیوانی سطح کی چیز ہے' اس کے تقاضے وہی ہیں جو ہر حیوان کے تقاضے ہیں: کھانا' پینا' زندہ رہنا' اولاد پیدا کرنا' ایک وقت کے بعد پھر اس مشینری کا بند ہو جانا' مر جانا۔ اسمیں کوئی بھی خصوصیت انسان کی نہیں ہے' یہ اسی سطح کی چیز ہے لیکن اس میں ایک چیز ایسی ہے جو اس سے پہلے کی ارتقائی سطح میں جو Life یا زندگی رہی ہے' یعنی حیوانات کی سطح تک بھی لیجیے' وہاں یہ نہیں ہے اور وہ ہے اختیار اور ارادہ۔

---

[1] یہ جو کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک قوت ہے جو حق اور باطل کی تمیز کر دیتی ہے (اسے ضمیر کی آواز کہتے ہیں) یہ غلط ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو مطلق حق اور باطل میں از خود تمیز کر دے۔ مطلق (Absolute) حق اور باطل کی تمیز وحی خداوندی کی رو سے ہوتی ہے۔ جب کسی شخص سے کسی ایسے فعل کا ارتکاب ہو جائے جو اس بات کے خلاف ہو جسے وہ حق سمجھتا ہے تو اس سے اسے احساسِ ندامت ہوتا ہے۔ اسے آپ ضمیر کی آواز کہہ سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جسے وہ حق سمجھتا ہے وہ فی الواقعہ حق ہو اور جسے باطل سمجھتا ہے' فی الواقعہ باطل (نیز دیکھیے 12:53)۔ پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوع اسلام ٹرسٹ رجسٹرڈ' لاہور' ص۔1386 فٹ نوٹ نمبر 1۔

[2] William Mc Dougall نے بھی زندگی کے اس واسطے کو Soul (روح) کہہ کر پکارا۔

[3] یاد رہے کہ مغرب میں Matter (مادہ) کے مقابلہ میں Spirit کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جس سے مقصود غیر مادی (Immaterial) اشیاء ہوتی ہیں۔

انسان کے لیے اختیار وارادہ کی صلاحیت اور توانائی

اب یہاں دو Possibilities (ممکنات) سامنے آئی ہیں: دو راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنا اور دوسرا چھوڑ دینا۔ یہ ایک چیز ہے۔ حیوانات تک میں جبلت (Instinct) ہے، وہ ایک ہی راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کے ہاں Choice (اختیار) نہیں ہے۔ یہ بکری کے اختیار میں نہیں ہے کہ کبھی جی میں آئے تو گھاس چر لے، کبھی جی میں آئے تو گوشت کھالے۔ بکری بیچاری تو بکری ہوتی ہے، یہ تو شیر کے اختیار میں بھی نہیں ہے کہ اگر کبھی بھوکا مر رہا ہو تو گوشت چھوڑ کر انگور کھانے شروع کر دے۔ اب یہاں یہ چیز آئی ہے کہ انسان کو صاحبِ اختیار بنایا، اسے کام کے لیے ارادہ دیا یعنی پہلے تو یہ ایک چیز کی کہ اسے Choice (اختیار) دیا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ طے کیا جائے کہ کونسا راستہ ہے۔ اس پہ چلنے کا ارادہ کیا جائے یہ خداوندی صفت ہے۔

روح کا مفہوم

عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ انسان کو خدا کی ''روح'' میں سے ایک شمہ ❶ دیا گیا۔ ''روح'' کے معنی توانائی ہوتا ہے۔ اصل توانائی تو یہ ہے کہ آپ خود اپنے ارادے سے ایک چیز کو اختیار کریں۔ یہ بہت بڑی قوت ہے۔ یہاں مجبوری نہیں ہے۔ یہ جو خدائی صفت کا ایک شمہ انسان کو دیا گیا تھا، یہ اس کا اختیار وارادہ ہے۔ قرآن نے اس کو ''نفس'' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اس کے طبعی جسم کی پیداوار نہیں ہے، نہ ہی یہ طبعی جسم سے متعلق جو قوانین ہیں، مثلاً کھانے پینے کے، مریض ہوجانے کے، شفاء پالینے کے'' اس سے کوئی تعلق ہے۔ یہ طبعی جسم صرف فزیکل یا طبعی چیز ہے۔ اس کا تعلق ان سے بھی نہیں ہے، یہ ان قوانین سے بھی ماوراء ہے۔ یہ فیصلہ کرتا ہے، ارادہ کرتا ہے، انسان کے طبعی جسم کو عمل کے لیے آمادہ کرتا ہے، تقویت پہنچاتا ہے، اور اپنے فیصلے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ جو انسان کا کوئی کام یا کوئی عمل ہے، اس کی ذمہ داری جس پہ آتی ہے یہ وہ ہے، جسے نفس کہا گیا ہے: فیصلہ کرنے والا، ارادہ کرنے والا۔ پھر یہ وہ ہے جس پر انسان کے عمل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، یہی ہے، وہ جسے قرآن نفس کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ انگریزی زبان میں بھی اس کے لیے یکے بعد دیگرے اتنے الفاظ، اتنی اصطلاحات، اختیار کی گئیں اور پھر Discard (رد) بھی کر دی گئیں، مگر ابھی تک بات نہیں بنی۔

---

❶ ایک مرحلہ تک طریقِ تخلیق، حیوانات اور انسانوں میں مشترک چلا آتا ہے۔ اس کے بعد، انسان کی صورت میں، ایک انقلابی تبدیلی (Emergent Evolution) واقع ہوتی ہے، جس میں اس کا تخلیقی سلسلہ حیوانات سے یکسر مختلف ہو جاتا ہے۔ یعنی خدا، انسان کو اپنی الوہیاتی توانائی (Divine Energy) کا ایک شمہ عطا کر دیتا ہے۔ اسے انسانی ذات (Human Personality) کہا جاتا ہے، جو صاحبِ اختیار وارادہ ہوتی ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھیے: (32:9)۔

وہ ''میں'' کیا ہے

عزیزانِ من! قرآن اسے ''نفس'' کہہ کر پکارتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیا ہے؟ اسے تو آپ چھوڑ دیجیے۔ یہ سوچیے کہ آپ جو کہتے ہیں کہ میں نے یہ کیا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ ''میں'' ❶ کیا ہے جس نے یہ کیا ہے۔ علمی بحث کو چھوڑ دیجیے۔ اصل یہ ہے کہ ہم نے سوچنا چھوڑ دیا ہوا ہے' ورنہ اگر ہم سوچتے تو اس علمی بحث میں جانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ یہ کیا بات ہے! جو ہم کہتے ہیں کہ یہ ''میں'' نے کیا ہے۔ ''میں'' اس کا ذمہ دار ہوں۔ اس ''میں'' سے مراد کیا ہے؟ اگر آپ کے ہاتھ نے چوری کر کے کوئی چیز جیب میں ڈال دی ہے تو یہ ہاتھ تو وہ ''میں'' نہیں ہے۔ آپ یہ نہیں کہتے کہ یہ میرے ہاتھ نے کیا ہے' میں نے نہیں کیا۔ یہ ''میں'' کیا ہے؟ آپ اس علمی مخمصے میں جائیے ہی نہیں۔ جسے آپ کہتے ہیں کہ ''میں'' نے کیا ہے بس وہی تو نفس ہے۔ وہ انسان کا طبعی پیکر نہیں ہے' ہاتھ نہیں' پاؤں نہیں' آنکھ نہیں' کان نہیں۔ وہ یہ چیزیں نہیں ہیں لیکن یہ ان سے الگ بھی نہیں ہیں' اس نے چوری کرنے کا فیصلہ کیا ہے' اس کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا ہے' ہاتھ نے پکڑا ہے' ہاتھ نے چوری کی ہے' ہاتھ جیب میں ڈلا ہے' پاؤں سے بھاگا ہے۔ وہاں سے لے کر یہ ساری چیزیں تو ٹھیک ہیں۔ یہ ایک مشینری ہے' ذرائع ہیں' اس نفس کے فیصلے کے بروئے کار لانے کے۔ تو ذمہ داری تو اس پہ عائد ہوتی ہے جس نے وہ فیصلہ کیا ہے یا وہ ان سے سارا کچھ کرا رہا ہے۔ اسی لیے قرآن اسے ذمہ دار قرار دیتا ہے اور اگلی چیز یہ ہے کہ جسم کی موت کے ساتھ وہ مرتا نہیں ہے۔ وہ اپنی ان تمام ذمہ داریوں کی گٹھڑی لیے ان کے نتائج بھگتنے کے لیے آگے چلا جاتا ہے: اگر یہ اعمال اچھے ہیں تو ان کی آسائشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے' اور اگر برے ہیں تو ان کے اثرات بھگتنے کے لیے۔ یہ مرتا نہیں ہے۔ یہ اس کی خصوصیت ہے۔ حیوانی سطح زندگی تک حیوان کا جسم مرتا ہے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ انسان میں پہنچ کر اس کا جسم مرتا ہے' اس کا ''میں'' نہیں مرتا۔ یہ ''میں'' اپنی ذمہ داریوں کو لیے ہوئے آگے چلا جاتا ہے۔

---

❶ پروفیسر آرون شروڈنگر (Erwin Schrodinger :1887-1961) نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے لیکن بڑی اہم ہے۔ اس کا نام ہے: What is Life? جو حضرات اس موضوع سے دل چسپی رکھتے ہوں' وہ اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ وہ اس کتاب کے خاتمہ پر لکھتا ہے: ''میں'' کسے کہتے ہیں؟ اگر آپ ''میں'' کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ انسانی تجارب اور حافظہ سے کچھ زیادہ کا نام ہے۔ یہ وہ پردہ ہے جس پر انسانی حافظہ اور تجربہ کے نقوش جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی داخلی دنیا کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جسے آپ ''میں'' Porsonality Self,Imness کہتے ہیں۔ اس بنیاد کا نام ہے جس پر تجربے اور حافظے کی عمارت اٹھتی ہے...... اگر کوئی ماہر عمل تنویم (Hypnotist) ایسا بھی کر دے کہ تمہاری تمام سابقہ یادداشت یکسر ذہن سے محو ہو جائے پھر تم دیکھو گے کہ اس سے تمہاری ''میں'' کی موت واقع نہیں ہو جائے گی۔ لہٰذا انسانی ذات (Human Self) کی ہستی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

انسانی نفس کی مختلف اقسام اور خصوصیات

عزیزانِ من! اب اس نفس پر آجایئے۔ ہمارے ہاں بھی عام طور پر تین نفس گنے جاتے ہیں: نفسِ امارہ ❶ نفسِ لوامہ ❷ اور نفسِ مطمئنہ ❸۔ قرآن میں ان تینوں کا ذکر ہے لیکن ہمارے ہاں کی اصطلاح اور قرآن کی اصطلاح میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ہمارے ہاں ایسا ہے جیسا کہ یہ تین الگ الگ نفس ہیں: نفسِ امارہ انسان کو برائی کے لیے آمادہ کرتا ہے' نفسِ لوامہ انسان کو اُس بات پر ٹوکتا ہے' ملامت کرتا ہے جو اس نے برا کام کیا ہے اور نفسِ مطمئنہ وہ ہے' جو اس اضطراب سے' اس کشمکش سے' آگے چلا جاتا ہے' وہ اطمینان سے بیٹھا رہتا ہے۔ گویا ہمارے ہاں کچھ تصور ایسا ہے جیسا انسان کے اندر الگ الگ یہ تین نفس ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ تینوں اسی ایک ہی نفسِ انسانی کی الگ الگ خصوصیات ہیں' الگ الگ Aspects (گوشے) ہیں' الگ الگ Chracteristics (خصوصیات) ہیں' الگ الگ Functions (افعال) ہیں۔ یہ تمام اسی ایک ہی نفس کی مختلف خصوصیات ہیں۔ وہی نفس ہے جو یہ سب کچھ کرتا ہے۔

نفسِ امارہ کیا ہے؟

عزیزانِ من! سمجھنے کی بات ہے۔ پہلے تو یہ عرض کر دوں کہ نفسِ امارہ کا ذکر سورۃ یوسف میں آیا ہے۔ وہ قول' ویسے تو عزیز کی بیوی سے منسوب ہے۔ اس نے یہ کہا تھا کہ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ❹ (12:53)۔ عزیز کی بیوی نے جب اپنی لغزش کا' اپنے جرم کا' اپنے گناہ کا' اعتراف کیا تھا' تو اس نے یہ کہا تھا کہ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ (12:53) میں اپنے آپ کو بری الذمہ نہیں قرار دیتی۔ اصل یہ ہے کہ قرآن نے اس کے یہ الفاظ کوٹ (نقل: Quote) کیے ہیں کہ یہ جو نفس ہے' یہ برائی کے لیے آمادہ کرتا رہتا ہے' اکساتا رہتا ہے' حکم دیتا رہتا ہے۔ یہ ہے امارہ' جہاں یہ لفظ آیا ہے۔ یہیں قرآن نے ایک بات بڑھائی ہے۔ خواہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے' اپنی طرف سے یہ بات کہی ہے یا یہ اسی عزیز کی بیوی کا قول نقل ہے لیکن کہا یہ ہے کہ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ❺ (12:53)۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ بنیادی طور پر وہ نفس یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ انسان کو برائی کی طرف ہی لے جاتا ہے۔ یہاں قرآن نے عیسائیت کے ایک عقیدے کو کاٹ کے رکھ دیا۔ عیسائیت میں یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ گناہگار پیدا ہوتا ہے۔ قرآن نے یہ کہا کہ یہ جو انسان کا نفس ہے وہ

---

❶ نفس الامارہ صرف 12:53 میں آیا ہے۔
❷ نفس اللوامۃ صرف 75:2 میں آیا ہے۔
❸ نفس المطمئنۃ صرف 89:27 میں آیا ہے۔
❹ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے حیوانی جذبات اسے برائی کے لیے اکساتے رہتے ہیں۔ اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا رحم کرے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)
❺ اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا رحم کرے۔ (ایضاً)

برائی کی طرف بھی لے جاتا ہے لیکن جس پہ خدا کی رحمت ہو' خدا کا رحم ہو' وہ یہ نہیں کرتا۔ تو بنیادی طور پر یہ نفس کی چیز نہیں ہوئی کہ وہ برائی کی طرف لے جاتا ہے۔ برائی کی طرف وہ نفس لے جاتا ہے جو رحمِ خداوندی میں نہیں ہوتا۔ وہ میں الگ عرض کرونگا کہ یہ کیا چیز ہوگئی۔ قرآن تو' عزیزانِ من! دو دو لفظوں میں اس قدر بنیادی حقائق بیان کر جاتا ہے۔ یہ عیسائیت کا اتنا بڑا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدائشی گنہگار پیدا ہوتا ہے۔ قرآن نے بھی' خواہ یہ اسی عزیز کی بیوی کا قول نقل تھا' کہا کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (12:53)۔ امارہ کے معنی ہیں ''بڑی شدت سے امر کرنے (اکسانے) والا''۔ لیکن اس کے بعد قرآن نے فوراً یہ کہہ دیا کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ نفس کرتا ہی یہ ہے' وہ ہوتا ہی اس کام کے لیے ہے' وہ گناہ کے لیے ہی آمادہ کرتا ہے' وہ ہمیشہ جرم کی طرف آمادہ کرتا ہے بلکہ یہ کہا کہ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (12:53) اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا رحم کرے۔

عزیزانِ من! درمیان میں آپ ادھر نفسِ مطمئنہ کی طرف چلے جائیے' لوامہ کی طرف میں بعد میں آؤنگا۔

نفسِ مطمئنہ کیا ہے؟

نفس کی تیسری اسٹیج مطمئنہ ہے۔ یہ قرآن کی اصطلاحات ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ان کے بنیادی معنی کی طرف جائیے تو انسان جھوم جاتا ہے۔ یہ ہے وہ نفس قرآن جو انسان کو جنت میں جانے کے لیے کوالیفائیڈ کر دیتا ہے کہ ہاں یہ ہے اصل مستحق۔ جسے جنت میں جانا ہے' اس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً o فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ o وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ❶ (89:27-30)۔ یہ ہے نفسِ مطمئنہ کی' Balanced Mind (متوازن نفس) کی' وہ اسٹیج جس میں کوئی اضطراب نہیں' ریب نہیں' کشمکش نہیں۔ اطمینان سے یکسو ہو گیا ہے' صحیح فیصلے کیے ہیں' صحیح مقام حاصل کیا ہے اور یہی وہ مقام ہے کہ جس کو وہ کہتا ہے کہ جنت میں جانے کا اہل ہو گیا' قرآنِ کریم نے اسے اس کے لیے کوالیفائیڈ کر دیا' وہ جس کے قابل ہو گیا۔

---

❶ وہ شخص جس نے قانونِ خداوندی کے اتباع سے' سکونِ گہر کی طرح' دل کا صحیح اطمینان حاصل کر لیا ہو (13:28) یعنی جس کی ذات میں' صحیح نشو و نما سے' پورا پورا توازن پیدا ہو چکا ہوگا (91:9) اُس سے کہا جائے گا کہ تیرا طریقِ زندگی قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ تھا' اس لیے تیری زندگی پسندیدہ خوش گواریوں کی حامل ہوگی۔ تجھے تیرے نشو و نما دینے والے کی طرف سے حسبِ منشا آسائشیں حاصل ہوں گی۔ (لیکن اے رسولؐ! انہیں متنبہ کر دو کہ یہ چیز انفرادی طور پر حاصل نہیں ہو سکتی' اجتماعی زندگی سے ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ) تم ان لوگوں کی جماعت میں شامل ہو جاؤ جنہوں نے خدا کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے یعنی جماعت مومنین میں۔ اور اس طرح اس جنتی معاشرہ میں داخل ہو جاؤ جو اس کے قانون کے مطابق متشکل ہوا ہے (9:119)۔ (اس دنیا میں بھی جنتی زندگی اور آخرت میں بھی جنتی زندگی۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

جنت ہو یا جہنم، اس میں اجتماعی طور پر ہی جانا ہوتا ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ یہ قرآن ہے، یہ کہیں بھی، کوئی بھی بات بیان کرے، وہ جو اس کا اپنا اصل مقصد ہے، اسے بیچ میں، ساتھ لے آتا ہے۔ یہ یہاں بھی لے آیا کہ یہ جنت یا جہنم میں جانا انفرادی چیز نہیں ہے، اجتماعی ہے۔ جسے آپ نجات کہتے ہیں وہ ہر فرد کی الگ الگ نہیں ہوتی۔ یہ روحانیت نہیں ہے کہ ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی۔ جب تک خود نہ پیو، پتہ ہی نہیں چل سکتا کہ یہ کیا ہے۔ یہ خانقاہیت نہیں ہے، یہ عیسائیت نہیں ہے، یہ Mysticism (باطنیت) نہیں ہے، یہ تو جنت میں جانا ہے۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ **فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ** (89:29) دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر جانا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے، عزیزانِ من! کہ قرآن کا کوئی مقام بھی آتا ہے جو اس کی اصل تعلیم ہے وہ اس کو ضرور فوکس (Focus) کر کے سامنے لاتا ہے۔ یہاں کہا کہ نفسِ مطمئنہ تو انفرادی ہے، ہر فرد کا اپنا اپنا ہے۔ ساری دنیا کے مذاہب یہی کہتے ہیں کہ اگر ہر فرد اپنے آپ میں پاکیزگی اختیار کر لے تو وہ نجات (Salvation) کے قابل ہو جائے، ترقی کے قابل ہو جائے، مکتی کے قابل ہو جائے۔ اگر ایسا کر لے تو اس فرد کی مکتی ہو جاتی ہے۔ فرد کا تزکیہ، پاکیزگی، سیرت کی بلندی، قرآن کا بھی مقصود ہے۔ وہ یہ کچھ کرنے کے لیے نفس کو کہتا ہے لیکن یہ ضرور واضح کر دیتا ہے کہ اس سے نجات نہیں ہوتی۔ یہ ایک ہیئت اجتماعیہ چاہتا ہے۔ ایک فرد تنہا جنت میں نہیں جاتا ہے، جماعت کے ساتھ جاتا ہے، جہنم میں بھی جماعت کے ہی ساتھ جاتا ہے۔ یہ سب کچھ قرآن میں ہے۔ آجکل جس جہنم کے اندر دنیا ہے اور بالخصوص ہم ہیں وہ تو آپ کو یاد ہے۔ ہمارے ہاں کا ایک ایک فرد جنت میں نہیں ہے بلکہ پوری کی پوری قوم جہنم کے اندر ہے۔ اور اگر کوئی یہ چاہے کہ جہنم میں کوئی ایک فرد جنتی ہو جائے تو وہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تو پوری جماعت کو ہونا ہوگا: یا جنتی ہونا ہوگا یا جہنمی ہونا ہوگا۔ میں یہ بات عرض کر رہا تھا کہ قرآن کوئی بات بھی کہے، کوئی حقیقت بھی بیان کرے، وہ جو اصل مقصود ہے، وہ اسے ضرور ساتھ لے آتا ہے۔ یہاں کہا کہ **فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ** [1] (89:29-30)۔ جنت میں جانے کا یہ طریقہ ہے اور یہ ہے نفسِ مطمئنہ۔

نفسِ لوامہ اور انسانی ضمیر کی تشریح

اب آیئے نفسِ لوامہ کی بات کی طرف۔ اس کے معنی ہیں: ملامت کرنے والا۔ ہمارے ہاں ایک عام چیز ہے اسے ضمیر کی آواز کہا جاتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اپنے ضمیر سے پوچھو۔ ضمیر کی آواز کا شہرہ ہے اور کہتے ہیں کہ ضمیر کی آواز پر چلنا چاہیے، گویا ضمیر کوئی ایسی چیز ہے جو ہمیشہ صحیح بات کہتی ہے، جائز کہتی ہے، سچی بات کہتی ہے، حقیقت کی بات کہتی ہے۔ یعنی انسان کے اندر کوئی ایسی چیز رکھی ہوئی

---

[1] تم ان لوگوں کی جماعت میں شامل ہو جاؤ جنہوں نے خدا کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے، یعنی جماعت مومنین میں تو اس طرح اس جنتی معاشرہ میں داخل ہو جاؤ جو اس کے قانون کے مطابق متشکل ہوا ہے (9:119)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے جو غلط اور صحیح، حق اور باطل میں امتیاز کر دیتی ہے اور پھر انسان کو یہ بتا دیتی ہے کہ حقیقت کی بات کیا تھی۔ عزیزانِ من! انسان کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ حق اور باطل کی تمیز کر سکے۔ اگر یہ چیز انسان کے اندر ہوتی تو کسی فرد کو وحی کی ضرورت ہی نہ پڑتی، رسول کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ ہوتا یہ کہ انسان کے اندر یہ چیز موجود ہے، خود فیصلہ کر لے۔ حیوانات کی زندگی میں یہ بات ان کے اندر ہے۔ اس چیز کی میں مثال دیا کرتا ہوں کہ مرغی کے نیچے آپ کچھ بطخ کے اور کچھ مرغی کے انڈے رکھ دیجیے، کچھ وقت کے بعد جب ان سے چوزے نکلیں گے تو مرغی کے چوزے تو خشکی کی طرف بھاگیں اور بطخ کے چوزے پھڑک کر پانی کی طرف چلے جائیں گے۔ ان دونوں کو کس نے بتایا ہے؟ یہ غلط اور صحیح کی تمیز، یہ حق اور باطل کا امتیاز انہیں کس نے بتایا ہے؟ کوئی رسول تو ان کی طرف نہیں آیا۔ یہ چیز ان کے اندر رکھی ہوئی ہے، جسے جبلت کہتے ہیں، Instinct کہتے ہیں۔ یہ ہے ان کے اندر رکھی ہوئی بات۔ اس قسم کی کوئی چیز انسانی بچے کے اندر نہیں رکھی ہوئی۔ اس کو دیکھیے، بچہ ذرا گھٹنوں چلنے لگے، ماں کے لیے مصیبت بن جاتا ہے: وہ چولہے میں ہاتھ ڈال دیا، وہ مرچیں کھا گیا، آنکھوں میں لگا لیں، چیں چیں کر رہا ہے، پھر اس کے بعد ادھر سے اترا تو پانی میں ڈبکیاں لے رہا ہے۔ حیوان کا کوئی بچہ ایسے نہیں کرتا۔ مرغی کا چوزہ کبھی پانی کی طرف نہیں جاتا ہے۔ یہ یہی حضرت اشرف المخلوقات ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کدھر دیکھیں گے، کیا کریں گے۔ اسی لیے رہنمائی کے لیے اسے خارج سے ضرورت پڑی ہے: وحی کے ذریعے، انبیائے کرام کے ذریعے، یہ بتانے کی کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔

ایک چیز تو اضافی ہوتی ہے جیسے اچھی اور بری، غلط اور صحیح کہتے ہیں۔ اسے Relative (اضافی) کہتے ہیں اور دوسری چیز وہ ہوتی ہے جسے کہتے ہیں کہ وہ فی الواقعہ ایک چیز ہے، فی الواقعہ وہ ایسی ہوتی ہے۔ اسے مطلق کہتے ہیں، اسے Absolute کہتے ہیں۔ جیسے خیر اور شر جیسے غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز یعنی یہ کہ ایک چیز فی الواقعہ ناجائز ہے، غلط ہے، باطل ہے۔ دوسری یہ چیز ہے کہ موقعہ محل کے لحاظ سے آپ کے نزدیک وہ اچھی ہے۔ آپ نے جس گاؤں میں جانا ہے، اُس کے لیے آپ نے چوراہے سے وہ راستہ اختیار کیا جو گاؤں لے جائے تو وہ صحیح راستہ ہے لیکن یہ اسی صورت میں صحیح ہے کہ جس گاؤں کی طرف آپ نے جانا ہے یہ اس طرف جاتا ہے۔ اگر آپ دوسرے راستے پہ چل پڑے جو اس طرف نہیں جا رہا تو یہ راستہ غلط ہے۔ وہ راستے تو دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔ ان میں سے نہ کوئی صحیح راستہ ہے، نہ کوئی غلط راستہ ہے۔ آپ نے خود جس طرف جانا ہے اس کے لحاظ سے وہ صحیح اور غلط ہو جاتا ہے۔ اسے اضافی (Relative) کہتے ہیں تو دوسرا راستہ جو آپ کو مطلوبہ گاؤں تک لے جائے وہی آپ کے لیے صحیح ہوگا۔

مطلق خیر اور مطلق شر کا علم وحی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے

عزیزانِ من! عام درس سے باتیں یوں کچھ اِدھر اُدھر ہٹ جاتی ہیں لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ بات اسی سطح پر رکھوں کہ بزم میں

اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی تا کہ ہر ایک کی سمجھ میں بات آ جائے۔ انہیں کہتے ہیں اضافی یا Relative، اچھا یا برا ہونا۔ یہ فیصلہ انسان خود کر سکتا ہے۔ اپنے لیے خود ہی اس نے فیصلہ کیا کہ میں نے شہر کی طرف جانا ہے، یہ سڑک سیدھی جا رہی ہے۔ یہ سیدھی اس کے لیے صراطِ مستقیم بن جائے گی۔ اگر اس نے فیصلہ کیا کہ ماڈل ٹاؤن کی طرف جانا ہے تو یہ گمراہی ہو جائے گی۔ لیکن ایک چیز یہ ہے کہ وہ فی الواقعہ گمراہی ہے یا وہ فی الواقعہ صراطِ مستقیم ہے۔ یہ Relative (اضافی) نہیں ہے، یہ مطلق ہے۔ یہ چیز کہ اپنی حلال کمائی سے رزق حاصل کرنا ہے، یہ ہے صحیح، دوسرے کی محنت کو Exploit (سلب) کرنا ہے، یہ ہے باطل اور یہ ہمیشہ ہے، ہر حال میں ہے، ہر شخص کے لیے ہے، یہ بدل نہیں سکتی، یہ Relative (اضافی) نہیں ہو سکتی۔ آپ اپنے دوست کی عزت کرتے ہیں، کل ہی کو وہ دوست دشمن ہو جاتا ہے۔ پھر آپ اس کی عزت نہیں کرتے۔ یہ جو آپ نے عزت کی ہے، یہ Relative (اضافی) ہے۔ قرآن کا حکم ہے کہ ہر انسان واجب التکریم ہے۔ یہ مطلق ہے۔ اس میں اب یہ فیصلہ نہیں کرتے کہ یہ دشمن ہو گیا، یا یہ دوست ہو گیا، یا یہ اپنا ہے، یا بیگانہ ہے، یہ میری قوم کا ہے، یہ دوسری قوم کا ہے۔ یہ ایک حقِ مطلق ہے۔ یہ جو مطلق خیر یا مطلق شر ہے اس کا علم انسان کے اندر نہیں ہے۔ یہ صرف وحی کے ذریعے اس کو رسولوں کی معرفت، ملا ہے۔ چونکہ وحی اور رسالت ہندوؤں کے ہاں نہیں تھی یا کبھی آئی تھی مگر ان کے ہاں گم ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنا یہ دھرم بنا لیا کہ پیدائشی اعتبار سے ایک شودر پیدا ہوتا ہے، ایک برہمن پیدا ہوتا ہے، برہمن بچے کی ساری عمر عزت کی جائے گی، شودر کو جوتی کے تلے رکھا جائے گا۔ ان کے ہاں کا یہ دھرم ہو گیا۔ یہ باطل ہے۔ حق یہ ہے کہ ہر انسانی بچے کی پیدائش کے اعتبار سے کوئی نسبت نہیں ہے، کوئی اضافی بات نہیں ہے، اس کا انسان ہونا اُسے واجب التکریم بنا دیتا ہے، تکریم اس کا حق ہے۔

ضمیر کی آواز کیا ہے؟

عزیزانِ من! اب آیئے اس طرف جسے آپ ضمیر کی آواز کہتے ہیں۔ مسلمان کا بچہ گائے کا گوشت لذت لے لے کر کھا جاتا ہے، ہندو کے سامنے رکھیے، اُسے قے آ جاتی ہے۔ یہ کیا ہے؟ کیا یہ ان دونوں کے ضمیر کی آواز ہے؟ کسی نے ان ہندوؤں سے یہ نہیں کہا کہ اس سے بچو، یہ گائے کا گوشت ہے اور اس مسلمان کے بچے سے یہ نہیں کہا: ''کھا جاؤ''۔ کیا یہ اس کے اندر کی آواز ہے؟ کیا ہے یہ آواز؟ اس ہندو کے بچے نے، جس سوسائٹی میں، جس ماحول میں، جس معاشرے میں، پرورش پائی ہے، جو اس کے کان میں بچپن سے آواز آتی چلی گئی ہے، جو کچھ وہاں آہستہ آہستہ بتایا گیا ہے، یہ چیز اس کے تحت الشعور میں آ گئی: جو گائے کا گوشت ہے وہ ہم نے نہیں کھانا۔ یہ آواز اس کے کان میں پڑی۔ مسلمان بچے کے کان میں ہی نہیں پڑی، بلکہ گائے کا یہ گوشت گھر میں پکنا شروع ہوا ہے، اس نے اپنے ماحول کا یہ اثر لیا ہے، اُس نے اپنے ماحول کا وہ اثر لیا ہے، تو ضمیر تو اسی کا نام ہے۔ حقِ مطلق یا خیرِ مطلق یا شرِ مطلق کے لیے یہ فیصلہ کن چیز نہیں ہے۔ یہ تو جس ماحول میں وہ ضمیر پرورش پائے گی، جس ماحول میں پیدا ہو گی، جس ماحول کا اثر لے گی، اس قسم کی اس کی ضمیر بن جائے گی۔ یہ سارے

بت پرست ضمیر کی آواز پہ چلتے ہیں۔ ایک انسان کو یعنی ایک نبی کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے والے ضمیر کی آواز پہ چلتے ہیں۔ آپ اس کی مخالفت کرتے ہیں تو گویا ضمیر کی آواز پہ کرتے ہیں۔ مگر یہ چیز نہیں ہے۔

ضمیر کی آواز حق اور باطل کا فیصلہ نہیں کر سکتی

عزیزانِ من! جسے انسان کی ضمیر کی آواز کہا جاتا ہے وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرنے کا معیار نہیں ہے۔ جس قسم کے معاشرے میں کوئی پرورش پائے گا اسی قسم کی اس کی ضمیر ہو جائے گی۔ اور جب اس کے خلاف کوئی کام ہوگا تو اس کی ضمیر اس کے خلاف اِبا کرے گی اس کے خلاف نفرت کرے گی۔ یہ لوامہ ہوا۔ انسانی نفس کے اندر یہ بات ہے کہ وہ ملامت کرتا ہے۔

نفسِ لوامہ کا عمل

میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ جب آہستہ آہستہ آپ اس ابا کرنے کی پرواہ نہیں کرتے اسے دباتے چلے جاتے ہیں جذبات آپ پر غالب آتے چلے جاتے ہیں پھر وہ ملامت بھی نہیں کرتا۔ وہ جرائم عام ہو جاتے ہیں۔ یہ جتنے جرائم پیشہ ہیں پھر ان کا ضمیر ان کو ملامت نہیں کرتا بلکہ وہ انہیں قابلِ ملامت ہی نہیں سمجھتا۔ وہ جن چیزوں کو قابلِ ملامت بھی سمجھتا ہے وہ وہی ہوتی ہیں جو شروع سے اس کے ذہن میں ڈالی گئی ہیں کہ یہ غلط ہیں۔ اب یہ چیز سمجھ لیجیے کہ انسان کا ضمیر یا نفسِ لوامہ ان چیزوں پہ ملامت کرتا ہے جن کے متعلق پہلے سے اس کو بتایا گیا ہے کہ یہ بری ہیں۔ ٹھگوں کا بیٹا اس کی ایک مثال ہے۔ اسے بچپن سے تعلیم دی گئی ہے کہ جب تک تم ایک شخص کو مار نہ دو گے اس وقت تک تمہاری شادی نہیں ہو سکتی اور یہ بھی کہ یہ کالی دیوی کا حکم ہے۔ وہ مارتا ہے۔ وہ ایک شخص تو مارتا تھا۔ پتہ نہیں اب بھی مارتے ہیں یا نہیں۔ اب تو ساری دنیا ٹھگ ہو گئی ہے۔ الگ ٹھگوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ جس طرح اقبالؒ (1877-1938) نے ابلیس کی زبان سے لکھا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے درخواست دی کہ جی! مجھے اب ریٹائر کر کے چھٹی دیجیے میں گھر بیٹھوں۔ کہنے لگے: کیوں؟ کہنے لگا: اب تو ہر شخص شیطان ہے یہاں میری ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ تو اب الگ ٹھگوں کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن ان کے ہاں یہ عقیدہ تھا یہ ان کا دھرم تھا۔ ٹھگوں کا بچہ جب یہ جان لیتا تھا دوسرے کا گلا گھونٹتا تھا تو اس کا ضمیر اس کو ملامت نہیں کرتا تھا۔

ابلیس کی خدا سے چھٹی کی درخواست

عزیزانِ من! سوال یہ ہے کہ اس کا ضمیر اسے کیوں منع نہیں کرتا تھا؟ وہ ضمیر تو وہی تھا جو بچپن سے اس کو سکھایا گیا تھا سمجھایا گیا تھا۔ اس لیے وہ اس کی ملامت نہیں کرتا تھا۔ تو اسے یاد رکھیے کہ انسانی نفس کے اندر یہ ایک خصوصیت ہے۔ آپ میرے یہ الفاظ سن رکھیے کہ جس چیز کو وہ برا سمجھتا ہے اس پر وہ ملامت کرتا ہے۔ پھر سنیے! اگر وہ ضمیر زندہ ہے تو جس کو وہ برا سمجھتا ہے وہ اسے ہی برا کہتا ہے یہ نہیں ہے کہ جس چیز کو ضمیر برا کہہ دیتا ہے وہ فی الواقعہ بری ہوتی ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس نظامِ سرمایہ داری میں دوسروں کی محنت کو

Exploit (غصب) کرنا ہے، جو اس نظام کو صحیح سمجھتے ہیں، انہیں کبھی اس سلب و نہب کی کرک ہی نہیں آتی۔ وہ اسی نظام ہی سے تو زیادہ سے زیادہ نچوڑتے ہیں، ان کا ضمیر اس پہ انہیں ملامت نہیں کرتا۔ تو یہ سن رکھیے کہ ضمیر حق اور باطل کا فی الواقعہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ جس بات کو وہ حق سمجھتا ہے، اس کی تائید کرتا ہے، جسے وہ باطل سمجھتا ہے وہ اس کی تردید کرتا ہے، اس پر ملامت کرتا ہے، وہ بھی اس وقت تک جب تک وہ زندہ رہتا ہے۔ زندہ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ جرم عام ہو جاتا ہے تو پھر وہ امارہ بن جاتا ہے، اسے برائی کے لیے آمادہ کرتا رہتا ہے، اکساتا رہتا ہے۔ المختصر، لوامہ اس حد تک رہتا ہے جب تک وہ جس چیز کو برا سمجھے اس پہ وہ ٹوکتا رہے۔

نفس کے متعلق قرآن کی تعلیم

عزیزانِ من! اب آ گئی ۔نفس کے متعلق قرآن کی تعلیم۔ اس کے لیے کہا ہے کہ بچپن ہی سے بچے کو یہ تعلیم دو، یہ Environment (ماحول) دو، ایسا معاشرہ دو کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے برا کہا ہے، وہ اسے برا سمجھے، جسے اس نے اچھا کہا ہے، وہ اسے اچھا سمجھے۔ اب اس کی ضمیر کی آواز صحیح آواز ہو گی۔ یہ ہے وہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر شیطان کا گھومتا گھماتا خیال بھی کبھی ان کے سامنے آ جاتا ہے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کے اندر پناہ لے لیتے ہیں۔ ''گھومتا گھماتا خیال'' بھی آ جائے تو یہ اس لیے ہے کہ وہاں تعلیم، تربیت، پرورش ایسی ہوئی ہے کہ جو مطلق حق ہے اسے حق سمجھا ہے، جو مطلق شر ہے، باطل ہے، اسے شر اور باطل سمجھا ہے۔ کسی وقت ایسا ہو جاتا ہے یا ہو سکتا ہے کہ خیال نہ رہے، بھول جائے، سہو ہو جائے، نسیان ہو جائے تو کہا کہ **لَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا** [1] (28:77)۔ یہ وہ بات ہے مگر وہ ارادتاً یہ نہیں کرتا، جان بوجھ کر یہ نہیں کرتا، اسی کے لیے یہ کہا ہے کہ نسیان سے کبھی ہو سکتا ہے کہ ایک چیز جو باطل تھی، جو غلط تھی، اسے اس وقت غلط نہ سمجھا ہو لیکن جونہی وہ خیال آتا ہے جسے **اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ** کہتے ہیں، وہ خدا کے قوانین کے پروں کے نیچے پناہ لیتا ہے۔ عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو یہ **تعوّذ** محض رسم ہی رہ گئی۔ وہ بھی صرف اس وقت جب تلاوتِ قرآنِ کریم کی جائے اور وہ تلاوت بھی رسم ہے، اس سے پہلے یہ کچھ کہنا بھی رسم ہے، ورنہ یہ تعوذ بڑی چیز ہے۔

تعوذ کا مفہوم

تعوذ جو **عــوّذ** سے ہے، اس کا مادہ (Root) ''ع وذ'' ہے۔ آپ یہ دیکھیے کہ عرب اُسے کہاں استعمال کرتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب مرغی کے چوزے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، مرغی ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ انہیں چھوڑ بھی دیتی ہے تو وہ اِدھر اُدھر دانہ

---

[1] اسے نہ بھولو کہ زندگی صرف اِسی دنیا کی زندگی نہیں جس میں انسان کا منتہائے نگاہ مال و دولت جمع کرنا ہے اور بس، زندگی اس کے بعد بھی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دنکا چن رہے ہوتے ہیں۔ اگر چیل کا سایہ اوپر آ تا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح بھاگ کر مرغی کے پروں کے نیچے آ جاتے ہیں۔ ان بچوں کا اس طرح بھاگ کر مرغی کے پروں کے نیچے آ جانا **عوّذ** کہلاتا ہے۔ اب آپ **اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم** کا مطلب و مفہوم سمجھیے۔ اس ''چیل'' کے خطرے سے میں خدا کے قوانین کے پروں کے نیچے پناہ لیتا ہوں' اگر بھول کر بھی کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پھر یہ اعوذ چلتا چلتا کہاں آ گیا۔ یہ تعویذ کا لفظ وہیں سے ہی تو ہے۔

حضرت صاحب کا تعویذ

عزیزانِ من! اب آپ نے جو خطرات سے پناہ ڈھونڈی تو وہ یہ ہے کہ آپ حضرت صاحب کے اس ایک تعویذ کو گلے میں لٹکا کے چلیے' معاملہ ختم ہو گیا' نہ خدا کے قانون رہے' نہ وہ تعوذ' نہ اعوذ باللہ' نہ پھر وہ شیطان۔

تعویذ کا لفظ ہی **عوّذ** سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ تم کہاں پھر رہے ہو' ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ حفاظت کیسے ملے گی۔ حفاظت کے لیے تعویذ ڈالتے ہیں' آپ کے گلے میں ہی نہیں بلکہ اوتے دیوار نال ٹنگ دیندے ہیگے نیں۔ [1] اس سے سارا گھر ہی محفوظ ہو گیا۔ چل بھئی' خدا کا قلعہ بنا دیا' اعوذ باللہ حضرت صاحب کے تعویذ میں آ گیا۔ بڑا خوبصورت شعر ہے:

بہک بہک [2] کے کہاں آ گیا ہے دیوانے
مقامِ سود و زیاں آ گیا ہے دیوانے

بہک بہک [2] کے یہاں آ گیا۔

خدا کے قانون کے پروں کے نیچے آنا

عزیزانِ من! میں نفسِ لوامہ کی بات کر رہا ہوں۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ بچے کی تعلیم' تربیت' پرورش' ماحول' معاشرہ' ایسا کر دو جسے اب آج کی اصطلاح میں Unconscious Mind (نفس غیر شعوریہ) کہتے ہیں کہ اس کے نفسِ غیر شعوری کے اندر یہ چیزیں آ جائیں کہ یہ حق ہے' یہ باطل ہے' یہ خیر ہے' یہ شر ہے' یہ جائز ہے' یہ ناجائز ہے۔ اگر یہ چیز اس کے اندر موجود ہے تو وہ بالارادہ تو کبھی کرے گا ہی نہیں۔ یہ ہو گی ضمیر کی آواز۔ اگر کہیں بھول چوک سے' سہو و نسیان سے' بے خبری بے خیالی سے' غفلت سے' کوئی قدم غلط اٹھتا ہے تو اٹھنے کے فوراً ہی بعد' قرآن کہتا ہے کہ اگر وہ خیال گھومتے گھماتے بھی اس کے سامنے آتا ہے' تو فوراً اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے: غلط ہو گیا اور پھر وہ رکتا ہے' پھر وہ خدا کے قانون کے پروں کے نیچے آتا ہے' وہاں پناہ لیتا ہے' وہیں رک جاتا ہے' غلط راستے کے اوپر زیادہ قدم

---

[1] وہ تو اسے دیوار پر بھی لٹکا دیتے ہیں۔

[2] اگلے ہی درس میں (چوبیسواں باب) پرویزؒ نے اس شعر کے پہلے مصرعہ کی خود ہی تصحیح کر دی کہ یہ یوں ہے: بھٹک بھٹک کے کہاں آ گیا ہے دیوانے

نہیں چلتا' چند قدم کے بعد فوراً واپس آ جاتا ہے۔ یہ فوراً لوٹتا ہے اسے عربی زبان میں توبہ کہتے ہیں اور پھر یہ قرآن ہے' کہتا ہے کہ یہ نفسِ لوامہ تھا جس نے اس کو روک دیا کیونکہ اسکے اندر صحیح تربیت سے' تعلیم سے' خدا کی دی ہوئی یہ چیز رچ بس گئی تھی۔ کسی نے خود فیصلہ کر کے یہ نہیں دی تھی۔ اگر ماں باپ نے ہی فیصلہ کرنا ہوتا' تو ہندو اپنے بچوں کو وہی تعلیم دیتے ہیں' عیسائی اپنے بچوں کو وہی تعلیم دیتے ہیں' سب اپنے بچوں کو وہی تعلیم دیتے ہیں' ہم اپنے بچوں کو وہی تعلیم دے رہے ہیں مگر یہ وہ بات نہیں ہے۔

مطلق خیر اور مطلق شر وہ ہے' جو قرآن کا یا خدا کا بتایا ہوا ہے۔ اسی کی تعلیم و تربیت دی جائے۔ یہ تعلیم و تربیت صرف پڑھانے لکھانے کی ہی بات نہیں ہے' یہ تو جیسے انسان سانس لیتا ہے' اس طرح کی یہ ایک چیز ہے۔ انسان کے اندر یہ خیالات اور معاشرے میں یہ خیالات عام کیے جائیں۔ جب یہ نہ ہو تو صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ صاحب! کیا کیا جائے'' اب رشوت کے بغیر کام ہی نہیں چلتا'' ہر گھر سے یہ آواز آ رہی ہے' بچہ اسے سنے گا' اسے بیوی کہے گی کہ کیا آپ نے یہ جھوٹ بولا' فریب دیا؟ وہ کہے گا کہ ہو ہی یہ رہا ہے' اس کے بغیر بھوکا مرنا ہے۔ بچہ سن رہا ہے۔ اس کا ضمیر مرتب ہو رہا ہے' آپ اس کے ضمیر کو بنا رہے ہیں تو جب وہ بڑا ہوتا ہے تو پھر اس سے آپ یہ توقع کرتے ہیں کہ یہ غلط کو غلط کہے۔ کیسے کہے؟ جسے تم نے صحیح کہا تھا وہ اسے صحیح کہہ رہا ہے۔ تم نے ہر قسم کے فریب کو' ہر قسم کی Exploitation (سلب ونہب) کو' جائز قرار دیا تھا۔ وہ اسے جائز سمجھ رہا ہے۔ اب اس کا ضمیر تو ملامت نہیں کرے گا۔

ضمیر کے اندر فی الواقعہ کچھ نہیں

عزیزانِ من! نفسِ لوامہ کی یہ بات' میرا خیال ہے' آپ نے سمجھ لی۔ یہ بڑی اہم چیز ہے کیونکہ ہمارے ہاں یہ ایک غلط تصور ہے کہ ضمیر کی آواز انسان کو صحیح بات بتاتی ہے۔ نہیں' ضمیر کے اندر فی الواقعہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ ضمیر بنائی جاتی ہے۔ اسے معاشرہ بناتا ہے' تعلیم بناتی ہے' تربیت بناتی ہے' ماں باپ بناتے ہیں۔ یہ وعظ و نصیحت سے کم بنتی ہے۔ جو احوال اور کام ہوتے ہیں' یہ ان سے بنتی ہے۔ اب آپ نے یہ دیکھ لیا کہ نفسِ لوامہ کی کتنی اہمیت ہے۔ جہاں ضمیر کا یہ غلط تصور ہو' وہ انسان کو کبھی برائی سے نہیں روک سکتا۔ وہ تو امارہ ہی بن جاتی ہے۔

قرآنی تعلیم و تصور کی اگر بنیادوں پر' جو خدا نے دی ہیں' ضمیر مرتب کی ہوئی ہو' تو پھر وہ ضمیر ایسے وقت میں' جو سہو و نسیان سے غلط قدم اٹھتا ہے' اس سے روک دیتی ہے۔ بالارادہ تو مومن غلط قدم اٹھاتا ہی نہیں۔ غلط قدم سہو و نسیان سے ہی اٹھتا ہے اور وہاں وہ جو نفسِ لوامہ ہے' وہ روک دیتا ہے کہ غلط قدم اٹھ گیا ہے۔ اور وہ رکتا ہے' پھر واپس لوٹتا ہے' پھر اس چوراہے پہ پہنچتا ہے جہاں سے اس نے غلط قدم اٹھایا تھا' غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ توبہ ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ کچھ ابھی تک منفی ہے' یہ Negative ہے۔ جو غلطی کی تھی صرف اس کا ازالہ

ہوا ہے۔صحیح راستہ ابھی نہیں آیا۔اس کے بعد اس چورا ہے سے جب وہ اس راستے پہ قدم رکھے گا جو اس کی منزل کی طرف جاتا ہے تو یہ عملِ صالح ہوگا۔اسی لیے قرآن میں توبہ اور عملِ صالح دونوں اکٹھے آئے ہیں۔ضمیر نے یہ کیا کہ وہ اسے یہاں تک لے آیا۔اب اس کی تعلیم' قرآن کے حقائق' اس کے سامنے ہیں' وہ بتاتے ہیں کہ اسے کس طرح اس پر عمل کرنا ہے لہٰذا اس طرف جب انسان گامزن ہوجاتا ہے تو پھر یہ صحیح راستے پر چل پڑتا ہے۔قرآن کی رو سے صحیح اور غلط' حق اور باطل' جائز اور ناجائز' خیر وشر' کے امتیاز کا Process (طریق عمل' طریق کار) یہ ہے۔ ان میں سے ایک کو چھوڑنے کا اور دوسرے کو اختیار کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔اسی لیے قرآن نے اس نفس لوامہ کو شہادت میں پیش کیا ہے۔یہ بڑی چیز ہے۔لیکن میں پھر عرض کردوں کہ اگر ہم نے اس نفس کی ترتیب ہی غلط انداز میں کی ہے' تو سب سے بری چیز بھی یہی ہے۔ضمیر کی آواز سے' اندر کی آواز سے' انسان مطمئن ہوجاتا ہے حالانکہ وہ باطل کی آواز ہوتی ہے۔اسی لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ [1] (75:3)۔یہ بات تھی کہ وہ جوان کا انکار تھا وہ تو پیچھے سے چلا آرہا ہے۔

خواہش کا پیدا ہونا بھی ایک نشان قائم کرتا ہے

عزیزانِ من! میں عرض کیے چلا آرہا ہوں کہ دین کی بنیاد قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے: انسان کا ہر کام حتیٰ کہ ہر ارادہ' ہر خواہش' ہر آرزو' خواہ وہ ناتمام ہی کیوں نہ ہو' دل میں خواہش کا پیدا ہونا' ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے۔غلط کام وعمل وارادہ غلط نتیجہ پیدا کرے گا اور صحیح عمل کا صحیح نتیجہ۔جسے خدا نے غلط اور صحیح قرار دیا ہوا ہے وہی حقیقت میں غلط اور صحیح ہے۔ہر عمل نتیجہ پیدا کرتا ہے۔اس کے نتائج اس زندگی کے اندر ہی سامنے آنے شروع ہوجاتے ہیں کیونکہ اِس اور اُس زندگی کا فرق ہمارا پیدا کیا ہوا ہے۔زندگی جوئے رواں است' رواں خواہد بود۔یہ زندگی تو ایک چلتی ہوئی ندی ہے۔اسے محض' یونہی کہی ہوئی کوئی بات نہ سمجھو۔پہلے وہ اس دیوار سے باہر تھے؟ اب اس موت کے بعد وہ دیوار کے نیچے سے اندر آگئے۔اب آپ دیوار کو دیکھ کر کہہ رہے ہیں کہ زندگی ختم ہوگئی۔نہیں' ایسا نہیں ہے۔ انسان کے اعمال کے جو نتائج ہیں وہ اسے بھگتنے پڑتے ہیں اور اعمال میں' میں نے عرض کیا ہے کہ خیالات اور ارادے بھی آجاتے ہیں۔انسان کو ان کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔اچھے ہیں تو ان کا اچھا نتیجہ' غلط ہیں تو برا نتیجہ۔اب وہ نتیجہ یہاں بھی مرتب ہوتا ہے' آگے بھی چلتا ہے' بلکہ آگے چل کر میں عرض کرونگا کہ قرآن نے کہا ہے کہ وہ جنت اور جہنم تو انسان کے اندر کا نفس یہاں سے اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ یہاں مستور

---

[1] کیا انسان اپنے دل میں یہ خیال کیے بیٹھا ہے کہ جب وہ مر مرا کر ختم ہوجائے گا تو دوبارہ زندہ نہیں ہوگا؟ (36:78; 37:16)۔(اور اس طرح وہ اپنے غلط اعمال کی پاداش سے بچ جائے گا۔) کیا وہ سمجھتا ہے کہ جس بنیاد پر زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے' وہ موت سے منتشر ہوجاتی ہے اور پھر مجتمع نہیں ہو سکتی؟ یہ اس کا خیالِ خام ہے۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

ہوتا ہے' وہاں ظاہر ہو جاتا ہے۔یعنی یہاں وہ نتیجہ چھپا ہوا ہوتا ہے' وہاں بے نقاب ہو جاتا ہے۔اور قرآن کے دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ جہنم تو تمہیں اب بھی دیکھ رہی ہے' تم اسے نہیں دیکھ رہے۔یہ ہے اصل چیز۔اس کے لیے قرآن نے مختلف مقامات پہ سمجھایا ہے۔ جو اس کے منکر تھے کہ نہیں صاحب! جو مر گیا' مر مرا گیا' اس کی ہڈیاں' جسم' کھال' بال' ختم ہو گئے اور کچھ باقی ہی نہیں رہا۔ان سے بھی یہ کہا کہ جس خدا نے تمہیں Nothingness (عدم) سے پیدا کیا ہے' وہ اس پہ قادر ہے کہ تمہیں دوبارہ بھی پیدا کر دے۔یہ بڑی عمدہ علمی دلیل ہے۔

عدم کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا

عزیزانِ من! اب تک کا علم اور اس کے بعد بھی ایسا نظر آئے گا کہ انسان کا انتہائی علم بھی' یہ نہیں بتا سکے گا کہ جسے عدم (Nothingness) کہتے ہیں' اس کے معنی کیا ہیں۔ Nothingness (عدم) کا ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا کہ کچھ نہ ہو اور شے بھی پیدا ہو جائے۔یہ جو ہمارے ہاں کی محسوس عالم کی دنیا ہے اس میں کچھ تو ہو' جس سے بات کچھ آگے بنے۔خوبصورت بات ہے: لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں ''لگاؤ''۔ جب کچھ بھی نہ ہو تو دھوکا کھائیں کیا'[1] ''لاگ'' ہو تو اس کو ہم سمجھیں ''عداوت''۔ Nothingness (عدم) سے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔آج بھی بڑے سے بڑا Scientist (سائنسدان) یہ دیکھتا ہے تو مبہوت ہو جاتا ہے' وہ وہاں تک تو Cause & Effect کی' علت اور معلول کی' کڑیاں ملاتا چلا جاتا ہے کہ اس سے یہ بنا پھر اس سے یہ بنا' اس آکسیجن اور ہائیڈروجن کے دو ''قطروں'' سے پانی کا ایک قطرہ بن گیا۔یہ آکسیجن کیسے بن گئی؟ یہاں آ کر پھر وہ اور ایک کسان' یا گدھا چرانے والا' دونوں ایک ہی مقام پہ ہوتے ہیں: نہ وہ بتا سکتا ہے' نہ یہ بتا سکتا ہے۔

قرآن نے دلیل یہ دی ہے۔ بڑے سے بڑے عالم کے لیے' Scientist (سائنسدان) کے لیے کہا ہے کہ تم یہ بتاؤ کہ Nothingness (عدم) سے Being (وجود) کیسے بن گیا۔تم زیادہ سے زیادہ یہی کہو گے کہ یہ جو جسمِ انسانی ہے جس طرح سے یہ فرسودہ ہو گیا' خاکستر ہو گیا' اس کا کچھ نہ کچھ تو پھر بھی باقی ہے' راکھ ہی سہی۔کہتے ہیں کہ ہڈیاں پھس پھسا گئیں' یہی سہی' کیڑے کھا گئے' کیڑوں کے اندر چلی گئیں' او کچھ تو ہے۔اور تم تو اس مقام پہ کھڑے ہو' جہاں یہ کہتے ہو کہ ''کچھ نہیں'' تھا اور ''وہ کچھ ہو گیا'' تو جو ''کچھ نہیں'' سے ''کچھ کر دینے والا'' ہے کیا وہ اس سے نہیں بنا سکتا؟

عزیزانِ من! قرآن بڑی عجیب دلیل دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو چیزیں موجود ہوں' ان کو نئی نئی ترتیب سے' اِدھر سے اُدھر' اُدھر سے اِدھر کرتے چلے جانا بس کیا یہ اتنا ہی ہوتا ہے جسے ہم تخلیق Creation کہتے ہیں۔وہ جو عالمِ امر ہے اس میں ہے کہ کچھ نہ ہو تو کچھ بنا

---

[1] لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا۔ (غالب)

دیا جائے۔ تو کہا کہ کیا وہ یہ نہیں کر سکتا اور اگر ''عظام'' کے معنی ہڈیاں نہیں لینا' تو اس کے بنیادی معنی لیجیے۔ ''عظام'' ''ع ظ م'' سے ہے۔ وہ بڑی مضبوط سخت شے، جس کے اوپر کوئی عمارت اٹھتی ہے' وہ بنیاد کا پتھر ہو جاتا ہے۔ ان عربوں کے ہاں زمیندار کے ہل کے نیچے' وہ اس کے اندر بہت سخت لکڑی لگاتے تھے۔ وہ لوہے کا پھالا ہوتا تھا۔ یہ ''عظم'' کہلاتا تھا۔ میں یہ ''ظ'' کے ساتھ ''عظم'' والی بات کہہ رہا ہوں' ''ز'' کے ساتھ نہیں۔ یہ ''بنیادی چیز'' ہے۔ کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ جس چیز پہ انسان کی زندگی کی بنیاد ہے' تم اوپر کی عمارت کو دیکھ کر کہتے ہو کہ یہ تو ختم ہو گئی۔ وہ جو بنیاد ہے وہ تو ہم نے Nothingness (عدم) سے پیدا کی تھی۔ وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس پہ پھر عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ یہ ہے دلیل' جو دی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ القیٰمۃ کی تیسری آیت تک ہی آج آئے۔ میں سمجھتا ہوں کچھ کام کی باتیں ہو گئیں۔ آیت 4 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

چوبیسواں باب: سورۃ القیٰمۃ (آیات 4 تا 15)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1984ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ القیٰمۃ کی آیت 4 سے ہو رہا ہے: (75:4)

پچھلے درس میں' میں نے لفظِ لوامہ کے متعلق کچھ تشریح کی تھی۔ اگرچہ بات کچھ تھوڑی سی مشکل تھی لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ احباب نے اس میں بڑی دلچسپی لی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جسے ضمیر یا Conscience کہتے ہیں یا جسے نفسِ لوامہ کہہ کر پکارا گیا ہے وہ خدا کی طرف سے کوئی بنی بنائی چیز نہیں ملتی' اس کے اندر از خود یہ خصوصیت نہیں ہوتی کہ وہ شر اور خیر میں' غلط اور صحیح میں' امتیاز کر سکے۔ معاشرہ اس ضمیر یا نفسِ لوامہ کو مرتب کرتا ہے۔ جس قسم کا معاشرہ ہوتا ہے اسی قسم کا وہ ضمیر بن جاتا ہے۔

لفظ نفسِ لوامہ کے متعلق علامہ اقبال کی وضاحت

علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے اس ساری تفسیر کو' جو میں نے پچھلے پورے درس میں بیان کی تھی' دو لفظوں میں سمٹا دیا ہے۔ ان کا تو انداز ہی فلسفیانہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ یاد رکھنے کے قابل ہے' پھر بات بھولے گی نہیں۔ انہوں نے اپنے خطبات میں یہ کہا ہے کہ یہ Conscience یا ضمیر یا لوامہ Internalized Society ہوتی ہے۔ یہ بڑا خوبصورت لفظ ہے یعنی معاشرہ ہے جو سینے کے اندر سمویا ہوا ہو۔ بس یہ ہے جسے Conscience یا ضمیر کہتے ہیں۔

مجھے یاد آیا کہ پچھلے درس میں کہے گئے ایک شعر میں ذرا سا تسامح تھا۔ ❶ میں نے کہا تھا ''بہک بہک کے کہاں آ گیا ہے دیوانے'' وہ ہے ''بھٹک بھٹک کے کہاں آ گیا ہے دیوانے۔'' اس میں بھی بڑا نفیس سا فرق ہے۔

---

❶ سہو' غلطی

نوٹ: آیات 6 تا 13 کا درس بجلی فیل ہوجانے کی وجہ سے ریکارڈ نہ ہوسکا۔ مفہوم القرآن سے ان آیات کا مفہوم اس درس میں متعلقہ مقام پر شامل کیا جارہا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' (سالِ اشاعت درج نہیں ہے)' ص ص 1388-1387)

نفسِ لوامہ کے معنی کی بات ہورہی تھی یعنی غلط بات پر کچھ ٹوکنے والی بات تھی۔ یہ اصل میں قانونِ مکافاتِ عمل ہے جو دین کی بنیاد ہے' جو قرآن کی ساری تعلیم کا ماحصل ہے۔ وہ قانونِ مکافاتِ عمل یہ ہے کہ انسان کے ہر عمل' ارادے' خواہش اور آرزو تک اپنا نتیجہ مرتب کرکے رہتے ہیں اور اس کے لیے یہ خصوصیت نہیں ہے کہ وہ نتیجہ اسی دنیا کے اندر مرتب کرے۔ قرآن کی رو سے چونکہ زندگی مسلسل چلتی ہے' اس لیے وہ اس کے بعد کی زندگی کے اندر بھی مرتب کرے گا۔ اصل چیز قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق اعتراض کیا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں بھی کیا جاتا تھا' آج بھی کیا جاتا ہے کہ صاحب! یہ انسان مرجاتا ہے' وہ مردہ ہے' اس کی لاش ہوتی ہے' ہڈیاں گل سڑ جاتی ہیں اور اس کے بعد پھر اس کا دوبارہ زندہ کرنا کیسے ممکن ہے؟ قرآن لمبی چوڑی بحث میں نہیں پڑتا' بڑے خوبصورت انداز میں بیان کرتا ہے کہ تم اسے ناممکن سمجھتے ہو کہ جب ہڈیاں گل سڑ جائیں تو پھر دوبارہ اس کا زندہ ہونا کیسے ممکن ہوگا۔ یہ کہو کہ یہ ساری کائنات' خدا عدم سے' Nothingness (عدم) سے' وجود میں لایا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تو اس میں سے یہ اتنی بڑی کائنات بن گئی تھی۔ تم خود بھی کچھ نہیں تھے اور یہ بن گئے۔ اگر وہ' عدم جسے Nothingness کہتے ہیں' سے اتنی بڑی کائنات وجود میں لاتا ہے تو اس میں تو پھر بھی تم کہتے ہو کہ گل سڑ گئی' کچھ تو اس کا باقی ہوتا ہے' وہ اس سے کیوں دوبارہ وجود میں نہیں لاسکتا۔ یعنی وہ ان کے اعتراض کا جواب ہے اور یہ جواب بڑا عمدہ جواب ہے کہ یہ چیز ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ میں عرض کروں کہ مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق قرآن نے تمثیلات میں بیان کیا ہے' ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس زندگی میں انسان یا فرد کس شکل میں پیدا ہوگا' اس کی کیسی صورت ہوگی' اس پہ قرآن بحث نہیں کرتا۔

انسانی اعمال کے نتیجہ میں جزا اور سزا کے الفاظ مناسب نہیں

عزیزانِ من! بات یہ ہے کہ ہمارا اس چیز پر ایمان ہے کہ وہاں انسان زندہ ہوگا' یہ زندگی اور اس کے سارے واقعات اسے یاد ہونگے' یہاں کے تمام اعمال کا اثر' اس کے نفس پر نقش ہوگا اور ان کے مطابق یہ متعین ہوگا کہ اس کی زندگی کس درجے پر پہنچتی ہے۔ اس کے لیے جزا اور سزا کے الفاظ بھی کچھ صحیح مفہوم کے متحمل نہیں ہوتے۔ وہاں انسان کی زندگی کے متعلق یہ متعین ہوگا کہ وہ کس درجے میں پہنچتی ہے کیونکہ قرآن نے پہلے یہ کہا تھا کہ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ [1] (74:37)۔ یہ بڑی بنیادی چیز ہے کہ ''جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے' جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔'' یہ تو ارتقائی منازل میں آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کی ساری بات ہے۔ بہرحال اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہا جائے گا۔ قرآن نے کہا تھا کہ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ؇

---

[1] یہاں ہر فیصلہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔ قوموں کی موت وحیات' افراد کا بڑھنا اور پیچھے رہ جانا' سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے سو جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے اور جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ❶ (75:3-4)۔ ''بنان'' انسان کی انگلیوں کو کہتے ہیں لیکن مجازی طور پر یہ ہر اُس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے' جس سے کسی چیز کی گرفت ہو' جس سے کسی چیز کو قابو میں لایا جائے۔ یہاں اس سے مراد انسان کی وہ قوتیں ہیں جس سے وہ کسی دوسرے عمل کو اپنے قابو میں لاتا ہے۔ اس آیت میں کہا ہے کہ ہمیں اس کی قدرت حاصل ہے کہ ہم اس کو پھر استوار کر دیں۔ ہمارے لیے یہ کوئی ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے بات تو یہ کہی ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی ایک برحق شے ہے اور یہ قانونِ مکافاتِ عمل کے لیے ضروری چیز ہے۔ کہا کہ یہ انسان جو اس قسم کے اعتراضات کرتا ہے کہ جس بنیاد پر زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے' وہ موت سے منتشر ہو جاتی ہے' موت کے بعد زندگی نہیں ہے' مکافاتِ عمل کا قانون نہیں ہے' یہ کیوں ایسا کرتا ہے؟ اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ (75:5) ❷ انسان' جس روش کی زندگی بسر کرتا چلا آ رہا ہے' وہ اس کا عادی ہو گیا ہوا ہے۔ لوٹ کے مال کا عادی ہو گیا ہے' ڈاکے کا چسکا پڑ گیا ہے' فریب کی کمائی کو سہل الحصول جان رہا ہے اور اس کی زندگی بڑے مزے اور عیش سے گزر رہی ہے۔ اصل میں وہ چاہتا یہ ہے کہ اس کی زندگی اسی طرح سے گزرتی جائے' اُسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو۔ یہ جسے آپ خدا کا پیغام' رسالت کی تلقین' قرآن کی تاکید' کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ یہی ہے کہ جو لوگ غلط نہج کی زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں' انہیں روک دیا جائے کہ یہاں تک تو تم کر چکے' آگے نہ کرنا۔ یہ ہے اصل چیز اور یہی بات ان کو ناگوار گزرتی ہے یا ان کے فائدے میں نہیں ہے۔ وہ چاہتے یہ ہیں کہ جس انداز سے ہم زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں' اسی انداز سے باقی زندگی بھی گزارتے چلے جائیں۔ کہا کہ اصل وجہ یہ ہے۔ یہ اعتراضات تو Justificatory چیزیں ہیں' یونہی منطقی استدلال ہیں جن سے وہ یہ کہتے ہیں ورنہ اصل چیز یہی ہے کہ وہ یہی باقی زندگی بھی غیر ذمہ دارانہ انداز میں گزارنا چاہتے ہیں۔ اپنے غلط اعمال سے فرار کی خواہش لاشعوری طور پر حیاتِ اُخروی کے تصور اور امکان کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ دین کی بنیاد تو قانونِ مکافاتِ عمل کی ہے۔ اس لیے **یسئل ایان یوم القیمة** (75:6) جب اس سے قیامت کے متعلق کہا جاتا ہے تو اس کے دل میں جھٹ اعتراضات ابھرنے لگتے ہیں'

---

❶ کیا انسان اپنے دل میں یہ خیال کیے بیٹھا ہے کہ جب وہ مر مرا کر ختم ہو جائے گا تو دوبارہ زندہ نہیں ہو گا؟ (36:78; 37:16) (اور اس طرح وہ اپنے غلط اعمال کی پاداش سے بچ جائے گا۔) کیا وہ سمجھتا ہے کہ جس بنیاد پر زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے' وہ موت سے منتشر ہو جاتی ہے اور پھر مجتمع نہیں ہو سکتی؟ یہ اس کا خیالِ خام ہے۔ ہمارے لیے ایسا کرنا کیا دشوار ہے؟ ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کے ان تمام قویٰ کو درست اور مکمل کر دیں جن سے اس کی زندگی قیام پذیر ہوتی ہے' اور اسے دوسری چیزوں کے تصرف پر گرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اصل یہ ہے کہ انسان حیاتِ اُخروی سے اسی لیے انکار نہیں کرتا کہ وہ اسے ناممکن سمجھتا ہے۔ حیاتِ اُخروی پر یقین کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنا ایک ایک قدم احتیاط سے اٹھائے۔ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے کوئی غلط کام نہ کرے لیکن انسان ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے سے جی چراتا ہے۔ وہ چاہتا یہ ہے کہ جس طرح اس کی سابقہ زندگی (یعنی جتنی زندگی وہ گزار چکا ہے) غیر ذمہ دارانہ گزری ہے' اسی طرح باقی زندگی بھی بے راہ روی میں گزر جائے۔ اپنے غلط اعمال کے نتائج سے فرار کی خواہش لاشعوری طور پر حیاتِ اُخروی کے تصور اور امکان کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ (ایضاً)

اور وہ پوچھتا ہے کہ یہ بتاؤ کہ قیامت کب آئے گی؟ یہ کس قدر خود فریبی ہے!

اب سوال یہ ہے کہ کیا انسان اپنے اعمال کے نتائج سے اس لیے بچ جائے گا کہ وہ خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان نہیں رکھتا؟ وہ ایمان رکھے یا نہ رکھے، وہ قانون اپنا کام کرتا رہے گا۔ مرنے کے بعد کی زندگی ہوگی اور اس کے اعمال کے نتائج اس کے سامنے آ کر رہیں گے خواہ یہ اس حقیقت سے کتنا ہی انکار کیوں نہ کرے۔ باقی رہا یہ کہ قیامت کب آئے گی، تو اس کا علم تو صرف خدا ہی کو ہے لیکن **فَـاِذَا بَرِقَ الۡبَصَرُ** (75:7) جب وہ آئے گی تو حالت یہ ہوگی کہ مارے حیرت کے آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔

عزیزانِ من! یاد رہے کہ ایک قیامت اس دنیا میں بھی سامنے آ جاتی ہے جب اعمال کے نتائج کا ظہور یہاں ہوتا ہے۔ اور ایک قیامت مرنے کے بعد واقع ہوتی ہے جس میں وہاں ظہورِ نتائج ہوتا ہے۔ یہاں کی قیامت بالعموم قوموں یا مختلف نظامہائے حیات کے باہمی تصادم کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ جب یہ تصادم یہاں ہوگا تو ان مخالفین کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی۔ اس وقت حالت یہ ہوگی کہ **وَخَسَفَ الۡـقَـمَـرُ** (75:8) چاند تاریک ہو جائے گا۔ یعنی جاہلیت عرب کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ آپ کو معلوم ہے اور یہ چیز کئی دفعہ درسوں میں بھی آ چکی ہے کہ جاہلیت عرب کے جھنڈے کا نشان قمر تھا اور ایرانی سلطنت کے جھنڈے کا نشان شمس۔ اس لیے کہا کہ **وَجُـمِـعَ الشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ** (75:9) "چاند" اور "سورج" اکٹھے ہو جائیں گے۔ یعنی عرب اور ایران کی قوتیں مل کر ایک ہو جائیں گی۔ ان آیات میں اگر اس دنیا کی قیامت صغریٰ کی طرف اشارہ ہے تو اس سے مراد وہ انقلاب ہے جو ظہورِ اسلام سے عرب جاہلیت اور ایران کی سیاسی زندگی میں آنے والا تھا۔ ظہورِ نتائج کے وقت، خواہ وہ اس دنیا میں ہو یا آخرت میں، قرآن کہتا ہے کہ **یَـقُـوۡلُ الۡاِنۡسَانُ یَـوۡمَـئِـذٍ اَیۡنَ الۡمَفَرُّ o کَلَّا لَا وَزَرَ** (75:10-11) انسان انتہائی پریشانی کے عالم میں کہے گا کہ اب میں کدھر بھاگوں اور کہاں پناہ لوں؟ اس وقت کوئی ایسی جگہ نہیں ہوگی جہاں بھاگ کر پناہ لی جائے۔

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ دین کی بنیاد تو قانونِ مکافاتِ عمل کی ہے۔ کہا کہ **اِلٰـی رَبِّکَ یَـوۡمَـئِـذِ ِ الۡـمُـسۡـتَـقَـرُّ** (75:12) اُس دن انسان کے اگلے پچھلے تمام اعمال کے نتائج اس کے سامنے آ جائیں گے۔ اس لیے کہا کہ سوچو کہ **بَـلۡ تُـکَـذِّبُـوۡنَ بِـالـدِّیۡـنِ** (82:9) تم اس خدا کے قانونِ مکافات کو جھٹلاتے ہو؟ لیکن تمہارے جھٹلانے سے کیا ہوتا ہے؟ کیوں کہ **اِنَّ عَـلَـیۡـکُـمۡ لَحٰفِظِیۡنَ o کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ o یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ** (82:10-12) اُس نے تم پر نہایت معزز اور ایماندار محافظ مقرر کر رکھے ہیں۔ جو کچھ تم کرتے ہو انہیں اس سب کا علم ہوتا ہے۔ وہ اسے ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے۔

اب یہاں کراماً کاتبین کے الفاظ آئے اور اس کے ساتھ ہی ان کا ایک مروجہ تصور ذہنوں میں آ گیا۔

کراماً کاتبین کی حقیقت

عزیزانِ من! اب ہمارے ہاں جو کراماً کاتبین کا تصور ہے وہ اس بات کو سمجھانے کے لیے تو ٹھیک ہے کہ وہ انسان کی ہر چیز کو لکھتے

رہتے ہیں۔ وہ جوان کا نوشتہ ہوتا ہے' اسے اعمال نامہ کہتے ہیں۔ اس اعمال نامے میں انسان کا ہر عمل درج ہوتا ہے۔ اس کے مطابق ہی اس کی جزا اور سزا کا فیصلہ ہوتا ہے۔ سمجھنے کے لیے تو یہ بات ٹھیک ہے لیکن قرآن کا انداز اور اسلوبِ بیان ایسا ہے کہ وہ ہر سطح کے انسان کو بات سمجھا دیتا ہے۔ بات تو یہ ہے کہ کسی کا کوئی عمل ضائع نہیں جائے گا' ریکارڈ کیا جائے گا' محفوظ کیا جائے گا' اس کا نتیجہ مرتب ہوگا۔ البتہ عوام کو سمجھانے کے لیے یہی بات صحیح ہے کہ وہ جو لکھنے والے فرشتے ہیں وہ لکھیں گے۔ بات یہ پہنچانی ہے کہ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ تمہارا ہر عمل نتیجہ پیدا کرے گا۔ یاد رکھو! غلط بات کی سزا ملے گی۔ تدبر میں جو اونچی سطح کے لوگ ہیں' ان کے لیے قرآن اپنا انداز اختیار کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ o وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ [1] (75:14-15)۔ آج انسان کی کیفیت یہ ہے کہ جب غلط کار سے غلط کار انسان سے بھی پوچھا جائے کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ تو وہ اپنے جواز میں Justificatory Reason (وجہ جواز) دیتا ہے۔ اپنی تائید میں' اپنے حق میں' عجیب عجیب قسم کے دلائل دیتا ہے۔ واقعی بڑے سے بڑے مجرم سے بھی آپ بات کر کے پوچھیے اور کہیے کہ یہ کیوں کیا؟ وہ بھی اپنے حق میں کچھ دلیلیں دیتا ہے' اپنے ایکشن (عمل) کو Justify کرتا ہے۔ یہاں کہا کہ آج تو تم یہ کر سکتے ہو کہ کوئی پوچھے کہ یہ غلط کام کیوں کیا ہے تو اس کے لیے Justification پیش کرنے شروع کرتے ہو' جواز کے دلائل پیش کرنے شروع کر دیتے ہو۔ آج اگر تم نے یہ کچھ بھی کیا تو اُس وقت یہ چیزیں کام نہیں آئیں گی۔ جو باطل کے دلائل تم غلط کام کے جواز میں' پیش کرتے ہو' وہاں یہ نہیں ہوگا۔ پھر وہاں کیا صورت ہوگی؟ عجیب چیز ہے جو قرآن بتاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ نہیں ہوگا کہ وہاں تمہارے متعلق کسی دوسرے کا لکھا ہوا ہوگا اور کوئی دوسرا اسے پڑھ کر سنائے گا' وہاں سے کوئی سزا ہوگی۔ یہ کچھ نہیں ہوگا وہاں تم خود یہ سب کچھ اپنے خلاف کہو گے' کوئی باہر سے نہیں آئے گا۔ عزیزانِ من! یہ بڑی اہم چیز ہے۔

انسان خود اپنے خلاف آپ گواہ ہوگا

انسان کے اعمال اور ان کی سزا کے متعلق میں سنکھیا کھانے کی مثال دیا کرتا ہوں کہ جو سنکھیا کھانے والا ہے اس کی سزا کے لیے کسی سپاہی کی' تھانے کی' عدالت کی' جج کی' کسی جیل خانے کی' ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس کی ہلاکت اس سنکھیے کے اندر چھپی ہوئی ہوتی ہے' اس کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ انسان خود اپنے خلاف آپ گواہ ہوگا' اپنے خلاف شہادت دے گا یعنی خود انسان اپنے ہی خلاف۔ گویا قرآن کا اعمال کے متعلق ایسا انداز ہے کہ انسان اس قسم کے دلائل کی رو سے جو اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا کرتا ہے یا دوسرے کو

---

[1] اس کے لیے نہ کسی خارجی گواہ کی حاجت ہوگی' نہ بیرونی ثبوت کی ضرورت۔ انسان اپنے خلاف خود آپ دلیل ہوگا۔ (اس کی ذات' جس پر اس کے ہر عمل کا اثر منقوش ہوتا چلا جاتا ہے' اس کا اعمال نامہ ہوگی۔) اس وقت تو اس کی عقل بہانہ ساز' اس کے غلط اعمال کے جواز میں ہزار دلائل پیش کر دیتی ہے' اور اس طرح حقیقت پر پردے ڈالنے کی کوشش کرتی رہتی ہے لیکن اُس وقت اس کے تمام اعمال بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں گے اور کسی قسم کا کوئی بہانہ کام نہ دے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دھوکا دیتا ہے وہاں اس کی گنجائش نہیں رہے گی' قیامت میں بھی نہیں رہے گی اور جب قرآن کے مطابق صحیح معاشرہ قائم ہوگا' اس میں بھی اس کی گنجائش نہیں رہے گی۔ اول تو اس معاشرہ کے جو مومن افراد ہیں' وہ ایسا کریں گے ہی نہیں' وہ نہ اپنے آپ کو فریب دیں گے' نہ دوسروں کو فریب دیں گے' اور اگر کہیں کوئی ایسے ہونگے بھی تو معاشرے میں قانون کا' انصاف کا نظام' اس قدر Perfect (مکمل) ہوگا کہ اس قسم کے جو باطل کے دلائل ہیں' وہ وہاں کام ہی نہیں دے سکیں گے' کارفرما ہی نہیں ہوسکیں گے۔ قرآن نے دوسرے مقام پہ جو اعمالنامے کے متعلق کہا ہے' وہ بڑا ہی حقیقت کشا' عبرت آموز ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل سترہویں سورۃ میں کہا ہے کہ وَكُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِىۡ عُنُقِهٖ (17:13) بات سمجھانے کے لیے کہا ہے کہ ''ہر انسان کا اعمالنامہ اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہے۔''

انسان کا اعمال نامہ انسان کی گردن میں

عزیزانِ من! آج تو کاغذات کو' دستاویزات کو' محفوظ کرنے کے ہزارہا انتظام نکل آئے ہیں۔ کاغذ لمبا ہوتا ہے اس کو یوں لپیٹ لیتے ہیں مگر اب وہ صورت نہیں ہوتی۔ یہ اسے دست آویز کہتے ہی اس لیے ہیں کہ وہ لپٹے ہوئے میں تاگہ باندھ کر یا رسی باندھ کر تو لٹکا لیتے تھے کہ کہیں گم نہ ہو جائے۔ یہ دست آویز یعنی ہاتھ کے ساتھ لٹکایا ہوا ہے۔ Document کا ترجمہ بھی دستاویز اسی لیے ہوگیا کہ وہ لپیٹ کر لٹکایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ٹین کی کچھ نلکیاں سی بنی ہوئی ہوتی تھیں' جو بہت زیادہ قیمتی کاغذات ہوتے تھے' وہ ان کے اندر رکھے جاتے تھے۔ میرے اپنے بچپن میں یہ سارے ہمارے گھر میں تھے۔ یہ انداز تھا محفوظ رکھنے کی کوئی اور صورت نہیں تھی۔ بہرحال وہ لپیٹا ہوا ہوتا تھا' اس کو لٹکایا ہوا ہوتا تھا۔ کہا کہ ہر شخص کا اعمالنامہ اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ وَنُخۡرِجُ لَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلۡقٰهُ مَنۡشُوۡرًا (17:13) بس اتنا ہی ہوگا کہ آج وہ لپٹا ہوا ہے' ظہورِ نتائج کے وقت' اس کو یوں کھول دیا جائے گا۔

کسی گواہی کی ضرورت نہ ہوگی

کیا خوبصورت انداز ہے کہ اسی کے گلے میں لپٹا ہوا ہوگا بس کھول دیا جائے گا یعنی اعمال کے نتائج کے ظہور کی جو بات ہے اس کو یوں بیان کیا ہے کہ اس وقت وہ لپٹا ہوا ہے' اس لیے اس کی نگاہوں سے وہ چھپا ہوا ہے۔ یوں کھول دیا جائے گا اور کھولنے کے بعد اسی سے کہا جائے گا کہ اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ (17:14) خود اپنا اعمالنامہ پڑھ۔ کیا بات ہے! خود پڑھ' کوئی دوسرا نہیں کہ وہ چارج شیٹ دیکھ کر' پڑھ کر سنائے۔ اپنا اعمالنامہ خود پڑھ اور پھر کہا کہ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا (17:14) اس کے بعد تمہارے خلاف کسی دعویدار کو' کسی گواہ کو' کسی شہادت کو' لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم خود اپنے خلاف گواہیاں دو گے' تم خود اپنے خلاف حساب کرنے کے لیے کافی ہو گے۔ اپنے اعمال کو خود ہی Justify کرو گے یعنی تم خود اپنے خلاف شہادت دو گے اور اپنے خلاف خود ہی مدعی

بن کر کھڑے ہو جاؤ گے' کہیں کسی اور کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ [1] یہ کتنا خوبصورت انداز ہے بتانے کا!

انسانوں کے نظامِ عدل کی خامیاں

یہ سارا کچھ' جو کچھ بھی ہے' انسان کے اپنے اندر کی چیز ہے۔ یہ باہر جو معاشرت کا نظامِ عدل ہوتا ہے' اس میں سارے باہر کے ہوتے ہیں' اسی لیے اس میں قدم قدم پر اس کا امکان ہوتا ہے کہ غلط فیصلہ ہو جائے' جو بے گناہ ہے اس کو سزا مل جائے' جو گناہ گار ہے وہ چھوٹ جائے۔ گرفتار کرنے والا' گواہ' منصف' یہ سارے باہر کے ہوتے ہیں۔ اگر یہی چیز انسان کے اپنے اندر کی ہو تو پھر اس کی گنجائش ہی نہیں ہوتی کہ کوئی بچ نکلے۔ تو یہ چیز ہے کہ ہر ایک کا اعمالنامہ اس کی گردن میں' دستاویز کی طرح' لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ آج وہ رول کیا ہوا ہے' چھپا ہوا ہے' اس وقت کھول کر سامنے لایا جائے گا۔ اس سے کہا جائے گا کہ تم خود پڑھو اور پھر اپنے خلاف آپ گواہی دو۔ یہ ہے وہ انداز جو قرآن نے اختیار کیا ہے۔

اگلی بات یہ ہے کہ قرآن جتنی چیزیں قیامت یا یومِ حساب کے متعلق کہتا ہے وہ اس دنیا میں بھی سامنے آ جائیں گے جب معاشرہ قرآن کے مطابق قائم ہو گا۔ اس میں یہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں کی تاریخ جیسی بھی ہے' اس میں بعض واقعات چمکتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ وہ نبی اکرم ﷺ اور عہدِ خلافتِ راشدہ (H 40-11 / بمطابق 632-661AD) کے واقعات ہیں کہ مجرم سے کسی ایسی جگہ' کسی طرح سے' کوئی جرم سرزد ہو گیا' گناہ سرزد ہو گیا' جہاں اسے کوئی دیکھنے والا نہیں تھا' وہ از خود بابِ خلافت میں آ گیا اور آ کر کہا کہ مجھ سے یہ جرم سرزد ہو گیا ہے' مجھے اس کی سزا دیجیے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مقدمے کی رو سے بہر حال ضروری تھا کہ کوئی گواہ ہو' کوئی شاہد ہو' یا اس قسم کی کوئی بھی چیز ہو تو وہ تو نہیں تھی۔ اس نے کہا کہ میں خود اپنے خلاف گواہ ہوں میں آ رہا ہوں۔ اس کے لیے معلوم ہے کہ اس کی سزا موت ہو سکتی ہے۔ وہ بار بار اس کی تاکید کر رہا ہے' اس پر اصرار کر رہا ہے کہ مجھے سزا دیجیے۔ کیا یہ وہی بات نہیں ہے جو قرآن کہہ رہا ہے کہ اپنا اعمالنامہ خود پڑھ' اپنے خلاف خود گواہی دے' اپنا محاسبہ آپ کر۔

عزیزانِ من! اگر معاشرہ اس قسم کا قرآنی ہو تو اس میں یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے ایمان ہے کہ میرا یہ عمل یا یہ جرم جو ہو چکا ہے یہ بغیر سزا کے نہیں رہے گا۔ یہ ایمان ہے جو آ کے کہہ رہا ہے کہ مجھے یہیں سزا دے دیجیے۔ قرآن نے یہ جو چیزیں کہی ہیں' ان پر ہمارا ایمان ہے کہ ایسا ہو گا' آخرت میں بھی جا کر ہو گا اور اس دنیا میں بھی ہو گا۔ جب اس القیٰمۃ کے بعد نیا معاشرہ قائم ہو گا' خدا کے قانون کے مطابق اس معاشرے میں یہ چیزیں پیدا ہونگی۔

---

[1] ان نکات کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر منظور الحق (زیرِ نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص ص۔ 97-91۔

قرآنِ حکیم کا مفہوم متعین کرنے کے سلسلہ میں ایک گزارش

عزیزانِ من! اس آیت کے بعد دو تین چار [1] آیتیں ہیں جن میں پھر تدبر کی ضرورت ہے۔ ان کے دو قسم کے مفہوم ہیں جو وہاں غور و فکر کرنے کے بعد سامنے آتے ہیں۔ الفاظ وہی ہوتے ہیں مگر ان کے معنی یا تو لغوی لیے جاتے ہیں یا مجازی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ الفاظ میں بھی، عربی زبان میں بھی، اور ہر زبان میں، یہ قاعدہ ہے کہ بعض الفاظ کے بعض معنی تو لغوی ہوتے ہیں جیسے ماء یا آب کے معنی پانی ہیں۔ یہ سیدھی سی بات ہے اور اس کے بعض معنی مجازی ہوتے ہیں کہ اس سے مفہوم یہ ہے۔ قرآن میں یہ انداز بھی ہے کیونکہ یہ عربی زبان کی کتاب ہے۔ عربی زبان کے اندر یہ Basic (بنیادی) چیز تھی۔ ان کے ہاں بڑے ہی مجازی معنی ہوا کرتے تھے۔ پھر دوسرے مقامات کو بھی ساتھ لینا ہوتا ہے۔ ان سب کو ملا کر اگر مجازی معنی لیے جائیں تو پھر یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس سے کیا مفہوم ہے۔ کچھ لوگ جو پہلے کے تھے وہ ان کے وہی لغوی معنی لیتے تھے اور ایک آیت کو وہیں لیتے تھے، اسی جگہ لیتے تھے اور وہاں سے سمجھتے تھے کہ اگر تو اس کا تعلق حقائق سے ہے تو پھر اس کا اثر زیادہ برا نہیں پھیلتا لیکن اگر احکام اور قانون سے ہے پھر اس قسم کے جو نتائج ہیں وہ بڑے مضرت رساں بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کافی ہے، ہماری ہدایت کے لیے، یہ مکمل ضابطہ ہدایت، ضابطہ قوانین بھی ہے تو اس کے لیے بڑے ہی تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ خارج از قرآن تو کہیں سے مدد نہیں لی جائے گی، قرآن کے اندر سے یہ چیزیں ثابت ہونگی تو اس کے لیے ان لوگوں کی ضرورت ہوگی جن کی قرآن پر بڑی وسیع نگاہ ہوگی۔ قرآن کے تمام مقامات بیک وقت سامنے آئیں، عربی زبان کی رو سے یہ معلوم ہو کہ ان الفاظ کے مجازی معنی کیا لیے جاتے تھے اور لغوی معنی کیا لیے جاتے تھے۔ اگر یہ ساری چیزیں سامنے ہوں، اس رو سے ان کا مفہوم لیا جائے تو قرآن کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے جو واضح نہ ہو جائے۔ میں نے اسی لیے آج یہ سب کچھ عرض کیا ہے۔

آج وقت ہو گیا ہے اور آگے جو چار آیتیں آ رہی ہیں، ان میں یہ دونوں چیزیں سامنے آئیں گی تو انہیں آئندہ درس پر اٹھا رکھتے ہیں۔ آج ایک اعلان کے بعد اس درس کو یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

---

[1] اس سورۃ کی 16 تا 19 آیات

پچیسواں باب: سورۃ القیٰمۃ (آیات 16 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1984ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القیٰمۃ کی آیت 16 سے ہو رہا ہے: (75:16)۔ سابقہ جمعہ کو چونکہ خصوصی درس تھا اس لیے اس سے پہلے جمعہ میں، جہاں آیات ختم ہوئی تھیں، ممکن ہے وہ آپ کے ذہن میں نہ ہوں، اُن سے اس درس کا آغاز کر رہا ہوں۔ اُن آیات میں کہا یہ گیا تھا کہ انسان کے ہر عمل کا ایک نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے۔ اسے اس کا اعمالنامہ کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی خارج سے لکھی ہوئی نوشت نہیں، دستاویز نہیں، خود انسان کے اپنے نفس کے اوپر منقوش اعمال ہیں۔ سمجھانے کے لیے یہ کہا گیا کہ اس وقت وہ لپٹا ہوا ہوتا ہے، ظہورِ نتائج کے وقت اس کو کھول دیا جاتا ہے، کوئی دوسرا پڑھنے والا نہیں ہوتا، اسی سے کہا جاتا ہے کہ خود آپ اپنے اعمالنامہ کو پڑھ۔ اور خود ہی اس پر شہادت دے کہ وہ صحیح ہے جو کچھ کہا گیا ہے۔ اسی سے متعلق آیات سابقہ درسِ خصوصی سے پیوست درس میں، ہمارے سامنے آئی تھیں۔

نزولِ وحی کے سلسلہ میں موجودہ تفاسیر

عزیزانِ من! اب اگلی چار آیات ایسی ہیں جو میں آپ سے کہا کرتا ہوں کہ بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں تدبر کا خاص موقعہ ہوتا ہے۔ یہ چار ایسی ہی آیات ہیں کہ **لَا تُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ○ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا**

قَرَاٰنَہٗ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ o ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ ❶ (75:16-19)۔اب ان آیات کے متعلق جو قدیم سے مفہوم چلا آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ جبریل امین وحی لاتے تھے' رسول اللہ ﷺ کے سامنے وہ پڑھتے تھے تو آپ اس کے ساتھ ساتھ جلدی جلدی سے' تیزی تیزی سے' خود پڑھتے چلے جاتے تھے' اس جلدی و تیزی سے پھر کچھ الجھاؤ پیدا ہو جاتا تھا۔ اِدھر جبریل پڑھتے تھے' اُدھر آپ ﷺ اس کے ساتھ دہراتے تھے اور اس لیے دہراتے تھے کہ کہیں بعد میں کوئی لفظ رہ نہ جائے تو اس پہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ تمہیں جلدی جلدی زبان ہلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ جبریل کہتا ہے اس کو اطمینان سے سنتے جاؤ۔ یہ جو تمہیں خدشہ ہے کہ بعد میں بھول جاؤ گے اور کچھ رہ جائے گا تو سن رکھو کہ نہیں' ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہم یہ کریں گے کہ آپ کو یہ ساری وحی اسی طرح سے یاد ہو جائے' اسی طرح سے پھر آپ اس کو پڑھ لیں۔ یہ مفہوم ان چار آیتوں کا بیان کیا جاتا ہے۔

وحی کے سلسلے میں قابلِ غور نکات برائے تقاضائے ربطِ مضمون

عزیزانِ من! تدبر کے اعتبار سے' میرے نقطۂ نگاہ سے' میری بصیرتِ قرآنی کی رو سے' یہ مفہوم اس لیے قابلِ فہم نہیں کہ اس سے وحی کی نوعیت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ جبریل امین کا اس طرح سے ان الفاظ کا پڑھنا' رسول اللہ ﷺ کا سننا' پھر اس کا دہرانا' قرآنِ کریم کے تصورِ وحی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ قرآن میں تو یہ ہے کہ جبریل وحی کو قلبِ محمدی ﷺ پر نازل کیا کرتے تھے بلکہ وہاں تو ہے کہ ہم وحی القاء کرتے تھے اور نزولِ وحی کی رو سے یہ جو کچھ کہتے ہیں اس سے یہ کچھ اور حقیقت ہو جاتی ہے۔ یہ وحی کا قلب پہ نازل ہونا ہے اور اس کے

---

❶ آیات 16 تا 19 کو اگر سابقہ آیات کے ساتھ مسلسل لیا جائے تو ان کا مفہوم یہ ہوگا: ''اس قسم کی بہانہ سازی کرنے والے سے کہہ دیا جائے گا کہ قینچی کی طرح زبان چلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تو چاہتا ہے کہ اس تیز کلامی سے معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ معاملہ اس طرح ختم نہیں ہو جائے گا۔ یہ کام خود ہم نے اپنے ذمے لے رکھا ہے کہ انسان کے اگلے پچھلے تمام اعمال کو اکٹھا کیا جائے اور پھر انہیں نہایت حفاظت میں رکھا جائے۔ سو (اے انسان!) جب ہم نے (تیرے اعمال کو) اس طرح جمع و ثبت کر رکھا ہے تو تجھے اس طرح جمع شدہ کے پیچھے پیچھے چلنا ہو گا۔ یعنی جس طرف تمہارے اعمال کے نتائج لے جائیں تمہیں اسی طرف جانا ہوگا۔ اس طرح ہم تمہارے اعمال کے نتائج کو ظاہر کر کے تمہارے سامنے لے آئیں گے۔' (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ آیت 16 سے ایک نیا مضمون شروع ہوتا ہے تو ان آیات کا مفہوم حسب ذیل ہوگا:

''اے رسولؐ! تم کسی معاملے کے متعلق عملی قدم اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لو۔ اس وقت تک انتظار کرو جب تک اس معاملہ کے متعلق پورا پورا پروگرام بذریعہ وحی نہ دے دیا جائے (20:114)۔ اگرچہ یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہو رہا ہے لیکن تمہیں اس کے متعلق فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا جمع کرنا اور بحفاظت رکھنا ہمارے ذمے ہے۔ تمہارے ذمے اس کے احکام و قوانین کا اتباع کرنا ہے۔ اتباع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مطالب نہایت وضاحت سے سامنے آ جائیں۔ اس کا ذمہ بھی ہم نے خود ہی لے رکھا ہے۔ ہم ایک مضمون کو مختلف آیات میں بار بار لاتے ہیں اور اس طرح پوری پوری وضاحت کر دیتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کو سمجھنے کا طریقہ'' (پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' سال اشاعت درج نہیں' ص ص۔1389-1388' فٹ نوٹ نمبر 2)

برعکس جبریل امین کا اس طرح سے پڑھ کر سنانا اور اس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کا اسے دہراتے چلے جانا کہ کہیں اس میں سے کچھ رہ نہ جائے یعنی کچھ تھوڑا سا یہ خدشہ ہونا کہ کہیں کچھ رہ نہ جائے' قرآنِ کریم کی تعلیمات کے خلاف ہے کیونکہ یہ خدا کی یقین دہانی ہے کہ نہیں' ایسا نہیں ہوگا' آپ ﷺ نہیں بھولیں گے' ہم اسے محفوظ کرادیں گے۔ تو وہ جو قلبِ محمدی ﷺ پر اس کا القاء کرنا ہے' یہ چیز اس تصور کے خلاف جاتی ہے جس میں وحی کا پڑھ کر سنانا' آپ ﷺ کا سننا' آپ ﷺ کا دہرانا' بتایا جاتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ان تفاسیر کی رو سے اس میں اور پہلی آیات کے معنی میں کوئی ربط نہیں رہتا۔ جو پہلی آیات ہیں وہ یہی آ رہی ہیں کہ ان میں اعمالنامے کا ذکر ہے' اس کے سامنے اسے پیش کرنے کا تذکرہ ہے اور آخری چیز یہ ہے کہ **وَ لَوۡ اَلۡقٰـی مَعَاذِیۡرَہٗ** ❶ (75:15)۔ اسے کہا جائے گا کہ اب تو کتنی باتیں بنا' تمہاری کچھ پیش نہیں چل سکتی۔ وہ جسے اپنے غلط اعمال کے لیے Justificatory Reason (وجہ جواز) کہتے ہیں وہ تو کتنی ہی بنا اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ تیرے اعمال کیا ہیں اور ان کے نتائج کیا ہیں؟

عزیزانِ من! پیچھے سے یہ بات چلی آ رہی ہے اور اِن چار آیتوں (75:16-19) کے بعد پھر آیا ہے کہ **کَلَّا بَلۡ تُـحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ** ❷ (75:20) یہ لوگ اس لیے غلط روش پر چلتے ہیں کیونکہ یہ اسی دنیا کی طبعی یا حیوانی سطح کی زندگی کے مفاد حاصل کرنے کو اپنا مقصودِ حیات قرار دیئے ہوئے ہیں۔ گویا پیچھے سے بھی وہی مضمون آ رہا ہے اور ان آیات کے بعد بھی وہی مضمون ہے جس کا تسلسل ہے۔ تو ربط کا تقاضا یہ ہے کہ یہ درمیان کی آیات کا مفہوم اسی مضمون سے متعلق ہو جو پیچھے چلا آ رہا ہے اور جو اس کے بعد آگے چلایا جا رہا ہے۔ جہاں تک قرآن کے معاملے میں جلدی کرنے کا تعلق ہے ایک اور مقام میں بھی یہی بات کہی گئی ہے لیکن اس کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ وہاں' الفاظ کے دہرانے یا جلدی جلدی پڑھنے یا جبریل امین کے ساتھ وحی کے دہراتے چلے جانے کی بات نہیں ہے۔ وہاں کہا ہے کہ **وَلَا تَـعۡـجَـلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُہٗ** ❸ (20:114)۔

عزیزانِ من! قرآن بتدریج نازل ہوتا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ قرآن کا عملی پروگرام دیتے تھے' اس پر عمل پیرا ہوتے تھے' اس کے مطابق عمل کراتے تھے' نظام کی تشکیل کرتے تھے' پروگرام کو آگے بڑھاتے تھے۔ اب یہاں یہ کہا ہے کہ جب تک

---

❶ اِس وقت تو اس کی عقل بہانہ ساز اس کے غلط اعمال کے جواز میں ہزار دلائل پیش کر دیتی' اور اس طرح' حقیقت پر پردے ڈالنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ لیکن اس وقت اُس کے تمام اعمال بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں گے اور کسی قسم کا کوئی بہانہ کام نہ دے گا۔

❷ تم جو حیاتِ اُخروی سے اس طرح بدکتے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم صرف مفادِ عاجلہ پر نگاہ رکھتے ہو۔ تم اِسی دنیا کی طبعی یا حیوانی زندگی کے مفاد حاصل کرنے کو مقصودِ حیات قرار دیئے ہوئے ہو۔

❸ قرآنی پروگرام پر عمل کرنے کے سلسلہ میں اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جب تک (کسی معاملہ کے متعلق) وحی کی رو سے مکمل ہدایات نہ مل جائیں' اس میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ (۱-۲-۳ مفہوم القرآن۔ پرویز)

قرآن کا پورا موضوع وحی کے ذریعے نہ آ جائے' اس سے پہلے اس پر عمل پیرا ہونے یا اس پروگرام کے بجالانے کے لیے جلدی نہ کرو۔ وہ موضوع پورا ہو جائے تو پھر اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ یہ بات تو سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس میں وحی کے الفاظ کو دہرانے کی بات نہیں ہے۔ ان کو عمل میں لانے کا جو طریق تھا وہ بتایا گیا ہے کہ جب ایک موضوع مکمل ہو جائے' پھر اُسے عمل میں لایئے۔

اِن آیات میں سارا ذکر نامہ اعمال سے متعلق ہے

عزیزانِ من! یہاں جو تفاسیر میں جبریل کے ساتھ وحی کے الفاظ دہرانے کی بات ہے تو میں نے اُس کے بارے میں عرض کیا ہے کہ یہ دو چیزیں ہیں جن کی وجہ سے کم از کم میری قرآنی بصیرت کے مطابق یہ وہ مفہوم نہیں ہے جس کی بات پیچھے سے چلی آ رہی ہے۔ مفہوم وہی ہے' اسی سے کہا جا رہا ہے جس کے اعمالنامے کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ اسے کہا جا رہا ہے کہ یہ ہے تیرا اعمالنامہ۔ یہ ہم کھول کر تمہارے سامنے رکھتے ہیں۔ اس کو خود پڑھو۔ اس کے بعد دیکھو تم خود اس پر شہادت دو گے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے صحیح ہے۔ اب کہا کہ **وَ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ** (75:15) کسی قسم کا کوئی بہانہ کام نہ دے گا' باتیں بنانے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ وہ ایک متعین چیز ہے جو تمہارے سامنے آئی ہے۔

یہاں میں نے عرض کیا ہے کہ اب یہ جو آیات ہیں آپ انہیں اس تسلسل' اور اس ربط کے ماتحت دیکھیں تو ان کا کچھ مفہوم یوں بنے گا: یہ کہا جا رہا ہے کہ **لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ** (75:16)۔ اس میں یہ ہے جیسے ہمارے ہاں محاورے میں کہتے ہیں کہ قینچی کی طرح زبان چلانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے' پہلے یہ ہے کہ یہ باتیں بنانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے' اس کا کچھ اثر نہیں ہوگا' کچھ مفہوم نہیں ہے' کچھ معنی نہیں ہیں' کچھ اثر نہیں ہے' تو نتائج اعمال بدل نہیں سکتا' وہ اس لیے کہ یہ جو کچھ تم نے کیا ہے وہ ہمارے ذمہ تھا کہ ہم اس کو اکٹھا کرتے' اور اس کو محفوظ رکھتے۔ ہم نے اسے محفوظ رکھا ہے اور اب تو تم نے اس کے پیچھے پیچھے چلنا ہے۔ یعنی جس طرف تمہارا وہ اعمالنامہ لے جائے گا تمہیں اس طرف جانا ہے۔ وہ اگر ایسا ہے کہ وہ جہنمی بنانے کا ہے' تو وہ تمہیں جہنم کے راستے کی طرف لے جائے گا' تم اس کے پیچھے پیچھے جہنم کی طرف جاؤ گے۔ وہ جنت کی طرف لے جانے والا ہوگا تو تم اس کے پیچھے پیچھے جنت میں چلے جاؤ گے۔ اس کی نمود' اس کا ظہور' ہمارے ذمہ ہے اور یہ تمہارے اعمال کی نمود کا زمانہ ہے۔ عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ ان آیات کا یہ مفہوم اس ربط کے مطابق ہے جو پیچھے سے چلا آ رہا ہے اور آگے ہے کہ **کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ** (75:20) تم جو حیاتِ اُخروی سے بدکتے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم صرف مفادِ عاجلہ پر نگاہ رکھتے ہو۔ تم اسی دنیا کی طبعی یا حیوانی زندگی کے مفاد حاصل کرنے کو مقصودِ حیات بنائے ہوئے ہو۔ اب یہاں بات ہوئی ہے کہ یہ کچھ دیکھتے بھالتے اس قسم کی غلط روش کیوں اختیار کرتے ہو۔

حیوانی زندگی کا نظریہ حیات

آپ کو یاد ہے کہ قرآن کی تعلیم کا بار بار نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں ہے۔ یہ تو حیوانی زندگی ہے' اسے اس کے علاوہ ایک اور زندگی بھی دی گئی ہے' جسے عام الفاظ میں انسانی زندگی کہیے' جسے انسانی ذات کی زندگی کہتے ہیں' انسانی Personality (شخصیت' ذات) کی زندگی کہتے ہیں۔ اعمال کا اثر اس پر ہوتا ہے۔ وہی ہے کہ جس نے انسان کی طبعی موت کے بعد آگے چلنا ہے' ظہورِ نتائج اسی کے لیے ہیں۔ جو لوگ اس نظریہ زندگی یا تصورِ حیات کو نہیں مانتے' وہ زندگی کو یہی طبعی زندگی سمجھتے ہیں' زندگی کے تقاضے یہی طبعی تقاضے ہیں' زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے۔ قرآن اسے آخرۃ کے مقابلے میں عاجلہ کہہ کر پکارتا ہے' یعنی پیش پا افتادہ' سامنے پڑا ہوا مفاد ہے اور وہ آخرت ذرا بعد میں آنے والا مفاد ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کا تصورِ حیات یہ ہے کہ وہ جو طبعی زندگی کے' طبعی دنیا کے' پیش پا افتادہ مفاد ہیں انہیں جھپٹ کر لیا جائے۔ اس کی پرواہ نہ کی جائے کہ اس کا اثر انسانی ذات پر کیا پڑتا ہے۔ جس طریقے سے بھی روپیہ یا دولت ہاتھ آتی ہے اکٹھی کر لی جائے' اس کا انجام کیا ہوگا' اس کی پرواہ نہیں۔ وہ یہ کرتے ہیں۔ یہ نظریہ زندگی ہے جس کی رو سے یہ لوگ جائز و ناجائز میں' غلط اور صحیح میں' حق اور باطل میں' تمیز نہیں کرتے۔ جو چیز جس طریق سے حاصل ہوتی ہے' اسے یہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے اعمالنامہ کے جو غلط اعمال کے اندراجات ہیں وہ انہیں جہنم کی طرف لیے چلے جا رہے ہیں' اسی لیے قرآن میں آیا ہے کہ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ o وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ [1] (75:20-21)۔ یہاں قرآن عاجلہ کے مقابلے میں اٰخرۃ لایا ہے۔ وہ خیال نہیں کرتے کہ ان کی جتنی غلط روشیں ہیں آخرت' عاقبت' انجام کار' مآل کار' مستقبل میں' ان کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ٹھیک ہے' دنیاوی مفادِ عاجلہ بڑی جلدی حاصل ہو جاتے ہیں' محسوس ہوتے ہیں' نظر آ جاتے ہیں' ان کی کشش ہوتی ہے مگر ان کے نتائج اُس وقت غیر محسوس ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ذرا گہری نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ ہے جسے قرآن اٰخرۃ کہتا ہے اور وہ ہے جسے قرآن عاجلۃ کہتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ دو تصورِ حیات' دو نظریاتِ زندگی ہیں۔ [2] اس لحاظ سے آپ انہیں دو قسم کے لوگ کہہ لیجیے۔ جنہوں نے مستقبل کی خوشگواریوں کو' اس دنیا کی زندگی میں' اپنے سامنے رکھا ہوگا تو جب ظہورِ نتائج کا وقت آئے گا تو وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ یہ ظہورِ نتائج کا وقت' مرنے کے بعد' قیامت ہی میں' جا کر نہیں آتا۔ وہ قیامت تو برحق ہے لیکن اس کا سلسلہ یہاں اسی دنیا سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جنت اور جہنم یہاں سے شروع ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی چلے جاتے ہیں۔

---

1. تم اسی دنیا کی طبعی یا حیوانی زندگی کے مفاد حاصل کرنے کو مقصودِ حیات قرار دیئے ہوئے ہو اور مستقبل کی زندگی کا تمہیں کوئی خیال نہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)
2. (۱) میکانکی تصورِ حیات اور (۲) قرآنی تصورِ حیات۔

اُخروی زندگی کے لیے مفادِ عاجلہ کی قربانی

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ لوگ جن کے سامنے آخرت کا بھی تصور تھا' انہوں نے عاجلہ مفاد کو بعض اوقات' خوشگوار مستقبل بنانے کے لیے' قربان کر دیا کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ زندگی بہرحال آگے چلنے والی ہے' اس کا خیال کرنا چاہیے۔ظہورِ نتائج کے وقت اعمال کے نتائج ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ❶ (75:22-23)۔اس آیت میں پہلے ناضرۃ ''ض'' کے ساتھ ہے اور دوسرا ناظرۃ ''ظ'' کے ساتھ ہے۔یہ عربی زبان ہے۔کہا کہ اس دن یہ لوگ' جنہوں نے مستقبل پر نگاہ رکھی ہوگی' ان کے چہرے بڑے ہشاش بشاش ہونگے۔

خدا تعالیٰ کے دیدار کا مفہوم

عزیزانِ من! اب اگلی آیت میں یہ چیز ہے کہ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ❷ (75:23) وہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہونگے۔عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ قیامت میں خدا کا دیدار ہوگا' وہ سامنے آئے گا اور اس طرح لوگ اسے دیکھیں گے۔میں اس فلسفیانہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتا مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ خدا کا جو تصور قرآن نے دیا ہے' وہ بہرحال محسوس آنکھوں سے دیکھا جانے والا نہیں ہے۔عام آنکھیں تو ایک طرف رہیں' وہ تو پیغمبر کی آنکھ سے بھی نہیں دیکھا جاسکتا۔حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے بھی جب یہ کہا تھا کہ بات تو آپ سنا رہے ہیں' ذرا بے نقاب سامنے بھی تو آئیے' تو جواب دیدیا گیا کہ لَنْ تَرَانِیْ (7:143) تو مجھے دیکھ نہیں سکتا۔وہ محسوسات سے بلند' ماوراذات ہے: برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم۔وہ تو اس نے جو اپنی صفات بیان کردی ہیں' ان سے ذہن میں کچھ ایک تصور قائم ہوسکتا ہے' محسوسات کی دنیا کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے۔بہرحال یہ اگر محسوس معنوں میں لیا جائے کہ وہاں یہ چیز محسوس طور پر سامنے ہوگی تو وہ قرآن کے اس تصور کے خلاف چلی جاتی ہے۔

قرآن نے اُخروی زندگی کو مثالی طور پر بیان کیا ہے

عزیزانِ من! وہاں حیات بعد الممات کی زندگی کیسی ہوگی' اسے ابھی ہم نہیں جان سکتے۔وہ تو خود ہی قرآن نے مثالی طور پر بیان کی ہے۔یہ نہیں ہے کہ اگر وہاں قرآن نے باغ کہا ہے تو اس میں اسی قسم کے درخت لگے ہوئے ہونگے' وہ باغ ہوگا اور اس کے نیچے' اگر نہریں جاری ہیں' تو واقعی وہ ندی ہوگی' اسی طرح کے پانی ہونگے اور یہ سب چیزیں ہوں گی۔قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے سمجھانے کے

---

❶ مستقبل کی خوشگواریاں' مفادِ عاجلہ کے مقابلے میں بہت زیادہ شگفتہ وشاداب ہیں۔جن لوگوں کو وہ حاصل ہوں گی ان کے چہرے ہشاش بشاش اور تر و تازہ ہوں گے۔اور وہ اپنے نشو ونماد دینے والے کی فیض گستری اور کرم فرمائی کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔(مفہوم القرآن۔پرویز)

❷ وہ اپنے نشو ونما دینے والے کی فیض گستری اور کرم فرمائی کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔(ایضاً)

لیے مثالی طور پر یہ کچھ کہا ہے۔ یہ تو دراصل خدا کی کرم گستری' اس کی عنایات' اس کی نوازشات ہوں گی۔ رب سے ربوبیت ہی کیوں نہ مراد لی جائے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر ہے کہ انہیں اس کے سامانِ ربوبیت کی فراوانیاں حاصل ہونگی اور اس سے ان کی زندگی بڑی خوشگوار ہوگی' چہرے بڑے مسکراہٹ سے بھرے ہوئے ہونگے۔ اوران کے برعکس **وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ o تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ** ❶ (75:24-25) جو دوسرے قسم کے لوگ ہونگے ان کے چہرے بڑے افسردہ' پژمردہ' جسے منہ ''بسورے'' ہوئے کہتے ہیں' ہوں گے۔ یہ ''باسرۃ'' اسی ''بسورے'' سے ہی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ان کی یہ کیفیت ہوگی اس لیے کہ انہیں نظر آ رہا ہوگا کہ کمر توڑ دینے والی ایک مصیبت ہے جو اُن پر آن پڑے گی۔ وہ جو اُن کی غلط روش کا انجام ہوگا اس وقت وہ محسوس طور پر سامنے آ جائے گا۔ یہاں تو یہی صورت ہے کہ انسان اپنی غلط روش کے انجام کو محسوس طور پر اپنے سامنے نہیں دیکھنا چاہتا' یا اسے دیکھتا نہیں ہے۔ اس وقت وہ سامنے آ جائے گی اور اسے نظر آئے گا کہ ہاں یہ ایک ''فاقرۃ'' ہے جو بہت بڑی' جسے کمر شکن کہتے ہیں' کمر توڑ دینے والی' ایک مصیبت ہے جو آنے والی ہے۔

یہاں کہا ہے کہ انہیں مستقبل کی زندگی کے متعلق ہرگز شک وشبہ نہیں کرنا چاہیے۔ اور وہ لفظ ہے: **كَلَّآ** (75:26)۔ اب یہ کہتا ہے کہ یہ آخرت کی زندگی کا' مرنے کے بعد کی زندگی کا' انکار کیے چلے جاتے ہیں حالانکہ انسان کی مرنے کے بعد کی زندگی کی کیفیت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ o وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ o وَّ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ o وَ الْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ** ❷ (75:26-29)

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ آخری دو تین پاروں کی' یہ جو اس قسم کی آخری سورتیں ہیں' ان کی آیات بھی آپ دیکھیں گے کہ وہ دو دو لفظ کی آیات ہیں۔ ادبی لحاظ سے بھی ان کی کیفیت یہ ہے کہ بالکل عروج پہ پہنچی ہوئی ہیں۔ جامعیت اور Concentration (ارتکاز) کی یہ کیفیت ہے کہ ایک ایک لفظ کے اندر معنی کی دنیا چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب یہ کس انداز سے دیکھتے ہیں؟ ایسا نظر آتا ہے جیسے کچھ شاعری کی بات ہو رہی ہے۔

قرآنِ حکیم نے بتایا ہے کہ اسی زندگی میں جب تم آخری لمحات کی ہچکیاں لے رہے ہوتے ہو' جس وقت موت سامنے نظر آ رہی

---

❶ جن لوگوں کو یہ کچھ میسر نہ ہوگا ان کے چہرے افسردہ و پژمردہ ہوں گے' اس لیے کہ انہیں یہ دھڑ کا لگا ہوگا کہ اب وہ مصیبت آنے والی ہے جو ان کی کمر توڑ کر رکھ دے گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت انسان سکراتِ موت کی ہچکیاں لیتا ہے اور سانس گلے میں اٹک جاتی ہے اور ہر کہنے والا یہی کہتا ہے کہ اس وقت جو کچھ بھی بن پڑے کر لینا چاہیے (اگر دوا دارو سے فائدہ نہیں ہوتا تو) کسی جھاڑ پھونک والے کو بلا لو شاید وہی اس کی جان بچا لے۔ اس سے مرنے والا سمجھ لیتا ہے کہ اب اُس کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ اُس وقت اُس کی اور اُس کے پسماندگان کی سختیاں اور مصیبتیں تو برتو جمع ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ (ایک پر دوسری مصیبت چلی آتی ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہوتی ہے' اس وقت تمہاری اور تیمارداروں کی بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کوئی علاج معالجہ تو ایک طرف رہا' وہ تو ہمات سے بھی نہیں چوکتے۔ وہ کہتے ہیں او! کوئی بات نہیں' اگر کسی دوائی سے فائدہ نہیں ہوتا' کسی جھاڑ پھونک والے کو ہی بلالو' کچھ دم درود ہی کرالو' کسی پیر صاحب کو ہی آواز دیدو۔ یعنی اس وقت تمہاری مایوسی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ یہ جو ساری دنیائے اسباب میں' تم ہر چیز اسباب کی روسے' سامان کی روسے' محسوسات کی روسے' کرتے تھے اس وقت تم تو ہمات کی دنیا میں چلے جاتے ہو کہ کسی طرح سے یہ بچ جائے' اس کی مصیبت' تکلیف کم ہو جائے۔ وہاں تک تم پہنچ جاتے ہو۔ یہ جو اس وقت تم اس طرح سے انکار پہ انکار کیے چلے جاتے ہو' اس وقت تمہاری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ تم بوکھلا اٹھے ہوتے ہو' تمہاری پریشانی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ تم یہ سب کچھ کہتے اور کرتے ہو اور یہ ہمارا ایسے وقت میں روزمرہ ایسا تجربہ ہے کہ جب کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ طبیب بھی مریض سے مایوس ہو کر اٹھ کے چلا جارہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ ''یوں تو خدا کی خدائی برحق ہے' پر ہمیں تو کوئی آس نظر نہیں آتی''، تو پھر اس وقت یہ کیفیت ہوتی ہے: کوئی کہتا ہے کہ صاحب وہاں ایک بھنگڑ خانے کا چوڑا [1] ہے۔ وہ ڈھول بجاتا ہے تو اس سے یہ فائدہ ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ او! اونوں ای سد لے۔ [2] یعنی قرآن کا یہ بات کہنے کا کیا انداز ہے کہ اس وقت عقل اور فکر اور منطق اور فلسفہ اور محسوسات اور دوا دارو سب چیزیں تم چھوڑ جاتے ہو اور یہاں تک پہنچ جاتے ہو کہ عام زندگی میں جن چیزوں کا تم مذاق اڑاؤ' اس وقت ان چیزوں کے متعلق بھی کہتے ہو کہ او! یہ بھی کر کے دیکھ لو' شاید یہی کچھ ہو جائے۔ تمہاری مایوسیوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ اور اُدھر شدت سے تکلیف پر تکلیف جمع ہوتی چلی جاتی ہے۔

عزیزانِ من! ساق کا یہ لفظ عربی زبان میں ہے۔ یوں تو اس کے معنی پنڈلی کے ہوتے ہیں لیکن محاورہ عربی زبان میں ہے کہ جب کوئی شدت کی تکلیف آئے تو اس کے لیے یہ لفظ کہتے ہیں۔ پنڈلی کھل جانا' اردو میں بھی ایک محاورہ ہے' اگرچہ اس کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ تکلیف پہ تکلیف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اِلٰی رَبِّکَ یَوۡمَئِذِ الۡمَسَاقُ [3] (75:30)۔ عزیزانِ من! یہاں ''مساق'' کا لفظ آیا ہے یعنی یوں ہے کہ جیسے اس وقت پھر کوئی ہنکائے جارہا ہو' جیسے کسی بیل کو' کسی مویشی کو' پیچھے سے ہانکتا ہوا چلا جارہا ہو' کھینچ کے کسی طرف وہ لے جارہا ہو مگر وہ جانہ رہا ہو اور یہ لے جارہا ہو۔ یعنی یہ عجیب انداز کی بات ایک ہی لفظ میں کہہ دی کہ پھر اس وقت یہ بارگاہِ خداوندی کی طرف ہنکائے جارہا ہوتا ہے۔ یہ وہ چیز تھی جسے یوں کہتے ہیں کہ وہ کیا بات تھی جو اس کی یہ کیفیت ہو گئی؟ اب دو آیات میں آپ غور کیجیے کہ کیا کچھ کیسے کہہ دیا گیا ہے۔

---

[1] بھنگی

[2] اُسے ہی بلالو۔

[3] اُس وقت' انسان کو ہر طرف سے ہٹا سمٹا کر' عدالت خداوندی کی طرف ہانک کر لایا جاتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

عزیزانِ من! ادب میں ایک صنف ہوتی ہے اسے نشر [1] کہتے ہیں: اِدھر کے ایک لفظ کے مقابل میں سامنے دوسرا لفظ لانا۔ عام طور پر یہ شاعری میں ہوتا ہے۔ عربی زبان کے ادب میں بھی یہ بڑی خصوصیت ہے کیونکہ اس میں تو پوچھیے ہی نہیں کہ کتنے الفاظ ہوتے ہیں مرادفات تو سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ نشر بڑا لطیف ہوتا تھا۔

صدّق کے بالمقابل کذّب اور صلّٰی کے بالمقابل تولّٰی کا مفہوم

قرآن کی اس آیت کے اندر یہ صنف نشر نظر آ رہی ہے: فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی [2] (75:31)۔ اس کی یہ حالت ایسی کیوں ہوئی اس لیے کہ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی o وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی [3] (75:31-32) یہاں ''صدق'' کے مقابل میں ''کذب'' آیا ہے۔ اس لیے کہ یہ حقائق کی تصدیق نہیں کرتا تھا۔ یہی ایک بات نہیں ہے کہ کچھ نہ کرے، خاموش رہے۔ آگے دوسری آیت میں اس کے مقابل میں لفظ ''کَذَّبَ'' آ گیا۔ ''صدق'' کے مقابل میں ''کَذَّبَ'' آ گیا۔ تصدیق نہیں کرتا تھا، حقائق کی تکذیب کرتا تھا۔ اب یہ دیکھیں کہ یہ دونوں چیزیں ملانے سے مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ یہ چیزیں ایک دوسرے کی Opposit (متضاد) ہوتی ہیں، متخالف ہوتی ہیں جیسے ایک طرف فلا صدّق اور دوسری طرف ولٰکن کَذَّبَ آیا ہے یعنی تصدیق نہیں کرتا تھا، تکذیب کرتا تھا۔ دوسرا ہے: ولا صلّٰی اور و تولّٰی۔ اب ''صلیٰ'' کے مخالف ''تولیٰ'' آیا ہے۔ ''تولیٰ'' کا تو مفہوم متعین ہے کہ ہر جگہ منہ موڑ کے چل دینا، گریز کی راہیں نکال لینا، پیٹھ پھیر کے چل دینا۔ اب اس کے مقابلے میں ''صلّٰی'' ہے۔ اب اس کے لیے ہمارے ہاں جو عام ترجمہ کیا جاتا ہے وہ ہے کہ نماز نہیں پڑھتا تھا۔ ٹھیک ہے صلوٰۃ بڑی اہم چیز ہے لیکن وہ تو میں اس آیت میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جو قرآن کا ادبی اعجاز ہے یہ بات اس کے خلاف چلی جاتی ہے کہ یہ اِدھر ''صلّٰی'' کہتا ہے اور اس کے مقابل ''تولّٰی'' کہتا ہے۔ ''تولیٰ'' کے مقابل کا

---

[1] اصلاح میں اسے ''لف ونشر'' بھی کہتے ہیں۔ لف کے معنی ہیں لپیٹنا اور نشر کے معنی ہیں پھیلانا۔ اصطلاح میں کلام کے اندر دو یا زیادہ باتوں کا ذکر کر کے ان سے تعلق اور مناسبت رکھنے والی اتنی ہی باتوں کا مزید ذکر کرنا ''لف ونشر'' کہلاتا ہے۔ اس کی تین صورتیں ہیں: (۱) لف ونشر مرتب۔ (۲) لف ونشر غیر مرتب اور (۳) لف ونشر معکوس الترتیب۔ اس آخری صورت کی مثالیں یہ ہیں

ایک سب آگ، ایک سب پانی...... دیدہ ودِل عذاب ہیں دونوں (میر)

اس میں ''آگ'' اور ''پانی'' اس کی مثال ہیں۔

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے (اقبال)

اس میں ''ابتدا'' اور ''انتہا'' اس کی مثال ہے۔

[2] (ان حقائق کی روشنی میں، تم اس شخص سے کہو) جو ہمارے قانونِ مکافات کی تصدیق نہیں کرتا، اور سیدھے راستے پر نہیں چلتا۔

[3] ہمارے قانونِ مکافات کی تصدیق نہیں کرتا اور سیدھے راستے پر نہیں چلتا بلکہ اس کی تکذیب کرتا ہے اور اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ (۲-۳ مفہوم القرآن۔ پرویز)

لفظ آنا چاہیے‘ اس کی ضد کا لفظ آنا چاہیے۔ عربی زبان میں یہ جو مادہ [1] ہے‘ جسے ہم صلوٰۃ کہتے ہیں‘ اس کے معنی ہیں: کسی کے پیچھے پیچھے سیدھے راستے پہ چلے جانا۔ بنیادی معنی اس کے یہ ہیں۔ اسے پھر دہرادوں‘ جو کئی دفعہ دہرایا گیا ہے کہ جسے مصلی کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ریس کورس میں ایک گھوڑا پہلے نمبر پہ جا رہا ہو‘ اس کے پیچھے دوسرا گھوڑا اس انداز سے اس کے پیچھے پیچھے جائے کہ اس کی کنوتیاں اس کی پشت کے ساتھ چھوتی ہوئی ہوں یعنی دونوں کے درمیان میں کوئی فاصلہ نہ ہو لیکن جائے یہ اس کے پیچھے اور مسلسل اس کے پیچھے جائے۔ اسے عربی میں مصلی کہتے ہیں۔ اب ہمارے ہاں تو مصلی کا ترجمہ نماز پڑھنے والا ہوتا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس لفظ کی بنیاد میں چلے جایئے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق

عزیزانِ من! قرآن کا مفہوم سمجھنے کا طریقہ بار بار دہرادوں۔ وہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ کے مادے کے بنیادی معنوں کی طرف جایئے‘ پھر یہ دیکھیے کہ عرب ان الفاظ کو کن کن معنی میں استعمال کرتے تھے‘ پھر دیکھیے کہ قرآن میں ان میں سے کونسا لفظ اس آیت کے اندر صحیح بیٹھتا ہے۔ یہ آپ کریں گے تو سارا قرآن سمجھ میں آ جائے گا‘ کوئی دشواری نہیں ہوگی‘ کہیں تضاد نہیں ہوگا‘ کہیں تخالف نہیں ہوگا‘ کہیں ابہام نہیں ہوگا۔ اور اگر آپ یہ کچھ نہیں کریں گے تو ایک ایک آیت میں آپ کو ابہام نظر آئے گا۔ اب یہاں ہی وہ جو ادب کی اتنی بڑی صنف [2] ہے‘ اُسے ہی دیکھ لیجیے۔ مثال کے طور پر ہم ”صَدَّقَ“ کے مقابلے میں تو ”کَذَّبَ“ کا لفظ صحیح معنی میں استعمال کرتے ہیں لیکن ”تـولّٰی“ کے مقابلے میں جو ”صـلّٰی“ ہے کہ یہ حقائقِ خداوندی کی تصدیق نہیں کرتا تھا‘ ان کی تکذیب کرتا تھا‘ اِدھر اُدھر منہ موڑ کے چل دیتا تھا‘ گریز کی راہیں نکالتا تھا تو پھر اس کے پیچھے کوئی ایسا لفظ آنا چاہیے جو اس کی ضد ہے‘ وہ تیسرا لفظ ”صلی“ ہے کہ یہ سیدھے سیدھے راستے پہ‘ صراطِ مستقیم پہ نہیں چلتا تھا‘ گریز کی راہیں نکال کر ادھر اُدھر مڑ جاتا تھا‘ تو بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ کچھ یہ کرتا تھا۔

یہ تکذیب کرنے والے کون ہیں؟ آپ کو پتہ ہے کہ ”تکذیب“ اور ”تکفیر“ میں فرق کیا ہے؟ کفر تو یہ ہے کہ آؤٹ رائیٹ (Out right بالکل ہی) کسی چیز سے انکار کر دینا جیسے کہ میں مانتا ہی نہیں ہوں اور تکذیب یہ ہے کہ زبان سے کہتے رہنا کہ مانتا ہوں‘ کہتے چلے جانا کہ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا الـلّٰہُ‘ کائنات میں‘ دنیا میں‘ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں سوائے خدا کے۔ یہ کہتے چلے جانا ہے اور ہر دوسرے شخص کو خدا بناتے چلے جانا‘ زبان سے یہ کہتے چلے جانا عملاً یہ کرتے چلے جانا۔ اسے تکذیب کہتے ہیں۔ تصدیق یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔

---

[1] صلوٰۃ کا مادہ ”ص ل و“ ہے۔

[2] لف و نشر

تکذیب کا قرآنی مفہوم اور اس کے مضمرات

عزیزانِ من! یہ اتنا ہی نہیں ہے کہ ہم منہ سے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ کہہ دیں پھر مینار پہ کھڑے ہو کر لاؤڈ اسپیکروں کے ساتھ دنیا کو اَشْهَـدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ دیں۔ یہ تو عملی طور پر ثابت کرنا ہے کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں' اس معاملے کا میں گواہ ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی شخص صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔ اللہ اکبر! یہ کتنی بڑی گواہی ہے۔ لیکن آج کیا ہو رہا ہے؟ کیا یہ سچ بول رہا ہے؟ کیا یہ اپنے اس اعلان کی تکذیب نہیں کر رہا؟ کیا کھڑے کھڑے' نیچے اتر کر' پوری زندگی میں' ہم میں سے ہر ایک' اس کی تکذیب نہیں کر رہا' انکار نہیں کرتا' یہ کچھ کہتا چلا جا رہا ہے عملاً کچھ نہیں۔ جبکہ جو ہندو ہے اس کا یہ کہنا نہیں ہے۔ ہندو انکار کرتا ہے۔ وہ بھی یہ بات کہتا اور اسی طرح سیکولر والا انکار کرتا ہے۔ وہ بھی اس بات کو نہیں مانتا لیکن ہم ہیں کہ یہ الفاظ دہرائے چلے جا رہے ہیں اور عملاً انکار کیے چلے جا رہے ہیں۔ اس کو تو تکذیب کہتے ہیں۔ صَدَّقَ کے مقابلے میں كَذَّبَ آیا ہے۔ اور پھر اگلی بات یہ ہے کہ وہ سیدھا اس راستے پر نہیں چلتا بلکہ گریز کی راہیں نکالتا چلا جاتا ہے' سارا روپیہ' جتنی دولت' جی چاہے جمع کر لو' قرآن میں آیا ہے کہ یہ سکے جہنم کی آگ میں تپائے جائیں گے لیکن اس کے باوجود یہ سارا کچھ کرتا چلا جاتا ہے' اس میں سے اتنے سے پیسے خیرات کر دیجیے باقی سب مال پاک ہے۔ یہ گریز کی راہیں ہیں' ثُـــمَّ ذَهَـبَ اِلٰـى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى (75:33) پھر بڑے فخر سے اپنے گھر کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے سب ٹھیک کر لیا ہے۔ قرآن میں ایک دوسری جگہ ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ بابا! یہاں تو تم نے عیش سامانیوں کا انتظام کر لیا ہے' آخرت میں بھی سوچو کہ کیا حشر ہوگا؟ قرآن کہتا ہے کہ وہ ان سے کہے گا کہ کوئی بات نہیں ہے' میں نے وہاں کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ ارے! کیا کر رکھا ہے؟ کہتا ہے کہ دیکھ لینا وہاں ہمیں یہاں سے بھی زیادہ بہتر مکان ملے گا کیونکہ جو شخص یہاں ایک مسجد بنا دے' اس کا موتیوں کا گھر وہاں بن جائے گا۔ یعنی جس طرح جی چاہے دولت جمع کر لو' بس اس میں سے کچھ حصہ ڈال دیجیے تو اب یہ وہاں Secure (محفوظ) ہو گیا۔

عزیزانِ من! بقول ان کے' یہ وہاں کے انتظامات ہیں۔ یہاں یہ جو يَتَمَطّٰى (75:33) کا لفظ آیا ہے کہ وہ بڑے فخر سے اپنے گھر والوں کی طرف آتا ہے یعنی اُسے شرم نہیں آتی' ندامت نہیں ہے' اس کے برعکس اسے اس بات کے اوپر فخر ہے' کیا بات ہے صاحب! اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى o ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ❶ (75:34-35)۔ عزیزانِ من! قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ بڑے فخر سے اپنے گھر والوں کی طرف آتا ہے' مگر سمجھتا نہیں ہے کہ اس کے لیے تباہی ہے: یکسر تباہی' بالکل تباہی۔ اور پھر اگلی بات یہ ہے کہ اَيَـحْسَـبُ

---

❶ اے بدنصیب! تیرے لیے کس قدر بہتر تھا کہ تو قوانین خداوندی کا اتباع کرتا۔ اے کاش! یہ بات تیری سمجھ میں آجاتی کہ وہ روش تیرے حق میں کس قدر مفید تھی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اَلْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ❶ (75:36)۔اس آیت میں ''سُدًی'' کا لفظ بڑا عجیب لفظ ہے۔کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اُسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔اب ''سدًی'' لفظ کے عام بنیادی معنی یہ ہوتے ہیں جسے ہم شتر بے مہار کہتے ہیں' یعنی جس سے کوئی مواخذہ ہی نہ کیا جاسکے' جس پہ کوئی گرفت ہی نہ کی جاسکے' جس کو یونہی آوارہ چھوڑ دیا جاسکے۔

اس پوری کائنات کا اور انسانی زندگی کا ایک مقصد ہے

قرآن کی رو سے' کائنات کا اور بالخصوص انسانی زندگی کا ایک مقصد ہے۔کائنات کا کیا مقصد ہے؟ وہ تو ہم نہیں جانتے مگر انسانی زندگی بالمقصد پیدا ہوئی ہے۔اقبالؒ (1938-1877) نے یہ بالکل صحیح کہا تھا کہ یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود۔❷ عزیزانِ من! انسانی زندگی کا ایک Purpose (مقصد) ہے' لائف (زندگی) کا ایک منتہیٰ ہے' ایک نصب العین ہے۔جو چیز کسی مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہو وہ عبث نہیں ہوتی۔

اب عبث کا لفظ آیا ہے تو دیکھیے قرآنِ کریم نے ایک دوسری جگہ کہا ہے کہ **اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا** (23:115) کیا تم یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے' تم بلا مقصد پیدا کیے گئے ہو' تمہارا کوئی نصب العین نہیں ہے' کوئی منزل نہیں ہے' کوئی منتہیٰ نہیں ہے' آوارگی ہے' جدھر جی چاہے منہ اٹھا کے چلدو' کوئی ایسی قوت نہیں ہے جو تمہیں اس نصب العین حیات کی طرف گھیر کر لے جائے' کیا تمہیں بلا مقصد پیدا کیا؟ یہاں عبث کا لفظ ہے اور کہا ہے کہ کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے غرض وغایت' اور بلا مقصد ومنزل پیدا کر دیا ہے کہ اتفاقیہ دنیا میں آ گئے۔کچھ دن زندہ رہے۔پھر خاک میں مل گئے اور زندگی کا افسانہ ختم ہو گیا! اس لیے جو کچھ تمہارا جی چاہے تم کرتے رہو۔تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔

عزیزانِ من! وہ مقصد آخر میں ہے لیکن یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ تم سمجھ رہے ہو کہ کوئی پوچھنے والا نہیں' کوئی مواخذہ کرنے والا نہیں' **وَ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ** (23:115) اور تم پر ہمارے قانونِ مکافات کی کوئی گرفت ہی نہیں؟ تم سمجھے بیٹھے ہو کہ خدا کے ہاں کوئی

---

❶ انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ نہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد ہے' نہ اس کے سفر کی کوئی منزلِ متعین' نہ اس راستے پر چلنے کے قواعد وضوابط۔اسے شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس طرح جی میں آئے اور جس طرف جی چاہے منہ اٹھا کر چل دے۔اس تصورِ حیات کا نتیجہ ہے کہ وہ طبعی زندگی کی مفاد پرستیوں کا تانا بنتا رہتا ہے اور اس میں انسانی ذات (Human Personality) کا بانا نہیں ڈالتا۔اس طرح اس کی ساری زندگی بلا مقصد دوڑ دھوپ میں ضائع ہو جاتی ہے۔(حالانکہ زندگی' مفادِ عاجلہ کے تانے اور مستقبل کے بانے سے کپڑا بننے کا نام ہے۔یا یوں کہیے کہ زندگی عبارت ہے دنیا کے تانے میں دین کا بانا ڈالنے سے۔اگر دین اور دنیا' روح اور مادہ' مستقل اقدار اور امورِ تمدن وسیاست کا اس طرح امتزاج نہ ہو تو انسانی زندگی کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔قرآنی تعلیم انہی کا امتزاج سکھاتی ہے اور یوں انسانی کوششوں کو نتیجہ خیز بنا دیتی ہے۔)(مفہوم القرآن۔پرویز)

❷ اقبالؒ: جاوید کے نام در بالِ جبریل' نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور' 1996' ص۔129:

یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ!

مواخذہ نہیں ہے جو جی میں آئے کرتے چلے جائیں راوی عیش لکھتا ہے۔ پہلی چیز تو اس میں یہ کہی گئی ہے کہ مواخذہ ہوگا تو پھر اس طرح سے لاپرواہی نہیں برتے گا۔ کیا تمہیں یقین نہیں ہے صدق نہیں ہے؟ زبان سے کہتے ہو عملاً اس کی تصدیق نہیں کرتے ہو۔

عربوں کی زبان میں لفظ ''سدیٰ'' کا مفہوم

اگلا لفظ جو عرب استعمال کرتے تھے وہ ''سدًی'' ہے۔ یہ لفظ تو اپنے اندر عظیم فلسفہ رکھتا ہے۔ عبث بلا مقصد! یہ کیا چیز ہے؟ یہ عجیب چیز ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ یہ عرب اَن پڑھ قوم تھی۔ مکے جیسا ان کا ام القریٰ (Capital City) مرکز تھا۔ یہ سب کچھ یہ تجارت کا یہ قافلوں کے آنے جانے والوں کا کعبے کی وجہ سے تھا اور مکے جیسے شہر میں صرف سترہ آدمی وہ تھے جو صرف نوشت وخواند جانتے تھے تعلیم تو بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ یہ صرف لکھنا پڑھنا تھا۔ اس دَور کو عہدِ جاہلیہ کہا جاتا تھا۔ واقعی یہ پورے کا پورا ملک بڑا تاریک تھا۔ اس میں یہ قوم تھی۔ یہ اُس قوم کی اُس زمانے کی زبان بنی ہوئی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے یہ اتنے بڑے بلند معنی کہاں سے سیکھے ان کے ذہن کے اندر یہ معنی کہاں سے آئے۔ جو عبث اور بے کار کام ہے وہ ''سدًی'' ہے۔ یہ بات باعث تعجب ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ان کے ہاں کے یہ جو الفاظ ہیں اور ان الفاظ کے یہ جو مادے (Roots) ہیں یہ عرب ان مادوں کو جس طرح استعمال کرتے تھے اگر وہ چیزیں آپ کے سامنے آجائیں تو قرآن کے معنی نکھر اور ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

وہ سدًی کو کیسے استعمال کرتے تھے؟ بات تو یہ ہے۔ عرب اس لفظ کو استعمال کرتے تھے کہ کوئی ایسا کام ہو جو نتیجہ خیز نہ ہو کوئی نتیجہ پیدا نہ کرے مگر اس میں آدمی لگا رہے۔ عزیزانِ من! آپ ذرا ان شرائط کو سامنے رکھیے کہ تگ ودو بھاگ دوڑ سعی وکاوش یہ سب ہو مگر اس کا نتیجہ کوئی نہ ہو تو وہ اسے کیسے سمجھاتے؟ ہم نے تو یہاں اب شہر میں اور شہر والوں نے جولاہا بہت کم دیکھا ہوگا وہ ایک تانی تنتا ہے۔ اس کے ہاں ایک تانا ہوتا ہے۔ وہ جو سید ھا دھاگے لے جاتے ہیں وہ تانا ہوتا ہے اور ایک بانا ہوتا ہے۔ جو تاگے اس طرح سے اس تانے سے گزار کر لے جاتے ہیں۔ یہ دونوں تانا اور بانا کہلاتے ہیں۔ یہ تانا اور بانا اکٹھے ہوں تو پھر یہ ''ثوب''[1] بنتا ہے یعنی کپڑا بنتا ہے پھر وہ ''ثواب'' ہوتا ہے۔ اگر تانا ہی تانا رہے جولاہا ساری عمر لگا رہے وہ تانا ہی تانا تنتا چلا جائے تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ یہ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ[2] ہے۔ تگ وتاز ہو رہی ہے سعی وکاوش ہو رہی ہے محنت ہو رہی ہے ساری عمر بھی لگا رہے تو بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا اور اگر کوئی دوسری طرف بانا ہی بانا لٹکا رہے پھر بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ سیکولر زندگی ہو مادی زندگی ہو صرف دنیاوی زندگی ہو اس کے اندر اقدارِ خداوندی کا بانا نہ ہو تو وہ تانا ہی تانا رہے گا۔ خانقاہیت کی زندگی ہو آپ کے ہاں کی یہ شرعی رسومات کی اور شعائر کی زندگی ہو یہ بانا ہی بانا ہوگا اس میں

---

[1] کپڑا

[2] ان کے اعمال رایگاں گئے۔

تانا نہیں ہے۔ اِدھر بانا نہیں ہے' تانا ہے۔ اُدھر بانا ہے تانا نہیں۔ یہ ساری عمر بانے میں لگے رہے' وہ تانے میں لگے رہیں تو حَبِــطَــتْ اَعْـمَالُهُمْ ❶ ہوا۔ وہ بھی گیا یہ بھی گیا۔ ایک لفظ ''سدًی'' نے یہ سب کچھ بتا دیا۔ زندگی ان دونوں (تانا اور بانا) کے امتزاج کا نام ہے۔ سچ کہا تھا مفکر قرآن اقبالؒ (1938-1877) نے کہ

جدا ہو دیں سیاست سے' تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ شخص بھی کیا بات کہہ جاتا ہے!

خانقاہیت بھی تانا ہی تانا ہے

دین' مذہب نہیں ہے۔ مذہب تو نرا تانا ہی تانا ہوتا ہے۔ یہ خانقاہیت بھی تانا ہی تانا ہے۔ یہ جسے روحانیت کہتے ہیں یہ فریبِ نفس ہے۔ یہ Mechanically (میکانکی طور پر) رسمی طور پر' مذہب کے جتنے بھی شعائر ادا کرتی ہے' رسمی طور پر Mechanically فرائض ادا کرنے والی بات ہے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ بھی تانا ہی تانا ہے۔ دوسری طرف زندگی کا مقصود صرف اس طبعی زندگی کے اسباب و سامان کو اکٹھا کرتے چلے جانا اور ان میں اقدارِ خداوندی کو نہ لانا' بانا ہی بانا ہے' اس میں ان اقدار کا تانا نہیں ہے جبکہ زندگی ان دونوں کے امتزاج کا نام ہے: دین اور دنیا کا امتزاج' عاجلہ اور آخرۃ کا امتزاج۔ ان الفاظ میں تو میں روحانی کا لفظ استعمال نہیں کیا کرتا۔ وہ تو پھر اسی تانے کی طرف لے جاتا ہے۔ انسان کے لیے تو میں اقدار کہا کرتا ہوں۔ وہ صحیح لفظ ہیں۔ اس کی Values (اقدار) ساتھ ہونی چاہئیں' یہ دونوں چیزیں اکٹھی کی جائیں تو پھر دین بنتا ہے۔ یعنی تانا اور بانا اکٹھا کیا جائے۔ اس قوم کی کیا بات ہے! اسی تانے اور بانے کے ملنے سے انہوں نے ثوب کا لفظ استعمال کیا کہ کپڑا (ثوب) بنتا ہے اور اس ''ثوب'' سے کہا کہ اگر ایسا کیا جائے تو کام کا ''ثواب'' ہوتا ہے' نہ کیا جائے تو پھر ثواب نہیں ہوتا۔ کسی کے پاس تانا ہوتا ہے' کسی کے پاس بانا ہوتا ہے' دونوں فریب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ بڑا کام کر رہے ہیں۔

جولاہی تانا تندی پھردی اے

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا ہے ہمارے ہاں یہ جو کھڈی پر تانا اور بانا ہوتا ہے' اس سے پہلی ایک منزل ہوتی ہے۔ یہ سوت یعنی تاگے جولاہے کو دیئے جاتے تھے۔ ہمارے ہاں وہ سوت کے تاگے لپیٹے ہوئے ہوتے تھے۔ اس کی پہلی منزل یہ ہوتی تھی کہ عام طور پہ راستے ہی میں وہ' یہاں سے وہاں تک' کانے ❷ کی کچھ لکڑیاں سی کھڑی کرتے اور اس تاگے کو یہاں سے وہاں تک لے جاتے اور لے

---

❶ ان کے اعمال رائیگاں گئے۔

❷ سرکنڈا

آتے تھے۔ عام طور پر ان کی عورتیں یہ کیا کرتی تھیں۔ وہ عورتیں تاگے کو ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر لیے پھرتی تھیں، وہ دن بھر چلتی رہتی تھیں۔ وہ اس کو ایک ابتدائی شکل دینے کی صورت ہوتی تھی، لیکن اتنی سی چیز جتنی وہ کر رہی ہوتی تھیں اگر اسی کو وہاں چھوڑ دیا جائے تو بے معنی ہوتا تھا۔ اس پر ہمارے ہاں پنجابی میں، ایک محاورہ ہوتا تھا کہ جو اس طرح سے دوڑ دھوپ تو بہت کرے لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلے تو کہا کرتے تھے کہ ''جولاہی تانا تندی پھردی اے''، یعنی وہ یہ چیز ہے کہ اس میں بانا نہیں آکے ڈلتا، تانے کی ساری محنت بے کار چلی جاتی ہے۔ یہ ہے: **اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ** یعنی ان کے اعمال رائیگاں چلے گئے۔

یہاں کہا کہ انسان سمجھتا یہ ہے کہ اس سے کوئی مواخذہ کرنے والا نہیں ہے اور زندگی کے اعمال کی کیفیت یہ ہے کہ ساری عمر تانا تنتا رہتا ہے اور ذہن میں یہ تصور ہے کہ میں بہت اچھا کپڑا بن رہا ہوں۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ زندگی کے اس امتزاج سے ان دو چیزوں کے امتزاج کا ایک محسوس نتیجہ مرتب ہوگا۔ جب تانا اور بانا دونوں ساتھ ہوں گے یعنی مادی دنیا کے اسباب و ذرائع کے لیے یہ تمام ذرائع اور قوتیں بطور تانا اور اقدارِ خداوندی بطور بانا ڈلے گا تو زندگی کا مقصد پورا ہوگا۔ یہاں کہا ہے کہ **اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی** [1] (75:36)۔ آپ نے اب غور فرمایا ایک لفظ میں قرآن بات کتنی بڑی کہتا ہے۔ اس لفظ ''سدی'' کے اندر ساری دنیا کا فلسفہ آجاتا ہے۔

جہانِ فردا کی حقیقت

اب رہی یہی بات کہ کیا اس کے بعد پھر دوسری زندگی بھی ہوگی؟ یہ پیچھے سورۃ (75:3) میں بھی آچکا ہے کہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب انسان مر مرا جائے گا، ہڈیاں بوسیدہ ہوجائیں، خاک میں مل جائیں گے، گوشت کو کیڑے کھا جائیں گے، یہ راکھ کے ساتھ راکھ ہوجائیں گی، تو اس کے بعد انسان کو زندگی کیسے ملے گی؟ قرآن نے ایک تو یہ کہا کہ اس زندگی کے متعلق تم ذہن میں نہیں لا سکتے کہ وہ کیسی ہوگی لیکن اگر تمہارا اعتراض یہی ہے کہ یہ ناممکنات میں سے ہے کہ جب انسان کے جسم میں سے کوئی چیز اس طرح باقی نہ رہے تو پھر بھی اس کو پیدا کیا جائے۔ قرآن اس قسم کی ایک دلیل دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ **لَا بُرْھَانَ لَهٗ** (23:117) اس کا توڑ ان کے پاس

---

[1] انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ نہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد ہے، نہ اس کے سفر کی کوئی منزل متعین، نہ اس راستے پر چلنے کے قواعد وضوابط۔ اسے شترِ بے مہار کی طرح چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس طرح جی میں آئے اور جس طرف جی چاہے منہ اٹھا کر چل دے۔ اس تصورِ حیات کا نتیجہ ہے کہ وہ طبعی زندگی کی مفاد پرستیوں کا تانا بنتا رہتا ہے اور اس میں انسانی ذات (Human Personality) کا بانا نہیں ڈالتا۔ اس طرح اس کی ساری زندگی بلا مقصد دوڑ دھوپ میں ضائع ہوجاتی ہے۔ (حالانکہ زندگی، مفادِ عاجلہ کے تانے اور مستقبل کے بانے سے کپڑا بننے کا نام ہے۔ یا یوں کہیے کہ زندگی عبارت ہے دنیا کے تانے میں دین کا بانا ڈالنے سے۔ اگر دین اور دنیا، روح اور مادہ، مستقل اقدار اور امورِ تمدن و سیاست کا اس طرح امتزاج نہ ہو تو انسانی زندگی کا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ قرآنی تعلیم انہی کا امتزاج سکھاتی ہے اور یوں انسانی کوششوں کو نتیجہ خیز بنا دیتی ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

نہیں ہوسکتا جب ہم دلیل دیتے ہیں۔ کہا کہ مرنے کے بعد پھر بھی کسی نہ کسی شکل میں اس کا یہ کچھ ہے تو سہی' وہ مٹی میں ملا ہوا سہی' وہ کیڑوں نے ہی کھایا ہوا سہی' پھر بھی کوئی نہ کوئی وجود تو ہے ہی۔ اس کے برعکس یہ ساری کائنات جو پیدا ہوئی ہے' وہ تو عدم سے وجود میں آئی ہے' جہاں کوئی بھی چیز نہیں تھی۔ یہ ساری کائنات تمہارے سامنے ہے اور تم کھڑے ہو۔ تمہارا سب سے بڑا سائنسدان بھی یہ کہتا ہے کہ ہم اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ Nothingness (عدم) سے Being (موجود) کیسے ہوگئی' کیسے عدم سے وجود میں آ گئی جبکہ کچھ نہ تھا؟ یہ بڑی صحیح بات ہے کہ یہ جو عالمِ اسباب ہے' یہ جو فزیکل کائنات ہے' اس Nature (فطرت) میں مختلف چیزیں موجود ہیں' وہ Elements (عناصر) کی شکل میں ہی سہی' وہ موجود تو ہیں۔ کوئی سائنسدان نہیں کہہ سکتا کہ یہ کس طرح عدم سے وجود میں آئیں۔ آگے جو کچھ ہو رہا ہے وہ تخلیق ہے۔

خلق کے معنی ہوتا ہے ''مختلف چیزوں کو خاص تناسب کے ساتھ اکٹھا کر کے ایک 'نئی چیز' بنا دینا۔'' یہ 'نئی چیز' عدم سے وجود میں لانے کی نہیں ہے۔ جو چیزیں موجود ہیں' یہ انہی میں مختلف تناسب سے' مختلف توازن سے' کچھ اختلاف پیدا کر کے' ایک نئی چیز بنا دینا ہے۔ یہ سارا کچھ یہی ہے۔ یہ جتنا کچھ بھی یہ سائنسدان ہمارے ہاں کرتے ہیں' یہ جو بھی صنعت وحرفت ہوتی ہے' وہ موجود چیزوں کو ترتیبِ نو دے کر ایک نئی چیز بنا دینا ہے۔ یہ تخلیق ہے' یہ عدم سے وجود میں لانا نہیں ہے۔

بصارت کو بصیرت میں بدل دینے والی دلیل

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ یہ کچھ تو تمہاری سمجھ میں آیا ہے۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ یہ چیزیں جن کی ترتیب سے تم تخلیقِ نو کرتے ہو' یہ بذاتِ خود کہاں سے آ گئیں؟ کوئی ایسا Element (عنصر) اس سے پہلے نہیں تھا کہ جن سے یہ وجود میں آئی ہیں۔ تو جو خدا اس طرح سے اتنی عظیم کائنات کو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے' کیا وہ ایک انسان کو از سرِ نو پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر دلیل کی رو سے سمجھنا چاہتے ہو تو یہ کتنی محکم دلیل ہے۔ اب اس کے بعد آگلی آیت میں کہا کہ اَلَمْ یَکُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى [1] (75:37)۔ اپنی پیدائش پہ غور کیجیے۔ انسان یا انسانی بچہ یا جو کچھ بھی یہ انسان اب ہے' کیا یہ تمہارے ذہن میں آ سکتا تھا کہ یہ ایک ابتدائی مادہ تولید سے یہ کچھ بن جائے گا؟ یہ Scientist (سائنسدان) یا ڈاکٹر وغیرہ ہمیں بتاتے ہیں کہ زندگی کی ابتدا مادہ تولید سے ہوئی۔ اِس ایک قطرے میں کروڑوں جرثومے ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے اتنے بچے بن سکتے ہیں۔ یہ جرثومے کیسے پیدا ہوتے ہیں' غور طلب ہے۔ تخلیقِ انسانی کی ابتداء (Conception) میں' جس سے یہ تخلیق آگے چلنی ہے' دو جرثومے [2] اکٹھے ہوتے ہیں: نر کا تولیدی جرثومہ مادہ کا (تولیدی جرثومہ:

---

[1] اسے سوچنا چاہیے کہ حیاتِ انسانی' کتنے ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد' انسانی پیکر تک پہنچی ہے۔ وہ ایک قطرۂ آب تھا جو رحم میں گرایا گیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] Sperm (نر کا تولیدی مادہ) اور Qvum (عورت کا مادہ تولیدی)

بیضہ خلیہ)‘ یعنی عورت کا اور مرد کا (تولیدی Reproductive) جرثومہ اکٹھے ہوتے ہیں تو تخلیق انسانی ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جرثومے کہاں سے آئے؟ پھر کہا کہ یہ کہیں سے بھی آئے‘ کیا اس کا کوئی جرثومہ مائیکروسکوپ (خوردبین: Microscope) کے بغیر اندر سے نظر آتا ہے؟ وہ تو ایسا ہوتا ہی نہیں ہے جو آنکھ سے دیکھا جا سکے۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ ہوتا کیا ہے؟ وہ یہ نہیں ہے کہ وہ ایک چھوٹا سا انسان ہوتا ہے‘ وہاں وہ بونا سا ہوتا ہے‘ بالکل نہیں۔ اُسے تو سوئی کے ناکے جتنا ایک ذرا سا نقطہ سمجھ لیجیے۔ وہ بس یہ ہوتا ہے۔ کہا کہ اگر اس اکیلے کو دکھا کر کسی سے کہا جائے کہ اس کے اندر تمہارا باپ چھپا بیٹھا تھا تو اِس بات کو کوئی نہیں مانے گا حالانکہ وہ اسی کے اندر تھا۔ ہر بیج کے اندر تناور درخت ہوتا ہے۔ ہر اس جرثومہ تناسل کے اندر انسان کا بچہ بیٹھا ہوتا ہے‘ پورا انسان ہوتا ہے۔ کہا کہ وہاں سے تو یہ بات شروع ہوئی کہ **ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً** (75:38) پھر وہ ذرا لوتھڑا سا‘ چپکنے والا‘ کچھ بن گیا۔ قرآن نے‘ دیگر مقامات میں انسانی بچے کی رحم کے اندر جو Stages (مراحل) ہیں‘ انہیں بھی گنایا ہے اور اسی لیے گنایا ہے کہ ذرا دیکھتے چلے جاؤ۔ کیا تم تصور میں لا سکتے ہو کہ اس سے یہ کچھ بن جائے گا؟ یہ کچھ وہاں ہوگا؟ اب اس نے وہ ذرا سی محسوس شکل اختیار کی ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **فَخَلَقَ** (75:38)۔ اب یہاں لفظ خلق آیا۔ خلق کے آگے **فَسَوّٰى** [1] (75:38) آیا۔ اب اس میں تناسب پیدا ہوا۔ وہ گوشت کا ایک لوتھڑا سا ہی ہوتا ہے۔ اب اس کے اندر یہ سارا تناسب ہے: سر ہے‘ آنکھیں ہیں‘ یہ بازو ہیں‘ یہ ٹانگیں ہیں‘ یہ انگلیاں ہیں۔ یہ سب کچھ ہے۔ عزیزانِ من! ''سوّٰی'' کہتے ہیں: حشو و زوائد کو‘ فالتو چیزوں کو‘ اِدھر اُدھر چھانٹ کر‘ الگ کر کے‘ اس میں سے ایک مجسمہ کھڑا کرنا۔ یاد رکھیے! خدا کی ایک صفت **المُصَوِّر** بھی ہے۔ یہ صفت کے مطابق ایک مجسمہ کھڑا کرنا ہے۔

کمہار کے عمل کی مثال

عزیزانِ من! اس کی ایک مثال کمہار کے عمل کی ہے۔ وہ کمہار اپنے اس پہیے کے اوپر‘ مٹی کا اتنا بڑا تودا سا‘ لوتھڑا سا‘ ڈالتا ہے۔ اس پہیے کو گھماتا ہے تو کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کیا کرتا ہے؟ وہ جتنی زائد مٹی ہوتی ہے‘ اُسے الگ کر کے‘ ایک نئی چیز بنا لیتا ہے۔ کبھی آپ نے دیکھا ہوگا۔ یہ بڑی دلچسپ چیز ہے۔ وہ کمہار بڑا ہنرمند ہوتا ہے۔ اس کے یہی دو ہاتھ ہوتے ہیں۔ اس کے پاس ایک تاگا ہوتا ہے‘ تھوڑا سا پانی ہوتا ہے۔ وہ اس کو کچھ یوں کرتا چلا جاتا ہے اور مٹی کو اِدھر اُدھر الگ کرتا چلا جاتا ہے‘ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے آبخورہ بن گیا‘ صراحی بن گئی‘ کسی کا یہ بن گیا اور کسی کا وہ۔ یہ **المُصَوِّر** ہے۔ یہ جو حشو و زوائد کو الگ کر کے‘ صحیح تناسب سے‘ ایک چیز کو پیدا کر دینے کا عمل ہے‘ تسویہ کہلاتا ہے۔ یہاں قرآن ''فسوّٰی'' کہتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ پھر یہ کچھ بھی ہوتا ہے۔ تم میں سے کوئی یہ کچھ نہیں کر رہا ہوتا‘ نہ اس بچے کا باپ کر رہا ہوتا ہے‘ نہ اس بچے کی ماں کر رہی ہوتی ہے‘ نہ وہاں کوئی مشینری لگی ہوئی ہے جو یہ کچھ کر رہی ہے‘ نہ وہاں خراد لگا ہوا ہے جو

---

[1] بعد ازاں اس میں ٹھیک ٹھیک تناسب پیدا ہوا۔

یہ کچھ کرے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کچھ کیسے ہو رہا ہے؟ یہ قانونِ خداوندی ہے جس کی رو سے یہ ہو رہا ہے اور پھر اگلی ہی آیت میں کہا کہ **فَجَعَلَ مِنۡهُ الزَّوۡجَيۡنِ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰى** ❶ (76:39)۔ وہ ایک ہی قسم کا نہیں پیدا ہو جاتا۔ پھر اس میں نر اور مادے کی تمیز پیدا ہوتی ہے۔ دونوں کے طبعی وظائف ہوتے ہیں یعنی یہ جو دونوں کے جسم کے وظائف اور چیزیں ہوتی ہیں وہ اسی جرثومے سے کچھ الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ کہا کہ صرف اتنی سی چیز پہ ہی غور کرو۔ اس کے بعد کہا کہ **اَلَيۡسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنۡ يُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰى** (76:40) کیا یہ کچھ کر لینے والا جو خدا کا قانون ہے، وہ اس پہ قادر نہیں ہے کہ وہ انسان کو پھر زندہ کر دے؟ کیا بات ہے کہ سمجھانے کے لیے دلیل کیا کیا دی ہے! بات تو یہ ہے کہ انسان کی زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے، زندگی آگے چلتی ہے۔ آگے جو زندگی ہے، اس کا دارومدار اُن اعمال پہ ہے جو انسان اس دنیا میں کرتا ہے۔ یہ ارتقائی منزل میں آگے بڑھنا ہے یا وہیں رک کر کھڑے ہو جانا ہے۔ اس رک کر کھڑے ہو جانے کو جہنم یا جحیم کہا جاتا ہے۔ اِس تصورِ حیات کے لیے راستے میں یہی چیز مانع تھی جو یہ کہتے تھے کہ نہیں صاحب! ہم انسان کو دبا دیتے ہیں، اس کو مٹی کھا جاتی ہے، جلا دیتے ہیں، پانی میں گرتا ہے، مچھلیاں کھا جاتی ہیں تو اس کے بعد کس طرح سے کوئی چیز وجود میں آ سکتی ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ یہ ختم ہو گیا۔

کوئی مادہ ❷ ختم نہیں ہوتا

قرآن یہی سمجھاتا ہے کہ تم خود اپنے سائنسدانوں سے پوچھو کہ کیا یہ چیز ختم ہو جاتی ہے؟ سائنسدان تو یہ کہتے ہیں کہ جو Matter (مادہ) ہے، یہ کبھی ختم ہوتا ہی نہیں۔ ''ختم نہیں ہوتا'' کے معنی ہیں کہ اس کا عدم نہیں ہوتا۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس کی Existence (وجود) ختم ہو جائے۔ وہ شکلیں بدلتا ہے، وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ شکلیں ہی بدلتا ہے۔ تو کیا جس نے ایک جرثومے کی شکل بدل کر، ایک تندرست و توانا بچے کی ہیئت میں پیدا کیا، پھر وہ انسان اتنا بڑا بن گیا، کیا اس طرح شکلیں بدلنے والا خدا کا قانون یہ نہیں کر سکتا کہ جسے تم کہتے ہو انسان مر گیا، وہ انسان زندہ ہو جائے۔ اگرچہ دوسرے مقامات پہ یہ بھی کہا ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ہم یہی کہہ رہے ہیں کہ اس قسم کا انسان اسی شکل کا ہوگا یا کچھ اور ہوگا۔ نہیں، کچھ نہیں، تمہارا یہ شعور ابھی نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کس قسم کا ہوگا لیکن یہ سمجھو کہ اس کے بعد وہ زندگی ہے، وہ Individual (فرد) ہے، وہ ہر فرد کی انفرادی زندگی ہے۔ ہر فرد کو اس کا احساس ہوگا کہ میں نے پہلی زندگی بسر کی ہے، وہ اپنے اعمالنامے کو دیکھ کر پہچانے گا کہ اُس میں یہ یہ کچھ اُس نے کیا ہے۔

---

❶ اس میں جنسی تفریق سے مرد اور عورت کے جوڑے بنے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ Matter

سب سے بڑا جہنم

عزیزانِ من! اسے نہ بھولیے جو میں کہا کرتا ہوں کہ سب سے زیادہ جہنم تو یہ ہوگا جو قرآن کہتا ہے کہ وہاں تم بھی ہوگے، جن لوگوں میں تم نے یہاں زندگی بسر کی ہوگی، کسی کو فریب دے کر بسر کی ہوگی، کسی سے منافقت برتی ہوگی، کسی سے جھوٹ بولا ہوگا اور بڑے کاریگر معتبر بن کر وہاں سے چلے آ رہے ہوگے، یہاں آؤ گے تو یہ ساری چیزیں بے نقاب ہونگی اور وہ سارے تمہارے سامنے کھڑے ہونگے۔ اف! جن کے سامنے یہاں آدمی معتبر بننے کی کوشش کرتا ہے، ایک جگہ جھوٹ بول کے کہ کہیں میرا یہ جھوٹ بے نقاب نہ ہو جائے، کسی طرح بات نہ کھل جائے، یہاں یہ کیفیت ہے کہ سب کچھ سامنے ہوگا۔ وہاں صورت یہ ہوگی کہ تم ہوگے اور یہ سب ہونگے اور یہ سب کچھ جو لکھا ہوا ان کے سامنے آئے گا کہ دل میں اس کے یہ تھا، کہہ تمہیں یہ رہا تھا۔ وہ پوچھیں گے کہ کیوں حضرت صاحب! وہاں تو بڑے مقدس اور معتبر بنے بیٹھے تھے، اور حالت آپ کی یہ تھی۔ اور پھر قرآن یہ کہتا ہے کہ کسی قسم کی کوئی بہانہ سازی اور عذر وہاں کام نہیں دے سکے گا، حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے گی۔ سب سے بڑا جہنم تو وہ ہے، عزیزانِ من! تو یہ ہے قرآن کی تعلیم کا نکتہ ماسکہ کہ تمہارا ہر عمل، ہر کام، ہر آرزو اور ہر ارادہ تک اپنا نتیجہ، محسوس نتیجہ، برآمد کر کے رہے گا۔ یہاں نہیں تو اگلی زندگی میں سہی اور یہ قرآن کی ساری تعلیم کا ملخص ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ القیٰمۃ، آج اس آیت پر ختم ہوگئی۔ آئندہ ہم سورۃ الدھر لیں گے۔ یہ 76 ویں سورۃ ہے اور **هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ** سے شروع ہوتی ہے۔ کیا بات ہے کہ یہ پچھلی آیت کے تسلسل میں ہی یہ چیز آ رہی ہے۔ **هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا** ❶ (76:1)۔ وہاں سے بات شروع ہوتی ہے کہ یہ انسان اس قابل بھی نہیں تھا کہ اس کے متعلق تم کوئی لفظ بھی استعمال کر سکو۔ تمہارے پاس ڈکشنری کے اندر کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جو بتا سکو کہ اس سے پہلے یہ کیا تھا۔ جسے تم Non-existence (عدم) کہہ دیتے ہو، صرف عدم کہہ دیتے ہو، موجود نہیں ہے کہہ دیتے ہو، یہ کیا تھا؟ تم نہیں کہہ سکتے۔ یہ ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

---

❶ یہ حقیقت ہے کہ انسان (جو اس وقت پیکر بشریت میں موجود ہے) اس پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب یہ کوئی شے نہ تھا جو از خود موجود ہوتی۔ (پھر ہم اسے، مختلف مراحل سے گزارتے ہوئے، آہستہ آہستہ اس مقام تک لے آئے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

چھبیسواں باب: سورۃ الدھر (آیات 1 تا 9)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1984ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الدھر سے ہو رہا ہے۔ یہ انیسویں پارے کی 76 ویں سورۃ ہے۔ سابقہ سورتوں میں اور بالخصوص سابقہ درس میں' جو آیات آئی تھیں' ان میں ایک بات تسلسل سے چلی آ رہی تھی۔ انہیں کہا جاتا تھا کہ تمہارے غلط اعمال' غلط نظام' غلط روشِ زندگی' تباہ کن نتائج پیدا کریں گے۔ وہ اس زندگی میں سامنے آئیں یا اس کے بعد کی زندگی میں آئیں لیکن آئیں گے ضرور کیونکہ زندگی مسلسل چلتی ہے' موت سے اس کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ ظہورِ نتائج کے اسی لمحہ کو قیامت کہیے' اسی کو حشر کہیے۔

وہ یہ اعتراض کرتے تھے کہ جب انسان مر جاتا ہے' اس کا جسم گل سڑ جاتا ہے' ہڈیاں خاک میں مل جاتی ہیں' تو اس کے بعد پھر انسان کا پیدا ہونا' اُسے حیاتِ نو کا ملنا' کس طرح ممکن ہے؟ اس کا جواب انہی کی علمی سطح کے مطابق یہ دیا کہ یہ تو تم ایک انسان اور اس کے جسم کی بابت کہہ رہے ہو' یہ سارا سلسلہ کائنات' عدم (Nothingness) سے پیدا ہوا کہ کچھ نہ تھا۔ یہ تم سب مانتے ہو۔ تمہارے بڑے بڑے سائنسدان بھی مانتے ہیں کہ بہرحال یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ کچھ نہ تھا۔ جس خدا نے ''اس کچھ نہ تھا'' سے اتنا عظیم سلسلہ کائنات پیدا کر دیا تو کیا اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ ایک انسان کے جسم کو زندہ کر دے جس کی یہ چیزیں بہرحال موجود ہیں' ان کی شکل ہی بگڑی ہے' ہڈیاں ہڈیوں کی شکل میں نہیں' تم خود مانتے ہو کہ وہ خاک کے ساتھ ملی ہوئی ہیں' بہرحال اس کے جسم کا گوشت پوست جو ہے' وہ تو مانتے ہو کہ کیڑے کھا گئے ہیں' مگر پھر بھی کچھ تو موجود ہے۔ بات تو یہ ہے کہ جب کچھ بھی موجود نہیں تھا تو وہ اتنا بڑا سلسلہ کائنات وجود میں لے

آیا۔اس کے لیے کیا یہ ناممکن ہے کہ وہ انسان کو پھر سے زندہ کر دے؟ یعنی وہ جوان کا اعتراض تھا کہ جب جسم انسانی کا کچھ نہیں رہتا' تو پھر وہ کیسے زندہ ہو جائے گا؟ ان کا علمی و عقلی سطح پہ جواب یہ دیا ہے کہ جب'' کچھ نہیں تھا'' تو اس سے خدا اتنا بڑا سلسلہ کائنات وجود میں لے آیا تو اس کے لیے کیا یہ ناممکن ہے کہ انسان کے جسم کو دوبارہ پیدا کر دے؟ میں یہ عرض کر دوں کہ قرآن کریم نے یہ کہا ہوا ہے کہ بعد کی زندگی میں انسان کس پیکر میں ہوگا' اس کی شکل وصورت کیا ہوگی' اس کے متعلق انسانی شعور کی موجودہ سطح اس زندگی کو سمجھ نہیں سکتی' اس کے لیے تو ہمیں صرف اس بات پہ ایمان لانا ہے کہ وہ زندگی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ یہاں جو کچھ انسان نے کیا ہے' اگر اس کے نتائج یہاں اس زندگی میں سامنے نہیں آئے تو وہاں اگلی زندگی میں اس کے نتائج اس کو بھگتنے پڑیں گے۔

جنت ہو یا جہنم [1] اس کی کیفیات کو قرآن نے تمثیلاً بیان کیا ہے

مرنے کے بعد اپنی حیاتِ نو میں وہ کس شکل میں ہوگا' ہئیت کیا ہوگی' صورت کیا ہوگی؟ انسانی شعور کی موجودہ سطح اسے نہیں سمجھ سکتی۔ قرآن میں خدا کہتا ہے کہ ہم یہ جنت بھی' جہنم بھی' مثال کے طور پر' تمثیلاً' بیان کرتے ہیں: یوں نہ سمجھو کہ ہم جن لفظوں میں بیان کرتے ہیں' وہ انہی لفظوں میں وہی کچھ ہے۔ جب آگ کہتے ہیں تو یہ آگ وہی نہیں ہے جو تمہارے تندور میں جلائی جاتی ہے۔ یہ ہم مثال کے طور پر بیان کرتے ہیں لیکن انہیں جو جواب دیا ہے' وہ ان کی سطح پہ' ان کی منطق کا' جواب ہے' جو کہتے تھے کہ جب یہ جسم اس شکل میں نہیں رہے گا' تو جسم کیسے بن سکتا ہے۔ یعنی انہوں نے کہا تھا کہ یہ ناممکن ہے کہ ایسا ہو۔ ان سے کہا گیا کہ کیا یہ جو چیز ہے کہ'' کچھ نہیں تھا'' اور اتنا بڑا سلسلہ کائنات وجود میں آ گیا' ویسے تمہارے ذہن میں آ سکتا ہے کہ یہ ممکنات میں سے تھا' اور یہ تم اپنے سامنے دیکھ رہے ہو۔ قرآن کا انداز ایسا ہے کہ وہ ہر سطح کے اوپر' انسان کو اس کی علمی سطح کے مطابق جواب دیتا ہے۔ اور یہ چیز آج کا بڑے سے بڑا سائنسدان بھی کہہ رہا ہے کہ جب ہم پیچھے لوٹتے چلے جاتے ہیں تو یہ جو Cause & Effect (علت ومعلول) کا قانون ہے' جسے ہم کہتے ہیں کہ اس چیز سے یہ پیدا ہوا' اس سے وہ پیدا ہوا' آخر میں جا کر ایک مقام ایسا آ جاتا ہے جہاں ہم مبہوت رہ جاتے ہیں کہ پھر کس طرح سے یہ کچھ بن گیا یا ہو گیا تو وہ مقام یہی ہے' جس کے متعلق قرآن یہ کچھ کہتا ہے۔ اس کے بعد یہ اگلی سورۃ شروع ہوئی ہے۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ یہ آخری دو پاروں کی سورتیں ہیں' ان کا زیادہ زور قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے' اُخروی زندگی پر ہے' اور اسی کو مختلف پیرائے میں اس نے بیان کیا ہے۔ تو یہ جو بات انسان کی آ گئی تھی کہ یہ کیسے ہوگا کہ وہ پھر دوبارہ زندہ ہو جائے' اس کے لیے کہا کہ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا (76:1) کیا انسان پہ وہ وقت نہیں آ چکا'

---

[1] جہنم کی مختلف شکلیں اور نوعیتیں نیز جنت کے متعلق قرآن کے تصور کی مزید تشریح وتبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔96-84 اور ص 185 کا فٹ نوٹ نمبر 1۔

یہ اس دور میں سے نہیں گزرا کہ جب یہ **لَمۡ یَكُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡكُوۡرًا** (76:1) تھا۔ ترجمہ تو یہ کیا جائے گا کہ جب یہ کوئی قابلِ ذکر شے ہی نہیں تھا۔

انسان تھا مگر شیئاً مذکورًا نہ تھا

یہ قابلِ ذکر کی بات یوں نہیں ہے۔ اس وقت تو پھر بھی یہ ہوگا کہ ''کچھ تو تھا''۔ وہ یہ کہہ رہے ہو کہ قابلِ ذکر نہیں تھا۔ ہمارے ہاں اردو کے ''مذکور'' کے معنی قابلِ ذکر ہے۔ عربی میں مذکور ہوتا ہے کہ ''جو خود اپنے وجود میں موجود ہو''۔ یعنی یہ جو تم کہتے ہو کہ خدا کوئی نہیں ہے جس نے یہ کچھ پیدا کیا' یہ خود موجود نہیں تھا۔ عربی زبان کے اندر مذکور کے معنی SelfExistence ہوتے ہیں۔ تو انسان کے متعلق یہ چیز ہے کہ اس پر ایک وقت ایسا بھی تھا کہ یہ کچھ نہیں تھا۔ اب اس میں دو تین الفاظ آتے ہیں: **هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ** (76:1) یہ ایک تو ''دھر'' کا لفظ ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ زمانہ کیا جائے گا' ٹائم کیا جائے گا۔ یہ لفظ زمان کے لیے بھی آتا ہے۔

وقت کیا ہے؟ اس پر بحث کر کے کچھ حاصل نہ ہوگا

عزیزانِ من! ہمارے ہاں' پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ جو زمان یا ٹائم ہے' یہ فلسفے میں اتنا مشکل مسئلہ ہے کہ بڑے بڑے فلاسفر بھی ہار تھک کر کہہ جاتے ہیں کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اگر آپ کسی وقت عام سطح پہ بھی سوچیں' جیسے ہم یہ کہیں گے کہ خدا ابتدا سے ہے تو ابتدا کے لفظ کے کیا معنی ہونگے؟ یعنی ذہنِ انسانی اس وقت سے آگے سوچ ہی نہیں سکتا' جسے ازل کہتے ہیں۔ وقت سے ہٹ کر کوئی بات ذہن میں آ نہیں سکتی یا جسے ''ابد'' کہتے ہیں' ''ہمیشہ'' کہتے ہیں: خدا ہوگا' ہمیشہ تک ہوگا' بات ذہن میں نہیں آ سکتی۔ انسانی ذہن محدود ہے۔ کوئی لامحدود شے' محدود ذہن کے اندر آ ہی نہیں سکتی۔ ہر چیز کے متعلق یہ کہنا کہ یوں پیدا ہوا' یوں پیدا ہوا' آخر میں کہتے ہیں کہ پھر خدا کس طرح سے پیدا ہوا ہے؟ وہ لامحدود ہے' محدود میں نہیں آ سکتا۔ اس لیے میں یہ عرض کرونگا کہ آپ میں سے جو احباب فلسفے سے کچھ دلچسپی رکھتے ہیں' وہ یہ ٹائم یا زمان کے فلسفے کے متعلق بالکل الجھن میں نہ پڑیں۔ وقت توانائیاں ضائع ہو جائیں گی' پریشانیاں آ جائیں گی' اس کے بعد کچھ پلے نہیں پڑے گا اور آخر میں وہ بات ہوگی جو اقبالؒ (1938-1877ء) کہہ گیا کہ ''ہے فلسفہ زندگی سے دُوری''۔ ان چیزوں کا عملی زندگی سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ بس اسے یوں سمجھو کہ بیٹھے ہیں' ڈور کو سلجھا رہے ہیں' اور سرا ملتا نہیں۔ اور اکبر الہ آبادی (1846-1921) اپنے انداز میں بڑا صحیح کہہ گیا ہے کہ

فلسفی ❶ بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

اس اکبر الہ آبادی کا انداز اپنا تھا۔ کیا بات ہے اس بحث کی! یہ فالتو عقل کی بات ہے۔ تو ادھر بالکل نہ آیئے۔ یہ ہیچ میرز ❷ بھی زندگی کا

---

❶ اکبر نے فلسفی کی جگہ مذہبی کہا ہے۔ ❷ پرویزؒ کا اشارہ اپنی ہی طرف ہے۔

خاصا وقت' خاصا عرصہ انہی وادیوں میں گذار چکا ہے۔ اس طرف بالکل نہ آیئے گا' فائدہ کچھ نہیں ہے' اس کا زندگی کے عملی مسائل سے کچھ تعلق نہیں۔اسی لیے قرآن بھی ان بحثوں میں نہیں پڑتا' سیدھی بات ہے۔ اب یہ کہ عربی زبان میں بھی دو الفاظ ہیں۔سمجھ نہیں آتی کہ اس زبان کے متعلق میں کیا کہوں' کیا عرض کر دوں کہ جب یہ ہمارے ہاں کے فلسفے والے آخر میں پہنچے ہیں' تو وہ بھی دو قسم کا ٹائم تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ دو قسم کا ٹائم ہوتا ہے: ایک Duration-less Time (بے دورانیہ زمان' طویل المدت عرصہ) ہوتا ہے۔اور دوسرا Serial Time (مبنی بر سلسلہ زماں) ہوتا ہے۔آپ اس بحث میں نہ پڑیئے کہ یہ کیا ہوتا ہے اور وہ کیا ہوتا ہے۔ بہر حال ٹائم کے دو قسم ہی ہیں۔

قرآنی الفاظ دہر اور عصر (زماں) کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ عربوں کی زبان ہے' یہ ان پڑھ قوم ہے' دورِ جاہلیت میں زندگی بسر کرتے ہیں' ان کی زبان میں بھی ٹائم کے دو الفاظ ہیں: دہر بھی ہے اور عصر (زماں) بھی ہے۔فلسفہ تو ایک طرف رہا ہے' ان کے ہاں عام طور پہ عقل و شعور کی کوئی بات بھی نہیں ملتی لیکن زبان کے اندر ٹائم کے لیے یہ دو الفاظ موجود ہیں اور وہ ان دونوں میں تفریق کرتے تھے۔''ابتدا سے انتہا تک طویل المدت عرصہ کو'' وہ دہر کہتے تھے اور عصر (زماں) کہتے تھے''تھوڑے وقت کے لیے جو ٹائم ہو۔'' بہر حال قرآن نے یہاں دہر کہا ہے کہ کیا دہر میں' ٹائم میں' وہ لمحہ' وہ وقفہ' نہیں آچکا کہ جب انسان وجود میں ہی نہیں تھا۔قرآن نے دہر کیوں کہا۔اس لیے کہ عربوں کے ہاں ایک عقیدہ تھا کہ تمہیں دہر مارتا ہے' یہ نہیں تھا کہ دہر پیدا بھی کرتا ہے۔اور قرآن کریم نے دوسری جگہ بھی اِسے بیان کیا ہے۔اس لیے ان کے ہاں اس کے لیے دو الگ الگ الفاظ ملتے ہیں۔

تخلیق اور امر کا مفہوم

یہ ہماری زبان کی کوتاہ دامنی ہے کہ ہمارے ہاں اس عمل (Process) کے لیے ایک ہی لفظ ہے۔اس [1] نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں صرف Creation (تخلیق) کا ایک ہی لفظ ہے' جس کے معنی ہوتے ہیں: پیدا کرنا' تخلیق کرنا۔وہ [1] کہتا ہے کہ ان عربوں کے ہاں

---

[1] یہ اشارہ پرنگل پیٹیسن (Pringle - Pattison 1856-1931) کی طرف ہے۔علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات کے ص۔82 پر اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

Pringle- Pattison deplores that the English language possesses only one word - Creation - to express the relation of God and the universe of extension on the one hand, and the relation of God and the human ego on the other. The Arabic language is, however, more fortunate in this respect. It has two words 'Khalq, and 'Amr' to express the two ways in which the creative activity of God reveals it self to us (Iqbal, Alama Muhammad: The Reconstruction of Religious Thonght in Islam, in Shaikh, M. Saced (Ed). Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1989)

ایک لفظ ''امر'' ہے۔ وہ اُس زمانے میں ان چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جب وہ چیزیں ابھی مخلوق کے درجے میں نہیں آئی ہوتیں' بلکہ اس سے پہلے درجے میں ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ امر کا درجہ ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـئًا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ** ❶ (36:82)۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو Creation (تخلیق) کا مرحلہ ہے' اس کے لیے تو ان کے ہاں ''امر'' کا یہ لفظ موجود ہے۔ لیکن ''امر'' کے لیے انگریزی زبان میں کوئی لفظ نہیں ہے۔ اِن عربوں نے امر کا درجہ الگ رکھا۔ وہ درجہ شے کے بن جانے کے مرحلے سے پہلے آتا ہے۔ لہٰذا اس مرحلے کے بعد' اگلا لفظ' جو دوسرے مرحلے کے لیے ہے' وہ لفظِ تخلیق ہے۔ علاوہ ازیں ایک لفظ تولید (Procreation) کا بھی ہے۔ وہ میں ابھی عرض کرونگا۔ یہ یاد رکھیے کہ ''امر'' عدم سے کسی شے کو وجود میں لانے کی چیز ہے۔ اس لیے خدا کہتا ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے' دہر نے پیدا نہیں کیا ہے۔ یہ ارشاد خداوندی ہے۔ پھر کہا کہ یہ تم بھی کہتے ہو کہ تمہیں دہر مارتا ہے۔ ان عربوں کا عقیدہ یہ تھا کہ دہر مارتا ہے۔ یہ نہیں تھا کہ دہر پیدا بھی کرتا ہے۔ ایک ایسا وقت بھی تھا جب انسان اس ہیئت میں ہی نہیں تھا' تو اس وقت ہم نے اسے پیدا کیا ہے اور پیدا کرنے کے لیے پھر وہ جو Cause & Effect (علت و معلول) کا سلسلہ ہے' کہ اِس سے یوں ہوتا ہے' اور اس سے ووں' اسے گنا دیا۔ اس طرح اب وہ کڑیاں گنا دیں۔

عزیزانِ من! ''امر'' کے بعد تخلیق کا مرحلہ قرآنِ کریم میں بھی ہے اور عربی زبان میں بھی۔ وہ یہ ہے کہ جب کوئی شے محسوس طور پر سامنے آ جائے' یعنی جتنی مختلف موجود چیزیں ہیں' ان کو کسی طرح خاص توازن کے ساتھ' خاص تناسب کے ساتھ' مختلف Proportion (تناسب) کے ساتھ ملایا جائے تو نئی چیز کی تخلیق ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ آکسیجن اور ہائیڈروجن موجود ہیں' صرف انہیں ایک خاص تناسب سے ملانا ہے' یعنی اتنا یہ لیا' اتنا وہ لیا' اتنی ہائیڈروجن لی' اتنی آکسیجن لی' اور پانی کا قطرہ بن گیا۔ اسے تخلیق کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ زبان کے اعتبار سے بھی یہ عربی زبان عجیب و غریب زبان تھی' اس لیے قرآن جیسی حقائق بیان کرنے والی کتاب کے لیے' اس کا انتخاب عمل میں آیا۔ ''امر'' تو وہ ہے کہ جہاں یہ Cause and Effect (علت و معلول) کا سلسلہ ہی نہیں ہے' جہاں کوئی شے ہی نہیں ہے اور وہ ایک شے وجود میں آتی ہے۔ وہاں اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ مختلف چیزوں کو ملا کر کچھ بنایا جائے۔ جب وہ شے اس طرح ''امر'' سے وجود میں آ جاتی ہے تو پھر یہ جو ہمارے ہاں Cause & Effect (علت و معلول) کا سلسلہ ہے' یہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے قرآنِ حکیم نے کہا کہ **اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ** ❶ (76:2) ہم نے انسان کو **مِنۡ نُّطۡفَةٍ** پیدا کیا۔ اب دیکھیے چودہ

---

❶ اسے (خدا کو) تخلیق کے لیے' کہیں سے کوئی مسالہ (Material) مانگ کر لانا نہیں پڑتا۔ اس کا قانونِ تخلیق یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے' تو اس ارادے کے ساتھ ہی اس شے کی تخلیق کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سوسال پہلے عرب جیسی قوم ہے کہ اسے تخلیق انسانی کے مراحل گنائے جا رہے ہیں۔ مِنۡ نُّطۡفَةٍ (76:2) سے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ جو سلسلہ توالد یا تناسل (Pro-creation) کا ہے' اس کے ذریعے وہ وجود میں آتا ہے۔

لفظ امشاج کی تشریح

عزیزانِ من! پھر آگے یہ انسان بنتا ہے۔ اس کے متعلق ''امشاج'' کا ایک لفظ کہا ہے۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ میں نے پچھلے درس میں بھی غالباً کہا تھا اور اب یہ کہنے کی مزید ضرورت نہیں ہے کہ وہ جو دیکھنے میں تو ذرا سا قطرۂ آب تھا بلکہ وہ ایک قطرے سے بھی کم' ایک شے ہے' جسے ہم اور وہ [2] تولید (Pro-creation) کا' نسل کا' منی کا' سیل (Cell) کہتے ہیں۔ اس کے اندر کروڑوں سے بھی زیادہ کروڑ در کروڑ مزید جرثومے ہوتے ہیں' سیلز (Cells) ہوتے ہیں' اور ان میں ایک بچہ پیدا کرنے کے لیے ایک سیل کافی ہوتا ہے۔ جب مرد اور عورت کے وہ دونوں سیل مل جائیں تو تخلیق ہوتی ہے۔ اس ایک سیل کے اندر یہ پورا انسان' تمام تر صلاحیتوں کے' جوہروں کے' مختلف قسم کی خصوصیات کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ ایسی شے' جس میں مختلف قسم کی چیزیں' مضمر شکل میں' Potential (صلاحیت) صورت میں' موجود ہوں' عربی زبان میں اسے امشاج کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ [3] (76:2)۔

عزیزانِ من! غور فرمائیے کہ قرآن یہ چیزیں کس دور میں کہہ رہا ہے۔ انتہا درجے میں' آج بھی سائنس' جہاں تک پہنچی ہے' وہ یہی چیز ہے۔ سائنسدانوں کا ذہن آج بھی اس کے لیے حیرت کدہ ہے اور وہ پکار اٹھتے ہیں کہ یہ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا کہ وہ جو یہ ایک جرثومہ ہے' جسے Naked Eye (خالی آنکھ) سے دیکھا نہیں جا سکتا' مائیکروسکوپ (خوردبین) سے دیکھا جا سکتا ہے' اس کے اندر یہ تمام صلاحیتیں' جوہر' مختلف قسم کی خصوصیات' یہ سارے Potential Form میں' مضمر شکل کے اندر' صرف اس اتنے سے ذرے کے اندر' کس طرح مضمر ہوتے ہیں' کس طرح ہوتے ہیں۔ یہ تو ابھی کوئی بھی نہیں کہہ سکا لیکن قرآن نے امشاج کے لفظ سے یہ بتا دیا کہ اس کے اندر مختلف قسم کی خصوصیات' جوہر اور مضمرات' مضمر شکل کے اندر ہوتے ہیں' Potential صورت کے اندر ہوتے ہیں۔ کیا بات ہے!

نَبۡتَلِيۡهِ کا ترجمہ

میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں کے عام ترجموں سے یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کا عام ترجمہ تو یہی ہوتا ہے کہ ہم نے

---

1. ان مراحل میں ایک مرحلہ وہ تھا جب اسے نطفہ سے پیدا کیا۔
2. اس سے مراد سائنسدان ہیں۔
3. وہ جرثومہ' وہ ذرا سا قطرہ آب (نطفہ) درحقیقت گوناگوں مخلوط ممکنات کا مجموعہ ہے۔ (امشاج)

اسے ملے ہوئے نطفے سے پیدا کیا اور اس پیدا کرنے کے لیے وہ آسان سی بات کہدی کہ مرد اور عورت کا وہ نطفہ ملتا ہے۔ ''امشاج'' میں یہ بات نہیں تھی کہ ان مضمر چیزوں کی نمود کس طرح ہوگی۔ قرآن کریم نے لفظ نَبۡتَلِیۡهِ (76:2) سے وہ بات واضح کر دی۔ عام تراجم سے تو یہ اگلی بات سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ یہ نبتلیہ کا ترجمہ کرتے ہیں کہ ہم اسے آزماتے ہیں۔ آپ بتائیے کہ یہاں اس ترجمے کے اندر کیا ربط ہے' کیا تک ہے؟ یہ کہ وہ ایک نطفہ ہے' جس کے اندر یہ تمام مضمرات موجود ہیں' اس سے ہم نے انسان کو پیدا کیا' وہ تو ابھی رحمِ مادر کے اندر ایسی شکل ہے' ابھی بچہ بھی نہیں بنا۔ یہاں اس ترجمے سے یہ ہے کہ ہم اسے آزماتے ہیں۔ کیا یہ آزمانے کی بات کوئی بات بھی ہے؟ ابتلاء کے معنی آزمانا ہی غلط ہے۔ یہ عجیب الفاظ ہیں! اور کیا بات ہے قرآن کے انتخاب کی!

عزیزانِ من! ''بلاء'' ہوتا ہے کسی شے کو اس طرح سے گردشیں دینا کہ جو چیزیں اس میں مضمر ہیں' پنہاں ہیں' ان کی نمود ہو جائے۔ اب تو ہمارے ہاں یہ جو الفاظ ہیں' وہ اساطیر کہن ہو گئے ہیں' پرانے زمانے کی باتیں ہو گئی ہیں' ورنہ میں عرض کرتا ہوں کہ دودھ ہوتا تھا' پھر دہی ہوتا تھا' وہ بلونی ہوتی تھی۔ دودھ کو بلویا جاتا تھا' رڑکیا جاندا سی۔ [1] بلونی سے بلویا جاتا ہے۔ اس وقت اس دہی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے اندر جو لسی ہوتی ہے' وہ الگ ہو جاتی ہے اور اس کے اندر جو مکھن پنہاں ہوتا ہے' وہ اوپر آ جاتا ہے۔ وہ بلونی جس طرح گردش کرتی ہے اس کے لیے یہ بلاء کا لفظ ہوتا ہے۔ گردش ہونے کے بعد کیا ہوتا تھا؟ وہ جو اس دہی کے اندر' یا دودھ کے اندر' مکھن پنہاں ہوتا تھا' وہ اوپر آ جاتا تھا۔ اس سارے پراسیس (Proeess)' عمل کے لیے عربی زبان میں یہ لفظ ''بلاء'' آتا ہے۔

مضمر صلاحیتوں کی نمود کا ہونا

عزیزانِ من! یہ کیا قوم تھی! ان کے ہاں یا تو اونٹنی کا دودھ ہوتا تھا یا بھیڑوں کا دودھ۔ اس سے وہ کیا جماتے' یعنی Fermentation کرتے اور پھر کیا بلوتے؟ کچھ بھی نہیں۔ لیکن اس عمل کے لیے ان کی زبان میں الفاظ موجود تھے۔ اس پراسس (عمل) سے' جو چیز مضمر یا Potential ہوتی ہے وہ Actualize (بارز) ہو جاتی ہے' اس کی نمود ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے وہ شے نمود میں آ جاتی ہے۔ اس میں کچھ گردشیں آتی ہیں' وہ چیز پہلو بدلتی ہے اور پہلو بدلتے بدلتے جو چیز اس کے اندر مضمر ہوتی ہے' اس کی نمود ہو جاتی ہے۔ اس تمام پراسس (عمل) کے لیے یہ ایک بلاء کا لفظ ہے: (۱) پہلو بدلنا' گردش کرنا اور (۲) مضمر شے کی نمود ہو جانا۔ ان دونوں کے لیے ان کے ہاں ابتلاء کا ایک ہی لفظ ہے۔ ہمارے ہاں یہ لفظ ''آزمائش میں ڈال دینا'' کے لیے آتا ہے یعنی ابتلاء کے معنی آزمائش ہوتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ خدا یہ کہتا ہے: ہم آزماتے ہیں۔ عزیزانِ من! بات دوسری طرف نکل جائے گی۔ ایک تو خود خدا کے متعلق یہ کہنا کہ ''ہم انسان کو آزماتے ہیں کہ دیکھیں یہ کیا کہتا ہے۔ کیا خدا کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ یہ کیا کہے گا' اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ وہ بھی آزماتا رہتا ہے یا نہیں' مگر اسیں

---

[1] بلویا جاتا تھا۔

تے آزماندے ساں۔ ❶ وہ کہیں گے کہ خدا کے بڑے نیک بندے ہیں' نیک بندوں پہ مصیبتیں آتی ہیں۔ اس بات کا انہیں جواب نہیں آتا کہ خدا کے نیک بندوں پہ مصیبتیں کیوں آتی ہیں؟ کہتے ہیں کہ جی! ایک غلط تصور کے تحت ہمارے ہاں یہی کہا جاتا ہے کہ خدا اپنے نیک بندوں کو آزماتا رہتا ہے۔ جب کہ اس لفظ ''بلاء'' کے معنی ہیں: گردشیں دینا' پہلو بدلنا تا کہ مضمر صلاحیتوں کی نمود ہو جائے۔

زندگی میں پہلو بدلنا

عزیزانِ من! زندگی میں پہلو بدلتے ہیں' ہر شخص کی زندگی میں پہلو بدلتے رہنے سے مختلف گوشے سامنے آتے ہیں۔ یہ چیز ہے جسے ہم عام طور پر گردش کہہ دیتے ہیں۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اس کے اندر جو چیزیں پنہاں ہیں' اس گردش کے اندر آتے ہوئے' وہ باہر آ جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! واقعی وہ باہر آ جاتی ہیں۔ کبھی کسی پہ کوئی تکلیف نہ پڑی ہو تو اس کے کتنے ہی مضمر جوہر ہوتے ہیں' جو بے نمود ہی رہ جاتے ہیں۔ اس تکلیف کے وقت بیشمار چیزیں ہیں' جو باہر آتی ہیں' مثلاً غصے میں اس کے اندر سے کیا کیا چیزیں نہیں باہر آتیں' اسی طرح تمول میں' افراطِ دولت میں' کیا کیا چیزیں باہر نہیں آتیں۔ یہ چیزیں نہ ہوں تو انسان کا پتہ ہی نہ چلے کہ اس کے اندر کیا چھپا ہوا ہے۔ خود اِسے اپنے متعلق بھی پتہ نہیں چلتا کہ میرے اندر کیا کیا جوہر پنہاں ہیں۔ یہ ابتلاء کا کیا ایک لفظ ہے کہ گردشیں دیتے ہیں' زندگی میں پہلو بدلتے ہیں تا کہ اس کے اندر کی جو چیزیں مضمر ہیں وہ نمودار ہو جائیں۔ ''بارز'' لفظ کے معنی کسی چیز کا محسوس شکل میں اوپر آ جانا یا نمود میں آ جانا ہوتے ہیں۔ ابتلاء کے اس ایک لفظ میں یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ وہاں رحمِ مادر کے اندر یہ دونوں ملتے ہیں پھر وہاں ہوتا کیا ہے؟ کہا کہ وہاں ہم ان نر اور مادہ' مرد اور عورت کے جرثوموں ❷ کو نمود کی خاطر گردش دیتے ہیں' ان کی نمود کے لیے ان کے پہلو بدلتے رہتے ہیں' تا کہ اس کے اندر جو چیزیں مضمر یا پنہاں تھیں وہ بارز ہو جائیں' محسوس ہو جائیں' ان کی نمود ہو جائے۔

لفظ ''فجعلنا'' کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ کچھ کہنے کے بعد قرآن نے کہا کہ **فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا** (76:2) اس طرح ہم اسے سننے' دیکھنے والا بنا دیتے ہیں۔ کیا بات ہے' عالمِ امر اور عالمِ خلق کی! یہاں تخلیق کے بعد ''فجعلنا'' کا لفظ آیا ہے۔ اب یہ تیسرا لفظ آ گیا۔ ان عربوں کے ہاں تخلیق سے بھی الگ یہ ایک لفظ ہے۔ بہرحال وہ تخلیق میں تو آ گیا' خواہ وہ کیسا ہی لوتھڑا ہو۔ وہ رحمِ مادر کے اندر ابتدائی حالت میں ہے۔ وہ تخلیق کے مرحلے میں تو آ گیا۔ اب اس کو گردشیں دینے کے بعد' جو گائنا کالوجی کے اس علم سے واقف ہیں' وہ جانتے ہیں کہ پھر

---

❶ مگر ہم تو آزماتے ہیں۔

❷ نر کا Spermatozoon (بالغ نر تولیدی خلیہ) اور عورت کا Ovum (مادہ تولیدی خلیہ)

رحمِ مادر کے اندر اس لوتھڑے میں کس طرح گردشیں ہوتی ہیں۔ یہ لوتھڑا' وہاں نو مہینے تک' کیا کیا پہلو بدلتا ہے۔ اس کے بعد یہ کہا کہ **جَعَلۡنٰهُ سَمِیۡعًا بَصِیۡرًا** (76:2) اسے سننے والا' دیکھنے والا بنا دیا۔ یہ وہی ہے جسے تخلیق کیا تھا' جس شکل میں گردشیں دیں' گردشیں دینے کے بعد اسے سننے والا' دیکھنے والا بنا دیا۔ سوال یہ ہے کہ اسے کاہے کے لیے یہ کچھ بنا دیا؟ اب یہ ہے قرآن۔ یہاں تک تو ایسے نظر آتا ہے کہ سائنس کا ایک فارمولا ہے' وہ بیان کیا جا رہا ہے' ساری چیز بالکل Scientific (سائنسی) ہے۔ یہ ٹھیک ہے یہاں تک تو یہ ہے۔ آگے اس کا Purpose (مقصد و مدعا) آ جاتا ہے' اُسے یہاں پھر جو دہریہ سائنسدان ہے وہ رُک کر کھڑا ہو جاتا ہے لیکن قرآن اسے آگے لے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُسے سننے والا بھی' دیکھنے والا بھی اس لیے بنا دیا کیوں کہ **اِنَّا هَدَیۡنٰهُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوۡرًا** ❶ (76:3)

زندگی کے دو راستے ہیں

اب اس کے سامنے زندگی کے دو راستے ہیں۔ اس سے یہ کہا کہ بصیرت سے کام لو' بصارت سے کام لو' سماعت سے کام لو' ان تمام چیزوں سے کام لو۔ کام لینے کے بعد پھر ان میں سے جو راستہ تم چاہتے ہو' خود اختیار کرو۔ اب یہ جو اسے اختیار و ارادہ دیا تھا تو اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ یہ صاحبِ سماعت و بصارت ہو۔ سمع و بصر کے معنی ہوتا ہے کہ انسان تمام Senses (حواس) کے ذریعے معلومات حاصل کر کے کسی نتیجے پہ پہنچے۔

فواد اور قلب کا استعمال

قرآن نے حواس (Senses) کے ذریعے معلومات حاصل کر کے کسی نتیجہ تک پہنچنے کے لیے یہاں جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ دو ہی ہیں' ورنہ تیسری چیز فواد بھی آتا ہے' قلب بھی آتا ہے۔ انسان دیکھتا ہے' سنتا ہے' حواس کے ذریعے اس تک خبریں پہنچتی ہیں' پھر اس کے اندر کوئی شے ہے' جسے اب تک Scientists (سائنسدان) بھی متعین نہیں کر سکے کہ وہ کیا ہے' جو اسے کسی فیصلے پہ پہنچاتی ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ غلط یا صحیح قوت حاصل ہوتی ہے تو کسے استعمال کرنا ہے؟ یہ اس کے اندر جو کیسے والی بات ہے' وہ کیا ہے؟ پہلی چیز یہ ہے کہ اس کے

---

❶ [ان کے اسی صاحب بصیرت وسماعت (سوچنے سمجھنے کے قابل) ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ اسے دیگر کائنات کی طرح ایک خاص راستے پر چلنے کے لیے مجبور نہیں پیدا کیا گیا' بلکہ اسے زندگی کے مختلف راستوں میں سے کسی ایک کے منتخب کر لینے کا اختیار دیا گیا ہے]۔ اس کی سماعت وبصیرت اس کا فیصلہ تو کر سکتی ہے کہ وہ کونسا راستہ اختیار کرے' لیکن صحیح راستے کا تعین ان کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف وحی خداوندی کر سکتی ہے چنانچہ خدا نے اسے وحی کے ذریعے صحیح راستہ بتا دیا' اور اسے آزاد چھوڑ دیا کہ یہ چاہے تو اس صحیح راستے کو اختیار کر لے اور چاہے اس سے انکار کر کے' اپنے لیے دوسرا راستہ اختیار کر لے۔ اسی سے یہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے' اور مستوجب جزا و سزا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لیے سماعت اور بصارت والا ہونا ضروری ہے۔ اسے معلومات ہونی چاہئیں۔ یہ سارا کچھ ہم نے کیا' اسے معلومات بہم پہنچائیں' اس لیے کہ اس کے سامنے دو Possibilities' دوممکنات' ہیں۔ یہ خصوصیت انسان کی ہے کہ اس کے سامنے دو راستے' دوممکنات' دو Possibilities رکھی جاتی ہیں کہ ان میں سے ایک وہ خود اپنے لیے چن لے' اب یہاں سے ذمہ داری شروع ہوگئی ہے۔

حیوانات میں یہ خصوصیات نہیں

حیوانات میں یہ بات نہیں ہوتی۔ ان کے سامنے انتخاب کے لیے دوراستے' دوممکنات' دوراہیں' نہیں ہوتیں۔ ان میں انتخاب ہوتا ہی نہیں۔ میں بار بار یہ عرض کر چکا ہوں کہ بکری کے لیے یہ انتخاب ہی نہیں ہے کہ وہ گوشت کھائے گی یا گھاس چرے گی۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ بکری بیچاری تو یونہی بیچاری سی ہوتی ہے' شیر کو بھی اس انتخاب کی قوت حاصل نہیں ہے کہ وہ گوشت کھائے گا یا گھاس کھائے گا یا انگور کھائے گا۔ وہ بھوکا مرجائے گا' انگوروں کے خوشے لٹک رہے ہونگے' اُدھر رخ بھی نہیں کرے گا' اس کے لیے انتخاب نہیں' اس کی جبلت ہے' وہ مجبور ہے' جس راستے پہ چلنے کے لیے اسے خدا نے پیدا کر دیا' وہ مجبوراً اسی ایک راستے پہ چلا جاتا ہے۔ اس لیے وہ ذمہ دار نہیں ہوتا۔ سانپ ڈستا ہے تو اس پہ مقدمہ نہیں چلایا جاتا' اس کو پھانسی نہیں دی جاتی [1] کیونکہ اس میں ذمہ داری نہیں ہے۔ ذمہ داری ہوتی ہے' اس پر جو خود دو راستوں میں سے ایک کو اختیار کرے۔ اسے تو انسان کے اوپر چھوڑ دیا۔ اسے ذمہ دار بنا دیا۔ اب یہاں تک ہم آ گئے ہیں۔

عزیزانِ من! قرآن بتاتا ہے کہ وہ وقت بھی تھا جب انسان وجود میں نہیں آیا تھا۔ ہم نے اسے پیدا کیا۔ وہاں اس پیدا کرنے کے لیے خلق کا لفظ ہے۔ تولید کا لفظ نہیں ہے۔ یہ کہا ہے کہ **خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ** (76:2) ہم نے انسان کو پیدا کیا۔ پھر کہا کہ اسے **مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ** (76:2) ایک جرثومہ سے پیدا کیا' جس میں یہ سب مضمر جواہر موجود تھے' پھر اس کو گردشیں دیں' پھر یوں کہیے کہ وہ سننے دیکھنے سمجھنے سوچنے والا بن گیا اور یہ سارا اس لیے تھا کہ اس کے بعد ہم نے **اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ** (76:3) اس کے سامنے دو راستے رکھ دیئے اور اسے کہا کہ **اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا** (76:3) اپنے لیے اب تمہارا جی چاہے تو یہ صحیح راستہ اختیار کرو' جی چاہے اس سے انکار کر کے غلط راستے کے اوپر چلے جاؤ۔ یہ ہے تخلیقِ انسانی کے مراحل جو قرآن نے گنائے ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ ساری Scientific (سائنسی) بحث نہیں ہے۔ یہاں آنے کے بعد بحث کا رخ بدل گیا۔ سائنسدان اس سے الگ ہوگئے' وہ یہاں ذمہ داری

---

[1] اس نکتے پر راشڈل (Rashdall) اپنی کتاب Theory of good and evil (نیکی اور بدی کا نظریہ) کے ص۔ 319 پر قمطراز ہے کہ ''آپ کو کوئی شخص پتھر مارے تو آپ اُس پتھر پر نالش نہیں کرتے۔ نہ ہی جب آپ کو کوئی شخص کھانا کھلاتا ہے تو آپ اس کھانے کے حق میں دعائے خیر کہتے ہیں۔ بہادری کا تمغہ توپچی کو ملتا ہے توپ کو نہیں۔ پھانسی کا پھندا قتل کرنے والے کی گردن میں ڈالا جاتا ہے' اس تلوار کے نہیں جس سے اس نے قتل کیا ہو۔ نہ جبر کا گناہ گناہ ہوتا ہے' نہ جبر کی نیکی نیکی۔ مجبور ولی اور مجبور گناہگار دونوں برابر ہوتے ہیں۔

تک نہیں پہنچتے۔ وہ صرف طبعی طور پہ جو چیز ہو رہی ہوتی ہے' اسے وہاں تک رکھتے ہیں۔

جہاں تک سائنس پہنچی اس سے آگے

قرآن نے یہاں کہا کہ ہم نے یہ سب اس لیے کیا کہ ہم نے اسے اپنے انتخاب کا' اپنے عمل کا' ذمہ دار بنایا ہے اور یہی ایک چیز ہے کہ جس سے انسان باقی تمام مخلوق سے متمیز ہو جاتا ہے۔ وہ چیز ہے اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ❶ (76:3)۔ ایک دوسرے مقام پر قرآن نے یہ کہا ہے کہ وَھَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ (90:10) ہم نے دونوں راستے دکھا دیئے۔ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ ضابطہ حق وصداقت آ گیا۔ اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے' اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ اس طرح اب یہ بات انسان پر چھوڑ دی کہ وہ کونسا راستہ اختیار کرتا ہے اور اس کے لیے اسے مجبور بھی نہیں کیا۔ مجبور تو حیوانات کو پیدا کیا ہے' انسان مجبور نہیں ہے۔ وہ تو نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ تمہارا کام ان کو صرف راستہ دکھا دینا ہے' راستہ پر چلا دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر مجبوراً اسے چلا دینا ہو تو پھر انسان کا اس میں اپنا کریڈٹ کیا رہا' پھر یہ خوبی کیا ہوئی۔ یہ کوئی بکری کی خوبی نہیں ہے کہ وہ کسی کو کاٹ کر کھاتی نہیں ہے۔ یہ کوئی خوبی نہیں ہے' جیسے سانپ کا یہ جرم نہیں ہے کہ وہ ڈستا کیوں ہے۔ انسان میں یہ چیز آئی کہ اسے صاحبِ اختیار وارادہ بنایا۔ اب کہا کہ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (76:3) جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے اس کا انکار کر دے۔ یہ صرف انسان کے لیے ہے۔ ان حیوانات میں سے یہ کسی کے لیے نہیں آ سکتا کہ اس کا جی چاہے تو گوشت کھائے' جی چاہے تو وہ گھاس کھائے۔ یہاں سے وہ سارے مسائل حل ہو گئے کہ آیا انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے یا نہیں۔ یہ بحثیں چلی جا رہی ہیں۔ قرآن کی موجودگی میں ان بحثوں کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد ہے فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے' جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے کیونکہ ھَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ (90:10) ہم نے دونوں راستے دکھا دیئے۔ قرآن بات تو صاف کرتا ہے۔ انسان کی یہ ذمہ داری ہے اور اس ذمہ داری کے آگے اب دیکھیے کہ کیسے کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے۔ اب یہ دو راستے آ گئے: صحیح راستہ اختیار کرنے والے اور صحیح راستہ چھوڑ کر' غلط راستہ اختیار کرنے والے۔ اب جو کفورا والے ہیں' یعنی صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستہ اختیار کرنے والے ہیں ان کے لیے کہا کہ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۠ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِيْرًا ❷ (76:4)

ہتھکڑیوں اور طوقوں کی کیفیت

عزیزانِ من! اب آئے وہ اِمَّا كَفُوْرًا (76:3) والے' جنہوں نے صحیح راستہ چھوڑا' اور زندگی میں غلط راستہ اختیار کیا۔ اب

---

❶ اپنے لیے جی چاہے صحیح راستہ اختیار کر لے' جی چاہے اس سے انکار کر کے غلط راستے پر چلے۔

❷ غلط راستے میں اس کے لیے' قدم قدم پر' طوق وسلاسل اور تباہیاں اور بربادیاں ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہمارے ہاں جو چیز ہے وہ تو یہی ہے کہ یہ سب کچھ آخرت کا معاملہ ہے خواہ وہ دوزخ کا ذکر ہو' خواہ طوق یا زنجیروں کا بیان اور آگ کا۔ جو یہاں غلط راستہ اختیار کرتا ہے' یا یہاں غلط نظامِ زندگی قائم کرتے ہیں' تو کیا یہاں وہ آزاد پھر رہے ہوتے ہیں؟ کیا غلط نظام میں کوئی شخص اپنے آپ کو آزاد کہہ سکتا ہے؟ کیا اس کے ہاں طوق اور سلاسل نہیں ہوتے؟ قدم قدم پر بیڑیاں اور ہتھکڑیاں اور طوق اور یہ چیزیں نہیں ہوتیں؟ کیا وہ آگ نہیں بھڑک رہی ہوتی جس کے متعلق قرآن نے یہ کہا ہے کہ **نَارُ اللّٰـهِ الْمُوْقَدَةُ o الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ** (104:6-7) اللہ کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں کو گھیر لیتی ہے۔ کیا اس دنیا کے اندر غلط نظام محکومیت کی زندگی' غلامی کی زندگی' محتاجی کی زندگی' طوق وسلاسل اور نار آگ کے شعلے نہیں ہیں؟ کیا انسانوں کی محکومیت میں کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھ میں طوق اور سلاسل نہیں؟ ان کے ہاں ایک طوق وسلاسل تو وہ ہیں جو نظر آ جاتے ہیں۔ یہ جنہیں ہتھکڑیاں وغیرہ کہتے ہیں' وہ تو بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ چیز کہ وہ طوق وسلاسل' لوہے کی ہتھکڑیاں نہیں ہوتیں۔ یو چھو نہیں کہ وہ ان کو توڑا بھی جا سکتا ہے' کئی دفعہ مجرم حوالاتوں سے بھاگ جاتے ہیں۔ یہ جو انسان کے خود پیدا کردہ طوق وسلاسل ہوتے ہیں' جن میں یہ جکڑے ہوئے ہوتا ہے' ان کو تو یہ توڑ بھی نہیں سکتا۔ یہ ایسی آگ ہے کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔ غلط نظام کی کفر کی زندگی' محتاجی اور محکومیت کی آگ اور طوق وسلاسل کو کس طرح سے توڑے گا؟ اب ہمارے ہاں تو میں نے عرض کیا ہے' وہ گاڑی جو دوسری پٹڑی پہ پڑی ہے تو قرآن کی تمام اصطلاحات کے مفہوم ہی بدل گئے۔ کفر اور کافر کے معنی ہندو ہو گیا' یعنی وہ نہیں ہے کہ جو صحیح نظامِ زندگی کی جگہ غلط اور باطل نظامِ زندگی کے ماتحت زندگی بسر کرے۔ اسے کافر کہا جاتا ہے۔ وہ کافر تو ہندو ہو گیا' ہم تو الحمد للہ مومن ٹھہرے۔ یہاں تک تو ہوا کہ ''الحمد للہ مومن ٹھہرے۔''

قرآن کو صرف یٰسین سنانے کے لیے رکھا۔ اگر مریض کو جلدی موت نہ آتی ہو تو یہ سورۃ یٰسین سناؤ' جلدی موت آ جائے گی اور قرآن یہ کہتا ہے کہ ہم نے یہ قرآن ان کے لیے بھیجا کہ **لِیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا** (36:70) جو زندہ انسان ہیں' ان کے لیے یہ زندگی دینے والا ہو' اور ہمارے ہاں اس کا استعمال ہوتا ہے موت لانے کے لیے۔ ٹھیک ہے' یہ جو کہہ رہے ہیں کہ وہ کافر ہیں' تو قرآن نے تو ان کو مخاطب کیا ہوا ہے: اے اپنے آپ کو مسلمان کہنے والو! **اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ** (4:136) اللہ پر ایمان لاؤ۔ انہیں کہا گیا ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ۔ اب معلوم ہوا کہ کفر کیا ہوتا ہے۔ کفر کی زندگی باطل کے نظام کے تابع زندگی بسر کرنا ہے' غیر خداوندی نظام کے تابع' انسانوں کی محکومی اور محتاجی میں زندگی بسر کرنا ہے۔ اس طوق وسلاسل سے سعیر [1] پیدا ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا قرآن نے جو مقصد بتایا تھا وہ

---

[1] سعیر کا مادہ ''س ع ر'' ہے۔ بقول صاحب تاج العروس ''ابن عرفہ نے کہا ہے کہ سَعُرٌ ایسی بات کو کہتے ہیں جو کسی کو پھونک ڈالے اور فراء نے اس کے معنی کو فت' مشقت اور سخت تکلیف کے کیے ہیں۔ سَعَرْنَاهُمْ بِالنَّبْلِ۔ ہم نے انہیں تیر مار مار کر بھون دیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے مشتعل ہونے' بھڑک جانے اور بلند ہونے کے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے سَعَرَ اور سَعَّرَ النَّارَ وَالْحَرْبَ کے معنی ہیں آگ اور جنگ کو بھڑکا دینا۔''
(لغات القرآن۔ پرویز ص 76-875)

سورۃ اعراف میں ہے کہ یہ نبی آخر الزماں اس لیے آیا ہے کہ وَ يَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ (7:157) انسانوں نے جن ہتھکڑیوں میں اپنے آپ کو جکڑ رکھا ہے، جو بڑی بڑی برفانی سلیں خود انہوں نے اپنے سروں پہ اٹھا رکھی ہیں، یہ رسول ان ہتھکڑیوں کو توڑ دے، ان سلوں کو اتار پھینکے۔ یہ کون سی ہتھکڑیاں اور کون سی سلیں تھیں، جو آپؐ نے توڑ کر پھینک دیں؟ اس کے اندر نہ انسان کی حکومت رہی، نہ سرمایہ داری کی محتاجی رہی، نہ مذہبی پیشوائیت کی۔ عزیزانِ من! کیا کہوں کہ کیا کچھ نہ رہا۔ یہ زنجیریں مذہبی پیشواؤں کے خودساختہ آئین وشرائع اور مستبد حکام کے جور وستم تھے جو توڑ کر پھینک دیئے گئے۔

ابرار کا قرآنی مفہوم

یہ تھے وہ طوق وسلاسل اور تقلید واوہام کہ جنہوں نے انسانی قلب ودماغ کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ حضورؐ نے پھینک دیئے۔ یہ کہتے ہیں کہ یہاں یہ کچھ ''کفور'' کے لیے کہا گیا ہے۔ اگر یہ اگلی آیت پڑھ لیتے تو بات سمجھ میں آ جاتی کیونکہ اس کے مقابلے میں اگلی ہی آیت میں کہا گیا کہ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ يَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ كَاۡسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوۡرًا ❶ (76:5)۔ ان غلط راستوں پر چلنے والوں (کافروں) کے مقابلے میں ابرار کہا گیا ہے۔ یہ لفظ تو ہمارے ہاں بھی آزاد کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہی آزاد ہیں۔ وہ کونسی زندگی ہوتی ہے، جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں ہوتا؟ یہ زندگی صرف ایک خدا کے احکام کی غلامی ہے، اگر اسے غلامی کہیں۔ یہ ایک خدا کی محکومی ہے اور باقی ساری دنیا سے آزادی:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ اس ایک دروازے پہ جھکنے والا باقی تمام طوق وسلاسل اور اندھی تقلید کی زنجیروں اور غیر اللہ کی محکومی کے طوق سے آزاد ہو جاتا ہے۔ عزیزانِ من! پوچھو نہیں کہ وہ ''ابرار'' کی کس صف میں ہوتا ہے۔ کیا لفظ ہے یہ! یہ چیزیں ہیں جس طرح قرآن سمجھ میں آتا ہے۔ پہلے کافر کے لیے یہ کہا ہے۔ اس کے مقابلے میں قرآن ''ابرار'' کا لفظ لایا۔ جو اغلال وسلاسل والے ہیں وہ ابرار نہیں ہو سکتے۔ ابرار میں تو وہی ہونگے جنہیں کسی قسم کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں اور طوق وسلاسل نہ پڑے ہوئے ہوں۔ صحیح آزادی وہی ہے۔ آزادی یہ نہیں ہے کہ اس کو ہتھکڑی نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ طبعی طور پر، کسی وقت، کسی جرم کی وجہ سے، کسی کے استبداد کی وجہ سے، یوں ہتھکڑیاں بھی پہنی ہوں۔ اگر اس کا قلب آزاد ہے تو ہتھکڑیاں پہننے والا بھی ابرار ہوتا ہے۔ ایک خدا کا محکوم ساری دنیا سے مستانہ وار گزر جاتا ہے۔ کسی کا محکوم نہیں ہوتا۔ جو اس ایک چوکھٹ پہ سر جھکانے والا ہے وہ دنیا کے اندر ہر چوکھٹ سے سرفرازی سے گزر جاتا ہے۔ لیکن میں کیا عرض کروں۔ عزیزانِ من!

---

❶ صحیح راستے پر چلنے کا نتیجہ، وسعت اور کشادہ ہوگا۔ یہ خصوصیت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ انسان اپنے جلد مشتعل ہو جانے والے جذبات کو وحی کے تابع رکھ کر، ان میں برودت (ٹھنڈک) اور سکون پیدا کرے۔ (مومن کی زندگی حدت اور برودت کے معتدلانہ امتزاج کا نام ہے)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اب تو باتیں ❶ رہ گئیں۔ کسی ایسے ابرار کو' کسی ایسے بر کو' دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں جو ابرار کی صف میں کھڑے ہو کر پکار کر یہ کہے کہ **اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ**. میں زندہ شہادت ہوں اس امر کی کہ یہاں کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے سوائے خدا کے۔ میں یہ شہادت دینے والا ہوں۔ کیسا نظام رسول اللہؐ نے قائم کیا کہ کھڑے ہو کر دنیا کو پکار کر اس کی شہادت دے رہا ہے۔ شہادت تو وہی دے گا' جو فی الواقعہ خود اس کا مجسمہ ہوگا: **اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا** ❷ (76:5)۔ عزیزانِ من! اب آپ انہیں جنتی زندگی کی باتیں کہہ لیجیے۔ اب اسکی تفصیلات آ رہی ہیں۔ یہ جنتی زندگی مثال کے طور پہ ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ **مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِىْ** (13:35) اس جنت کی مثال یوں سمجھو کہ...... عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ جنت کے سلسلہ میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے ان چیزوں کے لغوی معنی نہیں لینے چاہئیں یعنی ان کے Dictionary Meaning (لغوی معنی) نہ لیجیے کیونکہ یہ چیزیں مثال کے طور پر بیان کی گئی ہیں۔

کافوراً اور زنجبیلاً کی لازوال تشبیہ

ان الفاظ میں تو بڑے بڑے حقائق پوشیدہ ہیں۔ مثلاً یہ کہ پینے کے لیے ایک پیالہ مل رہا ہے۔ اب یہاں ہے کہ **مِزَاجُهَا كَافُوْرًا** (76:5) اور آگے چند ہی آیتوں کے بعد ہے کہ **مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا** (76:17) یعنی کافور اور زنجبیل دونوں۔ ویسے تو یہ کافور اور زنجبیل دونوں ہمارے ہاں طب کی اصطلاحیں ہیں۔ کافور کا تو آپ کو پتہ ہی ہے۔ اب اگر آپ کو پتہ نہیں ہے' ہاں سنیے! پہلے بھی ہمارے ہاں اس کا پتہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ وہ کافور تو صرف اسے ہی سمجھتے تھے جو مُردے کے کفن میں چھڑکتے تھے۔ کافور طب کی ایک دوائی ہے۔ جہاں کسی کی حرارت بہت زیادہ بڑھ جائے تو اعتدال پہ لانے کے لیے کوئی ٹھنڈک پہنچانا مقصود ہو تو اسے کافور دیتے ہیں۔ اس کے برعکس زنجبیل ادرک کو کہتے ہیں۔ طب میں اگر کسی کی حرارت کم ہو جائے' اس کو ابھار کر اعتدال پہ لانا ہو تو اس وقت اس کو زنجبیل دیتے ہیں' ادرک دیتے ہیں۔ جنت کے اس پیالے کے اندر' جس میں حرارت کی کمی رہ گئی ہے' اس میں زنجبیل ملائی جاتی ہے تاکہ اس کی حرارت بڑھ جائے اور وہ اعتدال پہ پہنچ جائے اور جس میں حرارت کی شدت ہوتی ہے اسمیں کافور ملا دیا جاتا ہے تاکہ یہ نرما (Soften) جائے اور اعتدال پہ آ جائے۔ کیا بات ہے' قرآن دو آیتوں کے اندر جو کہہ گیا ہے! انسان کے اخلاق کا مدار اس پہ ہے کہ جب ذرا شدت ہو' زیادہ برہمگی ہو' حد سے بڑھنے کی کوئی چیز ہو' تو کوئی شے ہو جو اسے روک دے۔ وہاں احکامِ خداوندی اس کو روک کر

---

❶ علامہ اقبال نے ایک جگہ ایسی ہی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ

اے بندۂ مومن تو کجائی تو کجائی — اے بندہ مومن تو کہاں ہے تو کہاں ہے۔

❷ صحیح راستے پر چلنے کا نتیجہ' وسعت اور کشادہ ہوگا۔ یہ خصوصیت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ انسان اپنے جلد مشتعل ہو جانے والے جذبات کو وحی کے تابع رکھ کر' ان میں برودت (ٹھنڈک) اور سکون پیدا کرے۔ (مومن کی زندگی حدت اور برودت کے معتدلانہ امتزاج کا نام ہے)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

پیچھے لے آتے ہیں۔ یہ مزاج کافوری ہے اور جہاں کسی طرح ظلم واستبداد ہو تو وہاں ان چیزوں سے حرارت اور قوت میں کمی واقعہ ہو جاتی ہے تو جنتی نظام اور فردوسی زندگی میں حرارت کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ادرک ملایا' اسمیں اس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے کہ جس سے حرارت بڑھے تاکہ قوت زیادہ ہو لیکن دونوں کو اعتدال پہ لا کر چھوڑا جاتا ہے۔ یہ ہوئی جنتی زندگی کی ایک خصوصیت: نہ کمزوری اور نہ حد سے بڑھی ہوئی شدت کے ساتھ قوت۔ ان دونوں کو اعتدال میں لائیے۔ اگر یہ دونوں ہی چیزیں اپنی حد سے بڑھی ہوئی ہوں تو بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اپنے گورنر کو ایک نصیحت

حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ (581-644AD) نے ایک شخص کو گورنر مقرر کیا تو اس نے پوچھا تھا کہ مجھے کوئی اصولی ہدایت دیجیے کہ میں اپنے ہاں جو لوگ مقرر کروں' Appoint (تعینات) کروں' ان میں کیا خصوصیات ہونی چاہئیں۔ آپؓ نے کہا کہ میں تمہیں لمبی چوڑی لسٹ (فہرست) تو نہیں دے سکتا یہ تو تم خود وہاں طے کرو۔ میں تمہیں اصول بتاتا ہوں: ''کمزور دیانتدار'' اور ''قوت والے بددیانت'': ان دو سے بچنا باقی جس کو جی چاہے Appoint (تعینات) کرلینا۔ کیا بات ہے! کیا باتیں یہ شخصؓ کر گیا ہے! یہ ابدی حقیقت ہے کہ کمزور دیانتدار شخص سے کتنا نقصان پہنچتا ہے اور دوسری طرف' قوت والے بددیانت سے کتنا نقصان پہنچتا ہے۔ ان دونوں چیزوں یعنی کمزوری اور قوت کو اعتدال پر رکھنے کا نام امن ہے اور اس کو جنتی زندگی کہا جاتا ہے۔ ذرا قوت بڑھنی شروع ہو تو اسے وہ فوراً کنٹرول میں لے آئے' اعتدال پہ رکھے۔ ذرا کمی واقعہ ہونی شروع ہو تو فوراً اسے بڑھا دیا جائے اور یہ بھی نہ ہو کہ جس کا جی چاہے طمانچہ مار کر سب کچھ چھین کر لے جائے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ اِنَّ الْاَبْـرَارَ یَشْـرَبُـوْنَ مِـنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ❶ (76:5)۔ اور آگے بات ہے کہ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ❷ (76:6)۔ یہ قرآن کی خود عجیب آیت ہے۔

اپنے دل کی چٹانوں کو پھاڑ کر چشمے کا حصول

عزیزانِ من! میری تو دعا ہی ہے کہ اللہ آپ کے بھی یہ چیز نصیب کرے کہ آپ قرآن کو خود اس طرح سے' اس کتابِ حکمت کے اس پیالے سے' خود لذت اندوز ہوں' لذت اندوز ہی نہیں بلکہ وہ لفظ ہی کچھ اور ہے: ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی۔ بڑی عجیب چیز ہے کہ کسی سے پوچھیے کہ صاحب! یہ جو شراب کا نشہ ہوتا ہے' یہ کیسا ہوتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ ''کیسا'' نہیں سمجھایا جاسکتا۔ یہ تو وہی جانتا

---

❶ صحیح راستے پر چلنے کا نتیجہ وسعت اور کشاد ہوگا۔ یہ خصوصیت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ انسان اپنے جلد مشتعل ہوجانے والے جذبات کو وحی کے تابع رکھ کر' ان میں برودت (ٹھنڈک) اور سکون پیدا کرے۔

❷ یہ مشروب اس چشمے سے ملتا ہے جسے خدا کے بندے' خود اپنے دل کی گہرائیوں سے نکال کر لاتے ہیں' اور یہ ان کے اختیار میں ہوتا ہے کہ اس چشمے کی نالیوں کا رُخ جدھر چاہیں کر دیں (یعنی ان صلاحیتوں کو اپنی صوابدید کے مطابق استعمال کریں)۔ (۱-۲ مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے جو پیتا ہے۔ یہاں کہا کہ یہ پینے کی چیز ہے۔ عربی زبان میں پینے کی چیز کو شراب کہتے ہیں۔ ہر پینے کی چیز ڈرنک ہوتی ہے۔ یہ تو ہمارے ہاں ہے کہ شراب کا لفظ وائین (Wine) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے ہاں بھی ہر پینے کی چیز کے لیے شراب کا لفظ نہیں ہوتا' وہ شراب مختص ہوگئی ہے مگر عربی زبان میں یہ بات نہیں ہے۔ وہاں یہ ہر پینے کی چیز کو شراب کہتے ہیں۔ یہاں کہا کہ یہ جو ہم نے پینے کی چیز بتائی ہے' یہ ایک چشمے سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ چشمہ کیا ہوتا ہے' کہاں سے آتا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ اہلِ جنت اس چشمے کو نکالتے ہیں۔ قرآن ہے' عزیزانِ من! یہ نہ سمجھ لینا کہ وہاں واقعی کوئی پہاڑی ہے اور پہاڑی سے چشمہ نکلتا ہے اور چشمہ سے پیالہ بھرا جاتا ہے۔ **يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا** (76:6) اپنے اندر سے' سنگلاخ چٹانوں کو پھاڑ کے یہ چشمہ نکالتے ہیں' یہ وہ چشمہ ہے جس سے یہ پیتے ہیں۔ اب اگر اس میں کمزوری ہوتی ہے تو تھوڑا سا ادرک ملا دیا جاتا ہے' اگر اس میں شدت ہوتی ہے تو تھوڑا سا کافور ملا دیا جاتا ہے لیکن اسے نکالتے اپنے ہی اندر سے ہیں۔ یہ کس طرح سے نکلتا ہے؟ آپ کو یاد ہے کہ اس سے پہلے بھی جہاں جہاں یہ چیزیں آئی تھیں' جہاں بھی قرآن نے یہ بات کہی تھی' کہ یہ یوں ہوگا' آگے کیا بات آئی تھی' کہ یہ اس طرح سے ہوگا کہ تم بھوکوں کی روٹی کا انتظام کرو گے۔ چلیے جی! جنت' جنت سے نکلنے والا چشمہ' چشمے سے حاصل ہونے والا وہ نشہ۔ کہا کہ **يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ يَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا** [1] (76:7)۔

عزیزانِ من! سنیے قرآن کیا بات کہتا ہے؟ کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہ کچھ اپنے اوپر واجب قرار دے لیا ہوتا ہے' یہ ذمہ داری ان کے اوپر عائد ہو رہی ہوتی ہے' اصل میں انہوں نے یہ ذمہ داری خود اپنے اوپر عائد کر لی ہوتی ہے۔ قرآن تو زبردستی کسی کے اوپر ذمہ داری نہیں ڈالتا۔ مومن تو یہ ذمہ داریاں خود اپنے اوپر ڈالتے ہیں۔

نذر کے لفظ کا معنی

اب اس آیت میں یہ جو ''نذر'' کا لفظ ہے' یہ ہمارے ہاں ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ جیسے نذر مانگتے ہیں' منت مانتے ہیں' اور اس کے ساتھ نذر ہوتی ہے مگر عربی میں کسی آنے والے خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے جو تدابیر اختیار کی جاتی ہیں' انہیں نذر یا نذور کہتے ہیں۔ ہر نبی جو نذیر ہوتا ہے' وہ یہیں سے ہے۔ وہ انسانوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ لوگ جو بھی ذمہ داری اٹھا لیتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں۔ یہ نذر ہے۔

شر کی وسعتیں اور ان سے حفاظت کا احساس

سوال یہ ہے کہ وہ اسے کس احساس سے پورا کرتے ہیں؟ عزیزانِ من! انسان جو کام بھی کرتا ہے اس کے لیے ایک احساس ہوتا

---

[1] یہ لوگ نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت کی ذمہ داری' برضا و رغبت اپنے سر لیتے ہیں اور پھر اسے نہایت خندہ پیشانی سے پورا کرتے ہیں۔ انہیں ہر وقت اس کا احساس رہتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو معاشرہ ایسی صورت اختیار کرے گا جس میں چاروں طرف شر پھیل جائے گا۔ (ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو جائے گا۔ ساری فضا اس سے متاثر ہو جائے گی۔ اس کی چنگاریاں اڑ کر دور دور تک پہنچ جائیں گی)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہے' Motive ہوتا ہے؟ وہ کیوں پورا کرتے ہیں؟ اس لیے کرتے ہیں کہ اگر یہ نہ کیا گیا تو معاشرے میں شراڑ کر ہر ایک کو آ لگے گا۔ یہاں دو الفاظ ہیں۔ **شَـرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا** آج تو ہمارا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کا معاشرہ اس کے اندر آ جاتا ہے۔ ایک لفظ شر ہے۔ جس قسم کا بھی کوئی Evil' کوئی برائی' کوئی تکلیف دہ چیز ہے' وہ سب اس لفظ کے اندر آ جاتی ہے۔ اصل میں تو یہ وہ چنگاری ہوتی ہے' شرر ہوتا ہے' جو ہر چیز کو پھونک کر رکھ دیتا ہے۔ ہر قسم کی برائی کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ شر' پھونک کے رکھ دینے والی چیز کا نام ہے۔ ٹھیک ہے کہ میں نے کچھ کیا ہے' وہ شرر مجھ تک ہی رہے گا۔ دوسرے نے کیا ہے وہ شرر اس تک رہے گا۔ اگر پورے کا پورا معاشرہ اس قسم کا ہو جائے تو پھر جیسے آج کہتے ہیں کہ صاحب! آج تو کوئی شخص رشوت سے بچ ہی نہیں سکتا' اگر لیتا نہیں ہے تو دینی پڑتی ہے' اس سے بچ ہی نہیں سکتا۔ یہ کیا چیز ہے؟ اس کے لیے قرآن کا لفظ ہے۔ کہا ہے کہ وہ ڈرتے اس سے ہیں کہ کہیں ایسا نظام اور معاشرہ نہ پیدا ہو جائے' جہاں شر راڑ کر آ لگے۔ یعنی یہ خود اس شرر تک نہ جائے' چنگاری تک نہ جائے' اس شعلے تک نہ جائے' اس آگ تک نہ جائے' بلکہ وہ اڑ کر آ لگے۔ لہٰذا اس شر سے بچیے: جتنا اور جس طرح بچا جا سکتا ہے' اس سے بچیے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ہم نے جو ذمہ داری اپنے اوپر لے رکھی ہے اسے پورا نہ کیا تو ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا' جس میں پھر یہ جو شرر ہے' اس سے کوئی بھی بچ نہیں سکے گا۔

عزیزانِ من! اب ہمارے ہاں شرر کا لفظ بھی ہے: وہ چنگاریاں جو اڑا کرتی ہیں۔ برائی کی چنگاریاں جو اڑا کرتی ہیں' وہ اڑ کر لگا کرتی ہیں' پھر ان سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ یہاں کہا ہے کہ ہم اس لیے ان چیزوں کو پورا کرتے ہیں کہ کہیں وہ معاشرہ نہ قائم ہو جائے کہ جس میں ہم بچ ہی نہ سکیں۔ اندازہ لگائیے کہ یہ جو اڑ کر لگنے والا شر ہے' کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ ہمیں بھی لگ جائے۔ معاشرے میں ہر فرد کو اڑ کر آ لگے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ جو اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہیں جس کے لیے کہا تھا کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے' یہ کوئی ایسا خوف نہیں ہے۔ یہ ایک ڈر ہے کہ جس کی بنا پر محتاط رہنا ہے کہ کہیں اس قسم کا معاشرہ نہ قائم ہو جائے کہ جہاں پھر وہ شراڑ کر لگنے والا شر ہو جائے۔ لہٰذا وہ اس لیے اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہیں کہ کہیں ایسی صورت ہی پیدا نہ ہو جائے۔

میری روٹی دوسرے تک نہ جائے

عزیزانِ من! اس اڑ کر لگنے والے شر کو روکنے کے لیے معاشرے میں ایک قسم کے انتظام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا** [1] (76:8)۔ وہ معاشرے میں ایسا انتظام کرتے ہیں کہ کوئی

---

[1] وہ ایسا انتظام کرتے ہیں کہ جو لوگ کام کاج کے قابل نہ رہیں' یا معاشرہ میں تنہا (بے یار و مددگار) رہ جائیں یا جو کسی اور مصیبت میں مبتلا ہو جائیں' انہیں سامانِ رزق بہم پہنچتا رہے' حالانکہ انفرادی مفاد پرستی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی لیے رکھ لے۔ وہ ان جذبات کے علی الرغم' دوسروں کی پرورش کی فکر کرتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

شخص بھوکا نہ سوئے' وہ بھی جو محنت کرنے کے قابل آدمی ہے' وہ تو محنت کر کے' کما لیتا ہے۔ مگر یہ بات ہے کہ عَلٰی حُبِّهٖ (76:8) اس میں بڑی کشش ہے کہ جو میرے پاس ہے' وہ میرے ہی پاس رہے۔ میری روٹی میرے پاس رہے' دوسرے کے پاس نہ جائے۔ اس میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ اس کشش کے باوجود اصل مسئلہ یہ آیا کہ اس کی ضرورت تو دو روٹیوں کے اندر پوری ہو جاتی ہے۔ یہ بڑے بڑے جتنے بھی خزانے دبائے بیٹھے ہوئے ہیں' وہ تو غریبوں کی طرح دو روٹیاں بھی نہیں کھا سکتے۔ ان کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔ مگر ضرورت یہی دو روٹیوں کی ہوتی ہے۔ اس سے آگے جو ہوتی ہے' وہ ہوس ہوتی ہے جس کی انتہا ہی نہیں ہوتی۔ قرآن میں دوسرے مقام پر آیا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ o حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) قبر تک یہ ہوس پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس دولت میں اتنی کشش ہوتی ہے' جب کہ دوسری طرف ایمان والوں کی کیفیت یہ ہے کہ دولت میں اتنی کشش کے باوجود یہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے علاوہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہمارے علاوہ کس کس کی ضرورت رکی ہوئی ہے تو پھر ان لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ یہ تھا جو یہ کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اس عمل سے ایک ایسا معاشرہ قائم نہیں ہونے پاتا جس میں شر پر اُڑ کر لگتا ہو۔ لیکن اس کے برعکس اگر معاشرہ ہی ایسا ہو جائے کہ جس میں کسی اور کی ضرورتیں ہی پوری نہ ہوں اور پھر اگلی بات یہ ہو کہ جائز طریقے سے تو کسی صورت پوری ہی نہ ہوں تو پھر تو معاشرہ ایسا ہو گا کہ جس میں شر ایسا عام ہو جائے گا' اڑ کے لگے گا۔ لہٰذا اس خیال سے کہ کہیں ایسی صورت ہی پیدا نہ ہو جائے وہ اس کے سدباب کے لیے انتظام کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ اس کے لیے کس چیز کا انتظام کرتے ہیں؟

اس شر اور شرارے سے بچنے کا علاج

عزیزانِ من! وہ اس کے سدباب کے لیے طعام کا انتظام کرتے ہیں' روٹی کا انتظام کرتے ہیں۔ ہر مسکین اور یتیم یا اسیر کے لیے روٹی کا انتظام کرتے ہیں۔ اس سے بیشتر بھی ''اسیر'' کا لفظ آچکا ہے۔ جو بھی اپنی محنت سے معذور ہے' جس کی محنت بھی اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتی' وہ ان سب کی روٹی کا انتظام کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس طرح اس کا انتظام کرتے ہیں؟ ایک انتظام تو وہ ہوتا ہے کہ کسی مصیبت کے وقت کسی پر کچھ احسان کیا اور پھر ساری عمر کے لیے اسے بے دام غلام بنا لیا۔ اس شخص کو دیکھیے صاحب! طوطا چشم کہیں کا' احسان فراموش' اس وقت روتا ہوا آیا تھا کہ صاحب! بچے بھوکے مرتے ہیں جی' خدا کے واسطے دیجیے۔ کیا کچھ دیا ہے صاحب! اس کے لیے سب کچھ کیا ہے۔ آج کہتا ہے کہ میں آپ کو ووٹ نہیں دونگا' اس کو دونگا۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ضرورتیں یوں پوری کی جاتی ہیں۔ یہ ہوتا ہے وہ نظام جس میں شر اڑ کر لگتا ہے۔ اس کے برعکس ایمان والوں میں سے اگر کوئی بھی کسی کی ضرورت پوری کرتا ہے تو اس کی کیفیت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ انہیں کہتے ہیں کہ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76:9) تم یہ نہ سمجھو کہ طعام کا' روٹی کا' انتظام کرنے سے ہم تمہارے سر پر ''احسان'' دھرتے ہیں۔ قطعاً نہیں۔ یہ ان کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس کے بدلے میں تم سے کوئی معاوضہ لینا تو ایک طرف رہا' ہم تو شکریہ کے

بھی متمنی نہیں ہیں۔ اللہ اکبر! وہاں کہا تھا: عَلٰی حُبِّہٖ (76:8) مال و دولت کی اتنی کشش کے باوجود وہ دوسرے کو دے رہے ہیں اور کیفیت یہ ہے کہ ان سے شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔

جنتی شراب پینے والے کی کیفیت؟

عزیزانِ من! یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کی جو جنتی شراب پیتا ہے۔ جس کو آپ شراب کہتے ہیں، اس کی یہ کیفیت پیدا ہو تو جنتی معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ یہاں تو اتنی سی ہی بات کہی ہے کہ ہم شکریہ کے بھی متمنی نہیں ہیں۔ دوسری جگہ تو یہ ہے کہ **وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ** ❶ (59:9) ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر دوسرے کی ضرورت اپنی سے زیادہ ہے تو اپنی ضرورت پر اس کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ دینے والوں کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ **اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا** ❷ (76:10)۔

عزیزانِ من! اسے پھر ہم آئندہ درس میں لیں گے، مگر یہ بات یاد رکھیے کہ وہ یہی بات اس طرح سے کہہ دیتے ہیں کہ اس کا کوئی معاوضہ نہیں، وہ تو شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہوتے۔ کیا بات ہے اس معاشرے کی جس میں کیفیت یہ ہو کہ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ ہے، وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کو دے جن کی ضرورت رُکی ہوئی ہے اور اس کے بعد یہ کہے کہ ''ہم شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔''

ہم سورۃ الدھر کی آیت 9 تک آ گئے۔ عزیزانِ من! 10 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

---

❶ وہ ہمیشہ ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انہیں خود تنگی ہی سے گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔

❷ ہم یہ انتظام اس لیے کرتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ایسی فضا پیدا ہو جائے گی جس میں زندگی کی شادابیاں جھلس کر رہ جائیں گی اور شجر حیات افسردہ و پژمردہ ہو جائے گا اور ہر طرف ایسی مصیبتیں اور پریشانیاں پھیل جائیں گی، جن سے لوگوں کے ماتھے پر شکنیں پڑ جائیں، اطمینان و مسرت کا نام باقی نہ رہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ستائیسواں باب: سورۃ الدھر (آیات 10 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1984ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الدھر کی آیت 10 سے ہو رہا ہے:(76:10)۔

شر سے بچنے والے معاشرہ کی جنت ارضی

آپ کو یاد ہوگا کا کہ سابقہ درس میں جو آیات سامنے آئی تھیں' ان میں اللہ تعالیٰ نے یہ کہا تھا کہ دیکھنا' کہیں ایسا معاشرہ یا ایسا نظام نہ قائم ہو جائے جس میں شر اڑ کر لگا کرتا ہے' پھر اس سے کوئی بچتا ہی نہیں ہے۔ اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایسا انتظام کرو کہ کوئی شخص رات کو بھوکا نہ سوئے۔ یہ موضوع الگ ہے جو میں عرض کرونگا کہ معاشی نظام کو قرآن نے کتنی اہمیت دی ہے۔ اب آپ غور فرمایئے کہ یہ معاشرہ جس میں شر اڑ کر لگا کرتا ہے' اس کے لیے یہ کہا کہ دیکھو' اس معاشرے میں کوئی بھوکا نہ رہ جائے۔ پھر ان لوگوں نے اس کے لیے کہا

کہ ہم نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ واقعی کوئی شخص بھوکا نہ رہے اور جن کی روٹی کا انتظام کیا ان سے یہ کہہ دیا کہ **لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا** (76:9) اس کے بدلے میں تم سے کوئی معاوضہ لینا تو ایک طرف، ہم شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔ وہ اس لیے کہ **اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا** (76:10) اگر ایسا نہ کیا تو ایک ایسا دور آئے گا، ایک ایسا نظام آ جائے گا جس میں ہر ایک پر پژمردگی اور افسردگی چھا جائے گی۔

غور فرمائیے قرآن کس انداز سے یہ بات کرتا چلا جاتا ہے۔ انہوں نے ایسا انتظام کیا کیونکہ **فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا** (76:11) اس نظام کے نتیجے میں خدا کے قانونِ ربوبیت نے انہیں اس قسم کے دور کی ہلاکت سامانیوں سے بچا لیا اور ایسی صورت پیدا ہوگئی، ایسا معاشرہ قائم ہوگیا، جس میں خوشگواریاں اور مسرتیں تھیں، ہر شخص ہشاش بشاش تھا، کسی قسم کی افسردگی و پژمردگی نہیں تھی۔ اس صورتِ حال کے لیے قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: **نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا** (76:11) اس معاشرے کے اندر تازگی تھی، مسرتیں تھیں۔ یہ کچھ ہوا تھا۔

عزیزانِ من! وہ جو میں ہر بار دہراتا ہوں، اسے ضرور ذہن میں رکھیے کہ یہاں اسی دنیا میں، وہ معاشرہ تھا جس کے متعلق کہا تھا کہ اسی دنیا میں اس کا شرار کر لگ جائے گا پھر اس کے بعد وہ معاشرہ قائم ہوا، جس میں کہا گیا کہ اس میں کسی قسم کی افسردگی اور پژمردگی نہیں ہوگی۔ اس میں مسرتیں ہونگی، نشاط انگیزیاں ہونگی، لوگ ہشاش بشاش ہونگے، خوشگواریاں ہونگی۔ آپ یہ دیکھیے کہ یہ جنت، یہ معاشرہ، اس دنیا میں قائم ہو رہا ہے۔ آخرت کی جنت تو ابھی اور آگے چل کر آتی ہے۔ کہا کہ یہ چیز پیدا ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کس عمل کا نتیجہ تھا؟ اس کے جواب میں کہا کہ **وَ جَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا** (76:12) یہ نتیجہ تھا اس استقامت کا جو انہوں نے اس قسم کا معاشرہ قائم کرنے میں روا رکھی۔ ان جنتی فضاؤں میں وہ بڑی آسائش و توانائی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اب یہ جنت ہے اور حریر ہے یعنی اس میں شادابیوں کے باغات ہیں اور حرارت بخش و حریت افزا فضائیں ہیں۔

جنتِ ارضی کے بعد اخروی جنت

عزیزانِ من! اب جبکہ ہم خاص طور پہ 29 ویں پارے کی آخری سورتوں میں پہنچ رہے ہیں اس میں جنت و جہنم کا ذکر ہے اور تیسویں پارے میں تو بالخصوص بڑی ہی تفصیل سے جنت اور جہنم کی تفاصیل ہمارے سامنے آئیں گی۔ میں پھر یہ عرض کر دوں کہ یہاں کی جنت کے بعد اخروی زندگی کی جنت اور جہنم پر ہمارا ایمان ہے لیکن اس کے متعلق جو قرآن نے بیان کیا ہے وہ تفاصیل بڑی کثرت سے ہمارے سامنے آئیں گی، ہر بار دہرانے کی بجائے ایک چیز کو سامنے رکھ لیجیے کہ قرآن نے کہا ہے کہ جو کچھ ہم نے آخرت کی زندگی کے متعلق بتایا ہے، وہ تمثیلی طور پر بتایا ہے، مثال کے طور پر بتایا ہے، ان الفاظ کے لغوی معنی نہیں ہیں بلکہ وہ مثال کے طور پر بتایا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ **مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِىْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ** (13:35) جس جنت کا وعدہ متقیوں سے کیا جا رہا ہے اس کی مثال یوں سمجھیے کہ **تَجْرِىْ**

مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا (13:35) اس کے نیچے آبِ رواں جاری ہے' گھنے سائے ہیں' پرلطف میوے ہیں جو وقتی نہیں' دائمی ہیں۔ یہ آگے اس کی تفسیر آ گئی۔ اس طرح مَثَلُ الۡجَنَّةِ الَّتِىۡ (13:35) ان چیزوں کی مثال یوں سمجھیے۔

قرآنِ حکیم کی آیاتِ محکمات اور متشابہات کی وضاحت

آپ کو یاد ہے کہ قرآنِ کریم کی جتنی بھی آیات ہیں انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: محکمات اور متشابہات۔ محکمات تو وہ آیات ہیں جو قانونی حیثیت رکھتی ہیں' احکام کی حیثیت رکھتی ہیں' اِن میں حکم متعین انداز میں بیان کیا جاتا ہے' ان میں الفاظ کے وہی معنی ہیں جو لغوی معنی ہوتے ہیں' جو لغت میں یا Dictionary میں ہوتے ہیں مثلاً جب اس نے کہا ہے کہ فلاں' فلاں چیزیں تمہارے لیے حرام ہیں تو ان کے کوئی مجازی معنی نہیں لیے جا سکتے۔ ان کے لغوی معنی ہی صحیح ہیں۔ اس کو محکمات کہتے ہیں اور دوسرا اس نے کہا ہے کہ متشابہات ہیں۔ یہ وہ آیات ہیں جن میں ان باتوں' ان واقعات کو تشبیہ دے کر' تشبیہ کے طور پر' بیان کیا گیا ہے' تشبیہاً بیان کیا گیا ہے۔ یہ وہی ہیں جنہیں فوق الفطرت کہتے ہیں' Metaphysical (ماوراء الطبیعات) کہتے ہیں' ماورائے عقل انسانی کہتے ہیں۔ یعنی خدا کا عالمِ امر ہے جس میں خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے' اس کا پورا نظام ہے۔ اس کے لیے وہ ملائکہ ہیں' وہ تفاصیل ہیں' وہ عالمِ امر ہے۔ وہ ہماری سمجھ اور دانش سے ماوراء ہے۔ اور اسی طرح مرنے کے بعد کی زندگی ہے۔ اسے بھی ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے۔ اسے مثال دے کر' تشبیہ کے طور پر' سمجھایا گیا ہے۔ تو اب اس طرح یہ جتنی چیزیں آئیں گی' جنت کے متعلق قرآن نے جو تفاصیل دی ہیں' یہ سمجھ لیجیے کہ وہ مثال کے طور پر بیان کی ہیں' تشبیہاً بیان کی ہیں۔

عرب معاشرہ کی کیفیت

عزیزانِ من! جو چیزیں مثال کے طور پر بیان کی جائیں گی؟ وہ کیا چیزیں ہونگی' اس کے لیے ہمیں عربی معاشرہ دیکھنا پڑے گا۔ عربوں کے ہاں تو آپ جانتے ہیں کہ سوائے ریگستان کے' کہیں کہیں چند درخت ہوتے تھے' کھجوروں کے نخلستان تھے۔ وہ اسے جنت کہتے تھے۔ اور جہاں پانی کا چشمہ ہوتا تھا' یا جہاں پانی کا چشمہ ہوا' وہاں چار درخت اگے' وہ ان کے لیے جنت ہوتی تھی۔ وہاں وہ ڈیرا ڈال لیتے تھے۔ چشمہ خشک ہوا' خانہ بدوشی کی زندگی ہے' یہ وہی ہے جسے قرآن نے جن کہا ہے' وہ وہاں سے اٹھے' اور پھر کہیں جا کے پانی ڈھونڈا' کہیں پانی مل گیا' دیکھا کہ وہیں چار درخت اُگے ہوئے ہیں' اُن کے نیچے پھر ڈیرا ڈال دیا۔ ان کی تو یہ زندگی تھی۔ اب اِن کے دونوں طرف عظیم الشان تہذیب کی مالک دو سلطنتیں' دو مملکتیں تھیں: روما کی مملکت اور ایران کی مملکت۔ ❶ وہ انہیں للچائی ہوئی نظروں سے

---

❶ ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور 2005' ص ص۔ 96-91 ,89' (فٹ نوٹ نمبر 1) بمعہ فٹ نوٹ 6 ص ص۔ 92-91' فٹ نوٹ 1' ص 92۔

دیکھتے تھے۔ وہ ہزار ہا سال پر پھیلی ہوئی مملکتیں ہی نہیں تھیں' ان کے اندر آسائش وزیبائش کی نعماء کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ اس قسم کی نعماء کو یہ عرب للچائی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان بیچارے عربوں کو کھجوریں کھانے کو تھیں۔ وہ کھجوروں کی گٹھلیاں پیس کر ستو بنا کر گزارا کرتے تھے۔ اسی لیے فردوسی نے زشیرِ شتر خوردن وسوسماء کا طعن دیا ہے۔ ان عربوں کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اونٹنی کا دودھ پیتے تھے اور ''گوہ'' کا گوشت کھاتے تھے۔ ان کے دائیں بائیں اس قسم کی دومتمدن' مہذب' مملکتیں اور تہذیبیں تھیں۔ وہ انہیں دیکھتے تھے۔ وہاں ان کے لیے معراجِ زندگی کی یہ آسائشیں تھیں' جو ان مملکتوں میں انہیں نظر آتی تھیں۔ خاص طور پہ ایران تو ان کے بالکل ساتھ واقع ہوا ہے' سلطنت رومن تو پھر بھی ذرا دور تھی۔ ایران والوں کا تو ہر وقت آنا جانا تھا۔ ان دونوں کے بارڈر (حدیں:Borders) ملتے تھے۔ میں یہ عرض کردوں کہ جسے آج عراق کہتے ہیں اس کا ایک حصہ جسے عراقِ عجم کہا جاتا تھا' وہ ایران ہی کا حصہ تھا۔ ان کا دارالسلطنت مدائن [1] میں واقع تھا۔ آپ غور کیجیے کہ ادھر ان بیچاروں کی یہ کیفیت کہ اونٹنی کا دودھ پیئیں' سوسمار کا گوشت کھائیں اور کھجور کی گٹھلیوں کے ستو بنا کر گزر بسر کریں اور جب اُدھر ان ایرانیوں کی طرف نگاہ ڈالتے ہونگے تو آپ سوچیے کیا کچھ نہ دیکھتے ہونگے۔ قرآنِ کریم نے جنت کی جو تفاصیل تشبیہاً' مثالی طور پر' بیان کی ہیں وہ قریباً تمام کی تمام ایرانیوں کے معاشرہ میں موجود تھیں۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ اگر تم قوانینِ خداوندی کی پیروی میں اپنا نظام قائم کرلو گے تو جو کچھ تم آج اس طرح للچائی ہوئی نظروں سے' ایرانیوں کے ہاں' رومیوں کے ہاں' دیکھتے ہو' وہ سب تمہیں حاصل ہو جائے گا۔

براؤن کی ہسٹری میں ایران کی تفصیل

عزیزانِ من! ان ایرانیوں کے ہاں کیا کیا چیزیں تھیں' اُن کی تفاصیل کا پتہ تو ایران کی ہسٹری پڑھنے سے چلتا ہے۔ اگر براؤن کی ہسٹری کی کتاب دیکھ لی جائے تو اس میں بڑی تفصیل سے اس کی تفاصیل موجود ہیں۔ اس سے پورے معاشرے کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اسے دیکھا جائے تو پھر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن جو' ان سے مثالی طور پر' جس جنت کا ذکر کر رہا ہے' وہ ایران کا ہی معاشرہ نظر آتا ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں' وہ وہاں کی آسائشیں ہیں' وہاں کی شادابیاں ہیں' وہاں کی برائیاں نہیں ہیں۔ یعنی وہ نظام ہو جو قرآن نے قائم کیا ہے' اور اس کے اندر وہاں نعماء اور آسائشیں اور مسرتیں ہوں' جو ایرانیوں کو میسر ہیں تو یہ ہے قرآن کا انداز جس میں اس نے جنت کا ذکر کیا ہے۔ یہاں اسی شکل کے اندر ان کے جو صحیح معنی ہیں وہ لیے جائیں لیکن آخرت کے حوالے سے مثالی طور پر لیے جائیں گے۔

---

[1] مدائن' ایران کا دارالسلطنت' حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت (13-24H) میں حضرت سعدؓ کی سربراہی میں' 16ھ بمطابق 637ء کو فتح ہوا اس زمانے میں ایران کا شہنشاہ یزدگرد تھا۔ رستم اس کا وزیر اعظم اور وزیر جنگ تھا۔

مدائن کی فتح کے بعد صاحبِ سلطنت ❶ کی حالت زار

ایران کی کیفیت ❷ کیا تھی؟ میں چند الفاظ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میں نے ''شاہکارِ رسالت'' میں جہاں مدائن کی فتح کا ذکر کیا ہے' ان واقعات کا ذکر کیا ہے۔ عزیزانِ من! وہ عجیب وغریب واقعات ہیں۔ وہ تو ہسٹری (تاریخ) میں پڑھنے کے قابل ہیں' مدائن کو ان عربوں نے فتح کیا۔ وہاں یہ کیفیت ہے کہ ان کے ہاں کا شہنشاہ' یزدگرد' وہاں سے بھاگ گیا۔ وہ بھاگا بھاگا پھرتا تھا' اسے کہیں پناہ نہیں ملی تھی۔ اس نے ایک پن چکی میں جا کر پناہ لی تھی اور وہاں پن چکی والوں نے اس کو مار دیا تھا۔ ایران کی سلطنت کا شہنشاہ' اور اس کا انجام ❸ یہ ہے!! انہوں نے جب مدائن کو (16ھ مطابق 637ء) فتح کیا تو وہ سب کچھ چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گئے تھے۔

---

❶ یہ یزدگرد تھا جو 13ھ میں' جب حضرت عمرؓ نے زمام خلافت سنبھالی' سن بلوغت کو پہنچ کر ایران کے تخت پر بیٹھا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ (16) سال اور بعض روایات کی رو سے اٹھارہ (18) سال تھی۔

❷ یہ ایران کی سلطنت کا چوتھا دور تھا' جو ساسانیوں کا عہد کہلاتا ہے۔ یہ دور نوشیرواں عادل کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ نبی اکرمؐ کے زمانے میں نوشیرواں پوتا خسرو پرویز تخت نشیں تھا۔ اس زمانے تک یہ سلطنت بڑی طاقتور رہی۔

❸ یزدگرد (16ھ بمطابق 637ء) سے بھاگ کر حلوان پہنچا۔ وہاں بھی جیش اسلامیہ نے اس کا تعاقب کیا۔ جلولہ کے مقام پر ایرانیوں سے مقابلہ ہوا اور وہ شکست کھا کر اپنے ''شہنشاہ'' یزدگرد سمیت پھر بھاگ نکلے۔ اس کے بعد وہ رَے میں جا کر مقیم ہوا۔ وہاں سے اصفہان کی طرف چلا گیا۔ اصفہان سے کرمان پہنچا۔ اس کے بعد پھر اصفہان واپس آ گیا۔ جب اسلامی جیوش نے صوبہ اہواز پر قبضہ کر لیا تو یزدگرد' خراسان کے شہر مرو میں آ کر مقیم ہوا۔ وہاں اس نے ادھر اُدھر سے ایرانی فوج جمع کر کے' اپنی متاعِ بردہ کی بازیابی کے لیے آخری کوشش کی۔ نہاوند کے مقام پر اس نے قریب ڈیڑھ لاکھ فوج جمع کر لی۔ اس سے اسلامی مملکت کو ایسا خطرہ لاحق ہوا کہ فاروق اعظم حضرت عمرؓ نے اس کے مقابلہ کے لیے خود جانا ضروری سمجھا لیکن اپنے رفقاء کے مشورہ پر کاربند ہوتے ہوئے ایک بار پھر آپ نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سپہ سالارِ لشکر کے تحت نہاوند کے معرکہ میں 21ھ بمطابق 642ء اسلامی فوجوں کو فتح عظیم حاصل ہوئی۔ یاد رہے فاروق اعظم کا قاتل' فیروز لولؤ نہاوند کا باشندہ تھا اور اِسی جنگ میں قید ہو کر مدینہ پہنچا تھا۔ فتح نہاوند کے بعد ایران کے مختلف صوبے' یکے بعد دیگرے' مسلمانوں کے قبضہ میں آتے چلے گئے۔ آذر بائیجان' طبرستان' آرمینیہ 22ھ (مطابق 643ء) میں۔ کرمان' سیستان اور مکران 23ھ (مطابق 644ء) میں۔ نہاوند کی جنگ 21ھ (مطابق 642ء) کے وقت یزدگرد خراسان کے شہر مرو میں مقیم تھا۔ جب اسلامی فوج نے یہاں بھی دباؤ ڈالا تو وہ بلخ کی طرف بھاگ گیا۔ اور جب مسلمانوں نے بلخ بھی فتح کر لیا تو یزدگرد کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے ملک (ایران) کو چھوڑ کر ترکستان چلا جائے۔ وہاں اس نے خاقان کے پاس سمرقند میں پناہ لے لی۔ اس کے چند روز بعد حضرت عمر کی شہادت ہوگئی۔ اس دوران یزدگرد اہل خراسان سے' چھینی ہوئی سلطنت کی بازیابی کے لیے' خط وکتابت کرتا رہا جب حضرت عثمان (573-656ء) کے زمانہ (645-656AD) میں خراسان میں بغاوت ہوئی تو اس نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور ترکستان سے مرو پہنچ کر لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنا شروع کر دیا لیکن مسلمانوں نے اس بغاوت کو جلد فرو کر دیا تو یزدگرد بھاگ نکلا لیکن اب اس کے لیے کوئی جائے فرار نہ تھی کیونکہ مسلمانوں نے اس کا خاص اہتمام کر رکھا تھا کہ وہ جہاں بھی ملے اسے گرفتار کر لیا جائے۔ جب اسے اس کا علم ہوا تو وہ جان بچانے کے لیے ایک پن چکی میں روپوش ہو گیا اور وہاں بری طرح قتل کر دیا گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اسے اہل خراسان نے قتل کر دیا تھا۔ بعض میں یہ کہا گیا ہے کہ چکی والے ہی نے لالچ میں آ کر اسے قتل کر دیا تھا۔ قتل کسی نے بھی کیا ہو' کیا اس سے بڑھ کر مقامِ عبرت کوئی اور بھی ہو سکتا ہے کہ ایران جیسی عظیم مملکت کا شاہنشاہ در روپوشی کی حالت میں ایک پن چکی میں مقتول! فاعتبروا یا اولی الابصار ۔ یہ 30ھ کا واقعہ ہے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا خط اور ایران سے مالِ غنیمت کی تفصیل

عزیزانِ من! اس وقت مالِ غنیمت کا (خمس) پانچواں حصہ مرکز میں بھیجا جاتا تھا۔ وہاں کا وہ تمام مالِ غنیمت انہوں نے مرکز (مدینہ منورہ) میں بھیجا ہے۔ اس کے ساتھ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک خط لکھا تھا۔ بہر حال جو چیزیں تھیں وہ میں چند الفاظ میں آپ کو سناتا ہوں۔ یہ لوگ وہاں سے کسریٰ کا موتیوں کا ہار اور جواہرات سے مرصع تاج اور زر کار ریشمی ملبوسات' لے کر آئے' جن میں جواہرات سجے ہوئے تھے۔ کسریٰ کی زرہ اور تلواریں بھی جواہرات سے مرصع تھیں۔ جب اس مالِ غنیمت کا خمس (پانچواں حصہ) مدینہ پہنچا ہے تو اہلِ مدینہ کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں' ان کا ذہن اسے باور نہیں کرتا تھا۔ انہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ یہ کچھ دیکھا ہوگا' ساٹھ مربع گز (Square yard) کا تو صرف ایک قالین تھا' جس پر مملکت ایران کا نقشہ بنا ہوا تھا' اس کی زمین سونے کی تھی' جا بجا موتیوں کی نہریں تھیں' کناروں پر چمنستان تھا' جس پر منقوش درختوں کے تنے سونے کے' پتے ریشم کے' اور پھل جواہرات کے تھے۔ حضرتِ سعد رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا کہ یہ تمام زر و جواہرات مسلمان سپاہیوں کے قبضے میں تھے اور ایسے ایسے مقامات سے ملے تھے جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب کچھ اپنے قائد کے سامنے ڈھیر کر دیا۔

عزیزانِ من! اس وقت میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جو مالِ غنیمت کا حصہ تھا' اس کی جو تفصیل اِس ایک خط میں انہوں (حضرت سعد) نے لکھی تھی' وہ یہ تھی۔ اب سوچیے کہ ایران کی تہذیب میں کیا کچھ نہ ہوگا۔ اگر آپ انہی چیزوں کو دیکھیے تو انہی سے جنت کا نقشہ مرتب ہو جاتا ہے اور قرآن نے جو جنت کا نقشہ مرتب کیا ہے وہ کچھ اسی قسم کی چیز ہے۔ پہلی ہی چیز یہ کہی کہ **جَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا** ❶ (76:12)۔ حریر' دبیز ریشم کو کہتے ہیں۔ کیا بات ہے اس زبان کی! لفظ کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں: ریشم! ایک تو ہمارے ہاں اونی کپڑے گرم ہوتے ہیں مگر جو خالص ریشم کا کپڑا ہے' وہ بڑا گرم ہوتا ہے۔ اس میں حرارت ہوتی ہے۔ اس حرارت کی وجہ سے اسے حریر کہتے ہیں۔ جس میں حرارت ہوتی ہے' وہ غلام نہیں ہو سکتا' ان کے نزدیک وہ آزاد ہوتا ہے۔ ''حر'' آزاد کو کہتے ہیں۔ ''احرار'' اس کی جمع ہے۔ ''حرارت' احرار' حر اور حریر۔'' یہ تمام الفاظ صرف ایک لفظ (ح ر ر) سے ہیں۔ آپ سوچ لیجیے کہ لغوی معنی میں اگر حریر جنت کے ساتھ ہے تو حریر کے جو معنی ریشم کا ملبوس تھا' تو وہ جو اس کی معنویت کی کیفیت تھی' اس میں حرارت زندگی کی تھی' عروق مردہ نہیں تھیں۔ اس حرارت میں آزادی تھی کیونکہ پہلے کہہ دیا ہے کہ جہنم کی زندگی میں **سَلٰسِلَا وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِيْرًا** (76:13) محکومیت تھی' زنجیریں تھیں' ہتھکڑیاں تھیں' بیڑیاں تھیں۔ اس کے مقابل میں جنت کا پہلا ہی لفظ ''حریرًا'' بیان کر دیا ہے: آزادیاں' زندگی کی

---

❶ یہ جنتی فضائیں' ان کے استقلال و استقامت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس میں وہ بڑی آسائش و توانائی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ شادابیوں کے باغات اور حرارت بخش و حریت افزا فضائیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

حرارتیں' اور ریشم کے ملبوسات۔ ایک ایک لفظ میں آپ دیکھیے قرآن کی دونوں دنیائیں مضمر نظر آتی ہیں۔ یہ کیفیت تھی! اور کہا کہ مُتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ❶ (76:13)۔

کچھ ذکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اور کچھ عرب و عجم کا تقابلی جائزہ

عزیزانِ من! امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی کیفیت کیا تھی اُسے دیکھنے کے لیے ان کے ہاں کے سلطنت روم (Roman Empire) کے سفیر آئے تھے کہ یہ معلوم کریں کہ ان کا جو ''بادشاہ'' ہے' وہ کس حیثیت سے رہتا ہے۔ وہ سفیر ڈھونڈ رہا تھا اُسے وہ مل ہی نہیں رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ آؤ' تمہیں وہ دکھائیں۔ دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ باہر ریت پہ کنکریاں تھیں' کچھ ان پہ ہی اپنا وہ چوغہ سرہانے رکھا ہوا تھا' گرمی میں' سورج کی روشنی میں' وہاں سو رہے تھے۔ انہوں نے کہا: یہ ہے ہمارا امیر المومنین۔ وہ حیرت میں پڑ گیا مگر یہ جو عوام تھے' ان کے لیے قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ مُتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ (76:13) یہ سب تختوں کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں۔ تقابل دیکھتے چلے جایئے کہ عرب کی سرزمین ہے۔ گرمی ہے تو اتنی سخت گرمی اور سردی ہے تو اتنی ہی سخت سردی۔ مگر قرآن ہے جو کہہ رہا ہے کہ وہ اقتدار و اختیار کی مسندوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ موسم ہوگا جس میں لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا (76:13) نہ وہ جھلسا دینے والی گرمی' نہ اکڑا دینے والی سردی' معتدل مزاج موسم یعنی جسے ہم بہار کا موسم کہتے ہیں جو دنیا میں بہترین موسم گنا جاتا ہے۔ کہا کہ بہار کا موسم ہمیشہ رہے کیونکہ وَ دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا (76:13) ان کے ہاں درخت ہوتے تھے۔ وہ کھجور کے درخت نیچے سے اوپر تک تنا ہی تنا چلا جاتا ہے اور تنے میں ایک پتہ بھی نہیں ہوتا۔ اوپر جا کر صرف چند شاخیں ہوتی ہیں۔ اب نیچے ان چند شاخوں کا جو سایہ ہوتا ہے آپ سوچیے تو سہی کہ وہ ہوتا کتنا ہے لیکن ان کے لیے تو وہ غنیمت تھا۔ کہا کہ وہاں تو اس قسم کے درخت ہونگے جن کی سایہ دار شاخیں جھکی ہوئی ہونگی' ان کا اتنا گھنا سایہ ہوگا اور اگلی بات یہ ہے کہ وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا (76:14) اور وہ پھلوں سے لدی ہوئی شاخیں ہیں۔ عزیزانِ من! پھلدار درخت اور ان کی شاخیں تو ہر معاشرے میں ہوتی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ وہ پھل اس قسم کے ہیں کہ خود جا کے' ہاتھ بڑھا کے' ان کو توڑنا نہ پڑے' وہ خود بخود جھک کر' ان کی جھولی میں آ جائیں۔ یہ ہے جنت! ہمارے ہاں اب یہ بڑے فخر سے کہا جاتا ہے اور بات ہے بھی ٹھیک۔

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ہمارے ہاں اجناس کی اور خاص طور پہ پھلوں کی پیداوار بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ یہ جتنی زیادہ ہوگئی ہے' اتنی ہی وہ عوام کے ہاتھوں سے دُور چلی گئی ہے۔ گرمیوں میں خواہ وہ آم ہوں' سردیوں میں خواہ یہ کنوں اور سنگترے ہوں' غریب ان کی طرف صرف دیکھ ہی سکتا ہے

---

❶ اس میں وہ' اقتدار و اختیار کی مسندوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

یعنی کتنے دور چلے گئے! اندازہ لگائیے۔قرآن ایک طرف تو جو مجازی نقشہ کھینچ رہا ہے کہ ایسے درخت ہوں، سایہ بھی اتنا گھنا ہو، پھلوں سے شاخیں بھی لدی ہوئی ہوں، شاخیں جھکی ہوئی ہوں۔ یہ تو ہوا۔ٹھیک ہے یہ ہوتا ہے۔اگلی چیز جو ہے وہ اس طرح سے ہے کہ پھلوں سے لدی ہوئی شاخیں ان کے ہاتھوں میں آ گئی ہوئی ہیں۔اور یہ ہے جنتی معاشرہ! عزیزانِ من! پیداوار لاکھ زیادہ ہو، اگر وہ غریب کی دسترس میں نہیں ہے، تو انہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا:

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

غریب کے دکھ کی دوا تو وہ پھل کرے گا جو اس کی دسترس میں ہوگا: وَ ذُلِّلَتۡ قُطُوۡفُهَا تَذۡلِيۡلًا (76:14) اس طرح جھکے ہوئے کہ ان کی دسترس میں ہونگے، انہیں حاصل کرنے کے لیے انہیں جاں کاہ مشقتیں نہیں اٹھانی پڑیں گی بلکہ وہ خود ان کی طرف جھک کر آ جائیں گے۔

عزیزانِ من! اس نظام کی اگلی کیفیت سنیے کہ يُطَافُ عَلَيۡهِمۡ بِاٰنِيَةٍ مِّنۡ فِضَّةٍ وَّ اَكۡوَابٍ كَانَتۡ قَوَارِيۡرَاۡ o قَوَارِيۡرَاۡ مِنۡ فِضَّةٍ قَدَّرُوۡهَا تَقۡدِيۡرًا (76:15-16) [1] چاندی کے، شیشے کے، بلوری آبخورے، صراحیاں، پیالے، یہ سب بے ڈھب سے نہیں، ٹھیک پیمانے اور اندازے سے بنے ہوئے۔اِن عربوں کے ہاں جو کچھ برتن ورتن بھی بنتے تھے تو ان کے ہاں تو ابھی وہ تہذیب وثقافت کی بات ہی نہیں آئی تھی۔اب ثقافت کی بات آ گئی ہے تو ہمارے ہاں کلچر اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔میں یہ بتا دوں کہ عربوں کے ہاں بنی ثقیف ایک قبیلہ تھا، وہ تلواریں بنایا کرتے تھے، اور انہیں تیز کیا کرتے تھے۔عربوں کی ثقافت تو تلوار تھی مگر ہمارے ہاں ناچ اور گانا آ گیا۔اب اس کی روشنی میں دیکھیے: ثقافتِ اسلامیہ۔بہرحال انہیں چاندی کے کٹورے، بلوری صراحیاں، پیالے، اکواب، چاندی اور شیشے کے ملے ہوئے، پتہ نہیں اوپر شیشہ نیچے کچھ چاندی کے، یہ سب چیزیں ان کے گرد گردش کریں گی۔اور پھر وہ کیا بات ہے جو کہا کہ قَدَّرُوۡهَا تَقۡدِيۡرًا (76:16) وہ بھونڈے پن سے یونہی نہیں بنے ہوئے، وہ نہایت شائستگی وشستگی سے تیار کیے ہوئے، پیمائش کے مطابق بنائے گئے ہوں گے۔کیا بات ہے! اور پھر اس کے بعد کیا ہی خوب کہا کہ وَ يُسۡقَوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنۡجَبِيۡلًا [2] (76:17)

---

[1] چاندی کے برتنوں میں کھانے، بلوریں آبخوروں میں مشروبات۔یہ سب کچھ ان کے گرد گردش کریں گے۔خود چاندی کی چمک بلور جیسی ہوگی اور یہ سب برتن اور آبخورے، ٹھیک ٹھیک اندازے اور پیمانے کے مطابق، بنائے گئے ہوں گے۔

[2] وہاں انہیں ایسا کچھ پینے کو ملے گا جو زندگی بخش توانائیوں اور حرارتوں سے بھرپور ہوگا۔اس سے وہ اس قابل ہو سکیں گے کہ زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اور چڑھتے اور آگے بڑھتے جائیں (83:27)۔(یعنی ایک طرف یہ کیفیت کہ جذبات میں ذرا سا اشتعال پیدا ہونے لگے تو وحیِ خداوندی کی پابندی، ان میں ٹھنڈک پیدا کر کے، مزاج کو اعتدال پہ لے آئے (76:5) اور دوسری طرف یہ حال کہ حرکت وعمل میں ذرا سی سستی آنے لگے، تو بھرپور حرارت وتوانائی مل جائے۔) (۱۔۲ مفہوم القرآن۔پرویز)

قوتوں کو اعتدال میں رکھنا

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ پہلے یہ کہا تھا کہ **کَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا** ❶ (76:5)۔ یہ ابھی اسی سورۃ کی آیت پانچ تھی جس میں ''کافور'' کہا ہے اور یہاں (76:17) میں زنجبیل۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ قوتوں کو اعتدال پہ رکھنا چاہتا ہے تاکہ اگر کسی طرح سے قوتیں زیادہ ہوگئیں، ان میں شدت پیدا ہوگئی، تو کہیں سرکشی اختیار نہ کر جائے، اس کے مزاج میں تھوڑا سا کافور ملا دیا۔ یعنی آپ الفاظ کے اندر باریکیاں ملاحظہ فرمائیے ''کافور'' طبی نقطۂ نگاہ سے حرارت کو کم کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ حرارت کو کم کر کے اعتدال پہ لے آیا جاتا ہے اور اگر حرارت کم ہو رہی ہے تو طبی نقطۂ نگاہ سے تھوڑا سا ادرک دیا جاتا ہے، جسے زنجبیل کہتے ہیں، وہ تھوڑا سا ملا دیا جاتا ہے تاکہ اس کی حرارت جو کم ہوگئی ہے، وہ ذرا بڑھ جائے اور نقطۂ اعتدال پہ آ جائے۔ یعنی یہ بات مشروب کی ہو رہی ہے، جو کچھ پینے کو مل رہا ہے۔

شراب ہر پینے والی شے کو کہا جاتا ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں شراب کو، ہمارے ہاں والی شراب نہیں کہتے۔ یہ تو ہمارے ہی ہاں کہتے ہیں۔ عرب ہر مشروب کو کہتے ہیں، ہر پینے والی چیز کو کہتے ہیں جسے آپ Drink (شربت) کہتے ہیں۔ اُوہ، ڈرنک میں نے کہہ دیا، تو پھر یہ انگریزی کا ڈرنک آ گیا۔ کیا کیا جائے: بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔ پھر وہ کولڈ ڈرنک کہنا پڑتا ہے۔ تو ہر مشروب کو عرب شراب کہتے ہیں۔ تو کہا کہ جو کچھ ان پیالوں میں پینے کو ملے گا، اس کی کیفیت یہ ہوگی: حرارتیں اگر کم ہوگئی ہیں تو وہ ان کو ذرا بڑھا کر اعتدال پہ لے آئے گا، اگر بڑھ گئی ہیں تو وہ اس کو ذرا نیچے، گھٹا کے، لے آئے گا۔ اب بظاہر بات شراب اور پینے کی چیز کی ہو رہی ہے مگر دراصل یہ ساری بات اسلامی نظام کی ہو رہی ہے کہ جس میں ہر قوت کو اعتدال پہ رکھا جاتا ہے۔ کہا کہ **يُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا** ❷ (76:17)

---

❶ انسان اپنے جلد مشتعل ہو جانے والے جذبات کو وحی خداوندی کے تابع رکھ کر ان میں برودت (ٹھنڈک) اور سکون پیدا کر لے۔

❷ وہاں انہیں ایسا کچھ پینے کو ملے گا جو زندگی بخش توانائیوں اور حرارتوں سے بھرپور ہوگا۔ اس سے وہ اس قابل ہو سکیں گے کہ زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اور چڑھتے اور آگے بڑھتے جائیں (83:27)۔ (یعنی ایک طرف یہ کیفیت کہ جذبات میں ذرا سا اشتعال پیدا ہونے لگے تو وحی خداوندی کی پابندی، ان میں ٹھنڈک پیدا کر کے، مزاج کو اعتدال پہ لے آئے (76:5) اور دوسری طرف یہ حال کہ حرکت و عمل میں ذرا سی سستی آنے لگے، تو بھرپور حرارت و توانائی مل جائے۔) (۱۔۲ مفہوم القرآن۔ پرویز)

مزاجھا کا مفہوم

عزیزانِ من! مـزاجھـا ❶ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خود اس کے اندر اس قسم کی تاثیر ہوتی ہے۔ اگر زنجبیل والی ہوتو وہ تو پھر ہر وقت حرارت کو تیز ہی کرتی رہے گی' کافور والی ہوتو وہ حرارت کو کم کرتی رہے گی۔ یہاں مزاجھا ہے جس کے معنی ہیں کہ اس میں یہ ''آمیز'' کردی جاتی ہے کہ وہ یہ کچھ ہو جائے۔ عزیزانِ من! وقت بھی نہیں ہے' کیا عرض کروں' ورنہ ایک ایک لفظ کی تفصیل پہ جی چاہتا ہے کہ میں ایک ایک درس صرف کردوں۔ مثلاً یہ زنجبیل کا ہی لفظ ہے۔ اگر میں اس پر جاؤں کہ عربی زبان میں انہوں نے یہ لفظ کس طرح بنایا تھا تو پھر اس کے اوپر ایک درس صرف ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہاں کہا ہے کہ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ❷ (76:17)۔ یہ مشروب کہاں سے آتی ہے؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ❸ (76:18)۔ وہ ایک چشمہ ہے۔ یہ زندگی بخش مشروب ہے۔ یہاں اس چشمے کے متعلق کہا تھا کہ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا (76:6) وہ اس چشمے کو خود اپنے دل کی گہرائیوں سے ابھار کر' پھاڑ کر' لائیں گے۔ وہ چشمہ ان کے اندر سے ابھرے گا۔

عزیزانِ من! یہ بات اس قسم کی ہو رہی ہے جیسے ایران کا نقشہ کھینچا جا رہا ہو۔ الفاظ وہ استعمال کر رہا ہے کہ جس کے اندر اسلام کی ساری تعلیم چلی آ رہی ہے۔ کہا کہ یہی نہ سمجھ لینا کہ وہ چشمہ کہیں دور ہے' وہاں سے آئے گا۔ وہ تو آئے گا ہی' وہ تو دنیا کی ضروری چیزیں ہیں لیکن یہ چشمے وہ ہیں جو تمہارے قلب سے پھوٹتے ہیں۔ آپ کو یاد ہے کہ قرآنِ کریم نے سورۃ الماعون میں یہ کہا ہے کہ وہ معاشرہ جس میں شر اڑ کر لگ جایا کرتا ہے' اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ہر قوت والا' یا جس کا بھی بس چلتا ہے وہ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) جس رزق کے چشمے کو بہتے پانی کی طرح ہر ضرورت مند کے سامنے سے گزرتے ہوئے رواں دواں جانا چاہیے تھا' وہ اس پہ بند لگا کر اسے اپنے لیے روک لیتا ہے' دوسروں کو اس سے محروم کر دیتا ہے۔ اس سے وہ شر پیدا ہوتا ہے جو اڑ کر لگا کرتا ہے۔ ابھی یہاں تو غنیمت ہے کہ دنیا میں وہ وقت نہیں آیا جہاں پھر بھوکوں نے اٹھ کر فساد برپا کیے ہیں۔ اس سے نظر آتا ہے کہ شر کیسے اڑ کر لگا کرتا ہے۔

---

❶ اس کا مادہ ''م ز ج'' ہے۔ بقول صاحب تاج العروس اور محیط المحیط اَلْمَزْجُ کے معنی ہیں ملانا۔ مَزَجَ الشَّرَابَ بِالْمَاءِ کے معنی ہیں: اس نے شراب میں پانی ملا دیا۔ مِزَاجٌ وہ شے جو (شراب میں) ملائی جائے۔ اور صاحب محیط المحیط کے مطابق مِزَاجُ الْخَمْرِ كَافُوْرٌ کے معنی ہیں: ''اس شراب میں کافور کی خوشبو ہے۔'' ابن فارس نے اپنی تالیف مقاییس اللغۃ میں کہا ہے کہ دو ملی ہوئی چیزوں میں سے ہر شے دوسری کے لیے مزاج کہلاتی ہے۔ (لغات القرآن۔ پرویزؒ ص1537)

❷ جو زندگی بخش توانائیوں اور حرارتوں سے بھرپور ہوگا۔

❸ یہ زندگی بخش مشروب ایک ایسے چشمے سے ملے گا جو اپنا راستہ دریافت کرتا ہوا پیچھے سے چلا آتا ہے اور اسی طرح آگے بہے چلا جائے گا (88;12)۔ (یعنی اس سے انسان علمی تحقیقات کے بعد' زندگی کی نئی نئی راہیں تراشنے کے قابل ہو جائے گا اور اس طرح زندگی کی کشتی نئے نئے انکشافات وایجادات کی ندیوں میں تیرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جائے گی۔) (۲-۳ مفہوم القرآن۔ پرویز)

رزق کے چشموں پر بند لگا دینا

عزیزانِ من! قرآن نے کس کے لیے یہ کہا تھا کہ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (107:4-5) تباہی ہے ان کے لیے جو اپنے آپ کو دھوکا دیدیتے ہیں کہ ہم نے نماز پڑھ لی اور فریضہ ادا ہو گیا۔ ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے جو اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتے ہیں اور هُمْ يُرَآءُوْنَ (107:6) سمجھتے یہ ہیں کہ یہ اٹھنا اور بیٹھنا' یہ سجدہ اور رکوع وسجود' بس یہ ہے نماز۔ یہ کہہ کرا پنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں' دوسروں کی نگاہوں میں متقی اور پرہیزگار بن جاتے ہیں۔ اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) جس رزق کے چشمے کے پانی کو ہر ایک کے گھر کے سامنے سے گزرنا چاہیے' یہ اس پہ بند لگا لیتے ہیں اور اپنے لیے اس کو محفوظ کر دیتے ہیں۔ یہ ہیں وہ نمازی جن کے لیے تباہی ہے کیونکہ وہ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) کرتے ہیں۔ لہٰذا یہاں جو معاشرہ قائم کیا تھا اس کی تو یہ کیفیت تھی' جبکہ اس کے برعکس جنتی معاشرہ میں جو چشمہ ہے' اس کی کیفیت یہ ہے کہ سَلْسَبِيْلًا (76:8) وہ جاتا ہے تو راستہ پوچھتا جاتا ہے کہ بھئی! وہ فلاں گلی کون سی ہے' وہ فلاں راستہ کس طرف ہے' غریب کا گھر کہاں ہے میں نے اُدھر جانا ہے' او میاں! مجھے بتاتے جانا۔ وہ سلسبیلا ہے۔ راستے کو پوچھتا ہوا جاتا ہے' اس گھر کا راستہ خود پوچھتا ہے جہاں پانی کی ضرورت ہے۔

قرآن کی اصطلاحات کا مفہوم ہی بدل دیا گیا

عزیزانِ من! یہ قرآن کے الفاظ ہیں' یہ قرآن کی اصطلاحات ہیں۔ اُن میں ایک اصطلاح سَلْسَبِيْلًا بھی ہے۔ یہاں لاہور میں تو نہیں دیکھا مگر کراچی میں ایک پٹرول پمپ پہ لکھا ہوا تھا: سَلْسَبِيْل ملاحظہ فرمائیں ہمارے ہاں قرآن کی ساری اصطلاحات ایسی ہو گئی ہیں۔ جب مصلین کی اصطلاح وہ ہو گئی ہوئی ہے' تو یہ سلسبیل کی کیوں نہ ہو گئی ہو؟ اس لیے کہ وہ چشمہ تو اب کہیں ہے ہی نہیں' ناپید ہے کہ جو خود پوچھے کہ پیاسا کہاں ہے' مجھے اس کا گھر بتا دینا۔ یہ ہے سَلْسَبِيْلًا۔ یہ ہے اس چشمے کا پانی جسے آپ کہیں گے کہ کہاں سے آتا ہے۔ ایک ریفرنس[1] (83:26-27) بھی ہے' اسے بھی دیکھ لیں۔

---

[1] خِتٰمُهٗ مِسْكٌ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ (83:26-27) ان آبگینوں کی مہریں بھی تقویت بخش عناصر (مشک) سے مرکب ہوں گی۔ یہ ہیں زندگی کو بڑھانے والے اسباب وعناصر جن کے حصول کے لیے تمہیں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ (ایک دوسرے سے مسابقت کا جذبہ ہر انسان کے اندر ہے لیکن کوتاہ بین انسان اس کے لیے میدان غلط منتخب کرتا ہے۔ وہ محض طبعی زندگی کے مفاد کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کرتا ہے۔ اس جذبہ کی تسکین کے لیے صحیح میدان یہ ہے کہ تم نوع انسان کی ربوبیت کی جدوجہد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اس سے تمہیں زندگی بخش ''بادۂ رحیق'' ملے گا (12:1 ;57:20) اس ''بادۂ رحیق'' میں اس چشمے کا آب خنک وشیریں ملایا جائے گا جو شرفِ انسانیت کے بلندترین مقام سے پھوٹ کر نکلتا ہے اور انسانی صلاحیتوں کی بھرپور نشوونما میں ممد ومعاون ہوتا ہے (76:17)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز ص 1428)

قرآنی الفاظ ''مسک'' اور ''تسنیم'' کا مفہوم

عزیزانِ من! ایک ایک لفظ میں قرآن معنویت پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔(83:26) میں کہا ہے کہ **خِتٰمُهٗ مِسْكٌ** یعنی اس کے اوپر جو سیل (Seal) ہے وہ ''مسک'' کی ہے' اُسے ہم مشک کہتے ہیں۔ یہ وہی زنجبیل والی بات ہے۔ یہ کاہے کے لیے ہے؟ کہا کہ **مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ** (83:27)۔ ہمارے ہاں تو اب یہ جو الفاظ ہیں' معاف رکھیے گا' وہ دوسرے کام کے لیے ہیں۔ مثلاً پہلی لڑکی پیدا ہوئی تو اس کا نام نسیم رکھ دیا پھر اس کے بعد دوسری پیدا ہوگئی تو اس کا نام شمیم رکھ دیا' پھر تیسری پیدا ہوگئی تو تسنیم رکھ دیا۔

عزیزانِ من! تسنیم [1] تو اس چشمہ کو کہتے ہیں جو اوپر سے نیچے کی طرف آئے۔ وحی خداوندی کے لیے نزول کا لفظ تھا' بارش کے لیے نزول کا لفظ تھا۔ یہ چشمہ وہ ہے جس کے لیے تسنیم کا لفظ ہے۔ یہ آبشار کی طرح اوپر سے نیچے آ رہا ہے' بلندیاں اس کے اندر ہیں' اس چشمے کا جو Source (منبع ومخرج) ہے' وہ بلندی پہ واقع ہوا ہے' وہاں سے تمہارے ہاں آتا ہے اور پھر راستہ پوچھتا ہوا' ہر پیاسے کی پیاس بجھاتا ہوا' آگے چلا جاتا ہے۔

مومن ہمیشہ بلندیوں پر پرواز کرتا ہے

عزیزانِ من! اس چشمے کے لیے کہا ہے کہ اس کا ''مزاج'' **مِنْ تَسْنِيْمٍ** ہے۔ اس کے اوپر مہر یعنی سیل (Seal) مشک کی لگی ہوئی ہے۔ مزاج میں زنجبیل کی تھوڑی سی آمیزش کر دی گئی ہے تاکہ قوتیں اور حرارتیں باقی رہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کچھ کاہے کے لیے کیا گیا ہے؟ کہا کہ **ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ** (83:26) یہ اس لیے ہے کہ زندگی کی شاہراہ پر اقوامِ عالم میں جو آگے بڑھنا چاہتا ہے' وہ اس سے آگے بڑھ جائے۔ یہ مشروبات اور جنت کی یہ آسائشیں منافست کے لیے دی جاتی ہیں' یہ آگے بڑھنے کے لیے ہیں اور یہ سب کچھ قوموں کی زندگی کے لیے ہیں۔ مومنے بالائے ہر بالاترے۔ مومن کی شان یہ ہے کہ جتنا کوئی اونچا بلندی کے اوپر ہے یہ اس سے بھی بلند ہے کہ غیرتے او برنتابد ہمسرے۔ پیچھے رہ جانا تو ایک طرف رہا اس کی تو غیرت بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اس کے ہمدوش ہو جائے۔

---

[1] ''تسنیم'' کا مادہ ''س ن م'' ہے۔ اَلسَّنَامُ اونٹ کا کوہان۔ اَلسَّنِمُ مِنَ النَّبْتِ بلند پودہ جس کے پھول (یا بالیں) نکل آئے ہوں۔ سَنَامُ كُلِّ شَيْءٍ ہر شے کا بلند حصہ یا بہترین حصہ (تاج العروس ومفردات امام راغب)۔ ابن فارس نے اپنی مشہور تالیف مقاییس اللغۃ میں لکھا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی رفعت اور بلندی کے ہیں۔ پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد دوم ص 907 پر لکھا ہے کہ ''اس میں بلندیوں کا تصور ہے یعنی زندگی کے ارتقائی مدارج' انسانیت کی رفعتیں' صلاحیتوں کی بھرپور نشوونما۔'' قرآن اسے عَيْنًا يَّشْرَبُ بها المقربون (83:28) کہتا ہے یعنی ایسا چشمہ جس سے مقربین پیتے ہیں۔ جس میں رفعت اور بلندی ہو۔

وہ آگے جاتا ہے، بلندیوں پہ جاتا ہے۔ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ o عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ❶ (83:7-8)۔ یہ سارا کچھ کاہے کے لیے ہے؟ اس کے لیے کہا کہ وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (83:26) جس نے آگے بڑھنا ہے وہ آگے بڑھتا ہوا چلا جائے۔

جنتِ ارضی کا معاشرتی ماحول

عزیزانِ من! قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا (76:19) اور پھر جنت والوں کے ہاں ان کے اہل وعیال میں سے بھی ہونگے لیکن صرف وہ ہوں گے جو جنت میں جانے کے مستحق ہونگے۔ صرف بڑے باپ کا بیٹا ہونے کی جہت سے جنت میں نہیں پہنچ جائیں گے۔ یہ نسبت تو وہاں کوئی شے ہی نہیں ہے کہ دریں رہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست۔ صرف وہ جنت میں جائیں گے جو خود مستحق ہونگے۔ اور نقشہ ایسا کھینچا ہے کہ جی چاہے گا کہ انسان خود بھی ہو، بیوی بچے بھی ساتھ ہوں، ان سے کہا ہے کہ یاد رکھو! ان کی نجات کی بھی فکر کرو۔ جب اس صورت میں تمہارے ساتھ ہونگے تو اس قسم کے جو بچے تنومند و توانا، خوبصورت، خوش جلد اور سعادت اطوار ہوں گے، یہ بھی وہاں ساتھ ہونگے۔ وہاں تم ان کو دیکھو تو ایسا نظر آئے جیسا چمکتے ہوئے موتی۔ یہ جو موتی سے تشبیہہ دی جاتی ہے، یہ اس لیے ہوتی ہے کہ ان کی سیرت بے داغ ہوتی ہے: موتی سے درخشندہ و تابندہ گوہر، گوہرِ تابندہ۔ آپ کو یاد ہے میرے ایک پمفلٹ کا نام ہے: ''گوہرِ تابندہ''۔ یہ لفظ گوہر فارسی زبان کا ہے۔ عربی میں وہ ''لؤلؤا'' آجائے گا۔ یہ تشبیہاً پاکیزہ بے داغ سیرت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس قسم کے وہ نوجوان بیٹے ہوں گے، اولاد بھی ساتھ ہوگی۔ اور پھر اس کے ساتھ منثور کا لفظ بھی آیا ہے۔ کیا بات ہے! یوں تو وہ لفظ ویسے ہی موتیوں کے لیے آتا ہے جو بکھرے پڑے ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان گھر والوں ہی کے لیے نہیں کہ چار دیواری میں بند کر کے ان کو رکھ چھوڑا ہوگا کہ انہیں باہر ہی نہ نکلنے دیا ہو۔ ان بچوں کی معاشرے کے اندر یہ صورت نہیں ہوگی، ان کو معاشرے میں پھیلایا ہوا ہوگا۔ وہ ہر جگہ آجا سکیں گے یعنی وہاں یہ ڈر نہیں ہوگا کہ کسی طرح سے غلط قسم کی تربیت کی چیزیں بچوں کو متاثر کر جائیں گی: باہر نہ بھیجو ان کو، بابا! پتہ نہیں وہ معاشرہ کس قسم کا ہے۔ وہ تو سارا معاشرہ جنت ہوتی ہے، جنت میں کوئی گوشہ بھی جہنم نہیں ہوتا، جیسے جہنم کا کوئی گوشہ بھی جنت نہیں ہوتا۔ یہ ہیں

---

❶ اس ''بادۂ رحیق'' میں اس چشمے کا آب خنک وشیریں ملایا جائے گا جو شرفِ انسانیت کے بلند ترین مقام سے پھوٹ کر نکلتا ہے اور انسانی صلاحیتوں کی بھرپور نشوونما میں مدد ومعاون ہوتا ہے (76:17)۔ یہ وہ چشمہ ہے جس سے وہ لوگ جو اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو (علی حد بشریت) منعکس کر لیں، زندگی اور اس کی توانائیاں حاصل کرتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز ص 1428)

لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا [1] (76:19)

جنتِ ارضی میں آسائش وزیبائش کے ساتھ جلال وجمال بھی ہوگا

عزیزانِ من! اب یہ سارا کچھ کہنے کے بعد کہا کہ اِذَا رَاَیۡتَ ثَمَّ رَاَیۡتَ نَعِیۡمًا وَّ مُلۡکًا کَبِیۡرًا [2] (76:20)۔ اب یہ بات آ گئی کہ وہاں کیا کچھ میسر ہوگا؟ کائنات کے اندر جلال اور جمال دو ہی چیزیں ہیں۔ اِن میں آسائشیں' زیبائشیں اور آرائشیں' یہ ایک طرف ہیں۔ یہ جمالیات کی چیزیں ہیں اور اس کے ساتھ یعنی دوسری طرف مملکت' قوت اور اقتدار ہیں۔ یہ جلال کی چیزیں ہیں۔ قرآن کا خدا اَلۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ (85:8) ہے۔ ''صاحبِ قوت بھی ہے اور مستحقِ حمد وستائش بھی ہے۔'' اس آیت میں کہا ہے کہ اس معاشرے کو تم دیکھو گے' پھر دیکھو گے' بار بار دیکھو گے' تو وہاں دونوں چیزیں نظر آئیں گی: آسائشیں اور زیبائشیں بھی نظر آئیں گی' قوت اور جبروت بھی نظر آئے گا۔ یہ قوت اور جبروت مُلۡکًا کَبِیۡرًا (76:20) ہے۔ ہاں مملکت نظر آ گئی' بہت بڑی مملکت نظر آ گئی۔

تئیس لاکھ مربع میل پر مملکت

عزیزانِ من! یہی وہ گوشہ ہے جو بڑھا' پھیلا اور پھیلتا چلا گیا۔ مکے مدینے والے اِس گوشے کو وسعت دینے گئے۔ چند ہی سالوں کے عرصے کے اندر آپ اندازہ لگائیے کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے وقت تو مملکت دس لاکھ مربع میل پر مشتمل تھی' چند ہی سالوں کے بعد' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے (634-644/45ء) میں' اس مملکت کو تئیس لاکھ مربع میل میسر تھا: سارا ایران' اُدھر سے رومن کا وہ حصہ بازنطینی' جو اس طرف تھا' مصر کا علاقہ اور اُدھر بلوچستان تک کا علاقہ۔ ذرا آگے چل کر جو ہم کہتے ہیں اور اب تو تاریخ آہستہ آہستہ انکشاف کر رہی ہے کہ صحابہؓ کے زمانے میں وہ چین تک پہنچے ہوئے تھے۔ یہ عظیم مملکت تھی جس کے بچے کھچے ٹکڑے آج بھی دنیا میں مسلمانوں کی چوالیس آزاد مملکتوں کی صورت میں ملتے ہیں۔ انہی کے جو پھینکے ہوئے ٹکڑے ہیں انہیں ہم آج تک چبا رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مملکت کاہے کے لیے تھی اور آج ہماری یہ مملکتیں کاہے کے لیے ہیں لیکن پھر بھی وہ جو مملکتیں تھیں' ٹوٹنے کے بعد آج بھی ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں وَ مُلۡکًا کَبِیۡرًا (76:20) ہیں۔ آسودگی وآسائش اور قوت واقتدار کی رمق باقی ہے۔

---

[1] ایسے ہشاش بشاش' تروتازہ' تندرست وتوانا' گویا موتیوں کے دانے ہیں جو بکھرے پڑے ہیں۔ یعنی ان کی صحت بھی قابلِ رشک ہوگی اور صحیح تعلیم وتربیت سے ان کی سیرت بھی گہرآبدار کی طرح پاکیزہ۔ لیکن انہیں صدف میں بند نہیں رکھا جائے گا بلکہ معاشرہ میں منتشر کر دیا جائے گا' اور اس کے باوجود' وہ اپنی پاکیزگی کو ملوث نہیں ہونے دیں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز ص 1395)

[2] تو اس معاشرہ پر' جب اور جدھر سے بھی نگاہ ڈالے گا' اس میں آسودگی اور آسائش بھی دکھائی دے گی اور قوت واقتدار بھی۔ یہ معاشرہ' جلال وجمال کا حسین ترین مجموعہ ہوگا۔ (جلال وجمال کا امتزاج' انسانی ذات کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز' ص 1395)

ملک کبیر کی تمام نعمتوں پر دسترس

عزیزانِ من! آپ یہ دیکھیے گا کہ یہ کوئی فقیروں کی' تکیہ والوں کی' خانقاہ والوں کی' باتیں نہیں ہو رہی ہیں۔ ملکِ کبیر بھی اس کے ساتھ دیا جا رہا ہے' استخلاف فی الارض ایمان اور عملِ صالح کا نتیجہ بتاتا ہے۔ اس **مُلْكًا كَبِيْرًا** میں آسائشوں اور آسودگیوں کی طرف آیئے۔ قرآن کہتا ہے کہ **عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ** (76:21) وہ باریک اور دبیز ریشمی پارچات میں ملبوس ہوں گے۔ یعنی ان کے لباس ریشم کے ہوں گے: دبیز ریشم کے اور باریک ریشم کے۔ یہ تفاصیل پیچھے سے چلی آ رہی ہیں۔ مزید کہا کہ **وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ** [1] (76:21)۔ اس آیت میں ''اساور'' کا یہ لفظ بڑا عجیب ہے۔ اس کے لفظی معنی تو بلندی' رفعت' شرف وفضیلت کے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں سوار اس کا ترجمہ ہے۔ یہ سوار یا **اساور** کا لفظ ''س ور'' سے نکلا ہے۔ اسی سے سورۃ کا لفظ آیا' اسی سے قرآن کی سورۃ کا لفظ نکلا ہے' یعنی بلندیوں کی طرف لے جانے والی چیز۔ ایرانیوں کے ہاں' جو شہنشاہ کے مقرب ہوتے تھے' قریب ترین لوگ تھے' جیسے ہمارے ہاں اکبر بادشاہ (1542-1605) کے نورتن مشہور ہیں' انہیں **اساور** کہتے تھے۔ انہیں وہ چاندی کے' سونے کے' کنگن پہنایا کرتے تھے۔ وہ نشانی ہوتی تھی کہ یہ شہنشاہ کے مقربین ہیں۔ وہ لوگ گنے چنے ہوتے تھے۔ یہ تھے **اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ** (76:21)۔ کہا کہ وہ ''اساورہ'' ہیں جنہیں تم دیکھتے ہو۔ سرداری کے یہ کنگن وہاں کی بلند ترین ہستیوں کی' شخصیتوں کی' صاحبِ قوت وجلال کی' نشانی ہوتی ہے۔ یہ نشانی اہلِ جنت کی ہوگی۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ انہی الفاظ میں وہی نقشہ کھینچا جا رہا ہے جو ان کے سامنے اہلِ ایران کا تھا **وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا** [2] (76:21)

یہ سب کچھ انسانی اعمال کی ہی جزا ہوگی

عزیزانِ من! اب ذہن میں یہ چیز آ سکتی تھی کہ کیا بلند ترین ہستیوں میں' ان آسائشوں سے عیش پرستی کی خباثتیں پیدا ہوں گی۔ فوراً کہا کہ نہیں' انہیں وہاں پینے کے لیے **شَرَابًا طَهُوْرًا** (76:21) ملے گا' یعنی ایسا ڈرنک ملے گا شراباً ڈرنک' پینے والا طہوراً جس سے سیرت میں پاکیزگی پیدا ہو جائے۔ جسے ہم شراب کہتے ہیں' اس سے جو سیرت پیدا ہوتی ہے' وہ تو ہمارے سامنے ہے۔ یہاں **شَرَابًا طَهُوْرًا** کہا ہے۔ یہ سب کچھ دینے کے بعد ان سے کہا کہ یہ کچھ تمہیں خیرات کے طور پر نہیں دیا جائے گا کہ ہاتھ سے لو اور آنکھیں شرما جائیں۔ نہیں' یہ بات نہیں ہے۔ وہ تو تم نے اپنے مزاج کو بگاڑا اور اس کا نام بخشش بخشیش رکھ دیا اور کہا کہ جنت بھی بخشش میں ملتی ہے۔

---

[1] (اور اقتدار کی طرف دیکھیے تو) ان کے ہاتھوں میں سرداریوں کے کنگن ہوں گے (لیکن ان میں نہ تو اُن آسائشوں سے عیش پرستی کی خباثتیں پیدا ہوں گی' اور نہ ہی جاہ واقتدار سے نشہ قوت کی بدمستیاں۔) (مفہوم القرآن۔ پرویز، ص1395)

[2] انہیں' ان کا نشو ونما دینے والا' وہ کچھ پینے کو دے گا جس سے ان کے قلب ونگاہ میں پاکیزگی پیدا ہو۔ (ایضاً)

یادرکھیے! یہ بخشش میں نہیں ملتی اس کے لیے تو کہا ہے کہ اِنَّ ھٰذَا کَانَ لَکُمْ جَزَآءً وَّ کَانَ سَعْیُکُمْ مَّشْکُوْرًا [1] (76:22) یہ سب کچھ جو ہم نے بتایا ہے یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کی جزا ہے، ہم نے تمہاری جو محنتیں تھیں صرف ان کو بارآور کردیا ہے۔ان میں یہ پھل آ گیا ہے، بھرپور نتائج پیدا کیے ہیں۔ یہ سَعْیُکُمْ ہے یعنی تمہاری اپنی محنت نے یہ بھرپور نتائج پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ ہے جو تمہیں ملا ہے۔مگر یہ ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ خدا واسطے کی جنت ہے۔اسے یاد رکھیے! یہ وہ نہیں ہے۔ یہ خیرات کے ٹکڑے نہیں ہیں جو تمہیں دیئے گئے ہیں۔ یہ تمہاری اپنی محنت کا اجر ہے اور قرآن نے جس معاشرہ کا ذکر کیا ہے، اس معاشرے میں تو Return (معاوضہ) یا Compensation یعنی جزا، بدلا، معاوضہ اس اصول پر ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53:39) معاوضہ صرف محنت کا ہے، سرمائے کا نہیں ہے۔ یہاں بھی یہی کہا ہے کہ کَانَ سَعْیُکُمْ مَّشْکُوْرًا (76:22) تمہاری جو لیبر تھی، تمہاری جو محنت تھی، اس نے بھرپور نتائج پیدا کیے ہیں۔ یہ جزا ہے، اس کا معاوضہ ہے، جو تمہاری محنت تھی، ہم نے اس کو یہ دیا ہے۔اب یہ جو اس قسم کا معاشرہ کہا گیا ہے، اسے کس طرح سے قائم کیا جائے گا؟ کہا کہ اس کے قائم کرنے کے لیے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا [2] (76:23) ہے۔

قرآن اسی قسم کے معاشرے کی طرف بتدریج ترغیب دیتا ہے

عزیزانِ من! یہاں (76:23) میں کہا ہے کہ اس معاشرے کے قائم کرنے کے لیے ہم نے تمہاری طرف اس قرآن کو نازل کیا ہے۔ یہاں پھر لفظ وہی نزول ہے یعنی اوپر سے نیچے آنے والی بات۔ہم نے اس قرآن کو تمہاری طرف نازل کیا ہے: یہ تنزیلاً ہے یعنی بتدریج آہستہ آہستہ۔وہ اس لیے کہ اس معاشرے کو قائم کرنا تھا۔وہ پورا معاشرہ Negative (نفی) تھا، جس کو قرآن نے جہنم کا معاشرہ بتایا ہوا ہے، جس میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی ہے۔عرب کے اس معاشرے کے اندر تبدیلی پیدا کرنے کے لیے تدریجی محنت کی ضرورت تھی۔ یہ Over-night (ایک ہی رات میں) نہیں آ سکتا تھا۔ یہ By Revolution (انقلاب لانے سے) نہیں آ سکتا تھا۔ یہ By Evolution (ارتقائی مراحل طے کر کے) ہی آ سکتا تھا۔ یہ ارتقائی طور پر ہی پیدا ہو سکتا تھا، اس لیے کہ اس کی بنیاد سیرت اور کردار میں تبدیلی تھی، یہ بنیاد قلب و دماغ کے اندر انقلاب لانے کی تھی۔تبدیلی کے یہ چشمے دل کی گہرائیوں سے پھوٹتے تھے۔قوت کے زور پر تو آپ ایک گھنٹے میں اس قسم کا انقلاب برپا کر سکتے ہیں، Over-night (شبا شب) تو بڑی لمبی چیز ہوتی ہے لیکن وہ انقلاب نہیں ہوگا۔

---

[1] یہ سب کچھ تمہاری اپنی جدوجہد کا نتیجہ ہے جو اَب ثمر بار ہو کر، تمہارے سامنے آ گیا ہے۔(مفہوم القرآن۔ پرویزؒ ص1395)

[2] ہم نے (اے رسول!) تجھ پر یہ ضابطہ حیات (قرآن) بتدریج نازل کیا تا کہ اس پر ساتھ کے ساتھ عمل ہوتا رہے۔(مفہوم القرآن۔ پرویزؒ ص1395)

انقلاب تو وہ ہے جس میں قلب کی تبدیلی ہو اور قلب کی تبدیلی کے لیے **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ**[1] (2:129)

قبولِ اسلام کے سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان

عزیزانِ من! اِس انقلاب لانے کے لیے نبی اکرمؐ جیسا معلم ہے۔ ان صحابہ کرام جیسے سیکھنے والے ہیں۔ حضور ﷺ کا فریضہ بتایا کہ وہ کتاب کی اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، عقل و فکر اور عقل و شعور پیدا کرتا ہے اور اس کے ساتھ وَ يُزَكِّيْهِمْ آیا ہے۔ یعنی اس طرح سے یہ سیرتوں کو پاکیزہ کرتا ہے۔ یہ تھے وہ جسے اب آپ اہلِ جنت کہیے یعنی وہ لوگ جن کے ہاتھوں سے یہ معاشرہ قائم ہوا تھا۔ یہ Over-night (شباشب) نہیں ہو سکتا تھا۔

ویسے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک ایک صحابیؓ مقام رکھتا ہے اور سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم برابر کے تبریک و تہنیت کے مستحق ہیں لیکن جن کے ہاتھوں سے یہ اتنی مملکتیں قائم ہوئیں ان میں حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کا ایک خاص مقام ہے۔ ان کا بار بار ذکر آتا ہے کہ وہ کس طرح عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے فاروق رضی اللہ عنہ بنے تھے۔ اپنی اس Conversion (تبدیلی ایمان) کے بارے میں وہ تو خود کہتے ہیں کہ ''میں رات کو نکلا کہ دیکھوں کیا ہو رہا ہے۔ ہم رات کو اکٹھے ہوا کرتے تھے۔'' آپ خود بیان کرتے ہیں کہ ''میں نکلا تو وہاں دیکھا کہ جہاں ہم اکٹھے ہوا کرتے تھے، اس دن وہاں کوئی نہیں تھا، نہ معلوم کیا حادثہ ہو گیا کہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ تو میں بڑا مایوس ہوا۔ رات کو دیر سے گھر جانا ہمارا معمول تھا۔ سوچا کہ اب کیا کریں؟'' کافر نہ توانی شدنا چار مسلمان شو۔ کہا کہ ''چلو کعبے کو چلتے ہیں، دیکھتے ہیں شاید وہاں کوئی ہو، اس سے کچھ باتیں واتیں کریں گے۔'' یعنی یوں تو یہ کعبے کیطرف آئے تھے کہ شراب خانہ بند تھا۔ یہاں دُور سے دیکھا تو ایک شخص نہایت پرکشش انداز میں قرآن کی تلاوت کرنے میں مشغول تھا۔ کہنے لگے کہ ''وہ تلاوت تو بجلی کی طرح میرے سینے میں اتر گئی۔ چپکے سے، ایک طرف، خاموشی سے کھڑا ہو گیا کہ کہیں میری آہٹ پا کے یہ بند نہ کر دیں۔ دیکھا تو وہ پڑھنے والا محمد ﷺ تھا، قرآن کی آیتیں پڑھ رہا تھا۔'' کہنے لگے: ''وہ پڑھتا گیا اور میرے اندر ایک تبدیلی پیدا ہوتی گئی۔ یا اللہ! یہ کلام ہے، جس کے خلاف ہمیں اتنی نفرت دلائی گئی، اور میں لٹھ لیے پیچھے پھرتا رہا، وہ تو یہ کہہ رہا ہے''۔ کہنے لگے: ''میں کعبے کے غلاف میں چھپ گیا کہ کہیں مجھے دیکھ کر یہ قرآن کی آیتیں پڑھنا بند نہ ہو جائے۔ وہ پڑھتا گیا۔'' رات کا سماں، تاروں کی روشنی، کعبے کا ماحول، محمد ﷺ کی آواز، خدا کا کلام۔ عمر رضی اللہ عنہ سن رہا تھا۔ حضور ﷺ نے بند کیا۔ آپ ﷺ چل دیئے۔ ''میں پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ گھر تک پہنچا تو انہوں ﷺ نے مڑ کے دیکھا۔'' میرے متعلق مشہور تھا

---

[1] وہ انہیں ضابطہ (کتاب) کی تعلیم بھی دیتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ اِن قوانین کی غرض و غایت کیا ہے اور ان پر عمل کرنے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے (2:23; 17:39; 33:34)۔ اور (صرف نظری طور پر ہی یہ تعلیم نہیں دیتا بلکہ عملاً ایسا نظام متشکل کرتا ہے جس میں) لوگوں کی صلاحیتوں کی برومندی اور اُن کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ ص 47)

کہ میں ان کو قتل کرنے کے ارادے کر رہا ہوں۔ مڑ کے دیکھا تو کہا: ''عمر رضی اللہ عنہ اس وقت کہاں آئے ہو؟'' میں نے کہا: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پیچھے آ رہا ہوں۔ اتنی سی بات ہے۔'' پوچھا: ''کیا ارادہ ہے؟'' کہا: ''ارادہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ چوم لوں۔ ارادہ یہ ہے کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ رہے تھے اس کے متعلق میں بھی پڑھ لوں' ارادہ یہ ہے کہ ہاتھ لائیے' میں اسلام لاتا ہوں۔'' پتہ نہیں یہ کتنے شب و روز کی سوز گدازیوں کا نتیجہ تھا جو عمر رضی اللہ عنہ کی یہ کیفیت پیدا ہوگئی۔ اور پھر وہاں سے تعلیم و تربیت شروع ہوئی ہے۔ یہ تو قدمِ اول ہے۔ اسی قرآنِ کریم نے کہا کہ **یُزَکِّیۡھِمۡ** وہ لوگوں کی صلاحیتوں کی برومندی اور ان کی ذات کی نشو و نما کرتا ہے **وَیُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ** وہ انہیں ضابطہ (کتاب) کی تعلیم دیتا ہے اور **وَالۡحِکۡمَۃَ** اور یہ بھی بتاتا ہے کہ ان قوانین کی غرض و غایت کیا ہے۔ تو یوں یہ عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بنتے گئے۔

عزیزانِ من! قرآن تنزیلاً یعنی بتدریج نازل کیا اور اس میں پھر یہ نہیں تھا کہ اپنے حجرے میں بیٹھ گئے اور تسبیح پڑھنی شروع کر دی۔ اس میں تو کوئی مزاحمت ہی نہیں ہوتی' کوئی مخالفت ہی نہیں ہوتی۔ یہ ایک نظام کا قیام تھا' مخالفت ہونی تھی اور ہوئی۔ اس کے لیے کہا کہ **فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ** (76:24) بڑی مشکلات کا سامنے آئے گا' خدا کے احکام کی اطاعت میں بڑی مخالفتیں ہونگی' بڑی مزاحمتیں ہونگی' استقامت سے ان کو برداشت کیے جاؤ۔ اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ **وَلَا تُطِعۡ مِنۡھُمۡ اٰثِمًا اَوۡ کَفُوۡرًا** ❶ (76:24)۔ اس آیت میں ''اٰثِمًا'' کی اور ''کفور'' کی کیا بات ہے! اثم کے عام معنی تو یہ کیے جاتے ہیں کہ کوئی شخص جو گناہگار ہو اور کفور جو ناشکرا ہو تو کہا کہ اس کی اطاعت نہ کر۔ گناہگار اور ناشکرے کی اطاعت چہ معنی؟ یہ الفاظ تو بڑے ہی پر معنی ہیں اور اِن کے اندر تو انتظامی امور کا ایک سمندر چھپا ہوا ہے۔

تھکا دینے والا پروگرام

عزیزانِ من! اس قسم کا نظام' اس قسم کی حکومت کا قیام اور اس کے انتظامی امور تو ایسے ہیں جو تمہیں تھکا دیں۔ یہاں' اس آیت میں یعنی (76:24) میں یہ لفظ **اثم** آیا ہے جس میں کہا ہے کہ جو تمہیں ''تھکا دے'' جو تمہاری صلاحیتوں کو مٹی کے نیچے دبا دے' ان کی اطاعت نہ کرنا۔ ہر انسانی حکومت میں' محکومیت میں' یہی ہوتا ہے کہ وہ ابنائے قوم کو ذبح کر دیتے ہیں' اتنی مشقت لیتے ہیں کہ ہر شخص تھک جاتا ہے' جسمانی طور پر نہ تھکے تو ذہنی طور پہ تھکا دیتے ہیں اور پھر کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی کی صلاحیت ابھرنے نہ پائے۔ یہاں کہا: اس چیز کو یاد رکھنا ان میں سے کسی کی اطاعت نہ کرنا' بلکہ **وَ اذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ بُکۡرَۃً وَّ اَصِیۡلًا ہ وَ مِنَ الَّیۡلِ فَاسۡجُدۡ لَہٗ وَسَبِّحۡہُ لَیۡلًا طَوِیۡلًا** ❶ (76:25-26)۔ یہ وہ آیتیں ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ صبح و شام خدا کا نام لے' رات کے کچھ حصے میں بھی اس کو سجدہ کر یعنی انہی کے مطابق اپنی عملی زندگی میں عمل پیرا رہ۔ عزیزانِ من! وہ ❷ لوگ تو اس آیت سے نماز کے اوقات کا تعین کرتے ہیں۔ بہر حال

---

❶ اور کسی ایسے شخص کی بات نہ مان جو اس کے خلاف راستے پر گامزن ہو۔ ذاتی مفاد پرستی کے غلط راستے پر چلنے سے انسان کی قوت عمل مضمحل ہو جاتی ہے یا اس کی صلاحیتیں دبی کی دبی رہ جاتی ہیں۔ جو شخص ایسے لوگوں کی بات پر کان دھرے گا اس کی بھی یہی حالت ہو جائے گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ' ص 1396)

میں نے جتنا کچھ قرآن کا مطالعہ کیا ہے میں پھر عرض کردوں' مجھے قریباً پچاس سال ہوگئے ہیں۔ہمیں متعین طور پر نماز کے اوقات قرآن سے نہیں ملتے۔بطورِ استنباط وہ ❷ اس قسم کی آیتوں سے یہ لیتے ہیں: صبح شام اور رات کے کسی حصے میں یہاں تین' کسی اور سے دو۔

فرقہ اہلِ قرآن سے میری مخالفت کی وجہ

میں فرقوں کی اس بحث میں نہیں پڑتا۔جو کچھ امت میں ہوتا چلا آرہا ہے' میں ہمیشہ تاکید کرتا ہوں کہ اسے اس معاشرے کے اندر قائم رکھا جائے اور اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کی جائے' کوئی تفریق نہ کی جائے' کوئی نیا طریقہ نہ ایجاد کیا جائے۔یہ جنہیں اہلِ قرآن کہتے ہیں ان کے ساتھ میری لڑائی اس پر ہے کہ انہوں نے اتنی سی بات پہ کہ نمازیں پانچ نہیں' تین ہیں' ایک الگ فرقہ بنالیا۔وہ پانچ سے کونسا امت کا بیڑہ غرق ہورہا تھا جو تین سے تم نے ان کو بچالیا۔یہ تبدیلی کر کے تم نے کیا کیا؟اس کی جگہ اگر صلٰوۃ کے مفہوم کو واضح کیا ہوتا تو بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی صلٰوۃ

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ **وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ** (76:25) خدا کی صفتِ ربوبیت کو عام کرنے کے لیے صبح' شام' رات کے کچھ حصے میں' تگ و دو کرتے چلے جاؤ۔اور اس کے لیے تمہیں **فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ** (76:24) استقامت سے کھڑا ہونا ہوگا۔یہ تین نمازیں ہوں' پانچ ہوں' دس ہوں' کتنی بھی ہوں' اس میں کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔اس صلٰوۃ کے لیے تو حضرتِ شعیب علیہ السلام ❸ نے اپنی قوم

---

❶ ان سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ تو صبح و شام' ہر وقت' خدا کی صفت ربوبیت کو اپنے سامنے رکھ اور اس کی روشنی میں نظامِ ربوبیت کی تشکیل میں سرگرمِ عمل رہ۔دن ہو یا رات' ہمیشہ' اسی کے قوانین کے سامنے جھک اور اپنے پروگرام کی تکمیل کی فکر میں اپنی پوری پوری وسعتوں کے ساتھ منہمک رہ (73:1-3)

❷ یہ اشارہ فرقہ اہلِ قرآن کی طرف ہے۔(مفہوم القرآن۔پرویز۔ص 1396)

❸ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی (قطورا) کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوئی' ان کے ایک بیٹے کا نام مدین تھا' حضرت اسماعیل علیہ السلام ارضِ حجاز میں متمکن ہوئے اور اسحٰق علیہ السلام فلسطین میں۔مدین' حجاز کے شمال میں' شام سے متصل علاقہ میں' سکونت پذیر ہوگیا اور اس کی نسل' تاریخ کے صفحات پر قوم مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ 2100 تا 2200 ق م) ہے۔اس لیے قوم مدین کے آغاز کا زمانہ 2000 ق م تصور کرنا چاہیے۔جو قافلہ حضرت یوسف علیہ السلام کو چاہِ کنعان سے بازارِ مصر لے گیا تھا۔وہ انہی مدیانیوں کا تھا۔یہ قوم اس علاقے میں بڑھی پھولی پھلی قریب چار سو سال تک یہی حالت رہی تا آنکہ ان میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔جب حضرت موسیٰ علیہ السلام (قبل از نبوت) مصر سے بھاگ کر نکلے ہیں تو مدین کی بستی کی طرف ہی آئے تھے۔قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے یہاں پہنچ کر سن بزرگ کے ہاں رہائش اختیار کر لی اور گلہ بانی کی خدمت سنبھالی۔انہوں نے اپنی بیٹی کا عقد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کر دیا۔قرآن نے یہ نہیں بتایا کہ یہ بزرگ کون تھے لیکن محققین کا خیال ہے کہ آپ حضرت شعیب علیہ السلام ہی تھے......اس اعتبار سے حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ایک ہی ہے یعنی 1600 یا 1700 ق م۔(پرویزؒ: جوئے نور' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور 1994' ص ص 279-80)

سے کہا تھا کہ تم مجھے اجازت دو‘ اس کی مخالفت تو نہیں کرو گے۔ میں اپنی صلوٰۃ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں‘ ہمیں کیا ہے‘ ہم اپنے طریقے پر کچھ پوجا پاٹ کر لیتے ہیں‘ تم اپنے طریقے پہ کر لو۔ اور جب انہوں نے صلوٰۃ کا نظام قائم کیا تو انہوں نے کہا کہ شعیب علیہ السلام! یہ کیا؟ ہم تو سمجھتے تھے کہ تم بھگتی‘ پرستش‘ اس قسم کی کوئی چیز‘ کرتے رہو۔ تمہاری صلوٰۃ تو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو اپنی مرضی کے مطابق صرف کر سکیں۔ یہ تمہاری کیا صلوٰۃ ہے؟ انہوں (شعیب علیہ السلام) نے کہا کہ خدا کی صلوٰۃ یہی ہے۔ تو یہ چیزیں تھیں جس میں کہا کہ **فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ** (76:24) تم اس خدا کے پروگرام پر نہایت استقامت سے گامزن رہو۔

عزیزانِ من! نمازیں پڑھنے کی اجازت تو ہمیں انڈیا میں‘ انگریز کے زمانے میں‘ بھی تھی۔ آج وہاں ہندو کی سیکولر حکومت میں بھی مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ اس میں کونسی استقامت کی ضرورت ہے‘ کونسی وہ تحویل احکام ہے کہ جس میں مخالفتیں اور مزاحمتیں سیلاب کی طرح امڈ کر آ جاتی ہیں اور وہ اجازت نہیں دیتیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔ صلوٰۃ یہ تھی کہ کسی انسان کو حکومت کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ تھی صلوٰۃ۔ اس کی اجازت کوئی حکومت نہیں دے سکتی:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

کہا کہ یہ فرق ہے۔

مخالفت کی اصل وجہ

یہ جو مخالفت کرنے والے ہیں ان کے لیے کہا کہ **اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَ يَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا** ❶ (76:27) یہ جو پیش پا افتادہ مفاد ہوتے ہیں‘ وہ جھپٹ کے‘ جلدی سے‘ حاصل ہو جاتے ہیں۔ فوراً روپیہ جمع کیا‘ اور اس کے بعد 10% لے لیا۔ ادھر سے کچھ مال سو روپے کا لائے‘ ہزار روپے میں بیچ دیا‘ کسٹم بچایا اور محصول چونگی بچا لیا۔ یہ عاجلہ ہے: سارا کچھ یونہی جلدی سے آدمی سمیٹ کر لے جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہے ان کے سامنے۔ اور وہ جو **يَوْمًا ثَقِيْلًا** (76:27) ہے وہ بہت گراں قدر انقلاب ہے۔ یہ اس کو پس پشت ڈال دیتے ہیں‘ اس کی طرف نہیں جاتے۔ انہیں اس پر بڑا ناز ہے کہ وہ بڑے صاحبِ قوت اور مضبوط لوگ ہیں لیکن یہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ **نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ وَ اِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا** ❷ (76:28)۔

---

❶ جو لوگ تیری مخالفت کر رہے ہیں‘ وہ اپنے اپنے پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصود و منتہیٰ ہی طبعی زندگی کے مفاد ہیں۔ اس لیے وہ ایسے عظیم الشان انقلاب کو نظر انداز کر رہے ہیں (جو حال اور مستقبل دونوں کی خوشگواریوں کا ضامن ہے۔)(75:20)

❷ ہم ہی نے انہیں پیدا کیا ہے اور اُن کے پیکروں کا یہ استحکام اور مضبوطی بھی ہماری ہی عطا کردہ ہے۔ لہٰذا اگر یہ ہمارے قوانین کی مخالفت کریں گے تو ہمارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں کہ ہم اپنے مشیت کے پروگرام کے مطابق ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے آئیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ ‘ص 1397)

عزیزانِ من! بات ذرا مشکل سی آ گئی۔ یہ جس قوت پہ اپنے جن پیکروں پہ اور اپنے جن اسباب پر اس قدر فخر اور ناز کرتے ہیں اور پھر ان مسائل کے بل بوتے پہ مخالفت کرتے ہیں یہ بھول گئے ہیں کہ ہم نے ہی ان کو پیدا کیا اور قوتوں کے یہ اسباب ہمارے ہی پیدا کیے ہوئے ہیں جن کو اگر ہم سلب کر لیں تو ان کے پاس تو رہ ہی کچھ نہیں سکتا۔

اگر یہ نظام نہ بدلا تو پھر چھٹی ہو جائے گی

عزیزانِ من! اس کے بعد کھل کر بتا دیا کہ **وَ اِذَا شِئۡنَا بَدَّلۡنَاۤ اَمۡثَالَهُمۡ تَبۡدِيۡلًا** (76:28) ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ ہم ان کی جگہ دوسری قوم لے آئیں۔ قرآن نے کئی مقامات پہ کہا ہے۔ یہ انہی سے نہیں کہا تھا جو کفارِ عرب تھے قرآن نے ہم سے بھی کہا ہوا ہے کہ ایمان کے مدعیو! مسلمان کہلانے والو! اگر تم نے یہ نظام قائم نہ کیا تو تمہاری جگہ دوسری قوم آ جائے گی جو پھر اس نظام کو قائم کرے گی۔ کہا کہ ہمیں اس پہ بھی اقتدار ہے کہ ہم دوسری قوم کو لے آئیں۔ **اِنَّ هٰذِهٖ تَذۡكِرَةٌ** (76:29) یہ ایک ایسی بات ہے جسے ہم بطور نصیحت تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں کہ اس سے سبق حاصل کرو عبرت حاصل کرو۔ **فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا** ❶ (76:29) پھر اس کے بعد جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے والے راستے پر چل نکلے **فَمَنۡ شَآءَ** (76:29) جس کا جی چاہے اور آگے وہ بات ہے جو میں کہہ رہا تھا۔ یہ دو تین مقام پہ آتا ہے کہ **وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ** ❷ (76:30)

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے سارے قرآن میں انسان ہی کی خصوصیت بتائی ہے کہ اس کو ہم نے اختیار کی آزادی دی ہے: دو راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنے کی آزادی دی ہے۔ اسی سے اس پہ ساری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ فمن شآء کے معنی یہ ہیں: جو چاہے۔ دوسری جگہ آیا ہے کہ **فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ** (18:29) جس کا جی چاہے اس کو تسلیم کرے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ یہ ہے سارے قرآن کی تعلیم۔ یہاں بھی یہی تھا کہ **فَمَنۡ شَآءَ** (76:29) جس کا جی چاہے۔ اس کے آگے جو آیت ہے اس کا جو ترجمہ کیا جاتا ہے اس سے تو قرآن کی ساری عمارت ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہا کہ **وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ** (76:30) جس کا جی چاہے جو چاہے صحیح راستہ اختیار کر لے مگر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یہ تو خود کچھ چاہ نہیں سکیں گے چاہ وہی سکیں گے جو خدا چاہے گا۔ چل بھئی! اور وہ سارے قرآن نے جو کہا ہے کہ ''جس کا جی چاہے یہ کرے'' ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ انہوں

---

❶ سو جس کا جی چاہے اس سے عبرت حاصل کر کے وہ راستہ اختیار کر لے جو اُسے خدا کے نظام ربوبیت کی طرف لے جائے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ ان سے کہہ دو کہ یہ اسی صورت میں ہو سکے گا کہ تم اپنے اختیار و ارادہ کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کر لو۔ (تم ویسا ہی چاہو جیسا قانونِ خداوندی کا منشاء ہے۔) (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ ص1397)

نے کہا کہ نہیں نہیں، وہ ہم کنٹرول کرتے ہیں کہ یہ کیا چاہے: غلط راستہ اختیار کرنا چاہیں گے تو وہ بھی ہم کراتے ہیں۔ آپ کو یاد ہے ان کے ہاں خدا کی ایک صفت معاذ اللہ **مُضِّل** بھی ہے یعنی گمراہ کرنے والا تو پھر انسان اپنے اختیار سے کچھ کر ہی نہیں کر سکتا' البتہ خدا تعالیٰ کا تو یہ کہنا ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ انسان کو چاہیے کہ یہ وہ کچھ چاہے جو ہم چاہتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر وہ آزادی کہاں رہی' وہ انتخاب کہاں رہا' اس کا تو سوال ہی نہ رہا۔ پھر ذمہ داریاں کاہے کی؟ اس کے بعد یہ ہے کہ پھر ہم تمہیں جہنم میں بھی بھیجیں گے۔ یہ **وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ** (76:30) ہے جبکہ عربی گرامر کے قاعدے کی رو سے اس کے معنی تو یہ ہیں اور پھر اچھے اچھے مفسرین نے بھی یہ معنی کیے ہیں کہ ''تمہیں چاہیے یہ کہ تم وہ چاہو جو خدا چاہتا ہے۔'' کیا الفاظ ہیں! پہلے کہا کہ تم میں سے جو چاہے' جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے' یہ تمہاری مرضی ہے لیکن ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ تم وہ چاہو' جو خدا چاہتا ہے کہ تم چاہو۔ بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔

عزیزانِ من! اس کے بعد آیا ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا** (76:30) اس لیے کہ خدا ہی ہے جس کو صحیح علم بھی ہے اور وہ حکمت بھی جانتا ہے۔ تو اس نے کہا ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ تم یہ صحیح راستہ اختیار کر لو' تو تم یہی چاہو۔ اس طرح **يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ** ❶ (76:31)۔ پھر ''من یشآء'' کا یہاں ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ خدا جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے' کر لیتا ہے تو پھر ہمارا اس میں کیا رکھا ہے۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ جو اس کی رحمت میں داخل ہونا چاہے وہ اسے اس رحمت میں داخل کر لیتا ہے لیکن اگر تم نے وہ کچھ نہ چاہا جو قانونِ خداوندی کا منشاء ہے تو **وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا** (76:31) یہ ظلم و سرکشی ہوگی۔ اس کے برعکس اگر جو کچھ خدا نے کہا تھا کہ تم یہ چاہو' تم تو اس کے سوا کچھ اور چاہ ہی نہیں سکتے' تم مجبور ہو' تو اگر وہی بات تھی تو پھر ظٰلمین کہاں سے آ گئے۔ حالانکہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ جو چاہتا ہے اس کی رحمت میں داخل ہونا وہ اسے وہاں داخل کر لیتا ہے اور جو ظالمین ہیں ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ظالم کے معنی تو پھر قرآن کی اصطلاح میں تاریکیاں ہیں۔ ظلم کے معنی ہوتے ہیں کہ جس چیز کو' جس شخص کو' جس مقام پہ ہونا چاہیے وہ وہاں' اس مقام پہ نہ ہو' کسی دوسرے کا مقام چھین کر وہ وہاں بیٹھ جائے۔ اس لیے اس آیت (76:31) میں کہا کہ یاد رکھو! جو لوگ ظلم و سرکشی کا شیوہ اختیار کر لیتے ہیں' ان کے لیے ہمارے قانونِ مکافات نے تباہیوں اور بربادیوں کا الم انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے تو اس طرح تو ظالمین کے لیے عذابِ الیم ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الدھر آج ختم ہو گئی۔ آئندہ درس میں سورۃ المرسلٰت آئے گی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

---

❶ تم ایسا چاہو گے تو خدا تمہیں اپنی رحمتوں کے سائے تلے لے آئے گا۔

اٹھائیسواں باب: سورة المرسلٰت (آیات 1 تا 19)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1984ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المرسلٰت سے ہو رہا ہے جو 29 ویں پارے کی آخری سورۃ ہے: (77:1)۔

کشمکشِ حق و باطل......تیسویں پارے کی اہمیت

سابقہ جمعہ (20 اپریل 1984)' چونکہ درس ایک خصوصی خطاب پر مشتمل تھا' اس لیے تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ قرآنِ کریم کے ان آخری دو پاروں میں بالخصوص اس مسلسل و متواتر چلی آنے والی کشمکشِ حق و باطل کا ذکر ہے جو قرآنِ حکیم نے یہاں ارتکاز کے طور پر' Summarise (تلخیص) کر کے' دے دیا ہے' Concentrated form (ارتکازی صورت) میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ اتنے طویل عرصے پر مشتمل ایک کشمکش کو' تزاحم کو' تخاصم کو' اور پھر حقائق کو' تھوڑی سی جگہ میں' بڑے دل نشیں انداز اور اعجاز سے' بیان کیا ہے۔ قرآن کی ان پاروں میں' بالخصوص تیسویں پارے میں' جو سورتیں ہیں' وہ دو دو الفاظ کی آیتیں ہیں اور ان دو الفاظ کے اندر تاریخی تفاصیل بھی آ گئی ہیں اور حقائق بھی آ گئے ہیں۔ ان الفاظ کے اندر بڑی جامعیت ہے جو ان پاروں کے اندر آئی ہے۔ انتیسواں پارہ تو اس سورۃ کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد آخری پارہ سامنے آئے گا۔

قرآن یہ بتا رہا ہے کہ یہ حق اور باطل کی کشمکش ہے۔ اس کے مختلف شعبے اور مختلف گوشے ہیں لیکن اس کائنات میں ساری کشمکش اور تزاحم دو ہی چیزوں کے اندر ہے۔ ایک کو وہ حق کہتا ہے' دوسرے کو وہ باطل کہتا ہے۔ قرآن کہتا یہ ہے کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) اس ساری کشمکش میں حق غالب آتا چلا جاتا ہے اور آخرالامر حق کو غالب آ جانا ہے۔ اسے وہ الدین بھی کہتا ہے' اسلام بھی کہتا ہے'

حق بھی کہتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کشمکش میں حق کو غالب آنا ہوتا ہے' یہ آتا چلا جاتا ہے۔ کلیۃً' آخرالامر' حق غالب آ کر رہے گا۔

حق کے غالب آنے کی دو صورتیں ہیں

عزیزانِ من! اس کشمکش میں حق کے غالب آنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انسانوں کی کوئی جماعت کھڑی ہو جائے' وہ حق کی علمبردار ہو' وہ اس کی تائید میں باطل کی قوتوں کا مقابلہ کرے تو پھر اس طرح سے حق چند دنوں میں غالب آ جاتا ہے' اس کی رفتار بڑی تیز ہو جاتی ہے' وہ انسانوں کے حساب و شمار کے مطابق' تاریخ کے اوراق کو مدون کرتا ہے۔ لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر یہ نہیں ہوتا کہ حق کہیں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے کہ کوئی انسانوں کی جماعت اٹھے گی تو پھر وہ اس کو غالب کرنے کی کوشش کرے گی۔ وہ ایک دوسرے طریقے سے آتا ہے' جسے زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔

کائناتی قوتوں کے تحت نتائج کا حصول صدیوں پر محیط ہوتا ہے

عزیزانِ من! حق کے غالب آنے کا ایک دوسرا طریقہ ہے۔ ایک چیز ہے جسے کائناتی قوتیں کہا جاتا ہے' عام فہم الفاظ میں اسے زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ ان تقاضوں کی رو سے بھی آہستہ آہستہ' رفتہ رفتہ' باطل مغلوب ہوتا جاتا ہے اور حق غالب آتا جاتا ہے لیکن اس میں بڑا لمبا عرصہ لگتا ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ خدا کے کلینڈر کے حساب و شمار سے ہوتا ہے' جس میں ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا بھی ہوتا ہے' پچاس پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے۔ جب زمانے کے تقاضوں سے' کائناتی قوتوں کی رو سے' یہ کشمکش برپا ہو اور اس میں حق نے غالب آنا ہو تو اس میں کسی ایک فیز (Phase) کے لیے' ایک گوشے کے لیے' اتنا لمبا عرصہ لگ جاتا ہے۔ تاریخ انسانیت کا مطالعہ اگر اس نقطۂ نگاہ سے کیا جائے' پہلے یہ دیکھا جائے کہ قرآن حق کس چیز کو کہتا ہے' پھر پوری انسانیت کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے' جہاں سے بھی وہ تاریخ ہماری دسترس میں ہے تو اس میں آپ دیکھیں گے کہ غیر محسوس طور پر عجیب عجیب قسم کی قوتیں آتی ہیں جن کی رو سے کشمکش ہوتی ہے اور اس کشمکش کے اندر اس حق کا پلڑا بھاری ہوتا ہے جسے قرآن نے حق قرار دیا ہے۔ یہ بڑا دلچسپ Subject (مضمون) بھی ہے' بڑا مشکل بھی ہے' دقت طلب بھی ہے' وقت بھی اس میں درکار ہوتا ہے اور تاریخ میں بڑی گہرائی میں جانا پڑتا ہے' ورنہ عام طور پر تو تاریخ میں یہی کہا جاتا ہے کہ مثلاً شہنشاہ اکبر (1542-1605) فلاں سال میں تخت پر بیٹھا' فلاں سال میں فلاں لڑائی ہوئی' فلاں سال میں مر گیا۔ اس کا نام تاریخ ہے لیکن قرآن کی رو سے اس کا نام تاریخ نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حق اور باطل میں جو کشمکش چلی آ رہی ہے' اس روئیداد کا نام تاریخ ہے اور پھر میں موضوع سے دوسری طرف چلا جاؤں گا ورنہ میں عرض کروں کہ تاریخ کے متعلق جو کچھ ہیگل (Hegel: 1770-1831) یا مارکس (Marx: 1818-83) نے کہا ہے' اس کی بڑی اہمیت بتائی ہے۔ ہیگل (1770-1831) نے تو تاریخ کو فلاسفی آف ہسٹری بتایا ہے جبکہ عام طور پہ یہ ہسٹری آف فلاسفی ہوتی ہے۔ یہ صرف ہیگل تھا جس نے فلاسفی آف ہسٹری لکھی ہے لیکن

میں نے عرض کیا ہے' یہ کسی دوسرے وقت پہ سہی' بات کہیں اور چلی جائے گی۔

حق و باطل کے سلسلہ میں تاریخی شواہد

عزیزانِ من! قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہ تاریخی شواہد تمہیں اس بات کی طرف لائیں گے' وہ اس بات کی شہادت بنتے جائیں گے کہ جسے اس نے حق کہا ہے' آہستہ آہستہ سہی' سست رفتاری سے سہی' خدا کے حساب وشمار سے سہی' لیکن کائنات کے اندر ہو یہی رہا ہے کہ حق رفتہ رفتہ غالب آتا جا رہا ہے۔ محسوس مثال سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ حق یہ تھا جو قرآن نے کہا اور آپ اسے حیران ہو کر سنیں گے کہ اس کا تعلق نہ مذہب سے ہے' نہ دین سے ہے۔ یہ تو ایک خالصتاً طبیعاتی چیز ہے لیکن قرآن جن امور کو حق قرار دیتا ہے اس کے لیے اس نے کہا کہ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (31:20) یہ کائناتی قوتیں جتنی بھی ہیں' انکو ہم نے تمہارے تابع تسخیر کر دیا ہے۔ یہ اس لیے کیا ہے کہ تم انہیں مسخر کرو۔ لہٰذا حق یہ ہے کہ انسان ان قوتوں کو مسخر کرے۔ باطل یہ ہے کہ انسان ان قوتوں کے تابع ہو جائے' ان سے مغلوب ہو جائے۔

اب آپ تاریخ انسانیت کو دیکھیے۔ ہمیں انسان کا ابتدائی دور وہ نظر آتا ہے جب وہ بڑی قوتیں تو ایک طرف رہیں' وہ تو فطرت کی ان چھوٹی چھوٹی قوتوں کے سامنے بھی ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے' سجدے کرتا ہے' ڈنڈوت بجا لاتا ہے' مغلوب ہوتا ہے' ڈرتا ہے' کانپتا ہے۔ بادل گرجتا ہے تو کانپتا ہے۔ بارش برستی ہے تو کانپتا ہے۔ بجلی کڑکتی ہے تو کانپتا ہے۔ ان کو دیوی دیوتا بناتا ہے۔ ان کے حضور نذرانہ پیش کرتا ہے' قربانیاں پیش کرتا ہے' بڑے بڑے پہاڑوں سے ڈرتا ہے' بڑے بڑے دریاؤں سے ڈرتا ہے۔ انسان یہاں سے شروع ہوا' اور اس کے بعد انسانیت کی تاریخ آپ کو یہ بتا رہی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ان قوتوں کو مغلوب کرتا چلا آیا اور آج چاند تک پہنچ گیا۔

یہ کیا ہے؟ مذہب نے کائناتی قوتوں کو مغلوب کرنے اور چاند تک پہنچنے کی بڑی مخالفت کی۔ اسے الحاد کہا' بے دینی کہا' سرسید (1817-1898) نے کہا کہ نیچر کی قوتوں کا مسخر کرنا اسلام کا تقاضا ہے' اسے نیچری کہا' کافر قرار دیا' مرتد قرار دیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ حق کی مخالفت کہاں سے ہوتی ہے۔ باطل کیا ہے؟ مذہب باطل ہے۔ حق کیا ہے؟ دین ہے اور دین یہ بھی ہے کہ کائنات کی قوتوں کو مسخر کرو۔ اگلی بات یہ کہی کہ فطرت کی ان تسخیر شدہ قوتوں کو انسانیت کی منفعت کے لیے صرف کیا جائے۔

حق کا پہلا گوشہ اور مذہب کی ہمیشہ مخالفت

عزیزانِ من! حق کا پہلا گوشہ یہ ہے کہ کائناتی قوتوں (Cosmic Forces) کو مسخر کیا جائے۔ قرآن نے یہ بات کہی تھی کہ یہ الحق ہے اس حق کو محسوس شکل میں سامنے آنے کے لیے پتہ نہیں کہ کتنی صدیاں اور تاریخ کے کتنے اوراق صرف ہوئے' ساری تاریخِ انسانیت اس کی شاہد ہے۔ تاریخ انسانیت اس پر بھی شاہد ہے کہ جہاں بھی یہ کشمکش ہوئی ہے' جس وقت بھی کسی سائنسدان نے یہ کہا کہ

زمین گول ہے، زمین حرکت کرتی ہے،[1] مذہب کی دنیا نے کہا کہ اسے پھانسی پہ لٹکا دو۔ دیکھتے ہیں حق اور باطل کی کشمکش کے معنی کیا ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی طرف سے یہ جتنی بھی مزاحمت ہوئی ہے حق غالب آتا چلا گیا ہے۔

مذہب نے ہمیشہ حق کی مخالفت کی ہے

پہلی دفعہ جب رشین (روسی) خلانورد چاند پہ گئے' تو آپ کے ہاں مذہب کی طرف سے اس کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ یہاں لاہور کے اندر وہ وعظ آپ کو یاد ہوں گے جو کیے جاتے تھے۔ ایسا ماننے والوں کو کافر قرار دیا جاتا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ مخالفتِ حق کہاں سے آ رہی ہے۔ یہ حق اور باطل کی کشمکش ہے۔ بالفاظ دیگر دین اور مذہب کی کشمکش ہے۔ باطل کا نمائندہ مذہب ہوتا ہے۔ حق کا نمائندہ دین ہوتا ہے' وہ دین جو تمام نظامہائے زندگی پر غالب آتا ہے: لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) تو اس کی مخالفت مذہب کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ کشمکش جو چلی آ رہی ہے: دین اور مذہب کی کشمکش' حق اور باطل کی کشمکش۔

دوسرا گوشہ حق کو مکمل کرنا ہے

عزیزانِ من! یہ چیز تو شاید پہلی دفعہ آج آپ کے سامنے آئی ہو لیکن درس میں' جو میں بیس سال سے یہاں دے رہا ہوں' کئی دفعہ آئی ہوگی کہ جو کائناتی قوتیں ہیں ان کو مسخر کرنا بھی دین ہے' حق ہے' اگرچہ اس کا جو اگلا گوشہ ہے' وہ دین کو مکمل کرتا ہے یعنی ان قوتوں کو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے صرف کرنے کا گوشہ۔ تو حق اور باطل کی یہ کشمکش چلی آ رہی تھی۔ یہی کشمکش پھر انسانوں کے اندر آتی ہے۔ انسانوں کی' افراد کی' مفاد پرستیاں اسے نوعِ انسانی کے لیے عام نہیں ہونے دیتیں' پھر ان میں باہمی ٹکراؤ ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک کشمکش ہے۔

صدرِ اوّل کی کشمکش کا نتیجہ

یہ وہ کشمکش ہے جو صدرِ اول میں نبی اکرم ﷺ والذین معہ رضی اللہ عنہم اور مخالفین میں تیئس سال تک برپا رہی لیکن ہر تقابل میں' ہر تزاحم میں' حق غالب آتا چلا گیا تا آنکہ آخر الامر اس دور میں حق غالب آ گیا یعنی دین کا نظام قائم ہو گیا۔ وہ اس طرح سے قائم ہوا کہ دائیں بائیں اس زمانے میں جتنے مذاہب تھے اور وہ سارے شکست کھا گئے۔ خود عرب کے اندر بھی مذاہب تھے' ایران کے اندر بھی تھے' روما کی وہ تمام بستیاں جو عرب کے ساتھ ملی ہوئی تھیں' مصر وغیرہ کے یہ جتنے علاقے ملے ہوئے تھے' وہاں کیا چیز تھی جو غالب آئی؟ یہ نہیں تھا کہ وہ پہلی مملکتوں کی جگہ ایک نئی مملکت قائم ہو گئی۔ اگر وہ مملکت بھی مذہب کی مملکت ہے تو پھر وہ باطل ہی کا غلبہ ہے۔ یہ بات نہیں تھی۔ وہاں

---

[1] کوپرنیکس (Copernicus: 1473-1543) نے بطلیموسی نظام (Ptolemiaic System) کی تردید کی اور کہا کہ زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے' اجرام فلکی (Heavenly Bodies) کا مرکز نہیں ہے۔ ان نکات کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ انبیاء' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور 2005' ص ص۔ 92-91 نیز فٹ نوٹ نمبر 4,3,1, اور 5 (ص۔ 91)۔

مذہب کی جگہ دین نے لے لی۔ یہ تھا غلبہ جو وہاں آیا تھا۔

کائناتی قوتوں کو قرآن نے ملائکہ بھی کہا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم ان آخری پاروں میں اس کشمکش کو سمٹا کر بیان کرتا ہے۔ اس کشمکش میں حق کو غالب کرنے کے لیے قرآنِ کریم میں ایسے الفاظ ہیں کہ آپ انہیں کائناتی قوتیں بھی کہہ سکتے ہیں' انہیں ملائکہ بھی کہا جاتا ہے' انہیں زمانے کے تقاضے بھی کہا جاتا ہے۔ اُن معنوں میں' جو قرآن نے استعمال کیا ہے' کہا جائے تو پھر ہیگل (1770-1831) یا مارکس (1818-1883) کے الفاظ میں انہیں Necessity of History بھی کہا جاتا ہے' اگرچہ ان کا مفہوم اس سے الگ ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ میں اس طرف نہیں جا رہا لیکن وہ بھی یہ مان رہے ہیں کہ یہ کچھ زمانے کے تقاضے کرتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں انسانوں کی کشمکش اور زمانے کے تقاضوں کے اعتبار سے حق و باطل کی کشمکش دونوں ہی سامنے آتی ہیں۔ قرآنِ حکیم نے کہا کہ ❶ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا❷ (77:1)۔

عزیزانِ من! یہ جو قرآن میں "وَ" آتا ہے' ہمارے ہاں ترجموں میں اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے: "قسم ہے ان چیزوں کی۔" قسم میں تو پھر یہاں تک ہے کہ وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ o وَ طُوْرِ سِیْنِیْنَ (95:1-2) قسم ہے تین کی' زیتون کی' انجیر کی۔ وہاں ان کی بھی قسمیں ہیں۔ عربی زبان میں یہ لفظ قسم کے لیے نہیں ہوتا۔ اس کے معنی ہوتے ہیں: "شہادت دیتی ہیں' یہ چیزیں اس بات کی۔ اس بات کی شاہد ہیں' اس کی گواہ ہیں جو آگے کہی جائے گی۔ جو بات ہم آگے بطور اصول بیان کر رہے ہیں' یہ اس کی شہادت دیتی ہے' اور وہ اصول یہ ہے۔ جو حقیقت بیان کی جائے گی یہ بات اس کی شاہد ہے"۔ یہاں جس بات کی شہادت دی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ❸ (77:7)۔ یہاں قرآن نے یہ بات کہی ہے کہ جو تم سے کہا جاتا ہے کہ باطل سرنگوں ہوگا' مغلوب ہوگا' یہ بات ہو کر رہے گی' یہ چیزیں جو پہلے بیان کی گئی ہیں' اس کی شہادت دیتی ہیں۔ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا (77:1) اس کی شہادت دیتے ہیں۔ مرسلٰت ہیں' جو خدا کی طرف سے بھیجے گئے' خدا کے پیغمبر ہوں تو ان کو بھی مرسلین کہا جائے گا' ان کے اتباع میں جماعتیں ہوں' جو حق کا علم لے کر اٹھی ہیں' وہ بھی جنہیں ملائکہ کہا گیا ہے یعنی فطرت کی قوتیں کہا گیا ہے' زمانے کے تقاضے کہا گیا ہے' تاریخ کی Necessities (وجوب) کہا گیا ہے' اس کے معنی وہ بھی ہونگے۔ اس کشمکش میں یہ جتنی چیزیں' خدا کے پروگرام کے مطابق آئی ہیں' اس کے لیے یہ لفظ آئے گا۔ ایک خاص مقصد کے لیے مرسلت بھیجے گئے۔

---

❶ "وَ": یہ چیزیں اس حقیقت پر شاہد ہیں:

❷ وہ کائناتی قوتیں جنہیں پیہم اور متواتر بھیجا تھا تاکہ وہ............

❸ جس انقلاب کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ واقع ہو کر رہے گا۔ (۱-۲-۳، مفہوم القرآن۔ پرویز)

لفظ عرفاً کا مفہوم

عزیزانِ من! اس آیت یعنی (77:1) میں تیسرا حرف عرفاً آیا ہے۔ یہ لفظ عجیب چیز ہے۔اسی سے عرف' معرفت' عرفان کے الفاظ بنتے ہیں۔اس کے معنی تو ''پہچانا'' ہوتا ہے لیکن جیسا میں بار بار کہتا ہوں' ہر دفعہ جب یہ لفظ آتے ہیں' تو میں جھوم کر یہ بات بیان کرتا ہوں کہ یہ عجیب قوم تھی' انہوں نے عجیب طرح سے اپنی زبان وضع کی تھی۔ان کے ہاں تو صحرائی زندگی تھی' بدوی زندگی تھی' ایک قبیلے کے دس افراد یہاں ہیں۔ پتہ نہیں دوسرا قبیلہ کہاں ہے۔ زندگی میں ایک آدھ مرتبہ اُس کا آدمی اِدھر آیا' اُدھر کا آدمی اِدھر چلا گیا۔ وہ اچھی طرح سے پہچانا نہیں جاتا تھا۔ پہچانا وہ جاتا تھا جو بار بار آئے۔اس قوم کی زبان عجیب چیز تھی یہ جو''عرفاً'' ہے' یہ اس چیز کو کہتے ہیں جو ''متواتر آتا رہے۔'' جو متواتر آتا تھا' وہ پہچانا جاتا تھا۔اس لیے اس کے معنی ہو گئے: پہچانا جانے والا۔کیا بات تھی اس قوم کی! یہاں کہا کہ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا (77:1)۔عزیزانِ من! اب دونوں معنی میں (یعنی پہچانا جانے والا یا جو متواتر آتا رہے) میں جو معنی موزوں نظر آئیں آپ وہ لے لیجیے۔''جو متواتر بھیجے گئے'' یہ زیادہ موزوں نظر آتا ہے یعنی علی التواتر بھیجے گئے' اس کے اندر انقطاع نہیں ہوا۔جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ وہ مرسلین ہوں' خدا کے پیغامبر ہوں' ملائکہ کی قوتیں ہوں' وہ جماعتیں ہوں جو حق کے علمبردار بن کر آتی رہیں' متواتر آتی رہیں جو معنی موزوں سمجھیں لے لیں۔ یہاں کہا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش کا یہ سلسلہ متواتر چلا آ رہا ہے' اس لیے خدا کی طرف سے بھی حق کی علمبردار قوتیں متواتر آتی رہی ہیں۔اور اگر عرفاً کے معنی پہچاننے کے ہیں تو پھر یہ ہے کہ قرآن نے جو ان کی پہچان بتائی ہے' اس کی رو سے یہ پہچانی بھی جاسکتی ہیں۔جب آپ حق کو متعین کریں گے' تاریخ میں کسی بھی قوت کو متعین کریں گے جو اس حق کی علمبردار یا تائید میں کھڑی ہوگی' وہ معروف ہو جائے گی۔ ہمارے ہاں مرسل کی حیثیت سے' خدا کے پروگرام کو کامیاب بنانے والے پیامبر ہوں' مجاہد ہوں' کائناتی قوتیں ہوں' انکو پہچانا جاسکتا ہے اور وہ بالتواتر آئیں گی۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی قوتیں ہیں' جو متواتر آتی رہیں' جنہیں تم پہچان سکتے ہو۔پہلی بات تو یہ ہے۔ یہ اس بات کی گواہی دیں گی جو آخر میں بات آئے گی۔سوال یہ ہے کہ یہ قوتیں آ کر کیا کرتی تھیں۔اُن کے لیے کہا کہ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا [1] (77:2)۔ان قوتوں نے' عزیزانِ من! حق اور باطل کی کشمکش میں باطل کو مغلوب کرنا ہے اور حق کو غالب کرنا ہے۔اس کے لیے ہمارے ہاں تو یہی الفاظ ہیں۔

---

[1] اِن نظریات' تصورات اور نظامہائے زندگی کو' جن میں بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی صلاحیت نہ ہو' خس و خاشاک کی طرح اڑا کر' زرمگاہِ حیات سے' دور پھینک دیں' اور یوں دانے کو بھوسے (حق کو باطل) سے الگ کر دیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ ، ص1398)

حق کو باطل سے الگ کرنے کا طریق

قرآنِ کریم نے اور پھر زبانِ عربی نے اس کو ایک بڑے ہی سحر انگیز اور حقیقت کشا الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حق اور باطل آپس میں اس طرح ملے ہوئے ہوتے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے۔ باطل حق کو اپنے اندر لپیٹ لیتا ہے اور وہ جس شکل میں سامنے آتا ہے وہ باطل ہی کی شکل ہوتی ہے' لوگ اسی کو حق سمجھنے لگ جاتے ہیں حالانکہ اس نے حق کو اپنے اندر چھپا رکھا ہوتا ہے۔ یہ جو کچھ میں نے کہا ہے' ابھی آپ کے ذہن میں نہیں آئے گا۔ یہ اس لفظ سے آئے گا جو عرب بولتے تھے اور جو قرآن کریم نے استعمال کیا ہے۔ ہم شہر والے شاید اس کو جانتے بھی نہ ہوں۔ آپ کو پتہ ہے کہ خوشوں میں دانے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ہم نے گیہوں کا دانہ بھی کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ ہم نے تو کبھی خالص آٹا بھی نہیں دیکھا۔ وہ جو کچھ تھیلے میں ملتا ہے اسے ہی زہر مار کر لیتے ہیں۔ بہر حال' خوشوں میں دانے ہوتے ہیں۔ گندم کے' اجناس کے ان دانوں کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے۔ وہ چھلکا اس دانے کو اس طرح سے لپٹا لیتا ہے کہ دانہ نظر ہی نہیں آتا' وہ چھلکا ہی نظر آتا ہے' اسی کو فصل سمجھا جاتا ہے۔ اب کرنا یہ ہوتا ہے کہ وہ دانہ اس چھلکے سے الگ ہو جائے۔ اب اگر کسی طرح سے اس کو کوٹ دیا جائے تو چھلکا اور اس کے اندر جو دانہ ہوتا ہے وہ تو سارا اکٹھا پس گیا' وہ تو حق اور باطل کی آمیزش ہوگئی۔ اب کیا کیا جائے؟ پتہ ہے یہ کاشتکار کرتے کیا ہیں؟ ہمیں کیسے پتہ ہو؟ فصل پک جاتی ہے' اُسے کاٹتے ہیں' پھر اس کا ایک پراسیس (عمل) ہوتا ہے۔ اسے گاہنا کہتے ہیں۔ اس کو زمین پر بچھا دیتے ہیں۔ دن بھر یا تو اس کے اوپر اسی طرح سے ویسے ہی بیل چلاتے رہتے ہیں یا وہ ایک کانٹے دار جالیوں کا (پھلا) سا بناتے ہیں' اس کو اس کے اوپر پھیرتے ہیں' یہ جو گاہنا ہے' یاد رکھیے! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ''درس'' کے معنی گاہنا ہوتے ہیں' وہ اس کو گاہتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ چھلکے کو اس طرح سے دانے سے الگ کرتے ہیں کہ دانے کو کوئی گزند نہیں پہنچتی' چھلکا الگ ہو جاتا ہے۔ کیا بات ہے! یہ حق اور باطل کو الگ کرنے کا پراسیس ہے۔ اس سے دانہ ثابت کا ثابت رہتا ہے' اور وہ جو چھلکا ہوتا ہے' وہ بھوسہ بن جاتا ہے۔ یہ ہے صحیح پراسیس حق کو غالب کرنے کا۔ قوت کے زور سے نہیں' اس سے دانہ اور چھلکا دونوں اکٹھے پس جائیں گے۔ دانہ اپنی اصل شکل میں باقی رہے گا اگر اس چھلکے کو اس سے الگ کر دیا جائے اور چھلکا بھوسہ بن جائے۔ عربوں کی زبان کا اور قرآن کا انتخابِ الفاظ ہے کہ یہاں کہا کہ **فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا** (77:2) یہ مسلسل آنے والی قوتیں کرتی کیا ہیں؟ دانے کو بھوسے سے الگ کر دیتی ہیں۔ یہ مرحلہ بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ یہ آپ کو زمیندار یا کاشتکار ہی بتا سکتا ہے۔ مئی جون کی کڑکتی ہوئی دھوپ میں وہ گاہنے کا کام کرتا ہے۔ میں ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہوں۔ اب تو وہ کڑکتی ہوئی دھوپ بھی نہیں ہوتی۔ اس میں صبح سے شام تک بیلوں کو چلاتے ہیں۔ بیل ہل چلانے سے اتنا نہیں تھکتا' جتنا گاہنے سے تھکتا ہے' پھر اس کے ساتھ یہ زمیندار' کاشتکار' سارا دن اس دھوپ کے اندر اس کے اوپر پھر رہا ہے بظاہر کچھ نہیں ہو رہا' فی الحقیقت یہ ایک پراسیس ہے۔ یہ جو جماعتِ مومنین' نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ **فَاصْبِرْ**

Be Steadfast:(76:24)' استقامت دکھاؤ' اس میں جلدی نہ کرنا' جلدی کرنے سے دانے ٹوٹ جائیں گے' اس کے اوپر آہستہ آہستہ چلو' مسلسل چلتے جاؤ۔ یہ پراسیس ہے حق کو باطل سے' دین کو مذہب سے الگ کرنے کا۔

مذہب میں اصلاح کرنے سے دین نہیں آتا

عزیزانِ من! یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مذہب کا اتنا غلبہ ہے' جو دین کی بات ہے وہ کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلا پراسیس عمل میں نہیں ہے۔ اس میں مذہب اور دین دونوں الگ الگ نہیں ہیں۔ انہیں الگ کر کے دکھانا ہے مگر یہ پراسیس موجود نہیں ہوتا۔ لہٰذا مذہب کی طرف سے جو کوئی بدظن بھی ہوتے ہیں یا اس کی طرف سے کچھ مایوس ہوتے ہیں' ان کا بھی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اسلام میں کہیں کسی پرزے میں کچھ تھوڑا بہت نقص پیدا ہو گیا ہے۔ ان پرزوں کو گھس کے' پٹ کے' کسی طرح سے ٹھیک کر دیا جائے تو پھر یہ نظام ٹھیک ہو جائے گا۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ پورے کا پورا نظام' جسے مذہب کہتے ہیں' دین کے نظام کی ضد ہے۔ اس کے کچھ کل پرزے خراب نہیں ہو گئے۔ قرآن کی رو سے یہ اچھی طرح سن رکھیے' عزیزانِ من! یہ بات کام آ جائے گی کہ مذہب میں اصلاح کرنے سے دین نہیں آتا' دین مذہب کی جگہ آتا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ (17:81) حق وصداقت کے نظام میں باطل کی تخریبی قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

عزیزانِ من! آپ نے اس فقرے پر غور فرما لیا: مذہب کی اصلاح سے دین کا نظام قائم نہیں ہو سکتا بلکہ مذہب کے نظام کی جگہ دین کا نظام آتا ہے' پھر اس کا کوئی اثر باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے یہ کہا ہے کہ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ [1] (17:81)۔ قرآن کہتا ہے کہ مفاہمت و مصالحت تو ایک طرف رہی اس پورے کے پورے نظام کی جگہ یہ دوسرا نظام لیتا ہے۔ یہ ہے جو کچھ وہ مرسلٰت کرتے ہیں۔ وہ پہلے جو کچھ ہے اس کو الگ کر کے دکھاتے ہیں۔ اسے فکری انقلاب کہا جاتا ہے۔ قرآن اسے نفسیاتی انقلاب کہتا ہے۔ پہلا انقلاب یہ ہے کہ آپ کو دانہ اور بھوسہ الگ الگ ہو کر نظر آ جائے۔ آپ کو پتہ چلے کہ یہ دین ہے اور یہ مذہب ہے' پھر وہ بات سمجھ میں آئے گی کہ مذہب کی اصلاح سے دین قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کی جگہ دین کا نظام قائم ہوتا ہے۔

روشنی ہوگی تو اندھیرا نہیں رہے گا

عزیزانِ من! مذہب کی اصلاح سے دین قائم نہیں ہو سکتا' اس کی جگہ دین کا نظام قائم کرنا ہوتا ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ ہمارے ہاں دین اور مذہب کا یہ فرق' یہ امتیاز ذہن میں نہیں ہوتا۔ ساری کوششیں بس مذہب کی اصلاح کرنے کی ہوتی ہیں۔ جو کوشش کرنے میں

---

[1] نظامِ حق وصداقت کا دور آ گیا اور باطل کی تخریبی قوتوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ۔ ص 648)

مخلص بھی ہوتے ہیں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ مذہب کے نظام میں کچھ خرابیاں سی پیدا ہوگئی ہیں۔ان کی اصلاح کر دی جائے تو پھر وہ صحیح اسلام ہوجاتا ہے۔بالکل نہیں ہوتا۔یہ دو ایک دوسرے کی متضاد چیزیں ہیں۔روشنی آتی ہے تو اندھیرے کا ذرا سا شمہ بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اندھیرے کی جگہ روشنی آئے گی۔اندھیرے کی اصلاح کرنے سے روشنی نہیں آئے گی: یا تاریکی ہوگی یا روشنی ہوگی۔اسی طرح یا مذہب ہوگا یا دین ہوگا اور یا حق ہوگا یا باطل ہوگا۔ان کا پہلا پراسیس یہ ہے کہ **فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا** (77:2) وہ دانے اور بھوسے کو الگ کر کے دکھا دیتے ہیں۔

عزیزانِ من! آپ غور فرما رہے ہیں کہ آخری پاروں کی آخری سورتوں میں' ایک ایک لفظ کے اندر' حقائق کا کتنا ارتکاز ہے' کتنی بڑی حقیقت ہے جو قرآن بیان کر رہا ہے اور قرآن کے حقائق کے لیے یہ عربی زبان ہی اس کی متحمل ہوسکتی ہے۔کہا کہ **فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا** (77:2) جو بھوسہ ہے وہ باطل تھا اس لیے **حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (2:217) بیکار گیا' رائیگاں گیا۔اور وہ جو اس کے اندر شے تھی جو زندگی بنی تھی جس نے زندگی کا ذریعہ بنانا تھا **وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا** پھر وہ اسے پھیلاتے ہیں۔دانے اور بھوسے کو' اکٹھے ملے ہوئے کو' نہیں پھیلاتے بلکہ وہ حق کو باطل سے الگ کر کے پھیلاتے ہیں' بھوسہ تو باطل ہے۔اس لیے **حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (2:217) وہ سب کچھ رائیگاں گیا جو انہوں نے کیا۔شاید وہ بھوسہ مویشیوں کو' ڈھور ڈنگر کو' ڈالنے کے تو کام آتا ہے' انسانی نشوونما کے کام نہیں آسکتا۔پھر وہ جو زندگی بخش شے ہوتی ہے' جس پر انسانی پرورش کا دارومدار ہوتا ہے' اسے لے کر پھر وہ اپنی جگہ جمع نہیں کر رکھتے۔اب یہ نظامِ سرمایہ داری کے خلاف ہوگیا۔ان کو اس میں جو زندگی بخش چیزیں ملتی ہیں **وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا** [1] (77:3) وہ ان کو پھیلاتے ہیں۔اب آپ کے سامنے یہ دو نظام آگئے۔ایک معاشی نظام ہے۔اس کے لیے کہا کہ **جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ** (104:2) دولت اکٹھی کرتا ہے اور پھر گنتا ہے کہ اب کتنا روپیہ جمع ہوگیا اور اب کتنا۔ ننانوے کے پھیر میں پڑ جاتا ہے۔ایک یہ نظام ہے جس میں جمع کرتا ہے' پھر گنتا رہتا ہے یعنی **جَمَعَ فَاَوْعٰی** (70:18) جمع کرتا ہے' پھر وہ اپنی تھیلی کو اوپر سے باندھتا ہے کہ ایک پائی بھی اس میں سے نکلنے نہ پائے۔ایک نظام یہ ہے۔ دوسرا نظام یہ ہے کہ وہ سارا جمع کرتا ہے پھر **وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا** (77:3) اس کو ساری دنیا کے لیے پھیلاتا ہے۔اس طرح یہ دو نظام ہیں۔ اِن میں حق و باطل کی کشمکش جاری و ساری ہے۔یعنی ایک نظام یہ ہے کہ وہ سب کچھ سمیٹتا چلا جاتا ہے' اپنی ذات کے لیے جمع کرتا چلا جاتا ہے' اس پر گرہ لگا کر' اس کے اوپر ڈھکنے لگا کر' اس کو تجوریوں کے اندر رکھ کر' اس کو تالوں کے اندر بند کر کے' بینکوں کے اندر اپنے پرسنل اکاونٹ کھول کر' یہ سارا کچھ اپنی ذات کے لیے کرتا چلا جاتا ہے اور دوسرا وہ جو دوسروں کی منفعت کے لیے کھلا رکھتا ہے۔

---

[1] اور جس زمین (نظامِ زندگی) میں نشوونما کی صلاحیت ہے اس میں سرسبزی و شادابی کا سامان پیدا کر کے اُسے دور دور تک پھیلا دیں' [کیونکہ دنیا میں وہی نظام باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہو (13:17)۔] (مفہوم القرآن۔پرویز۔ص 1398)

باطل کے بالمقابل قرآنی نظام کا روشن پہلو

عزیزانِ من! اس طرح پہلے کے سمیٹنے والے نظام کے خلاف دوسرا نظام یہ ہے کہ زمین میں باقی وہ عمل رہتا ہے' وہ نظام رہتا ہے' جو **مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ** (13:17) ہو یعنی پوری نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے ہو۔ اب آگے پوری نوعِ انسانی کی بات آئے گی۔ جس دور میں آج ہم ہیں' اس میں فطرت کی قوتوں کو مسخر بھی کیا گیا ہے' باطل کی چیزوں کو الگ بھی کیا گیا ہے' لیکن یہ کچھ کرنے کے بعد کیا کیا گیا؟ نظامِ سرمایہ داری فرد کے اوپر ہی نہیں آتا کہ ایک فرد نے اپنی ذات کے لیے سمیٹ لیا' اس کے بعد آگے بھی ہے کہ ایک قوم نے اپنی ہی ذات کے لیے سمیٹ لیا اور دوسری قوموں کو اس سے محروم کر دیا۔ یہ باطل ہے۔ حق تو یہ ہے جو نظام **مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ** (13:17) ہوتا ہے' جس میں یہ سامانِ نشو ونما تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے وہ نظام **يَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ** [1] (13:17) ہوتا ہے۔ یعنی وہی روئے زمین پہ باقی رہتا ہے۔ قرآن کا یہ فرمان یاد رکھیے! یہ **وَالنّٰشِرٰتِ نَشۡرًا** [2] (77:3) ہے اور اس طرح سے **فَالۡفٰرِقٰتِ فَرۡقًا** (77:4) ہر قسم کے نظام کے اندر تفریق کرتے چلے جاتے ہیں: دانے اور بھوسے کے اندر' اجتماعی نظام اور انفرادی نظام کے اندر' قرآن کے معاشی نظام اور باطل کے نظام کے اندر خواہ وہ باطل کا نظام سرمایہ داری ہو' سوشلزم ہو' کمیونزم ہو۔ یہ سارے باطل کے نظام ہیں۔ یہ دونوں میں فرق کرتے چلے جاتے ہیں۔

تاریخ کے نوشتے بطور شہادت

اب سوال یہ ہے کہ اس فرق کرنے کے بعد قرآن اس کی تائید میں کس چیز کو پیش کرتا ہے؟ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے کہ یہ جو باطل کا نظام ہے' یہ پنپ نہیں سکتا' یہ کامیاب نہیں ہو سکتا' یہ باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ حق کا نظام' جسے میں پیش کر رہا ہوں' خدا کی تائید کے ساتھ پیش کر رہا ہوں' یہی باقی رہے گا۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس دعوے کی شہادت کیا ہے؟ اس کے جواب میں کہا کہ **فَالۡمُلۡقِيٰتِ ذِكۡرًا** (77:5) تاریخ کے نوشتے بطور شہادت پیش کرتا ہے۔

قرآنِ کریم نے حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر نبی اکرم ﷺ تک جو مرسلین تھے ان کی داستانیں پیش کی ہیں۔ وہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ اس نے نصاب میں یہ ہسٹری کی بک (کتاب) رکھی ہوئی ہے' لڑکے نے امتحان دینا ہے' وہ تو ہسٹری کو بطور ایک فلسفے کے پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ فلاں قوم نے باطل کا نظام اپنے ہاں رائج کیا تو تباہ ہو گئی' فلاں قوم نے حق کے نظام کو اپنے ہاں قائم کیا تو

---

1. اَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ (13:17) جو کچھ نوعِ انسان کے لیے نفع بخش ہوتا ہے۔ وہ باقی رہ جاتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)
2. جس زمین (نظامِ زندگی) میں نشو ونما کی صلاحیت ہے اس میں سرسبزی و شادابی کا سامان پیدا کر کے اسے دور دور تک پھیلا دیں۔ [کیونکہ دنیا میں وہی نظام باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہو (13:17)۔] (مفہوم القرآن۔ پرویز۔ ص 1398)

اُسے زندگی کی آسائشیں، نعمتیں، قوت اور سلطنت یہاں بھی حاصل ہوگئی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی خوشگواریاں اس کے حصے میں آئیں گی۔ تاریخ یہ بتاتی ہے۔

قرآنِ کریم نے اس نقطۂ نگاہ سے تاریخ کو اپنے دفتین میں محفوظ کیا ہے، وہ انبیاءِ کرام کی داستانیں اور ان کی قوموں کی سرگزشت یہ ثابت کرنے کے لیے بیان کرتا ہے کہ کس قسم کا نظام، کس قسم کا نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ یہ جو آنے والے اس پراسیس (عمل) کو لے کر آتے ہیں، اس دعوے کو لے کر اٹھتے ہیں، وہ اس کی تائید میں ان تاریخی نوشتوں کو پیش کرتے ہیں اور یہیں سے وہ بات آتی ہے جو میں نے کئی دفعہ دہرائی ہے کہ قرآنِ کریم نے انہی قوموں کا ذکر کیا ہے جو ان عربوں کے گردوپیش بستی تھیں۔ تو اس سے مطلب ہی یہ تھا، کہ وہ عرب ان قوموں کو، ان کی تاریخ کو، ان واقعات کو، جانتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم تو صبح شام ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات میں پھرتے رہتے ہو، تم ان کی روز باتیں کرتے رہتے ہو، فرق یہ ہے کہ تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ اتنی بڑی شان وشوکت کی مالک قوم کیوں تباہ ہوئی؟ یہاں پہنچ کر تم یہی کہتے ہو کہ تباہ ہوگئی اور ہم یہ بتاتے ہیں کہ وہ تباہ کیوں ہوئی؟ اگر تم یہ ''کیوں'' سمجھ لو تو تم اپنے اندر بھی اصلاح کر لو کہ تم وہ کچھ نہ کرو جس کی وجہ سے وہ قومیں تباہ ہوگئی۔ اس کے برعکس چلو گے تو تم بھی شاداں وفرحاں زندگی بسر کرو گے۔ یہ تھی تاریخ اور یہ تھے اس کے نوشتے جو قرآن نے بیان کیے۔

عزیزانِ من! یہاں فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا (77:5) ❶ کہا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ یہ سب کچھ کاہے کے لیے کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنی مخاطب قوموں سے کہتے ہیں کہ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا (77:6) ❷۔ سن رکھو! ہم نے تمہیں بتا دیا کہ ہلاکت کس طرح ہوتی ہے، زندگی کیسے ملتی ہے۔ اب اس کے بعد جس کا جی چاہے، مٹ جائے، اپنے آپ کو مٹا دے۔ جس کا جی چاہے، اپنی ہلاکت کے سامان سے آگاہ ہو جائے، اس سے محفوظ ہو جائے۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآنِ کریم کے دو دو لفظ کتنی بڑی تفصیلات اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں اور قرآن انہیں بیان کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور پھر کہا کہ یہ سارا کچھ جو ہم بیان کرتے ہیں، یہ اس چیز کی شہادت دیتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ (77:7) جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اپنے غلط نظام کو نہ چھوڑا تو تباہ وبرباد ہو جاؤ گے۔ جو کچھ کہا جا رہا ہے یہ ہو کر رہے گا۔ یہ چیزیں جو پہلے بیان کی گئیں اس کی شہادت دیتی ہیں۔

---

❶ وہ ان ٹھوس حقائق کو تاریخی شواہد کی حیثیت سے پیش کرتی چلی جائیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ کائنات میں منفی اور مثبت قوتوں کی کارفرمائی کو دیکھ کر، اور یوں اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد، جو مٹنا چاہے وہ مٹ جائے، اور جو خطرات سے آگاہ ہو، ان سے بچنا چاہے بچ جائے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز، ص 99-1398)

سب سے پہلے مذہب اور دین کے فرق کو متعین کرنا ہوگا

عزیزانِ من! قرآن سمجھنے کا اور تاریخ سے اس کی تائید حاصل کرنے کا طریقہ قرآن نے خود بتایا ہے۔ اسے اس نقطۂ نگاہ سے سمجھو۔ میں پھر عرض کرونگا کہ پہلے قرآن سے متعین کرو کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ متعین کرو کہ دین کیا ہے اور مذہب کیا ہے؟ پھر اس کے بعد قرآن میں جن اقوام کا ذکر آیا ہے' جن انبیاء کرام کا ذکر آیا ہے' جو صلوٰۃ کا ذکر آیا ہے' ان کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے' اس نگاہ سے اس کا مطالعہ کرو۔ قرآن بتائے گا کہ غلط نظام کونسا تھا جو انہوں نے اختیار کیا' اس کا نتیجہ کیا نکلا' حق پر مبنی نظام کیا تھا۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ دانہ کیا تھا' بھوسہ کیا تھا۔ اس طرح قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقائق سامنے آ جاتے ہیں۔ وہ اس امر کی شہادت بنتے ہیں کہ جس نظام کو ہم نے اپنے ہاں قائم کر رکھا ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔

ایسی بات نہیں ہے کہ خدا جس قوم کو جی چاہے تباہ کر دیتا ہے' رات کو اچھے بھلے سوئے' صبح اٹھے تو تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ قوموں کا نظام بہت لمبے عرصے سے اپنے نتائج مرتب کرتا چلا آ رہا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ان کے پلڑے میں تخریبی پرچیاں پڑتی چلی جاتی ہیں' کچھ اچھے کام بھی وہ کرتے ہیں۔ کہا کہ ہم اس کو بھی شمار میں رکھتے ہیں۔ ہم عادل واقع ہوئے ہیں۔ جب تک صورت یہ رہتی ہے کہ ان کا تخریب کا پلڑا بالکل نہیں جھک جاتا' وہ قومیں زندہ رہتی ہیں' چلتی رہتی ہیں۔ یہ مرسلٰت [1] ان سے کہتے رہتے ہیں کہ اپنا تخریب کا پلڑا دیکھیے' جھکتا چلا جا رہا ہے۔ جس دن وہ جھک گیا اور یہ تعمیر کا پلڑا اٹھ گیا تو اس دن تمہاری تباہی آ جائے گی۔ یہ واقع ہوتا رہتا ہے اور یہ اسی چیز کا کہا ہے کہ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ [2] (77:7)۔ جب یہ واقع ہوگا تو پھر اس وقت کیا ہوگا۔ کیا بات ہے ''اِس کیا ہوگا'' کی! کہا کہ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ [3] (77:8)۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں جو قدامت پرستی میں قرآن کے ترجمے یا تفسیریں آ رہی ہیں' ان میں ان چیزوں کے جو لغوی معنی' ظاہری معنی ہوتے ہیں' انہی سے یہ سب کچھ لیا گیا ہے جبکہ ان الفاظ کے خود عربی زبان میں مجازی معنی موجود ہیں۔ اس کے لیے یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنی طرف سے جی چاہے' کوئی معنی متعین کر لے۔ بالکل نہیں' کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ کتاب لسان عربی مبین میں آئی ہے۔ جو مفہوم وہ لے رہا ہے اس کے لیے انہیں عربی مبین کی اتھارٹی (سند) دینا ہوگی۔

---

[1] خدا کی طرف سے بھیجے گئے' خدا کے پیغمبر' رسول' نبی' ان کا اتباع کرنے والی جماعتیں' ملائکہ' فطرت کی قوتیں' زمانے کے تقاضے۔

[2] جس انقلاب کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ واقع ہو کر رہے گا۔

[3] اُن مخالفین کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی قوت ماند پڑ جائے گی۔ (۱۔۲۔۳ مفہوم القرآن۔ پرویز)

قرآن کے بیان کردہ حقائق کو مجازی معنی میں بھی دیکھنا ہوگا

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر، بلکہ بکثرت مقامات پر، اور آخری پاروں میں تو پھر بہت کثرت سے، یہ چیز آئی ہے کہ زمین شق ہوجائے گی، ستارے ماند پڑ جائیں گے، چاند اور سورج کو گرہن لگ جائے گا، آسمان پھٹ پڑے گا۔ یہ تمام چیزیں آپ سے کہی جا رہی ہیں۔ ہمارے ہاں اس تمام گزشتہ دور میں، تیرہ سو سال میں، یا ہزار سال میں، یوں کہیے ان سے یہی معنی لیے گئے ہیں کہ جب قیامت آئے گی تو اس وقت یہ کچھ ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ جو کچھ طبعی کائنات خدا نے پیدا کی ہے تو یہ خدا کی طرح ابدی نہیں ہے کہ اس کو آخر میں زوال ہی نہیں آنا، اس نے ختم ہونا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کہتا ہے، تاریخ بتاتی ہے، سائنس بتا رہی ہے، کہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت یہ کچھ ہو، جو کچھ کہا گیا ہے، لیکن قرآن تو ہدایت اور راہنمائی دیتا ہے۔ ہمیں اس سے کیا راہنمائی ملتی ہے کہ آج سے چار ہزار کروڑ سال بعد یہ پہاڑ شق ہوجائیں گے، چاند تاریک ہوجائے گا، سورج مٹ جائے گا، ماند پڑ جائے گا، ستارے ٹوٹ جائیں گے۔ ہمارے لیے اس میں آج کیا راہنمائی ہے۔ یہ تو جس وقت ہوگا اس زمانے کے اندر بھی کچھ نہیں کرسکیں گے۔ قرآن کا تو ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ، اپنے اندر راہنمائی دیتا ہے۔

یہ راہنمائی کیا ہے، جو ہمیں مل رہی ہے؟ یہ سوال بڑا ہی اہم ہے۔ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ تاریخی واقعات اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ واقع ہوکر رہے گا اور ان سے کہا گیا ہے کہ یہ چیزیں تو اسی زمانے میں ہونی شروع ہوگئی تھیں لیکن دین کا آخری غلبہ فتح مکہ یا اس کے ذرا بعد کے زمانے میں یا اس کے بعد صدرِ اول میں، جو نبی اکرم ﷺ اور عہدِ صحابہ تک محدود (610-661) ہے، میں یہ چیزیں واقع ہوگئیں تھیں۔ کیا واقع ہوگیا تھا؟ ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو عرب کی سرحدوں پر واقع تھیں، روم کی اور ایران کی سرحدوں پہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ کہنے کو تو وہ آزاد تھیں لیکن جسے آپ خارجی پالیسی کہتے ہیں، اس میں وہ ان سپر پاورز کے تابع جاتی تھیں جن کی سرحد پر وہ واقع تھیں۔ عربوں کے ہاں تو سپر پاور تھی نہیں۔ ایران کی سرحد پہ وہ ایرانیوں کے تابع تھی، روم کی سرحد پہ وہ رومن کے تابع تھی۔ وہ ایران اور رومن کی وساطت سے عربوں کو تنگ کرتے رہتے تھے اور آج بھی یہی Strategy (حکمتِ عملی) ہوتی ہے۔ سب سے پہلے جب اسلام کے نظام کی، دین کے غلبے کی، یہ چیز اٹھی ہے تو سب سے پہلے یہ جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں ان کو ختم کیا گیا۔ عربی زبان میں جو سما اور چاند اور سورج ہیں یہ بڑی بڑی ریاستوں کو کہتے تھے اور جو جبال ہیں وہ بڑے بڑے سرداروں کو کہتے ہیں اور یہ جو ستارے اور نجوم ہیں، یہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو کہتے ہیں۔ یہاں کہا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ جواب دیا کہ **فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ** (77:8) پہلے تو یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم ہوجائیں گی۔ [1] ان چیزوں کی تاریخ شاہد ہے، وہ قرآن کے ان واقعات کی تفسیر کر رہی ہے اور اس سے معلوم بھی ہوا

---

[1] اُس وقت مخالفین کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی قوت ماند پڑ جائے گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز۔ ص 1399)

کہ ہمارے لیے اس میں ہدایت کیا ہے، ان کے لیے راہنمائی کیا ہے۔ قریش نے آخر تک مقابلہ کیا تھا۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ جو چھوٹی بڑی باطل کی قوتیں تھیں، کس طرح ایک ایک کر کے یہ ستارے جھڑ گئے، یہ چاند شق ہو گیا، یہ سورج ماند پڑ گیا۔ تم کیسے بچ سکتے ہو۔ بات تو یہ ہے اور ہمیں کہہ رہا ہے کہ استبداد پر نہ روما کی سلطنت رہی، نہ ایران کی سلطنت رہی، نہ مصر کی رہی۔ اگر تم اپنے ہاں استبداد کی سلطنت قائم کرلو گے تو تم کیسے بچ سکو گے۔ ہر زمانے کے انسان سے وہ کہہ رہا ہے۔ اس کا پراسیس (عمل) یہی ہوتا ہے کہ پہلے چھوٹی چھوٹی مملکتیں، سلطنتیں، ریاستیں ختم ہوتی ہیں۔ آج بھی پراسیس یہی ہے۔ یہ بڑی بڑی سپر پاورز کر رہی یہی رہی ہیں۔ یہ چھوٹی قوتوں کو جوان کے طفیل قائم ہیں ان کو آگے بڑھاتی ہیں۔ وہ **فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ** ❶ (77:8) ہے۔ اور اس کے بعد ہے کہ **وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ** ❷ (77:9)۔ یہ جو آپ کے ہاں کی بڑی بڑی پاورز ہیں شق ہو جائیں گی، ان میں دراڑیں پڑ جائیں گی، پھٹ جائیں گی۔ **وَ اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ** ❸ (77:10)۔ ان کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ یہ کہا گیا ہے کہ ان پہاڑوں کے، اس چاند اور سورج کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ آپ کہہ دیں کہ اگر ان کے پرخچے اڑ بھی جائیں گے تو اڑ جائیں، ہمارا کیا بگڑے گا لیکن جب ان کے یہ پرخچے اڑے تھے تو پوچھو نہیں کہ آج تک تاریخ کا وہ مورخ کیا کہہ رہا ہے: وہ آج تک اپنے زخموں کو سہلا رہے ہیں۔ دنیا بھر کے لیے ان کی تاریخ عبرت و موعظت کا مرقع بن کر رہ گئی ہے۔

تاریخ کا مرقع باعثِ عبرت ہوتا ہے

عزیزانِ من! آپ ہسٹری آف پرشیا (تاریخِ فارس: History of Persia) دیکھیے، اور نہیں تو فرعون ہی کو دیکھ لیجیے۔ اور بھی کئی ایک Histories (کتبِ تاریخ) ہیں، مثلاً History of Roman Empire (تاریخ سلطنتِ روما) لے لیجیے، آپ گبن ❹ کی دیکھیے۔ ان کے اندر بھی وہ تاریخی نوشتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نگاہ اس چیز پہ گئی کہ وہ سلطنتیں تباہ کیوں ہوئی تھیں۔ انہوں نے گنایا ہے کہ جسے قرآن نے باطل کہا ہے، انہوں نے وہ نظام اپنے ہاں رائج کر رکھا تھا اس لیے یہ کچھ ہوا۔ عرب کے اندر جب حق کا نظام

---

❶ اُس وقت مخالفین کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی قوت ماند پڑ جائے گی۔

❷ اور بڑی بڑی سربلندیوں کے حامل سرداروں کی رفعت و شوکت کے پرخچے اڑ جائیں گے۔

❸ اور پہاڑوں جیسی محکم جماعتیں پرکاہ کی طرح اڑ جائیں گی۔ یوں سمجھو گویا انھیں چھلنی میں چھان اور چھاج میں پھٹک دیا جائے گا۔ جو باقی رہنے کے قابل ہو گی وہ باقی رہ جائے گی، دوسری سب ضائع ہو جائیں گی۔ (20:105; 56:5) (1-2-3 ۔مفہوم القرآن۔ پرویزؒ ص 1399)

❹ گبن (Edward Gibbon : 1737-1794) برطانوی مورخ ہیں۔ ان کی مشہورِ زمانہ کتاب کا نام ہے: The History of the Decline and Fall of the Roman Empire (1716-88) یہ کتاب 1200 سالہ عرصہ تاریخ پر محیط ہے اور آج بھی اپنی ہی نوعیت کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔

قائم ہوا ہے تو اس کے اثرات اتنے دور دور تک گئے تھے۔ اسی لیے کہا تھا کہ نٰشِرٰتِ نَشْرًا (77:3) وہ اقوام متاثر ہو گئیں تھیں۔ ان قوموں کے اوپر تباہی آ گئی تھی اور اس کے بعد کہا کہ جو قوم بھی اس قسم کا نظام قائم کرے گی اس کا بھی وہی انجام ہوگا۔ یہ سارا کچھ ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ یہ کب ہوگا؟ اس کے لیے کہا کہ وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ (77:11) ہم رسولوں کو بھیجتے ہیں۔ ان کے ذریعے یہ پروگرام متعین کیا جائے گا۔ اس کو نافذ کرنا تمہاری ڈیوٹی ہے۔ یہ تمہارے ذمہ ہے۔ یہ فطرت کا' کائنات کا' خدا کا ایک نظام ہے۔ یہ کچھ یونہی ہنگامی طور پہ نہیں چل رہا۔ اس کی تو ابھی تحقیق ہوگی۔ جی چاہتا ہے کہ خدا کرے کہ میں اپنی زندگی میں اس تحقیق کے نتائج دیکھوں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ زمین و آسماں جو گردش میں ہیں' وہ اس لیے ہیں کہ کسی فرد کا کوئی عمل نتیجہ پیدا کیے بغیر نہ رہ جائے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ ابھی افراد تک ہماری نگاہ نہیں گئی' اقوام تک تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح اقوام تباہ ہوتی ہیں' کس طرح اقوام غالب آتی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ (77:11) اور جب تمام پیغام پہنچانے والوں کا پروگرام متعین کیا جاتا ہے' ڈیوٹی لگائی جاتی ہے' وقت مقرر کیا جاتا ہے' کہ ان میں سے کس نے کب اور کیا کام کرنا ہے۔ پھر یہ پوچھتے ہیں کہ لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ [1] (77:12) یہ پھر ہوتا کیوں نہیں ہے؟

عزیزانِ من! یہ بات آگے آتی ہے۔ یہ وہی ہے جس سے انسان فریب کھاتا ہے کہ پھر وہ انقلاب جلدی سے آتا کیوں نہیں ہے؟ وہ عذاب' وہ تباہی آنے میں دیر کیوں لگا رہی ہے؟ یہ ہے قرآن کا خدا' یہ ہے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل اور یہ ہے انسانوں کے لیے اس کی رحمت۔ وہ پہلے ہی جرم پر گلا نہیں گھونٹ دیتا۔

عزیزانِ من! دو قوتیں انسان کے اندر کشمکش میں رہتی ہیں: مدافعت کی قوت اور تخریبی قوت۔ علمِ طب والے یہ ڈاکٹر ہمیں بتاتے ہیں کہ ہر سانس میں کروڑوں کی تعداد میں تباہ کرنے والے جراثیم اندر جاتے ہیں۔ اگر اندر والے وہ جراثیم ان سے زیادہ توانائی میں ہیں جوان کو ہلاک کرنے آئے ہیں تو وہ انہیں ہلاک کر دیتے ہیں اور ان پر غالب آ جاتے ہیں۔ اس طرح انسان زندہ رہتا ہے۔ اگر یہ ہلاک کرنے والے جراثیم غالب آ جاتے ہیں تو انسان بیمار پڑ جاتا ہے۔ اگر یہ مسلسل غالب آتے رہتے ہیں تو پھر ایک دن مر جاتا ہے۔ یہی قانون قوموں کی تاریخ میں بھی کارفرما ہے۔ ان کی زندگی میں بھی پہلے ہی دن غلط عمل سے وہ قوم تباہ نہیں ہو جاتی' لمبا عرصہ پڑتا ہے۔ وہ اس کے لیے جسے آپ ڈھیل کہتے ہیں دیتا ہے لیکن یہ نہیں ہے کہ اس دوران میں کچھ ہو نہیں رہا ہوتا۔ ہو تو رہا ہوتا ہے مگر ابھی وہ اس مقام پہ نہیں پہنچتا جہاں مریض کی موت واقع ہو جائے۔ ابھی وہ سانس لے رہا ہوتا ہے۔

ہاں بات چلی آ رہی تھی کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ پھر ہوتا کیوں نہیں؟ کس وقت تک کے لیے یہ مہلت کا وقفہ ہے؟ ہم کب تک انتظار

---

[1] یہ انقلاب کس وقت تک کے لیے ملتوی کیا گیا ہے؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز۔ ص 1399)

کریں؟اس کے لیے کہا کہ لِیَوْمِ الْفَصْلِ (77:13) ابھی تو تمہیں وارن کیا جاتا ہے' یہ تنذیر ہے' آگاہ کیا جارہا ہے۔ پھر وہ فیصلے کا دن ہوجائے گا۔ یہ ایک لفظ ہے: فیصلے کا دن۔ اور جب فیصلہ ہوجاتا ہے تو پھر تو اس کے بعد واپسی کی گنجائش نہیں رہتی۔ فیصلے کا دن موت ہوتی ہے۔ اس سے پہلے تو آخری سانس تک بھی' ڈاکٹر ابھی امیدوالا ہوتا ہے' کچھ نہ کچھ تو دیئے رہتا ہے۔ یہ یوم الفصل ہوتا ہے جب وہ آخری سانس بند ہوجاتا ہے۔ کہا کہ یہ اس دن تک کے لیے ملتوی ہے۔ کیوں جلدی مچاتے ہو؟ کیا وہ عید کا چاند ہے' جو تم چاہتے ہو کہ انتیس کو نظر آجائے' تیس کو کیوں نظر آئے؟ نہیں' ارے وہ تو تمہاری موت کا دن ہے۔ اس کے لیے جلدی مچا رہے ہو! وہ یوم الفصل ہے۔

عزیزانِ من! اس کے فوراً ہی بعد کہا کہ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ (77:14) انہیں کون بتائے کہ یوم الفصل کیا ہوگا؟ اس دن کیا ہوگا؟ اس یوم الفصل کو وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ (77:15) جو لوگ دین کے ایسے واضح حقائق کو جھٹلاتے ہیں اس دن ان لوگوں کے لیے تباہی ہوگی۔ میں نے پہلے بھی کئی دفعہ کہا تھا کہ انکار کرنا اور چیز ہے' یہ کفر ہے۔ وہ ایک شخص مانتا ہی نہیں۔ اور دوسرا شخص وہ ہے جو زبان سے مان رہا ہے' کہہ رہا ہے کہ میں مسلمان ہوں' قرآن پہ بھی ایمان ہے' خدا پہ بھی ایمان ہے' حشر نشر پہ بھی ایمان ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ اور اس کے بعد عملاً' انفرادی طور پر' اجتماعی طور پر' ایسا نظام قائم کرتا ہے جو اس کے برعکس ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اپنے دعوے کو جھٹلاتا ہے۔ کیا لفظ ہے صاحب ''اپنے دعوے کو جھٹلاتا ہے''! یہ ان کا ذکر آرہا ہے۔ اس دن پھر وہ ان کے لیے تباہی کا دن آجائے گا جو یوں اپنے دعوے کو جھٹلاتے رہے۔ ان سے پوچھو: اَلَمْ نُهْلِکِ الْاَوَّلِیْنَ o ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِیْنَ (77:16-17) کیا تاریخ انہیں یہ نہیں بتا رہی کہ جو پہلی قومیں آئیں ان کو تباہ کیا۔ اس کے بعد ایک قوم آئی' اسے وارن کیا' انذار کیا' تنبیہہ کیا' آگاہ کیا کہ ایسا نہ کرنا ورنہ تمہارے ساتھ بھی ویسا ہی ہوجائے گا لیکن انہوں نے بھی کوئی اثر قبول نہ کیا لہٰذا ان کا انجام بھی ویسا ہی ہوگیا۔

عزیزانِ من! آگے ایک بات آئی کہ یہ ان قوموں کی ہی بات نہیں ہے جو ہم پڑھ رہے ہیں اور نہ ہی یہ انہی تک محدود ہے۔ یہ جو ہم اصول بیان کر رہے ہیں وہ یہ ہے کَذٰلِکَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ (77:18) مجرم کہیں بھی ہوں' کسی زمانے میں بھی ہوں' کسی قوم میں بھی ہوں' کسی دَور میں بھی ہوں' ہم اسی طرح سے ان کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہمارا قانونِ مکافات ہر مجرم کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرتا ہے۔

جرم کا مفہوم

عزیزانِ من! اب پتہ چلا کہ تاریخی شواہد کے معنی کیا ہیں؟ تو گویا خدا کا یہ ایک اٹل ابدی قانون ہے کہ مجرمین کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔ جرم کی نوعیتیں تو بہت ہیں' بے شمار ہیں' بکثرت ہیں۔ انہیں جرائم Crime کہیئے لیکن بنیادی طور پر عربوں کے ہاں جرم کہتے تھے کہ

''دوسروں کے ہاں کے درخت کے پھل کو کاٹ کر اپنے ہاں لے آنا۔'' اس کے اندر تمام جرائم کی تفصیل آ جاتی ہے یعنی دوسروں کی محنت کے ماحصل کو جبراً لوٹ کر لے جانا' استحصال کرنا یعنی Exploitation (سلب ونہب) کرنا' اُسے جرم کہا جاتا ہے۔ کیا بات ہے اس قوم کی! اس سے بڑا جرم اور کیا ہے' اور اسی سے تو قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ بِالْمُجْرِمِيْنَ o وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (77:18-19) تمام مجرموں کے ساتھ' اس دور میں تباہی ہوگی کیونکہ وہ ہمارے قوانین کو عملاً جھٹلاتے ہیں۔ سوچیے کہ یہ لوگ نام اسلام کا لیتے تھے' دوسروں کے درختوں کے پھل کاٹ کر اپنے گھر لے جاتے تھے۔ ایک نہ ایک دن تو تباہی آنی ہی تھی اور وہ آ گئی۔

عزیزانِ من! وقت ہوگیا۔ ہم سورۃ المرسلٰت کی 19 ویں آیت تک آ گئے' 20 ویں آیت میں پھر قرآن اسی کی شہادت میں' روزمرہ کے ایک واقعہ کو' پیش کرتا ہے' اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے اور آپ دیکھیں گے کہ کیا انداز ہے قرآن کا!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

انتیسواں باب: سورۃ المرسلٰت (آیات 20 تا 37)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1984ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ المرسلٰت کی آیت 20 ہی سے ہو رہا ہے: (77:20)۔

قرآن حکیم کے آخری پاروں کی خصوصیت

سلسلہ کلام ان آیات میں بلکہ ان آخری پاروں میں حق و باطل کی اس کشمکش کی انتہائی منزل سے متعلق ہے جو یوں تو شروع سے چلا آ رہا تھا مگر نبی اکرم ﷺ صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی زندگی کے آخری دَور میں شدت اختیار کر گیا اور قرآن انہی کی تفسیر بیان کرتا جا رہا ہے۔ ساری بات خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سمجھنے کی ہے، مظلوم یہ چاہتا ہے کہ ظالم کا ہاتھ سختی کے لیے اٹھے تو وہ وہیں اکڑ جائے، خدا کی قدرت کا یہ تقاضا ہونا چاہیے کہ وہ مظلوم کی حفاظت کرے، ظالم کو اسی وقت سزا دے۔

ظالم اور مظلوم کی غلط فہمی

خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل میں مہلت کا وقفہ رکھا گیا ہے۔ عمل اور اس کے نتیجے میں مہلت کا ایک وقفہ ہوتا ہے۔ یہ چیز چلی آ رہی ہے۔ قریب قریب ہر درس میں اس کا اعادہ ہوتا جا رہا ہے کہ اس میں کتنی بڑی مصلحتیں ہیں، کتنا نوعِ انسان کے لیے افادہ ہے، یہ مہلت کا وقفہ رحمت ہے لیکن اگر وہ قانونِ مکافاتِ عمل پر گہری نظر نہ رکھیں تو یہ دونوں اطراف میں غلط فہمی پیدا کر دیتا ہے۔ مظلوم کو اس سے کہ یہ کیا

انصاف ہے کہ مجھ پہ ظلم ہو رہا ہے اور ظالم پنپتا چلا جا رہا ہے۔ پہلے کچھ وساوس پیدا ہونگے' پھر شکوک پیدا ہونگے' ہوسکتا ہے کہ آخر میں جا کر مایوسی پیدا ہو جائے۔ مایوسی کا نتیجہ انکار تک بھی ہوسکتا ہے۔ اِدھر ظالم ہے کہ وہ یہ چیزیں سنتا تو ہے کہ ظلم کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے' خدا کا قانون ہے' وہ ایسا ہوتا ہے' وہ دیکھتا یہ ہے کہ ایسا ہوتا نہیں ہے' وہ پنپتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے اس جور واستبداد اور ظلم وستم میں اور بے باک ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی تیسری صورت یہ پیدا ہوتی ہے کہ خدا ان کی خاطر اپنے قانون کو نہیں بدلتا۔ وہ یہ سمجھاتا ہے اور قرآنِ کریم میں یہ چیز آئی ہے کہ یہ مہلت کا وقفہ کیوں رکھا گیا ہے اور یہ رکھنا ضروری ہے اور پھر وہ خارجی کائنات کے جتنے حوادث ہیں' ان کو سامنے لا کر سمجھاتا ہے۔ یہاں بھی آخری آیت تک یہ بات تھی کہ یہ بات فوری طور پر کیوں سامنے نہیں آتی تو قرآن اگلی مثال استقرار حمل اور اس کے بعد بچے کی پیدائش کی دیتا ہے۔

استقرارِ حمل کے سلسلہ میں بچے کی پیدائش تک کی ایک ٹھوس مثال

عزیزانِ من! قرآن عام طور پہ استقرارِ حمل اور اس کے بعد بچے کی پیدائش کی مثال پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میں کم از کم سات آٹھ نو مہینے کا وقفہ لگتا ہے پھر کہیں جا کر تندرست وتوانا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ جو مہلت کا وقفہ ہے یہ اسے پورا کرتا ہے۔ اگر اس میں عجلت ہو جاتی ہے تو اُس کا Abortion (اسقاط) ہو جاتا ہے' وہ بچہ ناتمام ہوتا ہے' اس کے نتائج بعض اوقات بڑے ہی مہلک ہوتے ہیں اور اگر یہ وقفہ پورا ہو جاتا ہے تو وہ بچہ عام طور پہ صحیح اور سلامت پیدا ہوتا ہے۔ عام طور پہ سمجھانے کے لیے یہ چیز قرآن کہتا ہے اور پھر اسے کہتا ہے کہ اس باب میں تو تم جلدی نہیں مچاتے لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ ظلم کا عمل اور اس کے نتیجے میں اسی قسم کا ایک وقفہ ہوتا ہے تو یہ بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔

اسی کے لیے یہاں سمجھایا کہ اَلَمۡ نَخۡلُقۡكُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ o فَجَعَلۡنٰهُ فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ o اِلٰى قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ❶ (77:20-21)۔ ہم نے جو تمہیں پیدا کیا ہے اس پراسیس (عمل) پر' اس طریق پر' تم غور کیوں نہیں کرتے؟ ایک جرثومہ حیات' ایک جرثومہ زندگی' مرد کا مادہ منویہ عورت کے رحم میں ٹپکتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کا ایک ایک لفظ اربابِ علم وفکر وتحقیق ودانش کے لیے ہزاروں موعظت کی چیزیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہاں دو الفاظ ہیں: جَعَلۡنٰهُ فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ (77:21)۔ یہ گائنا (Gynae) کے یا علمِ جنین کے ماہرین بتا سکیں گے۔ ہم تو ذہن میں یہی سمجھتے ہیں کہ یہ جو مادہ ہے عورت کے رحم میں ٹپکتا ہے اور رحم کے اندر بچہ پرورش پانے لگ جاتا ہے۔ چودہ سو سال پیشتر کے زمانے میں جب اِدھر کی تحقیق کا رخ بھی اُدھر نہیں ہوا تھا' قرآن وہ Stages (مراحل) بتا رہا ہے

---

❶ (ان سے کہو کہ) ذرا تم اپنی پیدائش کے سلسلہ پر غور کرو اور دیکھو کہ تم کن کن تخلیقی مراحل میں سے گزرتے ہو؟ ہم نے تمہیں مادہ تولید سے پیدا کیا جو بڑا حقیر سا تھا۔ پھر اس مادہ تولید کو رحم کے اندر ٹھہرایا جو وہاں' مادہ کے مبیضہ میں قرار گیر ہو گیا (23:13) اور ایک مقررہ پیمانے کے مطابق نشوونما پاتا رہا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ۔ ص1400)

جو آج علم الجنین والے ان چیزوں کو اپنے مشاہدے میں دیکھ رہے ہیں کہ یہ سیدھا رحم میں جا کر نہیں ٹپکتا۔ اول تو یہ کہ اس ایک قطرہ میں وہ جرثومے کروڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں' وہ چلتے ہیں۔ عزیزانِ من! میں اس کی تفصیل میں چلا جاؤں گا تو بات لمبی ہو جائے گی اور دوسری طرف چلی جائے گی اور پھر یہ کہ میرا یہ میدان بھی نہیں ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ جب قرآن کے الفاظ آتے ہیں تو جی نہیں چاہتا کہ انہیں چھوڑ کر آگے چلے جائیں۔ یہاں کہا ہے کہ ''قرار'' ہوتا ہے۔ دراصل جب کوئی چیز جو Move (حرکت) کر رہی ہو' چل رہی ہو' اس کا کسی مقام پہ ٹھہر جانا ''قرار'' ہوتا ہے۔ اس زمانے میں یہ بات ہی کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی کہ یہ جو اس کے Cells (جرثومے) ہیں' یہ حرکت کرتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔ ان کو ''قرار'' کہاں ملتا ہے؟ وہاں تو عورت کا اسی طرح سے وہ عام طور پہ جسے Egg کہتے ہیں' اس کو وہ مبیضہ کہتے ہیں' اس کو انڈہ کہتے ہیں' یہ اسی قسم کی ایک ذرا سا جرثومہ ہوتا ہے' سیل ہوتا ہے' یہ سیل (مرد کا مادہ منویہ) اس سیل (عورت کے مبیضہ) کے اندر قرار پاتا ہے اور یہ جو دونوں کا ایک آمیزش ہے یہ ہے ''مکین''۔ اب ان کو مکان ملتا ہے جسے رحم کہا جاتا ہے اور یہ اس کے اندر ''قرار گیر'' ہو جاتے ہیں۔ قرآن کے دو الفاظ ہیں: **فِیۡ قَـرَارٍ مَّـكِيۡنٍ** (77:21)۔ جھوم جاتا ہے مغرب کا سائنسدان جب وہ قرآن کی ان آیات پہ غور کرتا ہے۔ کہا کہ اس طرح سے وہ ''مکین'' وہاں رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کب تک وہاں رہتا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **اِلٰى قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ** (77:22) ایک مدت تک' جو تمہیں معلوم ہے' معین ہے۔ قرآن کا قدر کا یہ لفظ بڑا جامع لفظ ہے۔ یہ پیمانہ ہے جو خدا نے مقرر کیا ہوا ہے۔ اسی کو ہماری اصطلاح میں قانون کہتے ہیں یعنی خدا کا مقرر کردہ پیمانہ (Measure)۔ اس وقت تک یہ ''قدرِ معلوم'' ہے۔ بہر حال ٹھیک ہے' یہ تو ہر ایک کو معلوم ہے۔ کہا کہ اس کے اندر مہلت کا وقفہ ہے اور اسی سے یہ بچہ صحیح و سلامت تولد پذیر ہوتا ہے۔ یہ ہے: **اِلٰى قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ** [1] (77:22)

قرآن نے مہلت کے اس وقفہ کو پیمانے سے تعبیر کیا ہے

عزیزانِ من! اس کے بعد کہا: **فَـقَـدَرۡنَـا** (77:23) سو اسی طرح سے ہم نے ہر عمل اور اس کے نتیجے کے اندر ایک مہلت کا وقفہ یا ایک پیمانہ مقرر کر رکھا ہے۔ پہلے ایک متعین مثال دی ہے۔ اس مثال کے بعد پھر اپنا پورا اصول' اپنا قانون' بتایا ہے کہ **فَـقَدَرۡنَا** (77:23) ہر ایک کے لیے ہم نے اسی طرح سے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں' قانون مقرر کر رکھا ہے' مہلت کا وقفہ درمیان میں آتا ہے۔ اور مزید کہا کہ **فَنِعۡمَ الۡقٰدِرُوۡنَ** (77:23) کیسے اچھے ہیں ہم پیمانے بنانے والے' اور قانون بنانے والے۔ کیسے اچھے ہیں جو قوانین بنے ہوئے ہیں۔ یہ بڑی چیز ہے ڈاکٹر صاحبان' Scientists (سائنسدان) ان علوم کے ماہرین' جانتے ہیں کہ یہ جو ہر چیز کے' مرض کے بھی' شفا کے بھی' دوا کے اثر کرنے کے بھی' معین پیمانے ہیں یہ انسانیت کے حق میں کس قدر رحمت ہیں۔ یہ ہے **نِـعۡمَ الۡقٰدِرُوۡنَ** (77:23)۔ اب یہ پہلی

---

[1] ایک مقررہ پیمانے کے مطابق۔

چیز تو مثال کی تھی' صرف استقرارِ حمل اور جنین کی ولادت تھی۔ اور اس کے بعد وہ پورا اصول بتا دیا کہ کائنات کی ہر شے میں یہ چیز موجود ہے اور اسی طرح سے یہ کچھ ہوتا ہے۔

حق و باطل کی پہچان

عزیزانِ من! اب اُس نے کائنات کے قوانین کی طرف رخ موڑ دیا اور پچھلے درس میں ضمناً یونہی چلتے چلتے وہ ایک فقرہ میں نے بیان کیا تھا۔ وہ بات یوں ہوئی تھی' کہ یہ جو تسخیرِ فطرت ہے یہ حق ہے اور فطرت سے مغلوب ہو جانا باطل ہے۔ یہ بھی حق و باطل کی ایک کشمکش ہے جو جاری ہے۔ یہ بات ذرا سی تشریح چاہتی ہے۔ ویسے بھی یہ اس قرآن کے آخری پارے ہیں' زندگی کا کچھ پتہ نہیں ہے' یہ چیزیں سامنے آتی ہیں تو جی چاہتا ہے کہ کچھ نہ کچھ روشنی تو اپنی بصیرت کے مطابق اس پہ ڈالوں۔ یہ کائناتی قوانین' خدا کے قوانین ہیں۔ یہ قوانینِ الٰہیہ ہیں' یہ کسی اور کے مقرر کردہ نہیں ہیں تو جب آپ قوانینِ خداوندی کہیں گے تو سب سے پہلے کائنات کے یہ قوانین سامنے آئیں گے۔ جب قوانینِ خداوندی کی اطاعت کہیں گے تو اب اس گوشے کو کیسے الگ کر دیں گے۔ سب سے پہلے تو یہ گوشہ سامنے آئے گا۔ یہ چیز ذرا تفصیل چاہتی ہے۔

کائنات کو مسخر کرنا دین کا ایک گوشہ ہے

عزیزانِ من! یہ کائناتی قوانین ایسے ہیں جو وحی کے ذریعے نہیں دیئے گئے بلکہ انسان اپنی تحقیق کی رو سے ان کا انکشاف کرتا ہے۔ جوں جوں انسان کا علم اور اس کی تحقیق بڑھتی چلی جاتی ہے' ان کائناتی قوانین پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ ان قوانین کی اطاعت سے' قوت سے' فطرت کی قوتیں (Forces of Nature) مسخر (Harness) ہوتی ہیں تو اس طرح اس کائنات کے اندر انسان ان قوتوں کا ماسٹر ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان سے کام لیتا ہے' تو ان قوانین کی اطاعت کے نتیجہ میں فطرت کی یہ قوتیں مسخر ہو رہی ہیں۔ ان قوتوں کے مسخر کرنے سے پھر انسانی زندگی میں جس قدر نعمتیں' آسائشیں' وسعتیں آتی ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ یہ جزا (صلہ) ہے قوانینِ خداوندی کی اس اطاعت کی۔ وہ جو اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً [1] (2:201) ہے' وہ تو انہی کو مل سکتی ہے جو فطرت کی ان قوتوں کو مسخر کریں۔ آپ کبھی غور کیجیے کہ جو قومیں ان قوتوں کو مسخر نہیں کرتیں وہ اُن کی مغلوب رہتی ہیں جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہیں۔ یہ قومیں اپنی زندگی کی ہر ضرورت اور تقاضے کے لیے دوسروں کی محتاج رہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ اقوام کن کی محتاج رہتی ہیں؟ اُن کی جنہوں نے ان قوانین کو معلوم کر کے' فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا ہوتا ہے۔ تو آپ دیکھیے یہ گوشہ کتنا اہم ہے۔ قرآنِ کریم اسے دین قرار

---

[1] (اے ہمارے پروردگار!) ہمیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں عطا فرما۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دیتا ہے۔سورۃ ال عمران میں ہے کہ اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ (3:83) کیا یہ لوگ خدا کے دین کے علاوہ کسی اور دین کو چاہتے ہیں؟ کسی اور نظامِ زندگی (دین) کی تلاش میں ہیں؟ چاہتے ہیں کہ کوئی اور خدا ملے؟ چاہتے ہیں کہ خدا کے اس دین (نظامِ زندگی) کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کریں۔

کائنات کی ہر شے قانون کے سامنے سجدہ ریز ہے

عزیزانِ من! دین کو یہاں (3:83) میں دین اللہ کہا گیا ہے اور کہا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ وَ لَہٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّ اِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ (3:83) کائنات کی ہر شے طوعاً و کرھاً اس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے' اس کے قوانین کے آگے جھکی ہوئی ہے۔ یہ ہے وہ دین اللہ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ کیا یہ لوگ دین اللہ کے خلاف کسی اور دین کی تلاش کر رہے ہیں؟ اس کو دین اللہ کہا ہے۔خدا کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا' اس کے مطابق عمل کرنا' اس کے مطابق زندگی بسر کرنا' یہ دین اللہ ہے۔وَلَہٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (3:83) اور اُس کائنات کی ہر شے خدا کے دین کا اتباع کیے چلی جا رہی ہے۔کہا یہ ہے کہ کیا یہ لوگ پھر خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے متلاشی ہیں؟ دو ہی آیتیں آگے چل کر فرمایا کہ وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ (3:85) جو اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش کرتا ہے تو وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا' وہ قبول نہیں کیا جائے گا۔تو قرآن اس کو دین قرار دے رہا ہے۔

یہ کائناتی دین اس کائنات کے اندر احسن طریق سے نافذ ہے

عزیزانِ من! قرآن ہی دینِ خداوندی ہے اور قوانینِ خداوندی کی اطاعت کائنات کی تمام قوتیں طوعاً و کرھاً کرتی ہیں' از خود کرتی ہیں' مجبوراً کرتی ہیں' ان کو اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ ان قوانین کی اطاعت کریں یا نہ کریں۔ یہ اطاعت کرنے پر مجبورِ محض ہیں۔اور یہ دین ہے جو نہایت احسن شکل میں کائنات کے اندر نافذ ہے۔اسی کے متعلق انسانوں سے کہا گیا کہ تحقیق سے' تفتیش سے' Scientific Research (سائنسی تحقیق) سے' ان قوانین کا علم حاصل کرو' پھر اس سے تمہیں فطرت کی جو قوتیں حاصل ہوں تو وہ ہے جسے تسخیرِ کائنات کہا گیا ہے۔

انسان فطرت کے ان قوانین میں دخل اندازی نہیں کر سکتا

عزیزانِ من! یہ جو خارجی کائنات میں قوانین خداوندی نافذ ہیں چونکہ انسان اِن میں دخل اندازی نہیں کر سکتا' اسے فطرت نے رکھا ہی ایسا ہے کہ یہ اس میں دخل اندازی نہ کرے۔اس لیے وہ اپنے نتائج ٹھیک ٹھیک اسی طرح سے مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔آپ کو پیاس لگی ہے' آپ قانونِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں' پانی نہیں پیتے' آہستہ آہستہ ایک آگ آپ کے سینے میں بھڑکتی چلی جاتی

ہے' اندر ایک دوزخ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ قانونِ خداوندی سے معصیت کا نتیجہ ہے۔ **وَ اِلَیۡہِ یُرۡجَعُوۡنَ** (3:83) اور جب آپ اسی کے قانون کی طرف جا کر پانی کا گلاس پی لیتے ہیں تو وہ آگ بجھ جاتی ہے۔ اسی طرح بھوک میں اگر آپ کھانے کی طرف نہیں جاتے تو وہ بھوک کی شدت کا عذاب تو آپ کو معلوم ہے کتنا ہوتا ہے۔ ان قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا نتیجہ دیکھیے کہ کتنی جلدی مرتب ہوتا ہے۔

طبعی قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ تباہی ہے

عزیزانِ من! جب اس قانون کی طرف لوٹتے ہیں اور آپ کوئی چیز جو طیب ہے' اُسے کھاتے ہیں تو اس سے جو بھوک کی وجہ سے اندر کا عذاب تھا وہ ختم ہو جاتا ہے لیکن اگر قانونِ خداوندی کی طرف رجوع نہ کیا جائے تو نہ وہ پیاس کا عذاب بجھتا ہے' نہ ہی بھوک کی شدت کے عذاب میں کوئی کمی آتی ہے۔ بالالفاظ دیگر خدا کے ان قوانین کی خلاف ورزی سے یہ عذاب ہوتا ہے اور ان کی اطاعت کرنے سے' ان کی طرف رجوع کرنے سے' ہی یہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ تو میں نے انفرادی چیز کہی ہے۔ پوری قوموں کی زندگی میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ فلاں قوم یا مثلاً قومِ نوح میں سیلاب آیا اور وہ سیلاب سے غرق ہو گئی۔ کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ اس نے سیلاب سے بچنے کے لیے قانونِ خداوندی کی طرف رجوع نہیں کیا' اس کی خلاف ورزی کی۔ جس نے کشتی بنا دی' اس نے خدا کے قانون کی اطاعت کی۔ کشتی والا بچ گیا۔ جس نے اس کی خلاف ورزی کی وہ ڈوب گیا۔ نوح علیہ السلام کے زمانے [1] میں بھی اور آج بھی یہی قانونِ فطرت نافذ العمل ہے لیکن درمیان میں مہلت کا وقفہ ضرور ہوتا ہے۔

سپر پاور بننے کا طریق صرف ایک ہے

عزیزانِ من! یہ چیزیں میں نے تو فوراً' جلدی جلدی' بتائی ہیں مگر پیاس کی شدت فوراً نہیں مارتی' وقت لیتی ہے' بھوک میں بھی Hunger Strike (بھوک ہڑتال) کرنے والے ستر ستر دن تو جی ہی لیتے ہیں لیکن نتیجہ یقیناً برآمد ہوتا ہے۔ کیوں یقیناً برآمد ہوتا ہے؟ کیونکہ انسان کا اس میں دخل نہیں ہوتا۔ وہاں یہ نہیں ہوتا کہ سنکھیا میں کھاؤں اور مر جائے زید۔ آدمی کی مداخلت سے تو ایسا ہوتا ہے کہ قتل کوئی کرے اور پھانسی کوئی دوسرا چڑھ جائے لیکن فطرت کے قوانین کی نتیجہ خیزی میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ وہاں انسان کا ہاتھ مداخلت نہیں کرتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قانونِ مکافات اسے کہتے ہیں: ہر عمل کا ایک نتیجہ۔ قرآن کریم نے واضح کر دیا ہے کہ وہ نتیجہ **فَنِعۡمَ الۡقٰدِرُوۡنَ** [2] (77:23) متعین ہے' نتیجہ معین ہے۔ اس نتیجے کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ لہٰذا انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کائنات

---

[1] تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ 5000-4000 ق م کا ہے اور قوم نوح علیہ السلام کا وطن دجلہ و فرات ہی کا درمیانی علاقہ تھا۔

[2] ہمارے مقرر کردہ پیمانے' نہایت عمدگی سے' اپنے نتائج مرتب کرتے رہتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ۔ ص 1400)

کی قوتوں کا اور کائنات کے قوانین کا علم حاصل کرے کیونکہ اس کی قوتوں کو مسخر کرنے پر ہی، یہ دنیا کی جو بڑی بڑی ترقی یافتہ قومیں ہیں، اپنے آپ کو سپر پاورز کہلاتی ہیں، وہ کونسی چیز ہے جس سے وہ سپر ہوگئی ہیں؟ یہی فطرت کی قوتیں! جس نے زیادہ سے زیادہ مسخر کی ہوئی ہیں وہی آگے بڑھتا ہوا چلا جا رہا ہے باقی قومیں تو ان کی محتاج ہیں، محروم ہیں، بھک منگی ہیں اور لرزتی ہوئی، کانپتی ہوئی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یہ کیوں کر رہی ہیں؟ وہ اس لیے کہ انہوں نے دینِ خداوندی سے کفر برتا ہے، انہوں نے اِس کی اطاعت نہیں کی۔

عزیزانِ من! پھر میرے ذہن میں وہ چیز ہے جو آپ کے دل میں کھٹک رہی ہے: وہ تو سب کافر ہیں۔ اس حصہ دین کے تو ہم بھی کافر ہیں۔ نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ کفر کا نتیجہ جہنم ہے۔ جہنم میں یہی جو کائناتی حصہ ہے، اس کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے، طبعی زندگی کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے، تو اس کے لیے بھی تو قرآن نے اِسے دین اللہ کہا ہے۔ تو کیا دین کے اِس حصے میں جو جی میں آئے آپ کرتے چلے جائیں، کفر برتیں، الحاد برتیں، اور ظلم برتیں، اور اس کا تو کوئی نتیجہ نہ نکلے، یہ ہو نہیں سکتا۔ آپ نے صرف اتنا ہی سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے نماز پڑھ لی ہے۔ اور تو اسے مکمل دین اللہ کہتا ہے ٹھیک ہے یہ بڑا ضروری ہے لیکن کائنات کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں دین کا یہ بھی ایک اٹل حصہ ہے جس کے نتائج فوراً سامنے آتے ہیں۔

پوری کائنات کے اندر نہ کوئی سفارش ہے نہ رشوت اور نہ ہی کوئی کچہری

عزیزانِ من! کائناتی قوانین کے اس حصے کے اندر کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔ خدا کے قانون کے اس حصے کے اندر کچہریاں نہیں لگی ہوئیں، رشوتیں نہیں چلتیں، سفارشیں کام نہیں دیتیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہ کس قسم کا نظامِ عدل ہے کہ حضرتِ انسان کو اجازت نہیں دی کہ اس میں ہاتھ ڈالے۔ کھائے سنکھیا اور وہ بن جائے مصری کی ڈلی۔ یہ نہیں بن سکتی۔ ہر شے کے اندر عمل کے نتیجے تک کے لیے جو تھوڑا سا وقفہ ہے وہ اس کا مہلت کا وقفہ ہے، جو سنکھیا کھا کر قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس میں پہلے ہی دن مرض چھپا ہوتا ہے لیکن وہ مرض پہلے ہی دن موت نہیں طاری کر دیتا۔ اس کے لیے ایک وقفہ ہوتا ہے۔ ہر ایک قانون کے نتیجہ خیزی کرنے میں وقفے مختلف ہوتے ہیں اور یہ وقفہ اس لیے ہوتا ہے کہ شاید وقفہ کے دوران اگر یہ ''الیہ یرجعون'' ہو جائے تو یہ قوانین جو ان چیزوں کا مداوا کرتے ہیں تو ان کی وجہ سے پھر شفا ہو جاتی ہے، آدمی تباہی سے بچ جاتا ہے اسی کو توبہ کہتے ہیں۔ جن قوموں نے یہ انکشافات کیے ہیں انہوں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ فلاں قانون کی خلاف ورزی ہونے سے جو تباہی کی طرف یا ہلاکت کی طرف انسان جاتا ہے تو پھر اس کا مداوا کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ مختلف امراض کے لیے جس قدر متنوع یہ دوائیں ہیں اور روز بروز ان کے انکشافات ہوتے چلے جاتے ہیں، وہ یہی ہے کہ درمیان میں مہلت کا وقفہ ہوتا ہے، ورنہ جونہی غلط قسم کا ایک لقمہ کھایا، اس کے بعد موت واقع ہوگئی۔ پہلی چیز تو معاف رکھیے گا پھر یہ تمام ڈاکٹر صاحبان کو تو کہیں لیبیا جانا پڑے گا، ان کی ضرورت ہی نہیں رہے گی کیونکہ وہ مریض تو اسی وقت مر جائے گا۔ یہ وہ مہلت کا وقفہ ہے جو ان کو بھی زندگی

دے رہا ہے۔اس میں اس چیز کا امکان ہے۔یہ توبہ ہے۔

زندگی کا دوسرا گوشہ انسان کی انسانیت کی زندگی

عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ یہ جو خارجی قوانین ہیں یا خارجی کائنات ہے اس کے اندر نظامِ عدل کس شدت سے کارفرما چلا جارہا ہے کیونکہ اس میں انسان کا دخل نہیں آتا۔تباہیاں آتی ہیں' بربادیاں آتی ہیں' خوشگواریاں آتی ہیں' قومیں پنپتی ہیں' آسائشیں ملتی ہیں' قوانین کی خلاف ورزی سے وہ کچھ ہوتا ہے' اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے یہ کچھ ہوتا ہے۔درمیان میں مداوا کے لیے وقفہ ہوتا ہے۔اس کے اندر مداوا یعنی اِلَیۡہِ یُرۡجَعُوۡنَ (3:83) کی سب چیزیں آجاتی ہیں۔قرآن یہ سمجھاتا ہے۔قانونِ مہلت کے لیے یہ مثالیں دیتا ہے۔اب اگلا وہ حصہ سامنے آگیا' جو انسان کی یا تو طبعی زندگی سے متعلق ہے یا طبعی کائنات Physical world سے متعلق ہے۔ اسی طبعی کائنات میں انسان کی طبعی زندگی یعنی جسمانی زندگی بھی آجاتی ہے۔اس حصہ زندگی میں انسان اور گھوڑا یا گائے یہ سب برابر ہیں۔یہ سب ایک ہی قانون کے تابع چلتے ہیں۔

صدیوں کی کاوشوں' ہلاکتوں اور خون ریزیوں کا شافی علاج: وحی کی رہنمائی

عزیزانِ من! اس کے علاوہ ایک زندگی اور بھی آتی ہے جو انسان کی انسانیت سے متعلق زندگی ہے۔یہ وہ زندگی ہے جس میں انسان کا کسی دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے یا اپنی ذات کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے' جسم کے ساتھ نہیں' انسان کی انسانیت کے ساتھ۔سنکھیا کھانے سے تو ہلاکت نظر آتی ہے۔ڈاکٹر صاحبان کے پاس اس کا کوئی مداوا (Antidote) بھی مہلت کے وقفے میں ہوتا ہے۔اس مدت مہلت کے اندر اگر وہ مل جائے تو اس کا علاج بھی ہوجاتا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ جھوٹ بولنے سے کیا ہلاکت ہوتی ہے؟ اس کا پتہ نہیں چلتا ہے' نہ کسی طرح یہ تحقیقات کے ذریعے انکشافات ہوئے ہیں' Scientists (سائنسدان) ان قوانین کو نہیں معلوم کرسکے۔یہ وحی کے ذریعے معلوم ہوئے ہیں۔یہ ہے خدائے تعالیٰ کی دوسری رحمت کہ اس نے ان قوانین کو خود وحی کے ذریعے دے دیا' ورنہ انسان کے لیے تو ایک بوٹی (Herb) کی تاثیر معلوم کرنے کے لیے پتہ نہیں کتنی صدیوں کے تجربات درکار ہوتے ہیں اور اس تجربے کے اندر' کتنی موتیں' کتنی ہلاکتیں' کتنی تباہیاں' کتنی بربادیاں ہوتی ہیں۔جنھوں نے Medicine (ادویات) کے تجربے کیے ہیں ان کا انسانیت پر بڑا احسان ہے لیکن معلوم نہیں وہ کن کن دشواریوں کے بعد' کن کن مراحل سے گزرنے کے بعد' کسی نتیجے پہ پہنچے ہیں۔یہ کہ سانپ کا زہر زندگی کو بچا بھی سکتا ہے' پتہ نہیں ان میں سے کتنوں کو سانپ ڈسوانا پڑا تاکہ یہ معلوم کریں کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔یہ خدا کی رحمت تھی کہ یہ جو انسانیت سے متعلق قوانین تھے' اس نے یہ انبیا کرام کے واسطے سے بنے بنائے' مرتب شدہ' وحی کے ذریعے دے دیئے۔

انسانی زندگی کا بٹوارا انسانوں کے ہاتھوں

عزیزانِ من! اب دین کا یہ دوسرا حصہ آیا کہ انسانوں کی زندگی میں یہ ہوگا۔ کچھ لوگ تو وہی جو دین کا پہلا حصہ ہے اسی کا اتباع کرتے چلے گئے' اور یہ جو دوسرا حصہ ہے اس کو انہوں نے Ignore (فراموش) ہی کر دیا۔ ایک تو وہ ہو گئے۔ ان لوگوں کو' بہر حال' دنیاوی زندگی کی حسنات تو حاصل ہو گئیں۔ لوگوں کی دوسری کیٹگری وہی ہمارے والی ہے کہ اس نے یہ جو کائنات کا' Material World (مادی دنیا) کا حصہ تھا اس کو قابلِ نفرت قرار دیا۔ Materialistic (مادیت کا) الحاد اور بے دینی کے معنوں میں استعمال ہونے لگ گیا۔ مادہ قابلِ نفرت بن گیا۔ یعنی بات تو یہ آئی۔ ہمارے ہاں عجمی تصوف سے' ہمارے ساتھ ہی بسنے والے ہندو کے فلسفہ ویدانت کے اندر ساری بنیاد یہ ہے کہ انسان کی یہ روح' خدا کی روح کے اندر' ایک حصہ تھی۔ اس کی روح کا ایک حصہ جدا ہو کر' اس سے کہیں نیچے آ گیا' گر گیا اور آ کے یہ روح مادے کے دلدل میں پھنس گئی۔ اب یہ چیختی ہے' چلاتی ہے' اس روح کو مادے کی اس دلدل سے نکلنے کے لیے کروڑوں چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔ یہ مادہ اس قدر دلدل ہے' اتنا خبیث ہے کہ یہ اسے نکلنے نہیں دیتا۔ روح اس کی آلائشوں کے اندر پھنسی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا منتہیٰ یہ ہے کہ اس مادہ کی دلدل کو ترک کر کے' آلائشوں کو دُور کر کے' اس سے پاک وصاف ہو کے' کہ اس مادی کائنات کا پھر کوئی ذرا سا دھبا بھی نہ رہے' یہ جو روح ہے' وہ جا کر پھر روحِ خداوندی میں مل جائے۔ لو یہ As you were (جو اور جیسے تھے) ہے۔ اندازہ لگایئے کہ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد As usual (جوتھا) ہو جائے۔ یہ ہے تصوف' یہ ہے ویدانت۔ ہندوؤں کا تصوف بھی یہی اور کرسچن (عیسائیت) کے ہاں Mysticism (باطنیت) بھی یہی ہے۔

تصوف کی دنیا اور دین خداوندی کی خلاف ورزی کا نتیجہ

عزیزانِ من! آپ ان کے ہاں کے Saints (صوفی) کی زندگی پڑھ کر دیکھیے۔ کہا کہ یہ سب سے بڑا سینٹ ہے' جی۔ کیا کارنامہ سرانجام دیا؟ جی' یہ ساری عمر نہایا ہی نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمایئے' یہ صاحب بہت بڑے سینٹ ہیں۔ جی! یہ کیا ہوا؟ کہا کہ جی' یہ اپنے پتر [1] کے ساتھ مل کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ بہت اچھا چلو' کھا تو لیتے تھے۔ یہ کون ہیں جی؟ کہا کہ انہوں نے کبھی کھایا ہی نہیں اور یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ یہ وہ ہیں جو اپنی جوئیں (Lice) نہیں مارا کرتے تھے۔ مادی زندگی کو اتنا قابلِ نفرت بنا دیا۔ یہ تھا وہ تصور۔ دینِ خداوندی سے اس قدر پرہیز کیا' نفرت کی' سرکشی کی۔ یہی کچھ آپ کے ہاں تصوف میں ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی ساری زندگی یہ ہے کہ جی!

---

[1] بیٹے

وہ دنیا کو ترک کر کے چلے گئے' وہ کنویں میں الٹے لٹکا کرتے تھے' گئے تو ماں نے ایک لکڑی کی روٹی دیدی' ان کو بھوک لگتی تھی تو اس کو منہ مار لیتے تھے۔ لکڑی کی روٹی کو!!! یاللعجب! یہ ترکِ دنیا ہے۔ اور یہ جتنے آپ کے ہاں کے یہ بڑے بڑے ہیں جنہیں مقربینِ بارگاہِ خداوندی کہا جاتا ہے' اولیاء اللہ کہا جاتا ہے' ان کے کارنامے یہ ہیں کہ انہوں نے دنیا کو کس طرح سے ترک کیا۔ ترک کیا؟ سوچیے تو سہی! دینِ خداوندی کی خلاف ورزی نہیں تو اور کیا ہے۔ اس سے اس قدر نفرت ہے!

عزیزانِ من! اس تصوف کا نتیجہ تو پھر قوموں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اس تصوف کے علاوہ قوموں کے اندر شریعت والوں نے بھی جب دیکھا کہ مقربین کی نشانی یہ ہے تو انہوں نے بھی اپنے ہاں اس قسم کی روایتیں بنالیں کہ دنیا جیل خانہ ہے' مومن اس میں قیدیوں کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تصوف نہیں۔ یہ آپ کے ہاں شریعت کی روایتیں ہیں: دنیا ایک لاش ہے اور جو اس کی طرف جانے والا ہے وہ کتا ہے۔ وہی نفرت' وہی دینِ خداوندی کے اس حصے سے انکار' سرکشی۔ عذاب سامنے ہے۔ پوری کی پوری ہزار ہزار سال کی قومیں ہیں۔ ان کی تاریخیں دیکھ لیجیے۔ جنہوں نے اپنے ہاں کائنات کے متعلق یہ نظریہ زندگی رکھا' اس کے نتائج آج بھی سامنے ہیں۔

دین اور دنیا کے امتزاج کا نام ہی الاسلام ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ دین اسی سے کامل نہیں ہوا۔ دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جو انسانیت سے متعلق ہے۔ انسانوں کے جسم سے نہیں' انسانیت سے متعلق ہے' جہاں واسطہ دام و دد سے نہیں پڑتا' پتھروں سے اور حیوانوں سے نہیں پڑتا' انسانوں سے معاملہ پڑتا ہے۔ وہ دینِ خداوندی ہے جو وحی کے ذریعے ملتا ہے۔ یہ دو دین ہیں یعنی انسانیت اور طبعی کائنات۔ ان دونوں کو اکٹھا کرنے سے الاسلام ہوتا ہے یعنی فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے' ان کو وحی خداوندی کے مطابق استعمال میں لانا۔ بس یہ ہو گیا اسلام۔ پہلا حصہ بھی آ گیا' اس میں دوسرا حصہ بھی شامل ہو گیا۔ اس کا نتیجہ اسی زندگی میں' اسی دنیا میں' جنت کی زندگی گزارنا' اس خطہ ارض کو ارضی جنت بنا دینا' فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان قوتوں کو اقدارِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے استعمال کرنا۔ یہ ہو گیا اسلام۔ اب اگر اس میں وہی پہلا حصہ رکھا جائے۔ یعنی صرف مادی کائنات' اسی کائنات کی طبعی زندگی' طبعی قوانین' اسے جتنا جی چاہے مسخر کرے اور دوسرا حصہ جو انسانیت کا ہے اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو اسلام نہیں بنتا۔ ایک بات یہ ہو گئی۔ دوسری یہ کہ اِدھر اپنے ذہن میں مذہب کا ایک تصور قائم کر لیا جائے اور جو حصہ ہے خدا کے دین کا' اس سے نفرت برتی تو یہ بھی تصورِ اسلام نہ ہوا۔ یہ تو ان دونوں حکموں میں سے صرف ایک کے متعلق ہی تصور ہوا۔ یعنی ایک حصے کا انکار اور دوسرے کا اقرار۔

ایک حصے پر ایمان اور دوسرے سے انکار

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) کیا ان لوگوں کا یہ نظریہ زندگی ہے کہ کتاب اللہ کے ایک حصے پر ایمان رکھیں اور اس کے دوسرے حصے سے انکار برتیں۔ اس نے تمام زندگی کو کتاب اللہ کہہ دیا۔ صحیفہ

فطرت بھی تو کتاب اللہ ہے۔ وہ کتاب کسی ساجھے ماجھے کی تو لکھی ہوئی نہیں ہے۔ انسان تو یہ لکھ ہی نہیں سکتا۔ ایک بہت بڑا Scientist (سائنسدان) ہے' غالباً وہ Sulivan (سلیوان) ہے۔ اس نے کہا ہے

We only read the book of nature we can't write it.❶

کتاب اللہ اور کتاب فطرت

عزیزانِ من! ہم کتابِ فطرت کو صرف پڑھتے ہیں' کتابِ فطرت کو انسان لکھ نہیں سکتا۔ کتابِ فطرت تو کتاب اللہ ہے اور اس کتاب کا دوسرا حصہ ہے جسے وحی خداوندی یا اب قرآن کہتے ہیں۔ یہ دونوں حصے اکٹھے ہونگے تو پھر یہ دینِ خداوندی مکمل ہوگا۔ کہا کہ کیا یہ روش اختیار کرتے ہو کہ اس کے ایک حصے پر تم ایمان رکھو' اور دوسرے حصے سے تم انکار کرو۔ اس کے لیے کہا کہ **فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ** (2:85) تم میں سے جو بھی کوئی اس قسم کی روش اختیار کرے گا' تو اس کا نتیجہ **اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا** (2:85) اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اس دنیا کی زندگی کے اندر اس کی ذلت اور رسوائی ہوگی۔ یہ وہ ہے جو اس کتابِ فطرت کو Neglect (فراموش) کرنے والوں نے کیا اور دوسرے حصے یعنی کتاب اللہ کو Neglect (فراموش) کرنے والوں سے کہا کہ **وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ** (2:85) یہ جو انسانی زندگی کے نتائج کے ظہور کا وقت ہوگا اس میں ان کے لیے شدید ترین عذاب ہوگا۔ اب اِن دونوں کو ملانے کا نام وہ ہوا' جسے آپ اسلام یا دین کہتے ہیں' لیکن ان میں سے جو صرف کسی ایک حصے کو لینا اور دوسرے کو Neglect (فراموش) کر دینا ہے' اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک حصے کو لینا اور دوسرے حصے کو Neglect (فراموش) کرنا۔ اس کا نتیجہ اس دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی اور ظہورِ نتائج کے وقت شدید ترین عذاب' حال کی زندگی میں ذلت و رسوائی اور مستقبل کی زندگی میں اندوہناک تباہیاں' دنیا میں بھی ذلت اور آخرت میں بھی رسوائی۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ اگر وہ صرف مادی کائنات کو نظر انداز کرتے ہوئے انسانیت کی اقدار کو Neglect (فراموش) کرتے ہیں' اس سے انکار کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ اشد عذاب ہے۔ یہ اپنے آپ کو فریب دینے والے ہیں۔ یہ دین نہیں کرتا' یہ مذہب کرتا ہے' یہ تصوف کرتا ہے کہ خدا کی اتنی بڑی کائنات ہے اور یہ اس کے اتنے بڑے دین سے نفرت برتتا ہے۔ اس کا نتیجہ ذلت اور خواری ہے۔ اسلام کی زندگی ان دونوں کو اکٹھا کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہے قوانینِ فطرت کی اہمیت' عزیزانِ من! یہ ہے اہمیت اس مادی زندگی کی! مادی زندگی کو مسخر کیے بغیر تو دینِ خداوندی یا یہ جو انسانیت سے متعلق دین ہے' اس کے بغیر' ایک قدم بھی نہیں چلا جا سکتا۔ یہ مادہ تو وہ گھوڑا ہے' جس پہ سوار ہو کر آپ منزل کی طرف جائیں گے۔ اگر آپ کے پاس سواری نہیں ہے تو آپ جائیں گے کہاں؟ یہ جو

---

❶ ہم صحیفہ فطرت کو صرف پڑھ سکتے ہیں' لکھ نہیں سکتے۔

ان دونوں کا امتزاج ہے قرآن کے نزدیک یہ اسلام ہے۔ایک مصرع میں یہ شخص ❶ کتنی بڑی حقیقتیں بیان کر جاتا ہے۔وہ کہا ہے کہ

از کلید دیں درِ دنیا کشاد

دین کی چابی سے دنیا کا ہر دروازہ کھلتا ہے۔''دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولنا'' یہ ہے اسلام۔

عزیزانِ من! جس نے دنیا کے دروازے کو ہی قابلِ نفرت سمجھا' اس نے کھولنا کیا اور اگر اس کے پاس چابی ہے تو رکھی رہے۔یعنی چابی ہو اور وہ تالا ہی کوئی نہ ہو' اور تالا ہو تو آپ کہیں کہ وہ کھلتا ہی نہیں ہے تو یہ چابی کیا کرے گی۔یہ چابی پھر دین نہیں رہتی' یہ مذہب بن جاتی ہے۔پھر وہ چابی اپنی پرستش کرانے لگ جاتی ہے۔اس کو بڑا سنبھال کے رکھتے ہیں پھر اس کو وہ ریشمی رومالوں میں لپیٹ لپیٹ کر اور عطر وغیرہ سنگھا سنگھا کر اس پہ بڑی بڑی شاندار عمارتیں بناتے ہیں۔آج اسی کی پرستش ہو رہی ہے۔چابی کی پرستش ہو رہی ہے کیونکہ دروازہ کھولنا جو اس کا مصرف تھا اُس دروازے سے تو نفرت پیدا ہو گئی' اس کے قریب نہیں جانا۔

دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولیے

قرآن کہتا ہے کہ کائنات کی قوتوں کو مسخر کرنا اور مسخر کرنے کے بعد پھر انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال کرنا دین خداوندی ہے۔ لہٰذا اس چابی سے دنیا کے ہر دروازے کو کھولا جا سکتا ہے۔یہ ہے قرآن کا نسخہ کیمیا۔سو یہ کہنے کے بعد وہ ایک مہلت کے وقفے کی مثال دیتے ہوئے کہتا ہے کہ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ❷ (77:23) کائنات کی ہر شے میں ہم نے اسی قسم کے قوانین مقرر کیے ہوئے ہیں۔ اب قرآن خارجی کائنات کی طرف توجہ دلا رہا ہے۔کہتا ہے کہ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۝ اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا ❸ (77:25-26) عزیزانِ من! کیا عرض کیا جائے کہ قرآن کیا کیا الفاظ استعمال کرتا ہے۔قرآن خارجی کائنات کی طرف توجہ دلا رہا ہے۔ کہتا ہے کہ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا (77:25)۔بحث چلی ہوئی ہے کہ زمین ساکن ہے یا گھومتی ہے۔پھر ایک عرصے تک مغرب کے Scientists (سائنسدان) بھی اسی نتیجے پر رہے کہ یہ ساکن ہے' نہیں بلکہ چپٹی ہے۔گول ہونے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن ساکن تو وہ کہتے چلے آئے۔ان میں سے جس نے پہلے ❹ یہ انکشاف کیا' وہ اس نتیجے پہ پہنچا کہ یہ زمین گھومتی ہے تو اس بیچارے کو

---

❶ یہ اشارہ مفکرِ قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

❷ سو ہمارے مقرر کردہ پیمانے' نہایت عمدگی سے' اپنے نتائج مرتب کرتے رہتے ہیں۔

❸ (غور کرو کہ) زمین کو کس طرح ایسا بنا دیا کہ وہ جاندار اور بے جان اشیاء کو سمیٹتے ہوئے کس تیزی سے چل رہی ہے۔(مفہوم القرآن۔پرویزؒ۔ ص 1400)

❹ وہ گلیلیو (Galileo: 1564-1642) تھا۔اس سے پہلے نکولاس کاپرنیکس (1473-1543) نے بھی کہا تھا کہ سورج ہماری کائنات کا مرکز نہیں ہے۔ اس نے بطلیموسی نظام کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ انبیاء' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 92-91 نیز فٹ نوٹ نمبر 4,3,1 اور 5 (ص۔91)۔

انہوں نے سزائے موت دے دی تھی۔ آخری وقت پر پادری کا اسے یہ کہنا تھا کہ اب بھی کہہ دو کہ یہ ساکن ہے۔ وہ کہنے لگا: جب میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ زمین گھومتی ہے تو میں کیسے کہہ دوں کہ یہ ساکن ہے۔ ❶

ایمان کے استحکام کا ثبوت

عزیزانِ من! یہ ہے ایمان کا استحکام کیونکہ ❷ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ اس چیز کی شہادت دے رہا ہے کہ میں نے اس کو خود دیکھا ہے۔ یہ ہے شہادت! یہ وہ شہادت نہیں ہے جو آپ کو مؤذن اَشْھَدُاَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا ہے۔ یہ صرف الفاظ ہیں۔ وہ حقیقت بیان کر رہا تھا کہ جب میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ زمین گھومتی ہے تو میں کیسے کہہ دوں کہ نہیں گھومتی۔ کیا بات ہے! اور پھر ایک عرصے تک اس پہ بحثیں چھڑتی رہیں۔

مدینہ منورہ کی یونیورسٹی کے چانسلر کا فتویٰ

عزیزانِ من! وہ، جنہوں نے اس دینِ خداوندی میں تحقیق کی تھی، انکشافات کیے تھے، وہ تو پھر اس گھومنے کے بعد پتہ نہیں کہاں تک چلے گئے۔ آپ کے ہاں آج تک بھی یہ بحث چلی آ رہی ہے کہ زمین ساکن ہے، گھومتی نہیں ہے۔ مدینہ منورہ کی یونیورسٹی کے جو چانسلر ہیں، انہوں نے دو تین سال ہوئے ہیں، یہ فتویٰ دیا کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ زمین گھومتی ہے، ساکن نہیں ہے، وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے، اس کا نکاح بھی ٹوٹتا ہے۔ ''نکاح تے فوراً اتوڑ چھڈ دے نیں۔ اوایس واسطے پئی نواں بناون گے تو چار پیسے آون گے۔ گل تے اینی ہوندی اے وچ۔ پچھلا بجھا ہے، اے تے فیر کجھ دیندا ای نئیں۔ اوا کو واری دے چکا۔ فیر ہن کی کرئے۔ ❸ آج بھی آپ کے ہاں یہی ہے۔ میں نے اس لیے چھوٹی سی مثال نہیں دی۔ اس سے بڑی کوئی مثال نہیں ہے کہ مدینہ منورہ کی اسلامیہ یونیورسٹی کا جسے آپ چانسلر کہتے ہیں، وہ آج یہ فتویٰ دے رہا ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ زمین گھومتی ہے، ساکن نہیں ہے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

---

❶ Galileo`s belief that Copernicus (1473-1543) was right to claim that the Sun was the centre of our Universe led to hisp persecution by the Inquisition (1633). He ...... is said to have muttered under his breath "But it (the Earth) does move." Ref. Reader`s Digest (1990). Universal Dictonary, New Yark: The Reader`s Digest Association Limited, P. 625)

❷ گلیلیو (1473-1543) نے

❸ نکاح تو فوراً ہی توڑ دیتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ نیا نکاح پڑھائیں گے تو چار پیسے ملیں گے۔ بات تو اتنی ہی ہوتی ہے۔ پچھلا تو اب کچھ دیتا ہی نہیں۔ وہ تو ایک ہی دفعہ ''خدمت'' کر چکا، اب کیا کرے۔

زمین کے کفاتا ہونے مفہوم؟

عزیزانِ من! جب مغرب کاScientist (سائنسدان) قرآن کے الفاظ پہ غور کرتا ہے تو وجد میں آ جاتا ہے۔ کہا کہ اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ کِفَاتًا (77:25)۔ عربی زبان' قرآن کا انتخاب' کیسا عمدہ ہے! آپ سوچیں کہ ایک چیز حرکت میں ہو' تیزی سے جا رہی ہو' اس میں اس کے حرکت میں ہونے کی' تیزی سے چلی جانے کی' کوئی تو محسوس نشانی ہوتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ چیز تیزی سے اڑ رہی ہو اور اس میں اڑنے کی علامت نہ ہو۔ آپ نے پرندوں کو دیکھا ہے۔ ایک تو ان کی اڑان وہ ہوتی ہے جس میں وہ پروں کو پھڑ پھڑاتے ہیں اور ایک وہ اڑان ہوتی ہے جس میں وہ پروں کو سمیٹ لیتے ہیں' ان میں حرکت کی کوئی علامت نہیں ہوتی اور بڑی تیزی سے فضا میں تیر رہے ہوتے ہیں' وہ اڑ رہے ہوتے ہیں۔ کبوتروں میں عام طور پر یہ چیز پائی جاتی ہے۔ وہ پر سمیٹ کر پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے اڑتا ہے۔ پر کی پھڑ پھڑاہٹ نظر نہیں آتی' مگر وہ اڑ رہا ہوتا ہے۔ یہ معنی ہیں کفات کے۔ اس آیت (77:25) میں کہا ہے کہ کبھی تم نے زمین پر غور کیا ہے کہ وہ کس تیزی سے حرکت کرتی ہے اور اس حرکت کا تمہیں احساس تک بھی نہیں ہوتا' جیسے وہ پرندہ جو پر سمیٹ کر اڑ رہا ہوتا ہے۔ یوں سمجھو کہ یہ زمین پر سمیٹ کر اڑنے والا پرندہ ہے اور اپنے ساتھ اَحۡیَآءً وَّ اَمۡوَاتًا (77:26) جاندار اور بے جان تمام چیزوں کو' اپنے اندر سمیٹے ہوئے' اپنی گود میں' آغوش میں لیے ہوئے' اس تیزی سے حرکت کر رہا ہے اور اس حالت میں زمین کی کیفیت یہ ہے کہ بج رہی ہے اور بے آواز ہے' اڑ رہی ہے' مگر اس کے اڑنے کی' کوئی علامت نہیں ہے۔ اب تو ہوائی جہاز بھی ایسے ہیں کہ جن کے پنکھے بھی نظر نہیں آتے اور اڑ رہے ہوتے ہیں' پھر بھی آواز تو آتی ہے۔ یہ کچھ اس کی وہ اڑان ہے کہ جس میں پروں کو سمیٹے ہوئے نہایت خاموشی سے فضا کے اندر اڑتی چلی جاتی ہے اور اپنے آغوش میں جاندار اور بے جان اشیائے کائنات کو لیا ہوا ہوتا ہے۔

اسی معنی میں ایک دوسرا لفظ ہے۔ وہ لفظ تین جگہ آیا ہے۔ یہ جامع لفظ قرآن نے دیا ہے۔ ایک جگہ ہے کہ وَ اَلۡقٰی فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِکُمۡ ❶ (16:15)۔ قرآن نے دو جگہ اور بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے: دوسری جگہ ہے کہ اَنۡ تَمِیۡدَ بِکُمۡ (31:10) اور تیسری جگہ ہے: اَنۡ تَمِیۡدَ بِہِمۡ (21:31)۔ ''تمید'' کے معنی یہ ہوتے ہیں ''کسی چیز کو اپنے ساتھ لیے ہوئے' تیزی سے حرکت میں جانا۔'' کیا لفظ ہے! یہ زمین' اس کرہ ارض کی پوری آبادی' انسان ہی نہیں ہیں' باقی بھی ساری جتنی چیزیں اس زمین کے اوپر ہیں' وہ ان سب کو لیے اس تیزی سے گھوم رہی ہے' چکر کاٹ رہی ہے' گولائی میں گھوم رہی ہے' کہ کسی کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ جو سطحی طور پہ بحث کرنے والے ہوتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! اگر یہ گول ہے اور گھوم بھی رہی ہے تو پھر جب ہم نیچے کی طرف جاتے ہیں ''تے اسی تھلے کیوں نئیں ڈگ پیندے۔''❷ ان کے ذہن میں یہ بات آتی ہے۔ تَمِیۡدَ بِکُمۡ (31:10)۔ کیا لفظ ہے قرآن

---

❶ اور اس نے زمین کو ایسا بنا دیا ہے کہ تم اس پر آرام وسکون سے بیٹھے رہو اور وہ تمہیں لے کر گھومتی ہے اور اس میں پہاڑ پیدا کر دیئے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ۔ ص596)

❷ ہم نیچے کیوں نہیں گر پڑتے۔

کا! گھوم رہی ہے' اتنا کچھ اپنی گود میں لیے ہوئے چل رہی ہے اور تمہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ چل رہی ہے۔ کہا کہ یہ خدا کی کتنی بڑی رحمت ہے۔ اگر اس کی گردش اور حرکت جو تیزی سے چکر کاٹ رہی ہے اور انسان دو تین چکر کاٹے تو بے حوصلہ ہو کر گر پڑے مگر یہاں ساری زندگی چکر میں گزر جاتی ہے' بلکہ گھن چکر میں گزر جاتی ہے' احساس تک نہیں ہونے پاتا۔

فضائی کروں کے باہمی تعلقات

عزیزانِ من! کیا نظام ہے! اور پھر اس گردش کے ساتھ جو اور چیزیں متعلق ہیں' اُن کا تو پوچھو نہیں۔ اس کرّہ ارض کی' ساری فضا کی' باقی کرّوں کے ساتھ' آپس میں' تعلقات کی' تو ایک دنیا ہی الگ ہے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ یہاں لفظ آیا ہے: **کِفَاتًا** (77:25)۔ یہ پرندے کی وہ تیز اڑان ہے جس میں وہ پروں کو سمٹا لیتا ہے' اور محسوس نہیں ہونے پاتا اور اگلی ہی آیت میں کہا کہ **وَجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّ اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا** ❶ (77:27)۔ اس آیت میں پھر ''رواسی'' کا لفظ ہے۔ ویسے یہ بڑے بڑے پہاڑوں کو کہتے ہیں لیکن اس میں وہ جو زمین کی حرکت' اس کا تیرنا ہے' اس کی رعایت سے ''رواسی'' کا یہ لفظ ہے۔ یہ جو جہاز کا لنگر ہوتا ہے کہ جس میں پھر وہ جہاز موجوں کی نذر نہیں ہو جاتا' محفوظ رہتا ہے اس کے لیے بھی ''رواسی'' کا یہ لفظ ہے۔ یہ جو **مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا** (11:41) قرآن میں آیا ہے یہ لنگر انداز ہو جانا ہے۔

زمین پر پہاڑوں کے متعلق تحقیق

یہ جو زمین میں پہاڑوں کے متعلق حصہ ہے جسے جیالوجی کہتے ہیں' جس میں منرالوجی بھی ہے اس پہ بڑی تحقیق ہو رہی ہے لیکن ابھی یہ تحقیق ابتداء ہی میں ہے۔ یہ جو ان کا علم ہے کہ ان پہاڑوں کا کیا فنکشن ہے' اس زمین یعنی کرہ ارض کی اس حرکت اور گردش کے مطابق بڑی تحقیق ہو رہی ہے۔ بہر حال کوئی دن آئے گا کہ ان الفاظ کے بھی معنی سامنے آئیں گے۔ اتنے اتنے بڑے پہاڑ ہیں کہ رواسی کے اندر ایک لنگر کا لفظ آیا ہوا ہے' ممکن ہے کہ یہ لوگ جو ریسرچ کر رہے ہیں' ہمیں نہیں ہم تو ثواب کی خاطر پڑھتے ہیں' وہ حقائق کی خاطر پڑھتے ہیں' ممکن ہے کہ وہ اس سے کسی نتیجے پہ پہنچ جائیں۔

چٹانوں سے پانی کی مثال

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ تم یہ چٹانیں دیکھو' سخت پکی ہوئی چٹانیں ہیں۔ ان میں رطوبت کا نام نہیں اور ان کے اندر سے

---

❶ اور اس میں ایک طرف اتنے اتنے اونچے پہاڑ ہیں جو اپنے مقام پہ محکم کھڑے ہیں۔ دوسری طرف اسی میں سے پانی کے شیریں اور خوشگوار چشمے نکال دیئے جو مسلسل بہتے رہتے ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ ص 1400)

شیریں، ٹھنڈے پانی کے چشمے نکل رہے ہیں۔ دیکھتے ہو ہمارا قانون کس طرح کارفرما ہے۔ دیکھو یہ سب کچھ کس طرح ہمارے لگے بندھے قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔ اسی طرح مکافاتِ عمل کا قانون بھی ہے۔ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ❶ (77:28)

کائناتی قرآن کو جھٹلانے والوں کے لیے تباہی ہے

عزیزانِ من! وہ جو میں نے کہا تھا کہ جھٹلانے والوں کے لیے تباہی ہے تو اب اگر دین کا یہ حصہ آپ لیں جو کائنات سے متعلق ہے تو اس کے جھٹلانے والوں کے لیے بھی تباہی ہے جو آج بھی یہ کہتا ہے کہ زمین حرکت نہیں کرتی لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ حرکت کرتی ہے تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے دین سے منکر ہے۔ اب آیا وہ انسانیت کی زندگی تک۔ کتنی مثالیں دینے کے بعد پھر اس نے یہ کہا کہ یاد رکھو! جن چیزوں کی تم تکذیب کرتے ہو تباہی اس کا فطری نتیجہ ہے۔ عزیزانِ من! ایک تکذیب یہ بھی ہے کہ مہلت کے وقفے میں یہ کہو کہ نہیں صاحب! کہاں کا خدا اور کہاں کا اس کا انصاف! ظالم ظلم کیے چلا جا رہا ہے اس کا کچھ بگڑتا ہی نہیں ہے۔ مظلوم پستے چلے جا رہے ہیں، ان کی کوئی مدد ہی نہیں کرتا۔ تو اس کے اندر انسانوں کی دنیا آ گئی۔ وہ کہا یہ ہے کہ دین کی تکذیب کرنے والا، خواہ سرکشی میں کرے یا ناامیدی میں کرے، نتیجہ تو جہالت کا ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ بھگتنے کے لیے یہ لفظ ہے: اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰى مَا كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ❷ (77:29) جن حقائق کو تم جھٹلاتے تھے اس جھٹلانے کا نتیجہ بھگتنے کے لیے یہ لفظ آیا ہے: اِنۡطَلِقُوۡۤا (77:29)

انسان خود مصیبت کی طرف جاتا ہے مصیبت نہیں جاتی

عزیزانِ من! اس اِنۡطَلِقُوۡۤا (77:29) میں بڑا عجیب فلسفہ آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مصیبت انسان کی طرف نہیں آتی ہے بلکہ انسان خود اس کی طرف جاتا ہے۔ ''طلق'' یہ ہوتا ہے: آزادی سے کسی چیز کی طرف بھاگے ہوئے جانا۔ یہاں کہا ہے کہ یہ پھر اس ہلاکت کی طرف بھاگے ہوئے چلے جاتے ہیں اور پھر لپک کر، دوڑ کر، بھاگ کر، تباہی کی طرف آؤ جو تمہاری اس تکذیب کا فطری نتیجہ ہے یعنی اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰى ظِلٍّ ذِىۡ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ لَّا ظَلِيۡلٍ وَّلَا يُغۡنِىۡ مِنَ اللَّهَبِ ۝ اِنَّهَا تَرۡمِىۡ بِشَرَرٍ كَالۡقَصۡرِ ۝ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفۡرٌ ۝ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ❸ (77:30-34)

---

❶ جو لوگ قانونِ مکافاتِ عمل کی تکذیب کرتے ہیں، ان کے لیے تباہی ہے۔

❷ جب ظہورِ نتائج کا وقت آئے گا تو اُن سے کہا جائے گا کہ تم اُس تباہی کی طرف چلو جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔

❸ آتشیں دھوئیں کے اس سائبان کی طرف چلو جس کی تین بڑی بڑی شاخیں ہیں۔ (ایک شاخ سر کے اوپر چھائی ہوئی ہے اور دو انسانوں کو آگے اور پیچھے سے گھیرے ہوئے۔) وہ سائبان تو ہے لیکن ایسا نہیں جو دھوپ یا شعلوں کی تپش سے بچا سکے۔ شعلوں کی تپش سے بچانا تو ایک طرف، وہ خود بڑے بڑے گٹھوں جیسے شعلے پھینکتا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے گویا وہ شعلے نہیں بڑے بڑے زرد اونٹ ہیں۔ سوچو کہ اس دن ان تکذیب کرنے والوں کے لیے کس قدر تباہی ہوگی۔

(۱۔۲۔۳، مفہوم القرآن۔ پرویز)

سائبان کی طرح محیط دھوئیں کے بادل کی کیفیت

عزیزانِ من! یہ ہلاکت آمیز جو عذاب کی شکلیں ہیں ان کو کچھ مثالوں میں بیان کیا ہے۔ وہ دھوئیں کا اس قسم کا سائبان سایہ تو نظر آتا ہے لیکن اس سائے میں نہ ٹھنڈک ہوتی ہے نہ سکون ہوتا ہے اس میں بھی بڑی تپش ہوتی ہے اس میں انسان کا دم گھٹ جاتا ہے۔ اسے **ثَلٰثِ شُعَبٍ** (77:30) کہا ہے یعنی تین طرف سے گھیرنے والا: دائیں سے بائیں سے اوپر سے یعنی جس کو ہم ہر طرف سے کہتے ہیں: محیط گھیر لینے والا عذاب۔ اس قسم کا عذاب آئے گا۔ اس میں بظاہر سائبان ہوگا' ٹھنڈک نہیں ہوگی۔ آپ کو معلوم ہے کبھی کبھی ایک آندھی آیا کرتی ہے۔ یہاں بھی وہ آسمان پہ چھا جایا کرتی ہے۔ سرخ رنگ کی دھوپ تو اس سے گزر کر نیچے نہیں آتی لیکن خود اس کی تپش اتنی ہوتی ہے کہ انسان دعائیں مانگتا ہے کہ یا اللہ! اس سے تو وہ دھوپ اچھی ہے۔ وہ آندھی دو تین دن رہا کرتی ہے اور اس میں صرف چھوٹے چھوٹے ریت کے یا کسی چیز کے ذرے نیچے گرا کرتے ہیں۔ اس قسم کا بڑا سخت عذاب ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کا سائبان کہ جو سایہ ایسا نہ دے کہ جس میں ٹھنڈک ہو دھوپ کو روک لے لیکن اس کی اپنی تپش اتنی ہو کہ تمہیں جھلسا کے رکھ دے۔

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ آخرت کی زندگی میں یہ شکلیں کس طرح کی ہونگی' ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے۔ قرآن نے اسی لیے کہا ہے کہ ہم ان کو مثالوں کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔ یہ اس کی مثالیں ہیں لیکن اس زندگی میں جو دین کا حصہ ہے اس سے انکار اور سرکشی کا نتیجہ تو محسوس شکل میں اسی دنیا میں سامنے آجاتا ہے۔ اس قسم کے دھوئیں اور اس قسم کے عذاب تو اب روز دیکھی بات ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہاں ہم ان کو یوں خود دیکھیں۔ ٹیلیویژن پہ تو ہمیں روز نظر آرہے ہوتے ہیں کہ وہ کیا عذاب ہے جو انسانیت کے اوپر طاری رہتا ہے۔ اس انسانیت پر جس نے دین کے ایک حصے کو تو یہاں تک پہنچایا' دوسرے حصے سے اتنا انکار کیا کہ وہ اقدارِ خداوندی کو مانتے بھی نہیں ہیں۔ کہا کہ اس قسم کے جو بڑے بڑے یہ دو الفاظ ہیں' قصر لکڑی کے بڑے بڑے گٹھے بھی ہوتے ہیں' ان کے معنی بڑے بڑے مکان بھی ہوتے ہیں' ایسے جس طرح سے کہ وہ زرد رنگ کے اونٹ ہوں یعنی عذاب کی شدت کو بتانے کے لیے شعلوں کی مثالیں دی ہوئی ہیں۔ ان کے لیے کہا کہ **وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ** [1] (77:34)۔ یہ پھر اسی فقرے کی بار بار Repitition ہو رہی ہے۔ اگلی ہی آیت میں کہا کہ **هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ** [2] (77:35) اس دن ضرورت ہی نہیں ہوگی کہ ان سے کچھ پوچھا جائے کہ تم نے یہ کیا تھا یا نہیں۔ یہ قرآن کے اندر آچکا ہوا ہے کہ ہر چیز مجرمین کے ماتھے پہ لکھی ہوئی ہوگی۔ اعمالنامہ ان کی گردن میں لٹکا ہوا ہوگا' اسے کھول دیا جائے گا۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ ہر چیز یہاں تک کہ جو سینے میں چھپے ہوئے راز ہیں' وہ بھی عیاں

---

1. اُس دن اِن تکذیب کرنے والوں کے لیے بڑی تباہی ہے۔
2. اس دن اس کی بھی ضرورت نہیں ہوگی کہ ملزم اپنی زبان سے اقرار جرم کرے تو اسے مجرم قرار دیا جائے۔ (۱-۲، مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہوجائیں گے: وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ [1] (77:36) اوراس کی بھی وہاں اجازت نہیں ہوگی کہ وہ کچھ کسی قسم کا عذر یا جسے ہم معذرت کہتے ہیں، بھی پیش کرسکیں۔ اس کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ اگر معذرت والی بات ہوتو خدا کا انصاف کیا ہوا۔ وہ تو سب کچھ طے ہونے کے بعد نتیجے پہ پہنچتے ہیں۔ یہ سارے معاملات یا سارے مقامات جتنے بھی توبہ کے، معذرت کے، ہیں یہ سارے مراحل جو ہیں، وہ اس سے آگے چلا جاتا ہے۔ پھر خدا کا عذاب آتا ہے۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (77:37) اس دن ان تکذیب کرنے والوں کے لیے بڑی تباہی ہوگی۔

عزیزانِ من! آج وقت ہوگیا۔ ہم سورۃ المرسلٰت کی آیت 37 تک آگئے۔ اگرچہ اس سورۃ کی چند ہی آیات باقی ہیں لیکن بہرحال وہ ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

---

[1] نہ ہی انہیں اس کی اجازت ہوگی کہ وہ کوئی عذر پیش کرسکیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تیسواں باب: سورة المرسلٰت (آیات 38 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1984 کی 11 تاریخ ہے اور درس قرآن کا آغاز سورۃ المرسلٰت کی آیت 38 سے ہو رہا ہے۔(77:38)

فیصلہ کن مرحلہ

آپ کو یاد ہوگا کہ حق و باطل کی کشمکش کا جو سلسلہ حضرتِ نوح علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوا وہ مسلسل و متواتر مختلف مراحل سے گزرتا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ ہمایوں میں پہنچا اور اس میں بھی پھر یہ آہستہ آہستہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس زندگی کے آخری دَور میں، اس مرحلے میں، اس منزل میں، آ پہنچا جسے قرآن نے اس آیت میں یہ کہا ہے کہ **هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ** (77:38) یہ فیصلہ کن مرحلہ ہے اور یہ فیصلہ کن مرحلہ بڑی چیز ہوتی ہے۔ جنگ بدر [1] کو قرآن نے یوم الفرقان کہا ہے۔ اس کے بھی یہی معنی ہیں: چھٹ کر الگ الگ ہو جانے والی بات۔ اس اعتبار سے یہ ایک کشمکش کا فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس کے بعد پھر وہاں یہ کشمکش باقی نہیں رہی تھی لیکن یہ فرقان یا فصل کے الفاظ قرآن نے اس مفہوم میں بھی استعمال کیے ہیں کہ انسانوں میں بھی امتیاز ہو جائے گا اور سب سے بڑی چیز انسانوں میں امتیاز ہونا ہے اس لیے کہ سورۃ یٰسین میں یہ کہا گیا ہے کہ **وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ** (36:59) اے مجرمو! الگ ہٹ جاؤ، الگ ہو جاؤ، شریف انسانوں سے الگ ہو جاؤ۔ یہ بہت بڑی چیز ہے جو قرآن بتا رہا ہے۔ انسانوں کی سب سے بڑی

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ حج، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص۔29 (فٹ نوٹ نمبر) نیز پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ انبیاء ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص ص۔167-166 فٹ نوٹ نمبر 1۔

مصیبت یہ ہے جو میں ابھی عرض کر رہا ہوں کہ حیوانات میں یہ پہچاننا مشکل ہی نہیں ہے کہ یہ بکری ہے یا یہ بھیڑیا ہے اس لیے کہ کوئی بکری بھیڑیئے سے دھوکا نہیں کھا سکتی یہ الگ چیز ہے کہ اس کے پاس اپنی حفاظت کا ایسا سامان نہ ہو اور وہ قابو آ جائے لیکن وہ یہ سمجھ کر دھوکا نہیں کھا سکتی کہ یہ بھیڑیا نہیں ہے' ہرن ہے۔ ہر حیوان کا امتیازی نشان مستقل ہوتا ہے۔ اس سے وہ پہچانا جاتا ہے اس لیے حیوان ایک دوسرے کے دھوکے میں نہیں آتا۔ انسان کے لیے دشواری یہ ہے کہ ہر انسان شکل' صورت' پیکر کے اعتبار سے انسان ہی ہوتا ہے' ویسے جزئیات میں فرق ہو تو اور بات ہے لیکن ہر شخص انسان ہی ہوتا ہے۔ ان میں' انسان اور انسان میں' بھیڑیئے اور بکری کا فرق نہیں ہوتا اور یہ وجہ ہے کہ ہم دھوکا کھا جاتے ہیں اور ساری مصیبتیں' ساری پریشانیاں' ساری کشمکشیں' اس دھوکے کا ہی نتیجہ ہوتی ہیں۔ ہمارے ایک دوست تھے۔ عام اصطلاح میں سمجھ لیجیے کہ زندگی میں بڑے کامیاب۔ ہم نے ان سے یہ پوچھا کہ یار! تم ہمیشہ خوش باش رہتے ہو' ہم ہمیشہ روتے ہی رہتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ بات صاف سی ہے۔ کوئی شخص جو ہمارے سامنے نیا آتا ہے' ہمارے قریب آتا ہے' ہم سمجھتے ہیں کہ بڑا فریب کار ہے اور اس سے' ہم اس کے آگے چلتے ہیں۔ اگر وہ فریب کار نکلتا ہے تو ہمیں کچھ افسوس نہیں ہوتا کہ ہم تو پہلے ہی سمجھے ہوئے تھے۔ اگر اچھا نکل آتا ہے تو پھر اس سے خوشی ہو جاتی ہے۔ تمہارے قریب جو شخص آتا ہے' تم سمجھتے ہو کہ یہ بڑا شریف النفس ہے' بڑا قابلِ اعتماد ہے۔ وہ ایسا نہیں نکلتا تو تم روتے رہتے ہو۔ عزیزانِ من! یہ جو چیز ہے کہ انسان کو اس کے حلیے سے پہچانا نہیں جا سکتا اور ہماری تو پھر ساری شاعری اسی کے اوپر ہے۔ کیا خوب کہتا ہے وہ:

زلف آوارہ' گریباں چاک' ہو مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے دردآشنا سمجھا تھا میں

یہ ہے وہ چیز' وہ فریب خوری' جو انسان کے اندر ہوتی ہے۔

انسان کی فریب خوری

یہ جو ہمارے ہاں کا معاشرہ ہے' یہ غیر قرآنی معاشرہ ہے۔ اس میں آپ انسان اور انسان کے اندر تمیز نہیں کر سکتے اور دھوکا دینے والے تو ایسا میک اپ (Make up) کرتے ہیں کہ آپ کو اس سے اصل کا پتہ ہی نہیں چل سکتا۔ آپ سوچیے کہ وہ معاشرہ کیسا جنت بدوش ہوگا کہ جس میں دوسرے انسان کو پہچان لیا جائے کہ یہ کیسا ہے: وَامۡتَازُوا الۡیَوۡمَ اَیُّھَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ (36:59) اب جنتی معاشرہ قائم ہو رہا ہے۔ اے فریب کارو! اے مجرمو! الگ ہو جاؤ' چھٹ کر الگ ہو جاؤ۔ قرآن کہتا ہے کہ یُعۡرَفُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ بِسِیۡمٰھُمۡ (55:41) اس میں تو پھر مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانا جاتا ہے' چہرے سے پہچانا جاتا ہے۔ اتنا بڑا اطمینان بخش یہ معاشرہ ہوگا کہ جس میں انسان کی یوں پہچان ہو جائے۔ یہ جو قرآن نے یَوۡمُ الۡفُرۡقَانِ (8:41) یَوۡمُ الۡفَصۡلِ (77:38) اور وَامۡتَازُوا الۡیَوۡمَ

(36:59) کا بتایا ہے' یہ انسانوں کے لیے بہت بڑی رحمت ہے لیکن کیا بتائیں ہم تو اب قرآن کی یہ آیات دیکھتے ہیں' زیادہ سے زیادہ اس کا مفہوم سمجھتے ہیں' اس جنت کی تو جھلک بھی ہمیں نظر نہیں آتی کہ جہاں دُور سے' ماتھے سے' پتہ چل جائے کہ یہ مجرم ہے یا یہ شریف انسان ہے۔ دھوکا ہی دھوکا ہے۔ اور جہنم ہوتا ہی دھوکا ہے۔ کہا کہ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَ الْاَوَّلِيْنَ (77:38) اس سے پہلے کہ جنہوں نے کشمکش کی' فریب دیا' تم جو اکٹھے ہو' سب کو الگ الگ کر کے الگ کر دیا چنانچہ آپ دیکھیں کہ قرآنِ کریم میں سب سے بڑی کشمکش منافقین کی وجہ سے تھی۔ وہ معاشرے کے اندر ملے جلے رہتے تھے۔ پہلے پہچانے نہیں جاتے تھے اور پھر اللہ تعالیٰ کا قانون بھی وہ ہے جو تبدیل ہی نہیں ہوتا۔ نبی اکرم ﷺ اور جماعتِ مومنین سے کہہ دیا کہ ہم نام لے کر نہیں بتائیں گے کہ یہ منافق ہے اور یہ مخلص ہے' تمہیں ان کی علامات سے خود پہچاننا ہوگا۔ انہیں بھی خدا نے نہیں بتایا کہ فلاں فلاں منافق ہیں۔

یہ کیفیت ابدی نہیں ہوگی

عزیزانِ من! یہ بات ابدی طور پہ نہیں رہے گی۔ اسی معاشرے کے اندر ایسا وقت آئے گا کہ منافقوں سے تمہارا یہ معاشرہ پاک ہو جائے گا یا تو وہ مخلص مومن ہوں گے یا ان کو الگ کر دیا جائے گا۔ یہ ہے وہ معاشرہ' یہ ہے وہ امت' جو پھر اس کے بعد اُن سے عبارت ہوگئی جن سے دھوکا کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ یوم الفصل تھا۔ یوم الفرقان تھا' یہ امتیازی نشان تھا' یعنی یہ ماتھے سے پہچانے جانے والی بات تھی۔

عزیزانِ من! آگے پھر وہی بات آگئی' جو میں کہا کرتا ہوں کہ یہ سارے معاملات اِس دنیا کی کشمکش کے ہیں۔ قیامت میں جو کچھ ہوگا وہ وہاں جا کر دیکھا جائے گا۔ اس پر تو ہمارا ایمان ہے۔ اسے ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے کہ وہ کیا ہے اور اس کا تعلق بھی نہیں ہے۔ سمجھ کر ہم کیا کر لیں گے۔ وہاں کی جو بات ہوگی وہ تو اٹل ہوگی۔ وہاں تو جا کر نہ توبہ ہوگی' نہ اعمال کی گنجائش ہوگی' نہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی آسکے گی' جو وزن ہوگا اس کے مطابق پرچی مل جائے گی۔ یہ تو اسی دنیا میں ہے کہ پہلے سے یہ چیزیں بتا دی جائیں تو اصلاح کر لی جائے' کوئی ازالہ کی صورت پیدا کر لی جائے' کوئی تدبیر پیدا کر لی جائے۔ اب یہ دیکھیے کہ کہا گیا ہے کہ آج ہم نے تم سب کو اکٹھا کر دیا: فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ (77:39) اگر تمہارے پاس سازش کی کوئی بات ہے جیسا تم پہلے خفیہ تدبیریں کیا کرتے تھے' اگر اب بھی کوئی اور سازش باقی ہے تو وہ بھی کر دیکھو تو یہ یہیں کی بات ہے' ورنہ قیامت میں ان سے یہ کہنا کہ اور کوئی تدبیر تمہارے پاس باقی ہے تو وہ بھی کر دیکھو تو وہ تو بات ہی نہیں ہے۔ وہاں کیا تدبیریں کریں گے۔

عزیزانِ من! ہم قرآنِ کریم کے آخری مراحل میں آ رہے ہیں۔ زندگی کا پتہ نہیں۔ آپ ان چیزوں کو ذہن میں رکھیے کہ یہ چیزیں اس دنیا کی کشمکش کے متعلق ہیں اور پھر کہا ہے کہ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (77:40) وہ جو تم تکذیب کیا کرتے تھے' جھٹلایا کرتے

تھے کہ نہیں صاحب! ہماری اس قسم کی روش کا نتیجہ تباہی کیسے ہوسکتا ہے' ہم اس کو نہیں مانتے' اسکو جھٹلایا کرتے تھے' آج تم نے دیکھ لیا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ آج تباہی تمہارے سامنے آ گئی۔

متقین کا گروہ

عزیزانِ من! اب اس گروہ کے مقابل میں قرآن نے ایک دوسرے گروہ کی بات کی کہ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ وَّ عُیُوْنٍ o وَ فَوَاکِہَ مِمَّا یَشْتَھُوْنَ ❶ (77:41-42) یہ دوسرا گروہ متقین کا ہے۔ یہ قرآن کی بڑی جامع اصطلاح ہے۔ اس کا مفہوم ہے: زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ اور بچ کر چلنے والے۔ محفوظ طریق تو وہی ہے جو قرآن نے صراطِ مستقیم بتایا ہے' جنہیں وہ متقین کہتا ہے' یہی مومنین ہیں' یہی متقین ہیں۔ اس کی اصطلاحات مختلف ہیں۔ یہ جو متقین ہیں اب وہ جنت کیطرف آئے' یہ وہی تشبیہات ہیں جو قرآن نے کہا ہے کہ جنت کا ذکر تمثیلی انداز سے کیا گیا ہے لیکن اِن لوگوں کو جو جنت یہاں ملی تھی اس میں تو یہ چیزیں محسوس طور پر سامنے آ ئیں تھیں۔ عربوں کے لیے سایہ اور شیریں ٹھنڈے پانی کے چشمے سے بڑی جنت ہی کوئی نہیں ہے۔ جنت کے معنی ہی باغ تھے' باغ جن کے نیچے پانی کی نالیاں بہہ رہی ہوں' گھنے سائے' شیریں جھکے ہوئے پھل ہر ایک کی دسترس میں۔ جنت یہ چیز تھی جو ان لوگوں کو ملی جن کے ہاں آج بھی آپ جا کر دیکھیے تو مکہ معظّمہ اور اس کے گرد ایک درخت نظر نہیں آئے گا' گھاس کی پتی نظر نہیں آئے گی۔ یہ وادی غیر ذی زرع' جو پہلے دن سے تھی آج بھی وہی کچھ ہے۔ وہاں انہیں پھر ایسی زمینیں ملیں کہ پوچھیے نہیں کہ پھر ان کی خوشگواریوں کی کیا کیفیت تھی: ظِلٰلٍ وَّ عُیُوْنٍ ❷ (77:41)۔ عزیزانِ من! میں پھر عرض کردوں کہ اگر یہ معاشرہ متقین کا ہوجائے تو یہی دنیا' یہی ارض' جنت بن سکتی ہے۔ آپ سوچیے کہ ایک معاشرہ ہے جس میں آپ کسی اجنبی سے ملیں تو آپ اس سے کہیں کہ السلام علیکم یعنی میں تمہاری سلامتی کا خواہاں ہوں اور یہ منافقت سے نہ ہو یقینی طور پر اسے معلوم ہو' وہ اس پر اعتماد کرے' قابلِ اعتماد ہو' جاننے والا ہی نہیں ہر اجنبی سے بھی یہ کہا جائے اور وہ اس کے مقابل سے کہے وعلیکم السلام یعنی میں بھی تمہاری سلامتی کا خواہاں ہوں۔ دو ملنے والے ایک دوسرے کو اعتماد میں لے رہے ہیں کہ میں تمہاری سلامتی کا خواہاں ہوں' آپس میں رابطے کی کیفیت یہ ہو کہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ (59:9) یہ خود تنگی ترشی میں گزارہ کرلے گا۔ اس کی ضرورت کو مقدم سمجھے گا۔ وہ کیسا خوش کن جنت بداماں معاشرہ ہوگا!

جنت ارضی کی خصوصیات

عزیزانِ من! قرآن میں جنتیوں کے متعلق خصوصیت یہ ہے کہ کسی کے دل میں کوئی ایسی بات چھپی ہوئی نہیں ہوگی جو وہ دوسرے سے چھپا کر رکھنا چاہے۔ اللہ اکبر! یہ تو معاشرے کا ذکر کررہا ہوں۔ کبھی خوش قسمتی سے زندگی میں رفاقت کے لیے کوئی ایک انسان ایسا مل

---

❶ وہ لوگ جو قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے تھے' ایسے باغات کے سائے میں ہوں گے جن کے نیچے چشمے رواں ہوں گے اور ان کے حسب پسند میوے۔

❷ باغات کے سائے اور رواں چشمے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ' ص 1402)

جائے جس میں یہ خصوصیات ہوں تو دونوں میں جنت پیدا ہو جاتی ہے اور جنتی مومنین کی خصوصیات ہیں' ان کو آپ دیکھیے کہ معاشرہ ان لوگوں پر مشتمل ہو جن میں وہ خصوصیات ہوں تو وہ جنت بن جائے گا اور پھر قرآن نے تو مختلف مقامات میں یہ کچھ بھی بتا دیا ہے کہ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (3:132) جنت ارض و سما پہ محیط ہے۔ آپ سمٰوٰت کا ترجمہ بلندیاں کر لیجیے تو ارض تو یہی زمین ہے۔ یہ زمین اور یہ سماوی کرّے' بلندیاں' جو کچھ بھی ہے' وہ سارے اس جنت کے احاطے کے اندر ہیں۔ تو آپ ارض کو لے لیجیے۔ ارض میں جنت بننے کے متعلق تو قرآن کہتا ہے۔ جب اس کی وسعت بتا رہا ہے کہ اس کے اندر ارض بھی ہے تو یہاں جنت بنے گی۔ ایک اور مقام پہ اس سے بھی زیادہ متقین کا ذکر ہے۔ یہ (50:31) ہے۔ یہ بڑی عجیب آیت ہے بلکہ یہاں دو تین آیتیں مسلسل آتی ہیں۔ جنت کے متعلق ہے کہ وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (50:31) متقین کا معاشرہ ہوگا تو ہم جنت کو ان کے پاس کھینچ کر لے آئیں گے۔ اس جنت میں اور ان میں کوئی دُوری نہیں رہے گی۔ اگر یہ معاشرہ' جنتی نہیں بن جائے گا' اور ان متقین کی وجہ سے یہ ارض جنت نہیں بنے گی تو پھر اس کے کیا معنی ہیں' کہ جنت متقین کے قریب تر کر دی جائے گی' اس میں بعید بُعد نہیں رہے گا۔ وہ جو تصور تھا کہ جنت' قیامت یا مرنے کے بعد ہی جا کر ملے گی تو اس بُعد کا کہنا کیا تھا کیونکہ یہاں تو وہ جنت کسی کو ملے گی ہی نہیں:

زاہد نہ خود پیو' نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

یہاں کہا ہے کہ بُعد نہیں ہے: اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ o هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ ❶ (50:31-32)۔

معاشرتی جہنم

عزیزانِ من! قرآن اس آیت میں ''ھٰذا'' کہہ کر تو یوں بتا رہا ہے۔ اب ہمارے ہاں چونکہ اس کا تصور ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ سارا کچھ یوں ہوگا کہ یہاں اللہ میاں ان سے کہے گا۔ تصور یہ قائم تھا کہ یہاں نہیں کہے گا۔ یہاں وہ جنت قریب نہیں آئے گی۔ ٹھیک ہے' ہم لوگ بھی سچے ہیں اہلِ جہنم کو کس طرح یہ احساس دلا دیا جائے کہ جنت تمہارے قریب آ سکے گی۔ باقی دنیا کو چھوڑ دیجیے کہ ان کے ہاں کیا ہے۔ ہم جو لوگ ان چیزوں کو پڑھنے والے' دیکھنے والے ہیں' ہزار برس سے جہنم کی زندگی کے اندر مسلسل چلے آ رہے ہیں اور اس طرح سے قرآن نے کہا ہے کہ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (2:167) وہ جہنم سے نکل نہیں سکیں گے۔ قرآن میں ہے کہ جب کبھی کوئی کوشش بھی کرے گا کہ اس سے نکل جائے' دھکا دے کر وہیں ڈال دیا جائے گا' اسے اس جہنم سے نکلنے کی گنجائش نہیں ہوگی۔ جو قوم ہزار برس سے اسطرح جہنم میں ہے وہ یہاں کی زندگی کی جنت کے متعلق کیا سمجھے اور کیا اعتبار کرلے! متقین کا ہی لفظ ہے کہ جنت کو ان متقین

---

❶ جنت کو متقیوں کے بالکل قریب کر دیا جائے گا......وہ اُن سے دُور نہیں رہے گی۔ ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ جنت ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔
(مفہوم القرآن۔ پرویزؒ۔ ص1216)

کے معاشرے کے قریب لایا جائے گا اور بُعد نہیں رہے گا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہے گا۔ جنت کی سب سے بڑی خصوصیت کیا بتائی؟ کہا کہ وَ فَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ (77:42)۔اس کا لفظی ترجمہ تو یہی ہے کہ ''وہ پھل جنہیں وہ پسند کریں۔'' اس کے فوراً ہی بعد کہا کہ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا (77:43) کھاؤ پیؤ نہایت خوشی سے۔

جنت کی خاص نشانی

بظاہر تو یہ بات' عزیزانِ من! اتنی ہے کہ مختلف قسم کے پھل ہیں' ان میں سے جو پسند کرو' کھالو' لیکن یہ تو بڑی دُور کی بات ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔ خدا کی ساری مخلوق میں ایک انسان کو شرف حاصل ہے اور وہ ہے اختیار و ارادہ کی آزادی۔ اب آپ کی نگاہ ادھر جاسکے گی جب میں کہونگا کہ Choice (اختیار) دیا۔ یہ بات مِمَّا يَشْتَهُوْنَ (77:42) میں آ گئی۔ بات Choice (اختیار) کی ہے۔ Choice (اختیار) ہی تو آزادی کا نام ہے' انتخاب کا ہی تو نام آزادی ہے۔ آپ کے اختیار کا استعمال ہو' اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو اسی کو تو آزادی کہا جاتا ہے۔ یہی شرفِ انسانیت ہے۔ قرآن جہاں جہاں اس قسم کے الفاظ لاتا ہے' درحقیقت اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ جو ہم نے تمہیں اختیار و ارادے کی قوت عطا کی تھی' اس کو Exercise (استعمال) کرنے کے لیے پورا معاشرہ وہ ہوگا۔ اس میں تمہیں پوری آزادی حاصل ہوگی۔ کس قسم کی آزادی ہوگی؟ عزیزانِ من! یہ چیزیں کئی دفعہ آ چکی ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (41:30-31) جن لوگوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر استقامت سے' جم کر' کھڑے ہوگئے ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہے' نہ ہی افسردہ خاطری۔ وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ (41:30) ملائکہ ان کو جنت کی بشارت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نَحْنُ اَوْلِيٰٓـؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ (41:31) ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے اس لیے تمہیں یہ جنتی زندگی' اس دنیا میں بھی نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی۔ مزید کہا کہ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِىْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (41:31) اس جنتی زندگی میں جو چاہو گے ہوگا' جو مانگو گے ملے گا۔ یہ ہے شرفِ انسانیت کی آزادی: جو چاہو گے وہ ہوگا۔ کیا بات ہے جو مانگو گے وہ ملے گا! تو اس سلسلہ میں انسان کی آزادی صرف چند ایک پھلوں تک ہی محدود ہو کر نہیں رہ جائے گی بلکہ خدا نے انسان کو جو اختیار و ارادہ کی صلاحیتوں اور قدرتوں سے نواز رکھا ہے معاشرے میں وہ آزادی پوری برقرار رہے گی۔ اس کے برعکس جہنم میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہاں آزادی کا سوال ہی نہیں ہوتا' وہاں چوائس ہی نہیں' اس کے اندر Two Possibilities (دو امکانات) ہی نہیں ہیں' دو ممکنات نہیں ہیں۔ آگ میں دو ممکنات نہیں ہیں۔ اور پھر جہنم کا داروغہ مالک کہلاتا ہے یعنی ماسٹر (آقا) باقی تو Slaves (غلام) ہوتے ہیں۔ اس کے اندر طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ (73:13) کھانے کے لیے جو کچھ ملتا بھی ہے وہ حلق میں اٹک جائے' نہ

نگلے بنے، نہ اگلے بنے۔ تو سوال ہی نہیں کہ وہاں کوئی چوائس ہو وہاں تو ایسی چیز ہی نہیں ہوگی۔ کہا جائے گا ''ذُق'' (44:49) اس کا مزہ چکھ۔ وہ ایسے ہوگا جیسے اِدھر اُدھر سے پکڑ کر اس کے اندر ٹھونس رہے ہوں۔ اس سے کہا جائے گا کہ **اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡکَرِیۡمُ** (44:49) تو بہت بڑا معزز، باکرامت بنا پھرتا تھا، وہاں پھنے خاں بنا پھرتا تھا، اب اسے کھاؤ۔

جہنمی معاشرہ میں چوائس نہیں ہوتا

عزیزانِ من! کہا ہے کہ ذُق (44:49) اب نگلو اسے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں کیا چیز ہے جو سلب ہوئی ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ وہ کھانا کس قسم کا ہے۔ اپنی آزادی سے وہی دال روٹی جو یہاں ملتی ہے اور جو جیل میں ملتی ہے تو دونوں صورتوں میں کتنا فرق ہو جاتا ہے؟ دال روٹی تو شاید وہی ہوتی ہے۔ یہ ہے جہنم۔ اور جنت کی بنیادی خصوصیت وہ ہے جس میں وہ چوائس قائم رہے، جس میں انسان کا اختیار و ارادہ باقی رہے۔ جہنم وہ ہے جس میں یہ چیز سلب کر لی جائے۔ وہاں تو یہ چیز تھی کہ جو چاہو وہ ہوگا جو مانگو گے ملے گا اور جہنم کے متعلق بھی کسی نے یہ کہا کہ

بے نیازی کے تری ناز اٹھائے کیا کیا
جو نہ چاہا وہ ہوا اور جو چاہا نہ ہوا
مبداءِ فیض سے بس اتنا گلہ ہے مجھ کو
جو نہ مانگا وہ ملا اور جو مانگا نہ ملا

یہ ہے جہنم اور یہ ہے محکومیت کی زندگی۔ کہنے کو تو میں اس سے پہلے بھی بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ جنت اور جہنم کے متعلق بات سامنے آ گئی تو اقبالؒ (1938-1877ء) کے دو تین شعر ہی سہی: [1]

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سَیر ہیں محکوم کے اوقات!
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت

یہ **خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا** ہے۔ [2]

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات

---

[1] یہ اشعار ''ہندی مکتب'' کے عنوان سے ''ضربِ کلیم'' میں درج ہیں۔ [2] وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

آزاد کی پہچان کیا ہے؟ چوائس یعنی اختیار وارادہ۔ ایک اور نظم یاد آ گئی۔ مفکر قرآن اقبالؒ (1938-1877ء) کی۔ یہ ارمغانِ حجاز میرے سامنے ہے۔ اس کے آخر میں اکٹھی تین چار نظمیں محکوم کے متعلق ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے ❶ کہ جب محکوم کی لاش کو قبر میں اتارا گیا تو اس قبر نے محکوم کی لاش سے یہ کہا کہ:

آہ' ظالم! تُو جہاں میں بندۂِ محکوم تھا
میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک

مجھے یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ میری مٹی سے یہ آگ کیوں نکلنے لگی۔ پتہ چلا کہ تو بندہ محکوم تھا جو یہاں دفن کیا جا رہا ہے۔

تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر
تیری میت سے زمین کا پردۂ ناموس چاک

کیا بات ہے اس شخص کی کیا کہہ جاتا ہے!

الحذر' محکوم کی میت سے سو بار الحذر
اے سرافیل !اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک!

الحذر محکوم کی میت سے سو بار الحذر۔ یہ جہنم ہے۔ اس میں چوائس (اختیار وارادہ) نہیں ہے اس میں مَا يَشْتَهُوْنَ ❷ (77:42) نہیں ہے کیونکہ جو کہا جائے گا' کرنا ہوگا' جو دیا جائے گا کھانا ہوگا۔ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں یہ کہا ہے کہ جہنمی معاشرے کے اندر یہ کیفیت ہوگی۔ عزیزانِ من! اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی بنیادی خصوصیت ہے: مَا يَشْتَهُوْنَ (77:42) جو ان کے حسب پسند ہوں۔ اور آگے بڑھیے اور جو کچھ جنت میں دیا جا رہا ہے' اس کی ذرا تفصیلات پڑھیے۔ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ❸ (50:35) عزیزانِ من! یہ ''یشآءون'' کا لفظ قرآن میں خدا کے لیے آتا ہے۔ یہ وہی ہے جسے مشیت کہتے ہیں۔ ''مایشآءون'' آیا ہے کہ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا (50:35) جو ان کی مشیت ہوگی اس کے مطابق ان کو' یعنی اس سے آگے تو ہمارا تصور ہی نہیں جا سکتا: جو

---

❶ اس نظم کا نام ''قبر (اپنے مردے سے)'' ہے۔ ❷ ان کے حسب منشا' حسب پسند۔

❸ ان کے لیے اس جنت میں وہ سب کچھ ہوگا جس کی وہ آرزو کریں گے...... بلکہ ان کی آرزوؤں سے بھی کہیں زیادہ۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

چاہو گے ہوگا' جو مانگو گے ملے گا' جو تمہاری مشیت میں ہوگا وہ کچھ ہوگا' اور اس کے آگے کہا ہے کہ **وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ** (50:35) ہمارے ہاں ان کے لیے اس سے بھی زیادہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ! اللہ اکبر! کیا بات کر دی!

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر ❶

زندگی کی خواہشات اور اُخروی جنت میں فرق

عزیزانِ من! یہ جو ہماری طبعی زندگی ہے اس میں ہماری آرزوئیں' ہماری تمنائیں' ہماری خواہشات' محدود ہوتی ہیں۔ یہ اس زندگی کی اسی موجودہ سطح پہ ہوتی ہیں۔ سوچو تو سہی کہ اگر آپ سے بھی کہا جائے کہ مانگو آج تم کیا مانگتے ہو تو ہمارا مانگنا انہی حدود (موجودہ شعور کی سطح) کے اندر ہوگا۔ جو طبعی زندگی کی حدود ہیں اس سے آگے تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہاں کہا ہے کہ تم جو چاہو گے' تم جو مانگو گے' وہ ہوگا۔ وہ بہر حال تمہارے اس محدود پیمانے کے اوپر ہوگا اور ہم تمہیں اس سے آگے لے جانا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہوگا۔ آپ بچے سے کہیے کہ بیٹا جو چاہتے ہو یہاں سے لے لو تو اس میں سے وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ وہ چھوٹا سا گھگھو گھوڑا ❷ نہیں لے گا' وہ ہوائی جہاز کا کھلونا لے لے گا۔ اس کے ذہن کی سطح' اس کی مانگ' اس کی طلب' اس کی خواہش' اس کی آرزو' اس دائرے سے آگے جا نہیں سکتی۔ تم اسے کہتے ہو کہ بیٹا! ٹھیک ہے تم اس وقت کھلونے کا موٹر لے لو' ہم تمہیں سچ مچ کا موٹر لے دیں گے۔ یہ بات ابھی اس کے ذہن میں نہیں آ سکے گی۔ کیا بات ہے قرآن کی: جو تم چاہو گے وہ ہوگا' اور اس سے بھی زیادہ ملے گا۔ وہ زیادہ کیا ہوگا؟ اس کے لیے انہی مضامین کی بیسیوں آیات ہیں۔ میں ایک ایک آیت ہی لے آتا ہوں۔ اگر آپ کو قرآن کے اندر تفصیل میں دیکھنا ہو تو انہیں میری تصنیف ''تبویب القرآن'' میں دیکھ لیجیے جہاں میں نے تمام آیات اکٹھی کی ہوئی ہیں۔ یہاں جو چیز کہی گئی ہے اس کے لیے یہ آیت (9:72) بڑی عجیب ہے۔ کہا ہے کہ **وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِىْ جَنّٰتِ عَدْنٍ** ❸ (9:72) عزیزانِ من! یہ تو جنت کی بات ہوگئی کہ یہ ملے گا' وہاں بھی یہ کچھ تھا اور اس سے آگے ہمارے پاس وہ کیا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ** ❹ (9:72)۔ اب یہاں ہمارے ہاں

---

❶ یہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کا مصرع ہے۔ پورا شعر یوں ہے۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی' نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

❷ پکی ہوئی مٹی کا بنا ہوا گھوڑے کا ماڈل

❸ یہ ہیں وہ مومنین......مرد اور عورت......جن کے لیے قانونِ خداوندی کی رو سے زندگی کی سدا بہار خوشگواریاں ہیں' جن سے یہ ہمیشہ متمتع ہوتے رہیں گے ......فردوس منظر چمنستان میں آرائش و آسائش کا نہایت پاکیزہ ساز و سامان' عمدہ رہنے کی جگہ......

❹ اور صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگی و یک رنگی (۳-۴ مفہوم القرآن۔ پرویز)

کہیں بھی دیکھیے اس کا ترجمہ ہو جائے گا: ''خدا کی خوشنودی جو اس سے کہیں آگے ہے۔'' گویا خدا خوش بھی ہوتا ہے' خدا ناراض بھی ہو جاتا ہے۔ یہ خوش ہو جانا' ناراض ہو جانا تو انسانوں کے جذبات ہیں۔ اس میں خدا کی خوشنودی چہ معنی دارد۔

رضوان کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! رضوان کے معنی ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ساری جتنی بھی چیزیں ہیں یہ تو اس زندگی اور اس زندگی سے متعلقات کی ہیں۔ اس سے آگے اور بھی بڑی چیز ہے اور وہ ہے ''صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جانا۔'' رضوان کے معنی ''ہم آہنگی'' ہوتا ہے یعنی اپنے اندر صفات خداوندی' بہ حد بشریت پیدا کرتے چلے جانا' یعنی بشریت کی حد کے اندر' صفاتِ خداوندی کو اپنے اندر منعکس کرتے چلے جانا۔ اب اس سے پھر انسان کی خودی' یعنی وہ زندگی جو آگے چلنی ہے' وہ کس طرح جنت بداماں بن جاتی ہے' اسے ہم کیا سمجھیں! رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ یعنی صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگی' تو گویا اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہاں لفظ اکبر آیا ہے یعنی صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگی و یک رنگی۔ جنت کے سلسلہ میں قرآن نے یہ تمام چیزیں بتا دیں۔

مومن کے لیے احکام اور آزادی کا مفہوم

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مومن کو بھی تو کچھ احکامِ خداوندی ماننے ہوتے ہیں' وہ بھی تو انکا پابند ہوتا ہے۔ تو جب وہ پابند ہو گیا تو پھر تو وہ آزادی نہ رہی گویا آزادی سے ہمارا مفہوم تھا جیسے مادر پدر آزادی ہو۔ جسے یہ پابندی کہتے ہیں اس کا سمجھ لینا بڑا ضروری ہے۔ یہ پابندی کیا ہے؟ یہ پابندی کسی کی عائد کردہ نہیں ہے۔ پابندی اور پابندی میں فرق ہے۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ اپنی صحت کے لیے یہ باقاعدہ پروگرام بنا لیں کہ میں صبح اٹھ کر تین میل پابندی وقت کے ساتھ سیر کیا کرونگا اور ٹھیک اسی طرح سے آپ یہ کرتے رہیں۔ یہ پابندی تو آپ کے اوپر ہے مگر آپ کی آزادی کو اس نے سلب نہیں کیا۔ آپ نے تو خود یہ پابندی اپنے اوپر عائد کی ہے۔ جو خود عائد کردہ پابندی ہو' وہ پابندی نہیں کہلاتی' وہ تو آزادی کا مظہر ہوتی ہے۔ قرآن کی طرف آیئے۔ اس پابندی کا ذکر کس طرح کیا جا رہا ہے۔ بیمار ہے' وہ علاج کا سوچتا ہے۔ اس کے لیے وہ اپنے اختیار و ارادے سے طے کرتا ہے کہ ایلوپیتھک علاج کرانا ہے' طے کر لیا' پابندی عائد کر لی' باقی سب کچھ Eliminate (ساقط) کر دیا۔ طے کر لیا کہ جو فلاں ڈاکٹر ہیں اس کا علاج کراؤنگا۔ اب ان ڈاکٹر کی ساری کی ساری دوائیاں' ہدایات' Directions' کی پابندی اس پر عائد ہوئی۔ یہ پابندیاں اسے کسی کا محکوم نہیں بنا رہیں' یہ تو اپنے چوائس (اختیار و ارادہ) کی پابندی ہے۔ قرآن میں جو پابندیاں ہیں ان کی رو سے آپ کے نزدیک پہلی پابندی یہ ہے کہ وہ ایمان لائے' کفر کو چھوڑ دے۔ اس ایمان کے متعلق قرآن میں کیا ہے؟ عزیزانِ من! آپ اس کے حوالے لکھتے جایئے یہ بڑے اہم ہیں۔ ان میں یہ آیت تو بار بار آئے گی کہ وَ قُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ (18:29) یہ الحق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا اور تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ

تمہارے پروردگار کی طرف سے' یہ ضابطہ حق وصداقت آ گیا۔

من شاء کا مفہوم؟

اب فَـمَـنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) جس کا جی چاہے اسے اختیار کر لے' جس کا جی چاہے اس کو چھوڑ دے۔ تو یہ تو پہلی چیز ہے' جسے آپ ایمان کہتے ہیں۔ وہ ''شَآءَ'' کے ساتھ ہے' انسان کی مشیت پر ہے۔ خدا کی مشیت پہ نہیں کہ جسے ہم چاہیں مومن بنا دیں' جسے چاہیں کافر بنا دیں۔ وہ تو قرآن نے بیسیوں مرتبہ کہا ہے کہ اگر انسان کو اس طرح مجبور پیدا کرنا ہوتا' جیسے کائنات کی باقی مخلوق ہے' اسی طرح سے ہم اس کو بھی پیدا کر دیتے۔ ہم نے اس کو صاحبِ اختیار وارادہ بنایا: مَـن شَـآءَ۔ ہم نے صرف حق بھیجا ہے۔ اب فَـمَـنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ❶ (18:29) آپ دیکھتے ہیں کہ آزادی کو کیسے برقرار رکھ رہا ہے۔ یہ تو ہے جسے آپ ایمان لانا کہتے ہیں۔ یہ پہلی بنیادی چیز ہے اور اس کے بعد پوری زندگی میں انسان کے متعلق یہی ہے کہ اپنی منشا کے مطابق عمل کرو۔ عزیزانِ من! کسی مذہب کے پلیٹ فارم سے دیکھیے یہ چیزیں آپ کو کہیں نہیں مل سکتیں۔ پوری زندگی میں انسان کے متعلق یہی کہا گیا ہے کہ اِعْـمَـلُـوْا مَا شِئْتُمْ ❷ (41:40) ہم اپنی دنیا کے اندر اپنی مشیت چلاتے ہیں' تمہاری دنیا میں ہم دخل نہیں دیتے۔ مَا شِـئْـتُمْ (41:40) اپنی دنیا میں تم' جو تمہاری مشیت ہو' اس کے مطابق کرو' جو تم چاہو اس کو کرو' ہم نہیں دخل دیتے۔ نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے بار بار قرآن میں آیا ہے کہ اِعْـمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ (6:135) تم اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرو مجھے اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرنے دو۔ وہی بات کہ اِعْـمَـلُـوْا مَا شِئْتُمْ ❷ (41:40) عزیزانِ من! یہ وہی بنیادی چیز ہے' جس پہ میں آج زور دے رہا ہوں: اس ہدف پہ انسان کی آزادی کو برقرار رکھنا۔ یہ ہے قرآن کا مقصود ومطلوب۔ اسی کا نام جنت کی زندگی ہے۔ اس پہ کسی انسان کی طرف سے پابندی عائد کر دینا جہنم ہے۔ یہ محکومیت ہے۔ یہ ذلتِ انسانیت ہے کیونکہ مَـا كَـانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰـهُ الْـكِتٰـبَ وَالْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّىْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:78) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ قانون کا ضابطہ لیے ہوئے ہو یا انتظامیہ کے اقتدارات اس کو حاصل ہوں' وہ نبی بھی کیوں نہ ہو' اس کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ انسانوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں میرے محکوم بن جاؤ۔ کسی انسان کو یہ حق ہی نہیں ہے۔ حکومت کسی انسان کی ہے نہیں کسی انسان کو دوسرے انسان کی آزادی سلب کر لینے کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ جسے آپ نے ایمان کہا ہے وہ ''ما شآء'' ہے' پھر جو کام کرنا ہے وہ ''اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ'' ہے۔ اب ہے خدا کے احکام کی اطاعت۔ یہ چیزیں بھی تو قرآن میں ہیں۔ جیسا میں نے ابھی

---

❶ جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے' اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ (مفہوم القرآن پرویز۔ ص 665)

❷ جو کچھ تمہارے جی میں آئے کرو۔ (جونسی روش جی چاہے اختیار کر لو۔ تم پر کوئی زبردستی نہیں۔) (مفہوم القرآن پرویز۔ ص 1119)

عرض کیا ہے کہ ڈاکٹر کی ہدایت پہ عمل کرنا ہے۔ وہ محکومیت اور مجبوری نہیں ہے۔ تم نے خود اس کو اپنا ڈاکٹر Choose (منتخب) کیا ہے۔ خود تم نے اپنے چوائس سے اس کی دوائیوں کو اپنے لیے بہتر سمجھا۔ اس کی جو ہدایات ہیں ان پہ عمل کرتے ہو۔

اطاعت، اتباع اور بر کا مفہوم

عزیزانِ من! عربی زبان میں، قرآنِ کریم میں، اس کے لیے اطاعت کا لفظ آیا ہے۔ اس کا مادہ ''ط و ع'' ہے۔ طاع کا لفظ آیا ہے۔ طاع کے معنی ہوتے ہیں: ''وہ پکی ہوئی کھجور، جو از خود اوپر سے نیچے گرے۔ جھانپل سے کچی کھجوروں کو جو گرانا ہے وہ اَطَـــاعَ النَخلُ نہیں کہلاتا۔ پک کر خود گرے تو اسے اَطَـاعَ النَخلُ کہتے ہیں۔ اسی سے اطاعت کے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ کیا بات ہے جو لفظ اطاعت کے اندر ہے! اس کے لیے دوسرا لفظ اتباع ہے۔ اتباع ان کے ہاں کہتے تھے کہ گائے بکری اونٹ وغیرہ کا کوئی نوزائیدہ بچہ ہے۔ اس نوزائیدہ بچے کے آگے آگے مثلاً گائے، اس کی ماں، جا رہی ہوتی ہے اس کے پیچھے پیچھے وہ بچہ چلا جا رہا ہوتا ہے۔ وہ کسی زنجیر میں بندھا نہیں ہوتا، ماں اس کو کوئی حکم بھی نہیں دے رہی ہوتی اور بچہ اس کے پیچھے چلا جا رہا ہوتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ اپنا چوائس ہے، ایک کشش ہے جو اس کو محسوس ہو رہی ہے، جو اس کو پیچھے لیے چلی جا رہی ہے۔

در پہ بیٹھا ہوں تیرے بے زنجیر

یہ اتباع ہے۔ یہ قرآن کا لفظ ہے کہ وہ اس میں اتنی کشش محسوس کرے کہ اس کشش کے پیچھے پیچھے، وہ خود اپنی مرضی سے چلا جا رہا ہو۔ عزیزانِ من! ایک اور لفظ آتا ہے۔ اس کی طرف کبھی کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔ آیت ہے: لَيْـسَ الْبِـرَّ (2:177) وہ ہے ''بر'' کا لفظ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''نیکی یہ نہیں ہے، بدی یہ نہیں ہے۔'' یہ عربی کا لفظ ہے، فارسی زبان کا ترجمہ کر کے اس کا بیڑہ غرق کر دیا، ''بر'' کا لفظ ان دونوں الفاظ ''اطاعت'' اور ''اتباع'' سے اہم چیز ہے۔ ''طاع'' کے اندر تو ''کسی کے حکم کی، اپنی پسندیدگی سے اطاعت کرنا'' ہے۔ ''اتباع'' کسی خارجی کشش کے پیچھے چلنا، اس میں پھر بھی خارج کی چیز ہے۔ ان دو کے علاوہ ایک تیسری چیز بھی ہوتی ہے: آپ سانس لیتے ہیں، یہ نہ کسی کے حکم کی اطاعت ہے، نہ خارج سے کسی کے پیچھے چلنے کی بات ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ زندگی کو برقرار رکھنے کی، آپ کو پوری آزادی ہے۔ اس کے لیے ایک عمل خود بخود جاری رہتا ہے، یہ آزادی کا عمل ہے، یہ خود بخود جاری رہتا ہے۔ اسے عربی زبان میں ''بر'' کہتے ہیں۔ یہ ہے اطاعت۔ جسے آپ خدا کے احکام کی اطاعت کہہ رہے ہیں اس میں محکومیت آتی ہے مگر اس ''بر'' میں تو خدا کی محکومیت بھی نہیں آتی۔ عزیزانِ من! ان الفاظ کی رو سے، جو ہمارے ہاں استعمال میں آتے ہیں، آزادی انسان کے اختیار و ارادہ کے چوائس کی ہے۔ یہ ہے مقام اور مقصود و مطلوب قرآن کی تعلیم کا۔ انسان کو یہ بنانا چاہتا ہے۔ آں چہ حق می خواہد آں سازد ترا۔ جو خدا چاہتا ہے کہ ''تم بن جاؤ''، قرآن تمہیں وہ بنا دیتا ہے۔ یہاں کہا کہ مَـا شِـئْتُمْ (41:40) جو تم چاہو کرو۔ کہا کہ آؤ پھر تمہیں یہ بتائیں کہ یہ

کرنے والے ہمارے جو بندے ہوتے ہیں ان کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے۔ یہ آیتیں بڑی اہم ہیں۔ یہ پہلے بھی آ چکی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ جب بھی انہوں نے کسی چیز کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے' چوائس کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے' تو وہ اس وقت ہوتا ہے جب دو قسم کی ممکنات (Two Possibilities) ہوں' دو راستے ہوں: یہ اختیار کروں یا وہ اختیار کروں' یہ کروں یا وہ کروں۔ اگر ڈاکٹر کی وہ ہدایات اس کے پاس محفوظ ہیں تو وہ دیکھ لے گا کہ یہ کھاؤں یا نہ کھاؤں' ڈاکٹر صاحب نے کیا کہا تھا۔ جو ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے وہی میں' اندر سے' اپنا فیصلہ کروں کہ مجھے یہ کرنا چاہیے۔ آپ نے غور کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی اس ہدایت کے مطابق میں نے اپنی خواہش کو ڈھال لیا۔ خواہش میری ہے' اختیار میرا ہے' میں خود اپنے اختیار کو اس ہدایت کے مطابق کر رہا ہوں۔ قرآنِ کریم کے اندر یہ کیا آیت ہے! کہا کہ وَ مَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ (81:29) مومن کی مشیت' اس کا اختیار و ارادہ' یہ ہے کہ وہ پہلے یہ دیکھتا ہے کہ خدا اس معاملے کے اندر کیا چاہتا ہے اور اس کے بعد وہ خود وہی چاہنے لگتا ہے جو خدا چاہتا ہے' محکومیت بھی نہیں ہے' جبر اس میں بھی نہیں ہے۔ اس سے آزادی نہیں چھنتی۔ اپنے فیصلے کے لیے اس نے ایک روشنی لی ہے' ایک ہدایت لی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ بات ٹھیک ہے اور یہی چیز ہے جو آپ کو قرآنِ کریم دیتا ہے کہ جب بھی آپ کے سامنے دو Possibilities' دو ممکنات آئیں' اس میں سے آپ نے ایک راستہ اختیار کرنا ہے۔ یہ دیکھیے کہ خدا کیا چاہتا ہے۔ ایسے کیا جائے تو قرآن آپ کو یہ بتاتا ہے۔ جب اس کے مطابق آپ عمل کرتے ہیں تو یہ کسی کی محکومیت نہیں ہے' اپنی آزادی سے آپ ایسا کر رہے ہیں۔ آزادی یہ بھی تھی کہ جو راستہ خدا کے خلاف ہے' آپ وہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ آپ نے خود وہ راستہ اختیار کیا جو خدا چاہتا ہے۔ میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ ان آیتوں کے جو ترجمے دورِ ملوکیت میں' جو ہمارے ہاں تفسیریں ہوئی ہیں' پوچھو نہیں سارا قرآن' ساری تفسیریں' خود انسان کو محکوم بنانے کے لیے' اس کی آزادی چھیننے کے لیے ہیں کیونکہ دورِ ملوکیت میں تو پہلی چیز یہ ہے کہ کسی کی آزادی برقرار نہ رہے' جبکہ قرآن نے انسان کی حکومت کو تو مانا ہی نہیں ہے کہ انسان انسانوں کا محکوم ہو جائے کیونکہ اس عمل سے تو زندگی کے کسی گوشے میں بھی اس کو چوائس نہیں دی جاتی تو کیا جب اس دَور کے اندر آپ کی پہلی تفسیر قرآن ہوگی تو کیا اس تفسیر میں آپ کو آزادی کا سبق دیا جائے گا؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ اسی پہلی تفسیر طبری کے بعد پھر یہ تفسیریں اس تفسیر کی طرحی غزلیں ہیں جو آج تک لکھی چلی جا رہی ہیں۔

دورِ ملوکیت کی تفاسیر میں انسانی آزادی کہاں؟

باقی رہی آزادی چھیننے کی بات تو قرآن کہتا ہے کہ مَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ (81:29) تم وہی چاہو جو خدا کے قانون کا تقاضا ہے۔ تو اس میں پہلے یہ بات ہے کہ بھئی! تم جو چاہو کرو لیکن چاہو وہی جو خدا چاہتا ہے کہ تم چاہو مگر اس آیت کا ترجمہ' اس کی پہلی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ تم تو چاہ ہی نہیں سکتے کسی چیز کو بجز اس کے جو خدا چاہے۔ جناب! جو خدا چاہے تم وہی چاہ سکتے ہو' تمہارا اپنا کوئی

ارادہ ہی نہیں ہوگا۔ یہ اس کا ترجمہ ہوتا ہے۔ یہ اس کی تفسیر ہے جو دورِ ملوکیت کی ہے۔ حالانکہ اس میں بات یہ تھی کہ تم اپنے چاہنے سے پہلے' فیصلہ کرنے سے پہلے' کہ میں نے دونوں امکانات میں سے کونسا ایک راستہ اختیار کرنا ہے' یہ دیکھو کہ خدا نے کیا کہا ہے کہ کونسا راستہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اس نے جو کہا ہے اسے اختیار کرو۔ کرو اپنی آزادی سے۔ اپنے چوائس سے اسے اختیار کرو' یہ مَا تَشَآءُوْنَ ہے: تو فنا اندر رضائے حق۔ جب انسان اس طرح سے جو چوائس خدا نے اس کے لیے متعین کی تھی جو راستہ اس کے لیے تجویز کیا تھا' وہ اس راستہ کو اختیار کر لیتا ہے' اپنی خواہش کو' اپنے ارادے کو' اپنی چوائس کو' اس کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتا ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے: بندہ مومن قضائے حق شود۔ یہ بندہ خدا کی تقدیر بن جاتا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(اقبالؒ)

اس وقت ان دونوں کی رضائیں مختلف نہیں ہونگی۔ کہے کہ "وہی جو تیری رضا تھی لیکن وہ رضا تم نے مجھ پہ ٹھونسی نہیں ہے' میں نے اسے خود اختیار کیا ہے۔" آپ نے' عزیزانِ من! یہ سوچ لیا' یہ دیکھ لیا کہ یہ جو مِمَّا يَشْتَهُوْنَ (77:42) ہے' یہ اتنی ہی بات نہیں ہے کہ ان پھلوں میں جو تم چاہو' وہ پھل کھا لو۔ یہ تو بڑی چیز ہے۔ جنت میں ہر مقام پہ آپ کو یہ چیزیں ملیں گی۔ آگے کہا کہ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ [1] (77:43)۔ عزیزانِ من! یہ بڑی چیز آگے بھی آ گئی۔ یہ آخری پارے کی آخری آیتیں ہیں۔ پوچھو نہیں کہ ان میں کتنا ارتکاز ہے' کتنی Concentration ہے: بڑے مزے سے کھاؤ' پیو کیونکہ یہ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ [2] (77:43) کسی کا احسان نہیں ہے' تم نے بھیک نہیں مانگی' تم نے جو کچھ کیا تھا یہ اس کا بدلہ ہے۔ جو تمہارے اپنے اعمال تھے یہ اس کا نتیجہ ہے' کسی کا احسان نہیں' خدا کا بھی احسان نہیں۔ یہ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ہے۔ آزاد معاشرے کے اندر یہی چیز ہے کہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملتا ہے۔ جہنمی معاشرے میں یہ کچھ نہیں ہوتا مثلاً فرعون کا معاشرہ دیکھیے۔ ریفرنس ہے: (20:112) یہاں کہا ہے کہ مَا كُنْتُمْ (77:43) جو کرتے ہو اور وہاں کہا ہے کہ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ [3] (20:112) وہ مومن ہے' وہ معاشرہ جنتی ہے تو اسکے اندر یہ کیفیت ہوگی کہ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا [4] (20:112) اس میں کسی کے اوپر ناانصافی نہیں

---

[1] (ان سے کہا جائے گا کہ) یہ سب کچھ نہایت خوشگواری سے کھاؤ کیونکہ یہ سب تمہارے اعمال کے ثمرات ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ)

[2] یہ تمہارے اعمال کے ثمرات ہیں۔ (ایضاً)

[3] اور جو شخص' خدا کے ضابطہ قوانین کی صداقت کو تسلیم کر کے صلاحیت بخش کام کرے گا۔ (ایضاً)

[4] اُسے نہ کسی ظالم کے ظلم کا خوف ہوگا' اور نہ کسی حق تلفی کرنے والے کی سلب ونہب کا اندیشہ۔ (ایضاً)

ہوگی' کسی کی محنت کو Exploit (سلب ونہب) نہیں کیا جائے گا۔ یہاں یہ ھضمًا کا لفظ آیا ہے۔ یعنی اس میں استحصال نہیں کیا جائے گا۔ تو گویا جنت کی زندگی وہ ہے کہ جس میں کسی کی محنت کا استحصال نہ کیا جائے' اس میں ظلم نہ ہو۔ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ❶ (77:43) کے مطابق سب کچھ ملے اور اس کے بعد اگلی ہی آیت میں کہا کہ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (77:43) تم نے حسن کارانہ زندگی بسر کی' اس کا حسن کارانہ نتیجہ تمہارے سامنے آ گیا۔ تم نے ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کیا' تشخیص صحیح تھی' دوائی اچھی تھی' صحت مل گئی۔ عزیزانِ من! یہ ہے نظام اور اس کے مقابلے میں وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ❷ (77:45) پھر وہی' جو تکذیب کرتے تھے کہ ایسا نہیں ہوگا' تمہیں ایسا نہیں ملے گا' یہ نہیں ہو سکے گا' وہ آج تمہیں دیکھ دیکھ کر خودرو رہے ہیں۔ اب قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ كُلُوْا وَ تَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ❸ (77:46)۔ عزیزانِ من! یہاں پھر یہ دیکھیے کہ یہیں کی زندگی ہے۔ ان سے کہا جائے گا کہ ٹھیک ہے' تمہیں بھی روٹی ملے گی' ذلت کی روٹی ملے گی' کیونکہ تم مجرم تھے۔ یہ یہاں ہی کی زندگی کے متعلق کہا ہے۔ قیامت میں اگر مجرمین سے کہا جائے کہ تمہیں نپی تلی ہوئی روٹی ملے گی تو مجرمین کو تو یہیں نپی تلی روٹی ملتی ہے۔ یہ محکومیت کی روٹی ہوتی ہے۔ جو ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ❹ (77:47)۔ اس آیت کے فوراً ہی بعد اس نے واضح کر دیا کہ بات یہی تھی۔ کہا کہ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ (77:48) جب ان سے کہا جاتا تھا کہ خدا کے احکام کے سامنے جھکو' تو یہ جھکتے نہیں تھے' یہ اس کا نتیجہ ہے: وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ❺ (77:49)۔ پھر وہی بات آ گئی ہے آخری آیت بتا دیتی ہے کہ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (77:50) ❻۔ یہ انتیسویں پارے کی آخری آیت ہے۔ اتنا کچھ کہہ سن لینے کے بعد کہا کہ اتنی وضاحت سے ہم نے بیان کر دیا' دلائل و براہین دیدیں' مشاہدات بیان کر دیئے' تاریخی نوشتیں ہم ان کے سامنے لے آئے' یہ سب کچھ دے دینے کے بعد اگر یہ ان حقیقتوں کو صحیح نہیں مانتے تو کہو اس کے بعد پھر کیا اور چیز آ جائے گی جسے یہ تسلیم کریں گے۔ کیا انداز ہے بات کہنے کا! کہا کہ اور کیا چیز تمہارے سامنے آ جائے گی؟

---

❶ یہ سب تمہارے اعمال کے ثمرات ہیں۔

❷ تباہی ہوگی ان کے لیے جو ہمارے قوانین کو جھٹلاتے تھے۔

❸ (تم طبعی زندگی کے مفاد کے پیچھے پڑے ہوا اور اسی کو منتہی و مقصود سمجھ رہے ہو' سو) تم کچھ وقت کے لیے کھا پی لو' اور سامانِ زیست سے فائدہ اٹھا لو لیکن چونکہ تم ہمارے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہو (اس لیے تمہارا انجام بڑا خراب ہوگا...... طبعی زندگی کو منتہی و مقصود سمجھنے والے حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں جس میں کھانے پینے کے سوا کوئی مقصد حیات ہی نہیں ہوتا۔ (47:12)

❹ تباہی ہوگی ان کے لیے جو ہمارے قواین کو جھٹلاتے تھے۔

❺ جو بھی ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں ان کا انجام خراب ہوتا ہے۔ ان سے جب کہا جاتا ہے کہ تم ہمارے قوانین کے سامنے جھک جاؤ تو یہ ان کے سامنے کبھی نہیں جھکتے۔ بلکہ اس کی تکذیب کرتے ہیں' اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

❻ ہم نے تمام امور نہایت وضاحت سے بیان کر دیے۔ اگر یہ لوگ اس پر بھی ایمان نہیں لاتے تو ان سے پوچھو کہ اس کے بعد' وہ کون سی بات ہوگی جس سے یہ ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان لائیں گے؟ (۱۔۲۔۳۔۴۔۵۔۶ مفہوم القرآن۔ پرویز)

میری متاعِ حیات

عزیزانِ من! انتیسویں پارے کی آخری آیت ہے۔ درس کا وقت تو ایک گھنٹہ ہی ہوتا ہے مگر آج میں آپ سے کچھ زیادہ وقت مانگنا چاہتا ہوں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے' اس کا تعلق کچھ میرے جذبات سے ہے۔ دنیا کی ہر چیز' جو مرغوبِ خاطر ہو' پسندیدہ ہو' اس کا ختم ہونا' اس میں کمی آ جانا' انسان کے دل پہ گراں گزرتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں بھی انسانوں میں سے ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے زیادہ کچھ تو عرض نہیں کرنا لیکن یہ ضرور کہنا ہے کہ یہ متاعِ حیات' یہ سرمایہ زندگی' جو مجھے حاصل ہے' اللہ کا احسان ہے۔ گو کہ مجھے یہ کبھی اتنا میسر نہیں آیا' یا میں نے کبھی اتنا کچھ حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اتنا فراواں ہو اور جب اس میں کمی ہو تو مجھے اس کمی کا شدت سے احساس ہو۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ میرے گزارے کے مطابق دیتا ہے۔ جو مجھے مرغوبِ خاطر چیزیں ہیں' جو میرے ذوقِ لطیف کی تسکین کے لیے فنونِ لطیفہ کی چیزیں ہیں' ان میں کسی قسم کی کمی کا اور ان کے ختم ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اپنے اندرونی جذبات کی نسبت سے ان چیزوں کے اندر کشش ہوتی ہے لیکن میری متاعِ حیات میرے لیے اس کائنات میں مرغوب ترین متاعِ حیات خدا کی کتاب ہے اور محبوب ترین ہستی اس کتاب کا لانے والا نبی اکرم ﷺ ہے۔

عزیزانِ من! اب اس وقت میں قرآن کی بات کرتا ہوں' دو منٹ کے بعد حضور ﷺ کی بھی بات کرونگا۔ قرآنِ کریم کی صورت یہ ہے کہ یہ ایک بحرِ بے کراں ہے' ایک ایسی ندی ہے کہ

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

اس کے ختم ہو جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن جب اسے کاغذوں کے فانوس کے اندر ہم نے محفوظ کر دیا تو یہ مادی پیکروں کے اندر آ گیا۔ اب اس کا شمار بھی ہم اپنے حساب و شمار سے کرتے ہیں: پہلا پارہ' دوسرا پارہ' پھر تیسرا پارہ' اب میں اپنی اس کیفیت کو آپ کے سامنے لاتا ہوں۔ بچپن سے پانچ چھ سال کا ہونگا کہ قرآن کا پارہ میرے ہاتھ میں آیا ہوگا۔ ٹھیک ہے وہ ہر بچے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ قریب پچاس سال سے' عزیزانِ من! میری کیفیت یہ ہے کہ اس دن کے سوا کہ جب میں طبعاً معذور نہ ہو گیا ہوں' قرآنِ کریم کی پاکباز روشنی سے میری آنکھیں ہر روز منور ہوتی رہیں۔ یہ کیفیت پچاس سال سے ہے۔ پچاس سال سے! لیکن ایک ہی احساس میرے اوپر ہے' اسے آپ میری جذباتی کیفیت کہیے کہ جب بھی میں انتیسویں پارے کے آخر میں پہنچتا ہوں تو مجھے کچھ دھکا سا لگتا ہے کہ یہ ختم ہونے لگا ہے۔ ٹھیک ہے میں بھی منطق کی رو سے اس کی دلیل نہیں دے سکتا کہ جسے میں لامنتہیٰ مانتا ہوں وہ ہے کیا؟ لیکن وہ جو محسوس قاعدوں سے' محسوس طریقوں سے' ہمارا شمار ہو رہا ہے پھر وہ کیا ہے؟ یہ جو میں نے اب آپ سے کہا ہے کہ یہ انتیسویں پارے کی آخری آیت ہے' یونہی

نہیں کہا۔ میرے دل میں ایک طوفان اٹھ رہا ہے۔ وہی جو میں نے عرض کیا ہے' جو ساری عمر میرے ساتھ ہوتا رہا ہے' یہاں میں پہنچتا ہوں تو یوں احساس ہوتا ہے کہ اب یہ ختم ہو جائے گا اور میں پھر اس ختم نہ ہونے کے یا اس ختم ہو جانے کے احساس کو اس طرح سے بہلاتا ہوں کہ جب آخری سورۃ ''یُوَسْوِسُ فِی صُدُوْرِ النَّاسِ o مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ'' تک آتا ہوں تو میں یہ کرتا ہوں: مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ o اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمُ '' عزیزانِ من! میں اس کو یوں کر لیتا ہوں کہ وہاں کا وہ جو تاگا ہے' میں اسے وہاں توڑتا نہیں' یہاں آ کے اس کی گرہ دے لیتا ہوں اور پھر شروع ہو جاتا ہوں۔

میرا عشقِ دروں

انسان اپنے آپ کو بھی کس قسم کے حسین فریب دے لیتا ہے۔ یہ ہے میری قرآنِ کریم کے متعلق کیفیت۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والا بحرِ ذخار ہے۔ میری یہ کیفیت ایک اور مقام پر اور زیادہ شدت کے ساتھ ابھری۔ میں نے معارف القرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے اس کا نام معارف القرآن تھا' بعد میں الگ الگ جلدوں کے الگ الگ نام آئے اور اس میں حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کی داستانِ جلیلہ مسلسل چلی آ رہی تھی۔ پہلے وہ ''جوئے نور'' ❶ آئی۔ وہ حضرتِ نوح علیہ السلام سے لے کر حضرتِ شعیب علیہ السلام تک ہے' پھر وہ ''برقِ طور'' ❷ آئی۔ یہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے آگے کا سلسلہ ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی عبرت انگیز داستان اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل انبیائے بنی اسرائیل کا بصیرت افروز تذکرہ ہے۔ پھر ''شعلہ مستور'' ❸ آئی۔ یہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے متعلق ہے۔ اب وہاں یہ جو پیچھے سے سلسلہ چلا آ رہا تھا' جب میں نے ان کی داستان کے' آخری واقعے کو ختم کیا ہے تو وہ ایسا محسوس ہوا جیسے انتیسویں پارے کی آخری آیت ہے۔ وہ سلسلہ جو ختم ہوا اور آگے جو شروع ہونا تھا' اس کی جلالت و مرتبت کا تو پوچھو نہیں لیکن یہ چیز ہے کہ یہ جو اتنا سلسلہ دراز ہے وہ اب ختم ہو رہا ہے تو ایک احساس تھا۔ میں نے اس مقام پہ پہنچ کر ''شعلہ مستور'' میں اپنے ان جذبات کا اظہار کیا ہے۔ وہ الفاظ میں آپ کو سنا دوں۔ آپ اسے سن لیجیے۔ اس مقام پر پہنچ کر میں نے جو لکھا وہ میرے سامنے ہے اور آپ دیکھ لیجیے گا کہ جذبات کی شدت کا کیا عالم تھا۔ پتہ نہیں بعض اوقات خود لکھنے والا بھی محسوس نہیں کرتا کہ کس عالم کے اندر یہ چیز لکھی جاتی ہے اور لکھی گئی ہے۔ میں نے لکھا تھا:

---

❶ اس کا پہلا ایڈیشن 1945ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔

❷ یہ معارف القرآن کی تیسری کڑی تھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے انبیائے کرام کے تذکارِ جلیلہ تھے۔ یہ کڑی بھی سب سے پہلے 1945ء میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں جب ان جلدوں کے نئے ایڈیشن شائع کرنے کا وقت آیا تو مناسب سمجھا گیا کہ ہر جلد کو اس کے موضوع کی نسبت سے الگ نام سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ اسے ''برقِ طور'' کے نام سے شائع کیا گیا۔

❸ اس کا پہلا ایڈیشن 1958ء میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ یہ حضرت زکریا' حضرت یحیٰی اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے تذکارِ جلیلہ' سلسلۂ انبیائے کرام پر نگہۂ بازگشت اور اقوامِ عالم کے عروج و زوال کے ابدی اصولوں پر مشتمل ہے۔

''طائرانِ حظیرۂ قدس کا وہ کاروانِ شوق، جو صبحِ ازل، جھلملاتے تاروں کی سکوت افزا[1] شبنمی چھاؤں میں، جانب منزل روانہ ہوا تھا، قندیل آسمانی کی بصیرت افروز و جہاں تاب روشنی میں، زمزمہ سنج ونغمہ بار، جذب و کیف کی نورانی وادیاں طے کرتا، اس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں سے چراغِ منزل، روشنی کے جگمگاتے مینار کی طرح، دُور سے مسکراتا نظر آ رہا ہے۔ وہ مقام جہاں اس منزل کی تکمیل ہوگی جس کے لیے خاک کے ذرے مختلف ارتقائی ادوار طے کر کے پیکر آدم میں متشکل ہوئے۔ اور یہ پیکرِ آب وگل، مقامِ شرف ومجد انسانی کی طرف رواں دواں جادہ پیما ہوا...... یہ راحلہ شوق اس وقت میقات میں پہنچ چکا ہے۔ وہ دیکھیے ہر فرد کارواں مصروفِ احرام بندی ہے کہ اب اگلا قدم حریمِ کعبہ میں ہوگا۔ جب تک یہ کارواں تیاریوں میں مصروف ہے، آیئے ہم ان قطع کردہ راہوں پر ایک طائرانہ نگہ بازگشت ڈالیں تاکہ گزری ہوئی منازل کی یاد پھر سے تازہ ہوجائے اور ہم ان شگفتہ وشاداب پھولوں کو دامن نگاہ میں لیے، ان کے ساتھ آگے بڑھیں کہ اس سے آگے فاران کی مقدس وادی میں پہنچ کر، جہاں کا ہر سنگ ریزہ جلوہ فروش صد طور اور ہر ذرہ آئینہ نمائے ہزار سینا ہے، اس کی فرصت نہ مل سکے گی کہ وہاں قلب کی ہر حرکت صرفِ نیاز اور نگاہ کی ہر جنبش وقف سجود ہوگی۔''

عزیزانِ من! چراغِ منزل آپ نے سمجھ لیا کہ میں نے کس کو کہا تھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اس مقصد عظیم کی تکمیل ہوگی جس کے لیے خاک کے ذرے مختلف ارتقائی ادوار طے کر کے پیکر آدم میں متشکل ہوئے اور یہ پیکر آب وگل مقام شرف ومجدِ انسانیت کی طرف رواں دواں جادہ پیما ہوا۔ نفوس قدسیہ کا یہ قافلہ رشد وہدایت ایک جوئے رواں تھی جو دامنِ کہکشاں سے فرازِ کوہ پر جلوہ بار وگوہر ریز ہوئی اور سینائے کوہ کو چیرتی بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکرا کر بجلیاں پیدا کرتی، سرودِ زندگی کو اپنی لہروں کے آغوش میں پرورش دیتی، داخل دشت وصحرا ہوئی۔ محمد ﷺ گوئٹے[2] کی ایک نظم ہے اقبالؒ (1877-1938) نے اپنے ہاں فارسی زبان میں اس نعت کا ترجمہ کیا ہے۔ دنیا میں میرے نزدیک اس سے بلند مقام شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ اقبال نے اپنے ہاں بھی لکھا ہے مگر گوئٹے جو کہہ گیا ہے وہ عجیب حقائق کی دنیا ہے۔ میں اس کا ترجمہ نہیں کرسکتا۔ اُس نے لکھا ہے کہ

در خواب ناز بود بہ گہوارۂ سحاب

محمد ﷺ! یہ ہیں وہ لوگ جن کی آنکھیں پالیتی ہیں کہ یہ کیا مقام تھا اور یہ کیا ہستی تھی! زندگی نہیں، ایک جوئے رواں ہے کہ نامساعدت حالات ونا موافقت زمانہ کی ہر چٹان اس کی رفتار میں اور تیزی اور اس کی موجوں میں مزید خوش خرامی پیدا کردیتی ہے۔

---

[1] اس کے بعد ٹیپ میں آواز ختم تھی۔ یہ حصہ تحریر معارف القرآن جلد سوم کے عنوان تلک الرسل کے آغاز کے الفاظ پر مشتمل ہے اور پرویزؒ (1903-1985ء) کی معروف کتاب معراجِ انسانیت کے صفحہ 32 سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب 1949ء میں پہلی مرتبہ فیروز پرنٹنگ ورکس میں طبع ہوکر، جے۔بی۔ عارف پرنٹر وپبلشر کی وساطت سے ادارۂ طلوع اسلام کراچی سے شائع ہوئی تھی۔

[2] Goethe, Johann Wolfgang Von (1749-1832)

در خواب ناز بود بہ گہوارۂ سحاب
واکرد چشم شوق بآغوش کوہسار
سیمائے اوچوں آئینہ بے رنگ و بے غبار
از سنگ ریزہ نغمہ کشاید خرام او

اُس کی رفتار پتھروں کے ریزوں سے نغمے پیدا کرتی ہوئی چلی آ رہی تھی اور اُس کی پیشانی جلوت ماب بے رنگ و بے غبار تھی۔ الغرض یہ جوئے رواں نہ صرف ہجوم تزاحم اور انبوہِ تصادم کی سنگلاخ زمینوں ہی سے مستانہ وار گزرتی آئی ہے بلکہ کشش و جاذبیت کی ہر وادیٔ رنگ تعطر اور امیال وعواطف کے ہر دامنِ کیف ونکہت پر ایک نگہہ تبسم آلود ڈالتی کج کلہانہ انداز سے آگے بڑھتی چلی آتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں عقیدت

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود [1]

میں نے لکھا کہ یہ مست خرام جوئے بار دشت وصحرا میں زمین صالحہ کو لالہ زاروں میں تبدیل کرتی اور خس وخاشاک اور ہر کشت زبوں حال کو اپنی موجوں کی لپیٹ میں بہاتی آگے بڑھتی گئی۔ انبیائے کرام کی داستان کا سلسلہ گاہ اپنی سکوت افزا روانیوں سے سبزہ نو دمیدہ کا منہ چومتی اور جھکی ہوئی شاخوں کو آئینہ دکھاتی' اور گاہ کف بردہاں طغیانیوں سے بڑے بڑے سرکش تناور درختوں کو جڑ سے اکھیڑتی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ [2] (48:29) این و بے نیاز' ماحول سے مستغنی' گردوپیش سے غیر متاثر' اپنی خودی میں مست' انسانوں کے خودساختہ قوانین وضوابط سے بے رخی برتتی اور صرف اس قانون سرمدی کا اتباع کرتی' جس کے تابع زندگی بسر کرنے کے لیے اس کی تخلیق ہوئی تھی' جانب منزل بڑھتی گئی۔ گوئٹے [3] (1719-1832ء) کہتا ہے

---

[1] اس بے کراں سمندر کے اندر وہ لہر کس قدر مستانہ انداز سے چلی آ رہی ہے۔ اپنی ذات کے اندر دیکھو' دوسروں سے بیگانہ ہے۔

[2] محمد رسول اللہ اور ان کے رفقائے کار کی جماعت کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں' لیکن باہمدگر بڑے ہی نرم اور ہمدرد (5:54) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[3] گوئٹے نے کس قدر بلیغ انداز میں کہا ہے کہ تسلسلِ حیات کے بغیر تو اس دنیا کی زندگی بھی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔ اس نے کہا ہے کہ

That man is dead eren in this Life--- who has no belief in another (Quoted by Dixon in "the humhn Situation. P.428)

دریائے پرخروش ز بند و شکن گزشت

ان گھری ہوئی وادیوں کے اندر سے چیرتی ہوئی گزری......

یکساں چوں سیل کردہ نشیب و فراز را

از کاخ شاہ و بارہ و کشت و چمن گزشت

مساواتِ محمدی۔ پانی کا کام یہی ہے کہ جہاں وہ گڑھا ہوتا ہے اس کو بھی بھرتا ہے' جہاں فراز ہوتا ہے اس کے اوپر سے اس کی سطح ہموار ہوتی ہے۔ کہنے لگے کہ یہ جو تعلیم محمدی تھی یہ اس طرح سے نشیب و فراز کی سطح کو ہموار کرتی ہوئی طبقات کو مٹاتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ اس نے نہ تو بادشاہوں کی طرح کسی سے خراج وصول کیا' نہ کسی باغبان کی طرح اپنا حصہ ان کی محنتوں سے یا چمن کے پھلوں سے مانگا۔ بے تاب و تند تیز و جگر سوز و بے قرار۔ کیا کہوں' میں اس نعت میں!

بے تاب و تند و تیز و جگر سوز و بے قرار

در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گزشت

دورِ کہن میں جو چیزیں خستہ ہو چکی ہوئی تھیں' ان کو چھوڑتے ہوئے' جدید دنیا کی منزلیں طے کرتے ہوئے' آگے بڑھتے گئے۔

زی بحر بے کرانہ چہ مستانہ می رود

در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

تو میں نے پھر دیکھا کہ یہ قافلہ رشد و ہدایت' یہ کاروانِ نور و نکہت' ہر ناقۂ بے زمام کو دعوت قطار دیتا اور ہر رہرو سفر حیات کی تقدیروں کی پردہ کشائی کرتا' اس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں آثارِ منزل نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ تکمیل سفر کی ہنگامہ خیز مسرت اور حصولِ منزل کی مسرت انگیز کیفیت کا اندازہ ہم شکستہ پا کیا لگا سکتے ہیں' نہ جن کے قدم آشنائے جادہ' نہ آنکھیں شناسائے منزل۔ اس والہانہ حقیقت کا پوچھیے کسی ایسے قلب زندہ سے' جس پر یہ حقیقت آشکارا ہو چکی ہو کہ حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں۔ یہ کیف' یہ رہرو شوق' اس وقت میقات میں آ پہنچا ہے۔ مجھے خوشی ہے' مسرت ہے اور فخر ہے اپنی میقات کی اس تشبیہ پر۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب حج کے لیے جاتے ہیں تو کعبہ سے دُور کچھ فاصلے پر' کچھ یہاں کچھ وہاں' وہ وہاں مقامات کے ایسے نشانات ہیں کہ جہاں پہنچ کر پھر احرام کا جامہ پہنا جاتا ہے' کپڑے اتارے جاتے ہیں تو وہ درحقیقت حرم تک پہنچنے کی تیاری ہوتی ہے' وہ کسی کے ملنے کا میقات ہوتا ہے' وہ وعدہ ہوتا ہے' وہ مقام ہوتا ہے جہاں کوئی کہہ گیا ہو کہ یہاں کھڑے رہنا' ہم یہاں تمہارے لیے آئیں گے۔ کیا بات ہے اس لفظ کی صاحب! ہم تمہیں ملنے آئیں گے' یہاں ہمارا انتظار کرنا۔ میقات کیا عجیب سے الفاظ ہیں! کہا کہ اس وقت یہ میقات میں پہنچ چکا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ وہ دیکھیے! ہر فردِ کارواں مصروف احرام بندی ہے کہ اب اگلا قدم حریم کعبہ میں ہوگا۔ میقات پر پہنچ کر ہر زائر حریم قدس کا ولولہ شوق تیز تر اور راحلۂ

عناں ذوق گسیختہ ہو جاتا ہے کہ منزل کا قرب اور عید نظارہ کی کشش اس کے رگ و پے میں بجلیاں بھر دیتی ہیں لیکن اس مقام پر میرا یہ عالم ہوتا ہے کہ ذوق وشوق کی برق آسا بے قراریاں اور جذب و کیف کی والہانہ سرمستیاں یکسر حیرت بن جاتی ہیں کہ یہ وہ مقام ہے جہاں کا ہر ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہوتا ہے کہ

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر

اس آسمان کے نیچے یہ وہ ادب کا مقام ہے جو عرش سے بھی نازک تر ہوتا ہے صاحب! اور یہی وہ مقام ہے کہ جہاں میں یا یہی وہ کیفیت ہے کہ جہاں میں انتیسویں پارے کی آخری آیت میں پہنچا کرتا ہوں بعینہ یہ میری کیفیت ہو جاتی ہے۔ عزیزانِ من! میں جذباتی بہت کم ہوتا ہوں لیکن جذبات کی موٹر صرف پٹرول سے ہی نہیں چلتی، اس میں موبل آئل بھی ہونا ضروری ہے صاحب! یہ ہے وہ کیفیت جو میں نے عرض کیا کہ یہ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍ بَعۡدَهٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ❶ (77:50)۔

انتیسویں پارے کی آخری آیت اور میقات کا سنگ میل

جب انتیسویں پارے کی یہ آخری آیت آتی ہے تو میں اسے میقات کے سنگ میل سے پکارا کرتا ہوں۔ ہم وہاں پہنچ چکے ہیں۔ احرام باندھیے، اب آگے حریم کعبہ میں پہنچنے کے لیے تیاری کیجیے۔ قرآن کا تو جیسے میں نے عرض کیا ہے آخری آیت کے آخری لفظ پہ میں تو یوں کیا کرتا ہوں: الناس الحمدللہ۔ اس اختتام سے میں ابتدا کر لیا کرتا ہوں۔ اسی طرح سے میں نے اس کا مطالعہ اور تلاوت کی ہے۔ یہ وہ چیز ہے کہ کہنے کو تو بہت سے اشعار ذہن میں آ رہے ہیں لیکن زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ ختم ہونے کے بعد جگر ❷ کا ایک شعر حسین ہے۔

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آ رہا ہے

کیا کیفیت ہے اس کی! میں اسے محسوس کرتا ہوں کہ میں انتیسویں پارہ کو ختم قرآن کرتا ہوں تو میری وہ کیفیت ہوتی ہے۔ وہاں پہنچتے ہی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کوئی بات نہیں، محبت کا زمانہ آ رہا ہے اور پھر اُسی وقت شروع ہو جاتا ہے اور اس شروع ہونے کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ غالب ❸ جس انداز میں بات کہہ گیا ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد

---

❶ ہم نے تمام امور نہایت وضاحت سے بیان کر دیئے۔ اگر یہ لوگ اس پر بھی ایمان نہیں لاتے تو ان سے پوچھو کہ اس کے بعد، وہ کون سی بات ہوگی جس سے یہ ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان لائیں گے؟ (مفہوم القرآن۔ پرویز، ص 1402)

❷ جگر (1890-1960ء)۔ علی سکندر نام اور جگر تخلص۔ مراد آباد میں 1890ء میں پیدا ہوئے۔

❸ غالب مرزا اسداللہ خاں (1797-1869ء)

تیرا رخصت ہونا اور تیرا آ کر ملنا دونوں کی لذت ہی الگ الگ ہوتی ہے۔ ہزار بار بروصد ہزار بار بیا۔ ہزار بار بھی آ' سو ہزار دفعہ جا قرآن کی کیفیت عزیزانِ من! میرے ساتھ یہ ہے: وداع و وصل جدا گانہ لاتے دارد۔ ختم کرتا ہوں' ختم کے لفظ پر بھی میں کانپتا ہوں جب میں یہ کہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ لفظ بھی ختم کروں۔ آخری پارے میں پہنچنے کے بعد آخری آیت پہ جاتا ہوں تو الناس ''وداع و'' اور پھر الحمد للہ سے وصل۔ وداع و وصل جدا گانہ لذتے دارد۔ اس شخص ❶ کی کیا بات ہے کہ ہزار بار بروپہ ہے' لطیف جو چیز کہنے کی ہوتی ہے! لطیف صد ہزار بار قرآن کو جب یوں وداع کیا جاتا ہے' صد ہزار بھی آ بروس ہزار بار صرف آ صد ہزار بار۔ میں کہوں گا کہ اس کے بعد جب وہ آتا ہے تو وہ ایک نئی دنیا کے دروازے کھولتا ہے۔ پچاس برس ہو گئے عزیزانِ من! کتنی چھوٹی سی یہ کتاب ❷ ہے کہ میرے ہاں وہ لگا ہوا ہے' یہ ایک قطعہ ہے' جس کا اتنا بڑا افریم کیا ہوا رکھا ہوا ہے۔ یہ مصر میں طبع ہوا ہے اور اس میں سارا قرآن لکھا ہوا ہے۔ یہ کتنی چھوٹی سی کتاب ہے کہ وہ جو انگریزی کا باریک ٹائپ ہوتا ہے' یہ اس میں آ جائے۔ یہ چند صفحوں میں کتاب آ سکتی ہے لیکن کیفیت اس کی یہ ہے کہ نہ حد اس کے آگے' نہ حد سامنے' یہ ختم ہی نہیں ہونے کو پاتی' جب میں ہر بار اس کو شروع کرتا ہوں' ہر بار نئے حقائق سامنے آتے ہیں۔ پچاس سال ہو گئے۔ رجسٹر میرے ان چیزوں کے لکھنے سے رجسٹر بھرے ہوئے ہیں۔ لفظ ختم نہیں ہوتا۔ قرآن نے جو کہا تھا کہ خدا کے حقائق کو تم ختم نہیں کر سکو گے خواہ سارے سمندر روشنائی بن جائیں اور سارے درخت قلم بن جائیں۔ قرآن کی کیفیت یہ ہے' عزیزانِ من! بہر حال ہم میقات پر آ گئے۔ اس میں احرام باندھنے میں مصروف ہو جایئے۔ آئندہ ہم میقات کے بعد کی جو پہلی منزل حریم کعبہ کی طرف جا رہی ہے۔ وہ تیسویں پارہ ہے' ہم اس تیسویں پارے کی ابتدا کریں گے۔ میں اس کے مطابق یونہی کیوں نہ کروں کہ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ❸ (77:50)۔ عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ (78:1) کیا انداز ہے اس تیسویں پارے کی پہلی آیت کا! عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ (78:1) اے رسولؐ! یہ کس بات کے متعلق تم سے بار بار پوچھتے ہیں؟ کون سی بات ہے جس کی بابت یہ پوچھتے ہیں؟ اس کا جواب ہم آئندہ درس میں دیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀❀❀......❀

---

❶ غالب مرزا اسد اللہ خاں (1797-1869ء)

❷ یہ اشارہ قرآنِ کریم کی طرف ہے جو صاحب درس کے کمرے میں مکمل طور پر ایک کاغذ کے فریم میں آویزاں ہے۔

❸ ہم نے تمام امور نہایت وضاحت سے بیان کر دیئے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس پر بھی ایمان نہیں لائے تو ان سے پوچھو کہ' اس کے بعد' وہ کونسی بات ہو گی جس سے یہ ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان لائیں گے؟ (اے رسولؐ! تمہیں معلوم ہے کہ) یہ لوگ' ایک دوسرے سے' کس چیز کے متعلق دریافت کرتے ہیں؟ (۲-۳ مفہوم القرآن۔ پرویز)

میرا فہمِ قرآن حرفِ آخر نہیں

اس حقیقت کا دُھرا دینا ضروری ہے کہ میں قرآنِ کریم کے متعلق جو کچھ پیش کرتا ہوں وہ بہرحال ایک انسانی کوشش ہوتی ہے جو نہ سہو وخطا سے منزہ ہو سکتی ہے اور نہ ہی اسے حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعہ میں' میں نے اسی لیے صرف قرآنی آیات کو پیش کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ان آیات کے مفہوم سے استنباطِ نتائج کیے ہیں' اگر آپ کو ان نتائج سے اتفاق نہ ہو تو آپ انہیں نظر انداز کر دیں اور قرآنی آیات پر غور وتدبر کے بعد' خود کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں۔ میرا مقصد اپنی وسعت واستطاعت کے مطابق' رہ نوردانِ جادہ قرآنی کے لیے سہولتیں بہم پہنچانا ہے تاکہ وہ بآسانی منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔ میں ان کا رفیقِ سفر بننا چاہتا ہوں' خضرِ راہ نہیں اور میرے لیے یہی سعادت بہت ہے۔ [پرویز۔ قرآنی قوانین]

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے ذہن کی نارسائی۔

(پرویز۔ معراجِ انسانیت)